

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_226315

UNIVERSAL
LIBRARY

سلسلہ شریعت اسلامیہ

نظریہ سلطنت

تصنیف
جے۔ کے۔ بلنچلی
ترجمہ

قاضی تلمذ حسین صاحب ایم۔ اے۔

رکن شعبہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ

جس کا مقابلہ اصل جرمانی کتاب ہے

ڈاکٹر عبدالستار صاحب یقینی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔
نے کیا

۱۳۳۴ھ ۱۳۳۴ھ ۱۹۲۸ء

دارالافتاء دارالحدیث دارالعلوم

یہ کتاب کلارنڈن پریس آکسفورڈ کی اجازت سے جس کو
حق اشاعت حاصل ہے اردو میں ترجمہ
کر کے طبع و شائع کی گئی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مذہبی نظر بر نظر یہ سلطنت

اس کتاب میں تحقیق پر تعصب غالب ہے مثلاً: ”تاریخ عالم اسی وقت سے شروع ہو سکتی ہے جبکہ ایک اعلیٰ انسانی نسل نے بنی نوع انسانی کی تکمیل کے لئے خود کچھ کرنے کی قابلیت پیدا کر لی تھی“ پس اس کی ابتدا سفید نسلوں کے ظہور سے ہوتی ہے، یہی لوگ روشنی کے فرزند ہیں اور یہی دنیا کی تاریخ کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں، یہ سفید انسان اتنے قدیم نہیں ہو سکتے جتنے قدیم انسان منا بند ہیں“ (ص ۵۰)

تصور سلطنت کا جو موازنہ ہے (ص ۶۰ — ۶۶) وہ آئین قدیم سے پوری واقعیت پر مبنی نہیں۔

مذہبی رنگ کی سلطنتوں کی خصوصیتیں دکھائی ہیں کہ ”آزادانہ نشوونما میں غلطی پڑ جاتا ہے“ ”حکمران حاکم علی الاطلاق بن جاتا ہے“ ”جب یہ اقتدار ایسے وحشی الہام پر مبنی ہو جاتا ہے جس کا سلسلہ مدتوں قبل منقطع ہو چکا ہے“ جیسے یہودیوں میں موسوی احکام اور مسلمانوں میں قرآن شریف، تو اس میں ایک مستحکم مگر ناقابل تغیر نظم قائم ہو جاتا ہے۔“ ”مذہبی حکومتیں قوائے انسانی جو قانون و حکومت کے معاملات کے فیصلے کے لئے لازمی ہیں بہت ہی نامکمل طور پر ترقی کرتے ہیں اور کبھی ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا“ ”مذہبی سلطنت میں مردانہ قوتیں زمانہ قوتوں کے تابع ہو جاتی ہیں“ ”اہل مذہب کی حکمرانی میں عام لوگوں کو ہمیشہ

بقیت پیش آئے گی۔ ”جرم کے قوانین سخت اور سزائیں ظالمانہ ہوتی ہیں“ ”علم و ہنر میں
 فی نفسہ کوئی خوبی نہیں سمجھی جاتی“ (ص ۳۷۲ - ۳۷۴) و مایحذو حد وہ
 حضرات اساتذہ سے توقع کی جاتی ہے کہ درس کے وقت ایسے مقامات
 پر نہ ہی نگہ کریں گے بلکہ حقیقی مذہب اور اس کے صحیح متعلقات کی نسبت جو غلط
 سائنس کا ارتقاء و زوال، اصل نشانے غلط کو ظاہر کر کے علمی استدلال کے ساتھ فرمائیں گے نقطہ

عبداللہ العماوی

ناظر مذہبی جامعہ عثمانیہ سرکار عالی

فہرست مضامین نظر یہ سلطنت

صفحہ نمبر	عنوان و مضمون
۳	۱
۱۲	تہہید
۷	پہلا باب :- علم سیاست
۵	دوسرا باب :- علمی تحقیق کے طریقے
۱۰	تیسرا باب :- عام اور خاص علم سیاست
۱۳	۲ پہلا مقالہ
۷	سلطنت کا تصور
۷	پہلا باب :- سلطنت کا تصور اور سلطنت کا تخیل سلطنت کا عام تصور
۲۵	دوسرا باب :- سلطنت کا انسانی تخیل عالمگیر شہنشاہی
۳۶	تیسرا باب :- تخیل سلطنت کے نشو و نما کی تاریخ
۷	(۱) دنیائے قدیم
۳۰	الف - یونانیوں کا تخیل سلطنت
۳۲	ب - رومیوں کا تخیل سلطنت
۷	الف - میسائیت
۳۳	ب - جرمانی دشوئن، قوم
۴۶	ج - نشاۃ جدیدہ کا اثر
۵۱	پانچواں باب :-
	(۲) ازمنہ وسطی

صفحہ	آرمنو	عنوان و مضمون
۳	۲	۱
۵۱		۳۲ ازمنہ جدیدہ کا تکمیل سلطنت
		الف - بنیاد و کس وقت شروع ہوگا
		ب - ازمنہ قدیمہ و وسطی کے
۶۰		تصور سلطنت سے جدید
		سلطنت کے خاص خاص فرق
۶۷		ساتواں باب :- سلطنت کے مختلف نظریوں کا ارتقار
۲۳۲	۸۱	دوسرا مقالہ
		سلطنت کے بنیادی شرائط، انسان اور قوم کی سرشت اور طینت کے اعتبار سے
۸۱		پہلا باب :- نوع انسان، انسانی نسلیں، اور قوموں کے خاندان
۸۶		تعلیقات
۸۸		دوسرا باب :- تصورات است و قوم
۹۵		تعلیقات
۹۷		تیسرا باب :- قومیتوں کے حقوق
۱۰۱		چوتھا باب :- تعمیر سلطنت میں قومیت بحیثیت اصول
۱۱۳		تعلیقات
۱۱۵		پانچواں باب :- نظم معاشرت (سوسائٹی)
۱۱۹		چھٹا باب :- قبائل
۱۲۱		ساتواں باب :- ذاتیں
۱۲۷		اکھواں باب :- طبقات اگر وہ ذی امتیاز
۱۳۲		نواں باب :-
		الف - قیس (طبقہ مذہبی)

صفحہ نمبر	صفحہ نمبر	عنوان و مضمون
۳	۲	۱
۱۳۹		دسواں باب :-
۴		ب۔ طبقہ اعیان و امراء (۱) فرانسیسی امراء
۱۵۰		کیا مصواں باب :-
۵		ب۔ انگریزی طبقہ امراء
۱۵۷		بار مصواں باب :-
۶		ج۔ جرمانی طبقہ امراء (۱) پرنس
۱۶۳		تیر مصواں باب :-
۷		ج۔ جرمانی طبقہ امراء (۲) نائٹ
۱۷۰		چودھواں باب :-
۸		ج۔ شہریوں کا طبقہ
۱۷۶		پندرھواں باب :-
۹		د۔ کسانوں کا طبقہ
۱۸۲		سولھواں باب :- ہ۔ غلامی اور اسکی نسوخی
۱۸۸		سترھواں باب :- جدید زمانے کے درجات کا اصول
۱۹۲		اٹھارھواں باب :- جدید زمانے کے درجات کا تبصرہ
۱۹۳		تعلیم یافتہ شہری طبقہ یا "طبقہ سوم"
۲۰۲		انیسواں باب :- سلطنت کا تعلق خاندان سے
۲۱۳		الف۔ قبائلی سلطنت۔ پدرسر حکومت۔ اندولج
۲۱۷		بیسواں باب :- سلطنت کا تعلق خاندان سے
۲۱۷		ج۔ عورتوں کا درجہ
۲۱۷		تعلیق

صفحہ نمبر	صفحہ نمبر	عنوان و مضمون
۳	۲	۱
۲۱۸		اکیسواں باب :- سلطنت کا تعلق افراد سے
"		الف - اپنے ملک والے اور غیر ملک والے
۲۲۶		بائیسواں باب :- سلطنت کا تعلق افراد سے
"		(۲) سلطنت کے شہری
۲۳۳	۲۶۸	تیسرا مقالہ
"		سلطنت کے بنیادی اصول سیرونی فطرت کے لحاظ سے
"		زمین
"		پہلا باب :- آب و ہوا
۲۳۸		دوسرا باب :- ملک کی ہیئت اور قدرتی اشکال
۲۴۱		تیسرا باب :- زمین کی زرخیزی
۲۴۶		چوتھا باب :- زمین
۲۵۳		پانچواں باب :- ملکتی فرمانروائی
۲۵۷		چھٹا باب :- ملک کی تقسیم
۲۶۰		ساتواں باب :- ملک شخصی سے سلطنت کا تعلق
۲۶۹	۳۲۱	چوتھا مقالہ
"		سلطنت کا عروج و زوال
"		پہلا باب :- تہذیب
۲۷۲		دوسرا باب :- تاریخی تکوین کی صدئیں
"		دائیں تکوین اولیں کی صورتیں

صفحہ نمبر	صفحہ نمبر	عنوان و مضمون
۳	۲	۱
۲۷۸		تیسرا باب :-
"		د) تکوین ثانوی کی صورتیں
۲۸۷		چوتھا باب :-
"		د) تخریجی تکوین کی صورتیں
۲۹۰		پانچواں باب :-
۲۹۳		سلطنتوں کا زوال
"		چھٹا باب :-
"		تخمینی (یا تخیلی) نظریے
۲۹۷		د) نام نہاد فطری حالت
۲۹۷		ساتواں باب :-
"		د) سلطنت ہمیشہ تنظیم ربانی
۳۰۵		اٹھواں باب :-
"		د) نظریہ جبر
۳۰۸		نواں باب :-
"		د) نظریہ معاہدہ
۳۱۳		تعلیقات
۳۱۷		دسواں باب :-
"		د) انسان کی فطری تمدن پذیری اور اس کا سیاسی احساس
۳۲۲		پانچواں مقالہ
۳۲۵		سلطنت کی غایت
"		پہلا باب :-
"		سلطنت غایت ہے یا وسیلہ ؟ کس حد تک غایت ہے کس حد تک وسیلہ ؟
۳۲۷		دوسرا باب :-
		سلطنت کی غایت کے متعلق غلط خیالات

صفحہ نمبر	عنوان و مضمون
۳	۱
۳۳۱	تیسرا باب :- سلطنت کی غایت المرام کی نسبت نامکمل یا مبالغہ آمیز خیالات
۳۳۶	چوتھا باب :- سلطنت کی صحیح غایت
۵۰۰	پنجمہ مقالہ سلطنت کی شکلیں
۳۳۶	پہلا باب :- ارسطو کی تقسیم
۳۳۹	دوسرا باب :- نام نہاد ممبروں کی سلطنت
۳۵۳	تیسرا باب :- نظریہ ارسطو کی ترقیات و بعد
۳۵۶	چوتھا باب :- سلطنت کی چار بنیادی شکلوں کے اصول
۳۶۰	پانچواں باب :- سلطنت کے اشکال ثانوی کا اصول
۳۶۳	چھٹا باب :- تصویری یا مذہبی حکومت
۳۶۵	ساتواں باب :- شاہی کی بڑی بڑی قسمیں
۳۶۹	آٹھواں باب :-
۳۸۳	الف - یونانیوں اور جرمانوں میں خاندان بادشاہی
۳۸۴	نواں باب :-
۳۸۶	ب - قدیم روم کی قومی شاہی
۳۸۷	دسواں باب :-
۳۹۱	ج - رومی شہنشاہی
۳۹۶	گیارھواں باب :-
۳۹۶	د - فرانکی شاہی
۳۹۶	بارھواں باب :-

صفحہ نمبر	صفحہ	عنوان و مضمون
۳	۲	۱
۳۹۶		۵۔ جاگرتی شاہی اور شاہی محدود بحقوق طبقات
۳۹۷		تیرھواں باب :-
۴		۶۔ زمانہ حال کی مطلق العنان شاہی
۴۱۰		چودھواں باب :-
"		نہر۔ آئینی شاہی
۴۳۹		پندرھواں باب :-
"		دو، آئینی شاہی کے غلط تصورات
۴۴۳		سولھواں باب :-
"		۳، شاہی کا اصول اور آئینی شاہی کا تصور
۴۵۱		سترھواں باب :- اعیانی حکومت
"		الف۔ یونانی شکل سلطنت ————— اسپارٹا
۴۵۶		اٹھارھواں باب :-
۶		ب۔ روم کی اعیانی حکومت
۴۶۳		انیسواں باب :-
"		ج۔ اعیانی حکومت پر بعض خیالات
۴۷۰		بیسواں باب :- سلطنت کی عمومی صورتیں
"		الف۔ عمومیت بلا واسطہ (قدیمی عمومیت)
۴۷۵		ایکسواں باب :-
"		ب۔ بلا واسطہ عمومیت پر تنقید
۴۸۰		بائیسواں باب :-
"		ج۔ نیابتی عمومیت اور موجودہ زمانے کی جمہوریت

صفحہ نمبر	تعداد	عنوان و مضمون
۳	۲	۱
۳۹۱		ایسٹوئیل باب ۱۔
"		در نیابتی حکومت عوام پر بحث
۳۹۶		چوبیسواں باب ۱۔ سلطنت کی مرکب صورتیں
۵۹۴	۵۰۱	ساتواں مقالہ
"	"	اقتدار اعلیٰ اور اس کے کارکن اعضاء سلطنت کے کمال اور عہد
"	"	پہلا باب ۱۔ اقتدار اعلیٰ کا تصور
۵۰۳		تعلقات
۵۰۵		دوسرا باب ۱۔ قوم یا سلطنت کا اقتدار اعلیٰ اور حکمران کا اقتدار اعلیٰ
۵۱۵		تیسرا باب ۱۔
"	"	الف سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کا تجزیہ
۵۱۹		تعلیق
۵۲۰		چوتھا باب ۱۔
"	"	ب حکمران کا اقتدار اعلیٰ
۵۲۲		پانچواں باب ۱۔ تقسیم اختیارات
"	"	۱) زمانہ قدیم کی ابتدائی مجلسیں
۵۲۳		چھٹا باب ۱۔
"	"	ب سلطنت کے سیاسی فرائض کی قدیم تفویض
۵۲۶		ساتواں باب ۱۔
"	"	ج تقسیم اختیارات کا جدید اصول
۵۳۶		آٹھواں باب ۱۔ خدمات عامہ اور فرائض عامہ

صفحہ نمبر	از صفحہ	عنوان و مضمون
۳	۲	۱
۵۴۱		نواں باب :- عہدہ داروں کا تقرر
۵۴۶		دسواں باب :- سرکاری عہدہ داروں کے حقوق اور فرائض
۵۵۸		گیارہواں باب :- سرکاری ملازمت کا ختم ہونا
— — — — —		

دنیاجہ

تافون اور سیاسیات کا نام ور ماہر اور مشہور مصنف، یوحنا کا سپر لمپلی،
 ان مصنفوں میں نہ تھا جو ساری دنیا سے الگ تھلگ اپنی کوٹھری میں بیٹھے بیٹھے
 نظریے گھڑا کرتے اور اپنی کتابوں کے ڈھیر کے پیچھے بیٹھ کر نئی کتابیں بنایا کرتے ہیں
 بلکہ نے جہاں علم کی دوڑ میں بہتوں کو پیچھے چھوڑا تھا وہاں عمل کے میدان میں بھی ہمیشہ
 سب سے آگے بڑھ کے اپنی سرگردگی کا علم بلند کیا۔ پچیس برس کی عمر میں وہ اپنے وطن
 تیسویش کی جامعہ میں پروفیسر مقرر ہوتا ہے، پچیس برس بعد (ستمبر ۱۸۳۹ء میں) اس
 شہر میں جو سیاسی واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں ان میں وہ شہریوں کے فزوق (یعنی
 کسروینو پارٹی) کے سرگردہ کی حیثیت سے شریک ہوتا ہے اور آگے چل کے ایک
 آزادی پسند کسروینو فزوق کی بنیاد ڈالتا ہے۔ یہ تقریباً وہ زمانہ ہے جب کہ اس کی
 قابلیت کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ ۱۸۴۰ء میں میونیک کی جامعہ نے اوپر
 ۱۸۶۱ء میں ہادی ڈیل برگ کی جامعہ نے اسے پروفیسر کی دعوت دی۔

جسے مانیا پنچ کر اس نے اپنے کو کبھی غیر ملکی نہ جانا بلکہ اول دن سے جرمن
 ہی تصور کیا، اور تعلیم و تربیت کے لحاظ سے وہ تھا بھی جسے ملانی ہی۔ اپنے وقت کو اس نے

۱۸۶۱ء، ریمس، سوئٹزرلینڈ کے شہر تیسویش (زیورچ) میں پیدا ہوا اور اراکین جرمن
 کو کارٹن روٹے (جرمانیا) میں مرا۔

کے لٹری نے اعلیٰ تعلیم کی تحسین جرمانیا میں رکھ کر کی تھی جہاں وہ شہر جرمانی ملانی بنی (Savigny)

صرف پڑھنے پڑھانے ہی میں صرف نہیں کیا بلکہ دوسرے تدبیریں کے ساتھ ساتھ عملی سیاست میں بھی نمایاں کام کرتا رہا۔ بویریا کی مجلس اعلیٰ کا رکن منتخب ہو کر آزاد قومی (نیشنل پارٹی) فریق میں داخل ہو گیا۔ سلاسلہ میں اوروں کے ساتھ شامل ہو کر اُس نے "جرمانی نمایندگان کی مجلس" قائم کی۔ سلاسلہ میں "جرمانی پروٹیسٹنٹوں کی انجمن" کی بنیاد رکھی اور سلاسلہ میں "جرمن قومی قانون کا ادارہ" قائم کیا۔

اُس کی زیادہ اہم تصنیفوں کے شائع ہونے کا سلسلہ سلاسلہ سے شروع ہوا اور آخر تک برابر جاری رہا سلاسلہ میں اُس کی بلند پایہ کتاب، جسے اُس کا "شاہکار" کہنا چاہیے، "عمومی قانون صنعت و تجارتی بنیاد پر" کے نام سے ایک جلد میں شائع ہوئی اور ایسی مقبول ہوئی کہ جلد کئی بار چھپی اور کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔ جب پانچویں اشاعت کی نوبت آئی تو مصنف نے اُس میں بہت زیادہ اضافہ کیا اور زمانہ حال کی سلطنت کا نظریہ "نام رکھ کر اُسے دو جلدوں میں شائع کیا (۱۸۵۷ء) پہلی جلد کا نام "عمومی نظریہ سلطنت" اور دوسری کا "عمومی قانون سلطنت" قرار پایا ساتھ ہی ساتھ مصنف نے ایک اور جلد اضافہ کی اور یہ تیسری جلد "سیاسیات" کے نام سے ایک سال بعد شائع ہوئی۔ بلجی کے مرنے کے پانچ برس بعد پہلی دو جلدوں کی اشاعت چھٹے بار پرومیر لوسنگ کی ادارت میں ہوئی (۱۸۸۷ء)۔

تینوں جلدوں کے فرانسیسی ترجمے کی پہلی اشاعت مصنف کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی (۱۸۵۷ء) اور ایتالیائی ترجمہ اُس کے مرنے کے دو برس بعد (۱۸۶۳ء) چھاپے جانے سے نکلا۔ انگریزی میں فقط پہلی جلد کا ترجمہ ہوا ہے جو پہلے بار ۱۸۵۷ء یا ۱۸۵۸ء میں شائع ہوا اور پھر ۱۸۹۷ء میں بعض خفیف ترمیموں کے ساتھ تیسری اشاعت ۱۹۰۷ء میں ہوئی جو دوسری اشاعت کی محض نقل ہے۔

قاضی تلمذ حسین، صاحب، ایم۔ اے ارکن شعبہ تالیف و ترجمہ، جامعہ عثمانیہ نے اسی انگریزی ترجمے کا اردو میں ترجمہ کیا، جسے جامعہ کی مجلس نصاب تدریس نے بہت پسند کر کے یہ سائنس کی کرسی سے پہلے اردو ترجمے کا مقابلہ اعلیٰ جرمانی میں

Eichhorn

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اور اُن کا سلسلہ مکمل کر دیا

۱۸۵۷ء میں کتاب کی پہلی اشاعت کیلئے زیادہ آئیں پرومیر لوسنگ نے قلمبندی نہیں کی کاموہ بھی انگریزی ترجموں کے پیش نظر تھا۔ فرانسیسی ترجمے سے بھی اُن کو بہت فائدہ ملی۔ (دیکھو انگریزی ترجمے کے دیباچے کا آخری صفحہ)

سے بھی کر لیا جائے اور یہ خدمت میرے سپرد ہوئی میں اس تجویز کو قبول کرنے کی جانب
محض اس خیال سے مائل تھا کہ اکثر حالتوں میں اگر جرمانی زبان سے براہ راست اردو میں
ترجمہ کیا جاتا ہے تو وہ زیادہ شگفتہ ہوتا ہے۔ نسبت اس ترجمے کے جو انگریزی کے واسطے
سے ہوا ہو، پھر بھی ہا میں بھرنے میں مجھے گونہ مائل تھا اس لیے کہ میں اس فن کا ماہر
نہیں جس پر یہ کتاب لکھی گئی ہے اور پھر کتاب بھی ایسی جس کی مثال یورپ کی زبانوں میں
بھی نہیں ملتی۔ انگریزی کا ترجمہ میں مسلم انگریز ماہروں کی اجتماعی محنت اور نقد و تنقید کا
نتیجہ ہے اور اردو کے مترجم صاحب بھی اس فن میں غائر اور وسیع نظر رکھنے کے علاوہ
اردو کے حیدر افشا پر داز اور بڑے کہنہ شوق ترقی کرنے والے ہیں۔ مگر جب میں نے
خود قاضی صاحب ہی کو مصر پاکر ڈرتے ڈرتے پسند و رقوں کا مقابلہ کیا تو انھوں
نے اُسے بہت پسند کیا بلکہ جو خیال میں نے ترجمے کے طرز عبارت کو بدلنے کے متعلق
ظاہر کیا اُس سے بھی انھوں نے اتفاق کیا اور مقابلے کے دوران میں بار بار میری
محنت کی داد دے دے کے ہمت بڑھاتے رہے۔ جو اجزاء میں مقابلہ کر کے شعبہ تالیف
کے دفتر میں بھیجا وہ اُن کی نظر سے گزرتے اور بعض امور کا فیصلہ ہم دونوں کی خط کتابت
سے طے پالیتا تب مسودہ صاف کر لیا جاتا۔ غرض کہ ایک ایک لفظ کو جانچ کر اردو ترجمہ بنایا
گیا۔ یہی وجہ تھی کہ مقابلے کے کام میں کچھ اوپر دو برس لگ گئے۔

انگریزی ترجمہ مجموعی حیثیت سے جڑا نہیں۔ اور بعض مفید حاشیے بھی ترجموں
نے اضافہ کیے ہیں۔ مگر جرمانی متن سے مقابلہ کرنے میں مجھے انگریزی کتاب میں
سقم دکھائی دیے۔

(۱) اکثر مقامات پر اختصار سے کام لیا گیا ہے جس کی طرف مترجموں نے خود ہی
اشارہ کیا ہے۔ کہیں تو متن کے لفظوں سے قطع نظر کہنے کے مطلب کو انگریزی میں ادا کیا
ہے اور کہیں ٹکڑے کے ٹکڑے چھوڑ دیے ہیں۔ یہ ڈھنگ شاید انگریزی
بولنے والے ناظرین کے لیے کچھ بہت بیجا نہ ہو لیکن اردو پڑھنے والوں کے لیے بالکل
نامناسب ہوتا۔ پچھلی جیسے مصنفہ کی عبارت میں اس طرح کا تصرف سراسر غلط ہے

اس قسم کے تصرف کا حق اگر کسی کو ہو سکتا تھا تو وہ چھٹی اشاعت کے فائل مدیر، لوئینگ کو، مگر وہ خود یوں کہتا ہے:—

راقم حروف کے سپرد یہ پرائیز خدمت کی گئی ہے کہ وہ اس نئی اشاعت کو سرانجام دے۔ مگر اس شخص میں اس کی کارگزاری صرف ایک محدود وحیثیت کی ہو سکتی تھی۔ بلنگلی کی یہ کتاب ایسی نہیں ہے کہ محدود معنوں میں ایک درسی کتاب کہی جاسکے، وہ کوئی ایسی کتاب نہیں جس میں سوکھے سلکے فقروں کو ایک دوسرے پر جاجامکے مرہ معلومات کا ایک ڈھیر لگا دیا گیا ہو، نہ وہ کوئی اس ڈھب کی کتاب ہے کہ کسی خاص زمانے میں فن کی جو حالت ہو اس کے لحاظ سے بعض ٹکڑے اس میں سے نکال لیے جائیں اور ان کی جگہ اور ٹکڑے بھرتی کر دیے جائیں۔ اس کتاب کی حالت تو یہ ہے کہ اس کے ہر خط پر مصنف کی انوکھی بصیرت کا سکہ لگا ہوا ہے۔ یہ خصوصیت خاص کتاب کے حجم و جان کا ایک جز ہے (جولگ نہیں کیا جاسکتا)، اور یہ مصنف کا محض احترام ہی نہ تھا جس نے راقم کو تبدیل و تبدیل سے باز رکھا بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ خوب جانتا تھا کہ اس قسم کی دمت اندازی سے کتاب کی قدر و قیمت برباد جائے گی۔ بلنگلی کے قانونی اور سیاسی تدبیر اور کلیسیائی مقصودات سے راقم کی رائیں اکثر کسی قدر مختلف ہیں مگر اس نے اس بات کو ناروا جانا کہ اس محل پر مصنف کی رایوں کا مقابلہ کرے یا اس خلاف کی طرف اشارہ بھی کرے، اگر اس طرح سے وہ اثر کمزور پڑ جاتا ہے مصنف نے اپنی کتاب کے پڑھنے والوں پر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب جیسی پہلے بلا شرکت غیر بلنگلی کی دماغی ملک تھی، اب بھی ہے۔

”راقم نے انیس عبارتوں میں تبدیل اور اضافہ کرنے کی جارت کی جو اصل کتاب کا جز نہ تھیں۔ یہ تدبیر یا ادبی بیانات میں جو پیش پا افتادہ غلطیاں کسی نہ کسی طرح کتاب میں آ داخل ہوئی تھیں وہ دور کردی گئیں۔ اہم واقعات اور قوانین جن کا علم

سے مسلمان کتاب کی چھٹی اشاعت کا دیباچہ، ص ۱۲-۱۳۔

سے یعنی تہیدوں، حاشیوں وغیرہ میں، ص ۶۔

مصنف کو شہادت نہ تھا اُن کی طرف اشارہ کرنا ضروری تھا۔ کتاب میں جو تین اور مصنفوں کی نقل کی گئی تھیں اُن کی تفصیلی نظر ثانی بھی ایک ضروری چیز تھی۔۔۔۔۔ جہاں کہیں کوئی اضافہ کیا گیا ہے۔ وہ کہنی دار خٹوں یعنی [] کے ذریعہ سے ظاہر کر دیا گیا ہے۔

پہلی کی پُر زور اور واضح زبان بھی، جو اسی کا حصہ ہے، بلا کمی و بدل کے اہلی حالت پر قائم رکھی گئی۔ خود اُن مقامات پر بھی پُرانا متن جیوں کا پل رہنے دیا گیا جہاں پہلی نے امانوس لفظوں اور فقروں کا استعمال کیا تھا جو کبھی بعض سولسی علاقوں کی بولی ٹھوکی کو یاد دلادیتے ہیں اور جو ہمیشہ نحو اور طرز تحریر کے نکالی قاعدوں کے مطابق نہیں ہوتے۔ صرف ایسے موقعوں پر خفیف ترمیم تبدیل کرنے کی جرات کی گئی جہاں یقین کیا جاسکتا تھا کہ غلطی کی بنا پر کتابت ہوئی۔

(۲) انگریزی مترجموں نے باجی صرف تین حصے ہی سے کام نہیں لیا بلکہ اگر مصنف کے لفظوں سے دور جا پڑے ہیں اور ترجمے کی عبارت دُشمنی ہو گئی ہے۔ بعض جگہ صرف اس وجہ سے ترجمے کا حق ادا نہ ہو سکا کہ جرمانی لفظوں یا فقروں کے ٹھیک ہم معنی لفظ یا فقرے انگریزی میں مل نہ سکے مگر ایسے مقامات بھی کچھ کم نہیں پائے گئے کہ لفظ انگریزی میں موجود تھے مگر بھی بے پروائی کے ساتھ اُن کی جگہ پر غلط لفظ رکھ دیے گئے۔

(۳) سب سے بڑا ستم انگریزی کتاب میں یہ ہے کہ ترجمے کی ایسی غلطیاں بھی باجی موجود ہیں جنہیں دیکھ کر سوادس کے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ مترجموں کو جرمانی زبان پر عبور نہ تھا۔ مثلاً اہم واحد ہے اور ترجمہ جمع میں کر دیا گیا جس سے مضمون ضبط ہو گیا یا ایک ہی مادے سے دو لفظ مشتق ہیں مگر دونوں کے معنوں میں زمین آسان کا فرق ہے اور مترجموں میں سے کسی ایک کو بھی اس کا احساس نہ ہوا۔

۱۔ انگریزی ترجمے میں لوئیٹنگ کے حاشیوں کو (الف)، (ب)، وغیرہ سے ظاہر کیا ہے اور جو اضافے انگریزی مترجموں نے اپنی طرف سے کیے ہیں وہ کہنی دار خٹوں کے اندر رکھے گئے ہیں مگر اس مول کی پوری پابندی نہیں کی گئی مثلاً دوسرے مقالے کے بائیسویں باب کا حاشیہ ۱۴ نمبر کی طرف سے ہے مگر انگریزی کتاب میں کوئی علامت ایسی نہیں جس سے یہ بات ظاہر ہو سکے۔

(۴) کتابت کی بھی بعض بہت بڑی غلطیاں ہیں جن سے پڑھنے والا یا تو دھوکا کھائے گا یا سخت غلجان میں پڑ جائے گا۔

ان تمام اسقام نے جمع ہو کر اردو میں ترجمہ کرنے والے کے لیے چند در چند صوبوں کا سامان ہمایا کر دیا ہے۔ چنانچہ جب کتاب کے بعض مقامات کا وہ ترجمہ قاضی تلمذ حسین صاحب نے دیکھا جو اصل متن سے راست اردو میں کیا گیا تھا تو انہوں نے مجھے ایک خط میں لکھا:

”بھئی کے متعلق اگر آپ یقین کریں تو اتنا عرض کروں گا کہ بعض مقامات کے ترجمے میں میں خود مترق ہو گیا تھا اور (ٹلاں ٹلاں مقامات)

کا ترجمہ میں نے خود تامل کے ساتھ کیا، مگر میں مجبور تھا۔“

انگریزی ترجمے کی کمزوریوں پر نظر کر کے یہی مناسب معلوم ہوا کہ اصل جرمانی متن کی پوری پیروی کی جائے؛ پس جہاں کہیں میں نے دونوں میں اختلاف پایا اصل کے مطابق اردو ترجمے کو بنا دیا۔ اہم اختلافوں اور حجابے کی غلطیوں کی ایک فہرست مرتب کر دی جو اس دیباچے کے نکلنے کے طور پر کتاب میں شامل ہے۔ جو عبارتیں اور حاشیے اس باعث سے ترجمہ ہونے سے چھوٹ گئے تھے کہ وہ لاطینی، یونانی، فرانسیسی یا ایتالی زبان میں تھے ان کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ جن کتابوں کا حوالہ حاشیوں میں دیا گیا تھا ان کے ناموں کا بھی، جہاں تک ہو سکا، اردو میں ترجمہ کر دیا گیا تاکہ ہر کتاب کا موضوع معلوم ہو سکے۔

جرمانی، فرانسیسی، ہولندی وغیرہ ناموں کی کتابت میں انگریزی تلفظ کا تتبع کہ نام اس غلط ہوتا، اس لیے جو نام جس زبان یا قوم سے متعلق تھا اُسے اُسی کے تلفظ کے مطابق اردو حروف میں لکھ کر دیا گیا کی کوشش کی گئی گو کہ چند در چند وقتوں کے باعث اس میں پوری کامیابی نہ ہو سکی۔ اکثر ملکوں کے نام اردو میں انگریزی تلفظ کے موافق لکھے جاتے ہیں باوجود اس کے کہ اردو بولنے والوں کے لیے وہ از حد ثقیل ہوتے ہیں اور بہتوں سے تو وہ نام پڑھنے بھی نہیں جاتے، جیسے سوٹ زر لینڈ، خود اس ملک کے باشندے اپنے وطن کو اس نام سے نہیں یاد کرتے بلکہ وہاں جو لوگ فرانسیسی بولتے ہیں وہ اُسے سیوس اور جو جرمانی بولتے ہیں وہ ”اشواتس“ کہتے ہیں۔ اردو کے لیے فرانسیسی نام زیادہ مناسب ہے اور اُسے ہم ”ٹومیس“ کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح ”پرشیا“ جس سے اکثر ”پرشیا“ (ایران) کا دھوکا ہوتا ہے، انگریزی میں اس خطے کا نام ہے جس کے باشندے خود اُسے ”پرسس“

کہتے ہیں۔ اردو میں ”پروس“ یا پروسیا ”ہایت موزوں ہے اور یہی اس کتاب میں اختیار کیا گیا تھا، مگر کاتب نے زمانا اور اکثر جگہ اس کو مش کر ہی دیا۔ انھوں نے کراڑو کتاب میں کتابت کی اور بھی غلطیاں ہیں جن کا احاطہ غلط نامہ بھی نہ کر سکا۔ اس کی تالیف یوں ہی بہتر ہوگی کہ اگلی اشاعت کے وقت اصلاح کر دی جائے، اور نظریہ سلطنت ”کئی ایسی کتاب نہیں جس کی دوسری اشاعت کی فوجت بہت دیر میں آئے۔ اس کی سروسنڈا ارباب فن تک محدود نہیں بلکہ ہر موشمند شخص اسے شوق سے پڑھے گا۔

اس موقع پر مجھے یہ بتادینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ ”لائینی“ ”لائینی“ وغیرہ اس سے نہیں لکھے گئے اس لیے کہ یہ لفظ عربی زبان کے نہیں ہیں اور مصر اور شام میں بھی ان کا املاات سے اختیار کیا گیا ہے۔ قاضی ”لنڈسین“ صاحب کو اس میں تامل تھا مگر مبادئ خیالات کے بعد انھوں نے اس املا کو منظور کر لیا۔ بعض اور اختلافات بھی تھے جو بحث مباحثہ کے بعد طے ہوئے۔ کتاب کے نام کے مستطابق میرا خیال تھا کہ ”نظریہ سلطنت“ ہو، اس لیے کہ مجلس وضع اصطلاحات نے State کے لیے ”مملکت“ کا لفظ تجویز کیا تھا لیکن قاضی صاحب ”سلطنت“ کو زیادہ موزوں سمجھتے تھے۔ پس کتاب میں جہاں کہیں ”سلطنت“ کا اقتدا آیا اس کا ترجمہ ”سلطنت“ ہی کیا گیا۔

ع۔ صدیقی

دہاکہ
۱۹۲۰ء

انگریزی ترجمے کے اہم اختلافات جرمانی متن سے

[ہر اختلاف کے نشان سلسلہ کے بعد پہلے انگریزی ترجمے کے صفحے اور سطر کا، پھر قوسین میں جرمانی متن (م) کے صفحے اور سطر کا حوالہ دیا گیا ہے۔ دوسری سطریں اردو (ترجمے) کا صفحہ اور زیر بحث عبارت دے کر اختلاف کی تشریح کی گئی ہے]

(۱) ص ۳۱، س ۱-۲ (م-ص ۳۲، س ۲۳-۲۵)۔

اردو-ص ۳۰: ”... مگر فائق مدبر اور سپہ سالار (یعنی نپولین) نے....“
سلسلہ کلام سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ فائق مدبر اور سپہ سالار سے سوانہ پین کے کوئی دوسرا شخص مراد نہیں ہو سکتا۔ مگر انگریزی ترجمہ جوں نے جرمانی زبان کے اسم و صفت کی گردانوں کی بھول بھلیاں میں پڑ کر دونوں لفظوں ”مدبر“ اور ”سپہ سالار“ کو جمع سمجھ لیا اور غلط ترجمہ کر کے عبارت کو خطہ کر دیا۔ اردو ترجمے میں مزید وضاحت کی غرض سے قوسین میں ”یعنی نپولین“ بڑھا دیا گیا۔

(۲) ص ۳۶، س ۹-۱۱ (م-ص ۳۸، س ۷-۸)۔

اردو-ص ۳۷: ”اور معدلت کا فرض.... منضبط کرے۔“

(۳) ص ۴۴، س ۱۲ (م-ص ۴۵، س ۳۲)۔

اردو-ص ۴۴: ”اس خصلت کا ایک دوسرا....“

ان دونوں مقامات پر اختلاف خفیف ہے۔ اردو ترجمے میں اصل کی پیروی کی گئی۔

(۴) ص ۵۱، س ۲۵ (م-ص ۵۳، شے سے دوسری سطر)۔

اردو-ص ۵۲: ”... متزلزل کر دیا۔“

انگریزی میں ”destroyed“ کے سوا مشکل سے کوئی اور لفظ مل سکتا تھا۔ اردو میں اس کا ترجمہ ہوتا، ”تباہ کر دیا، برباد کر دیا“ مگر یہ ترجمہ اصل متن سے دور جا پڑتا۔ بخلاف اس کے ”متزلزل کر دیا“۔ متن کے لفظ کا ٹھیک مرادف ہے۔

(۵) - ص ۵۱، س ۳۴ (م - ص ۵۲، س ۹) -

اردو - ص ۵۲، س ۲۱، ”۳۱ اکتوبر“

۳۱ اکتوبر صحیح تاریخ ہے، اور ۱۳ اکتوبر سراسر غلط ہے۔ [اردو ترجمہ کی عبارت یوں ہونا چاہئے: ”جس کے آغاز کی تاریخ“.....]

(۶) - ص ۵۳، س ۴-۵ (م - ص ۵۵، س ۲۳-۲۴) -

اردو ص ۵۴، ”..... انھیں پرانے رومی اور آبائی خیالات سے....“ انگریزی میں اسلوب بیان کو بالکل بدل دیا ہے جس کی ضرورت نہ تھی۔

(۷) - ص ۵۳، س ۱۸ (م - ص ۵۶، س ۵) -

اردو - ص ۵۴، س ۱۲، ”بے شک اس انقلاب.....“

انگریزی مترجموں نے یہاں بھی مفرد کو جمع کر دیا (”اس“ کی جگہ ”ان“) جہاں زبانیں واحد و مونث غائب اور جمع مذکر و مونث غائب کے لیے ایک ہی ضمیر استعمال ہوتی ہے اور اردو کی طرح فعل سے فاعل کی وحدت یا جمعیت ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں فعل واحد ہے مگر مترجموں نے توجہ نہیں کی۔

(۸) - ص ۵۵، س ۶-۸ (م - ص ۵۸، س ۵-۹) -

اردو - ص ۵۶، ”عمر کے بڑھتے بڑھتے..... زمانی فاصلے.....“

انگریزی ترجمے میں گو نہ اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

(۹) - ص ۵۵، س ۱۳ (م - ص ۵۸، س ۱۶) -

اردو - ص ۵۶، ”انگلستان کی سی آئینی بادشاہی.....“

متن میں جو ”انگلستان“ کا لفظ موجود تھا اسے انگریزی مترجموں نے ضروری نہ خیال کیا ہو مگر اردو میں اس کے چھوڑ دینے سے ابہام پیدا ہو جاتا۔

(۱۰) - ص ۵۹، جدول ۱، س ۱۴ (م - ص ۶۲، جدول ۱، س ۹-۱۰) -

اردو - ص ۶۱، جدول ۱، ”دماغی آزادی“

انگریزی ترجمے میں ”spiritual“ کا لفظ سراسر غلط ہے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ مترجموں کو جرمانی زبان میں ہر ساری نہ تھی۔ صحیح ترجمہ ہوتا۔

”freedom of thought“ یا ”Intellectual freedom“

(۱۱)۔ ص ۷۷، ۷۸ (م۔ ج ۵۳، ص ۳۶-۳۸)۔

اردو ص ۷۹: ”انسان کے اخلاقی خصائل..... معاشرت کا بھی“
انگریزی میں کسی قدر اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

(۱۲)۔ ص ۸۴، ۸۵ (م۔ ج ۸۹، ص ۱)۔

اردو ص ۸۴: ”تابانوں کی تربیت اور انضباط“
مض۔ Discipline کا لفظ کافی نہیں۔ تن میں ”تابانوں“ کا لفظ بھی موجود ہے۔

(۱۳)۔ ص ۸۸، ۸۹ (م۔ ج ۹۴، ص ۱۲-۱۳)۔

اردو ص ۹۱: ”مادری زبان“۔
تن میں ”مادری زبان“ ہے ”قومی زبان“ نہیں جیسا کہ انگریزی ترجمے میں لکھا گیا ہے۔

(۱۴)۔ ص ۸۹، ۹۰-۹۱ (م۔ ج ۹۵، ص ۱۲-۱۳)۔

اردو ص ۹۲، ۹۱-۹۰۔
مضمون کی ترتیب و تقسیم ہیں انگریزی ترجمے میں جدت کی گئی ہے گویا بھی
جراثیمی اثر کو ترجیح ہے۔ اردو میں اصل کا نتیجہ کیا گیا۔

(۱۵)۔ ص ۹۲، تعلیق ۱ (م۔ ج ۹۸، تعلیق ۱)۔

اردو ص ۹۵، تعلیق ۱: ”قوم کی عمر کے مختلف مدارج.....“
انگریزی میں صرف ”عمر“ ہے حالانکہ اصل میں جمع کا صیغہ ہے مذکورہ کا یہاں ضمیر
کی گروان نے مترجموں کو دھوکا دیا۔

(۱۶)۔ ص ۹۷، ۹۸-۹۹ (م۔ ج ۱۰۳، ص ۱۱-۱۲)۔

اردو ص ۹۱، ۹۲-۹۱۔
انگریزی ترجمے میں دو جگہ مل کر ایک کر دیے گئے ہیں۔

(۱۷)۔ ص ۹۹، ۱۰۰ (م۔ ج ۱۰۵، ص ۳ پیچھے سے)۔

اردو ص ۱۰۳: ”جب بچے نے اپنی ولولہ انگیز تھریڈوں اور ڈسٹ نے
تھریڈوں سے.....“

یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ انگریز مترجموں نے ”تقریروں“ اور ”تقریروں“ کو ”نظروں“ اور ”نکتوں“ کیوں کہ بنا دیا۔

(۱۸)۔ ص ۹۹ خیر سطر۔ ص ۱۰۰ س ۲ (م۔ ص ۴۰۶ س ۳۴۳۰)۔
اردو۔ ص ۱۰۲: ”تمام ملکیتوں خصوصاً آسٹریا..... محض بند کر دیا“
انگریزی ترجمے میں بے جا اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

(۱۹)۔ ص ۱۰۰ س ۱۴ (م۔ ص ۱۰۷ س ۱۳-۱۲)۔

اردو۔ ص ۱۰۴ س ۱۳-۱۲۔

یہاں بھی انگریزی ترجمے میں اختصار کیا گیا ہے۔

(۲۰)۔ ص ۱۰۵ س ۱۸-۱۹ (م۔ ص ۱۱۳ س ۶-۷)۔
اردو۔ ص ۱۱۰: ”اعلیٰ تعمیر سلطنت..... محدود نہیں رکھتی۔“
یہاں بھی انگریزی عبارت مختصر اور مبہم ہو گئی ہے۔

(۲۱)۔ ص ۱۰۷ س ۱۰ (م۔ ص ۱۱۶ س ۱۶)۔

اردو۔ ص ۱۱۲: ”قوم اپنے نمونے مختلف مراحل میں زندگی بسر کرتی ہے۔“
انگریزی ترجمہ یہاں بھی تشنہ رہ گیا۔

(۲۲)۔ ص ۱۱۰ س ۷ (م۔ ص ۱۱۹ س ۱۷)۔

اردو۔ ص ۱۱۶: ”بخلات اس کے ایک صحتور، خوش حال اور تربیت یافتہ....“
انگریزی ترجمے میں ”خوش حال“ کے لیے ”beneficient“ کا لفظ لایا گیا ہے جو غلط ہے۔

(۲۳)۔ ص ۱۱۳ س ۵ (م۔ ص ۱۲۲ س ۱۶، ۱۸)۔

اردو۔ ص ۱۲۰ س ۵-۴: ”ٹووری نظام سلطنت یونی..... سے جدا“
اس مقام پر انگریزی ترجمے میں ایک پورا جملہ چھوڑ دیا گیا ہے جو اردو خواں طبقہ کے لیے خصوصاً بہت ضروری ہے۔

(۲۴)۔ ص ۱۱۵ س ۱۷ (م۔ ص ۱۲۵ س ۱-۲)۔

اردو۔ ص ۱۲۲: ”ہندو معتقدات کے مطابق“

یہ جملہ محض اہل میں موجود ہے مگر انگریزی ترجمہ کرنے والوں نے حذف کر دیا تھا۔

(۲۵) ص ۱۲۱، س ۳۰-۳۱ (م-ص ۱۳۱، س ۲۲-۲۳)
اردو ص ۱۲۹، س ۵-۶ ”وہ قلعوں (یا گڑھیوں) میں رہنے کے شائق
ہوتے اور شہروں میں بھی بلند مقامات کو اختیار کرتے تھے“
جرمانی زبان میں ”بزرگ“ قلعے یا گڑھی کو کہتے ہیں اور تن میں یہی لفظ ہے۔
ایک دوسرا لفظ ہے ”بیزرگ“ جس کے معنی ہیں ”پہاڑ“ انگریز مترجم دونوں میں
امتیاز نہ کر سکے گو کہ دونوں کے ہجوں اور تلفظ میں فرق ہے۔

(۲۶) ص ۱۲۲، س ۳۰ (م-ص ۱۳۲، س ۲۵)
اردو ص ۱۳۰: ”مسما سارہ گئی“
انگریزی ترجموں نے غالباً ایک دوسرے لفظ کا دھوکا کھا کر ”Doubtful“
ترجمہ کر دیا جو صحیح نہیں۔

(۲۷) ص ۱۲۲، س ۲۰ (م-ص ۱۳۴-۱۳۵)
اردو ص ۱۳۲: ”اُن کا کام یہ تھا..... اور کریں گے تو کس حد تک؟“
انگریزی ترجمے میں بیجا اختصار کیا گیا ہے۔

(۲۸) ص ۱۳۲، س ۳۲ (م-ص ۱۳۳)
اردو ص ۱۴۱، س ۱-۲: ”البتہ اُس گروہ.....“
یہاں بھی انگریزی ترجمہ درست نہیں۔ تن میں امرار کا طبقہ مراد ہے نہ کہ عام
رعایاء

(۲۹) ص ۱۳۳، س ۱ (م-ص ۱۴۳، س ۲۲)
اردو ص ۱۴۱: ”ایسی مثالیں بھی کچھ کم نہیں.....“
انگریزی ترجمے کا ”بعض اوقات“ کافی نہیں۔

(۳۰) ص ۱۳۳، س ۱۸-۱۹ (م-ص ۱۴۲، س ۹-۱۰)
اردو ص ۱۴۱، س ۱۶-۱۸
انگریزی ترجمے میں اختصار کو دخل دیا گیا ہے۔

(۳۱) ص ۱۳۳، س ۱ (م-ص ۱۴۵، س ۲-۱)
اردو ص ۱۴۲: ”سفری فرانس نے..... کر لی۔“

انگریزی میں ایک پورا جملہ چھوٹ گیا ہے یا چھوڑ دیا گیا۔ یہ کمی بھی اصل متن سے پوری کی گئی۔

(۳۲) - ص ۱۳۴، س ۲۰ (م - ص ۱۴۵، س ۲۵ - ۲۶)۔

اردو - ص ۱۴۳، س ۱۔

انگریزی ترجمہ مبہم ہے۔

(۳۳) - ص ۱۵۳، س ۳۳ - ۳۴ (م ص ۱۶۹، س ۱۳ - ۱۵)۔

اس اختلاف کے متعلق دیکھو اردو، ص ۱۶۲، س ۷ - ۸ اور حاشیہ۔

(۳۴) - ص ۱۹۱، س ۱۶ - ۱۷ (م - ص ۲۱۱، س ۳۰ - ۳۱)۔

اردو - ص ۱۹۸، س ۱۹ - ۲۲، "خود حکمرانی کرنے کی قابلیت اُن میں نہیں ہے۔ یہاں کہیں اُن کو اس کوشش کا موقع ملا۔۔۔۔۔ وہاں سلطنت کی حالت اُس آدمی کی سی ہو گئی جو سر کے بل کھڑا ہو اور ٹانگیں اوپر کو ہوں۔"

اردو میں اصل کا لفظی ترجمہ بول چال کے بالکل مطابق ہو گیا۔ انگریزی میں ایسا نہیں ہو سکا۔

(۳۵) - ص ۲۰۰ (م - ص ۲۲۳)۔

اردو - ص ۲۰۷ - ۲۰۸۔

انگریزی میں بہت اختصار کیا گیا ہے۔ اردو میں متن کا پورا ترجمہ ہے۔

(۳۶) - ص ۲۰۰، س ۲۲ (م - ص ۲۲۳، نیچے سے چوتھی سطر)۔

اردو - ص ۲۰۸، س ۳، "اس قسم کی۔۔۔۔۔"

اصل متن میں "قانونی" کا لفظ نہیں ہے۔

(۳۷) - ص ۲۲۱، س ۲۳ (م - ص ۲۵۳، س ۲۳)۔

اردو - ص ۲۴۱ - دیکھو حاشیہ ۲۔

(۳۸) - ص ۲۲۷، س ۲۲ (م - ص ۲۵۸، س ۲۵ - ۲۶)۔

اردو - ص ۲۳۶، س ۴، "خود ایک ہی تسلیم کے اندر"

انگریزی مترجموں نے جانے "مستدل تسلیم" کیوں کر لکھ دیا۔

(۳۹) - ص ۲۴۷، س ۱۸ (م - ص ۲۸۵، س ۲۸)۔

اردو۔ ص ۲۵۸، س ۱۰، "تا دیب خانوں"
انگریزی ترجمے میں جو "قید خانوں" لکھا گیا ہے سراسر متن کے خلاف ہے۔
(۴۰)۔ ص ۳۱۲، س ۵ (م۔ ص ۳۵۳، س ۱۸)۔
اردو۔ ص ۳۲۹، س ۱۲، "جنگی زندگی کا منبع وہی ہے۔۔۔۔۔"
"guided" غلط ترجمہ ہے۔ اُس کے مقابل جو جرمانی لفظ ہے اُس کے معنی مشتق
یا "ماخوذ" ہیں۔

(۴۱)۔ ص ۳۲۳، س ۲۳ (م۔ ص ۳۶۶، س ۱۰)۔
اردو۔ ص ۳۲۲، س ۱۶، "مزدوری کرنے والوں۔۔۔۔۔"
انگریزی ترجمے میں "مزدور" کے لیے "کارگر" لکھا ہے جو صحیح نہیں۔
(۴۲)۔ ص ۳۶۱، س ۷ (م۔ ص ۴۰۶، س ۱۱)۔
اردو۔ ص ۳۸۰، س ۲، "ارکانِ ملت"
انگریزی والوں نے "ارکانِ ملت" کو "ارکانِ مملکت" بنا دیا۔

(۴۳)۔ ص ۳۶۳، س ۱۴ (م۔ ص ۴۰۹، س ۱۳)۔
اردو۔ ص ۳۸۱، س ۱۸، "جرمانیوں۔۔۔۔۔"
انگریزی والوں نے جرمانیوں کو "رومیوں" کر دیا۔
(۴۴)۔ ص ۳۹۲، س ۱۷-۱۹ (م۔ ص ۴۴۳، س ۸-۱۱)۔

اردو۔ ص ۴۰۵، س ۹-۱۱، "نئے علمائے قانون۔۔۔۔۔ اور خاص کر (پیرس
اور صوبہات کی) شاہی۔۔۔۔۔ بڑی مدد دی۔"
اردو ترجمے میں متن کی پیروی کی گئی اور جو عبارت انگریزی ترجمے میں زائد تھی وہ
توسین میں رکھی گئی۔

(۴۵)۔ ص ۴۰۹، س ۴ (م۔ ص ۴۶۵، س ۲۱، ۲۲)۔
اردو۔ ص ۴۲۲، "اب ضرورت سے مجبور ہو کر لوگوں نے جمہوریہ کا اعلان کر دیا۔"
اُس کے بعد ہی۔۔۔۔۔
"مگر" سے پہلے کے الفاظ انگریزی ترجموں نے چھوڑ دیے حالانکہ وہ ضروری تھے
(۴۶)۔ ص ۴۱۹، س ۶ (م۔ ص ۴۷۸، خیر سطر)۔

۱۱ دو۔ ص ۴۳۱۔ نیچے سے تیسری سطر، ”۵۔ رد سمبر“
 تن میں ”۵۔ رد سمبر“ ہے مگر انگریزی ترجمے میں ”۵۔ اکتوبر“

(۴۶)۔ ص ۴۳۱ اس ۱-۲ (م۔ ص ۴۹۲، اس ۱-۲)۔

اردو۔ ص ۴۴۴، اس ۱، ”آئینی شاہی کا تصور یہ ہوتا ہے کہ....“
 انگریزی ترجمے میں ”must“ کا لفظ تن کے مفہوم کو صحیح ادا نہیں کرتا۔

(۴۸)۔ ص ۴۴۰، اس ۱۲ (م۔ ص ۵۴۰، اس ۱۸)۔

اردو۔ ص ۴۸۱، اس ۴-۵ ”زمین کے وسیع قطعات پر کم تعداد آبادی کو بھلا کر
 انھیں قابل پیداوار بنایا تھا۔“
 انگریزی ترجمہ تن کے برعکس ہے۔

(۴۹)۔ ص ۵۳۲، اس ۲۸ میں جو جملہ ختم ہوتا ہے اس کے بعد تن کے بعض جملے چھوڑ دیے
 گئے ہیں اور نو سطروں کا خلاصہ ڈیڑھ سطر میں کر دیا گیا ہے۔ آگے کی سطروں
 میں بھی بہت اختصار کیا گیا ہے۔

(۵۰)۔ ص ۵۳۳ کی سطر ۱۱ سے لیکر سطر ۱۵ تک جو عبارت ہے وہ بھی اصل کی ۲۶ سطروں کا
 خلاصہ صرف ۶ سطروں میں ہے۔

(۵۱) جن اختلافات کی بنا، کتابت یا چھاپے کی غلطیوں پر ہے وہ اگلے صفحے پر درج ہیں۔

انگریزی کتاب میں چھاپے یا کتاب کی غلطیاں

صفحہ سطر غلط صحیح

۱۶۸۸ (اردو میں ۵۴، ص ۱۱)	۱۶۶۸	۱۸	۵۳
(اردو میں ۶۷، ص ۶۷)	دو نوکسن غلط درج ہیں تحقیق	۲	۶۴ (حاشیہ ۱)
(حاشیہ ۱، ص ۱-۱)	کی گئی تو وہی سن درست نکلے جو		
	جرمانی متن میں درج ہیں۔		

Pufendorf	Puffendorf	۲۲	۶۶
milder (اردو میں ۲۵، آخر سطر)	wilder	۱۹	۲۲۷
Klüber	Klober	۲	۲۵۲ (حاشیہ ۷)
eternal (اردو میں ۳۱، ص ۱۱-۱)	external	۹	۲۹۸
Chapters XIV—XVI,	Chapter XVII,	انہر	۲۳۳ (تخلیق)
wergeld	wergild	۷	۳۶۱
Volksthing	Folkething	۱۱	۴۱۵
	(نویں حاشیہ کا ہندسہ متن کی سطر ۷ کے بجائے سطر ۲۷ کے آخر میں	۰	۴۳۷

ہونا چاہیے تھا۔)
تمام کتاب میں جرمانی لفظ "staat" کو "stat" لکھا ہے جو درست نہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تمہید

پہلا باب

علم الیسا است

علم الیسا است
کی تعریف

اپنے مفہوم صحیح میں علم الیسا است وہ علم ہے جس کا بحث سلطنت ہے اور جس کا مقصود یہ ہے کہ سلطنت پر اس طرح غور کیجئے اور اس کو ایسے واضح طور سے سمجھ لیجئے کہ سلطنت کی بنیاد اس کی حقیقت و باہیت، اس کے مختلف اشکال و مظاہر اور اس کے نشو و نما سب پر احاطہ ہو جائے۔ پس بہت سے علوم جو بہا و اوقات علوم سیاسیہ میں شمار کیے جاتے ہیں حقیقتہً اس علم میں داخل نہیں ہیں گو کہ ان کو بھی سلطنت سے ایک تعلق ہے اور علم الیسا است کے احاطہ میں اس کی حیثیت سے ان پر کھانا کرنا بھی لازمی ہے۔ اس قبیل کے علموں میں سے حسب ذیل علوم خاص طور پر ذکر کر کے قابل ہیں:-

اس میں بعض
وہ علوم شامل
نہیں ہیں جو
اس علم سے
مساوی ہیں

(الف) کسی قوم یا ملت کی ایسی تاریخ جو اس کی خالص سیاسی یا آئینی تاریخ نہیں ہے بلکہ جو اس قوم کی رہنمائی کے عام واقعات اور اس کے افراد کے اعمال و افعال کا حال بیان کرتی ہے اور علوم و فنون، اقتصادی حالات، اخلاقیات، سفارتی اور سیاسی جدوجہد اور جنگی واقعات سے بحث کرتی ہے۔ یہ سب چیزیں علم الیسا است میں شامل نہیں ہیں۔

(ب) اور نہ ایسے شمار و اعداد جو خالص سلطنت سے متعلق نہیں بلکہ معاشرتی اور شخصی حالات کو بھی شامل ہیں۔

(ج) اور نہ معاشیات (یا اقتصادیات) جہاں تک کہ اس کا تعلق ان اقتصادیات و قوانین کی تحقیق سے ہے جو صرف سلطنت پر نہیں بلکہ ہر شخص پر عائد ہو سکتے ہیں،

باب

(۵) اور نہ نظم معاشرت کا مطالعہ، جہاں تک کہ معاشری زندگی خود اپنے حال پر چل رہی ہو اور اُس نے سلطنتی زندگی کی صورت نہ اختیار کر لی ہو۔

قدیم یونانی پولیسی (یعنی پالیس) کا لفظ ہر قسم کے علم سیاست کے لئے استعمال کرتے تھے، ہم (جرمانی) قانون سیاسی (یعنی قانون عامہ) اور سیاسیات میں حقیقہ کے ساتھ امتیاز کرتے اور اُن دونوں کو دو مستقل علم قرار دیتے ہیں اور اُن کے علاوہ کئی مخصوص علموں مثلاً سیاسی شمار و اعداد، قانون نظم و نسق، قانون بین الاقوام، انتظام کو توالی وغیرہ کو مختص ناموں کے ساتھ اُن دونوں مذکورہ بالا علموں کے پہلو بہ پہلو قائم کرتے ہیں۔

علم سیاسیات
قانون عامہ
اور سیاسیات
میں منقسم ہے

قانون سیاسی (یعنی قانون عامہ) اور سیاسیات دونوں کے دونوں فی الجملہ سلطنت ہی سے بحث کرتے ہیں مگر اُن دونوں میں سے ہر ایک علم سلطنت پر جدا گانہ پہلو سے اور جدا گانہ طریق پر نظر کرتا ہے سلطنت کو زیادہ خوبی کے ساتھ سمجھنے کے لئے علم و حکمت نے اُس کے دو اہم پہلوؤں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے۔ ایک اُس کا نفس و جوہ اور دوسرے اُس کے حرکات زندگی اس لئے کہ جب اجزا کی جانچ پر کچھ جدا جدا ہو جائے تو پوری چیز کو زیادہ خوبی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔ اس طریق عمل میں نہ صرف نظری بلکہ عملی نوآئد بھی ہیں قانون کی وضاحت اُس کی وسعت اور اُس کی قوت میں اُس وقت سے بہت نمایاں ترقی ہو گئی ہے جب سے کہ وہ سیاسیات سے قطع طور پر مجیز کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح سیاسیات کو بھی اسی وقت سے اپنی وسعت میں آزادی کے ساتھ ترقی کرنے کا موقع ملا جب سے کہ اُس کی جدا گانہ حیثیت کا مشاہدہ اور اندازہ کیا جانے لگا۔ قانون عامہ سلطنت کے مضبوط وجود اور صحیح انتظام پر نظر کرتا ہے اور سلطنت کی عضوی تنظیم اُس کی حیات کے دائمی شرائط، اُس کی ہستی کے ضوابط اور سلطنتی تعلقات کی ضرورت کے متعلق گفتگو کرتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ قانون عامہ سلطنت سے کما ہی بحث کرتا ہے۔

بخلاف اس کے سیاسیات سلطنت کے حرکات زندگی اور نشو و نما پر نظر کرتی ہے۔ اور اُن مسائل کی نشاندہی کرتی ہے جو عصرِ معاصر عامہ کا فرن ہوتی ہیں ایسی راہیں بتاتی ہیں جن سے ان منزلوں تک رسائی ہوتی ہے اور وہ تدبیریں سوچتی ہیں جن سے حصول مقاصد ممکن ہو و واقعات پر قانون کے عمل و اثر کا مشاہدہ کرتی اور اس امر پر غور کرتی ہے کہ مضمر نتائج سے حفاظت اور موجودہ انتظامات کے تقاضوں کی اصلاح کس طرح ہو سکتی ہے۔ الغرض سلطنت کی زندگی کافی اور سلطنت کی عملی کیفیت کو سیاسیات کہتے ہیں۔

پس قانون عامہ کو سیاسیات سے وہی واسطہ ہے جو انضباط کو آزادی سے، جو تعلقات سے، جو سکون تعین کو ان کی پرپیچ حرکت سے یا جو اجسام کو ان کے افعال اور ان کے مخافت و ہمتی حرکت سے ہے۔

قانون عامہ اور سیاسیات دونوں میں اخلاقی جزو بھی شامل ہے، سلطنت ایک اخلاقی چیز ہے اور اس کے کچھ اخلاقی فرائض بھی ہیں مگر قانون اور سیاسیات کا تعین محض اخلاقی قوانین سے نہیں ہوتا اور نہ کلیتہً اخلاقی قوانین سے، وہ فی نفسہ مستقل علوم ہیں، محض فلسفہ اخلاق کی تفصیل نہیں ہیں بلکہ ان کی بنیاد سلطنت پر ہے اور سلطنت ہی ان کی غایت ہے، یعنی وہ سیاسی علوم ہیں بخلاف اس کے اخلاقیات کوئی سیاسی علم نہیں اس لئے کہ اخلاقیات کے بنیادی اصول سلطنت پر مبنی نہیں بلکہ اس کا وسیع تر پایہ عام انسانی فطرت پر اور اس کی ارفع و اعلیٰ بنیاد خدائی نظام عالم اور قصداً و قدر پر قائم ہے۔ قانون عامہ اور سیاسیات کو ایک دوسرے سے بالکل ہی جابجی کر دینا چاہیے سلطنت واقعہ ایک زندہ چیز ہے یعنی وہ قانون اور سیاسیات کی جامع ہوتی ہے، قانون بھی کلیتہً جامد اور ناقابل تبدیل نہیں ہے (اور دوسری طرف) سیاسیات کا محرک سکون کی جانب راجع ہے۔ معہذا قانون محض ایک نظم ساکت نہیں ہے بلکہ اس کی ایک تاریخ بھی ہے اور اس کے علاوہ قانون سازی کی سیاسیات بھی ایک چیز ہے۔ جہاں کہیں عضوی (یا ذی حیات) وجود دکھائی دے وہاں ہمیشہ قانون اور سیاسیات کا اثر ایک دوسرے پر پڑتا ہے جو فرق ہم نے تسلیم کیا ہے وہ اس طرح ساکت نہیں ہو جاتا بلکہ اور زیادہ خوبی کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ قانون کی تاریخ اور سیاسی تاریخ میں صحیح فرق یہی ہے کہ قانون کی تاریخ اپنے تئیں صرف سلطنت کی مودلہ اور قائم شدہ ہستی کے نشوونما کے اظہار اور اس کی مستقل تنظیمات و قوانین کے پیدا ہونے اور ان کے تغیر کے اعلان تک محدود رہتی ہے لیکن سیاسیات کی تاریخ قوم کی تغیر پذیر قسمت آزمائیوں، اس کی گونا گوں حالتوں مدبڑوں کی نیات و اعمال اور قوم اور مدبڑوں و دونوں کی کارروائیوں اور مصیبتوں خصوصیت کے ساتھ زور دیتی ہے اور اسی پر نہایت متحرک انسانی زندگی کو بیان کرتی ہے۔ قانون عامہ کا سب سے اعلیٰ اور سب سے خالص اظہار نظام سلطنت (یعنی قانون اساسی) کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ سیاسیات کا سب سے روشن اور سب سے پر حیات ظہور خود سلطنت کی عملی کار فرمائی (یعنی حکومت) میں نظر آتا ہے۔ اس لئے سیاسیات میں علم کے بنسبت فن کی حیثیت زیادہ نمایاں ہے پس سیاسیات کے لئے قانون کو (بطور اصول متعارف کے) پہلے ہی سے مان لینا لازم ہے کیونکہ سیاسیات کی آزادی

اخلاق عامہ

قانون عامہ

اور سیاسیات کا

فرق۔

قانون اور

سیاسیات

کے باہمی تعلقات

باب

کے لئے اگرچہ قانون ہی ایک اکیلی شرط نہیں ہے مگر پھر بھی ایک بنیادی شرط ضرور ہے۔ سیاسیات کو اپنی رفتار میں حدود قانونی کا لحاظ رکھنا لازم ہے اس لئے کہ وہ زندگی کی بدلتے والی ضروریات کا اہتمام اپنے ذمہ دہی سے دوسری جانب قانون کو سیاسیات کی امداد کی ضرورت رہتی ہے۔ تاکہ وہ موت کی سی افسردگی سے محفوظ اور زندگی کی ترقیوں کے ہم قدم رہ سکے سیاسیات کے روح پرور انھاس کے بغیر پھر قانون ایک جسد بے روح ہوگا اور قانون کے آثار و حدود کے بغیر سیاسیات بے لگام خود غرضی اور ہلاک کن ہوسوں میں پڑ کر تباہ ہو جائے گی۔ محض وضاحت اور آسانی بیان کے لئے نظر پهلطنت کے ان دو فرعی علموں یعنی قانون عامہ اور سیاسیات کے قبل ہم علم سیاسیات کے ایک تیسرے بلکہ سب سے مقدم جزو کو پیش کرتے ہیں۔ یہ فرع عمومی نظریہ سلطنت ہے اس میں ہم سلطنت کو قانون و سیاسیات کی دو حیثیتوں میں ممیز کے بغیر اس پر مجموعہ نظر کرتے ہیں۔ سلطنت کا تصور اس کی بنیاد اس کے خاص اجزاء (ملک و قوم) اس کے پیدا ہونے اور ترقی پانے کی کیفیت اس کی غرض و غایت اس کے نظام اساسی کی خاص شکلیں اس کے اقتدار شاہی کی تعریف اور تنظیم عضوی یہی عمومی اصول سلطنت کے موضوعات ہیں اور پھر اپنی باری میں ہی عمومی نظریہ سلطنت علم سیاسیات کے دو خاص اجزاء یعنی قانون عامہ اور سیاسیات کی بنیاد ہے۔

اس تصنیف کا پہلا حصہ عمومی نظریہ سلطنت کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ قانون عامہ کے لئے اور تیسرا حصہ سیاسیات کے لئے ہے۔

دوسرا باب

علمی تحقیق کے طریقے

صحیح و غلط
طریقے

سلطنت کے متعلق علمی تحقیق و تفتیش مختلف نقطہائے خیال اور مختلف طریقوں سے اختیار کی جاسکتی ہے علمی تحقیق کے صحیح طریقے دو ہیں اور انہیں دونوں طریقوں کی افراط یا تفریط سے دو غلط طریقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ صحیح طریقوں کو ہم فلسفیانہ اور مورخانہ کر سکتے ہیں۔ انہیں دونوں طریقوں کی کسی اہم خصوصیت کو مبالغے کی حد تک پہنچانے سے فاسد طریقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس مبالغے سے فلسفیانہ طریق تخیل مجرّد کی اور مورخانہ طریق تفطن محض کی مضحکہ خیز صورت اختیار کر لیتا ہے۔

تخلّص پستی

ان دونوں طریقوں کا یہ اختلاف کچھ تو قانون اور سیاسیات کے خصوصیات ذاتی سے وابستہ ہے اور کچھ ان لوگوں کے ذہنی میلان کے اختلافات سے تعلق رکھتا ہے جو ان مباحث کے مطالعہ میں مشغول رہے ہیں۔ تمام قوانین اور جملہ سیاسیات ایک تخیلی پہلو رکھتے ہیں جو ایک اخلاقی و روحانی عنصر ہوتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ ایک حقیقی بنیاد پر مبنی ہوتے ہیں اور ایک مادی شکل اور قیمت بھی رکھتے ہیں اور اسی آخر الذکر پہلو کے سمجھنے میں تخیل سب سے غلطی ہوتی ہے اور وہ اُس سے بے پروا ہو جاتے ہیں، وہ ایک سیاسی اصول کی بالکل مجرّد صورت کو اپنے سامنے رکھ دیتے ہیں اور اُسی سے منطقی نتائج کا نکالنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس کا کچھ لحاظ نہیں کرتے کہ نظام سیاسی کے حقیقی واقعات کیا ہیں۔ افلاطون تک اپنی کتاب سیاست مدن میں اس غرض سے نہ بچ سکا اور ایسی رائیں اختیار کر لیں جو سراسر فطرت انسانی اور حواج بشری کے خلاف واقع ہوئی ہیں تاہم وہ اپنی علوئے طبیعت اور لطافت پسندی کی وجہ سے

لہٰذا میں اس موقع پر (Republic) کا ترجمہ سیاست مدن کے لفظ سے کیا ہے کیونکہ وہی پہلوک سے یہاں مراد جمہوریت نہیں ہے بلکہ یہ کتاب انتظام مدن سے متعلق ہے۔

باب

ان نہایت لایعنی کلیات کے قائم کرنے سے محفوظ رہا جن کو ہم مصنفین حال کے فلسفہ سیاسی میں بکثرت پاتے ہیں سلطنت ایک زندہ اخلاقی عضو ہے نہ کہ ٹھیک منطوق کی پیداوار اور قانون عامہ تختی خیال آرائیوں کے مجموعہ کا نام نہیں ہے۔

یہ طریقہ جب تک نظریات کی حد میں رہتا ہے اس سے بے سود نتائج پیدا ہوتے رہتے ہیں اور جب عملیات کی سرحد میں قدم رکھتا ہے تو جگہ ہوئے (غلط) خیالات کو نہایت ہی خطرناک اثر بخشنا اور موجود الوقت سیاسی تنظیمات کے نقص و تخریب کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔ انقلاب کے زمانے میں چونکہ لوگوں کے جذبات بالکل بے قید ہو جاتے ہیں اس لئے وہ انھیں خیالی اصولوں کی طرف راغب ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ انھیں یہ امید ہوتی ہے کہ ان اصولوں کی مدد سے وہ قانونی قیود سے آزاد ہو جائیں گے۔ اس قسم کی تخیل پرستی بہت آسانی کے ساتھ خطرناک قوت حاصل کر لیتی ہے جس میں خود کسی نئی تنظیم کے پیدا کرنے کی قابلیت نہیں ہوتی مگر جو ایک دیو کی طرح ان تمام چیزوں کو برباد کر دیتی ہے جو اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ فرانسیسی انقلاب اپنے پُر جوش قہات کے ذریعے اس رائے کی صداقت کے عبرت ناک ثبوت دینا کے سامنے پیش کر چکا ہے اور نیپولین کا یہ کہنا غلط نہ تھا کہ "ابعد الطبیعیات والوں اور خیال پرستوں نے فرانس کو بتا دیا کہ آزادی و مساوات" کے خیالی خط نے فرانس کو برباد کر دیا اور اس میں خون کی ندیاں بہا دیں اسی طرح اصول شاہی کے نظریہ محض کے مسلح غلبے نے جرمانیا کی سیاسی آزادی کو دبا دیا اور اس کی طاقت کی ترقی کو روک دیا۔ اب اس زمانے میں قومیت کے خیالی اصول کو عملی صورت میں لانے کی کوشش نے تمام یورپ کے امن کو خطرے میں ڈال رکھا ہے صحیح سے صحیح اور مفید سے مفید خیالات جب تخیل پرستوں کے دماغوں میں سما جاتے ہیں اور وہاں سے نکل کر تنگ ظرف کٹھروں کے تختہ مشق بنتے ہیں تو ان سے سوائے نقصان کے کوئی نفع نہیں ہو سکتا۔

تظن

خالص تظنی طریقہ دوسری جانب کی یکطرفہ افراط کا نتیجہ ہے اور صرف ظاہری حیثیت قانون کے الفاظ اور مرئی واقعات سے غرض رکھتا ہے علمی حیثیت سے اس طریقے کا زیادہ سے زیادہ نفع یہ ہے کہ ترتیب نتائج کے لئے کثرت کے ساتھ مواد فراہم ہو جائے علمی سیاسیات میں اس طریقے کے ماننے والے بڑی تعداد میں پیدا ہو جاتے ہیں خاص کر مطلق انغان حکومت کے عہدہ دار اسے بہت پسند کرتے ہیں۔ یہ تظنی طریقہ اگرچہ تخیلی طریق کی طرح تمام سلطنت کو یکدم

باب

سے خطرے میں نہیں ڈال دیتا تاہم انصاف کی شمشیر ابدار کو زندگ آلود کر دیتا، مفاد عامہ میں ہر طرف سے خارج ہو جاتا اور بہت سے چھوٹے چھوٹے تقاضاں پیدا کر دیتا ہے۔ سلطنت کی اخلاقی قوت کو کمزور کر دیتا اور اس کی صحت میں ایسا انحطاط پیدا کر دیتا ہے کہ نازک وقتوں میں سلطنت کا بچنا دشوار بلکہ سمجھی سمجھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ اگر تخیلی طریقے پر عمل کرنے سے سلطنت مرض کی بحرانی کیفیت میں مبتلا ہو جاتی ہے تو تیفننی طریقہ اُسے مرض امراض کا شکار بنا دیتا ہے۔

مورخانہ طریقہ

تقفننی طریقہ پر مورخانہ طریقے کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے محض موجود الوقت تنظیمات اور وقتی واقعات کے آگے تسلیم خم نہیں کر دیتا بلکہ ماضی و حال کے اندرونی تعلقات، قومی زندگی کے عضوی نشوونما، تاریخ کے مختلف کردہ اخلاقیات سب کی معرفت حاصل کرتا اور ان کی توضیح پیش کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ طریقہ بھی حقیقی واقعات پر مبنی ہے مگر وہ ان واقعات کو مردہ نہیں بلکہ ایک زندہ چیز سمجھتا ہے۔

فلسفیانہ طریقہ

اسی صحیح مورخانہ طریقے کے ساتھ صحیح فلسفیانہ طریقہ بھی ہم رشتہ ہے جو صرف تئیں مجرد پر نہیں بلکہ اور اک واقعات پر مبنی ہے اور اسی لئے اس میں تخیلات و واقعات دونوں کے دونوں ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر مورخانہ طریقے کی بنیاد ظاہری واقعات اور ان کے ارتقا پر ہے تو فلسفیانہ طریقے کی بنیاد انسانی طبائع کے سمجھنے پر ہے، اور اسی نقطہ نظر سے ارادہ انسانی کے ان مظاہر کو دیکھتا ہے جو تاریخ کے دریغے نمودار ہوتے ہیں۔

اعلیٰ درجے کے

لکھنے والوں نے

ان دونوں طریقوں

کو جمع کیا ہے

بالغ نظر علمائے فن میں سے بیشتر اپنے رجحان فطری کے باعث کسی ایک جانب مائل ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم نکلیں گے جنہوں نے دونوں طریقوں کو جمع کیا ہو۔ اس زمرے میں خاص طور پر منزلت کا مستحق ہے اُس کی کتاب "سیاسیات" اگرچہ تاریخ عالم کے عطفو لیست میں لکھی گئی تھی جبکہ سلطنت کو یہ نشوونما اور ترقی حاصل نہیں ہوئی مگر یہی کتاب دو ہزار برس سے سیاسی حکمت کا پاکیزہ ترین سرچشمہ بنی ہوئی ہے، سیمسرو نے اپنے طرز استدلال اور انداز بیان میں رومیوں سے زیادہ ذی جوہر یونانیوں کا فلسفیانہ اسلوب اختیار کیا ہے مگر اُس نے اپنی تصنیف کے بہترین اجزاء کا مواد و مہم کی علمی سیاسیات سے اخذ کیا اور اس کا ایسا کرنا بالکل بجا تھا۔ زمانہ حال کے لکھنے والوں میں بودین (فرانسیسی) و کیو (اطالی) اور بیکن فلسفیانہ اور مورخانہ دونوں طریقوں کے جامع کہے جانے کے مستحق ہیں۔ ہر یک جس طرح اپنی تصنیع ابلیاتی کی شان اور لادریزی میں سیمسرو سے مشابہت رکھتا ہے اُسی طرح وہ اپنے

باب

ملک کے علم سیاست کے اصول کو اپنے ہی ملک کی تاریخ اور اپنی ہی قوم کی زندگی سے اخذ کرنے اور ان کو فلسفیانہ عظمت اور عالمانہ ثبوت کے ساتھ بیان کرنے میں بھی سیرسرو کے دوش بدوش علوم ہوتا ہے کیا ویلی (ایطالی) نے اپنی تصانیف کو ایک عمیق نظر اور ہوشمند مردم شناس کے غم افزا تجربات کا مخزن بنا دیا ہے اور موٹینسکو (فرانسیسی) نے کشادہ پیشانی اور خندہ روئی کے ساتھ دنیا پر نگاہ ڈال کر جریستہ خیالات اور قطعی مشاہدات سے اپنی تصانیف کو مالامال کر دیا ہے یہ دونوں کبھی ایک طریق اختیار کرتے ہیں کبھی دوسرا تاہم اول الذکر زیادہ تر مورخانہ طریق کی طرف اور اورتانی الذکر فلسفیانہ طریق کی طرف مائل رہتا ہے۔ برخلاف ان کے روسو اور ہنٹنگٹن شرجر مابین کی طرح زیادہ تر فلسفیانہ ہی طریق کے پابند رہتے ہیں مگر وہ اپنے معلم اعلیٰ افلاطون کے نسبت تخیل پرستی کی یکطرفہ غلطی میں زیادہ مبتلا ہو جاتے ہیں۔

بیان مذکورہ بالا سے واضح ہے کہ مورخانہ اور فلسفیانہ طریقوں کے درمیان کسی قسم کا تصادم نہیں ہوتا بلکہ ایک سے دوسرے کی تکمیل و تصحیح ہوتی ہے۔ جو شخص یہ خیال کرے کہ اسی پر تاریخ کا خاتمہ ہو گیا ہے اور اب نئے قانونی خیالات نہیں پیدا ہو سکتے اس کی نظر تاریخ کے متعلق بہت ہی محدود اور تنگ ہے اسی طرح جو شخص سمجھتا ہے کہ اسی کی ذات پر تمام صحیح اصولوں کی ابتدا و انتہا ہو گئی ہے وہ ایک خود پسند و ہی مغر متفلسف ہے اور بس۔ جو شخص صحیح معنوں میں موعظ ہوگا وہ فلسفے کی قدر و منزلت کو تسلیم کرے گا اور اسی طرح ایک سچا فلسفی تاریخ کے تجربات سے بھی فائدہ اٹھائے گا۔

مورخانہ اور
فلسفیانہ طریق
ایک دوسرے
کی تکمیل و تصحیح
کرتے ہیں۔

دونوں طریقوں میں سے ہر ایک کی خاص خوبیاں اور بچہ خاص کمزوریاں اور خطرے ہیں۔ مورخانہ طریقہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے نتائج واضح اور قطعی ہوتے ہیں اس لئے کہ تاریخ جیسے جاگتے تنوعات سے بھری ہوئی ہے اور اسی کے ساتھ پوری پوری حتیٰ و قطعی بھی ہے، جو خیالات بنی نوع انسانی کی تاریخ کے مطالعے سے حاصل ہوتے ہیں ان کے مقابلے میں وہ سارے خیالات جو ایک بار آور سے بار آور دماغ پیدا کر سکتا ہو بیچ بچ ہوں گے اور عموماً ایک غیر معتبر اور دصندنی شکل اختیار کریں گے البتہ اس کے ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی موجود ہے کہ تاریخی طریقوں پر چلنے سے شاید ہم انواع و اقسام کے لاتعداد حالات میں پڑ کر اپنے اصلی مقصود کو بھول جائیں اور اُسے کھو بیٹھیں، مواد کثیف کے بوجھ سے دب جائیں، تاریخی مشاہدات کی بہتات ہمیں مغلوب کر لے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گزشتہ زمانے کے حالات سے مرعوب و مسحور ہو کر ہم اپنی نظر کی اُس تازگی کو کھو بیٹھیں

جس سے ہمیں موجودہ اور آئندہ زندگی کی طرف دیکھنا چاہئے۔ یہ کچھ لازم نہیں کہ یہ تقاضا ہر حال میں مورخانہ طریقے کے لادبی نتائج ہوں مگر تاریخ خود ہی ہمیں بتاتی ہے کہ وہ لوگ جو مہم تن اُسی کے ہو رہے ہیں اکثر اس قسم کی بے راہ روی میں گرفتار ہو گئے ہیں۔

اس کے مقابلے میں فلسفیانہ طریق کے فوائد یہ ہیں کہ اس سے مقصود اصلی صاف ہو جاتا ہے، اختیار کردہ نظام میں کیرنگی اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے، حصول تکمیل کی آرزو جس کے لئے انسان ہر جگہ اور ہر نامے میں کوشش کرتا ہے۔ پوری طرح برآتی ہے یعنی وہ اپنے مقصدائے خیال کو حاصل کرتا ہے فلسفیانہ طریقے سے جو نتائج اخذ کئے جاتے ہیں وہ انسانی طبیعت کے موافق اور مقصدائے خیال کے مطابق ہوتے ہیں۔ تاہم اپنی جگہ پر یہ طریقہ بھی خطرات سے خالی نہیں ہے، فلسفی اپنا غایت نام تو وہ نتائج کو بنا کر اس درجہ اس کے دوسرے ہو جاتے ہیں کہ فطرت کی اندرونی پیچیدگیوں اور حیات واقعی کے معروضات ان کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ خیالات کی بے قید بلند پروازی میں پڑ کر کمتر ایسا ہوتا ہے کہ حقیقی قوانین کے دریافت کرنے کے بجائے لا حاصل کلیات اور لائینی معروضات کے بنانے میں وہ اپنا وقت نہ ضائع کر دیتے ہوں۔ وہ فطری نشو و نما کو صحیح طور پر نہیں سمجھتے، کچھ پھل توڑ لیتے، بے جڑ کے درخت لگانے لگتے، اور تخیل پرستی کے اوہام باطلہ میں ڈوب جاتے ہیں چند ہی مالی قسمت فلسفی ایسے ہوئے ہیں جو ان غلطیوں سے بچ سکے ہوں۔

فائدہ یہ کہ میں نے ایک کتاب "جرمانی میں اصول قانون کے موجودہ طریقے" کے نام سے لکھی تھی۔ اس کتاب میں ان خیالات اور ان کے مثل دوسرے خیالات کو جرمانہ کے علمی نقطہ نظر سے ربط و تکرر تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا، مگر اس سے مدتوں پہلے انگلستان کا لارڈ جانسلر سکین اپنے زمانے کے قانون فطرت اور انسانی اصول قانون کے مروجہ طریق کے مطالعہ پر اعتراض کر چکا اور تاریخ فلسفہ کے امتزاج سے قانون میں ضروری اصلاح کی توجہ ظاہر کر چکا ہے۔

تیسرا باب

عام اور خاص علم سیاست

خاص علم سیاست کسی مخصوص قوم اور ایک ہی سلطنت تک محدود ہوتا ہے اس کی مثالیں روما کی قدیم جمہوریہ جدید انگریزی نظام سلطنت اور موجود الوقت جرمانی شہنشاہی ہیں۔
برخلاف اس کے عام علم سیاست سلطنت کے ہمہ گیر تصور پر مبنی ہے مخصوص سلطنت کی بنا و ایک معین قوم پر ہوتی ہے، عام سلطنت جو انسانی فطرت پر نظر رکھتی ہے کل بنی نوع انسان پر مبنی ہے۔

سلطنت کے عام نظریے اور بالخصوص عام قانون عامہ کی نسبت اکثر سمجھا جاتا ہے کہ وہ دلخواستہ تخمین کا نتیجہ ہے، اور کوشش کی جاتی ہے کہ دنیا کے حالات پر ایک تخمینہ نظر ڈال کر محض منطقی استدلال کے ذریعے اس نتیجے کا استنباط کر لیا جائے۔ اس طرح بر فطری یا فلسفی قانون عامہ کے مختلف مذاہب پیدا ہو گئے ہیں جو اس قانون عامہ سے بالکل ہمیز ہیں جسے انتہائی یا تاریخی کہتے ہیں۔

میں اس فرق کو اد بھی نظر سے دیکھتا ہوں۔ میرے خیال میں سلطنت فلسفی اور تاریخی دونوں طریق سے سمجھنا اور پہچاننا چاہئے اس دو گونہ عمل سے نہ عام قانون عامہ مستفید ہو سکتا ہے نہ خاص۔

سلطنت کے خاص نظریے سے اس کا عام نظریہ اُسی طرح مقدم ہے جس طرح عام انسانی فطرت کسی قوم کی مخصوص فصاحت سے مقدم ہے عام علم سیاست ان اصولی تصورات سے بحث کرتا ہے جو مخصوص سلطنتوں کے نظریات میں گونا گوں طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ تاہم اس کا ناظر عام نظریہ سلطنت کرتا ہے وہ تمام دنیا کی بالملکیہ تاریخ ہے، کسی خاص ملک یا کسی خاص سلطنت کی تاریخ نہیں ہے تاریخ عالم سے سیاسی فلسفے کے نظریات کا اندازہ اور مکمل ہوتا ہے اور تاریخ عالم ہی ترقی کے ان مختلف مابج کو ہمارے پیش نظر کر دیتی ہے،

عام علم سیاست
ملکی تاریخ
پر مبنی ہے

جھپیر انسان نے اپنے بچپن سے اس وقت تک ٹکیا ہے اور ان میں سے ہر درجہ میں سلطنت کے متعلق مختص خیالات اور اُس کی خاص ترکیبی سیٹیں پائی جاتی ہیں اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ بنی نوع انسان کے عمل مشترک میں مختلف قوموں نے کس طریقے سے حصہ لیا ہے۔

تاریخ عالم کے تمام دور اور اُس کی تمام قومیں ہمارے اس علم کے لئے یکساں اہمیت نہیں رکھتیں ہمیں بالخصوص موجودہ زمانے کی سلطنت سے غرض ہے۔ ازمنہ قدیمہ اور ازمنہ وسطیٰ میں سلطنت کی تشکیلیں تھیں اُن پر محض اس لحاظ سے غور کرنا چاہیے کہ وہ ہیولائیہ ابتدائی کام دیتی ہیں اور ان کے ساتھ مقابلہ کرنے سے جدید سلطنت کے اوصاف زیادہ واضح اور عیاں ہو جاتے ہیں۔ جدید سلطنت کی تشکیل میں مختلف قوموں کی اہمیت کا تعین بالعموم اُن کے اُس کام سے ہوتا ہے جو انھوں نے سیاسی ترقی دینے میں کیا ہے، سیاسی تمدن سے مراد وہ اجتماع انسانی ہے جس میں انسانی باضابطگی اور انسانی آزادی ریش بہ ریش چل رہے ہوں۔ دنیا کی تاریخ میں آریائی یا ہندو جرمانی نسل سیاسیات کے لئے ویسی ہی نمایاں ہے جیسی سامی نسل مذہب کے لئے۔ لیکن آریائی قوموں کو بھی اُن کے یورپ میں آنے کے بعد ہی دانستہ طور پر سلطنت کی اعلیٰ ترکیبی سیٹ حاصل ہوئی۔ آریائی قوموں میں سے زمانہ قدیم میں یونانی اور رومی اور ازمنہ وسطیٰ میں جرمانی گوے سبقت لے گئے ہیں مگر ہماری جدید سیاسی تہذیب بالخصوص یونانی درومی اور جرمانی عناصر کے باہمی امتزاج کا ثمر حاصل ہے اور جدید سیاسی ارتقا میں اقوام ذیل نے اور ساری قوموں سے زیادہ حصہ لیا ہے (۱) اول انگریز جن کی نسل بھی انھیں عناصر سے مخموج ہے (۲) دوسرے فرانسیسی جن میں قدیم کلٹی اور رومانی عناصر کے ساتھ جرمانی عناصر بھی مخلوط ہو گئے ہیں (۳) تیسرے پروشیائی جن میں جرمانی قانون پسندی اور مردانہ نمکنت کے ساتھ سلاوی باس حکومت اور اطاعت شناری مخموج ہیں امریکہ کی سیاسی زندگی یورپ سے ماخوذ ہے لیکن اُس نے شمالی امریکہ (یعنی ممالک متحدہ) ہی میں ترقی حاصل کی ہے۔

پس عام علم سیاسیات زمانہ موجودہ کے تمدن بنی نوع انسان کے مشترک سیاسی ادراک و احساسی اُسل کے اساسی خیالات اور اُس کے حقیقی مشترک تنظیمات سے بحث کرتا ہے اور اُن مشترک تنظیمات کا اظہار مختلف سلطنتوں میں مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ عام قانون عام بھی محض نظریہ نہیں ہے۔ اس کا اثر بھی ایک حقیقی اثر ہے لیکن یہ اثر بالواسطہ ہے۔

بابت
کون سے
زمانے اور
کون سی
قومیں
نمایاں ہیں

باب ۱۔ کیونکہ ایک مالگیر سلطنت موجود نہیں اور اس لئے مختلف مخصوص سلطنتوں کے توسط سے یہ اثر عمل پذیر ہوتا ہے۔ انسان اور اس کی تاریخ کے مانند اس قانون عام کا وجود بھی حقیقی ہے محض خیالی نہیں۔

تعلیق ارسطو کی Rhetoric (فن بلاغت) میں خاص قانون اور عام قانون کے درمیان جو اختلاف بیان کیا گیا ہے وہ اس سے مختلف ہے جس پر بحث کر رہے ہیں۔ اول الذکر سے مراد وہ قانون ہے جیسے کسی خاص سلطنت نے خود اپنے لئے بنایا ہو خواہ وہ تحریری ہو یا غیر تحریری ثانی الذکر وہ ہے جو کسی سیاسی قلمت کا لحاظ کے بغیر اس کے فطرت صحیح ہو۔

پہلا مقالہ

سلطنت کا تصور

پہلا باب

سلطنت کا تصور۔ سلطنت کا تخیل۔ سلطنت کا عام تصور

سلطنت کا تصور ایسی سلطنتوں کی ماہیت سے جو فی الواقع موجود ہیں اور اُن کی ضروری خصوصیات سے بحث کرتا ہے۔ برخلاف اس کے سلطنت کا تخیل عام خیال میں ایک اہم واکمل سلطنت کی جگہ کا فی ہوا تصور پیش کرتا ہے جو ابھی تک عالم وجود میں نہیں آئی ہے مگر جس کے لئے کوشش کرنا ضروری ہے۔

سلطنت کا تصور صرف تاریخ ہی سے حاصل ہو سکتا ہے اور سلطنت کا تخیل فلسفی تھین سے پیدا ہوتا ہے۔ سلطنت کے عام تصور کی معرفت اُس وقت حاصل ہوتی ہے جب کہ اُن متعدد سلطنتوں کی جو واقعہ دنیا کی تاریخ میں نمودار ہو چکی ہیں پرتال کی جاتی اور اُن کے مشترک خصوصیات کا سرخ لگایا جاتا ہے سلطنت کا اُوچے سے اُوچا تخیل اُس وقت نظر کے سامنے آتا ہے جب کہ انسانی فطرت کے اُس میلان پر لحاظ کیا جاتا ہے جو اسے سیاسی نظم کی طرف ہے اور جب کہ یہ یقین کیا جاتا ہے کہ جہاں تک خیال میں آسکتا ہے اس میلان کو ممکن تر ترقی دینا نوع انسان کی سیاسی غایت ہے۔

اگر ہم سلطنتوں کی اُس کثیر تعداد پر نظر کریں جس کو تاریخ نے ہمارے سامنے کر دیا ہے تو چند خصوصیات جو تمام سلطنتوں میں مشترک ہیں فوراً ہی ہم پر عیاں ہو جائیں گی اُن کے علاوہ بعض دوسری خصوصیات زیادہ غائر مطالعہ سے ظاہر ہوں گی۔

۱۔ سب سے پہلے یہ بات واضح ہے کہ ہر سلطنت میں آدمیوں کی ایک تعداد مجتمع ہوتی ہے۔ مختلف سلطنتوں میں اس تعداد میں بہت تفاوت ہو سکتا ہے۔ بعض سلطنتیں صرف

سلطنت کا
تصور تاریخ
سے اور اس کا
تخیل فلسفے
سے پیدا
ہوتا ہے۔

تمام سلطنتوں
کی مشترک
خصوصیات

۱۔ انسانوں
کی ایک
تعداد۔

باب

چند ہزار ایسی کمی کر ورائسائوں پر مبنی ہوتی ہیں مگر سلطنت کا لفظ ہم اُس وقت تک نہیں استعمال کر سکتے جب تک کہ کسی سلطنت کے باشندے ایک اکیلے خاندان کے حلقے سے باہر نہ ہو جائیں اور جب تک کہ ایک بڑی تعداد آدمیوں (یعنی خاندانوں کی جن میں مرد و عورت - بچے شامل ہوں) باہم متحد نہ ہو جائے۔ حضرت یعقوبؑ کے کہنے کی طرح کوئی خاندان یا قبیلہ ایک ایسا مرکز ہو سکتا ہے جس کے گروا متراور ماند سے ایک بڑی تعداد جمع ہو جائے مگر جب تک یہ اضافہ وقوع میں نہ آئے یا جب تک ایک کنبہ محتلف کنبوں میں تقسیم ہو کر اور قسرا تبادری کی حد سے گزر کر ایک نسل بن جائے اس وقت تک حقیقی معنوں میں سلطنت نہیں قائم ہو سکتی۔ محض ایک غول کو ایک قبیلہ نہیں کر سکتے اور بغیر ایک قبیلہ یا تمدن کے اعلیٰ مدارج میں بغیر ایک قوم کے سلطنت نہیں ہو سکتی۔

سلطنت کے لئے آبادی کی کوئی خاص تعداد معین نہیں ہے روسو نے جو دس ہزار آدمیوں کی تعداد تجویز کی ہے وہ یقیناً کافی ہے ازمنہ وسطے میں ایسی چھوٹی سلطنتیں حفاظت اور عزت کے ساتھ قائم رہ سکتی تھیں مگر جدید زمانے کا میلان بہت بڑی سلطنتوں کے قیام کی طرف ہے جس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ جدید سلطنتیں بہائی فرائض کے لئے بڑی قومی قوت کی ضرورت ہے اور کچھ یہ کہ بڑی بڑی سلطنتوں کی برصغی ہوئی طاقتیں چھوٹی سلطنتوں کی خود مختاری اور آزادی کے لئے خطرہ و تہدید کا سبب ہو جاتی ہیں۔

(۲) دوسرے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ سلطنت کی بقا کے لئے کسی خاص زمین کے ساتھ قوم کا مستقل تعلق لازمی ہے سلطنت کو ایک قبضہ سلطنت کی ضرورت ہے اور قوم اور ملک لازم و ملزوم ہیں۔

فائدہ بدوش قوموں میں اگرچہ حکمرانی کے لئے سردار اور انتظام کے لئے قانون موجود ہوتا ہے مگر پھر بھی وہ سلطنت کی پوری منزلت پر نہیں پہنچ سکتیں۔ اُن کی سلطنت کی صورت اسی وقت بندھتی ہے جب وہ ایک مقررہ جگہ پر بس جاتی ہیں۔ بنی اسرائیل نے سیاسی تربیت

ایک مملکت

علیٰ اس مسئلہ کے متعلق ارسطو کی رائے کے لئے سیاسیات (فصل ہفتم جزو ۴) دیکھنا چاہئے وہ کہتا ہے کہ سلطنت نہ تو دس آدمیوں کی ہو سکتی اور نہ لاکھ آدمیوں کی ہو سکتی سیاسیات کی فصل سوم جزو ۵ فقرہ ۵ بھی دیکھنا چاہئے۔ اگر نیری سترجمہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام حاصل کر لی تھی مگر وہ سلطنت کی حیثیت میں اس وقت تک نہ آسکے جب تک کہ یوشع نے ان کو فلسطین میں متکین نہیں کر دیا۔ سلطنت روم کے زوال کے بعد نقل وطن کا جو سیلاب عظیم رواں ہوا اور قوموں نے اپنے قدیم مسکنوں کو چھوڑ کر نئی جگہ بوندو و باش کے فتح کرنے کا نتیجہ کیا تو وہ استحالہ کی ایک غیر معین حالت میں تھیں۔ ان کی قائم کردہ سابق سلطنتیں باقی نہیں رہی تھیں اور نئی ایک وجود میں نہیں آئی تھیں شخصی تعلق ایک زمانے تک قائم رہا مگر ملک کے ساتھ جو تعلق تھا وہ ٹوٹ گیا تھا صرف اسی حالت میں وہ کوئی نئی سلطنت قائم کر سکے جب وہ مستقل طور پر کہیں قدم جانے میں کامیاب ہو گئے۔ جو قومیں اس مرحلے میں ناکام یا بے ہمتہ ہو گئیں۔ انہیں خیر و احوال نے تھک کر کسی کی سرکردگی میں سلطنت انہیں کو اپنے جہازوں پر بچا لیا کیونکہ فتح کے بعد انھوں نے پھر اپنے شہر پر قبضہ کر لیا مگر سمبری اور یٹو ٹوٹی تباہ ہو گئے کیونکہ انھوں نے اپنے قدیم وطن کو چھوڑ دیا تھا اور کسی جدید مقام کو اپنا وطن بنانے میں ناکام رہے۔ اگر اہل روم اپنے شہر کے جل جانے کے بعد ویلی کو چلے گئے ہوتے تو خود سلطنت روم کا خاتمہ ہو گیا ہوتا۔

۳۔ سلطنت کی ایک اور جدید قسم ہے کل فراد کا اتحاد یعنی قوم کے ہر فرد کا اپنے تئیں ایک ہی سر۔ اتفاق کل کا جز و جملہ۔ اندرونی طور پر مختلف قسمیں ضرور ہو سکتی ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر کافی آزادی رکھتی ہوں جیسے روم میں ایک گروہ پتریلیوں (یعنی اشراف) کا تھا اور دوسرا پلبیوں (یعنی عامیوں) کا۔ اسی طرح متوسط زمانے کے ابتدائی دور میں جرمانی سلطنتوں میں جاگیر نظام کے پہلو بہ پہلو ایک قومی نظام بھی موجود تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سلطنت ایسے مختلف حصص پر مشتمل ہو جو بجائے خود سلطنت ہوں جیسے قدیم جرمانی شہنشاہی سے بندرتج بہت سی مقامی سلطنتیں پیدا ہو گئیں یا جیسے شمالی امریکہ یا سویٹزرلینڈ کی جہیوتہ سلطنتوں اور نئی جرمانی شہنشاہی میں ایک مشترک مجموعی سلطنت کے ساتھ ساتھ متحد مقامی سلطنتیں بھی قائم ہیں۔ مگر جب تک کہ قوم اپنی اندرونی عضوی ترتیب میں ایک مربوط مجموعہ نہ بن جائے یا اپنے بیرونی تعلقات میں سارے قومی اتحاد کی وہ حیثیت کا اظہار و عمل نہ کر سکے اس وقت تک سلطنت کا وجود ہی نہیں ہو سکتا۔

۴۔ تمام سلطنتوں میں ہم حکم اور محکوم یا باصطلاح قدیم بادشاہ اور رعیت کے درمیان امتیاز پالتے ہیں۔ بادشاہ اور رعیت کے فقرے کے مفہوم میں بسا اوقات غلط فہمی ہوئی اور اکثر وہ غلط استعمال کیا گیا ہے مگر بجائے خود یہ فقرہ نہ قابل نفرت ہے نہ اس سے علاماتہ انقیاد کا اظہار ہوتا ہے۔ ہر صورت یہ فرق نہایت ہی متنوع شکلوں میں

بابت

ظاہر ہوتا ہے مگر ہر حال میں ایک ضروری امتیاز ہے یہاں تک کہ بہت ہی انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔ جس میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ امتیاز نا پدید ہو گیا ہے وہاں بھی حقیقت میں موجود ہوتا ہے۔ تیسرے شخص کے باشندوں کی مجلس ملی، فرانزوا تھی اور اہل امتیاز فرداً فرداً نمایا تھے۔

جہاں کوئی حکمران صاحب اختیار نہ رہے جہاں محکموں نے سیاسی اطاعت سے انکار کر دیا ہو اور ہر شخص وہی کرنے لگے جو اُس کا جی چاہے، اور جہاں لاکھمیت کا دور دورہ ہو وہاں پھر سلطنت کا خاتمہ ہے۔ لاکھمیت دیا طوائف الملوکی مثل اور منیفیات کے اتنی کم مدت تک قائم رہ سکتی ہے کہ ہر ایک زندہ قوم میں گویا فوراً ہی اس لاکھمیت سے پھر ایک قسم کی نئی حکومت پیدا ہو جاتی ہے گو کہ وہ نہایت سخت گیر ملکہ اکثر شکل اور نظامانہ ہوتی ہے۔ یہ نئی حکومت بزور لوگوں کو اطاعت و انقیاد پر مجبور کر دیتی اور اس طرح اُس لادبی امتیاز کو دوبارہ قائم کر دیتی ہے۔ اشتہالی اصولاً اس امتیاز سے انکار کرتے ہیں مگر ان کے اس انکار سے خود نفس سلطنت کا انکار لازم آتا ہے۔ سلطنت کو توڑ پھوڑ کے محض معاشرتی اتحاد پیدا کرنے میں یہ لوگ بھی کسی قوم میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں اور اگر کبھی عارضی طور پر عوام کو اپنی تجا ویز کا طرفدار بنائیں اور انھیں کامیابی ہو بھی جائے تو سو طھویں صدی کی مذہبی اشتہالیوں یعنی باز اصطہا عینوں کی مثال کے مطابق اور واقعات کے اندرونی تلج کی بنا پر ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ وہ بھی بعد میں ایک تسلط قائم کر دیں گے اور یہ تسلط سخت ترین قسم کا ہو گا۔

سلاوی قوموں میں ہم یہ قدیم خیال پاتے ہیں کہ قوم کے تمام افراد کا اتفاق رائے ہی

۱۷۱۵ء میں جرمانیا میں ایک نئے فرقے کی ابتدا ہوئی جس کے ماننے والوں کو ان کے مخالفوں نے باز اصطہا عینوں (Anabaptist) کا لقب اس لئے دیا کہ ان کا ایک اصول یہ بھی تھا کہ بچوں کو بپتسمہ (اصطہا) دینا ایک باطل چیز ہے پس عام رواج کے مطابق جن لوگوں کو سولہ سترہ برس کی عمر میں بپتسمہ دیا جا چکا ہے ان کے بپتسمے کی تجدید لازم ہے۔ اسی کے ساتھ یہ لوگ یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ ہر مذہبی اصلاح سے لازمہ معاشرت کی بھی اصلاح ہوتی ہے۔ یہی عقیدے پوسٹھویں صدی میں اشتہالیت کی بنیاد پڑی پس یہ فرقہ خالص مذہبی نہیں بلکہ سیاسی مقاصد بھی رکھتا تھا۔ اُس نے جرمانیا سولیس (Switzerland) اور ولند (Holland) میں ایک حد تک شیوع پایا لیکن مذہبی اور سیاسی شورش برپا کر کے اپنے دشمنوں کی تباہی کا باعث ہوا۔ ع۔ ص۔

مرضی عامہ کا نمائندہ ہو سکتا ہے اور کثرت رائے کو یا اعلیٰ ذی اقتدار افراد کو مینصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں یہ اصول زیادہ سے زیادہ مقامی جماعت کے لئے کام دے سکتا ہے اور وہ بھی اسی قوم میں جہاں لوگ آسانی اور سرعت کے ساتھ باہم اتفاق کر لیتے ہوں لیکن اسے سیاسی اصول کا درجہ کبھی حاصل ہو سکتا کیونکہ سلطنت کے لئے ضروری ہے کہ وہ افراد کی ناگزیر مخالفت کو مغلوب کر دے۔

۵ ذہنیاتی
فطرت۔

سلطنت کسی نہج سے ایک بے جان آلہ یا ایک مردہ کل نہیں ہے وہ ایک زندہ اور اس لئے ایک عضوی وجود ہے۔ سلطنت کی اس عضوی فطرت کو لوگوں نے ہمیشہ نہیں سمجھا۔ سیاسی اقوام نے ضرور اس کا ایک نقش اپنے ذہن میں قائم کر لیا ہے اور الفاظ میں بھی اسے طبعی طور تسلیم کیا ہے مگر علم سیاست سے سیاسی عضویت کی حقیقی معرفت ایک مدت تک پوشیدہ رہی اور آج بھی بہت سے علماء سیاست اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ تاریخی مصنفین میں اس کا سہرا جرمائیکہ تاریخی قانون دانوں کے سر رہا کہ انھوں نے قوم کی اور سلطنت کی عضوی فطرت کو بھانا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ سلطنت پر ریاضی اور علم آلات کے طریق تحقیق سے نظر ڈالنا جس میں صرف کثرتوں سے کام لیا جاتا ہے نیز ایسے لا نقد و لائق جزئیات سے بحث کرنا جنہوں نے جزد کے ہجوم میں کل کو بھلا دیا تھا، غلط اور لاعاصل مانا گیا۔ جس طرح ایک روغنی تصویر صرف روغن و رنگ کے قطرات کا مجموعہ نہیں بلکہ کچھ اور یہی چیز ہے اور ایک مجسمہ صرف سنگ مرمر کے ذرات کے اتصال کا نام نہیں بلکہ اس کے لئے کچھ اور بھی درکار ہے اور انسان محض خلل و جزائیم اور خون کی ایک مقدار کا نام نہیں ہے اُنسی طرح محض شہریوں کا اجتماع، قوم نہیں ہے اور سلطنت محض ظاہری نظامات و ضوابط کا مجموعہ ہے۔

یہ سچ ہے کہ سلطنت فطرت کی پیدا کی ہوئی چیز نہیں ہے اور اس لئے وہ ایک فطری عضو بھی نہیں بلکہ باواسطہ انسانوں کا کام ہے البتہ سلطنت بنانے کا میلان انسان کی فطرت میں پایا جاتا ہے اور اس حد تک سلطنت کی بنا فطرت پر ہے مگر اس میلان کو عملی صورت دینا فطرت نے انسانی محنت اور انسانی انتظام و اہتمام پر چھوڑ دیا ہے اور اس حد تک سلطنت انسانی قوت عمل کی پیداوار اور اس کی عضوی صورت ایک فطری عضویت کی نقل ہے۔

سلطنت
کس میں
ذہنیاتی ہے۔

جب ہم سلطنت کو عضوی (یا ذی حیات) کہتے ہیں تو ہم فطرت کی مخلوقات کے اُن

اعمال و افعال کا خیال اپنے دل میں نہیں لاتے جن کے ذریعے سے وہ مخلوقات اپنی غذا کو تلاش کرتے۔ اُسے ہضم کرتے اور جڑ و بدن بناتے ہیں اور اپنی نوع کا تولید و تناسل کرتے ہیں، بلکہ ہمارے دل میں عضوی (یا ذی حیات) مسمیوں کے خصوصیات ذیل کا خیال آتا ہے:-
(الف) ہر عضویہ (ذی حیات) جسم اور روح یعنی مادی عناصر اور روحی قوتوں کے اتحاد سے بنا ہے۔

(ب) اگرچہ ہر عضویہ ایک پوری چیز ہے اور پوری ہی چیز رہتا ہے پھر بھی اگر اُس کے اجزاء پر نظر کرو تو وہ ایسے اعضاء رکھتا ہے جو خاص اغراض کے لئے بنے ہیں اور خاص قابلیتوں سے بھرے ہوئے ہیں تاکہ وہ متعدد طریقوں سے خود مجموعے کی مختلف ضروریات کو پورا کریں۔
(ج) ہر عضویہ کے کانون اندرونی جانب سے بیرونی جانب کو ہوتا ہے اور اُس میں غار جی نشوونما ہوتی ہے۔

ان تینوں اعتبارات سے سلطنت کی عضوی نوعیت عیاں ہے:-

(الف) سلطنت کے اندر روح اور جسم ارادہ اور کارکن اعضا لازماً مربوط ہو کر ایک زندگی بیا کرتے ہیں قوم کی واحد روح جو اپنے وقت کے فرد افراد نام باشندوں کی روح کے اوسط مجموعے سے ایک مختلف شے ہے سلطنت کی بھی روح ہے قوم کا واحد ارادہ جو تمام قوم کے اوسط ارادے سے مختلف ہے، سلطنت کا بھی ارادہ ہے۔ نظام سلطنت اور اس کے ساتھ اُس کے وہ اعضا جو کل کی قائم مقامی کرتے اور قوانین کی شکل میں سلطنت کی مرضی کا اظہار کرتے ہیں، اس کا وہ سرگروہ جو حکمرانی کرتا ہے، انتظامی اغراض کے لئے اس کے ہر طرح کے محکمے اور فرائض عام انصاف کو عمل میں لانے کے لئے عدالتیں، قوم کے مادی اور ذہنی اغراض کے مہیا کرنے کے لئے ہر قسم کے تنظیمات، عام قوت کے اظہار کے لئے فوج، یہی وہ نظام ہے جو سلطنت کا جسم ہے اور یہی وہ شکل ہے جس میں قوم کی مشترک زندگی کا اظہار ہوتا ہے۔ انفرادی سلطنتیں مثل انفرادی اشخاص کے اپنی روح اپنے خصائل اور اپنی شکل و صورت میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ بنی نوع انسان کی ترقی کا حقیقی انحصار قوموں اور سلطنتوں کی مسابقت پر ہے جن سے نوع انسانی مرکب ہے۔

(ب) نظام سلطنت میں سیاسی جسم کے اعضاء کی ترکیب و ترتیب بھی رونما ہوتی ہے۔ ہر عہدہ اور ہر سیاسی مجلس اسی جسم کا ایک مختص عضو ہے جو ایک خاص کام کے لئے

(الف) سلطنت
میں روح اور
جسم ہے

سلطنت میں اعضا
میں جن کے
وظائف ہیں

مخصوص ہے عہدہ کسی کل کے ایک ٹکڑے کے مثل نہیں ہے اسے خالص اوزاری کام کرنے نہیں ہوتے جو ہمیشہ ایک ہی سے ہوتے ہیں جس طرح کچی کل کے پیسے اور پھر کیاں ہمیشہ ایک ہی کام کو ایک ہی طریقے سے انجام دیتی رہتی ہیں عہدے کے کارِ منصبی ذہنی (یا روحانی) نوعیت رکھتے ہیں اور عام زندگی کے ضروریات کے لحاظ سے جن کو پورا کرنا ان کا فرض ہے۔ خاص مواقع پر ان میں تغیر ہوتا رہتا ہے۔ وہ نندوں کی خدمت کرتے اور خود بھی زندگی رکھتے ہیں پس جب کوئی عہدہ اپنے جوہر حیات کو کھو کر لایقفل ظاہریت کی لپیٹی میں جا پڑتا اور ایک کل کے مانند بن جاتا ہے جو بغیر کسی تیار کے اور خاص حالات پر یا مرد و زنانہ سے بدلی ہوئی کیفیات پر لحاظ کئے بغیر اپنی عین عادت کے مطابق اور اسی اوزاری روش سے برابر اپنا کام کئے چلی جاتی ہے تو اس حد کو پہنچ کر خود وہ عہدہ ہی تباہ ہو جاتا ہے اور شین بن جانے کی وجہ سے خود سلطنت پر انجام کا مریخ وال آجاتا ہے۔

نہ صرف وہ شخص جو کسی عہدے پر ہے بلکہ خود عہدے میں بھی ایک طرح کی نفسی اہمیت اور ایک ذی حیات روحی اصول ہوتا ہے گویا کوئی روح اسے زندہ رکھتی ہے۔ عہدے کی ایک خصوصیت اور اس کی ایک روح ہوتی ہے جو اپنی باری میں اُس شخص پر اثر ڈالتی ہے جو اس عہدے پر کام کرتا ہے۔ یومیوں میں جب ایک معمولی شخص بھی کو نسل کے بلند اور با اقتدار عہدے پر ممتاز ہو جاتا تھا تو اپنے عہدے کی عظمت اور اقدار و قوت کی وجہ سے اُس شخص کا اخلاق بلند ہو جاتا تھا اور اس کی طبعی طاقت بڑھ جاتی تھی۔ میر عدل (یعنی نج) کا عہدہ ایسا محترم ہے اور انصاف گستری نے اُسے ایسا مقدس بنا دیا ہے کہ ایک نہایت کمزور شخص بھی جب اس عہدے پر مقرر ہو جاتا ہے تو حق کے قائم رکھنے کے لئے اس کا دل شریفانہ خیالات سے لبریز اور اس کا استقلال بلند ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ عہدے کی روح عہدہ دار کی طبیعت کو نہیں بدل سکتی، وہ اس قدر قوی نہیں ہوتی کہ انسان کی خصلت پر اس طرح چھا جائے کہ ہمیشہ شخص کو جس کا تقرر کیا جائے عہدے کا پورا اہل بنا دے تاہم عہدہ دار اپنی طبیعت اور مذاق پر ایک غیر مرنی اثر محسوس کرتا ہے اور اگر اُس کا دل اثر پذیر ہے تو ممکن نہیں کہ وہ یہ اثر محسوس نہ کرے کہ خود اُس کے عہدے میں ایک روح ہے جسے فی الحال اُس کی شخصیت سے گہرا اور قریبی تعلق پیدا ہو گیا ہے مگر جو اس کی ذات سے مختلف اور زیادہ دیر پا ہے۔

ج۔ قومیں اور سلطنتیں نوکرتی ہیں اور انکی بایبیدگی خاص قسم کی ہوتی ہے۔ قومی اور سیاسی تاریخ کے دوروں کا شمار ان طویل المدت قرونوں سے ہوتا ہے جو منفرد اشخاص کی عمروں سے بہت بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، آخر الذکر کو برس اور برس کی دہائیوں سے ظاہر کر سکتے ہیں اول الذکر صدیوں سے متجاوز ہوتا ہے۔ پھر ہر دور اپنے مخصوص شمول رکھتا ہے اور قوم و سلطنت کی جامع تاریخ میں وہ بیک جا دکھائی دیتے ہیں۔ قوموں کا بچپن، ان کے زمانہ بلوغ سے بالکل مختلف نوعیت رکھتا ہے اور ہر مذہب و مہر سے کہ سلطنت، زندگی کے جن زمانی مدارج پر ہوا ان کا لحاظ رکھے۔ اس امر میں بھی وہی مقولہ حکمت صادق آتا ہے کہ ہر چیز کے لئے ایک وقت ہے۔“

اج سلطنت
میں نو اور بایبیدگی
ہوتی ہے۔

سلطنت کو جہاں عضوی موجودات فطری کے ساتھ نشو و نما میں مشابہت ہے وہاں اُن دونوں میں ایک ہم فرق بھی ہے وہ یہ کہ نباتات، حیوانات اور انسان کی زندگی تقابلاً قاعدگی کے ساتھ نواور انحطاط کے مختلف دوروں اور درجوں کو طے کرتی ہے مگر سلطنتوں اور سیاسی تنظیموں کا نمونہ ہمیشہ ایسا میں شخص نہیں ہوتا۔ انسانی آزادی یا بیرونی سوانح کے اثروں سے نمونہ کی یہ رفتار اکثر دوسری راہیں اختیار کر لیتی ہے اور کبھی کبھار کھلی طور پر ان میں خلل پڑ جاتا ہے یا اُس کی صورت بالکل بدل جاتی ہے۔ یہ صورت جیسے جلیل القدر و قوی افراد یا خود قوم کے زبردست جذبات کی طرف سے پیش آتی ہے ویسا ہی اُس کا اثر بھی پڑتا ہے لیکن یہ کج راہیاں نہ تو تعداد میں اتنی زیادہ اور نہ عموماً ایسی اہم ہیں کہ عام قاعدے کو کمزور کر دیں بلکہ اُن کا وقوع بہت نادر ہے اور عام طور پر وہ اس سے بہت ہلکی ہوتی ہیں جتنا وہ لوگ گمان کرتے ہیں جن کی رائیں محض واقعات کے فوری اثرات سے قائم ہوتی ہیں لیکن پھر بھی ان میں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی وزن ہوتا ہے کہ سلطنت کے محض ایک فطری عضو یہ ہونے کا خیال ایک طرفہ اور ناقابل اطمینان ہے اور یہ کہ اس معاملے میں بھی ہمیں افراد کے آزادانہ عمل کی پوری وسعت کار کو تسلیم کرنا چاہئے۔

پھر بھی سلطنت
محض فطری
نشو و نما پائی
ہوتی چیز نہیں
ہے۔

۶۔ تاریخ ہم پر جہاں سلطنت کی عضوی نوعیت کو ظاہر کرتی ہے وہاں ہمیں یہ بتاتی ہے کہ سلطنت، نباتات و حیوانات کے جیسے ادنیٰ ذی حیاتوں کی ہم سطح نہیں ہے بلکہ اُن سے ایک بلند تر درجے کی چیز ہے تاریخ ہی سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت ایک اخلاقی و روحانی عضو ہے وہ ایک عظیم جسم ہے جو قوم کے حیات و خیالات کو اپنے اندر جمع کر سکتا ان کو توانیں کی صورت میں ظاہر کر سکتا اور عملاً ان سے کام لے سکتا ہے۔ تاریخ ہی کے ذریعے سے ہمیں ہر سلطنت کے

۶۔ سلطنت
ایک اخلاقی
و روحانی عضو
ہے۔

اخلاقی صفات اور اُس کی حقیقت سے اطلاع حاصل ہوتی ہے اور تاریخ ہی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سلطنت ایک ایسی شخصیت ہے جس میں روح اور جسم ہوتا ہے اور اس وجہ سے وہ اپنا ایک الگ وہ رکھتی اور اسے ظاہر کرتی ہے۔

سلطنت کی عزت و شوکت کے خیال نے ہمیشہ اس کے فرزندوں کے دلوں کو بھرا دیا اور انھیں ایشیا اور جاں بازی کے لئے جوش دلایا ہے سلطنت کی آزادی و خود مختاری اور اس کے حقوق کے لئے ہر زمانے اور ہر قوم میں شریف ترین اور بہترین افراد نے اپنا مال اور اپنی جان قربان کر دی ہے اس امر پر ساری دنیا کا اتفاق ہے کہ سلطنت کے دقت اور قوت کو بڑھانا اور اُس کی خوشحالی اور اقبال مندی کو ترقی دینا وہی جو ہر شخص کے معزز ترین فرائض میں داخل ہے۔ سلطنت کی خوشی اور رنج میں تمام اہل ملک ہمیشہ شریک رہے ہیں۔ اگر سلطنت میں یہ اعلیٰ اخلاق اور شخصی صفت نہ ہو تو وطن کا اعلیٰ خیال اور وطن کی محبت سب کا عدم ہو جائے گی۔

سلطنت کی شخصیت کا تسلیم کرنا قانون عامہ کے لئے بھی ویسا ہی لازم و لازمی ہے جیسا بین الاقوامی قانون کے لئے ہے۔

سلطنت کی
ایک شخصیت
ہے۔

قانون کی اصطلاح میں شخص اُسے کہتے ہیں جس کی طرف کوئی قانونی ارادہ منسوب کیا جاسکے اور جو حقوق کو حاصل کر سکے، پیدا کر سکے اور ان پر قابض رہ سکے۔ قانون عامہ میں یہ تصور ویسا ہی معنی نیز ہے جیسا قانون شخصی میں قانون عامہ کے مفہوم میں سلطنت ہمہ وجود ایک شخصیت ہے سلطنت کا سارا دستور اس طرح ترکیب پاتا ہے کہ سلطنت کی شخصیت اپنے ارادے میں جو ہم آہنگی پیدا کر کے اس پر عمل پیرا ہو سکے تمام افراد کے انفرادی ارادے سے مختلف ارادوں کے مجموعے سے بھی مختلف ہے۔

البتہ سلطنت کی شخصیت کو صرف آزاد قوموں نے تسلیم کیا ہے اور صرف متمدن توہمی سلطنتوں میں اُس نے پوری قوت حاصل کی ہے۔ سیاسیات کے زیادہ قدیمی مدارج میں صرف حکمران کی ہستی نمایاں ہوتی ہے۔ شخص صرف وہی ہے اور سلطنت اُسی کی ذاتی حکومت کا میدان ہے۔ موجودہ زمانے کی سلطنت کی مردانہ خصوصیت کا بھی یہی حال ہے کہ یہ خصوصیت سب سے اول کلیسا کی زنا نہ خصوصیت کے مقابلے میں نمایاں ہوئی۔ ایک مذہبی جماعت میں سیاسی جماعت کے تمام صفات ہو سکتے ہیں مگر سلطنت ہونے کی خواہش اس میں نہیں ہو سکتی

سلطنت
مذکر ہے

اور وہ سلطنت ہے جس میں محض اس وجہ سے کہ وہ مثل ایک انسان کے اپنے اوپر بالارادہ حکومت نہیں کرتی اور نہ اپنی بیرونی زندگی میں آزادانہ عمل کرتی ہے بلکہ وہ صرف خدا کی عبادت کرنا اور اپنے مذہبی فرائض کو بجالانا چاہتی ہے اس تاریخی غور اور مشاہدے کے نتیجے کو یکجا کیجئے تو سلطنت کا عام تصور اس طرح پر مبنی کیا جاسکتا ہے کہ سلطنت انسانوں کے اُس مجموعے کو کہتے ہیں جو ایک معین رقبے میں حکومت اور محکوم کی شکل میں ہوا اور وہ لوگ جو ایسا خلائی اور عضوی مردانہ شخصیت میں باہم متفق ہو گئے ہوں یا زیادہ مختصر یوں کہیں کہ کسی خاص ملک کی سیاسی طور پر تنظیم پائی ہوئی قومی شخصیت کو سلطنت کہتے ہیں۔

سلطنت کے مختلف نام۔

فائدہ ۱۱۰ اس امر پر نظر کرنا چاہیے سے خالی نہ ہو گا کہ مختلف قوموں نے سلطنت کے نام کس طرح رکھے ہیں یونانی ہمیشہ شہر اور سلطنت کو ایک ہی لفظ پولیس (Πολις) سے ظاہر کرتے تھے۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ اُن کا تصور سلطنت شہر پر مبنی اور شہر ہی کے نقطہ نظر کے باعث محدود بھی تھا۔ اسی طرح رویش کا لفظ کیوٹاس (Civitas) اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ایک شہر کے حقوق شہر ہی سلطنت کا مغز ہیں، مگر بہ نسبت یونانی لفظ کے اس میں وصف شخص یا زیادہ ہے اس لئے یہ لفظ قوم کی زیادہ وسیع جماعتوں پر حاوی ہونے کے لئے یونانی لفظ سے زیادہ موزوں ہے۔ اس امر سے سلطنت کے علو کے مرتبت کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ لفظ تمدن Civilization سلطنت کے نام سے ماخوذ ہے اور عملاً سلطنت کی وسعت و انتفاع کے مرادف ہے ایک خاص لحاظ سے دوسرا رومی نام ریس پبلکا (Res publica) اور بھی زیادہ بلند ہے کیونکہ اُس سے نہ صرف شہریت کی طرف اشارہ ہوتا ہے بلکہ وہ ریس پوبلی Res populi ایک قوم اور اس قوم کے فوائد پر نظر رکھنے کی طرف اشارہ کرتا ہے قدامت کے مفہوم میں لفظ جمہوریہ (ریپبلک) سے شہری خارج نہیں ہے البتہ خود مختار نہ حکومتوں پر یہ لفظ عام نہیں ہوتا (اس کے مقابلے میں انگریزی کے لفظ دولت عامہ Common wealth پر غور کرنا چاہئے۔

جدید زبانوں میں سے نہ صرف رومانی ہی زبانوں میں بلکہ جرمانی زبانوں میں بھی اسٹیٹ (State) کا لفظ (Stato, etat, Stat) عام طور پر شائع ہے

۱۔ واضح ہو کہ ”رومانی“ (Romance) (یعنی جدید لاطینی) قوموں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ پس (Roman) کے لئے ”رومی“ ہی کو قائم رکھنا درست ہو گا۔ ع۔ ص

جیسے خود بالکل غیر مبین ہونے کے باوجود امتداد زمانہ سے یہ اصطلاح بہت ہی عالمگیر ہو گئی اس میں اب نہ تو کسی قسم کا ابہام ہے اور نہ وہ کسی طرح کی تفریق کی محتاج ہے (گو کہ ابتداء اس لفظ سے محض "حالت" کا اظہار ہوتا تھا) اور سلطنت کا یہ مفہوم ظاہر کرنے کے لئے "حالت امور عامہ" (Status Reipublicae) کے مرکب کلمے کی ضرورت ہوتی تھی لکسیکون (سلطنت) کے لفظ کا نہایت نمایاں مفہوم ایک وہ چیز ہے جو "قائم" یا مستقل ہے لیکن لفظ و معنی کا یہ واسطہ بھی اب پس پشت پڑ گیا ہے اور اس لفظ (سلطنت State) سے نہ صرف موجود الوقت انتظام و نظام حکومت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ خود وہ سلطنت مراد ہوتی ہے جو حکومت کی شکل کی کامل تبدیلی کے بعد بھی قائم رہ سکتی ہے۔ اس مفہوم کے اظہار کے لئے زمانہ جدید میں جو دوسرے الفاظ اختیار کئے گئے ہیں ان سب کا اطلاق محدود ہے مثلاً ایک پرنس لفظ رائش (Reich) کا ہے اس کا اطلاق صرف ان بڑی بڑی سلطنتوں پر ہوتا ہے جو شاہی تنظیم کے تحت میں ہوں اور اسی طرح اس سے ایسے متعدد ممالک کے اجتماع باہمی کا خیال بھی ذہن میں آتا ہے جو ایک دوسرے سے آزاد ہوں، یہی کیفیت لاطینی لفظ امپیریم (Imperium) (فرانسیسی و انگریزی امپائر Empire) شہنشاہی کی ہے جس میں ساتھ ساتھ قیصری حکمرانی کا اشارہ بھی موجود ہے۔ اس سے زیادہ محدود مفہوم لفظ ملک (Land ارض) کا ہے جس سے ابتداء سلطنت کے خارجی رقبے کا (اور ایسی سلطنت کا جو متفرق اجزاء میں منقسم نہ ہو) اظہار ہوتا ہے۔ مگر تاہم اس کا اطلاق خود اس سلطنت پر بھی ہوتا ہے جو اس رقبے پر قابض ہوتی ہے۔ یہ لفظ یونانی لفظ پولس (Πόλις) کی ایک طبعی ضد ہے کیونکہ اس میں سلطنت کی اولین بنا ملک (Landschaft) پر رکھی گئی ہے اور یونانی لفظ نے اس کی بنا شہر پر رکھی ہے۔ وطن (Fatherland) کا دلاویز لفظ اور بھی محدود ہے کیونکہ اس کا تعلق افراد سے ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں اس وجہ بلندی اور روحانیت ہے کہ اس کا اشارہ ملک کے ساتھ شخصی تعلق اور رشتہ خون کے سلسلے کی طرف ہے۔ اس لفظ میں صفائی اور جوش کے ساتھ اس تمام حب و شغف کا اظہار ہوا ہے جو اس حلیل المقدور و ذی حیات جماعت سے ہوتا ہے جس سے اسے تعلق ہے جس کی ہستی کے ساتھ خود اس کی ہستی وابستہ ہے اور جس کے لئے اپنے کو نثار کر دینا انسان کے شرف و علو کی برترین مثال ہے۔

(۲) میں نے اپنی تصنیف Psychological Studies on State and Church

میں سلطنت کی مردانہ خصوصیت پر زیادہ تفصیل سے بحث کی ہے۔ فرانسیسی کے اس فقرے سے
(L'etat c'est l'homme) سلطنت انسان ہے، صرف یہی مراد نہیں ہے کہ "سلطنت ایک
عام انسان ہے" بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس طرح کلیسا عام زمانہ صفت یعنی بیوی کی حیثیت رکھتا
ہے اسی طرح "سلطنت مرد یا میاں" کے مفہوم کو پورا کرتی ہے۔ (یہ ملحوظ رہتا چاہیے کہ
جرمانی زبان میں لفظ سلطنت (Stat) مذکر ہے اور لفظ کلیسا (Kirche) مؤنث ہے)

باب دوسرا

سلطنت کا انسانی تخیل — عالمگیر شاہنشاہی

سوال یہ ہے کہ کیا سلطنت کا ایک ایسا تصور جو مختلف قائم شدہ سلطنتوں پر غور کرنے سے حاصل ہوا ہو انسانی تخیل کے لئے کافی ہو سکتا ہے تاہم یہی طبع صرف اس بات کے مان لینے پر قانع ہے کہ سلطنت، قوم کا کالبد ہے اور سلطنت کی بنا قوم کی فطرت اور اس کے ضروریات پر ہوتی ہے۔ پس سلطنت اُسی قوم تک محدود ہے۔

لیکن فلسفے کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اور زیادہ تعمق نظر سے کام لیں۔ انسانی فطرت میں یہیں بقائے سیاسی کامیلان اور اس کی احتیاج محسوس ہوتی ہے۔ ارسطو بدقوں قبل اس معنی خیز صداقت کا اظہار کر چکا ہے کہ ”انسان فطرتاً ایک سیاسی حیوان ہے“ یہ کوئی قومی خصوصیت نہیں ہے جو انسان کو حصول سلطنت پر آمادہ کرتی اور اس کے قابل بناتی ہے بلکہ یہ ایک عام انسانی فطرت ہے۔ اس کے علاوہ مختلف سلطنتوں کے عضویہ کی پرتال سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مختلف و قبائین قوموں میں ایک ہی سے اہم اعضا ایک ہی طرح پر پائے جاتے ہیں، ہر جگہ ایک ہی سی عام طبیعت انسانی کا مشاہدہ ہوتا ہے جس کے مقابلے میں مختلف قومی تشکیلات الہی دکھائی دیتی ہیں کہ یہ ادنیٰ تغیر ایک ہی چیز کی مختلف صورتیں ہیں سب سے آخری بات یہ ہے کہ خود قوم ہی کا تصور قطعی اور مسلم نہیں ہے۔ اس سے بجائے خود یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ایسے بلند تر انسانی اتحاد کی ضرورت ہے جس میں اقوام محض اعضاء و ارکان کی حیثیت رکھتی ہوں پس کیونکر ہو سکتا ہے کہ بلا لحاظ اس اعلیٰ اتحاد کے سلطنت کی بنا قوم پر قائم کی جائے اور اس کے یہ سچ ہے کہ انسان ایک جنس واحد ہے اور ایک عام روح اس میں داخل و سائر ہے تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ خود اپنے اس جوہر حقیقی کو ایک مجسم شکل میں لانے کی کوشش سے باز رہے یعنی ایک سلطنت نہ بن جائے۔

اس لحاظ سے نثری قومی سلطنتوں کی واقعیت اور اہمیت صرف ایک نسبیت چیز

عام فطرت
انسانی یک
یا ملک سلطنت
کی ضرورت
کی متقاضی
ہے۔

رہ جاتی ہے۔ ایسی سلطنتوں میں ایک فلسفی کو سلطنت کے اعلیٰ ترین تخیل کا رد بکار آنا محسوس نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک سلطنت ایک انسانی عضویہ بلکہ ایک انسانی شخص ہے اور جب ایسا ہے تو جو انسانی روح اس میں موجود ہے اسے ایک انسانی جسم بھی ملنا چاہیے کیونکہ روح اور جسم ایک دوسرے سے کمر اقلق رکھتے ہیں اور باہم ملکر شخص بنتے ہیں درحقیقت ایک ایسے جسم میں جس کی عضویت انسانی نہ ہو، روح انسانی صحیح معنوں میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس لئے سلطنت کے جسم کی تعمیر انسان کے جسم کے نمونے پر ہونا لازمی ہے پس مکمل سلطنت انسانیت کے جسم مرنے کے مماثل ہے عالمگیر سلطنت یا عالمگیر شاہنشاہی انسانی ترقی کا نفاذ ہے۔ ایک ایسا انسان اپنی انفرادی حیثیت میں اور نوع انسانی اپنی مجموعی حیثیت میں تخلیق عالم کی دو ایسی صدیں ہیں جو ابتدا سے جلی آئی ہیں اور یوں ہی قائم کر رہنے والی ہیں۔ شخصی قانون اور عام قانون کا فرق بالآخر انھیں دونوں پر مبنی ہے یہ سچ ہے کہ نوع انسان میں کجی کا احساس بھی محض ایک خواب پریشاں ہے نہ وہ ابھی پوری طرح بیدار ہوا ہے اور نہ ابھی اس نے اتحاد آزادی کی صورت اختیار کی ہے۔ اس لئے نوع انسان ابھی اس قابل نہیں ہوئی ہے کہ وہ اپنے عضوی وجود کو مکمل کر سکتی۔ عالمگیر سلطنت کے حصول کے لئے ابھی صدیاں درکار ہیں۔ لیکن دنیا کی تمام قوموں کا ایک اس قسم کا جمعا قائم ہو جانے کی تمنا دنیا کی تاریخ ماضی میں وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتی رہی ہے۔ مذہب یورپ پہلے ہی سے اس بلند مقصد کی طرف اپنی نظر زیادہ مضبوطی کے ساتھ جادھا ہے۔

یہ سچ ہے کہ ازمنہ تاریخ میں عالمگیر سلطنت کے حصول کی تمام کوششیں آخر میں ناکامیاب ہوئیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ مقصد ناقابل حصول ہے عالمگیر سلطنت کا خیال عالمگیر مذہب کے خیال کے مماثل ہے۔ مذہب عیسوی اس امید میں سرخوش ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن ساری دنیا کو اپنے حلقے میں داخل کر لے گا اور اگرچہ یہ امید ابھی تک پوری نہیں ہوئی ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا پورا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ جس طرح مذہب عیسوی اس یقین سے دست بردار نہیں ہو سکتا کہ وہ دنیا کا واحد مذہب ہو کر رہے گا۔ اسی طرح انسانی سیاسیات تمام ہی نوع انسان کو ایک نظام میں لانے کی کوشش سے باز نہیں رہ سکتی۔ اگرچہ بعضی کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو وہ خود صاف صاف اس راستہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جو منزل مقصود کو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی

گزشتہ زمانہ
میں اس عالمگیر
سلطنت کے
حصول کی
کوششیں

ہیں اُن غلط راستوں سے متنبہ بھی کرتی ہے جن میں عالمگیر سلطنت کے قبل از وقت حصول کے دیوانہ دار جوش میں ماہرین سیاسیات تک بھٹک گئے ہیں۔ جب سے پہلی بار ایک عالم سلطنت کا انسانی احساس یورپ میں پیدا ہوا ہے اس وقت سے ہر زمانے میں اپنے اپنے طریقے پر اُس کے لئے کوششیں ہوتی رہی ہیں۔

سکندر اعظم
کی شاہنشاہی

اول۔ سکندر اعظم۔ مقام لوسا (ایران) میں سو جوڑوں کی تقریب شادی کے موقع پر سکندر نے اپنے خیال سے دنیا کو اشارۂ آگاہ کر دیا تھا۔ اس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ یونانیوں کے مردانہ جوش کا عقد ایشیائیوں کی زنانہ حسیتی و نزاکت سے کرنا چاہتا ہے مقصود یہ تھا کہ مشرق اور مغرب باہم متحد و مخلوط ہو جائیں اور اس جام محبت کے سرستوں کے اختلاط باہمی سے ایک نئی نفع انسانی پیدا ہو جو ایک عظیم الشان ربانی و انسانی شاہنشاہی کے حصول سے اپنا اطمینان حاصل کرے۔ بہر حال اس طور پر آنے والی صدیوں کی تہذیب و تعلیم کے لئے سکندر نے ایک روش مقرر کر دی اور ایشیائی کی نئی سرزمین میں یونانی تہذیب کے تخم نے خوب ہی سرسبز و شادابی حاصل کی مگر دنیا کی ایک سلطنت قائم کرنے کی یہ پہلی شاندار کوشش کچھ دیر پائنا بت نہیں ہوئی اور سکندر کی موت سے مایوسانہ طور پر تباہ ہو گئی، مگر اس تباہی کا باعث صرف فلک کچ رہتا ہی قرار دینا درست نہ ہوگا جس نے اس نئی عالمگیر سلطنت کے بانی کو یکساں استقامات قائم کرنے اور آئندہ کے لئے سامان مہیا کرنے کے قبل ہی عین عنفوان شباب میں جام مفارقت پلا دیا بلکہ متضاد اجزاء کا اختلاط بجائے خود ایک غیر فطری چیز تھا اور جو خیال اس تہذیب کا محرک ہوا وہ خود ہی دھندلا تھا۔ اس امتزاج سے سیاسی خیالات پریشان ہو گئے۔ ادھر یونانی سلطنت کو آزادانہ طور پر انسان کی نبائی ہوئی نئے نئے سمجھتے تھے، ادھر ایرانی حکومت کو آسمانی منصب جانتے تھے۔ ان دونوں میں اتحاد نہیں ہو سکتا تھا یہیں ممکن تھا کہ مقدونیہ کی شاہی ایک ایشیائی مذہبی سلطنت بھی بن جاتی۔ ایشیائی تو یہ یقین کرنے کو آمادہ تھے کہ سکندر برترین خدا کا فرزند ہے مگر خود یورپ والے اس کو الوہیت کا اعزاز دینے کے خیال تک سے منقض ہوتے تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ نسلیں گڑبڑ ہو گئیں۔ یونان کے علوم و تہذیب نے ایشیائیوں کو مذہبی اور سیاسی قیود کی پابندیوں سے تو آزاد کر دیا مگر اس کا اثر زیادہ تر یہ ہوا کہ

قدیم نظام ٹوٹ پھوٹ گیا اور اس کی جگہ بر کوئی نیا نظام وجود میں نہ آیا انسان کو اوصاف الوہیت سے محض کر دینے سے قدیم دیوتاؤں کی عظمت جاتی رہی تھی۔ یورپی تہذیب بے باک نہ میاشی کی صورت میں تبدیل ہو گئی اور مشرق کی پستی کے مکمل کر دینے میں اور معاون بن گئی۔ عالمگیر مملکت حاصل کرنے میں اہل روم کے مساعی نے زیادہ دیر یا نتیجہ پیدا کیا رومن شہنشاہی ایک عالمگیر شہنشاہی تھی۔ تمام رومن قوم یہ سمجھتی تھی کہ تمام روئے زمین پر اپنے خیال سلطنت کے پھیلائے اور تمام قوموں کو رومن اقتدار کے تحت میں لانے کے لئے وہ مہوش ہوئی ہے۔ اہل روم کی طبیعت کی مردانگی اور ان کی قوت بازو نے انھیں ان متدد اقوام پر غاب کر دیا جنھوں نے روم کی فاتحانہ رفتار کے مقابلے کی جرأت کی تھی اور قبل ہی مدت میں اپنی کوہ وقار قانونی تنظیم کے ساتھ روم کی سلطنت تین براعظموں میں مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی۔ اہل روم کا عظیم ترین شخص قیصر جولیس شہنشاہی کا خیال اپنے اخلاف کے لئے ورثے میں چھوڑ گیا، اور اس خیال میں اس نے ایسی قوت مہیا کر دی جس نے قومی حدود سے گزر کر دنیا کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

ہر روم کی
شہنشاہی

اہل روم کی کوشش بر بھی عالمگیر تاریخ کی عدالت میں محاکمہ ہو چکا ہے۔ یہ کوشش سکندر کی کوشش کی طرح قوموں کے اختلاف پر مبنی نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد ایک قوم واحد کی اعلیٰ فطرت پر تھی جس نے یہ چاہا کہ اپنا قومی اخلاق تمام نوع انسان میں پھیلا دے یعنی تمام دنیا کو رومی بنا دے۔ یہی اس کا گناہ تھا۔ کوئی قوم ایسی جلیل القدر نہیں ہو سکتی کہ تمام نوع انسان کا احاطہ کرے اور دوسری قوموں کو اپنی آغوش میں فنا کر دے۔ روم کی عالمگیر سلطنت یونٹن قوم کے تازہ جوش جوانی سے نگر کر تباہ ہو گئی۔ وہ جرمانیوں کو فتح نہ کر سکی اور صدیوں کے جدال و قتال کے بعد جرمانیوں ہی نے اسے پامال کر دیا۔

سہ صدیوں میں
شہنشاہی

اس کے بعد پھر کبھی عالمگیر سلطنت کا خیال سیاسی مطلع پر ایسی شان و شوکت کے ساتھ ظہور نہیں ہوا اگر کبھی تمام غروب بھی نہیں ہوا ازبک متوسط میں نے رومانی اور یونانی اجزاء کے ارتباط باہمی کے ساتھ اسے اپنے طور پر حاصل کرنے کی پھر کوشش کی گئی۔ اول فرنگ کی شاہی کے ذریعے سے، بعد ازاں رومن جرمانی شہنشاہی کے ذریعے سے، یہ سچ ہے کہ انھوں نے زیادہ معتدل حد کے اندر کوشش کی مگر اس سے بھی حصول صداقت میں اہم تر تھی ہوئے بغیر نہیں رہی، اب یہ خیال نہیں رہا تھا ایک اعلیٰ اور مطلق اقتدار ہو جو قوم کی تمام زندگی پر یکساں حکومت کرتا ہو۔

اس اثنا میں عیسائیت نے سلطنت و مذہب کے سخت ٹخاٹ کو ظاہر کر دیا تھا۔ یہ تیناٹ انسان کے لئے نیا جے سے بھرا ہوا تھا۔ سلطنت اپنے اس حق سے دست کش ہو گئی تھی کہ وہ لوگوں کے ایمان و ایقان پر اپنے قوانین کے ذریعہ سے حکومت کرے، اس نے اس امر کو تسلیم کر لیا تھا کہ اُس کے سوا ایک مذہبی جماعت بھی ہے جو زندگی کے خاص اصول رکھتی ہے اور جو خود سلطنت ہی کی طرح (مگر اس سے مختلف) ایک مرنی جسم بھی رکھتی ہے اور حقیقتاً آزاد ہے۔ یہ ایک ایسی روک تھمی جو سلطنت کو علی الاطلاق تسلط کے عمل میں لانے سے باز رکھتی تھی۔ وہ مجبور تھی کہ مذہبی زندگی کو کلیسا کی رہبری میں دیدے۔ و حقیقت سلطنت نے کلیسا کے ساتھ اپنے تعلق کو کبھی بھی پوری وضاحت کے ساتھ نہیں سمجھا مگر مذہبی اعتقاد کی آزادی اور خدا کی عظمت دینا دی حکمران کی بے لگام مرضی سے محفوظ رہی عیسائیت کی قوت کا انحصار دنیا کی حکمران پر نہیں تھا۔

علاوہ ازیں عیسوی عالمگیر سلطنت کا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ مختلف قوموں کو ہضم کر جائے یا انھیں معدوم کر دے بلکہ وہ ان سب کو امن اور انصاف کا اطمینان دلانا چاہتی تھی۔ ازمنہ متوسط کا رومن شاہنشاہ تمام قوموں کا حاکم علی الاطلاق نہیں تھا بلکہ وہ ان کے حقوق اور ان کی آزادی کا ایک عادل محافظ تھا۔ اس طرح شاہنشاہیت کا جیال پاک و صاف ہو کر فریڈرک ثانی جیسے مدبر اور ڈانٹے جیسے صاحب فکر کی معنی آفرینوں کی جولا نگاہ بن گیا۔ ازمنہ متوسط کی شاہنشاہی حقیقی آزاد سلطنتوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو اپنی آغوش میں لے ہوئے تھی، جو حقیقت ایک عام نظم میں متحد اور عرفاً شاہنشاہ کے ماتحت تھیں، مگر اپنے تمام اہم امور میں آزاد اور اپنی ہی مرضی پر چلنے والی تھیں یہاں تک کہ (ایک ہی سلطنت کے اندر) بتائیں قوموں اور نسلوں کو بھی مراعات و محافظت حاصل تھی مگر جو امر فی نفسہ عالمگیر سلطنت کی نشو و نما میں ترقی کا باعث تھا وہی اُس کی خرابی کا بھی سبب ہو گیا کیونکہ خود انداز ضرورت کی طرح طور پر اس کی پیروی کی جانے لگی۔ افتراق کا میلان اتحاد کی اہمیت سے زیادہ قوی تھا۔ قومیتوں کے بتائیں اور زبانوں کے اختلاف نے فرانس اور جرمانیا کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا اور فرنگ کی عالمگیر بادشاہی کے دو ٹکڑے کر ڈالے۔ جرمانی بادشاہ اور رومن شاہنشاہ کی کمزور طاقت چھوٹے چھوٹے حکمرانوں اور مقامی امرا کے قیام کا مقابلہ نہ کر سکی۔ مرکزی تنظیم کی کوئی مرکزی بنیاد نہیں تھی اور اسلئے

محیط قوتیں بہت زور پکڑ گئیں اور شاہنشاہی کے پر خچے اوڑ گئے یہ کوشش دوبارہ ناکام ہوئی مگر آنے والی نسلوں کے لئے اہم سبق چھوڑتی گئی۔

ہنرورین اول
کی شاہنشاہی

ہمارے زمانے (اٹھویں صدی) میں شاہنشاہ ہنرورین اول نے ایک بار پھر ارادہ کیا کہ اس خیال کو جو ایک مدت سے فراموشی میں پڑا تھا پھر زندہ کرے اُس نے ازمندہ وسطی کی غلطی سے بچ کر کامل احتیاط کے ساتھ ایک مضبوط کارکن مرکزی طاقت قائم کی مگر جو سچی ترقیاں ازمندہ وسطی میں ہو چکی تھیں اُن کو قائم رکھنے کی طرف اُس نے کافی توجہ نہیں کی۔ غیر قومیوں کا اُس نے بہت ہی کم لحاظ کیا اور اس طرح وہ اُسی راستے پر بڑھ گیا جو اس کے قبل اہل روم نے اختیار کیا تھا گو کہ یہ ضرور ہے کہ اُس نے رومیوں کے بہ نسبت زیادہ اعتدال سے کام لیا۔ اس کی خواہش یہ تھی کہ یورپ کو ایک وسیع بین الاقوامی سلطنت کے طور پر مرتب کرے، اور منفرد سلطنتیں اس کے اعضاء و ارکان کی حیثیت سے ہوں۔ شاہنشاہی اقتدار فرسسی قوم کو حاصل ہو، جو قوموں کے اس بڑے خاندان میں بمنزلہ سرگروہ کے ہو۔ اس نے ایک نشست میں وہ بات حاصل کرنا چاہی جس کے لئے اہل روم نے صدیاں صرف کر دی تھیں وہ اس منصوبے میں ناکام رہا مگر اس مرتبہ جرمانی قوم کی مقاومت کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا کیونکہ وہ تو بادل خواستہ فرانسیسی قومیت کو مان چکے تھے، مگر ہنرورین کے اس نظم و ترتیب کے متعلق ان کی اطاعت کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ خود بھی پرانی شاہنشاہی سے مایوس ہو گئے تھے اور اپنے آبائی ملک کی صورت حال سے بےزار تھے، صرف دو بڑی جرمانی سلطنتوں نے پیہم جنگ کے ذریعے فرانس کی قومیت کے مقابلے کی کوشش کی ایک ان میں سے حوصلہ مند پروشیا تھی اور دوسری کئی مختلف ملکوں اور قوموں کا مجموعہ آسٹریا وہ اپنی بقا کے لئے فکر مند تھی اور یہ اپنے آپ کو ایک شاہنشاہی سلطنت سمجھتی تھی مگر فالتو مدبر اور سیر سالار (یعنی ہنرورین) نے ان دونوں کو بھی مغلوب کر لیا لیکن انگریز جن کی قومی جبلت میں قدیم جرمانی (یا یوٹن) نسل کے خیالات آزادی کے ساتھ جن میں ایک جلیل القدر تاریخی احساس قومیت بھی شامل تھا ایک صعب دشمن ثابت ہوئے اور ان کی مقاومت پر غالب آنے میں ہنرورین ناکام رہا۔ اُدھر روسی جو اُس وقت تک نیم وحشی تھے شکست کھا کر میدانوں کی طرف ہٹ گئے مگر مغلوب نہیں ہوئے جب متحدہ یورپ فرانس پر حملہ آور ہوا تو اس مصیبت کے وقت فرانسیسیوں نے کچھ استقامت نہیں دکھلائی

پس پولیس کا خیال بھی علی صورت اختیار کرنے سے اُسی طرح ناکام رہا جیسے اس کے قبل رومی ناکام رہ چکے تھے اور اس ناکامی کے وجوہ و اسباب بھی وہی تھے۔ فرانسیسیوں کے سوا اور تمام قوموں نے اس عالمگیر بادشاہی سے خود کو خطرے میں سمجھا اور دنیا کی اس نئی حکومت کی طرف سے ان کو اعتماد و اطمینان بھی نہیں دلایا گیا اس کے ساتھ ہی فرانسیسی قوم میں اتنی قوت بھی نہیں بچی کہ وہ ہمیشہ انہیں محکوم رکھ سکتی۔

لیکن اس اثناء میں خود زمانہ جس پر کسی کا قابو نہیں برابر اپنا کام کرتا جا رہا ہے وہ قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لا رہا اور تمام نوع انسانی کے عالمگیر احساس کو پیدا کر رہا ہے اور عام انتظام عالم کے لئے یہ ایک فطری تیاری ہے یہ محض اتفاق ہی اتفاق نہیں ہے کہ جدید تحقیقاتیں اور آمد و رفت اور رسل و رسائل کے بے شمار نئے ذرائع سب کے سب اس غرض کو پورا کر رہے ہیں اور درجہ جدید کے تمام علوم اس تحریک کے عقب میں چل رہے ہیں اور وہ خاصہ تمام نوع انسانی کی ملک سمجھے جاتے ہیں اور صرف ضمنی طور پر کسی خاص قوم کے لئے مختص ہوتے ہیں، مگر ذرا دیر بعد در و رک اور حجاب جو مختلف قوموں کے درمیان حائل تھے اب رفع ہوتے جا رہے ہیں۔ آج بھی تمام یورپ یہ محسوس کرتا ہے کہ ہر خلل جو کسی خاص سلطنت میں پیدا ہوتا ہے اس کا نتیجہ کل یورپ کو برداشت کرنا پڑتا ہے اور براعظم کے انتہائی حدود پر بھی جو کچھ پیش آتا ہے فوراً ہی اس سے عام دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے، اس وقت بھی یورپ کا جوش طبیعت تمام کرۂ ارض کو اپنے حلقہ اثر میں لا رہا ہے اور آریائی نسل یہ محسوس کرتی ہے کہ اعظام عالم کا فرض اس پر عائد کیا گیا ہے۔

ابھی ہم اس حد تک نہیں پہنچے ہیں مگر اس وقت بھی ارادے اور قوت کی اتنی کمی نہیں ہے جتنی روحانی زندگی کی ہے، یورپی خاندان اقوام کے ارکان دوسری قوموں پر اپنی فوقیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں مگر یہ ارکان خود اپنے آپس کے تعلقات اور اپنے ذاتی امور کو صاف اور واضح طور پر سمجھنے سے ابھی تک قاصر ہیں اُس وقت تک کسی قطعی نتیجے کا امکان نہیں ہے جب تک کہ علم کا نور افشان لفظ اس امر خاص اور فطرت انسانی کی نسبت کوئی فیصلہ صادر نہ کر دے اور (دینا کی) قومیں اُسے ماننے کے لئے تیار نہ ہوں۔

جب تک ایسا نہیں ہوتا اس وقت تک عالمگیر شاہنشاہی صرف ایک خیالی شے رہے گی جس کے پیچھے بہت لوگ سرگرداں ہیں مگر جسے کوئی تکمیل کو نہ پہنچا سکا۔ لیکن اس

نوع انسان
کے ایک شریک
انتظام کے
میلان

لحاظ سے کہ عالمگیر شاہنشاہی کا قیام آئندہ زمانے میں یورپی ہونے والی شے ہے۔ عام
نظریہ سلطنت اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔ صرف عالمگیر شاہنشاہی میں سچی انسانی سلطنت
کا اظہار ہو گا اور اسی میں بین الاقوامی قانون ایک اعلیٰ شکل اور ایک یقینی ہستی حاصل
کرنے گا۔ عالمگیر شاہنشاہی کے ساتھ منفرد سلطنتوں کا تعلق ہے جیسا قوموں کا تعلق
نوع انسان کے ساتھ منفرد سلطنتیں عالمگیر شاہنشاہی کے اعضا و جوارح ہیں اور انسانی
اعضا کی طرح یہ اعضا بھی ایک جسم میں مرتب ہو کر ایک دوسرے کے مدد و معاون ہو سکتے
اور اپنے مدعا کو حسب و نحوہ حاصل کر سکتے ہیں عالمگیر شاہنشاہی کا مقصد منفرد سلطنتوں
کو توڑ دینا اور قوموں کو دبا لینا نہیں ہے بلکہ سلطنتوں کے لئے امن اور قوموں کے لئے
آزادی کا بہتر طریقہ پر حاصل کرنا اس کا مطمح نظر ہے۔ پس سلطنت کا بلن ترین تصور جو بھی ہو
عملی صورت اختیار نہیں کر سکا ہے یہ ہے کہ سلطنت بنی نوع انسان کی ایک منتظرہ صورت
ہے مگر مردانہ شکل و شکل کے ساتھ نہ زمانہ صورت میں، کیونکہ سلطنت مرد ہے۔

تعلیقات: (۱) وینٹ (ساکن واڈ) جیسے ذی جوہر اور صداقت پسند شخص نے
اپنی کتاب "انفرادیت و اجتماعیت" میں عالمگیر سلطنت کے خیال پر یہ اعتراض کیا ہے
کہ وہ نوع انسان کی تمام زندگی کو جذب کر لے گی، شخصی آزادی کے اصول کو توڑ دے گی
اور ایمان و یقین اور علم پر ایک غیر مناسب حد تک دنیاوی حکومت قائم کر دے گی
یہ اعتراض ہمیں مجبور کرتا ہے کہ اس خیال کو زیادہ صحت کے ساتھ مردود کر دیں۔

سب سے اول تسلیم کرنا پڑے گا کہ سلطنت ہی واحد انسانی اجتماع نہیں ہے
بحکم انسانیت کی ہی ایک شکل نہیں ہے، کلیسا بھی اپنی ظاہری وارضی (دنیاوی) حالت کے
اعتبار سے انسانیت کی ایک جماعت اور مجسم ہستی ہے، بہر صورت یہ مسلم ہے کہ سلطنت
کی سیاسی حکومت انسان کی مذہبی زندگی کو معین نہیں کرتی اور نہ انفرادی ضمیر و عقیدے
کی آزادی کو خطرے میں ڈالتی ہے۔

ثانیاً یہ کہ سلطنت کی انسانی نوعیت کے اعتبار سے یہ نتیجہ بھی نہیں نکلتا کہ
سلطنت افراد پر جزا و کلا حکمراں ہے، ہر فرد انسانی میں دو ممیز حیثیتیں پائی جاتی ہیں۔

(۱) دینی
کے اعتراضات

ان اعتراضات
کی جوابات

ایک حیثیت انفرادی اور دوسری حیثیت مشترکہ انسانی کوئی فرد واحد بشمول دیگر افراد تہا متہ قوم یا مائیں کی ملک نہیں ہے اور اس لئے وہ کلیتہً سلطنت کی ملک بھی نہیں ہے جو زمین پر زندہ جماعت ہے۔ سلطنت کی بنا فطرت انسانی پر ہے مگر نہ اس حد تک جو انواع و اقسام کے تغیرات کے ساتھ لاکھوں افراد میں ظاہر ہوتی ہے بلکہ اس حد تک جس قدر کہ انسانیت کی مشترکہ فطرت ایک شخص میں ظاہر ہوتی ہے اور اس لئے سلطنت کا اختیار اس حد سے آگے نہیں بڑھتا جس قدر کہ مشترکہ اعراض و اجتماع انسانی کے لئے ضروری ہے۔ خود سلطنت جب غلطی سے انفرادی آزادی کے حدود میں مداخلت کر بیٹھتی ہے تو وہ اپنے حکم کی تعمیل کرانے کی قوت نہیں رکھتی کیونکہ وہ شخصی طبیعت کو پاب نہ بخیر نہیں کر سکتی یعنی شخصی روح کو ہلاک نہیں کر سکتی۔

بہت تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں کہ لورین (Laurent) نے بھی اپنی کتاب "تاریخ حقوق انسان" (Histoire d'udrail desgens) میں اپنے کو عالمگیر سلطنت کے خیال کا مخالف ظاہر کیا ہے۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں۔

(الف) عالمگیر سلطنت ایک عالمگیر شاہی ہوگی اور یہ سلطنتوں کے اقتدار شاہی سے توافق نہیں پیدا کر سکے گی۔

(ب) افراد کی شخصیت فطری اور قوموں کی شخصیت مفروضہ میں فرق ہے اول الذکر ناقص ہیں اور خراب جذبات سے موثر ہوتے ہیں ثانی الذکر مکمل اور با اخلاق ہستی ہیں۔ اس غرض سے کہ اول الذکر باہمدگر زندگی بسر کر سکیں قوت سلطنت کی مسلسل مستعدی کی ضرورت ہے۔ مگر ثانی الذکر کو باہمدگر زندگی بسر کرنے کیلئے اس آمادہ کاری کی ضرورت نہیں ہے اور ہے بھی تو بہت ہی مستثنیٰ صورتوں میں۔

(ج) فرداً فرداً ہر شخص کمزور ہے اور اسکے لئے قوت سلطنت کے تالیف ہونا لازمی ہے۔ سلطنتیں قومی ہیں اور اس لئے وہ کسی اعلیٰ طاقت کے سامنے سر نہیں جھکا سکتی۔

(د) اگر عالمگیر سلطنت اتنی قوی ہوئی کہ وہ سلطنتوں کو ان کی مرضی کے خلاف مجبور کر سکے تو یہ فوقیت انسان اور آزادی میں خلل انداز ہوگی کیونکہ جہاں مقاومت غیر ممکن ہوتی ہے آزادی باقی نہیں رہ سکتی۔

(ه) افراد کی ترقی کے لئے قومی سلطنت ضروری ہے اور اسکے لئے اتنا شاہی

لورین کے
اعتراضات

کافی بھی ہے، افراد کی بہبود کے لئے عالمگیر سلطنت کی ضرورت نہیں ہے اور قوموں کی ترقی کیلئے یہ عالمگیر سلطنت خطرناک ثابت ہوگی۔

میرے معزز دوست دلائل مجھے اپنا عقیدہ بناسکے میں ان کا جواب یہ دوں گا۔ کہ

(الف) عالمگیر سلطنت کا خیال شاہی سرکردگی یعنی شہنشاہی کی صورت میں بھی ذہن میں آسکتا ہے اور جمہوریت کی شکل میں بھی یہ جمہوریت خواہ ایک نظامت کے تحت میں قائم کی جائے (میں اس وقت صرف یورپ کے دول خمسہ کا خیال کر رہا ہوں) یا سلطنتوں کی مشترکیت و اتحاد کی صورت میں ہو، کسی صورت میں بھی اس عالمگیر سلطنت کے لئے اختیار مطلق کے خیال کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور قومی سلطنتوں کا مسلسل قیام و بقا حدود و اختیارات میں تمیز کو خود لازمی کر دے گا۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ عالمگیر سلطنت کے حدود و اختیارات کو دنیا کے مشترک معاملات یعنی دنیا کا امن قائم رکھنے، دنیا کی تجارت اور بالخصوص بین الاقوامی قوانین کے محفوظ رکھنے کے اغراض سے آگے بڑھائے اس کا نمونہ ایک متفقہ سلطنت یا ایک متفقہ شہنشاہی میں مل سکتا ہے جس میں عام متفقہ معاملات کا انصرام مشترک قانون، مشترک انتظام اور مشترک عدالت کے ذریعے سے ہوتا ہو، اور جو معاملات خاص اپنے اپنے ملک سے متعلق ہوں ان میں منفرد سلطنتوں کا اقتدار شاہی برابر تسلیم کیا جاتا ہو۔

(ب) مثل افراد کے قومیں بھی اپنی کمزوریاں اور اپنے جذبات رکھتی ہیں اور اگر بین الاقوامی قانون نہ ہوتا تو جو قومیں کمزور رہے بس ہیں وہ بہت آسانی کے ساتھ طاقتور اور حریص قوموں کا شکار ہو جاتیں، قانون بین الاقوامی کی بنا عالمگیر سلطنت کی بھی اصل دینا ہے۔

(ج) قومی سلطنتوں کی قوت، عالمگیر سلطنت کے مقابلے میں بھی بہتر ضمانت اس لئے ہے کہ اگر کسی قسم کی تبدیلی نہ کر سکے گی، لیکن عظیم ترین قومی سلطنت بھی اگر وہ غلطی پر ہے تو اس میں اتنی قوت نہ ہوگی کہ وہ نہ تمام دنیا سے جنگ کر سکے، جنگ صرف اس وقت ممکن ہوگی جب سلطنتوں کے گروہ یا مختلف فریق ایک دوسرے کے مخالف ہو جائیں اور نہ اور تمام صورتوں میں جنگ عالمگیر عدالتوں کے عدالتی فیصلوں کی تعمیل ہوگی۔ بہترین

سیاسی انتظامات بھی ہیں غماز جنگوں سے کامل طور پر موزن نہیں کر سکتے اور اگر بین الاقوامی قانون کا ایک زیادہ مضبوط انتظام سلطنتوں کے درمیان جنگ کو کم کر دے تو ہمیں اسی پر قناعت کرنا چاہئے۔ انصاف کبھی اپنے منہ سے خیال پر نہیں کہہ سکتا بس بہتوں صورتوں میں صرف اس کے قریب تک پہنچ جاتا ہے۔

(۵) مملکیتِ شاہنشاہی قومی سلطنتوں کے مقابلے میں ہر اعتبار سے کم طاقتور ہوگی اس لئے اگر جو اقتدار ایک قومی سلطنت کو اپنے اہل ملک کے مقابلے میں حاصل ہوتا ہے وہ قومی سلطنتوں کے مقابلے میں عالمگیر سلطنت کو کسی طرح حاصل ہی نہیں ہو سکتا اور باوجود قومی سلطنت کے اس اقتدار سے باشندگان ملک کی آزادی کو کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ سلطنت کے نظم و ترتیب کے ذریعے اس کی اور حفاظت ہوتی ہے۔

(۶) سلطنت تمام انفرادی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتی، علوم و فنون ادبیات اور تجارت وغیرہ کے بہت سے ہمہ گیر روحانی اور مادی اغراض ایسے ہیں جو صرف ایک کامل عالمگیر سلطنت ہی سے کماحقہ حاصل ہو سکتے ہیں۔ یورپ و افریقہ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ہمارے وقت میں یورپی پوری قوموں تک کے حقوق کس قدر کم محفوظ ہیں۔

یورپین بین الاقوامی قانون کی بنائسل انسانی کے اتحاد پر قرار دیتا ہے اور کوئی دوسری بنا اس کے لئے ہو بھی نہیں سکتی مگر وہ اس اتحاد کو محض ایک اندرونی اتحاد سمجھتا ہے۔ میرے خیال میں منطق اور نفسیات دونوں یہ چاہتے ہیں کہ اندرونی قوت خود کو خارجاً بھی ضرور ظاہر کرنا چاہئے اگر نوع انسان اندرونی طور پر واقعی ایک ہستی ہے تو اپنے پیروں کی حالت میں وہ اپنے کو خارجاً بھی مثل ایک شخص کے ظاہر کرے گی اور نوع انسان کی تنظیم ہی عالمگیر سلطنت ہے۔

میں جانتا ہوں کہ میرے بہت سے ہم عصر اس خیال کو محض ایک خواب سمجھتے ہیں مگر اس وجہ سے میں اپنے اعتقاد کے اظہار اور اس کی حمایت سے باز نہیں رہ سکتا۔ آئیو الی نسلیں شاید اب سے صدیوں بعد اس سوال کا آخری فیصلہ کر سکیں گی۔

تفسیر باب

تخیل سلطنت کے نشو و نما کی تاریخ

(۱) دنیا کے قدیم

الف یونانیوں کا تخیل سلطنت

صحیح معنوں میں علم سیاست کی ابتدا یونانیوں میں ہوئی جس طرح دیگر علوم و فنون اور فلسفہ کے متعلق انسان کی خود آگاہی کا اظہار اول اول یونان میں ہوا وہی کیفیت سیاسیات کی بھی یہی ہے۔

یونانیوں کے
سیاسی تخیلات

یونانی سلطنت کے حدود ارضی جس درجہ مختصر تھے اور اس کی طاقت جس درجہ محدود تھی وہ ظاہر ہے، مگر وہ اصول جن پر یونانیوں کے سیاسی تصورات مبنی تھے، نہایت وسیع اور جامع تھے اور یونان کے اصحاب فکر نے جس سیاسی تخیل کا اظہار کیا ہے وہ ایک بلند رتبہ اور شریفانہ تخیل ہے۔ وہ سلطنت کی بنا کو فطرت انسانی پر قائم کرنے اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ صرف سلطنت ہی میں انسان تکمیل کو پہنچ سکتا اور حقیقی طمانیت حاصل کر سکتا ہے ان کے نزدیک سلطنت ہی دنیا کا وہ اعلیٰ نظام ہے جس سے فطرت انسانی اپنی غرض کو پورا کر لیتی ہے۔

افلاطون نے اپنی کتاب (Republic) میں یہ بلند پایہ الفاظ درج

افلاطون

افلاطون نے جو کتاب اس نام سے لکھی ہے یا جو اس نام سے اس کی طرف منسوب ہے اس میں نہ صرف سیاست پر بحث ہے بلکہ جملہ ان نظامات عامہ پر اس نے اظہار خیال کیا ہے ہمارے زمانے میں (Republic) کے معنی سلطنت جمہوری کے ہیں مگر اس زمانے میں اس کے یہ معنی نہ تھے بلکہ محض جمہور کے مفہوم میں یہ لفظ بولا جاتا تھا۔

کے ہیں کہ سب سے بہتر سلطنت وہ ہے جو اپنی عضو بندی میں سب سے زیادہ انسانی حالت کے قریب پہنچ سکے جسم کے ایک حصے پر اگر کوئی آفت آتی ہے تو تمام جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا اور سارا جسم اس تکلیف رسیدہ عضو سے ہمدردی کرتا ہے۔ اس عبارت سے اس نے سلطنت کی نہ صرف محض عضوی فطرت بلکہ انسان کی سی عضوی فطرت کو تسلیم کر لیا ہے گو کہ اس نے اس پر مغز خیال کے نتائج سے زیادہ اعتنائیں کی ہے۔

افلاطون کے نزدیک سلطنت انسانی تہذیب کا بلند ترین ظہور اور انسان کی مختلف روحانی طاقتوں کا تناسب اور ہم آہنگی جلوہ ہے یعنی سلطنت کامل انسانیت ہے۔ چونکہ روح انسانی عقل آگاہ (شعور) اور مردانہ جرات اور خواہشات پر حکمراں ہونا چاہئے اس لئے افلاطون تھیسٹا سلطنت میں عقل مندوں کو حکمراں ہونا اور بہادر جنگجویوں کو قوم کی حفاظت کرنا اور جو فرقے مادی پیداوار اور جسمانی کاموں میں مشغول ہیں انھیں ان دو اعلیٰ طبقوں کا مطیع ہونا چاہئے اور مودلت فرض یہ ہے کہ جسم سیاسی کے تمام تعلقات کو ان کی فطرت کے مطابق منضبط کرے۔

ارسطو کے سیاسی فلسفے کی عظمت ہمارے دلوں میں اسی قدر بڑھتی ہے جس قدر زیادہ ہم اس کے بعد کے مصنفوں کے تصانیف پر غور کرتے ہیں افلاطون کے بنیہت وہ پردہ از خیال کی پیروی کرتا ہے، واقعیت کو زیادہ تامل کے ساتھ جانچتا اور انسان کے ضروریات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اس غرض سے کہ حکما اور مجاہدین قوم کے حکمران طبقہ اپنی زندگی کو کلینہ سلطنت کے لئے وقف کر دیں افلاطون ان کو خاندانی زندگی سے علیحدہ کر لیتا ہے اور ان کے لئے مشترک ازواج و املاک مہیا کرنا چاہتا ہے برخلاف اس کے ارسطو چاہتا ہے کہ ازدواج اور خاندان اور شخصی جائیداد کے اہم اور بنیاد کی تنظیمات بدستور قائم رہیں۔ وہ سلطنت کو قبائل اور مقامات (یعنی قوم اور ملک) کی ایک مکمل اور خود کفیل زندگی کے باہمی ارتباط کا مجموعہ مانتا ہے وہ کہتا ہے کہ انسان فطرۃً ایک سیاسی حیوان ہے اور سلطنت فطرت انسانی کی پیدا کی ہوئی چیز ہے۔ سلطنت محض بقائے زندگی کے لئے وجود میں آئی ہے مگر اس کا قیام یا استمرار بہتر زندگی

کے لئے ہوتا ہے۔

سلطنت کے اس تخیل (یا انتہائے خیال) میں مذہب، قانون، اخلاق و معاشرت، علوم و فنون، تحصیل و ترتیب دولت و تجارت و حرفت، نفع و یزاینوں کی جگہ کو ششیں مجتمع و متحدہ ہیں، مگر انسان کو سلطنت ایک قانونی حیات عطا کرتی ہے، سلطنت سے علیحدہ نہ وہ محفوظ ہے نہ اسے آزادی حاصل ہے۔ غیر ملکی فطرتی دشمن میں اور مفتوح دشمن غلام ہو جاتے ہیں، سیاسی جماعت سے خارج ہوتے ہیں اور اس لئے ذلیل و متزلزل حالت میں ڈال دئے جاتے ہیں۔

چونکہ قدیم زمانے کی تمام سلطنتوں کی طرح یونانی سلطنت بھی ہمہ گیر طاقت کا منبع سمجھی جاتی تھی اس لئے اسے فی الواقع زائد از ضرورت طاقت مائل تھی سلطنت ہی سب کچھ تھی کسی شہری کی کوئی ہستی نہ تھی بجز اس کے کہ وہ سلطنت کا ایک رکن تھا، اس کی ہستی تمامہ سلطنت پر موقوف اور اسی کے تابع تھی۔ بیشک اہل ایتھنز کو ذہنی آزادی حاصل تھی اور وہ اس کو عمل میں بھی لاتے تھے مگر یہ صرف اس لئے ہوتا تھا کہ ایتھنز کی سلطنت میں فی نفسہ آزادی کی بڑی قدر و منزلت تھی، نہ اس لئے کہ وہ انسان کے حقوق کو تسلیم کرتی تھی یہی آزاد ترین سلطنت تھی جس نے سقراط کے قتل کی اجازت دی اور یہ سمجھتی رہی کہ وہ ایسا کرنے میں حق بجانب تھی۔ خاندانی آزادی، خانگی زندگی، ماں باپ کی تربیت بلکہ ازدواجی و فاشناری تک بھی کسی اعتبار سے سلطنت کی مداخلت سے محفوظ نہیں تھی شہریوں کی شخصی ملکیت تو لازماً اور بھی کم ہامون تھی۔ سلطنت ہر چیز میں دست اندازی کرتی تھی اور وہ اپنی طاقت کے لئے نہ کسی اخلاقی حد کو تسلیم کرتی تھی نہ کسی قانونی حد کو۔ وہ اپنے شہریوں کے جسم بلکہ ان کی ذہنی قابلیت تک کو جس طرح چاہتی تھی کام میں لاتی تھی، وہ عہدوں کے قبول کرنے پر لوگوں کو اسی طرح مجبور کرتی تھی جس طرح فوجی خدمت انجام دینے کے لئے افراد کو اول سلطنت میں فنا ہو جانا چاہئے تھا پھر اس کے بعد وہ سلطنت کے ذریعے سے دوبارہ زندہ ہو کر آزاد اور معزز زندگی پاسکتے تھے۔ سلطنت کی اس طاقت علی الاطلاق کے لئے قدیم رسوم و رواج کے اثر سے قطع نظر اگر کوئی حد تھی تو وہ حسب ذیل تھی۔

ایک تو اس طاقت کے عمل درآمد میں شہری خود بھی دخل رکھتے تھے اور اس خوف سے کہ

یونانی تخیل
سلطنت کے
تفصیل سے
سلطنت کو
زائد از ضرورت
طاقت مائل
کی گئی تھی۔

اس طاقت علی الاطلاق
کے حدود۔

مبادعوام کی خود مختاری خود ان کے لئے بھی باعث مضرت ہو جائے وہ سیاسی اشتراکیت کی انتہائی
نتائج سے بچتے رہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ایک شہر کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں شہریوں کو
اپنے جذبات کے عمل میں لانے کے لئے کچھ زیادہ موقع نہ ملتا تھا اور پھر وہ اپنے ہمسایوں
کا لحاظ کرنے پر بھی مجبور تھے اس کے علاوہ یونانی سلطنتیں یونانی قوم کے متفرق اجزاء اور
ان کی نسلوں کی تقسیم و تقسیم سے مرکب تھیں، اور ان کی حیثیت شہری جماعتوں سے کچھ زیادہ
ارفع نہ تھی پس اس طرح اس پُر فتنہ تخیل کی مادی صورت بہت حقیر سی تھی۔ اگرچہ
یہ تخیل کل نوع انسانی پر منطبق کیا جاتا تھا مگر عموماً وہ صرف کسی پہاڑ کی وادی یا کسی ساحلی قطعے
کے تنگ حدود کے اندر ہی اپنی طفلانہ ہستی کو روٹھا کر سکتا تھا۔

اس طرح قوت سلطنت کی اس خیالی راجدودیت اور اس کی علی بے بسی میں ایک گہرا تضاد
ہو گیا ہے۔ یونانیوں کے تصور سلطنت کے یہی دو بڑے نقص ہیں در نہ دیگر اعتبارات سے وہ
نہایت ہی قابل وقت، نظرات انسانی کے عین موافق اور نیچے کے لحاظ سے نہایت ہی باادب
رہا ہے۔

(ب) رومیوں کا تخیل سلطنت

(*)

تمام قدیم قوموں میں سب سے زیادہ اہل روم کی طبیعت قانون سلطنت سے مناسبت رکھتی تھی اور اُن کے ذہنی قوی سے زیادہ اُن کے اخلاقی خصائل اس کا باعث تھے اس لئے یونانی یونانیوں کے بہ نسبت اُن کا زیادہ اثر پڑا۔

پہلی نظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ رومیوں کا تخیل سلطنت یونانیوں سے بہت قریبی تعلق رکھتا ہے۔ سسرو نے اپنی سیاسی تحریروں میں ایتھنز کے نمونے کو برابر پیش نظر رکھا ہے رومن مضیفین جب قانون و سلطنت کی عمومی تشریح کرتے ہیں تو وہ فلاسفہ یونان خاص کر رواقیوں کا اتباع کرتے ہیں۔

یونانیوں کا اثر۔

سسرو سلطنت کو انسانی طاقت کی اعلیٰ ترین پیداوار قرار دیتا اور کہتا ہے کہ انسان کسی کام میں خداؤں کی مرضی سے اتنا قریب نہیں ہے جتنا سلطنتوں کی بنا ڈالنے اور اُن کو قائم رکھنے کی کوشش میں کہیں کہیں وہ بھی سلطنت کو انسان سے اور سرگروہ سلطنت کو انسانی روح سے مشابہ قرار دیتا ہے جو جسم پر حکومت کرتی ہے۔ لیکن بعض اہم خصوصیات میں رومن تصور سلطنت یونانی تخیل سے مختلف ہے۔

یونانی تخیل سے فرق

رومیوں ہی نے سب سے پہلے قانون کو اخلاق سے میز کیا اور اسے ایک معین شکل میں ڈھالا اور اس طرح سلطنت کی قانونی حیثیت کو زیادہ واضح طور پر نمایاں کیا۔ اس طرح انھوں نے سلطنت کی حد بندی کر کے اسے زیادہ استحکام اور قوت عطا کی۔ اب سلطنت ان کے لئے اخلاقی نظم عالم کا مجبوری نہیں رہی، بلکہ وہ ابتداء ہی سے ایک عام قانونی تنظیم بن گئی انھوں نے بہت کچھ معاشرتی رسم و رواج پر اور انسان کے جذبہ نہایت پر چھوڑ دیا رومیوں کا خاندان (یونانیوں کے بہ نسبت) سلطنت کی مداخلت سے زیادہ آزاد تھا۔ شخصی جائداد اور شخصی حقوق خود حکومت کے خود مختارانہ عمل کے مقابلے میں بھی بالعموم

۱۔ قانون کا اخلاقی سے میز کیا جانا

زباہد محفوظ تھے۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے بھی سلطنت کی بہبود کو برترین قانون قرار دیا حتیٰ کہ ان کے دیوتاؤں کی پرستش کا انتظام بھی سلطنت کی طرف سے ہوتا تھا۔ سلطنت جب اپنا مشاغل پرکرتی تو پھر کوئی اس کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا مگر بایں ہمہ رومی سلطنت نے اپنے حدود مقرر کر لئے تھے اور خود اپنے اختیار اور اپنے عمل کی وسعت کا حصر کر دیا تھا۔

مزید براں اہل روم "قوم" کے تصور کو تسلیم کرتے تھے اور انھوں نے نظام سلطنت اور قوم کے درمیان ایک عضوی تعلق پیدا کر دیا تھا۔ وہ بالا اعلان یہ کہتے تھے کہ قوم کی تنظیم شدہ ہیئت ہی سلطنت ہے اور قوم کی مرضی ہی کو وہ تمام قوانین کی اصل قرار دیتے تھے پس رومی سلطنت محض ایک مقامی جماعت نہیں رہی تھی بلکہ اس نے خود کو ایک قومی سلطنت کے بلند درجے تک پہنچا دیا تھا۔

علاوہ ازیں، رومی سلطنت کے لئے یہ مقرر ہو چکا تھا کہ وہ تمام دنیا کو اپنی آغوش میں لے لیگی۔ عالمگیر حکومت کا یہ میلان اہل روم کی تمام تاریخ میں جاری و ساری ہے۔ شہریت کے قومی قانون کے ساتھ قانون اجانب بھی شامل تھا۔ رومیوں کا شمار ابد قرار (روما) دنیا کا دارالحکومت ہو گیا گویا دنیا ایک انگشتری تھی اور روما اس انگشتری کا نگینہ رومی حکام کے اقتدارات محیط عالم ہو گئے تھے رومی سینات تمام قوموں اور ان کے بادشاہوں کا سینات ہو گیا۔ رومی قوم کی عظمت و شوکت بڑھتے بڑھتے شہنشاہی طاقت کی عظمت و شوکت کے درجے پر پہنچ گئی چنانچہ فلورس فخر سے کہتا ہے کہ روم کی تاریخ نوع انسانی کی تاریخ ہو گئی اس کوشش نے رومی تخیل سلطنت میں ایک ایسی جان ڈالی جس سے یونانی سلطنتیں بہت پیچھے رہ گئیں اور رومیوں کو ایسی عظمت نصیب ہوئی جس کے سامنے یونانیوں کو جھکنا پڑا۔ تمام دنیا پر جو قوت حکومت کر رہی تھی وہ کوئی وہی شے نہیں تھی بلکہ ایک حقیقی شے تھی جو اس زمانے کی ساری دنیا پر طغرائی کرتی تھی اور جس کے مقابلے کی جرات مغرب میں صرف جرمانی اور مشرق میں صرف ایرانی ہی کر سکے۔

۲۔ قوم کا تصور

۳۔ عالمگیر سلطنت کی طرف میلان -

چوتھا باب

(۲) ازمنہ وسطیٰ

جن دو جدید طاقتوں نے روما کی عالمگیر شاہنشاہی کو تبدیل پیکر اور ایک حد تک اُسے تباہ کر دیا وہ عیسائیت اور جرمانی قوم کی طاقتیں تھیں۔

(الف) عیسائیت

عیسوی مذہب نے یہودی سلطنت اور روما کی شاہنشاہی دونوں کے اقتدار سے یکساں انکار کر کے اپنی طاقت انسان کے دلوں میں جا گزریں کر دی۔ عیسائیت کا بانی کچھ اس دنیا کا بادشاہ نہ تھا۔ قدیم سلطنت نے اسے اور اس کے پیروں کو ہر طرح پرستایا یہاں تک کہ ان کے قتل سے بھی دریغ نہیں کیا۔ زمانہ اوائل کے عیسائی سلطنت کے براہ راست مخالف نہ بھی تھے مگر اتنا ضرور تھا کہ وہ سیاسی تنظیم اور سیاسی اغراض کو چھوڑ کر کچھ اور چیزوں کی طرف اہل حقے جیب عیسوی دنیا اور قدیم یونانی رومی سلطنت میں صلح و آشتی ہوئی اُس وقت مذہبی جماعت یعنی کلیسا کو اپنی مختص روحانی ہستی کا احساس ہو چکا تھا اور وہ خود کو محض سلطنت کا ایک محکمہ نہیں سمجھتا تھا نیا خیال بر شائع ہو گیا تھا کہ جماعت کی تمام و کمال روحانی زندگی اگرچہ سلطنت کی نگرانی اور اثر سے کلیتہً علیحدہ نہیں ہو گئی ہے پھر بھی وہ حقیقیً اس سے آزاد ہے۔ کلیسا اور سلطنت کی یہ نمایاں دو رنگی سلطنت کے حدار کے لئے ایک حقیقی روک ہو گئی۔ سلطنت اب صرف قانون و سیاسیات کی ایک جماعت رہ گئی تھی مذہب و عبادت سے اسے کوئی تعلق باقی نہیں رہا تھا۔

ابتدائی زمانے
کے کلیسا کی
روح سلطنت
کے متعلق۔

جب کلیسا نے اپنے لئے شہنشاہ سے جدا پوپ کے نام سے ایک ظاہری سرگروہ حاصل کر لیا اور روما کو اس کا مستقر قرار دیدیا تو عالمگیر تسلط کا قدیم یونانی مذہبی رنگ میں پھر ظاہر ہوا۔ اگرچہ اپنی زمانہ وسطیٰ والی وقت پر پہنچ کر بھی کلیسا کو اس امر میں کامیابی نہیں ہوئی کہ وہ سلطنت کو پست کر کے اسے محض ایک مذہبی محکمہ بنادے تاہم اس کی چمک دمک نے ایک مدت تک

باپائیت

سلطنت کے خیال کو خیر و کر ویا تھا کلیسا اپنے کو آفتاب سے اور سلطنت کو ماہتاب سے تشبیہ دیتا تھا اور انسانوں کی رگوں پر نگراں ہونے کی حیثیت سے اُن کے جمہوں کے حکمران پر تقدم کا دعویٰ کرتا تھا مگر سلطنت اور کلیسا کی یہ دو گونہ حیثیت برابر تسلیم ہوتی رہی اور مال کا سلطنت کی آزادی محفوظ رہ گئی شہنشاہ اور پوپ دونوں کی تلواریں یکساں طور پر خدا سے حاصل ہوئی تھیں جو دنیا کا برتر اور حقیقی حکمران ہے جہاں تک کلیسا کی تعلیم نے اثر کیا سلطنت کا تصور (جیسا کہ اس سے پہلے شرق میں ہو چکا تھا) پھر مذہبی بنیاد پر قائم ہو گیا۔ سلطنت کی طاقت خدا سے حاصل ہوئی تھی مگر اس کے ساتھ ہی سلطنت کی روحانی اہمیت نظر انداز کر دی گئی تھی اور اس کے سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی۔ تمام مذہبی زندگی کلیسا سے حاصل ہونا چاہیے تھی اور چونکہ سلطنت محض جسمانی خیال کی جاتی تھی اس لئے اُس کا درجہ پست رکھا گیا تھا۔ قومیت کے تنگ حدود سے سلطنت کے تصور کا وسیع ہونا اُس کا ناکافی معاوضہ تھا۔ سلطنت کا مطلق نظریہ انسان پر حکومت کرنا نہیں رہا تھا بلکہ صرف عیسائیوں کے امور و نیادی کا انصرام اس کا کام تھا۔ ازمنہ وسطیٰ کی حالت کے اعتبار سے رومن شہنشاہی کی تجدید اس طرح ہوئی تھی کہ اعلیٰ صفات میں کلیسا سے روم اور انی اہمیت میں جرمانی قوم کی رومی شہنشاہی اُس کی ناسندگی کرتی تھیں۔

(ب) جرمانی (یا یٹوٹن) قوم

روما کی قدیم مالگیر شاہنشاہی یٹوٹن نسلوں کے مقابلے و ان کا قائم نہیں رہ سکتی تھی ان جنگجو قبائل نے ایک صوبے کے بعد دوسرا صوبہ رومیوں کے تحت سے نکال لیا۔ ایسے اتفاقات بھی پیش آئے کہ رومی صوبہ داروں یا خود شاہنشاہوں نے اپنی مدد کے لئے یٹوٹن شاہزادوں سے فوجی مدد طلب کی اور اس طرح انھوں نے پُر امن طریق سے اقطاع ملک پر شاہی حقوق حاصل کر لئے۔ ازمنہ وسطیٰ میں مغرب میں ہر جگہ یٹوٹن حکمران تھے۔ انھوں نے کلیسا کی مذہبی تعلیم اور رومی تہذیب کے اثر کو قبول کر لیا تھا مگر شاہوں کے تحت اور امرا کے قلعوں پر انھیں قابض رہا عصا اور تلوار دونوں انھیں کے ہاتھ میں تھے۔

رومیوں کی طرح یٹوٹن ایک کامل سیاسی قوم نہیں ہیں۔ افراد کل قوم کے اقتدار علیٰ کی اطاعت باوالتی خواستہ کرتے ہیں۔ ان کی مضبوط، با اعتماد اور خود رائے شخصیت احساس عام میں مراغلت کرتی اور اس کی قوت کو رد کرتی ہے (پس اس وجہ سے قوم یٹوٹن کو رومیوں کے سیاسی

جرمانیوں
(یا یٹوٹنوں)
کی حالت

قوم یٹوٹن
کی حالت

انضباط سے سبق لینے کی ضرورت تھی (مگر بالآخر ہمہ تاریخ عالم میں سیاسیات کا ارتقاء ان کا بہت کچھ زیر بار احسان ہے۔ سب سے بڑھکر یہ کہ قوم ٹیوٹن نے رومی سلطنت کی مطلق انسانی کو توڑ دیا اور جدید سیاسی تنظیمات میں انفرادی و جماعتی اور طبقات کی آزادی کے لئے ایک با اثر جگہ حاصل کر لی۔ منوس کیونے بہت ہی سچ کہا ہے کہ مجالس شوری کے انتظامات کے ہم کو جبرائیا کے جنگلوں میں تلاش کرنا چاہئے جہاں قدیم غیر تمدن جرمانی قبیلہ سکونت پذیر تھے۔ ماسی گو مین نے ابتدائی صورتوں کا جو نقشہ کھینچا ہے کہ شاہان ٹیوٹن ایک جانب مقامی شہزادوں اور دوسرے امرا کے ساتھ اور دوسرے جانب آزاد اشخاص کی جماعت عظمیٰ کے ساتھ ملکر کام کرتے تھے اسی نقشے میں ہیں اس آزاد بنیادی حکومت کی ماہور اور ابتدائیت صاف نظر آتی ہے جو بعد کی صدیوں میں پیدا ہوئی۔

ٹیوٹنوں کے نزدیک قوم کی مرضی یا کم از کم اس کی براہ راست مرضی قانون کا ماخذ نہیں ہے وہ اپنے لئے ایک پیرائیشی حق کا دعویٰ کرتے ہیں جس کی حفاظت سلطنت کا فرض ہے مگر جب سلطنت پیدا نہیں کرتی اور جس کے لئے ایک ٹیوٹن ساری دنیا سے لڑنے کے لئے آمادہ رہتا ہے یہاں تک کہ خود اپنی (قومی) حکومت کے اقتدار کے مقابلے میں بھی سینہ سپر ہوتا ہے۔ وہ سلطنت کے اس قدیم پھل کا کہ جو کچھ ہے سلطنت ہی ہے، شدت کے ساتھ منکر ہے۔ پس اس طرح تمام نسبتیں الٹ گئی ہیں۔ ایک ٹیوٹن شخص کے نزدیک شخصی آزادی فائق ہے۔ اسے اس امر کی ترغیب دی جاسکتی ہے کہ وہ سلطنت کے لئے اس آزادی کا ایک حصہ قربان کر دے تاکہ باقی حصے کو وہ زیادہ محفوظ رکھ سکے۔

اس خصلت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جرمانی قبیل سلطنت رومی قبیل سلطنت کے بہ نسبت شخصی حقوق کی آزادی کی قطعاً و حتماً زیادہ وقت کرتا ہے۔ اس طرح شخص خاندان اور جماعت کی آزادی قدیم رومی شہنشاہی کے بہ نسبت زیادہ محفوظ اور زیادہ وسیع ہو گئی ہے۔ لہذا سلطنت کے حقوق کلیسا کے حقوق کے ساتھ ہی شخصی حقوق سے بھی محروم ہو گئے تھے۔

اس خصلت کا ایک دوسرا نتیجہ قانون عامہ کے لئے یہ ہے کہ جرمانی قومیں سلطنت کے اختیار مطلق کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتیں اور ان معاملات میں بھی نہیں جن کا اثر کلی جماعت پر پڑتا ہے بلکہ رومی تصور ان کے لئے ایک اجنبی چیز ہے۔ جب ان سے حکم مانے کو کہا جاتا ہے تو وہ رائے دینے اور فیصلہ کرنے میں شریک ہونے کے خواہاں ہوتے ہیں۔

انفرادی
حقوق کا
خیال

سیاسیات
میں

ان کے طبقات ایک سیاسی طاقت ہیں جس کے ساتھ بادشاہ کی طاقت کو متحد ہونا چاہئے تاکہ قانون وضع کئے جاسکیں۔ یہ خیال کہ سلطنت مجموعی حیثیت سے ایک شخص متصور ہو سکتی ہے جرمینوں کے لئے دور از کار اور بیشتر ناقابل فہم ہے۔ ان کا میلان زیادہ اس طرف ہے کہ سلطنت کو واقعی اشخاص یا واقعی اشخاص کی جماعتوں میں منقسم کر دیں۔ وہ اولاً یہ سمجھتے ہیں کہ سلطنت بادشاہ یا دوسرے والیان ملک میں جو محکمہ عدالت اور مجلس ملی کے سرگروہ ہیں یا تقاضوں اور قبیلوں اور قصبوں کے سرداروں میں مرکوز ہوتی ہے۔ اشخاص کا ایک گروہ بھی دوسرے گروہ کو تقویت دیتا ہے اور کبھی اس کے سردار ہو جاتا ہے۔ پس قوم کا سارا نظام جزئیات ملک میں آزادی کی روح سے بھرا ہوا ہے۔ لہذا اسے ترکیبی کا اتحاد نسبتاً کمزور ہے مگر ان اجزائی آزادی بجائے خود مستحکم ہے۔

قدامت کے
باقی دیتا

تخل سلطنت کے یہ تغیرات جن میں معتد بہ ترقی پائی جاتی ہے نظریہ کے نسبت عمل میں زیادہ نمایاں ہوتے ہیں۔ خود جرمینوں کا کوئی مخصوص سیاسی فلسفہ تھا ہی نہیں۔ ازمنہ وسطیٰ میں علوم اول اول کلیسا کے ہاتھ میں رہے اور اس کے بعد رومی اصول قانون اور یونانی فلسفہ کی روایات نے انھیں اپنا تابع بنالیا۔ قدیم قبائلی قوانین تک میں اس قسم کے اتنا ریا کئے جاتے ہیں مثلاً مغربی گوتمی قوانین میں قدیم روایات کے نتیجے میں جسم سیاسی کو انسان سے مشابہ قرار دیا ہے جس کا سر بادشاہ اور جس کے اعضاء قوم ہے مگر یہ محض تقلیدی انشا پر وازانہ نامش بھی۔ اس میں کوئی عمیق معنی نہیں تھے اور نہ ازمنہ وسطیٰ کی حقیقی سلطنتوں سے اس کی کوئی قطعی تطبیق کی گئی تھی۔

جاگیر داری
قانون -

بعض دوسرے اعتبارات سے تخل سلطنت میں تنزل واقع ہوا اور یہ محض اسی وجہ سے نہیں ہوا کہ کلیسا نے اسے نسبتاً حقیر قرار دے دیا تھا۔ ازمنہ وسطیٰ کی سلطنت بھی ایک قانونی سلطنت کی جاسکتی ہے مگر رویوں کے مفہوم سے ایک جداگانہ مفہوم میں کیونکہ ازمنہ وسطیٰ کی سلطنت خالص قانون عام کی تنظیم نہیں تھی بلکہ اس کے تمام تنظیمات میں شخصی قانون کے اجراء ملے ہوئے تھے۔ ملکیتی بادشاہت خاندان کی موروثی ملک شمار ہوتی تھی اور خدمات عامہ اراضی پر پائید سمجھے جاتے تھے۔ سارے جاگیر داری قانون اور آبا کی سلطنت کو اس تخلیط سے ہر طور پر نقصان اٹھانا پڑا۔ رویوں نے قانون عام نے غایت عامہ کے لئے صرف ایک بنیاد کا کام دیا اور نہ ازمنہ وسطیٰ کا جاگیر داری قانون ہی اس زمانے کی

سلطنت کا اصلی مقصود معلوم ہوتا تھا اور اس کے لئے قوم کے سودر بہبود کی طرف سے بچ پڑائی ہوتی جاتی تھی۔

قومی اور سیاسی اتحاد کے شکست ہو جانے جاگیر واری طریق کے نافذ ہو جانے طبقات اور خاندانوں کے حقوق میں تضادم ہو جانے سے قومی سلطنت کا تصور فنا ہو گیا تھا۔ رومن شہنشاہی کے اثرات میں سے جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ سیاسی اتحاد کے یہ نسبت زیادہ تر مغربی یورپ کا خیالی بین الاقوامی اتحاد تھا اور یہ اتحاد شہنشاہی کے بجائے زیادہ تر یورپ اور رومن پادریوں کے اقتدار کی وجہ سے قائم تھا۔

فی الجملہ سلطنت کی زیادہ آزاد اور زیادہ صحیح ترقی کا بیج بویا جاتا تھا مگر ازمنہ وسطیٰ میں سلطنت کا تخیل بمقابلہ رومی زمانہ کے قطعیت و قوت میں کم ہو گیا تھا۔

(ج) نشاۃ جدیدہ کا اثر

قدیم سلطنت کی یاد ازمنہ وسطیٰ میں بھی کسی وقت بھلنے کو نہیں ہوتی تھی۔ روم اب بھی مغرب کا روحانی مستقر بنا ہوا تھا۔ جرمانوں نے اگرچہ قدیم رومن سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے مگر وہی جرمانی جنھوں نے رومی صوبوں کو خود مختار سلطنتیں بنا دیا تھا۔ اپنے دین اور سب سے بڑھکر اپنے مذہب میں روماہی کا تئیں کرتے تھے اور رومیوں کے زوال یا فتنہ شہر کے بجائے رومن کلیسا ازمنہ وسطیٰ کی حکمرانی طاقت بن گیا تھا جس کی اطاعت ایک وقت میں اگر خود جرمانی قوم نے بھی کی۔ رومن کلیسا کے تنظیمات اس کے طور و طریق، اخلاق، قانون اور زبان میں قدیم رومن سلطنت کا ایک بہت بڑا بلکہ اس کا خاص انخاص حصہ قائم رہ گیا تھا۔ اقوام پر زیادہ آسانی کے ساتھ حکومت کرنے کے لئے قدیم شہنشاہی نے پاپائیت کی اور عالمگیر سلطنت نے عالمگیر کلیسا کی صورت اختیار کر لی تھی۔ قدیم رومن شہنشاہ اپنے اقتدار کو رومن قوم کے نام اور رومن قوانین کی امداد سے اپنے نائبین اور عمال کے توسط سے عمل میں لاتا تھا اور اپنی فوجوں کے ذریعے سے ان کی تعمیل کراتا تھا۔ اسی طرح رومن پوپ مذہبی انضباط اور دینی قانون کی مدد سے اپنے اساتذہ کے وسیلے سے خداوند و کلیسا کے نام سے تقدس و عظمت کی منہ پر مہمکن تھا اور بے شمار خالق ہی سلسلوں کے ذریعے سے اپنے احکام کا نفاذ کرتا تھا۔

مگر کلیسا کے پہلو پہلو قدیم شہنشاہی کی یاد بستور قائم تھی ہم اب اس زمانے میں

رومی کلیسا نے
رومی شہنشاہی
کے تختی انت کو
زندہ رکھا۔

مقدم رومن
شہنشاہی۔

یہ جانتے ہیں کہ کارل (چارلس) اعظم کے وقت سے فرانسی (فرانسیسی) بادشاہوں کی اور اوٹو اعظم کے وقت سے جرمانی بادشاہوں کی رومن شہنشاہی اُس رومن شہنشاہی سے جس کا مستقر روما اور قسطنطنیہ تھا کس درجہ مختلف تھی مگر تمام ازمندہ وسطیٰ میں لوگ یہی یقین کرتے تھے کہ فرانکی رومی جرمانی رومی شہنشاہی ہی روم والی شہنشاہی کی جانشین ہے اور یہ کہ فرانکی شہنشاہ جرنانی قوم کا رومی شہنشاہ کلاڈیس، انٹونینس اور قسطنطین کا باقاعدہ جانشین ہے۔ بہر حال شہنشاہوں کی ازسرنو قائم شدہ عظمت قدیم رومن شہنشاہی کی یاد تازہ کرتی تھی اور دنیائے قدیم کے ساتھ ازمندہ وسطیٰ کے خیالات و تنظیمات کا ایک خیالی اتحاد قائم ہو گیا تھا۔ مزید برآں یہ کہ قدیم رومی شہنشاہی مضابطہ یعنی مجموعہ قوانین روما ازسرنو ہاتھ آ گیا تھا۔ اطالیہ کی یونیورسٹیوں میں بارہویں صدی سے اس مضابطہ کی تشریح و توضیح ہوتی رہی تھی اس طرح پرک گوایدو نوع انسان کے الہامی قانون کا معزز و موقر درجہ رکھتا تھا۔ اطالیہ نے نکل کر اس قانون نے تمام مغرب کو فتح کر لیا اور ہر جگہ مسلم و مستند ہو گیا۔ تیرہویں صدی سے فرانس میں اور پندرہویں صدی سے جرمانیا میں اس کا دور دورہ ہو گیا۔ جرمانیا میں اس کے اثرات و نتائج فرانس سے بھی بڑھے ہوئے ثابت ہوئے البتہ قانون عامہ کے بجائے اُس زمانے کے فاضل قانون دان زیادہ تر شخصی قانون اور شاید اُس سے بھی زیادہ فوجداری کے قانون کو مد نظر رکھتے تھے مگر پھر بھی اس طرح سلطنت اس کی قانون سازی اور اس کے اقتدار شاہی کے نسبت بہت سے اصولی خیالات جنہیں رومیوں نے ظاہر کیا تھا، تعلیم یافتہ طبقے کے معمولی خیالات کا جزو ہو گئے۔

جمہوریت کے روایات

علاوہ ان قدیم رومن جمہوریت اور اس کی عظمت کی یاد بسا اوقات شہری باشندوں کی نئی شہری جمہوریتیں قائم کرنے کی کوششوں کو تازہ کرتی اور اس میں جان ڈالتی رہی۔ اطالیہ اور جرمانیا کے حکام شہری (Civil magistrates) کا نام رومی جمہوریت کے کانسٹیبلوں کا ایک دھندلا سا خیال پیدا کرتے تھے۔ ازمندہ وسطیٰ میں روما کے عائدہ الناس نے دوبارہ اپنی جمہوریت کے بیدار کرنے اور اس میں ازسرنو جان ڈالنے کی کوششیں افسانہ وار جوش کے ساتھ کیں۔ ایک مرتبہ بارہویں صدی میں آرلنڈ آف برسکیا کی سرکردگی میں ادرو و سری مرتبہ چودھویں صدی میں ٹریبیوں کو لارینیزی کے تحت میں ایزندہ وسطیٰ کدہ دیوں کی سیاسی ناقابلیت کے سبب سے بدوونوں کوششیں ناکام رہیں مگر ان دونوں سے قدیم روایات کی قوت کا ثبوت

ملتا ہے۔

یونانی
نظریات

ارمنہ وسطی کے رومی الاثر تمدن کے لئے یونانی سیاسی نظریات بھی کلیتہً غنیمت و نہ نقص۔
بہت سی خاتقاہوں میں ارسطو کی کتاب ”سیاسیات“ کی تعلیم ہوتی تھی حتیٰ کہ دینیات کے نہایت ہی
مشہور عالم ٹامس (اکونیوی) نے اس یونانی فلسفی کی اس برگزیدہ تصنیف کی شرح لکھی۔

باہیں بہہ ارمنہ وسطی کا قانونی نظم اور اُس سے بھی زیادہ اُس کی سیاسی تنظیم، قدیم
طور و طریق سے بالکل ہی مختلف تھی اُس زمانے کی تمام تنظیمات جرمانی اثر کے سانچے میں ڈھلی ہوئی
تھیں اور اُس کے خیالات پر کلیسا کے مذہبی قوانین حاوی تھے۔

نشاۃ جدیدہ

پندرہویں صدی کے نصفِ آخر میں قدما کے زمانے کی یاد زیادہ زور کے ساتھ
مازہ ہو گئی تھی اور یونانیوں اور رومیوں کی قدامت کی روح دوبارہ بیدار ہو گئی تھی (اس کی
نشاۃ جدیدہ یا نئی زندگی کہتے ہیں) قدیم فنون کے کاموں نے اطالیہ کے ہنرمندوں کو تازہ نگاہی
نقاشی اور شاعری کے ماہروں کے دلوں میں آزادی پیدا کر دی اور ان کے خیالات کو بلند کر دیا
قدیم علوم کے خیالات نے دوبارہ وقعت و عزت حاصل کر لی اور ارمنہ وسطی کی مدرسے تعلیم اور
خاتقاہی دینیات کے قیود و عائدہ کو توڑ ڈالا۔ کلیسا کے اس عقیدے پر کہ دنیا ایک قابلِ احترام
چیز ہے، اس خیال نے غلبہ پایا تھا کہ انسانیت یعنی فطرت انسانی اور قدامت کا مطالعہ ایک
قابلِ قدر شے ہے اور زندگی پر زیادہ روشن اور زیادہ مسرت آمیز طریقے سے نظر ڈالنے کو
درباروں اور شرعوں میں وسیع مقبولیت حاصل ہو گئی۔ جس طرح تقریباً دو ہزار برس قبل ہرستاتی
یونانیوں کے عالی خاندان نوجوانوں کے معلم ہو گئے تھے اُسی طرح اب علمائے قدامت جرمانیا
فرانسیسی اور اطالیہ کے حوصلہ مند نوجوانوں کے معلم و ادیب ہو گئے۔ تعلیم یافتہ اشخاص
اب اس ملامت سے ہراساں نہیں ہوتے تھے کہ وہ مسیحوں سے پھر بت پرست بنتے جا رہے ہیں
خود پاپاؤں تک نے اس ذہنی تحریک کی سرگردہی اختیار کی۔ نیکولاس بیچم (۱۴۴۴-۱۴۵۵)
پیئرس دوم اینیاس سلوئیس (۱۴۵۵-۱۴۶۴) یولیس (جولیس) دوم (۱۵۰۳-۱۵۱۵)
سول (۱۵۱۵) لیئو دہم (۱۵۱۳-۱۵۲۱) سب نے نشاۃ جدیدہ کے فنون لطیفہ کی آزادی
کی ہمت افزائی اور حمایت کی۔ ایسی کا شاہانہ جاہ و عظمت والا خاندان خامکیران میں سے
کوسی مو (۱۴۴۴-۱۴۶۴) اور لو نیزو (۱۴۶۹-۱۴۹۲) نے فوشتا فلورنس کو اطالیہ
کا تیغز بنا دیا۔

علوم قدرت
کی تجدید

قدیم تصور سلطنت اور اسی طرح قدیم نظریات سیاسی کا کچھ حصہ بنی اب دوبارہ ظاہر ہوا اور اس نے عام معاملات پر اپنا اثر ڈالا (خصوصاً) حسب ذیل صورتوں میں۔

(۱) ایک یہ کہ چند ذی ہمت صاحبان فکر نے سلطنتوں کے قیام اور سیاسی اقتدار کی نوعیت کو انسانی خیالات کے تحت میں لاکر ان کی تشریح کرنے کی جرأت کی اور اس طرح سلطنت کے معاملات میں مذہبی طرز استدلال کا مقابلہ کیا۔

(۲) دوسرے یہ کہ حکمت عملی کا خیال بنی سلطنت کی رہبری اور قوموں کی حکومت کے اغراض و ذرائع پر بالارادہ اور غائبانہ طور پر کرنا سیاسی عملیات و نظریات میں فطری ہو گیا اور کیلیا ویلی (۱۶۶۹-۱۵۲۷) کی تحریرات میں اس خیال کو واضح ترین اور صاف ترین اظہار کا موقع ملا اس کی کتاب ”مکالمات لیوی“ (جس میں اس نے رومن جمہوریت کی عظمت و رفعت کو ظاہر کیا ہے) نیز اس کی تصنیف ”حکمران“ (Prince) جس میں اس نے حکمرانوں کے عوصلوں کو پورا کرنے کے طریقے بتائے ہیں) دونوں نشاۃ جدیدہ کے سیاسی جوش سے بھری ہوئی ہیں

(۳) تیسرے یہ کہ ہم ایک ایسی سیاسی آمریت اور سیاسی اقتدار شاہی کی تجدید کے علامات دیکھتے ہیں جن کے واحد اقتدار کے سامنے ہر شے کو جھکنا پڑتا ہے۔ اس بادشاہ کے ماتھے میں جو سلطنت پر حکمران ہے یہ اقتدار تمام جاگیری اور رازداری و سٹی کے سارے طبقاتی قبو و سے آزاد ہو کر رومن شہنشاہ کی سی مطلق العنانی کی حد تک ترقی کر گیا۔

(۴) آخر الامر یہ ہے کہ نشاۃ جدیدہ نے خود کو ایک مخالف شکل میں بھی ظاہر کیا جس میں اس روز افزوں ظلم نے استقلال پیدا کر دیا قیصر کی یاد کے ساتھ بر دلس کیا وہ بھی تازہ ہو گئی۔ ظالموں کا قتل جمہوریت کا ایک وصف سمجھا جاتا تھا اور اس کی مدح سرائی ہوتی تھی یہاں تک کہ کیٹلینا کے سے بیاک سازشی بھی پیدا ہو گئے۔

مگر قدیم سیاسی خیالات اور قدیم میلانات کی یہ تمام ”تجدید“ علی التبعیہ کے ایک سنگ حلقہ ہی تک محدود تھی۔ عامۃ الناس کو اس سے سمجھتے تھے اور ان کے سمجھنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ سیاسیات پر نشاۃ جدیدہ کا تمام اثر صرف جزوی اثر

تھا اور بہت جلد رفع ہو گیا، اس نے ازمشہ وسطیٰ کی سلطنت کے شیرازے کو بکھیر کر ازمشہ
جدیدہ کی سلطنت کے لئے راستہ صاف کر دیا مگر بجائے خود کوئی نئی سیاسی تنظیم نہ پیدا
کر سکا۔

پانچواں باب

(۳) ازمنہ جدیدہ کا تخیل سلطنت
(الف) نیاد ورکس وقت سے شروع ہوتا ہے۔

آج اہل یورپ و امریکہ کا تاریخی احساس اس امر کے قبول کرنے پر متفق ہے کہ انسانی زندگی میں کئی صدیوں کا ایک زمانہ گذرا ہے جسے "ازمنہ وسطی" کہتے ہیں اور وہ یہ بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ ہم اب ایک نئے زمانے میں رہتے ہیں مگر اس خاص وقت کے متعلق جو موجودہ زمانہ کو ازمنہ وسطی سے قطعی طور پر جدا کرنا ہے رایوں میں اب بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ تو ہم مدت سے جانتے ہیں کہ اسی مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے۔ آنے والے زمانے کے مدرکات و میلانات بہت پیشتر سے محسوس ہونے لگتے ہیں، اور (اسی طرح) ایام گزشتہ کے بشمار اثرات بدلے ہوئے و فتوں میں بھی اپنے عمل کو جاری رکھتے ہیں۔ ازمنہ وسطی کے دوران میں چند ممتاز افراد نے ایسے خیالات کا اظہار کیا تھا جو موجودہ صدی کے قبل تک سمجھ میں نہیں آئے تھے اور دوسرے جانب ہم آج تک ازمنہ وسطی کے بہت سے تنظیلات کے آثار دیکھتے ہیں جو با حقیقا تمام محفوظ رکھے گئے ہیں اور یہ آثار صرف خاتقاہوں اور امر کے قلعوں ہی تک محدود نہیں ہیں۔ قدیم اور جدیدہ ور کی کڑیاں خود انسانی زندگی کے اتحاد کے ذریعہ سے ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں اور ان دونوں کا طبقہ ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا گوشت سے ناخن کو جدا کرنا یہی حال افراد کی زندگی کے مختلف دوروں کا ہے مگر پھر بھی زمانے کے اُن مختلف دوروں کا تین ضروری ہے جن کی سرحدوں کے آپس میں تداخل ضرور پایا جاتا ہے لیکن یہ باوجود اس تداخل کے بحیثیت مجموعی یقیناً ایک دوسرے سے ممیز کئے جاسکتے ہیں۔

نشاۃ جدیدہ

بہت سے لوگ دور جدید کی ابتدا کو پندرہویں صدی کے نصف آخر تک پیچھے ہٹاتے ہیں، اُن کے نزدیک نشاۃ جدیدہ کا دور وہ وقت ہے جب کہ ازمنہ وسطی کی تقلیب عالم جدیدہ

کی شکل میں ہوئی۔ ہزار برس سے زائد کی خواب کے بعد فلسفیانہ روح (خیالات) کا از سر نو بیدار ہونا، ازمنہ وسطیٰ کے تنظیمات و اعتقادات کے علی الرغم قدیم خیالوں اور یادگاروں کا دوبارہ زندہ ہونا، قدما کے نمونوں کی مطابقت میں پہلے سے زیادہ آزاد اور زیادہ مسرت آمیز فنون لطیفہ کا دوبارہ ظاہر ہونا، سب سے بڑھ کر اطالیہ میں ایسے شہروں کا عروج حاصل کرنا جنہیں موقع آئے پر پوپ کی مذہبی حکومت سے علیحدہ ہو جانے میں کوئی باک نہ ہو، رومن قانون کا (ملکوں میں) پھیل جانا مذہبی قانون پر اس کا ترجیح پانا، پچھلے کا ایجاد اور مطبوعات کی اشاعت بارود کا ایجاد ہونا اور اس کی وجہ سے طریق جنگ کا بدل جانا بحری سفر میں زیادہ جسارت اور افریقہ کے سوا حل اور ہندوستان میں نامعلوم ملکوں کی دریافت اور مغرب میں ایک پورے کے پورے نئے براعظم کا پتہ چل جانا یہ تمام امور قطعی طور پر بتاتے ہیں کہ (انسان) عصر قدیم سے گذر کر عصر جدید کی طرف قدم بڑھا رہا تھا، مگر یہ ازمنہ وسطیٰ کا اختتام نہ تھا بلکہ اخطا و تقصیر جو عصر جدید کے عروج پر میلان کا پیش خیمہ تھا۔ نشاۃ جدیدہ کے وقت میں زمانے کی طبیعت میں جو نئی یا بچن کے خصائص کے بجائے پختگی کی خصلت پائی جاتی تھی۔ وہ نئی چیزوں کے پیدا کرنے کی طرف اس قدر مائل نہ تھی جس قدر پرانی چیزوں کے زندہ کرنے کی طرف اس کی کوششیں تمام تر قدیم خیالات کی قدیدہ اور قدیم نمونوں کی نقل کی طرف متوجہ تھیں۔ اس نے ازمنہ وسطیٰ کی بعض تنظیمات کی اصلاح کی اور بعض کو متزلزل کر دیا مگر انھیں بالکل میٹ نہیں دیا اور نہ کسی نئی چیز کو پیدا کر کے ان کی جگہ پر قائم کیا۔ آخر میں یہ تحریک چھوٹے اور بڑے ہر طرح کے حکمرانوں کی مطلق انسانی کے باعث ٹھہر کر رہ گئی۔

اصلاح

اس سے بھی زیادہ کلیسائی اصلاح کا زمانہ نئے دور کی ابتدا خیال کیا جاتا ہے۔ اس سے مقصود اصلاح کی وہ ناکافی کوششیں نہیں ہیں جو جرمانی، ہنشاہی میں شوشہ کی دور مغز کی مجلس (رائٹس تارخ) میں کی گئی تھیں بلکہ اس سے مقصود سو لھویں صدی کی کلیسائی اصلاح ہے جس کی تاریخ اس امر کو برہنہ سمجھی جاتی ہے جب کہ مارٹن لوتھر نے اپنے مقالوں و معتقدات کو ڈینرگ کے گرجا کے دروازے پر چبیاں کیا تھا۔

حقیقت میں ازمنہ وسطیٰ کے رومن کلیسا کا اقتدار اس وقت پوری طرح ٹوٹ گیا تھا جس کا اثر تاریخ عالم پر پڑا اور پرنسٹن کلیساؤں کی بنا مذہبی دائرہ عمل میں حقیقتہً ایک نئی تخلیق تھی۔ اس میں بھی شک نہیں کہ مذہبی اعتقاد کے روم کی غلامی سے آزاد ہو جانے لے

علوم کو بھی مذہبی اقتدار سے مطلقاً آزاد کر دینے کے لئے ایک قومی تحریک پیدا کر دی۔ غورِ فکر
تخیلِ سلطنت کی بلندی اور اُس کے اخلاقی تزکیہ نے جدید سیاسیات کے لئے راستہ
تیار کر دیا۔

تاہم جرمانی اصلاح کا اصولی خیال کسی نئی شے کا پیدا کرنا نہیں بلکہ قدیم مذہب کو
ویرا ستادہ خرابیوں سے پاک کرنا اور عیسائیت کی ابتدائی سادگی کو واپس لانا تھا۔
یا پاپائی کلیسا کا تاریخی اقتدار اور اُس کے روایات شکست ہو گئے تھے مگر کتابِ مقدس کا
اُس سے بھی پرانا اور ویسی ہی تاریخی اہمیت کا اقتدار پہلے سے بھی زیادہ پابندی کے ساتھ
قائم رکھا گیا تھا۔ درحقیقت مصلحانِ مذہب کے لئے ابتدائی عیسائیت کا واپس لانا ایسا ہی
ناممکن تھا جیسا اطالیہ کے ماہرِ فن کے لئے ایتھنز اور روما کے قدیم فن و صنعت کا
واپس لانا دشوار تھا۔ دینا بدل گئی تھی اور قدیم خیالات اب صرف نئی شکلوں میں دوبارہ
ظاہر ہو سکتے تھے یورپ کی زندگی کی برابر ترقی کر جاتی تھی اور پروٹسٹنٹ مذہب
اور نیز سلطنت جس پر اُنسی مذہب کا اثر پڑ رہا تھا نسبتاً نئے نظامِ معلوم ہوتے تھے
مگر خود سلطنت کا تخیل اصلاً وہی رہا جو ازمنہ وسطی کا تھا۔ سلطنت اب بھی اُس دنیا کی
اور اجسامِ مادی کی بادشاہی تھی اور مذہب اب بھی زیادہ تر مقدس نفوس کی ایک وحانی
جماعت تھی جو بہشت کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھی۔

یہ اہم کہ سولہویں صدی کی اصلاح کا تعلق نئے دور کی جوانانہ کوششوں کے
بجائے درمیانی دور کی انحطاط پذیر کبرسنی سے زیادہ ہے، اس کا قطعاً ثبوت ۱۵۵۰ء
سے ۱۶۵۰ء تک کی دو صدیوں کے خضائل میں موجود ہے۔ یہ طولِ زمانہ ایک ناظرِ فہم
مبصر کے ذہن میں نوجوانی کی نہیں بلکہ پیرائسائی کی مثال کو منعکس کرتا ہے۔ پروٹسٹنٹ
کلیسا تک میں ایک بحس اور بے جان تقلید پرستی نے فوراً ہی پھر غلبہ حاصل کر لیا جس نے
کسی تازہ تحریک کو اُس کے نہ بڑھ دیا اور علوم کی ترقی میں رکاوٹیں ڈال کر انھیں پامال
کرنا چاہا۔ کیتھولک کلیسا میں ہم یسوعی (Jesuit) فرقے کا اثر بڑھتا ہوا دیکھتے
ہیں۔ یہ فرقہ ازمنہ وسطی کی مصنوعی طور پر قائم کی ہوئی مذہبی حکومت کا علم بردار تھا
زمانہ وسطی کے امرا پر شاہی مطلق العنانی غالب آگئی اور اُس نے جاگیر داری طریقے کو
نوڑ دیا تھا مگر پھر بھی اُس مطلق العنانی میں زیادہ تر وہی قدیم روح برقرار رہی جو مختار

طریق حکومت جواب تمام براعظم یورپ پر چھانپا تھا اور جسے صرف انگلستان میں متقاومت کا سامنا ہوا اس کی تائید زیادہ تر انھیں پرانے رومی اور آبائی خیالات سے ہوتی تھی جن کا اصل اصول شاہی خاندان کی حرمت تھا اور جن کی رو سے حکومت کے سارے اقتدار کو احکام فریسی پر مبنی ہونا چاہئے تھا۔ اٹھارہویں صدی کا پرنسٹن طرز (Rococo) جس نے آہستہ آہستہ نشاۃ جدیدہ کے طرز کی جگہ لے لی تھی اس پرانہ سالی کا اظہار ہے ان سب باتوں کے کسی اور دور کے آثار نہیں نظر آتے جس کی بنیاد نئی ہو بلکہ عہد وسطیٰ کی شکست و ریخت زیادہ نمایاں ہے۔

نومر لاسٹ رنٹس پر اس کے زمانے کے قدیمانہ رنگ کا ایسا اثر پڑا کہ اس نے سلطنت میں یہ لکھا کہ "ہم بخوبی یقین کر سکتے ہیں کہ دنیا اپنے عہد پیری میں داخل ہو گئی ہے۔ یہی اسباب ہیں اس سے بھی روکتے ہیں کہ ہم عہد جدید کی ابتدا انگلستان میں انقلاب کو قرار دیں خواہ وہ سلطنت کا انقلاب ہو یا مشرق کا نام نہاد شاندار انقلاب بیشک اس انقلاب نے بھی ایک نئے عہد پیدا کر دی یعنی اپنی یا شاہی کی بناؤ الدی لیکن ہم جس قدر زیادہ غور کے ساتھ انگریزی انقلاب کا فرانسیسی انقلاب سے مقابلہ کرتے ہیں، اسی قدر ہمارا یہ اعتقاد قوی ہوتا جاتا ہے کہ وہ عہد وسطیٰ کے آخری زمانے سے اس عہد جدید سے تعلق رکھتا ہے۔ انگریزوں کی جدوجہد زیادہ تر قدیم اینگلو سیکسن آزادی قوم اور برادری حقوق پارلیمنٹ کے لئے باو شاہ کی مطلق العنانی کے خلاف میں تھی، بخلاف اس کے فرانسیسیوں کی کوشش یہ تھی کہ سلطنت کی ایک نئی معقول تشکیل ہو اور ایک نئی معاشرتی آزادی حاصل کی جائے۔

اس لئے بہتوں کے نزدیک فرانسیسی انقلاب میں عہد جدید کی پہلی قطعی تحریک رونما ہے اور اسی لئے وہ اس دور جدید کی تاریخ طے کرنے سے مقرر کرتے ہیں۔ یہ رائے فرانسیسیوں کے عجب و خود بینی کو بہت خوش آئند معلوم ہوتی ہے۔ اس میں کسی بحث کی گنجائش نہیں کہ فرانسیسی انقلاب میں دور جدید کی روح جو شہر ن تھی مگر اس روح نے اپنا کام اس سے قبل ہی شروع کر دیا تھا۔ روشن خیالی "کا زانہ جو پہلی شری ہو چکا تھا اس پر دور جدید کا گہرا نقش بیچہ چکا تھا جو دوسرے نمایاں تھا۔

جدید تمدن کی تاریخ کے فاضل مصنف ٹامس بکل نے بھی بہت سے اور لوگوں کی

۴۔ انگریزی
انقلاب

۵۔ فرانسیسی
انقلاب

۶۔ فرانسیسی
عہد جدید
کا گہرا نقش
بیچہ چکا تھا

طرح یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ گزشتہ صدی میں انسانی خیالات کی رفتار میں ایک نمایاں تغیر نظر آتا ہے جس طرح آفتاب کی کرنیں پہلے پہاڑوں کی چوٹیوں کو روشن کرتی ہیں، اور بعد کو جا کر پہنچنے کی وادی میں چمکتی ہیں، اسی طرح نیا خیال پہلے بڑے آدمیوں میں ظاہر ہوتا ہے اور پھر تین آہستہ آہستہ عوام میں پھیلتا ہے، لیکن اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں نئی تحریک نے نہ صرف چند منتخب سربراہان اور وہ اشخاص میں تازہ روح بھونک دی تھی بلکہ ہر طرف افق پر نئے خیالات بلند ہونے لگے تھے۔ اور تغیر کی خواہش عالمگیر طور پر محسوس ہونے لگی تھی۔ لوگوں کے دل نئی زندگی کی امید سے اچھلنے لگے تھے فنون لطیفہ اور ادب میں سلطنت اور معاشرت میں ایک بالکل نیا رنگ پیدا ہو گیا تھا دنیا کے حیات، ازمنہ وسطیٰ سے ہٹ کر ایک جدید کائنات کی طرف قطعی طور پر منعطف ہو گئے تھے۔

اگر ہم گزشتہ صدی کے حالات و اشخاص کا مقابلہ اس سے قبل کی صدیوں سے کریں تو ہم زمانے کے خصوصیات کے وسیع تغیر سے حیرت میں پڑ جائے ہیں کہ صرف افراد میں تغیر نظر آتا ہے بلکہ ان کی زندگی کی ساری کیفیتیں بدلی ہوئی ہیں۔ وہ زمین جس پر وہ کھڑے ہیں، وہ ہوا جو ان کے گرد و پیش چل رہی ہے کوئی اور ہی ہے، ہم مثلاً کہتے ہیں کہ پیر و شیا کا فریڈرک اعظم جدید سلطنت اور جدید طرز زندگی کا نمائندہ ہی واضح نمائندہ ہے۔ اگر اس کا مقابلہ فرانسیس کے لوئیس چارلیم سے نہیں کر سکتے تو مطلقاً انسان شاہی بافضل ویزدی کا روشن ترین قائم مقام تھا اور جس پر ازمنہ وسطیٰ کا خاتمہ ہوتا تھا بلکہ خود اسی کے جلیل القدر بزرگ الکٹر فریڈرک ولیم سے نیچے یا ہسپانیائی حکومت سے مندر لینڈ کے آزادی پانے اور انگریزی حکومت کے شمالی امریکی کے آزاد ہونے کا باہم موازنہ کیجئے یا اگر فرانسیسی انقلاب کو انگریزی انقلاب کے مقابل رکھ کر دیکھئے۔ یا روس پر اولرک فون بوٹن پالینگ پر لوکھر کے بالمقابل نظر ڈالئے تو یہ وسیع فرق فوراً عیاں ہو جائے گا۔

گزشتہ صدی کے وسط سے مہذب دنیا جس دور میں داخل ہوئی ہے اس کی جدت بعض اور باتوں سے بھی نمایاں ہوتی ہے یعنی اس زمانے میں سیاسی نظریے کی غیر متیقن تلاطم اور سیاسی عمل کا تجربہ کیا جانا ایک بالکل نئی تخلیق کے وجود میں لانے والے کوششوں کا عمل میں لایا جانا، اس مایوسی کا طاری ہونا جو مہر ناکامی کا پہلا نتیجہ ہوتی ہے۔ انقلاب اور رجعت کا

کایکے بعد دیکھ کر واقع ہونا، یہ سب باتیں اُسی نئے دور کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔
 دور جدید کو اگر اپنے بلوغ کا احساس اُس سے بلند تو رہے میں ہے جتنا کسی اور
 تاریخی دور کو کبھی ہوا ہو تو وہ خصوصیات جو ہم نے اوپر ذکر کی ہیں، یہ ظاہر کرتی ہیں کہ
 ہم نے ابھی بلوغ کی پہلی ہی منزل میں قدم رکھا ہے اور ابھی تک اُس میں خامی اور نوجوانانہ
 بلکہ بسا اوقات طفلانہ کیفیت بالکل اُسی طرح موج دے جیسے ازمنہ وسطیٰ کی آخری صدیوں
 میں پیرانہ سری کے آثار نمایاں تھے۔ عمر کے بڑھتے بڑھتے بڑھاپے کا آجانا ایک عضوی
 اور نفسی قانون ہے اور اُس کا عمل انسان کی اجتماعی زندگی کے طویل دور ہائے روزگار
 میں مدد دیتا ہے بلکہ روزگار کے مختلف دوروں کے اندر جو چھوٹے چھوٹے زمانی فاصلے
 ہوتے ہیں اُن پر بھی یہ قانون ایک دورانی رفتار سے بار بار افزہ ہوتا رہتا ہے۔
 پس ہم دور جدید کی تاریخ کو سنسکا سے سطر کرتے ہیں، سلطنت پر ویشا کا
 عروج، آسٹریا میں جوزف ثانی کے اصلاحات، شامی امریکہ میں مائیک متھڈ کا قائم ہونا
 فرانسیسی انقلاب کے تغیرات اور نیولیون کی سلطنت، براعظم یورپ کے ممالک میں
 انگلستان کی سسی آئینی بادشاہی کا قائم ہونا، نیابتی عہد میں جس کو رواج دینے کی کوششیں،
 قومی سلطنتوں کی بنا قانون عامہ پر جو ایک مذہبی غلام پڑا تھا اُسے اتار پھینسنا
 مذہب کا سلطنت سے جدا کر دیا جانا، یا کم از کم اُن دونوں میں ہر ایک کے میدان
 عمل کی حد بندی ہو جانی، جاگیر داری طریق اور ہر طرح کے امتیازی گروہوں کے حقوق
 و رعایات کی تسبیح، قومی اتحاد کے تحلیل کا عروج پانا، معاشرت کی آزادی کا تسلیم کر لیا جانا
 ریسب جدید اجتماعی زندگی کی اور اس لئے جدید سلطنت کی پہلی کوششیں ہیں یا پہلی
 تشکیل و تیاج۔

تعلیق۔ ہم نسل انسانی کی تاریخ کو اس کے داخلی ارتباط اور ایک معین ترتیب
 میں دیکھنے کے عادی ہیں، اس لئے ہم دنیا کی مختلف عمروں میں اُسی طرح فرق کرتے
 ہیں جس طرح ہم افراد کی زندگی کے مختلف مدارج میں تیز کرتے ہیں۔ ہم نوع انسانی
 کے زمانی مدارج کو طفولیت اور شباب سے تیز کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُس کے شباب
 کا زمانہ قدیم یونانی اور رومی تہذیب کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اسی طرح ہم ازمنہ وسطیٰ کو ایک طرف
 قدیم یونانیوں اور رومیوں کے نوجوانانہ اور شادمانہ دور سے اور دوسری جانب نیاکے

کی زیادہ پختہ اور مردانہ حالت سے میسر کرتے ہیں۔

جس طرح فرد واحد کی زندگی کا شمار برسوں اور دہائیوں سے ہوتا ہے اسی طرح نوع انسانی کی زندگی کا شمار سیکڑوں اور ہزاروں برس سے ہونا چاہئے۔ بعض اوقات ہم خاص دوروں کے اندر بھی یہی پیکر اور عمروں کے یہی مراتب دیکھتے ہیں۔ پہلے عروج کے اور پھر زوال کے مدایح نظر آتے ہیں۔ اور جس طرح تاریخ عالم کے بڑے دوروں کی ایک معین خصوصیت درج ہوتی ہے بالکل یہی حال اُن دوروں کی اندرونی قرون اور حالتوں کا ہوتا ہے۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کے نصف اول اور نصف آخر کا نینتہ ایک دوسرے سے جداگانہ طور پر ہیں اور یہی کیفیت سوٹھویں صدی کے اول و آخر حصوں کی ہے۔

لیکن تاریخ عالم پر غور کرنے کا یہ سارا طریقہ صرف اُسی حالت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ اول یہ فرض کر لیا جائے کہ انسانیت محض افراد کا ایک مجموعہ نہیں ہے نہ اُس کی زندگی محض افراد کی زندگی کا حاصل جمع ہے۔ اُس کا انحصار اس خیال پر ہے کہ انسانیت (نوع انسانی) بجائے خود ایک مکمل شے ہے اور خود اس کا ایک نشوونما ہے جو اپنی حرکت اور ترقی کے لئے اُن سے وسیع تر زمانوں کا خواہاں ہے جو انسانی زندگی کے لئے دیکار ہو رہے ہیں جب ہم سیکڑوں اور ہزاروں برسوں کے پورے پورے مجموعی زمانوں پر نظر کرتے ہیں تو پھر یہ نہیں ہو سکتا ہے کہ ہم پر اس پر زور تسلسل اور اُس میں ترتیب ترقی کا اثر نہ پڑے اور اس سے ہم نسل انسانی کے اتحاد اور اُس نوع انسانی کے آئندہ مقدر کا نتیجہ نکالتے ہیں جس کی طویل زندگی افراد کی ان چھوٹی چھوٹی زندگیوں سے بے پروا ہو کر ترقی کر رہی ہے جو بالاراوہ یا بلااراوہ اُس میں شریک ہیں۔

اگر یہ خیال صحیح ہے تو ہمیں یہ سوال کرنا پڑتا ہے کہ عالمگیر تاریخ میں جس نوع انسانی کا بیان ہوتا ہے اُس کی مدت عمر کیا ہے۔ یہ امر اغلب نہیں معلوم ہوتا کہ انسانیت کا غیر معلوم یا قلیل معلوم دور طفولیت نامحدود زمانے تک وسیع ہوتا جائے اور اس کی نوجوانی اور سن رسیدگی چند ہزار برسوں سے زائد نہ بڑھے دونوں میں کوئی نہ کوئی نسبت ہونا چاہئے لیکن یہ احتمال موجودہ زمانے کے طبیعی علوم کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔

تخلیق عالم کی سامی تاریخ زمین کی عمر کو گھٹا کر چند ہزار برس بیان کرتی ہے لیکن زیادہ غائر تحقیق نے اُسے نہایت ہی وسیع کر دیا ہے، اور ہم اب لاکھوں اور

اتحاد و تاریخ
میں اتحاد
انسانیت
داخل ہے۔

نسل انسانی
کی مدت

کر وڑوں کیا اربوں سے اُس کا شمار کرنے لگے ہیں اسی قسم کی تحقیقاتوں سے نسل انسانی کے آغاز و ابتدا کے زمانے کو ایسے وقت تک پیچھے ہٹا دیا ہے جس کا قطعی انجین مشکل ہے اور تاریخ مابعد کے جو زمانے معلوم ہوتے ہیں اُن سے وہ بے انتہا زیادہ بعید ہے۔ کم از کم اس قدر اگر یقینی نہیں تو اغلب ضرور ہے کہ لاکھوں برس پیشتر کچھ مخلوقات انسان کے مثل موجود تھیں۔ تاریخ طبعی نے ابتدائی انسانوں کی ہڈیوں اور کھوپڑیوں کے باقیات کا پتہ چلایا ہے جو اُس نامعلوم قبل انتاریخ زمانے سے متعلق معلوم ہوتی ہیں جس زمانے میں غاروں میں رہنے والے پیچھے کا پتہ چلتا ہے طبعی تاریخ اُس ربط اور اُن تعلیمی مدارج کو بھی ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہے جو انسانی جسم کو حیات حیوانیہ کے زیادہ قدیمی اجسام کے مماثل بتاتے ہیں۔ طبعی تاریخ کی رو سے یہ گمان بھی غالب ہے کہ قبل انتاریخ زمانے کا انسان اپنے موجودہ قائم مقام (انسان) کے بہ نسبت لنگوروں اور دوسرے حیوانوں سے زیادہ قریبی تعلق رکھتا تھا۔ اس بیان سے پہلی نظر میں تو ہمارے مشکلات برپا ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مگر زیادہ غائر نظر ڈالے تو خود اسی بیان سے اُن مشکلات کا حل پیدا ہو جاتا ہے۔

انسانی تخلیق کی تاریخ اس قدر پیچھے ہٹا کر قائم کی جاسکتی ہے کہ وہاں تک روایتی رائے کا دھرم و گمان بھی نہیں پہنچ سکتا لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم تنہا کی تاریخ کو اور اُس تاریخ کو جسے ہم عالمگیر تاریخ کہتے ہیں۔ اس قدر پیچھے ہٹا لجاؤں تاریخ عالم اُسی وقت سے شروع ہو سکتی ہے جب کہ ایک اعلیٰ انسانی نسل نے نوع انسان کی تکمیل کے لئے خود کچھ کرنے کی قابلیت پیدا کر لی تھی۔ پس اس کی ابتدا سفید نسلوں کے ظہور سے ہوتی ہے۔ یہی لوگ روشنی کے فرزند ہیں اور یہی دنیا کی تاریخ کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں یہ سفید انسان اتنے قدیم نہیں ہو سکتے جتنے قدیم انسان نامہند ہیں۔

تاریخ عالم کے عضوی اور نفسی نمو کے قانون کو جسمانی تناسل کے طبعی قانون کے ساتھ خلط ملط نہ کر دینا چاہیے۔ نوع انسان کا وہ مشترک احساس در اُس کی وہ مشترک روح اور حیات و خیالات کے وہ ارتقائی مدارج جو انسان کے کاموں سے ظاہر ہوتے ہیں سب کے سب اُس کی اعلیٰ فطرت سے تعلق رکھتے ہیں نہ کہ حیوانی خصلتوں سے۔

ادنیٰ درجے کی انسانی نسلوں کا پہلا ظہور انسانیت کے اعلیٰ اشکال

تاریخ کا آغاز
سفید انسان
سے ہوتا ہے

کی مادی بنیاد تصور کیا جاسکتا ہے مگر انسانیت کی حقیقی تاریخ سے اُن ادنیٰ نسلوں کو
اُتنا ہی لگاؤ ہو سکتا ہے جتنا رنگ ابرمو قلم کو مصور کے نقشِ کمال سے ہوتا ہے ۔

چھٹا باب

(ب) ازمنہ قدیمہ وسطیٰ کے تصور سلطنت سے جدید تصور سلطنت کے خاص خاص فرق
ان فرقوں کا اظہار حسبِ ذیل صورتوں سے واضح ہو سکتا ہے :-
ازمنہ قدیمہ کی سلطنت و در جدید کی سلطنت

۱۔ جدید سلطنت ہر شخص کے لئے حقوق انسانی کو تسلیم کرتی ہے، غلامی، جگہ ظلم، محکمہ منسوخ کر دی گئی ہے یہاں تک کہ زرعی غلامی اور موروثی طاقت کو بھی انسان کی طبعی آزادی کے خلاف سمجھ کر برطرف کر دیا گیا ہے، انسان انسان کو اپنی ملک نہیں بنا سکتا کیونکہ انسان کوئی شے نہیں بلکہ ہمیشہ "شخص" (یعنی خود صاحب حقوق) ہے اس امر پر ہر شخص ادا ہے کہ وہ جس کام کو چاہے اسی کو اختیار کرے اور ہر کام با وقت سمجھا جاتا ہے آبادی کے تمام طبقات سلطنت میں ایک سیاسی حیثیت رکھتے ہیں اور اسے وہی کا حق مزدور اور ملازموں تک کے لئے وسیع کر دیا گیا ہے غلاموں کی شورشوں کا خطرہ مفقود ہو گیا ہے کل سلطنت زیادہ وسیع بنیاد پر قائم ہے اس کی جڑیں تمام آبادی کے اندر پھیلی ہوئی ہیں

۱۔ قدیم سلطنت انسان کے شخصی حقوق کو تسلیم نہیں کرتی تھی اور اسی لئے انفرادی آزادی کو بھی نہیں مانتی تھی۔ تمام قدیمی سلطنتوں میں آبادی کا کم سے کم نصف حصہ غلاموں پر مشتمل تھا۔ جن کے کچھ بھی حقوق نہیں تھے اور آزاد شہریوں کی تعداد آبادی کا صرف چھوٹا اودھ حصہ تھی زراعت و پیشہ کی پرورش، صنعت، خانگی خدمات اور ایک ہی حد تک تجارت بھی ترجیحاً غلاموں کے سپرد ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ محنت کی کچھ وقعت نہ تھی اور محنت مزدوری کرنے والے کسی شمار میں نہ تھے غلاموں کا تعلق سلطنت سے صرف ان کے اتاؤں کے توسط سے ہوتا تھا سلطنت میں ان کا کوئی حصہ نہیں تھا نہ ان کا کوئی وطن تھا۔ غلام انسانی حقوق سے تقریباً بالکل ہی محروم کر دیے گئے تھے البتہ رواج اکثر قانون سے بہتر تھا مگر بہترین صورت میں بھی ان کی واقعی منزلت غیر متعین تھی اور وقتاً بدترین صورت میں تبدیل ہو سکتی تھی وقتاً فوقتاً غلاموں

۱۔ قدیم اور جدید سلطنت کے فرق و حقوق انسان

کی شورشیں چھوٹ پڑتی تھیں۔ اور خالمانہ طور پر دباؤ جاتی تھیں۔

۲۔ سلطنت کا قدیم تحمل افراد قوم کی پوری انسانی زندگی پر مادی تھا جس میں مذہبی قانونی اخلاقی حرفتی، تنہائی، علمی سب حالات شامل تھے مذہبی پیشوائی بھی ایک سیاسی عہدہ تھی۔ قدیم سلطنت نے افراد کی کامل دماغی آزادی کو بھی تسلیم نہیں کیا تھا۔

۳۔ جدید سلطنت اپنی طاقت اور اپنے حقوق کے حدود سے آگاہ ہو گئی ہے وہ خود کو حقیقتاً ایک قانونی اور سیاسی جماعت سمجھتی ہے، وہ مذہب اور عبادات پر حکمران ہونے کے دعوے سے دست بردار ہے اور ان دونوں کو مذہب و افراد کی رائے پر چھوڑتی ہے مذہبی پیشوائی ایک دینی عہدہ ہے۔ جدید سلطنت کسی قسم کے علمی اور حرفتی اقتدار کا بھی دعویٰ نہیں کرتی، البتہ وہ علمی تحقیقات اور اظہار رائے کی آزادی کی قدر اور اس کی محافظت کرتی ہے۔

۴۔ قدیم زمانے کے انسان کو پورے حقوق صرف سلطنت کی رعایا ہی کی حیثیت سے حاصل تھے۔ یونانیوں میں عام قانون اور شخصی قانون کا فرق نہیں قائم ہوا تھا بلکہ دونوں قسم کے قانونوں میں گڈڈ تھے۔ رومیوں نے ان دونوں کو اصولاً تو علیحدہ کیا مگر پھر بھی ان کا شخصی قانون کلیتہً قوم اور سلطنت کی مرضی پر منحصر رہا سلطنت کے مقابل میں شخصی آزادی اس وقت تک بھی تسلیم نہیں کی گئی تھی۔

۵۔ قدیم زمانے کی سلطنت کا اقتدار غیر محدود

سلطنت کے عمل کی حدود وسعت -

شخصی آزادی قانون شخصی

اقتدار سلطنت

تھا۔

۵۔ صاحبان اختیار اپنے اختیار عام کو برسر کام میں لاتے تھے۔ قدیم جمہوری سلطنت میں سارے شہری بڑے بڑے عام جلسوں میں جمع ہوتے تھے (جنہیں یونانیوں کے ہاں اکلیسا اور رومیوں کے ہاں کومیٹیا کہتے تھے) اور سلطنت کے اہم معاملات کا فیصلہ انہیں عام جلسوں میں کرتے تھے۔

۶۔ یونانی سلطنتیں حقیقت شہروں کی سلطنتیں تھیں، روم ایک شہری کی سلطنت سے ترقی کر کے دنیا کی سلطنت بن گیا تھا۔

۷۔ قدیم سلطنت میں فرائض عامہ کی تفریق ان کی نوعیت اور اغراض کے لحاظ سے کی گئی تھی مگر پھر بھی بالعموم ایک ہی مجلس اور ایک ہی عامل مختلف النوع فرائض انجام دیتے تھے یعنی قانونی بھی اور انتظامی بھی۔

۸۔ قدیم سلطنت اگر اپنے اقتدار کو اپنے ملک کے حدود کے اندر ہی تک محدود رکھتی بھی تھی محض ذاتی وجہ سے کہ دوسری سلطنتوں کی مقاومت سے راہ تھی، نہ اس وجہ سے کہ وہ خود کو کسی عام بین الاقوامی قانون کا پابند سمجھتی تھی جیسا پچھلے رومان تمام دنیا پر مسلط ہو جانے کو مینا کی کے ساتھ اپنا فطری حق سمجھتا تھا۔

حدود ہے۔

۵۔ جدید سلطنت نیابتی ہے، ان عام جلسوں کی جگہ ایک نیابتی مجلس ہوتی ہے جسے اہل ملک منتخب کرتے ہیں۔ اس زمانے کی نیابتی مجلسوں کو زمانہ قدیم کی عمومی مجلسوں کے بہ نسبت قوانین کو جانچنے، تجاویز پر غور کرنے اور امور سلطنت پر قابو رکھنے کی زیادہ قابلیت حاصل ہے۔

۶۔ جدید سلطنتیں حقیقتاً قومی سلطنتیں ہیں شہر سلطنت کا صرف ایک جزو ہے اس کا قلب نہیں ہے۔

۷۔ جدید سلطنت میں مختلف فرائض کے لئے مختلف کارکن معین ہیں پس اختیارات کی وہ قدیم تفریق جس کی بنا محض اشتیاق پر قائم ہوئی تھی اب ترقی کر کے ایک ایسی تفریق بن گئی ہے جو فرائض کی شخصی تقسیم پر مبنی ہے۔

۸۔ جدید سلطنتیں بین الاقوامی قانون کو اپنے اقتدار و تسلط کی حد سمجھتی ہیں۔ بین الاقوامی قانون تمام قوموں اور سلطنتوں کی ہستی اور آزادی کی حفاظت کرتا اور تمام قوموں پر کسی ایک سلطنت کے عالمگیر تسلط کو مسترد کرتا ہے۔

حکومت عامہ اور حکومت نیابتی

شہر قومی

تفریق فرائض

تعلقات بین الاقوامی

ازمنہ وسطیٰ اور دورِ جدید کی سلطنتوں کے درمیان فرق حسب ذیل ہیں :-

دورِ جدید کی سلطنت

۱۔ دورِ جدید کی سلطنت انسانی فرائض سے انسانی فطرت کے تقاضے کی بنا پر قائم ہوئی ہے سلطنت حیات مشترکہ کا ایک نظام ہے جسے انسان نے انسانی اغراض کے لئے بنایا اور وہی اس کا انتظام کرتا ہے۔

۲۔ سلطنت کے بنیادی اصول کا تئیل انسانی علوم فلسفہ و تاریخ سے ہوتا ہے۔ جدید علم سیاسیات سلطنت کی تشریح کرتے وقت انسان ہی سے شروع کرتا ہے، بعض اشخاص سلطنت کو افراد کی ایک جمیعت (سوسائٹی) سمجھتے ہیں۔ جو اپنے امن و آزادی کی حفاظت کے لئے باہم متحد ہو گئے ہیں، بعض اسے قوم کی بریت اتحاد کا مجسمہ سمجھتے ہیں۔

سلطنت کا جدید تخیل مذہبی نہیں ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ غیر مذہبی ہے یعنی وہ سلطنت کا انحصار مذہبی اعتقاد پر نہیں رکھتا مگر وہ اس سے بھی انکار نہیں کرتا کہ خدا نے انسانی فطرت کو بنایا ہے اور حکومت عالم میں اس کی مرضی شریک ہے۔ جدید علم سیاسیات خدا کے طریقوں پر حاوی ہو چکا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ سلطنت کو ایک انسانی تنظیم جان کر اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

ازمنہ وسطیٰ کی سلطنت

۱۔ ازمنہ وسطیٰ میں سلطنت اور سلطنت کے اختیار کا مبداء خدا کو سمجھنے تھے۔ سلطنت گویا ایک تنظیم تھی جس کو خدا نے اپنی مرضی سے پیدا کیا تھا۔

۲۔ سلطنت کا تصور مذہبی اصول پر مبنی تھا اور یہی اصول اس کا انضباط کرتے تھے۔ اسلام جس کا تعلق نماز ازمنہ وسطیٰ سے ہے وہ صرف خدا کی ایک سلطنت کو تسلیم کرتا ہے جسے خدا نے سلطان کے تفویض کر دیا ہے ازمنہ وسطیٰ کی عیسائیت، مذہب اور سلطنت کی دوگوئی کا اقرار کرتی ہے مگر یہ یقین رکھتی ہے کہ روحانی اور دنیاوی دونوں تلواریں خدا کی ہیں، اور اس نے ایک تلوار پر سپ کو اور دوسری شہنشاہ کو تفویض کر دی ہے۔ پرورش مذہب نے روحانی تلوار کے خیال کو منتشر کر دیا اور صرف سلطنت کی ایک تلوار کو تسلیم کیا مگر وہ بھی اس مذہبی خیال پر مضبوطی سے جمارا کر شاہی اقتدار خدا کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔

ازمنہ وسطیٰ اور دورِ جدید کی سلطنت کے فرق بابت حالی یا اسالی مبداء

مذہب علم

خدائی حکومت

۳۔ ازمنہ وسطیٰ کی سلطنت کا منہا ہے خیال قدیم
ایشیائی قوموں کی طرح براہ راست خدائی
حکومت کا خیال نہیں تھا بلکہ سلطنت باوا وسط
خدائی حکومت سمجھی جاتی تھی، حکمران خدا کا نائب
تھا۔

۴۔ کسی قسم کی خدائی حکومت کا خیال جدید
اقوام کے احساس سے بالکل مستبعد ہے جدید
سلطنت انسان کی معین کی ہوئی آئینی تنظیم ہے
سلطنت کا اختیار قانون عامہ سے مشروط
ہے اور اس کے سیاسیات کی غایت المرام
قوم کی بہبود (یا رفاد عام) ہے انسانی عقل
سمجھ سکتی ہے اور جو انسانی ذرائع سے عمل
میں آتی ہے۔

مذہب

۴۔ ازمنہ وسطیٰ کی سلطنت مذہبی ملت پر مبنی
اور اتحاد اعتقاد کی خواہش تھی منکروں اور محدود کو کسی قسم
کے سیاسی حقوق حاصل نہیں تھے، اُن پر ظلم ہوتا
اور اُن کا استیصال کیا جاتا تھا، ان کے ساتھ
زیادہ سے زیادہ مراعات یہ تھی کہ اُن سے تعرض
نہ کیا جائے۔

۴۔ جدید سلطنت مذہب کو قانونی میپارہ کی
کوئی شرط نہیں سمجھتی۔ قانون عامہ و قانون شخصی
دونوں اعتقاد مذہبی سے آزاد ہیں جدید سلطنت
آزادی اعتقاد کی حفاظت کرتی ہے اور مختلف
مذہب اور دینی گروہوں کو امن و امان کے ساتھ
متفق رکھتی ہے، وہ غیر مذہب والوں کو باعزت و
کو کسی قسم کا آزار پہنچانے سے باز رہتی ہے۔

کلیسا

۵۔ ازمنہ وسطیٰ میں مسیحی دنیا کلیسا کو روحانی اور
اس وجہ سے افضل و برتر اور سلطنت کو جہانی
اور اس وجہ سے کمتر سمجھتی تھی۔ چنانچہ مینو اسے مذہبی
کی حکومت یا کم از کم اُس کی ولایت بادشاہوں پر
قائم سمجھی جاتی تھی مقتدرایان دین کا فرقہ عام لوگوں
سے بہت زیادہ بلند تھا اور ایسے خاص حقوق
رکھتا تھا جن سے بعضے جرموں کے ارتکاب پر
بھی سزا لازم نہ آتی تھی۔

۵۔ جدید سلطنت اپنے کو ایک شخص سمجھتی ہے
جس میں روح بھی ہے (یعنی قومی روح) اور
جسم بھی (یعنی آئین سلطنت) ۱۵۰ پنے کو
کلیسا ملک کے مقابل میں آزاد سمجھتی ہے کیونکہ کلیسا
بھی اُس کے مثل جسم و روح پر مشتمل ہے اور ایک
مذہبی مجموعی شخصیت رکھتا ہے سلطنت مختار
اور آزاد ہے اور کلیسا پر بھی اپنی برتری کو قائم
رکھتی ہے۔ وہ مقتدرایان دین کے حقوق کو تسلیم
نہیں کرتی بلکہ اُس نے اُن کے ایسے حقوق کو
بن کی بنا پر وہ قانون کی پابندی سے مستثنیٰ تھے

منسوخ کر دیا ہے اور قانون کے اختیار کو تمام طبقات پر یکساں طور پر وسیع کر دیا ہے۔

قدیم

۷۔ جدید سلطنت نے صرف مذہبی تربیت کو کلیسا کے ہاتھ میں رہنے دیا ہے۔ مدرسہ کا مدرسہ ہے۔ علم دینی اقتدار سے آزاد ہے اور سلطنت اس کی راوی کی محافظ ہے۔

قانون عامہ

قانون

شخصی

۸۔ جدید سلطنت نے عام قانون کی شخصی قانون کو ایک دوسرے سے ممتاز کر دیا ہے اور اس نے حقوق عامہ کے ساتھ فرائض عامہ کو بھی لازم کر دیا ہے۔

خصوصیت

اور مزید

۹۔ جدید زمانے میں سلطنت قوم کی تنظیم کا نام ہے جو اپنے اختیارات کی متحدہ قوت کو ایک مرکز پر قائم رکھتی ہے۔ سلطنتیں قومی احساس پر مبنی ہوتی ہیں اور اس کی کوشش کرتی ہیں کہ ان میں افراد کی تعداد بہت زیادہ ہو جائے۔ قانون ایک قومی اور انسانی عضو ہے اور سب پر یکساں طور پر نافذ ہوتا ہے۔

نیابت

۱۰۔ جدید سلطنت تمام قوم کی یکساں نیابت کی خواہاں ہے۔ قوم کے تئیں اتحاد کو گروہوں کی طاقت غالب ہے۔ پس سلطنت کی بنیاد عمومیت پر ہے۔ حقوق شہریت میں تمام فرقے یکساں طور پر شامل ہیں۔ قانون تمام ملک و قوم کے لئے ایک ہی ہے۔

نئی

۱۱۔ جدید سلطنت تمام گروہوں میں شہریت کی

۶۔ ازمنہ وسطیٰ میں نوجوانوں کی تربیت کا ادبی و رہبریکسیا تھا اور علم پر بھی اسی کا اختیار چلتا تھا۔

۷۔ ازمنہ وسطیٰ میں عام قانون اور شخصی قانون آپس میں غلط ملط تھے۔ مملکتی اقتدار ملکیت ارضی کے مشابہ سمجھا جاتا تھا اور شاہی اختیار کو ایک خاندانی حق تھا۔

۸۔ ازمنہ وسطیٰ کا رجحان زعامت (یعنی جاگیردار طبقہ) کی طرف تھا۔ پس سلطنت کی طاقت کے مرکز ہو گئے اور زندگی میں نزول کے ساتھ یہ طاقت خدا سے بادشاہ کو، بادشاہ سے نوابوں (امرا) کو، نوابوں سے جاگیرداروں (پانصدہ روں) اور شہروں کو حاصل ہو گئی تھی قانون کی تیسرے ایک تخصیصی نوعیت اختیار کی تھی (یعنی اس کی بنیاد یکساں اور ہموار نہ تھی)۔

۹۔ نیابت، طبقات کے لحاظ سے ہوتی تھی۔ اشرافی طبقات یعنی پادریوں اور اعیان کو غلبہ حاصل تھا۔ قانون بھی ہر طبقے کے لئے مختلف تھا۔

۱۰۔ امرا چھوٹے ہوں یا بڑے ان کی خاندانی اور

طبقاتی آزادی اس درجہ محفوظ تھی کہ سلطنت کا اقتدار کمزور ہو گیا تھا، دوسری جانب متکاربہ کا طبقہ غیر آزاد حالت میں مقید تھا۔

۱۱۔ ازمنہ وسطیٰ کی سلطنت محض ایک قانونی سلطنت تھی مگر عدالت کے ذریعے سے حقوق کی پوری حفاظت نہیں ہوتی تھی اور لوگوں کو اکثر اپنے حقوق کی حفاظت خود ہی کرنی پڑتی تھی۔ حکومت اور انتظام دونوں کمزور تھے اور ان میں بہت کم ترقی ہوئی تھی۔

جدید زمانے کی سلطنت کی حکمرانی پر قوت ہے اور اس کا نظم و نسق قوم اور رسوائی کی بہتوں کے نقطہ نظر سے مضبوط طور پر قائم کیا گیا ہے۔

۱۲۔ ازمنہ وسطیٰ کی سلطنت کو خود اپنی روح کا احساس بہت کم تھا سلطنت کی بنا شعور و فطری اور رجحانات پر قائم ہوتی تھی اور دیکھنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک خود رو چیز تھی۔ اس کے قانون کا اصل ماخذ رواج تھا۔

سلطنت کے
عمل کی
حد و وسعت

غیر آزادی
رواج اور
ارادی قانوں

ساتواں باب

سلطنت کے مختلف نظریوں کا ارتقا

سلطنت کے تخیل اور اُس کے واقعی مفہوم کی تبدیل ہوتی میں علم سیاست نے بھی بہت ہی اہم حصہ لیا ہے۔ جدید سیاسی نظریہ۔ جدید سیاسی عمل سے پہلے وجود میں آیا۔ علی سلطنت کے تغیرات کی راہ میں ہر قدم پر نظریہ سلطنت چراغ ہدایت بن کر اُس کے ساتھ ساتھ رہا۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ نظریہ عمل کے پیچھے پیچھے رہا۔
نظریہ سلطنت کی علی ارتقا کے حسب ذیل اہم مراحل خاص طور پر ذکر کے

قابل ہیں:-

۱۔ نشاۃ جدیدہ: کسی قدر ہو غوغا و تیش کی تحریرات میں ملتا ہے وہ قدیمی خیال کا بلا واسطہ نتیجہ ہے مگر اُس سے منحرف ہونا شروع ہو گیا تھا۔

۲۔ ماکیا ویلی کے نزدیک سلطنت کائنات کی اعلیٰ ترین ہستی ہے، وہ انسانی سرشت کی شریف ترین آفرینش، بھکر اس کا احترام کرتا اور ولولہ انگیز طور پر اُس سے الفت رکھتا ہے وہ بلا تامل ہر شے کو ہائیک کہ مذہب اور نیک صفائی کو بھی اُس پر قربان کو تیا ہے مگر اُس نے سلطنت کو اس قسم کی قانونی یا ایسی سلطنت نہیں باقی رکھا ہے جیسی رومیوں کی قدیمی سلطنت تھی اُس کے نزدیک قانون عامہ صرف سلطنت کی بہبود کے ترقی دینے اور اُس کی ترقی طاقت کی حفاظت کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

۳۔ مائیکل کی تصنیف: قانون ملی اور سیاسیات کی تاریخ (مینزنگ سٹڈاء۔ بیچ ثالث سٹڈاء) میں علم سیاست کی اس ارتقا کا زیادہ تفصیلی بیان درج ہے۔

۴۔ یاد رکھو کہ دہریہ زبان میں ہ کا تلفظ ہمیشہ مع کیا جاتا ہے اور بعض حالتوں میں مخ۔ (ع۔ ص)

اُس کا قیام سلطنت تمام سیاسیات سے بھرا ہوا اور اسی کے تابع ہے۔ اُس کے نزدیک سلطنت نہ اخلاقی ہے اور نہ قانونی بلکہ وہ محض ایک سیاسی شے ہے۔ پس سلطنت کے تمام کاموں کا معیار محض سود مند ہی ہے۔ سلطنت کی قوت اور اس کا اقتدار جس اور کا متقاضی ہو صاحب سلطنت (مدبر ملک) کو دہی کرنا چاہیے اور اخلاقی ضوابط اور قانونی رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لانا چاہئے البتہ جو امر سلطنت کی بہبود کے حق میں مضر ہو اُس سے پہلو بچا جانا چاہئے۔

ماکیا ویلی کی بڑی خدمت یہ تھی کہ اُس نے علم انیست کو دینیات سے بالکل آزاد کر دیا اور قانون عامہ اور سیاسیات کا فرق دریافت کیا مگر اس نے ایک خلاف اخلاق اور خلاف قانون طرز عمل کو سراہا ہے اور اپنی دانشمندانہ مشورت کو ظلم و جور کے تابع کر دیا ہے اور اس طرح گزشتہ چند صدیوں کے سیاسی دستور کو خراب کرنے میں مدد دی ہے۔

بوڈن، سلطنت کا مفہوم یہ سمجھتا ہے کہ چند خاندان اور اُن کے مشترک مقبوضات کی صحیح حکومت شاہی اقتدار کے ساتھ ہو۔ وہ سلطنت کی بنا بالتحقیص خاندان مقبوضات مشترک اور اقتدار شاہی پر رکھتا ہے اور قدامت کے ان سیاسی خیالات کو مورد الزام سمجھتا ہے کہ اُنھوں نے خوشحالی و کامیابی پر ضرورت سے زیادہ توجہ کی۔ حکمران کے اقتدار شاہی کے اصول سے اس نے فرانسیسی بادشاہوں کی مطلق العنانی کو عملی تقویت دی۔

ہو غوغو و تیس ہنوز سیمسر کی تعریفات کی طرف رجوع تھا مگر پھر بھی جدید سیاسی خیالات کی طرف اس کا میلان بہت ہی کم طور پر نظر آتا ہے۔ قدامت کی طرح وہ بھی سلطنت کی بنا انسانی فطرت پر رکھتا ہے مگر نسبتاً وہ بنی نوع انسان یا تمام قوم کا خیال کم کرتا ہے وہ سب سے زیادہ منفرد اشخاص پر نظر ڈالتا ہے اس کا یہ قول کہ انسان مدنی الطبع ہے اسطو کے اس قول کا ناقص ترجمہ ہے کہ انسان ایک سیاسی حیوان ہے مگر اس سے ایک خصوصیت کے ساتھ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جدید مباح سلطنت سے ابتدائیں کرتیں جیسا کہ متقدمین کا عمل تھا بلکہ افراد سے ابتدا کرتی ہیں اور اُن کے مجموعے کی طرف بعد کو توجہ کرتی ہیں، کلیسا کی مذہبی جماعت کا سلطنت کی دنیاوی اور سیاسی جماعت سے قطعی علیحدہ کر دینا اور شخصی آزادی پر زور دینا اس دلدیزی مصنف کے جدید میلان طبع کے دو مزید شواہد ہیں۔ وہ سلطنت کو آزاد و اشخاص کا اتحاد کامل بتاتا ہے جو قانون سے نفع اٹھانے اور عام بہبود کے خیال سے باہم متفق ہو جاتے ہیں۔

بوڈن

غوغو و تیس

سلطنت کی شخصیت سے بھی وہ ناواقف نہیں تھا مگر اس کے سیاسی نظریے پر اس خیال کا غلبہ نہیں ہے، عام رضامندی کو قانونِ عام کا اہم ماخذ قرار دینے سے اُس نے اُسی خیال کی طرف اشارہ کیا ہے جس نے بعد کے زمانے میں نظریہ معاہدہ کی صورت اختیار کی۔

قانونِ فطرت کے نظریہ جدید کی بنیادی خیال معاہدہ ہے اور اُس تختی فلسفہ سیاسی کی بنا بھی یہی ہے جو سلطنت کے قدیم نظریات سے بالکل آنا دھوکہ کر قائم کیا گیا ہے فلسفی جماعتوں اور سیاسی فریقوں کے اختلافات نے رایوں میں بڑا فرقہ ڈال دیا اور مشکل سے کوئی ایک مصنف دوسرے مصنف سے پورا اتفاق کرتا تھا، مگر فطری قانون کے متغیر دبیانوں اور سلطنت کے عام تصور میں موجودہ صدمہ ہی تک یہ بنیادی خیال پھیلا ہوا تھا کہ سلطنت دراصل افراد کا ایک اجتماع ہے اور اس لئے وہ شخصی آزادی کا ایک علی الاطلاق فعل ہے (جو کسی قاعدے کا پابند نہیں) اس معاملے میں حکومت علی الاطلاق کا حامی، ہائیس جس نے بادشاہ کے اختیار کو ایک بلا فوشس عفریت بنا دیا ہے، اور وہ اصول پرست خانہ برانداز روسو جس نے اپنے قومی اقتدار اعلیٰ کے نظریے سے سارے نظم سلطنت کے استمرار کو ایک بحث طلب مسئلہ بنا دیا ہے دونوں ہمہوا ہیں ذہن ساموئل پوٹن وورف سلطنت کو ایک اخلاقی شخص قرار دیتا ہے، مگر اُس کے نزدیک بھی سلطنت کی معنی جملہ افراد کی معنی کا مجموعہ ہے اور سلطنت کی تشریح وہ بھی معاشرتی معاہدے کے نظریہ سے کرتا ہے۔ جان لاک نے مذہبی متعصبوں کے مقابلے میں نظریہ معاہدہ کی پر جوش حمایت کی ہے اور اُس کی نظر میں بھی نظریہ انگریزوں کی ملکی آزادی کی ایک ضمانت ہے۔ کانت بھی اس سے آگے نہیں بڑھا ہے اگرچہ اس کا میلان یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دائرے سے نکل جانا چاہتا ہے اور فشتے بھی اپنی سابقہ تحریروں میں اسی خیال پر قائم ہے۔

فطرتی حقوق کے تمام فلسفے کے مطابق سلطنت کی حقیقی بنیاد معاہدہ ہے اور اجتماع پر

سہ دیکھو کانسٹ کے تصنیفات (مترجمہ روزن کرانتس) جلد ۲ صفحہ ۱۹۰۔

تمام معاشرتی معاہدات میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ کسی خاص غرض کے لئے بہت سے لوگ متحد ہو جاتے ہیں مگر ایسا اتحاد جو فی نفسہ مقصود آخری ہو وہ صرف بتخلیم معاشرت ہی میں پایا جاتا ہے مگر اُسی حد تک جتنا تک کہ نظم معاشرت ایک مجموعی حیثیت رکھتا ہو۔

۱۔ قانونِ فطرت
۲۔ نظریہ
۳۔ سلطنت
۴۔ معاہدہ اور
۵۔ سلطنت
۶۔ ارتباط -

اگر قدیم فلسفیوں نے افراد کے حقوق پر کافی توجہ نہیں کی، تو جدید فلسفیوں نے اُن کے برعکس یہ غلطی کی ہے کہ انھوں نے انفرادی حیثیت کو اتنا بڑھایا کہ سلطنت کی مجموعی ہستی سے غافل ہو گئے۔ فطری قانون کی بنیاد پر جو نظریہ سلطنت معاشرے کا قیام ہوا تھا اُسے دو جدید میں اگر علم مقبولیت حاصل ہو سکی اور اسی دور میں اُسے عمل میں لانے کی کوشش کی گئی، تب تک اس سے قبل کی دو صدیوں کے خود مختار راندنگ طبیعت کو ایک ایسا ہی نظریہ سلطنت پسند آ سکتا تھا جس میں سلطنت کی بنیاد اقتدار اعلیٰ پر رکھی ہو۔ اُس زمانے میں اس بات کے دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی تھی کہ خود اقتدار اعلیٰ کا ماخذ کہاں ہے۔ کبھی تو لوگوں کو کلیسا کے اس روایتی حقوق سے اطمینان ہو جاتا تھا کہ حکومت کی تلوار خدا کی طرف سے عطا ہوئی ہے، اور کبھی اس شیشی روایت کی طرف مائل ہو جاتے تھے کہ امیر یا حکمران ملک کا مالک اعلیٰ ہے، لیکن اس اثنا میں ان قدیمی معتقدات میں تغیر ہوا کہ کچھ تو اقتدار اعلیٰ میں قانون عامہ کی خصوصیت کے بڑھ جانے کی وجہ سے اور کچھ عام بہبود پر کا خاکہ کرنے کی ضرورت سے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

مہم ترین
اقتدار

اس طرح سلطنت کی نسبت یہ خیال پیدا ہو چلا کہ کبھی بالا تر شخص کی حکمرانی کے دائرہ عمل کا نام ہے، اور اقتدار اعلیٰ واقعتاً سلطنت کے ہم معنی ہو گیا جیسا کہ لوئس چارلزم کا کرتا تھا کہ "میں ہی سلطنت ہوں" اس خود مختاری کے نظریہ سلطنت کا بنیادی خیال یہی تھا جسے بوڈن اور ہابز نے تیار کیا اور جسے بالتحقیق فیلڈ (انگریز) اور بوسویٹ (فرانسیسی) کے توسط سے مذہبی رنگ میں ترقی حاصل ہوئی اور سیکڑوں مختلف طریقوں سے اسی ایک خیال کی تعلیم ہوتی رہی۔ اقتدار کی اس یک طرفہ بحث میں بالطبع محکوم کی آزادی اور اُس کے حقوق بالکل نظر انداز کر دیے گئے تھے جس طرح رومن کیتھولک کلیسا اپنی جستی کا لب لباب صرف فرقہ بندی کو اور اُس کے سرگروہ پوپ کو قرار دیتا ہے۔ اور دنیا داروں کو بھیدوں کا گلہ بھٹاتا ہے جس کی ہدایت و خبر گیری اور اس سے (انتفاع) مذہبی گلیبانوں پر موقوف ہے۔ اُسی طرح اس نظریہ سلطنت کے موافق صرف حکمران اور عمدہ داران حکومت ہی ایک حیثیت رکھتے ہیں اور رعایا محض ایک مطیع و منقاد گروہ ہے، جس پر حکومت کرنا طبقہ بالا کا کام ہونا چاہیے اور خود رعایا کو اپنے انتظام کا یا حکومت میں شریک ہونے یا حکمرانوں کے اطوار کی نگرانی کا کوئی حق نہیں ہے۔

سلطنت
حقیقت کی
سلطنت کے

کانٹ اور ولیم فون میمولٹ نے سلطنت کو جو اس مفہوم میں ایک قانونی سلطنت بتایا کہ اس کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ ہر شخص کے قانونی حقوق کی حفاظت کو برقرار رکھے اس دعوے سے اُن کی پہلی غرض اُس وسعت کو تنگ کرنا تھا جو نظریہ قانون فطرت اور نظریہ اقتدار دونوں کے بموجب حکومت کو حاصل ہو گئی تھی مگر فشتے سے حقیقت اپنی توضیح سلطنت میں ان تنگ حدود کو توڑ دیا کیونکہ اس نے معاشیات کو بھی سلطنت کے ساتھ مربوط کر دیا بلکہ معاشی سلطنت کی طاقت کو مبالغے کے ساتھ بیان کیا اور اپنی زندگی کے آخر زمانے میں جرمانیا کی آزادی کے قومی جوش سے متاثر ہو کر اُس نے سلطنت کی طرف اس سے بھی برتر و حافی فرائض منسوب کر دیے مگر اُس سے اگلی پشت کے اکثر جرمانی فاسفی اور معنی اس نظریہ کے متعلق کانٹ ہی کے تنگ مفہوم پر قائم رہے۔

قانونی سلطنت
بمقابلہ احتسابی
سلطنت

یہ کوئی عجیب کا مقام نہیں کہ یہ خیال بہت سے ایسے لوگوں میں مقبول ہو گیا جو اُس زمانے کی حکومت کے خط سے اور کو تو اتالی اور فوج کی بے لگام کارروائیوں سے پناہ ڈھونڈ رہے تھے مگر جو لوگ "قانونی سلطنت" کو احتسابی (یا کو تو اتالی) سلطنت کا مقابل قرار دیتے تھے اور جس کے نزدیک زمانہ جدید کا یہ فرض ہے کہ وہ کو تو اتالی سلطنت کو بٹا کر اُس کی جگہ قانونی سلطنت قائم کرے انھوں نے صاف طور پر یہ نہیں سمجھا تھا کہ سلطنت کیسی وسیع چیز ہے۔ سلطنت کو خالص قانونی سلطنت، بنادینا الیہابی ناموزوں ہے جیسا اُسے شری "کو تو اتالی سلطنت" بنانا ناگزیر ہے۔ اگر سلطنت کی تدوین ایک طرفہ طور پر کر کے وہ "قانونی سلطنت" بنا دی گئی تو وہ بالآخر محض انصاف رسی کی ایک تنظیم ہو کر رہ جائے گی جس میں قانون وضع کرنے والی قوت کی جانب سے قانونی قواعد مقرر کر دیے جائیں گے اور اختیار عدالت ان کی حفاظت کرے گا اور انھیں منہرہ حالتوں پر عائد کرے گا اور حکومت کی کار فرمائی کے لئے اس کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا کہ وہ قانونی عدالتوں کی خادم یعنی الٹا کو تو اتالی بن جائے اقتصاداً و اخلاقاً و تعلیم و تہذیب اور قومی قوت کا نشو و نما سب اُس سپر کی حالت میں پڑ جائیں گے اور ملک کی حکمت عملی میں کسی قسم کی عظمت و رفعت باقی نہیں رہے گی۔ اس کے برعکس "احتسابی سلطنت" کی ایک طرفہ تدوین انجام کار میں ہر قسم کے انفرادی حق اور آزادی کو ان مقاصد پر قربان

(علیہ مقابلہ کیے متنازعہ) یا بسیم۔ یہ بیان ہے کہ پہلی قانونی سلطنت کا مفہوم وہی ہے جسے ایک تیان میں (بقول پرور میر) بیان کیا تھا۔ بہت برت (پنسر) انتہائی ادا بہت "یا لا حکیت مع بولیس" کہا گیا ہے۔ پس اس سے بالکل مختلف ہے جسے پہلی "احتسابی سلطنت" کہتا ہے جس کا مفہوم وہ ہے جسے "وادی جان کی قانون سازی" کے نام سے مدعا کیا جاتا ہے۔ یہ غلط و مبنا جائے کہ زیادہ حال کے بعض جرمانی مصنفین نے "قانونی سلطنت" کا لفظ محض اپنی حکومت کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ کتب اور کتب کی ہو کر وہ قانون کی ظان درزی نہیں کرتی۔ مقابلہ کیے ہوئے تیار ت۔ اصول سیاست الطبع دوم، صفحہ ۲۱۳۔ ۲۱۴

کر دے گی جو مجموعہ مفید معلوم ہوں گے، اور آزاد شخصوں پر ناقابل برداشت حد تک
تولیت قائم کر دے گی۔

پس اگر قانونی سلطنت سے یہ سمجھا جائے کہ (۱) سلطنت صرف ایک تنظیم ہے
جس کا فریضہ افراد کے حقوق کی حفاظت ہے تو پھر سارا قانون عام محض ایک ذریعہ قانون
شخصی ہی کا رہ جائے گا اور سلطنت افراد کے ذاتی حاد م کی حیثیت تک متغزل کر جائے گی۔
اور اگر قانونی سلطنت سے یہ سمجھا جائے کہ (۲) سلطنت کا کام قوم کے
حقوق کو منظم کرنا اور اس کے ساتھ افراد کے حقوق کو تسلیم کرنا ہے تو یہ ایک بالکل صحیح مگر غیر مکمل
راہ ہے کیونکہ اس میں مذبران سلطنت کے سب سے زیادہ نتیجہ خیز مساعی یعنی قوم کی ذی
بہبودی اور اس کی دائمی ترقی کی فکر کرنے کے کام کلیتہً نظر انداز کر دئے گئے ہیں۔

یا (۳) اگر یہ سمجھا جائے کہ سلطنت کا کام عملاً فوائد عامہ کو ترقی دینا بھی ہے مگر
ضابطے کی رو سے اسے صرف اس حد تک جبر کرنے کا اختیار ہے جس قدر کہ کسی قانونی ضرورت
کے لئے درکار ہو تو اس خیال کے خلاف مشکل سے کچھ کہا جاسکتا ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی
ظاہر ہے کہ اس سے سیاسی کارفرمائی کا صرف ایک پہلو متعین ہوتا ہے اور مفاد عامہ کے
معاملات مثلاً اشیائے خورد و پی کی ہم برسانی، تجارت اور عام تمدن کے حالات سے کچھ اعتنا نہیں
کیا گیا ہے حالانکہ سب انہیں قانونی حدود کے اندر آزادانہ طور پر جاری ہیں اور ان کے لئے
جبر کی کسی شکل کے اختیار کرنے کی حاجت نہیں ہے۔

اگر قانونی سلطنت سے یہ سمجھا گیا ہے کہ (۴) سلطنت کی مدہی بنا سے انکار اور
اس کے انسانی بنا محدود کا اقرار کیا جائے (۵) ہر قسم کے اقتدار علی الاطلاق اور
موروثی سلطنت سے جس میں اکثر جاوید پالیس کی مداخلت بھی شامل ہو جاتی ہے مقادمت
کی جائے اور اس امر کا دعویٰ کیا جائے کہ معاملات عام میں اہل ملک کو مشرک کرنا چاہئے تو
اس سے جدید سلطنت کے خصوصیات ضرور ظاہر ہو جاتے ہیں مگر بد قسمتی سے تکثرین اظہار
اس کے لئے ناموزوں واقع ہوا ہے۔ اسے آئینی سلطنت کہنا زیادہ مناسب ہے۔

جس طرح سلطنت کے دو پہلو ہیں، مسکون اور حرکت، قائم رہنا اور نشوونما پانا،
اور روح اور اس داخلی اعتبار کے حسب حال دو علوم سیاسیہ ہیں، قانون عام اور سیاسیہ۔
اسی طرح دو متمم بالشان اصول سلطنت بھی ہیں جو روایتی استعاروں کے امتداد سلطنت کی
پہرنا جاتے ہیں۔

کس مبنی میں
سلطنت کی
قانونی سلطنت
اور کس مبنی میں
نہیں ہے۔

سلطنت کو بہبودی
اور قانون پر مبنی
پہرنا جاتے ہیں۔

زندگی کو بناتے اور اُسے بار آور کرتے ہیں اور جو سلطنت کی صورت اور منی دونوں کو مشکل اور متعین کرتے ہیں۔ یہ دو صمات اصول، معتات گستری اور بہود عامہ ہیں۔ بہود عامہ بالخصوص ماہرین کے پیش نظر ہوتا ہے اور عدالت گستری پر متعین کی نظر رہتی ہے۔ خیال عدل قانون عامہ کا تعین کرنا اور خیال بہود و سیاسیات کی رہبری کرتا ہے۔

حکومت کا اشتغال اگرچہ دو قانونی ہی کے اندر رہے مگر اس کا تعلق زیادہ تر بہود عامہ سے ہوتا ہے۔ اہل رواجین کی قوم سیاسی اعتبار سے بہترین قوم تھی انھوں نے بہود عامہ کی خبر گیری کو اپنے اعلیٰ ترین حکام کا مقدم فرض قرار دیا تھا، عدالت قانونی کے مشاغل قانون کے برقرار رکھنے تک محدود ہیں لیکن سلطنت اگر اپنی زندگی و خوش حالی کی خواہاں ہے تو اسے بہود عامہ قانون دونوں پر مسلسل توجہ رکھنا چاہیے اب ہی بہود عامہ کی ضروریات میں جدید سلطنت ازمنہ و ظلی کی سلطنت کے نسبت بہت زیادہ توجہ کرتی ہے اور اس نے سابق الذکر خرائد کی بر نسبت قانونی سلطنت کی حیثیت کم رکھتی ہے۔

یہ فرقہ مورخین ہی کو حاصل ہے کہ انھوں نے سلطنت کے عضوی خصوصیات کا ازسرنو احساس کیا، بعض بڑے بڑے ماہروں نے تو سلطنت کی عضوی حیثیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا تھا چنانچہ پروفیسر ویشاکے فریڈرک اعظم نے اپنی تصنیف ”اسٹیٹ یا کیس ویل“ (یعنی مایا دیوی کے رو) میں صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ ”جس طرح سے انسان پیدا ہوتے ایک عرصے تک زندہ رہتے اور پھر کسی بیماری سے یا بوجھ سے ہو کر مر جاتے ہیں، اُسی طرح سلطنتیں بھی وجود میں آتی، چند صدیوں تک چلتی بھولتی اور پھر برباد ہو جاتی ہیں“ مگر اہل فن نے اس خیال کے ساتھ اس دور جمہوریہ کی برتری کہ جب فرقہ مورخین نے اس کی تجدید کی تو وہ ایک نئی تحقیقات معلوم ہونے لگی اور علم السیاست کے ارتقاء نے آئندہ کے لئے ایک بالکل نیا اور زیادہ حاصل خیز راستہ اختیار کیا جس انسانیں فرقہ مورخین تصور سلطنت کو ضرورت سے زیادہ قومی رنگ میں لانے کی طرٹ مائل رہے اور اس کی بلند تر انسانی اہمیت کو انھوں نے نہ صرف نظر انداز کر دیا بلکہ اُس کے ماننے سے انکار کرتے رہے چنانچہ سوئیڈن نے صاف یہ لکھا ہے کہ ”سلطنت قوم کے اجتماع روحی کی مجسم شکل یا قوم کا عضوی مظہر ہے“ مگر ایک

۱۷۷ سوئیڈن:۔ رومیوں کا نظام قانون (Lesromischen) Savigny System

Rechtsg

ممتاز انگریز اور منڈربرک نظریات انقلاب کے خلاف بحث کرتے ہوئے تاریخی سلطنت کو دنیا کی "ترتیب خداوندی" کی روشنی میں لایا۔ اپنی تحریر (فرانس کے انقلاب پر اظہار خیالات) میں ایک مشہور فقرہ اس نے یہ لکھا ہے کہ "نظم معاشرت، فی الواقع ایک طرح کا معاہدہ ہے، محض وقتی ضرورت کی انبیاء کے لئے جو معمولی اور ضمنی معاہدے ہوتے ہیں جسے منی منسوخ کئے جاسکتے ہیں مگر سلطنت کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ کالی مہر ہے، تھوڑے چھینٹ یا تباہی کو یا کسی قسم کی ادنیٰ درجہ کی چیزوں کی تجارت کے معاہدہ اشتراک سے زیادہ وقت نہیں رکھتی جو کسی ادنیٰ اور عارضی غرض سے قائم کیا جاتا ہے اور فریقین کے دل میں جب خیال آجائے وہ اسے برباد کر سکتے ہیں سلطنت کو ایک دوسری ہی طرح کے استراحت کی نظر سے دیکھنا چاہئے کیونکہ وہ ان چیزوں کا اشتراک نہیں ہے جو کیفیت حیوانی ہستی کے لئے عارضی دنیا پذیر قسم کی ہوا کرتی ہیں بلکہ ہر طرح کے علم، ہر طرح کے فن، ہر طرح کی نیک صفاتی، ہر طرح کی نیکی کا اشتراک ہے چونکہ اس قسم کے اشتراک کے اغراض کئی نسلوں میں بھی حاصل نہیں ہو سکتے اس لئے یہ صرف ان لوگوں کا اشتراک نہیں رہتا جو الحال زندہ موجود ہیں بلکہ یہ ایک اشتراک ہے ان لوگوں کے درمیان جو اس وقت زندہ ہیں اور جو مر گئے ہیں اور جو آئے دن آئے ہیں۔ ہر ایک مخصوص سلطنت کا ہر ایک معاہدہ دائمی نظم معاشرت کے عظیم وسیع ابتدائی معاہدے کی ایک دفعہ جیسی وہ دائمی نظم معاشرت سے جو مرئی اور غیر مرئی دنیا کو مربوط کرتا ہے جو ایک مین عہد و پیمان کے ذریعے سے (جسے اس ناقابل الفسخ حلف کی منظوری حاصل ہے جو جملہ طبعی و اخلاقی میسٹوں کو اپنی اپنی جگہ پر قائم کئے ہوئے ہے) ادنیٰ فطرتوں کو اعلیٰ سے اور مرئی دنیا کو غیر مرئی دنیا سے مربوط کرتا ہے۔

سلطنت کا یہ تصور اس سے ہر جہاں زیادہ بلند ہے جو زمانہ وسطیٰ کے اصول کے موافق ممکن تھا کہ سلطنت کا تعلق کلیسا (مذہب) سے ویسا ہے جیسا جسم کا تعلق روح سے۔ لیکن فرقہ مورخین نے سلطنت کو اس حالت میں دیکھا جو قائم ہو چکی تھی صرف گزشتہ پر نظر کرنے سے ان پر قدیم زندگی کے مناظر کا ایسا قوی اثر پڑا کہ ان میں سے بہتوں سے موجودہ حالت کا ادراک اور حالات عامہ کو ترقی دینے کا میلان ہی جاتا رہا۔ نظریہ قانون طبعی کے مؤکدوں پر بکثرت یہ الزام لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے سلطنت افراد کی خود کامی کا کیلونا بنا دیا ہے اسی طرح فرقہ مورخین پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے تصور سلطنت کو روایتی اقتدار اور موروثی تفصیلات سے سخت جڑ بند کر دیا ہے۔

اگرچہ فرقہ موخرین کی تصنیفیں کم و بیش خاص ہی خاص سلطنتوں کی قانونی اور سیاسی تاریخ تک محدود ہیں پھر بھی اس جدید تحقیقات سے فلسفہ تحقیقی کو بھی نفع پہنچتا ہے۔
 ہیکل نے اپنے نظریہ قانون میں سلطنتوں کی تاریخ کو یوں برسرِ اُس سے دیا وہ تو یہ کی ہے جتنی اُس سے پہلے فطری قانون کے نظریے کے ماننے والوں نے کی تھی۔ اُس نے یہ ضرور سمجھا کہ دنیا کی تاریخ میں اُسے ایک منطقی طریقہ استدلال مل گیا ہے "مستی موجود" اسی اُسے "قرین عقل" معلوم ہوئی "اُس کے نظریے نے اُس وقت کی سلطنت پر وسیعاً کو آسمان پر چڑھا دیا جس کی حکومت ہنوز مطلق انسان تھی گو کہ فرائض عامہ کا احساس بھی پر و می حکومت میں شامل تھا۔ اس نے شاہی طاقت کی حمایت کی اور آئینی آزادی کی کچھ پروا نہیں کی لیکر اُس نے سلطنت کی اخلاقی اہمیت پر زور دیا اور اس لغو خیال کے علی الرغم کہ سلطنت صرف ایک لاپرواہی خرابی ہے، اس نے سلطنت کی تعریف و توصیف ان الفاظ میں کی کہ سلطنت "حق" کے تحیل کی بلند ترین اور شریف ترین تشکیل ہے۔

بایں ہمہ ہیکل کی سلطنت ایک منطقی تصور ہے، کوئی زندہ عنایت نہیں ہے، وہ نفس ایک منطقی تصور ہے، کوئی شخص نہیں ہے۔ ہیکل نے سلطنت اور قانون کی باطنی مرضی پر قائم کرنے سے اس حقیقت نفس الامری کو نظر انداز کر دیا ہے کہ سلطنت محض مجبوری انسانی مرضی ہی کی علامت صورت نہیں ہے بلکہ وہ انسانی طبیعت و احساس کی تمام قوتوں کی جامع ہے۔
 فریڈریش۔ سی۔ اشٹال جو ہیکل کے بعد برلن میں فلسفیانہ نظریہ سلطنت کا سب سے زبردست نمائندہ تھا اس نے نظریہ قانون فطرت کے ماننے والوں اور نظریہ ہیکل کے خلاف جوش اور سلیقہ کے ساتھ بحث کی، اُس نے رجحان تاریخی کو شیانگ کی متغیلتی عنین سے ملا دینے کی کوشش کی۔
 اشٹال نے اپنی مناظرانہ اور نقادانہ قابلیت سے نئے نکات پیدا کر کے اور اپنی

سے ہیکل اپنی تصنیف Rechtsphilosophie (فلسفہ قانونی) فقرہ ۷۵ میں لکھتا ہے کہ سلطنت اخلاق کے تصور کی تشکیل ہے۔ یہ اخلاقی روح ہے جو آدمی آزادی کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے وہ خود اپنے لئے یہاں ہے صاحب فکر و علم ہے اور جن امور کا اُسے علم ہے اور جو کچھ وہ جانتی ہے اُس کی تکمیل کرتی ہے مقابلہ کردہ ہیکل کی کتاب فلسفہ تاریخ سے (مترجمہ سیری صفحات ۴۴-۴۵)۔

۱ موجودہ دنیا
 کا جرمانی فلسفہ
 سیاسی
 ہیکل -

اشٹال

وقت نظر سے اکثر بہیم بیانات کو واضح کر کے علم الیاسات میں مختلف طریقوں سے ترقی دی گرا درامبارت سے اس نے اپنی تاریخی قابلیت کی کمی اور کسی قدر قبل سو فسطائیت کے باعث جدید کلیات کو چھوٹے بڑے مطلق العنان حکمرانوں کے افسانہ دار توہمات کے تابع کر دیا جس سے فن کو بہت نقصان پہنچا۔ احتمال سلطنت کو ایک اخلاقی و دینی مملکت، یعنی ایک تنظیم شدہ مہستی کے لئے ایک گروہ کا اتفاق سمجھتا ہے بالفاظ دیگر ایک پر شوکت و مہمت اخلاقی اقتدار و قوت کا قائم ہو جانا جس کے سامنے تمام رعایا تسلیم خم کر دے۔ اُس کا تصور سلطنت مہنگل کے تصور سے زیادہ جاندار ہے۔ اُسے یہ بھی تسلیم ہے کہ سلطنت کی حکمرانی عام اغراض تک محدود رہے اور اس طرح وہ اپنے تئیں قدیم سلطنت کے غلو سے بھی بچاتا ہے مگر پھر بھی عہد نامہ عقیق کی حکومت مذہبی کا اثر ایک لال دور سے کی طرح اُس کے تمام نظریہ سلطنت میں دوڑ گیا ہے جس سے اُس کا نظریہ جدید یورپی دنیا کے لئے بالکل ناقابل قبول ہو گیا ہے۔ سلطنت کی طاقت کے لئے ربانی یا فوق الانسانی عظمت کا ہونا انسانی و ملکی آزادی کے ساتھ ہموا نہیں ہو سکتا۔

جرمانیا میں فلسفیانہ اور مورخانہ فرقوں کی قدیم جنگ کلینے بند ہو گئی ہے۔ بعد ہی دونوں میں صلح ہو گئی تھی اُس وقت سے ہر طرف یہ مسلم ہو گیا ہے کہ تاریخ کے تجربات و مشاہدات کو تفکر کی شمع سے روشن کرنا چاہیے اور محض اگر قوم کی زندگی کے حقیقی حالات کا لحاظ نہیں کرتی تو وہ محض طحانہ توہم ہے۔ دونوں طبقے ایک دوسرے کی تلافی اور اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں طریقوں کے اتحاد سے مختلف مصنفوں کی باہوں کا تنوع مجموعی ہو سکتا کیونکہ طبیعتوں کا اختلاف ایک فطری چیز ہے بعض مصنفوں کا جحان فلسفے کی طرف زیادہ ہوتا ہے اور بعض کا تاریخ کی طرف۔

جدید علم الیاسات کی ایک دوسری خصوصیت وہ زیادہ دقیق تنقید ہے جس سے نہ صرف واقعات کی تحقیق میں بلکہ واقعات سے نتائج کے افکار و خیالات کی تشکیل میں بھی کام لیا جاتا ہے اس قسم کی تنقید میں سلطنت پر نہایت ہی مختلف پہلوؤں سے نظر کی جاتی ہے سب سے زیادہ سر پر آوردہ مصنفوں میں سے چند کا نام لیا جاسکتا ہے۔ روبرٹ فون مول کی تصنیفیں مشیر ادبی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں مگر ساتھ ہی ان میں علمی فائدہ مندی کا لحاظ بھی ہوتا ہے اور مقلانہ طور پر رکھا گیا ہے۔ آگسٹس ڈی تو کے دل چاہے امریکیہ کی جمہوریت کا بیان

۱۔ فلسفیانہ
۲۔ اور مورخانہ
۳۔ طریقوں کا اتحاد

سلطنت کی
تنقید و خلاصہ
پہلوؤں سے

کر رہا ہوا انقلاب فرانس کا قیدی سلطنت کے ساتھ تعلق ظاہر کرتا ہوا انگریزی حکومت اعیانی کی حالت دکھاتا ہوا ہر موقع پر وہ سیاسی زندگی کی حرکت کو پیش نظر رکھتا ہے۔ ہرن ایوٹ فوس کی تحریروں ان بدگمانیوں سے متاثر ہیں جو جدید خیالات کی طرف سے پہلی ہوئی یقین جان اسٹوارٹ مل معاملات عامہ پر تجریدی منطق کے اصولی نقطہ نظر سے بحث کرتا ہے مگر اسکی انگریزی سرشت و طبیعت نے اس میں گونہ اعتدال پیدا کر دیا ہے۔ ٹامسن بکسل علم طبعی کے طریقوں سے نظریہ سلطنت میں کام لیتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ فطرت کی قوتوں کے مطابق سلطنت کی زندگی کی تشریح کرے۔

دوسرے مصنفوں نے تنقید کی نوعیت کلیتہً موروخانہ کر دی ہے جیسے گنایسٹ نے کیا ہے جو انگریزی آئینی تاریخ پر خاص سند ہے۔ یہی حال ایڈورڈ لابلوی کا ہے جس نے امریکی نظام سلطنت پر نہایت شوق کے ساتھ لکھا ہے، ہارن ریش فون برائچکے جس نے سب سے اول پر روسی شاہی کی اہمیت ظاہر کی وہ بھی اسی زمرے میں داخل ہے۔ لورنٹس فون آشتائن بھی اسی طریق کا پیرو ہے مگر وہ خاصکر انتظامی جزئیات میں مشغول ہو گیا ہے۔

گیربر کے نسبتاً نئے طریق میں تنقید نے بالخصوص متفقانہ نوعیت حاصل کر لی ہے یہ طریقہ جو تجریدیات اشکالیہ کے ذریعے سے ترقی کی رفتار کو روک دینے کی طرف مائل ہے اس کے بہت سے شاگردوں کی تحریروں میں مضمر نہک پہنچ گیا ہے۔

دوسری جانب جو لوگ نفسیاتی طریقے پر سلطنت کے متعلق غور کرتے ہیں وہ سلطنت کی زندگی کو انسانی طبیعت کے خواص و اشکال کے مطابق زیادہ نمایاں کرنا چاہتے ہیں، اس طریقے میں طریقہ سابق کے مخالف خطہ پیدا ہوتا ہے یعنی سیاسیات کی حرکت قانون کے معینہ و یقینی تسلط پر کافی لحاظ نہ کرے بلکہ اسے مضطرب و مبہل کر دے۔

طریق تقابلی جو زیادہ اہم سلطنتوں کو ایک دوسرے کے مقابل میں لا کر غور کرتا ہے وہ حال کے میلانات کے موافق ہے جن مصنفوں کا ابھی ذکر ہو چکا ہے ان میں سے بہتوں نے اس طریق کو کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے، عام نظریہ سلطنت کے لئے یہ طریقہ راہدہ ضروری ہے۔

سب سے آخر امر یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں جس میں قومی سلطنتیں قائم کی جا رہی ہیں

قومی نظریہ سلطنت

نظریہ سلطنت قطعی طور پر سلطنت کی قومی خصوصیت کے متعلق بہ نسبت سابق کے زیادہ زور دیتا ہے۔ اٹلی اور جرمانا کے اپنے اپنے قومی اتحاد پیدا کرنے کی کوششوں سے پہلے فرانسیز برگ میں ولکر نیویارک میں فرانسیز لی برگٹ میں فریڈرک، لورین، تسمیورس اور میونخ میں بلنچلی نے نظری حقیقت سے اس بیان کی پیروی کی ہے اہل اطالیہ کا نو بیدار علم ایسا ہے اپنے جوانانہ جوش میں سلطنت کو قومی بنیاد پر قائم کرنے کے سہلے کو بہت خاص نود کے ساتھ زیر بحث لایا، ابتداً ایک طرف جذبات کا بھی اظہار کیا، اس خیال کے ممتاز ترین حامی رومانیوں میں جینی اور پیدے یعنی اونیپلینر میں میراتونی میں جبرائیل کی طرح اطالوی بھی اپنے نصایف میں مورخاں اور فلسفیانہ طریقوں کو متحرک رکھتے ہیں۔

تعلیق کا بھی تک سلطنت کے عضوی یا بہتر الفاظ میں بول کہنا چاہئے کہ اس کی نفسیاتی و انسانی حقیقت کا ادراک و افہام بہت کم ہوا ہے جس طرح بہت سے لوگ میں جن میں تعلیم یافتہ اشخاص بھی شامل ہیں کہ ان کے کان موسیقی سے آشنا نہیں ہوتے یا تصویر اور نقاشی کے کھن کا مطلق احساس نہیں رکھتے، اسی طرح بہت سے ذی علم اشخاص ہیں جو کسی شے کے متعلق حیاتی یا نفسیاتی غور و فکر سے بالکل محروم ہیں ان پر کوئی الزام نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ کوئی شخص اپنے طبعی خصائل کے خلاف نہیں چل سکتا مگر ان کے لئے یہ بہتر ہوگا کہ جس شے کو وہ نہیں سمجھتے اس پر حکم لگانے سے باز رہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو صرف یہ ہوگا کہ ان کی کڑواہی کے ساتھ ان کی خود بینی کا بھی اظہار ہوگا۔

عضوی طریقے کے اولیں پیشروؤں میں ایک فریڈریش اشٹمٹ نیز بھی تھا جس نے سلطنت کو ایک اخلاقی عضویت قرار دیا اور اس کا مقصد یہ بتایا کہ انسان کی ظاہری زندگی اور قانون اور یہود عامہ اور تعلیم و تہذیب کے عام معاملات کو دہینے دے لے۔ نظریہ سلطنت کو تمام قوموں کی لغبات پر مبنی کرنے کی ایک بہترین قابل یادگار کوشش فولگوات نے کی اس نے سترہ سو اسی ایک کتاب میں حصوں میں شائع کی جس کا نام ہے "علم علم لاقوام کی علم انسان کے ذریعے سے اور فلسفہ سیاسیات و قانون کی علم لاقوام یعنی اقوام کی قومی خصائص کے ذریعے سے تشریح کی پہلی کوشش تصنیف پہلی کوشش ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور اس اعتبار سے وقت کی مستحق ہے گریفی کی طریقے کی قدر و منزلت قائم کرنے کے لئے کچھ زیادہ موزوں نہیں ہے اس میں تو جانے بولنے والی کابیان قابل طینان ہے اور وہ مختلف طبائع کا اندازہ درست ہے اور جو متذہب تاریخی مواد جمع کیا گیا ہے اور

سلطنت کی
حیاتی نفسیاتی
حقیقت

اشٹمٹ نیز

فولگوات

مشابہات سیر و سیاحت کے تجربات کا ہر حصہ اس درجہ غیر تنقیدی ہے اور اس درجہ خالص اور ہی تصویریت کا ہوا ہے کہ اس کی صحت کا اثر دل پر نہیں پڑتا۔

آرنہیمس

فلسفہ کراؤزے کی پیروی میں آرنہیمس نے ایک کتاب "عضوی نظریہ سلطنت" لکھی ہے۔ (آرنہیمس: عضوی نظریہ سلطنت پہلی جلد۔ ویانا ۱۸۷۵ء) مگر سلطنت کے عضویہ سے وہ اس درجہ ایک زندہ اور شخصی مجموعی وجود مراد نہیں لیتا جس قدر وہ اسے قوم کے لئے قانون کی ایک عضوی تنظیم سمجھتا ہے۔

وائٹس

وائٹس (بالک سٹڈی اہلد باب ۵) کہتا ہے کہ سلطنت کوئی ایسی شے نہیں ہے جو حسب مرضی قائم کر لی جائے یہ نہ تو لوگوں کے معاہدہ باہمی سے پیدا ہوتی ہے نہ ایک یا زائد افراد کی قوت سے وجود میں آتی ہے سلطنت مثل ایک عضویہ کے نمودار ہے مگر محض طبعی زندگی کے قانون کے موافق اور نہ محض اس زندگی کے اغراض کے لئے بلکہ اس کی بنیاد انسان کے اعلیٰ تر اخلاقی رجحانات پر قائم ہے اور وہ اخلاقی خیالات کے حصول کا ایک ذریعہ ہے لیکن وہ ایک طبعی نہیں بلکہ ایک اخلاقی عضویہ ہے سلطنت قوم کی عضوی تنظیم کا نام ہے، مگر حقیقت میں سلطنت عام اخلاقی زندگی کے حصول کا ذریعہ نہیں ہے انسان کے اخلاقی فضائل اور اخلاقی خیالات اس کی خانگی زندگی کا بھی تعین کرتے ہیں اور اس کی سلطنتی زندگی کا بھی اس کے مذہب کا بھی اور سلطنت کا بھی اس کے خاندان کا بھی اور معاشرت کا بھی شکل سلطنت کے لئے ایک صاف اور قابل اطمینان بنیاد کا اور اک ہم آہمی وقت کر سکتے ہیں جب ہم اقوام اور نفع انسان کی مجموعی حصلت انسانی کو نفسیات کی رو سے سمجھ لیں میں نے اپنی تصنیف "سلطنت و کلیسا پر نفسیاتی مطالعات" Psychologische Studien über Staat und Kirche. Zurich, 1844

بلخانی

مطبوعہ تصویرش ۱۸۷۵ء) میں پہلی بار کوشش کی ہے کہ سلطنت کی تشریح فریڈرک رورس کی نفسیات کی رو سے کروں۔

میں نے خطا کی جو یہ فرض کر لیا کہ یہ علم ہے میں نے اپنی کتاب "سیاسی فرقوں کے نظریے" (Lehren von den Parteien) میں ظاہر کیا ہے، اشاعت پذیر ہو گیا ہے مجھے بہت جلد تجربہ ہو گیا کہ نہ صرف یہ علم مفقود ہے بلکہ سلطنت کی نسبت نفسیات کی رو سے غور و فکر کرنا تعلیم جو سے مطلقاً خارج ہو چکا ہے اور اسے کوئی جانتا ہی نہیں ہے "سطحیات"، یہ کہہ کر غلطی رکھ دئے گئے کہ یہ ایک ایسے شخص کے ناقابل یقین بیانات ہیں جو اس کے سوا کسی

باتوں میں بلاشبہ سمجھ دار ہے ان مطالعات کے مخرجِ نچتہ ہو کر اس موجودہ تصنیف میں پیش
 کئے گئے ہیں عام طور پر مقبول ہوں گے اب وہ وقت قریب آگیا ہے کہ جس راہ پر ان مطالعات
 میں قدم رکھا گیا تھا وہ خطرناک نہ معلوم ہوا اور سلطنت کا عضوی اور نفسیاتی مطالعہ مستعدی
 کے ساتھ جاری ہو جائے، اس وقت لوگ اس امر کا بہتر فیصلہ کر سکیں گے کہ یہ مطالعات
 قابلِ قدر ہیں یا نہیں اس اثنا میں مجھے اس بات کے جاننے سے بہت سی غلط فہمیوں اور ناقدانہ
 کی معاوضہ مل گیا کہ حرامانی بدترین ہیں سب سے زیادہ درخشاں تدبیروں یعنی فرید شمس اعظم
 اور پرنس ہسما کے نے اپنے قول و فعل سے پتہ نہایت کر دیا ہے کہ وہ قوموں اور سلطنتوں کے
 اندر نفسیاتی زندگی کو محسوس کرتے ہیں۔

دوسرا مقالہ

سلطنت کے بنیادی شرائط انسان اور اقوام کی مشترک وطنیت کے اعتبار سے

پہلا باب

نوع انسان، انسانی نسلیں اور قوموں کے خاندان

نوع انسان
اُس کا توحہ
اور اُس کے
اختلافات

نوع انسان ابھی تک عالمگیر شنشائی کی کوئی مجموعی تنظیم قائم نہیں کر سکی ہے۔ ازمنہ گزشتہ کی تاریخ میں صرف ایسی منفرد شنشائیوں اور سلطنتوں کا ذکر ملتا ہے جو نوع انسان کے خاص خاص حصوں تک محدود تھیں، اس لئے قانون عامہ کا موجودہ زمانے کا نظریہ عام انہیں حصوں کے مشابہات اور نوع انسانی اور سلطنت کے ساتھ اقوام کے تعلقات کے متعین کرنے سے شرفی ہونا چاہیے۔

اعلیٰ مذہبی احساس کے لئے بنی نوع انسان کی ایک کا یقین کرنا بہت ضروری ہے۔ مسیحیت نے تمام آدمیوں کو خدا کی اولاد بتایا ہے۔ مہندس سلطنتیں نوع انسانی کی ایک کو نامتی اور پست درجے کی نسلوں اور قبیلوں تک میں ایک مشترک انسانی فطرت کا اعتراف کرتی ہیں مگر اس کے ساتھ ہی نسلوں کا تحالف، سلطنت اور قانون عامہ دونوں کے لئے نہایت ہی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ سلطنت میں انسان ایک نظم و ترتیب کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے اور نظم و ترتیب بغیر اختلاف و امتیاز کے ممکن نہیں ہے۔ نوع انسان کی اہم نسلوں کے پر اسرار آغاز پر جو پردہ پڑا ہے اُس کے اٹھانے سے سائنس اب تک عاری رہا ہے سوال یہ ہے کہ آیا نسلین تخلیق کے جلد افعال کا نتیجہ ہیں اور بعض نسلیں پہلے پیدا ہوئیں اور بعض بعد کو یا مختلف نسلیں ایک ہی ابتدائی نسل سے رفتہ رفتہ جدا ہوتی گئی ہیں اور اگر ایسا تھا تو کس فطری قوتوں کے باعث یہ تغیر پیدا ہوا ہے۔ ہمیں ہنوز اس کا علم نہیں ہے مگر

لے لیکن تمام مذاہب سے اعلیٰ ترین خیال اس "ایک" (توحہ) کا اسلام میں موجود ہے یعنی یہ کہ کل بنی نوع انسان ایک ہی خالق کی مخلوق ہے اور تمام مخلوقات میں اس کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اور وہ خالق مطلق نہ خود کسی سے پیدا ہوا ہے نہ کوئی اُس کی اولاد ہے۔ (ناظر مذہبی)

انسانی ترقی کی تاریخ کے عین ابتدا ہی کے جو حالات ہمیں معلوم ہیں انہیں میں ہم دیکھتے ہیں کہ خاص، خاص نسلوں کے جسموں کی ساخت اور ان کے رنگ نیز ان کی ذہنی قابلیتوں میں فرق موجود تھا، اور وہی فرق حقیقتاً اس وقت تک بدستور موجود ہے۔

یہ سچ ہے کہ کوئی نسل کلیتہً خالص نہیں رہی ہے، اور ابتدائی نسلوں کے بہت بڑے بڑے حصے اپنی قرابت قریب سے جدا ہو گئے اور بعض ان میں نئی قوموں کی صورت میں مبدل ہو گئے ہیں۔

مگر اس تمام دور میں سفید، سیاہ، زرد، اور شاید سرخ رنگوں کی نسلوں کا امتیاز صاف نظر آ رہا ہے اور یہ امتیاز محض رنگوں کے بہ نسبت جو کبھی صوف کے میں ڈال دیتے ہیں زیادہ تر انسانی ارتقاء کی تاریخ میں نمایاں ہوتا ہے بعض نہایت عالی دماغ لوگ بھی ہیں جو ان نسلوں کے دماغی تفاوت کو اصولاً نہیں مانتے مگر ایسا شاید ہی کوئی ہو جو عملی زندگی میں بالاستقلال اس تفاوت کا اعتراف نہ کرتا ہو۔ دنیا کی تمام تاریخ نسلوں کی وہی قابلیت کے اختلاف کی شاہد ہے بلکہ ان نسلوں سے جو قومیں پیدا ہو گئی ہیں ان تک میں نامساوی قابلیت کا ثبوت عیاں ہے۔

چار خاص
نسلیں

اغلب یہ ہے کہ سیاہ رنگ حبشی نسل کی قومیں جن کو کارٹوس "اقوام لیل" کہتا ہے، کسی وقت میں نہ صرف افریقہ پر محیط تھیں (جو دنیا میں ان کا خاص حصہ ہے) بلکہ ایشیا کے جنوبی ممالک میں یہی کالی نسل پھیلی ہوئی تھی اور خود براعظم یورپ کے جنوبی اقطار پر قابض تھی۔ اس نسل کی طول عمر میں کوئی شک نہیں ہو سکتا اور یہ شاید دنیا میں سب سے مقدم نسل ہے مگر کسی جگہ یا کسی زمانے میں اس نے بطور خود کسی معقول حد تک قانونی یا سیاسی ترقی نہیں حاصل کی۔ اس کی کوئی حقیقی تاریخ بھی نہیں ہے۔ گوری نسل کے افراد یا قبائل سے جب کبھی اس کا مقابلہ ہوا وہ فوراً ان کی مطیع ہو گئی۔ تخیل کی کثرت اور جلد اشتعال میں جانے والے جذبات کے ساتھ کالی نسل میں کم فہمی اور ضعف ارادہ بھی شامل ہے۔ فطرتاً اس کی طبیعت بچوں کی سی بنی ہے جس کا اقتضایہ ہے کہ اعلیٰ قومیں

دار حبشی نسل

اسے اپنے زیر تربیت رکھیں اور اس پر حکومت کریں۔

قدیم زمانے میں بھی ہندوستان اور مصر کی کالی قوموں پر آریائی اور سامی قومیں حکمرانی کرتی تھیں۔ افریقہ کی قدیم حبشی بادشاہتیں آج بھی صحیح مفہوم میں سلطنت نہیں ہیں بلکہ جابرانہ متلون مزاج مطلق العنان حکومتیں ہیں۔ یہ قبیلے جنہیں اسلام اور اسلامی تہذیب کی ہدایت میں آگئے تو بالخصوص شمالی افریقہ میں اور وسطیٰ سودان کی سلطنتوں نے ایک نمایاں ترقی حاصل کی، ہسپانی اور لبریا کے حبشیوں کا فرانسیسی شہنشاہی اور ممالک متحدہ امریکہ کی نقل کرنے کی کوشش کرنا سیاسی قوموں کی زندگی کا ایک متحجر ہے۔

برخلاف اس کے امریکہ کے اصل باشندوں کی سرخی مائل نسل میں اس درجہ بچوں کی سی حالت نہیں ہے، مگر سلطنت کی قابلیت اُن میں بھی بہت ہی کم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ امریکہ میں یورپیوں کے آباد ہونے سے پہلے وہاں بڑی بڑی سلطنتیں موجود تھیں اور اُن میں ایک معقول حد تک قابل وقعت تمدن پایا جاتا تھا مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پیرو اور میکسیکو کی مذہبی بادشاہیاں خود وہاں کے اصل باشندوں کی کارگزاری کا نتیجہ نہیں تھیں بلکہ مشرقی اور جنوبی ایشیا سے آئے ہوئے آبادکاروں کی قائم کی ہوئی تھیں۔ پیرو میں ہنبلا انکاس کو داسوچ کے سفید بچوں کا نام دیا جانا اور ڈیوتاؤں کے بیٹوں کی حیثیت سے گورے آدمیوں کی وقعت کرنا بلاشبہ پیرو والوں کی آریائی اصل کا ثبوت ہے جہاں امریکی خود اپنی مرضی پر چھوڑ دئے گئے تھے، وہاں وہ پھر حبشی شکاریوں کی حالت کی طرف پلٹ گئے اور چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ ان کے قبائلی جمہوریئے باوجود اپنے وقتاً فوقتاً بدلتے رہنے والے سرگروہوں اور اپنے پر زور تقریر کرنے والوں اور اپنی سیاسی مجلسوں کے کسی مضبوط قانونی بنیاد پر قائم نہ تھے اور ان کے تنظیمات کا قیام یقینی اور قابل اطمینان نہ تھا۔ وہ سلطنت نہیں ہیں بلکہ شکاریوں کے جبرگے ہیں۔ منفرد شخصوں کو شاید ایک طرح کی خود سرانہ اور زبردستی کی آزادی حاصل ہو مگر جو بندش سب کو متحد کرتی ہے وہ پکی اور لوچ دار نہیں ہے۔ وہ گورے آبادکاروں کی ترقی میں کسی طرح سے

۲۷ لال
زنگ الی
نسل

(۳) زرد نسل

ہارج نہیں ہو سکتے اور اس کے قدموں کے نیچے کچلے جاتے اور تباہ ہوتے جاتے ہیں۔ سیاسی ترقی کی قابلیت کا لی نسل کی نسبت زردی مائل نسل میں زیادہ ہے۔ اس زرد نسل کا وطن ہمیشہ ایشیا میں رہا ہے اور وہ دو بڑے قبیلوں میں تقسیم ہے ایک طرف زیادہ بھورے رنگ والے اہل ملایا ہیں اور دوسری طرف ہلکے رنگ والے چینی اور منچل ہیں۔ منچلوں میں بالخصوص بڑے بڑے فرمانروا سپہ سالار اور مدبر پیدا ہوئے ہیں۔ بعض قبائل جو بلاشبہ منچل نسل سے ہیں اس وقت تک گلہ بانوں، شکار یوں اور بہنریوں کی حیثیت سے خاص کر وسط ایشیا میں بادیہ نشین حالت میں رہ گئے ہیں۔ مگر اس نسل کی دوسری قوموں نے بڑی بڑی شاہنشاہیاں قائم کر لیں۔ مغرب میں انھوں نے اپنی درشت خوئی قائم رکھی ہے مگر مشرق میں وہ زیادہ نرم مزاج ہو گئے ہیں۔ حبشیوں اور لال امریکیوں کے نسبیت یہ ساری نسل کوہ قافی نسل سے زیادہ قریبی مشابہت رکھتی ہے اور اس نے قدیم زمانے سے سفید قوموں کے ساتھ ازدواج باہمی بھی قائم رکھا ہے۔ بالخصوص ان کے اعلیٰ طبقہ میں یہ رواج زیادہ ہے۔ چین اور جاپان کی تمدن قومیں انھوں اور ترکوں کے نسبیت ترقی کے مدارج زیادہ طے کر گئی ہیں۔ انھوں نے ایک لطیف سیاسی فلسفہ پیدا کر دیا ہے اور انھوں نے وحشت کے مقابل میں خیالات انسانیت کا اور شرافت نسب کے مقابلہ میں جوہر ذاتی کا اعتراف یورپ کی آریا قوموں سے بہت پہلے کیا تھا انھوں نے زراعت، تجارت، مدارس اور کوٹوالی کے لئے بہت کچھ کیا ہے مگر قانون کے متعلق ان کے خیالات ہمیشہ اخلاقی احکام کے ساتھ مخلوط اور خاندانی زندگی اور نابالغوں کی تربیت اور انضباط کے ضروریات سے محدود رہے ہیں ان کی حکومت ایک فیض رساں مطلق العنانی ہے۔ عدوت کا احساس ان میں زیادہ نمایاں نہیں ہے اور قومی آزادی کے خیال نے زیادہ ترقی نہیں کی ہے۔ اس میزان میں کوہ قافی یا ایرانی قوموں کی نسل کا بلکہ سب سے بھاری ہے، کارٹس انھیں کونماریکی اور خفگی کی قوموں کے مقابلے میں دروز روغن کی قومیں کہتا ہے اور قدما نے انھیں کوآ قتاب

(۴) چھوٹی نسل

اور آسمان کے فرزند“ کہا ہے۔ یہ قومیں ممتاز طور پر تاریخی قومیں ہیں۔ دنیا کی تاریخ کو یہی قومیں معین کرتی ہیں، تمام اعلیٰ مذاہب جو انسان کا تعلق خدا سے قائم کرتے ہیں ان کا ظہور انھیں قوموں میں ہوا اور کم و بیش تمام فلسفہ انھیں کے افکار و ہنسی کا نتیجہ ہے۔ دوسری قوموں سے جب ان کا تصادم ہوا ہے تو اس کا انجام ہمیشہ یہی ہوا کہ انھوں نے ان قوموں کو مفتوح کر کے انھیں اپنا ماتحت بنا لیا ہے۔ ہر قسم کی اعلیٰ سیاسی تنظیم انھیں کی امنگ کا نتیجہ اور انھیں کی کارگزاری ہے۔ خدا کے زیر سایہ انھیں کی ذہانت اور انھیں کی قوت آزادی سے ہمیں انسانی طبیعت کی تمام اعلیٰ تر قیات کا آل حاصل ہوا ہے۔

یہ ”روز روشن“ کی قومیں دو بڑے خاندانوں سامی اور آریا میں منقسم ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں سامیوں کا کام سب سے زیادہ مذہب سے متعلق رہا ہے، یہودیت، عیسائیت اور اسلام ان سب کا پہلا ظہور سامی ہی قوموں میں اور مشرق ہی میں ہوا مگر سیاسی حیثیت سے ان کی اہمیت نسبتاً کم ہے۔ بخلاف اس کے آریا خاندان کی قومیں جن کی زبان صوری اور مثنوی خوبیوں کے لحاظ سے بہت وسیع ہے، سلطنتوں کی تاریخ اور حقوق کے نشو و نما میں سب سے اول جگہ رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنا صحیح وطن یورپ میں پایا ہے، اور یہیں آکر سیاسیات کے متعلق ان کی مردانہ فطرت کو غور اور پختگی حاصل ہوئی۔ یہی بنا ہے یورپ کی آریا قوموں کے اس دعوے کی کہ وہ اپنے خیالات و تنظیمات سے روئے زمین کی تمام دوسری قوموں کے سیاسی ہر کردہ بن جانا اور اس طرح نوع انسان کے انتظام کو مکمل کرنا چاہتی ہیں۔

پس نسلوں کا یہ اختلاف فطرت کی تخلیقی قوت کا نتیجہ ہے، محض انسانی تاریخ کی پیداوار نہیں ہے بلکہ خلاف اس کے وہ قومیں جن میں یہ نسلیں تقسیم ہو گئی ہیں یا جو مختلف نسلوں کی مخالفت سے پیدا ہوئی ہیں، وہ صاف طور پر انسانی تاریخ کی پیداوار ہیں۔ قومیں نوع انسان اور انسانی نسلوں کی تاریخی ارکان ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہم نہایت ہی قدیم قوموں سے بھی آگاہ ہیں جنھیں ہم اوائل زمانہ میں دیکھتے ہیں مگر جن کی نسبت ہمیں بہت ہی خفیف سا علم ہے،

گوری نسل کے
دو بڑے
خاندان
(۱) سامی
(ب) آریا

نسلوں کے
فرق طبعی ہیں
قومیت کے
فرق تاریخی
ہیں۔

اور جن کی اصل وابتدا قدمت میں گم ہو گئی ہے، لیکن ایک بہت کثیر تعداد اُن قوموں کی ہے جن کی اصل وابتدا ہمارے تاریخی علم کی حد میں واقع ہے اور ہمارے لئے یہ یقین کرنے کی کافی وجہ موجود ہے کہ ابتدائی قومیں بھی اسی طریقے سے پیدا ہوئی ہو گئی، تاریخ نے اس طویل زمانے میں انفصال و اتصال کے مسلسل عمل نیز تبدل و ترقی کے ذریعے سے قوموں کو متفرق کر دیا ہے، اور نئی قومیں پیدا کر دی ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ قوموں کی خصوصیت، ان کی طینت و خصلت زبان و قانون کے بہ نسبت اُن کے جسم کی ساخت میں کم ظاہر ہوتی ہے۔

تعلیقات

(۱) پیر ہارڈ نے اپنی ”انسان کی فطری تاریخ“ میں بڑی بڑی نسلوں کی جسمانی ساخت اور زبان کے مخالف و توافق کو نہایت خوبی سے دکھایا ہے اور اے ڈی گو بنیونے اپنے مضمون ”انسانی نسلوں کے علم مساوی“ میں سیاسی اختلافات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تصانیف اگرچہ دلچسپ اور طبیعت میں حرکت پیدا کرنے والی ہیں مگر فیصلہ کن علمی نتائج کے حاصل کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے، سب سے آخری اور سب سے مکمل تصنیف تھیوڈور وائٹس کی کتاب ”فطری (یعنی غیر تمدن) قوموں کی انسانیات“ ہے جس کا چھٹا (آخری) حصہ خصوصاً ملاحظہ طلب ہے نیز پیشل کی کتاب ”معلومات بابت اقوام“ (پانچویں شاعت ۱۸۸۱ء) صفحہ ۳۳۳ سے آخری بیان تک۔

A. de Gobineau,

۱۸

Essai sur l'inégalité des races humaines, Paris 1852-1855.

Th. Waitz, Anthropologie der Naturvolker. 6 vols, 1856-1872

Peschel, Volkerkunde 5. Auflage 1881

۳۵

(۲) قانون اور سیاسیات کے متعلق نسل کی جواہریت ہے اُس سے اہل فن نے بہت زیادہ زمانے تک لاپرواہی برتی ہے گو بینو اُس کمی کو پورا کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اکثر دوسری انتہا پر پہنچ جاتا ہے اور ہر شے کی تشریح نسل کی طبیعت سے کرنا چاہتا ہے نیز وہ اس نسل پر ضرورت سے زیادہ توجہ کرتا ہے جو توالد و توارث اور خون کے تسلسل سے قائم ہوئی ہو اور اس امر واقعی کو فراموش کر دیتا ہے کہ تعلیم سے بھی نسل پیدا ہو سکتی ہے جیسا کہ ہم خاندانوں اور قوموں دونوں میں دیکھتے ہیں ایسی ثانوی نسل اگرچہ زیادہ انسانی آزادی پر منحصر ہے مگر حقوق کی ارتقا پر بہت قوی اثر رکھتی ہے، رومی پادری اس زمانے میں یورپ میں اس کی ایک نمایاں مثال ہیں کہ تعلیم و تربیت کے اثر سے کیوں کر ایک نسل پیدا ہو سکتی ہے۔

افراد کا اثر نسل کے اثر سے ایک جہا چیر نہ ہے اور انفرادی اثر بھی کچھ کم توجہ نہیں چاہتا۔ افراد نے تاریخ کی رفتار کا تعین نسلوں سے بھی زیادہ کیا ہے۔ فریدریش رومر نے ان اختلافات کا جو بیان اپنی کتاب ”مہول جماعتیاتیات“ میں کیا ہے وہ اس سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے جو اسے اب تک حاصل ہوئی ہے۔

دوسرا باب

تصورات امت و قوم

زبان کے عام استعمال میں 'امت' اور 'قوم' کے الفاظ خلط ملط ہو جاتے ہیں مگر علمی حیثیت سے لازم ہے کہ ان میں احتیاط کے ساتھ تفریق قائم کی جائے لیکن خود علمی زبان میں بھی اکثر اس وجہ سے خلط بحث ہو جاتا ہے کہ مختلف مہذب قومیں ایک ہی لفظ کو مختلف معنوں میں استعمال کرتی ہیں۔ جرمانی زبان میں ہم لفظ ناسیون (nation) کو ریویوں کے لفظ ناسیو (natio) اور ایٹالیوں کے لفظ ناسیون نالتا (nazionalita) کی طرح تمدنی مفہوم میں استعمال کرتے ہیں۔ مگر زمانہ حال کے فرانسیسی اور انگریز اس مفہوم کو پوپل اور پپل (people امت) سے ادا کرتے ہیں۔ سیاسی مفہوم کو ہم (جرمانی) فولک (Volk) یعنی لائینی لفظ پوپلٹس کے مرادف لفظ سے ظاہر کرتے ہیں مگر مغربی قومیں یعنی انگریز اور فرانسیسی اسی مفہوم کے لئے لفظ (nation) نیشن یا ناسیون استعمال کرتے ہیں۔ اشتقاق کی رو سے جرمانی استعمال صحیح ہے اس لئے کہ لائینی لفظ (natio) ناسیو (nasci) جو (ناس سی) سے مشتق ہے پیدائش اور نسل کی طرف اشارہ کرتا ہے اور فولک (Volk) اور پوپلٹس (populus) کے لفظ بیشتر سلطنت کی عام زندگی (یونانی τολῆς پوپلس یا لائینی respublica ریپبلکا

امت کے اندر
تمدن کا مفہوم
مرعی ہے اور
اور قوم ایک
سیاسی خیال

سے مگر انگریزی لفظ 'پپل' سے بسا اوقات 'فولک' کا سیاسی مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً فولکس فیئر ترپیتینگ Volkvertretung کا مرادف انگریزی میں Representation of the people ہے۔

کو ظاہر کرتے ہیں۔

چنانچہ اہل جرمانہ یا ازمنہ وسطیٰ میں ایک امت بھی تھے اور ایک قوم بھی اور اخیر کی چند صدیوں میں ان کی حیثیت ایک قوم کی نہیں بلکہ ایک امت کی تھی جو مختلف سلطنتوں، ملکوں یا یوں کہئے کہ مختلف قوموں میں منقسم تھی آج جرمانی قوم (Volk) پھر زندہ ہو گئی ہے گو کہ جرمانی امت کے متفرق اجزاء غیر جرمانی قوموں اور سلطنتوں کا جزو بھی ہیں ہر چند کہ ہمارے زمانے میں قومیت کا خیال اس سے زیادہ قوی ہے جتنا کہ کسی سابق زمانے میں رہا ہے مگر اب بھی امت اور قوم کے حدود کسی جگہ بھی ہٹا کر ایک نہیں ہو گئے ہیں۔

امت کی ابتداء

”امتیں“ اور قومیں“ تاریخ کی پیدا کردہ ہیں، ایک امت نفسیاتی کا ردوائی کے ذریعے سے آہستہ آہستہ وجود میں آتی ہے جس میں آدمیوں کا ایک گروہ بتدریج معاشرت اور زندگی کا ایک انداز اختیار کر لیتا ہے، جو دوسرے گروہوں سے اسے میسر کر دیتا ہے اور یہی ایک نسل کی مستقل تواریث ہو جاتی ہے کسی ٹکمانہ اتفاق یا اجتماع سے بھی کوئی امت نہیں بنتی ہے بلکہ اشخاص کی ایک کثیر تعداد کے آپس کی رضامندی سے اتفاق کر لینے اور معاشرتی میل جول سے بھی کوئی امت نہیں پیدا ہو سکتی۔ امت کے لئے کئی نسلوں کے تجربات و حوادث کے تعامل باہمی کی ضرورت ہے، اور پھر بھی اس وقت تک اس کے استمرار کا یقین نہیں ہو سکتا جب تک کہ خاندانوں کی روایات، تہذیب، پشت پائنت تک جاری رہ کر متواتر خصال نہ پیدا کر دیں۔

قوم کی ابتداء

ایک قوم کے وجود میں آنے کے لئے پہلے سیاسی کا ردوائی یعنی ایک سلطنت کے قائم ہونے کی ضرورت ہے اور اس لئے ایک نیا نظام سلطنت جاری کر کے بہت عجلت کے ساتھ ایک قوم معرض ظہور میں لائی جاسکتی ہے مگر حقیقی تحفظ اسے اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا جب تک کہ اس کی بنیاد قومیت پر نہ رکھی جائے۔

امت کے بنانے میں ان متعدد قویٰ اور عناصر کو ایک ساتھ عمل کرنا ہے جو مشتمل گروہوں کو ان کی مشترک عصیت، مشترک اغراض اور مشترک رسم و رواج

کے ذریعے سے آپس میں متحد ہو جائے اور دوسرے اجنبی گروہوں سے جدا ہو جائے
طرف مائل کر دینے کی قابلیت رکھتے ہیں۔

دماغی مذہب
کا اثر

مذہبی اعتقاد نے نہ صرف خصوصیت کے ساتھ ازمنہ و سطحی کے
یورپ ہی میں بلکہ قدیم ایشیا میں بھی انسان کے تمام خیالات اور زندگی پر
ایسا قوی اثر ڈالا کہ ملت دینی Community قومیت کی بنا قرار پا گئی اور
اُس مذہب پر اعتقاد نہ رکھنے والے اجنبی قرار پا کر خارج کر دیئے گئے۔

ظن غالب ہے کہ ہندوستان اور ایران کے آریا اولاً مذہبی
وجہ کی بنا پر ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور برہمنی مذہب کے پیرو
اور بودھ مت کے ماننے والے تو اپنی مشترک بود و باش، زبان اور نسل کے
باوجود یقیناً محض مذہب ہی کی بنا پر ایک دوسرے سے اس طرح لڑتے تھے
گویا وہ ایک دوسرے سے بیگانہ امتیں (People) ہیں۔ اسی طرح ہت
یہود نے صرف اپنے وطن فلسطین میں بلکہ بابل کی غلامی میں اور اُس کے بعد
اسکندر یہ کی رومی شہنشاہی کے تحت میں اور روما کے دوران قیام میں اور
یہودی سلطنت کے تباہ ہو جانے پر در دراز غیر ممالک اور اُمتوں میں منتشر
ہو جانے کے بعد بھی اپنے خصوصیات کو قائم رکھا مگر اب کہ مذہبی یکجہتی کے مقابلے
میں مذہبی آزادی کی زیادہ قہر ہونے لگی ہے اُمتوں کے بننے اور جدا ہونے
کے لئے مذہب کا اثر نسبتاً کمزور ہونا جاتا ہے۔ اب اتحاد و تفریق کے لئے مذہب
کی نسبت قومیت زیادہ قوی طاقت رکھتی ہے جس مانیوں میں بلا لحاظ
اس کے کہ وہ کیتھولک ہیں یا پروٹسٹنٹ۔ موسوی مذہب والے ہیں یا ایکسے
زیادہ مسعودوں کے ماننے والے قومی اتحاد کا احساس اور اک پیدا ہو گیا ہے اور وہ غیر ملکی اُمتوں
سے اپنا امتیاز قائم رکھتے ہیں۔ باوجودیکہ اکثر ان میں سے انھیں کے
ہم مذہب ہیں۔

دماغی زبان

اُمتوں کی تفریق میں مذہب سے زیادہ قوی اثر شے زبان کا اثر
ہے۔ زبان کا اشتراک اُمت کا خاص نشان ہے۔ مختلف ممالک کی آبادیاں
اپنی زبانوں کو بتدریج اپنی ایک خاص وضع میں ڈھالتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ

ایک وقت ایسا آ جاتا ہے جب وہ لوگ جو پہلے ایک ہی زبان بولتے تھے ایک دوسرے کی گفتگو کے سمجھنے سے قاصر ہو جاتے ہیں کیونکہ اُن کی زبانیں مختلف بن گئیں اختیار کر لیتی ہیں۔ اس نوبت کے بعد بھی جو لوگ ایک ہی زبان بولتے ہیں، وہ ایک دوسرے کو اپنا ہم امت سمجھتے ہیں اور اُن دوسروں کو جن کی زبان وہ نہیں سمجھتے اجنبی جانتے ہیں۔

زبان ہی مشترک جذبات کے اظہار کا ذریعہ اور تباہ کن خیالات کا آلہ ہے۔ وہ خاندان میں اگے بڑھتی رہتی اور ارث کے طور پر جاری رہتی ہے۔ اسلئے مادری زبان روزمرہ عمل کے ذریعے سے قومیت کے خیالات کو بیدار اور زندہ رکھتی ہے، خود اجنبی نسلیں جب وراثت کے ذریعے سے ایک نئی زبان کو اختیار کرتی ہیں تو رفتہ رفتہ اُن نسلوں کی طینت میں اُس زبان کے اثر سے تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اُسی قوم میں شمار ہونے لگتی ہیں جس کی زبان وہ بولتی ہیں۔ اس طرح جرمانی قبائل اوسٹ گوٹ اور لوم بارڈ جو آئنا لیا میں تھے وہ رفتہ رفتہ آیتا لوی ہو گئے؟ فرانس میں کلٹ فرانک اور برگنڈوی فرانسیسی بن گئے اور پروشیا میں سلاوی اور وینڈ جرمانی ہو گئے۔

ہمارے وقت میں اگر قومیت کا احساس تمام سابق زمانوں سے زیادہ قوی اور موثر ہو گیا ہے تو اس کی خاص وجہ زبان اور ادب (لٹریچر) کا اثر ہے اور سب سے بڑھکر یہ نتیجہ ہے موقت الشبوع مطبوعات کا۔ قومی تحریک کو سب سے زیادہ قوت قومی ادب سے پہنچی ہے۔ کیونکہ قومی ادب ہی وہ چیز ہے جو خیال اور احساس کا اتحاد قائم کرتی اور جو مشترک ذہنی خزانوں کو وسعت دیتی ہے۔

”تاہم زبان ہی ہمیشہ قومیت کا فیصلہ نہیں کرتی اور اس لئے اُمت“ اور موروٹی زبان کا جھٹکا وہ نونوں ایک ہی چیز نہیں ہیں ہمیشہ (واقع فرانس) کے رہنے والے اور باسک اپنے آپ کو امت فرانسیسی کا ایک جزو سمجھتے ہیں۔

سلا باسک واقع فرانس کے باشندے ایک قدیم زبان بولتے ہیں۔ اور اس کا نام اسکیورا ہے۔

حالانکہ وہ فرانسیسی زبان یا تو بولتے ہی نہیں یا اُس کا استعمال مثل ایک سیکمی ہوئی غیر زبان کے کرتے ہیں۔ اس موقع پر فرانسیسی قومیت کا احساس ایک قوم کی حیثیت سے سیاسی طور پر متحد ہوتے، مشترک حوادث اور مشترک اغراض اور ایک ہی تہذیب سے پیدا ہوا اور انہیں سے قائم ہے۔ دوسری جانب انگریز اور شمالی امریکی اگرچہ ایک ہی زبان بولتے ہیں، مگر وہ قومیت میں ایک دوسرے کو علیحدہ سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ان کا تعلق قریبی ہے مگر پھر بھی وہ ایک دوسرے سے ممیز ہیں۔ یہاں زبان کا سوال نہیں ہے بلکہ طبعی کیفیات اور مقاصد اور تاریخی معاشری اور سیاسی حالات کے اختلاف نے ایک امت کو دو حصوں میں منقسم کر دیا ہے ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نئی امتوں کے بننے میں مذہب اور زبان کے سوا (د) وطن اور ملک، (ج) طرز معاشرت و فرائض زندگی اور رسم و رواج اور (ح) سیاسی تعلقات کے ایک ہونے کا بھی اثر پڑتا ہے۔

(ج) سکونت
رسم و رواج
سیاسی اتحاد
وغیرہ

ان سب کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جس کا اثر اس خصوص میں زیادہ ہوتا ہے یعنی مختلف قومیتوں کا میل جس کے ذریعے سے ایک قومیت کے بعض حصے ایک دوسری قومیت کے ارکان کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیتے ہیں اس طرح سے ایک نیا کینڈا اور ایک نئی خصلت اور اُسی سے ایک نئی قومیت پیدا ہو جاتی ہے یورپ اور امریکہ کی تاریخ اس کی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔ لہذا امت کا اصلی جوہر اُس کے تمدن میں مخفی ہے اُس کا اندرونی انصاف اور غیر امتوں سے اُس کا افتراق زیادہ تر اُسی تمدنی ترقی سے پیدا ہوتا ہے اور ان کا اظہار بالتحقیق اُس کے حالات پر اثر ڈالنے سے ہوتا ہے۔ اسے ہم صرف نفسیاتی نقطہ نظر سے سمجھ سکتے ہیں اس کے اصلی جوہر کو ہم اُسی مشترک جذبے اور مشترک خصلت میں دیکھ سکتے ہیں جو اس کے محرک ہیں، اُسے ہم اُسی جنٹک عضوی (ذاتی جیات) کہہ سکتے ہیں جہاں تک اس کی کیفیت کا بدیہی اظہار نسل کے بقد و قاتل اُس کے خط و خال، زبان، عادات و اطوار سے ہوتا ہے مگر حقیقت میں امت شخصیت کے اعلیٰ مفہوم کے لحاظ سے کوئی عضوی ہستی نہیں ہے جیسی ایک قوم کی ہستی ہوتی ہے

نسلوں کا
امتزاج

امت کی شخصیت
مشترک جذبہ
اور مشترک
تمدن ہے
یہ باتیں ترقی
کی غیر ارادی
رفتار سے
حاصل ہوتی
ہیں۔

امت میں باہمی ارتباط کا احساس اور اتحاد کا میلان موجود ہے مگر قانونی ارادے اور عمل کا اتحاد نہیں ہے اور نہ قانونی شخصیت کا وجود ہے جب تک کہ وہ ایک سلطنت کے حدود میں ایک قوم نہ بن جائے۔

اگرچہ انسانی طبیعت اور انسانی کوششیں امتوں کی ساخت پر بہت بڑا اثر رکھتی ہے مگر زیادہ تر یہ عمل محل ایک فطری ضرورت کے غمرازی طور پر جاری رہتا ہے محض اس بات سے کہ ایک ایک ملی نوع انسانی مختلف امتوں میں تقسیم ہو گئی ہے یہ موقع پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کی مسابقت اور ان کے انواع و اقسام کے قوائے علیہ کے ذریعے سے ان کی فطرت کی وہ تمام پوشیدہ قوتیں عیاں ہو جائیں جن میں مشترک ترقی کی قابلیت موجود ہے اور اس طرح انسان اپنی غایت اصلی کو زیادہ وسعت اور فراوانی کے ساتھ پورا کر سکے امتوں کا نمودار تھا دنیا کی تاریخ کا ایک زبردست جزو ہے اور یقیناً اُس کے خدائی نقشے کے بنیادی خطوط ہیں۔

امت کی
تعریف

پس 'امت' کے تصور کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے: امت ایک موروثی نظام معاشرت ہے ان مختلف پشتوں اور مختلف معاشری مدارج کے آدمیوں کے گروہوں کے مشترک جذبے، مشترک احساس اور مشترک نسل کا جو سیاسی یکجہانیت سے قطع نظر بھی خصوصاً ایک ہی زبان ایک سے رسم و رواج اور ایک ہی تہذیب کے باعث یہ احساس رکھتے ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے ہم قبیلہ ہیں اور ایک ہی تہذیب نے اُن کے آپس میں رشتہ داری قائم کر دی ہے اور غیر امتوں سے اُن کو جدا کر دیا ہے۔

امت کے حدود و تحریک و تبدل کی قابلیت رکھتے ہیں اپنی زبان اپنے عادات و اطوار اور اپنے تمدن کو غیر گروہوں میں پھیلا کر اور اس طرح سے انھیں اپنے اندر جذب کر کے وہ مسلسل ترقی اور وسعت حاصل کر سکتی ہے اسی طرح اگر کوئی غیر تمدن فائز طور سے اُس پر غالب آجائے اور اُس کے افراد کو اپنے اندر جذب کر لے اور ان کی حالت بدل دے تو وہی 'امت' ٹکھٹ سکتی، شکست ہو سکتی اور بالکل نیست و نابود ہو سکتی ہے۔ اس طریقے پر ایک بڑی امت کا اعلیٰ تمدن

چھوٹے چھوٹے قبیلوں کے نامکمل تہذیبوں کو آہستہ آہستہ فنا کر کے ان کی جگہ پر اپنے مکمل اور وسیع نظام کو قائم کر دیتا ہے۔

لفظ ”قوم“ اسے ہم بالعموم کسی سلطنت کے جملہ افراد کا اجتماع جس حیثیت سے کہ وہ سلطنت کے اندر متحد و منظم ہوں مراد لیتے ہیں۔ قوم سلطنت کے قائم ہونے سے وجود میں آتی ہے وہ شے جو قوم کو است سے بلند کرتی ہے وہ سیاسی یکائیت اور یکجہتی کا احساس اور یک ہے خواہ اس احساس نے کم ترقی کی ہو یا زیادہ کوئی قوم جو اپنے ملک کو چھوڑ دے اس کی قومی حیثیت برقرار منظور ہو سکتی ہے مگر صرف عارضی طور پر بہانہ تک کہ اسے کسی نئے ملک میں ایک نئی سلطنت قائم کر لینے میں کامیابی ہو جائے۔ سو اس کے قوم سلطنت سے پہلے بھی قائم ہو سکتی ہے جیسے یہود کی قوم موسیٰ کے تحت میں یہودی سلطنت سے قائم تھی مگر یہاں بھی صرف اس وجہ سے ایسا تھا کہ حیات سلطنت کی تحریک یہودی قوم میں پوری قوت کے ساتھ ترقی کر چکی تھی اور قوم کی متحد تنظیم بنائے سلطنت کے لئے راستہ صاف کر چکی تھی۔

بیانیہ تک تو قوم کے تخیل کے ساتھ سلطنت کا لا بدی تعلق برابر قائم ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ سلطنت نہیں تو قوم بھی نہیں، سلطنت کی تخلیق یہ رسم خصوصیت کے ساتھ جو تھے مقالے میں بحث کریں گے مگر ہم عام طور پر قوم کے لفظ کا اطلاق اس گروہ امت پر نہیں کرتے جو محض ایک بے بس محکوم ہوا اور اس کے کچھ سیاسی حقوق نہوں اور اس لحاظ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ”قوم نہیں تو سلطنت بھی نہیں“۔ مطلق العنان حکومت قوموں کو نہیں جانتی۔ وہ صرف رعایا کو جانتی ہے۔

اگر پوری قوم یا اس کا بڑا حصہ ایک ہی امت پر مشتمل ہوتا ہے، تو طبعاً اس امت کی مشترک روح جبلت زبان اور رسم و رواج قوم پر چھایا جاتا ہے، برخلاف اس کے اگر وہ مختلف امتوں کے اجزائے مرکب ہوئی ہے، تو اس میں جذبات اور تنظیمات کا اتحاد ایک امت کے بسبب کم ہوتا ہے۔

دوسری جانب قوم کو امت پر یہ امتیاز حاصل ہے کہ قوم میں اتحاد حقوق زیادہ نمایاں درجے تک ترقی کر جاتا اور اس حد کو پہنچ جاتا ہے کہ وہ امور سلطنت کے انضمام میں حصہ لے سکے اور اس میں یہ قابلیت پیدا ہو جاتی ہے

قوم کی ترقی
سیاسی اتحاد
کے احساس سے
قوم است
متمم ہو جاتی ہے

سلطنت
نہیں تو قوم
بھی نہیں۔

قوم ایک
مجموعی شخصیت
ہے۔

کہ نظام سلطنت میں موزوں اعضاء کے قیام سے وہ اپنی عام کراوی کا اظہار ارادوں کے عملی استحکام کا انتظام کر سکے۔ ایک لفظ میں کہہ سکے کہ وہ قانونی و سیاسی طور پر ایک مجموعی شخصیت ہے۔

قوم کی روح
اور ارادہ

اس لئے ہم قومی روح اور قومی ارادے کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کا
ہیں۔ یہ روح اور یہ ارادہ ان جملہ افراد قوم کی روح اور ارادے کے مجموعے سے
کچھ زیادہ حقیقت رکھتا ہے جو قوم میں شامل ہیں۔ یہ روح اور ارادہ اپنے ظاہر و باطن
میں منفرد و درمناضد نہیں ہے بلکہ مشترک روح اور عام ارادے کا کامل اتحاد
اس کے اندر موجود ہے۔

قوم عضوی زندگی
کے فیضان کے
مذبح ہے۔

مزید براں اقوام ذی اعضا ہستیاں ہیں اور اس وجہ سے عضوی زندگی کے فطری
قوانین کے تابع ہیں۔ ان کی تاریخ ترقی میں وہی مدارج ممیز طور پر پائے جائیں گے جو
افراد کی زندگی میں پائے جاتے ہیں۔ کسی قوم کی فطری قوتیں اور قابلیتیں۔ اس کے
خیالات اور ضروریات پیرائہ سانی میں وہی نہ ہوں گے جو ہمدظلی میں تھے۔ افراد کے
مانند اقوام میں بھی زندگی کا وسط ان کی طبیعت اور طاقت کے عروج کا زمانہ ہوتا
ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ یہی زمانہ جو افراد کی زندگی میں دہائیوں سے
شمار ہوتا ہے اقوام کی زندگی میں صدیوں سے شمار کیا جاتا ہے مگر فانی ہونے کے
لحاظ سے اقوام افراد سے کچھ بہتر نہیں ہیں۔

تعلیقات

(۱) آسوی فی کا یا ایک کا زمانہ ہے کہ اس نے بحیثیت ایک عضوی ہستی کے قوم کی
اہمیت کو اور جرمانیا میں ارتقائے قانون پر قوم کی عمر کے مختلف مدارج کے اثر کو نہایت واضح طور
پر بیان کر کے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا۔

(۲) فاندانی رابطے سے از خود نہ امت ظہور میں آتی ہے اور نہ قوم اور
اشلائیر ماخر Schleiermacher کا یہ کہنا تاریخ کے سراسر مخالف ہے کہ اگر
بہت سے خاندان بذریعہ ازدواج آپس میں متحد اور دوسروں سے منقطع ہو جائیں
تو قومی اتحاد اس کا نتیجہ ہوگا۔ روما کے پیٹریشین Patrician آپس میں ازدواجی بننے

رکتے تھے اور یہی حال پلےبیان (Plebeian) گروہ کا تھا۔ مگر اولاً ان میں باہمی ازدواج کا طریقہ رائج نہیں تھا، پھر بھی یہی دونوں ٹیکر رومی قوم بنے تھے۔ جرمانی (ٹیوٹنی) تو یہی طبقات کے اتحاد و پرتل بھٹیں بن میں سے ہر ایک اپنے طبقے کے اندر ہی اپنے برابر والے گھر میں بیاہ کر سکتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں ہم مختلف امتوں میں باہمی ازدواج کا رواج دیکھتے ہیں۔ مگر اس سے کوئی نئی امت نہیں پیدا ہوتی۔

(۳) من چینئی اپنی کتاب (Della nazionalita come fonda)

(mento del Diritto delle Genti) محبوبیٹوان ششمہ اء صفحہ ۳۱ میں ”قومیت“ کی تعریف اس طرح کرتا ہے: ”ایک فطری اتحاد ان انسانوں کا جو اپنے وطن، نسل، رواج اور زبان کے ایک ہونے سے مشترک زندگی میں شامل ہو گئے ہیں اور اس اجتماعی زندگی کا احساس رکھتے ہیں۔ من چینئی کا یہ تسلیم کرنا تو درست ہے کہ سلطنت قائم کرنے کی طبعی قابلیت قومیت میں موجود ہوتی ہے۔ مگر اس کی رائے سے قوم اور امت کا فرق کافی وضوح کے ساتھ ظاہر نہیں ہوتا۔ نیز وہ اس طرف مائل ہے کہ امت کو ایک قانونی شخص تصور کرے حالانکہ کوئی امت اس وقت تک قانوناً شخص کی حیثیت کو نہیں پہنچ سکتی جب تک وہ ایک سیاسی عضویہ کے درجے پر پہنچ جائے۔“

تیسرا باب

قومیتوں کے حقوق

حقوق جن کا
ایک امت
دعویٰ کر سکتی ہے

اس امر سے کہ ہم قومیتوں کے حقوق کے تسلیم کئے جانے کا مطالبہ کرنے لگے ہیں تمدنی تمدن میں ایک قدم آگے بڑھنے کا اظہار ہوتا ہے اقوامیتیں چونکہ نوع انسانی کے اجزاء اور تاریخ عالم کے ایک عظیمہ اشان عمل ارتقائی کا نتیجہ ہیں اس لئے وہ اس بات کی مستحق ہیں کہ ان کے قیام و دوام کی بھی حرمت و حفاظت کی جائے سب سے پہلا اور سب سے زیادہ قرین فطرت اور بنیادی حق اپنی ہستی کا برقرار رکھنا ہے۔ لیکن ایک امت کی "روح عامہ" سے زیادہ اپنی بقائے ہستی کا حق انسانی زندگی کی کس ہیئت و شکل کو حاصل ہو سکتا ہے یہی "روح عامہ" انفرادی زندگی کا اساس اور اس کے ساتھ ہی ارتقاء انسانی کی شرط اولین ہے مگر اس کے لئے وقت چاہیے کہ یہ خالص اخلاقی اقتضاء و قانونی اصول کی صورت اختیار کرے۔ اس حد تک اصول قومیت کی بڑی اہمیت حکمت عملی کی حد میں داخل ہے قانون عامہ سے اسے تعلق نہیں ہے۔

مگر ایسے اصولی قومی حقوق بھی ہیں جن کا دعویٰ ایک ہی قومیت کے اعضاء مختلفہ جائز طور پر کر سکتے ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں:-

۱۔ اپنی قومی
زبان پر حق

ہر ایک "امت" کے لئے اس کی زبان اس کی نہایت ہی خاص ملک ہے زبان ہی میں امت کی مخصوص صفت رونما ہوتی ہے اور یہی وہ نہایت مضبوط بنیاد ہے جو امت کے افراد کو باہم ملائے ہوئے ہے اس لئے سلطنت کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ کسی قومیت (امت) کو اس کی زبان سے استعمال سے روکے نہ اس کے ترقی دینے اور اس کے ادب و

۱۷۲ و ممبر ۱۹۱۷ء کے آسٹرویائی اساسی قانون میں شہریوں کے عام قصوں کی بابت دفعہ ۱۹ میں

کرنے سے منع کرنا چاہئے بلکہ اس کے برعکس سلطنت کا یہ فرض ہے کہ جس حد تک تمدن کے عام اغراض کو نقصان نہ پہنچے وہ ہر ایک زبان کو آزادی کے ساتھ پھیلنے دے اور خیر خواہانہ اس کے رواج کو ترقی دے اہل روم کا اپنے صوبوں کی دسی زبانوں کا دبانا اور یوٹنی نظم و نسق کے ممالک میں سترائے موت سے وڈی زبان کے استعمال کو روکنا حقوق پر وحشیانہ دست درازی تھی۔

مگر اس اصول سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ سلطنت کے اغراض کے لئے تمام زبانوں کو ترک کر کے کسی ایک خاص زبان کو ترجیح نہیں دی جاسکتی۔ جہاں سلطنت کی زندگی کا تعلق ہے وہاں قوم کی سہو و حیثیت مجموعی اس امر کی تقاضی ہے کہ زبان کا اتحاد قائم کیا جائے انگریز پارلیمنٹ سے ویلزی اور کیلی زبانوں کا فرانسیسی مجلس ملی سے اسک اور برٹن اور جرمانی رائٹس ٹاگ سے پولی ڈینی اور فرانسیسی زبانوں کا اخراج حق بجانب ہے مگر سویٹزرلینڈ ان مختلف قومیتوں کو جن سے وہ مرکب ہے زیادہ وقت دیتی ہے اور سرکاری زبان میں فرانسیسی کے ساتھ جرمانی کو شامل کر رکھا ہے اور بعض مواقع پر ایسا لوی زبان کو بھی تسلیم کرتی ہے۔

سلطنت کو اس امر کا بھی حق حاصل ہے کہ وہ مدارس میں زیادہ ترقی یافتہ زبان کی تعلیم کا انتظام کرے تاکہ سہو ز غیر تکلیف یافتہ امت کے بچے ایک پاکیزہ اور مقتدر علم ادب کا ورثہ حاصل کر سکیں بخلاف اس کے ایک متمدن امت اسے نہایت ہی سخت ظلم سمجھتی ہے کہ ایک غیر ملکی زبان کی طرف داری میں اس کی زبان مدرسے اور کھلیسا سے خارج کر دی جائے۔

مذہب ہواں ہر ایک امت کو اپنے خاص رسم و رواج پر عمل کرنے کا اس حد تک حق ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاقی قانون انسانی کے مخالف یا حقوق سلطنت کے لئے خطر رساں نہ ہوں کہ ہندوستان کی بیواؤں کو اپنے شوہروں کے مرنے پر سستی ہو جانے کی اجازت نہ دینے میں انگریز حق بجانب ہیں مگر غیر مضر قومی گھیلیوں کے بند کرنے کا

۲۔ اپنے
خاص رسوم

بقیہ ماحشیہ صفحہ گذشتہ پر ہے کہ قوم کے اندر تمام قبائل کو یکساں حقوق حاصل ہوں ہر ایک کی اپنی قومیت اور زبان کے قائم رکھنے کا ناقابل انقض حق ہے۔

سلطنت کو کوئی حق نہیں ہے۔

خاص قانونی تنظیمات کے حدود میں کسی اُمت کو اپنے اس قسم کے قانونی تنظیمات کے سلطنت کی طرف سے تسلیم کئے جانے اور اس کی محافظت ہونے کی امید کم رکھنا چاہئے اُس لئے کہ ایسی صورت میں اُس اُمت کے مقابلے میں کچھ تو سلطنت کا اتحاد اور اس کی یکسانی اور کچھ سلطنت کے متہد قوم کے اغراض فطراناً زیادہ اثر رکھتے ہیں۔

ایک ترقی یافتہ سلطنت کے لئے ایک ایسا قانون ضروری ہے جو ساری آبادی کو شامل ہو اور منفرد اُمتوں کے حقوق کو بدل سکے یا منسوخ کر سکے۔ ہم اہل روم پر یہ الزام نہیں لگا سکتے کہ انھوں نے اپنی تمام شاہنشاہی میں رومی قانون جاری کرنے کی کوشش کی مگر یہاں کہہ مداخلت ضرور قابل ملامت ہے۔ انگریزی حکومت نے اس معاملے میں نہایت ہی سخت غلطی کی کہ اُس نے سترہ اعر میں انگریزی قانون طریق عدل جوئی کو بنگال کے لوگوں میں زیرِ سوختی نافذ کرنا چاہا جو اس کے لئے ہنوز تیار نہیں تھے۔ دوسری جانب اسی زمانے میں جرمانی سلطنتوں میں بجد اضطراب تھا کہ قوم کے چھوٹے چھوٹے گروہوں کے لئے روایتی قرابتی حقوق کا ایک نیا پریشان جمع ہو گیا اور ساتھ ہی تمام اُمت کے لئے ایک غیر ملکی قانون کے دلیرانہ اور انقلابی طور پر جاری کر دینے کی روش بھی قائم رہی۔

پس قانون کے ارتقا میں قوم کو نسبت اُمت کے زیادہ قوی حق حاصل ہے، قانون و انصاف سب کے لئے ایک اور یکساں ہونے کے خیال سے قومیت کے اختلافات کو دب جانا چاہیئے۔

یہ یقینی ہے کہ رومیوں کے لئے یہ آسان تھا کہ ماتحت اُمتوں کو قانون کے لحاظ سے رومی بنالیں مگر یہ مشکل تھا کہ وہ زبان کے لحاظ سے انھیں لاطینی بنالیتے اور ہم اسی طرح فرانسیسیوں پر اس امر کا الزام نہیں لگا سکتے کہ وہ اپنا نیپولینی صلابت جرمانی الناس اور قدیم گالی بریٹنی پر کیوں نافذ کرتے ہیں، انگریزوں کو ہر طرح پر یہ حق حاصل ہے کہ اہل ویزا اور اہل آئرلینڈ پر یکساں قانون جاری کریں تاہم یا عمر فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ رومیوں کا غیر متہد جرائمیوں پر رومی طریق عدل گسٹری کے نافذ کرنے ہی کا اثر تھا کہ جرمانی آزادی کی

ہم نظریات
سلطنت کے
حدود کے اندر
انہی خاص
قوانین پر عمل
پیرا ہونا۔

عظیم انسان جو وجہ کا شعلہ بلند ہوا اور اسی وجہ سے صدیوں تک جرمانی نظریہ قانون کا یہ مسئلہ اصول رہا ہے کہ ہر امت کو اپنے خاص قانون پر عملدرآمد کی اجازت ہونا چاہیے اور ہر شخص کی اس کے خاص وطنی اور قومی حقوق کے مطابق حفاظت ہونا چاہیے۔

قدیم رومی اصول اگر انتہائی حد تک پہنچایا جاتا تو وہ قومی قانون کے ساتھ ہر طرح کی قومی آزادی کو بھی برباد کر دیتا اور اگر قدیم جرمانی طریقے پر سختی کے ساتھ عمل کیا جاتا تو حکومت اور قانون کی ہر طرح کی اعلیٰ تہذیب غیر ممکن ہو جاتی۔ آزادی اقوام اور ترقی تمدن کی خوش نصیبی تھی کہ رومی اور جرمانی دشمنوں کے طور پر ایک دوسرے سے ملے اور کسی اصول کو کامل غلبہ نہیں ہونے پایا۔

اگر کسی امت کی اخلاقی اور ذہنی زندگی پر سلطنت کی طاقت کی طرف سے حملہ کیا جاتا ہے تو اس امت کے افراد نہایت ہی سخت مقاومت پر آمادہ ہو جاتے ہیں انسان کے واسطے ظلم و تعدی کی مقاومت کے لئے قومیت کی محافظت سے بڑھ کر کوئی سبب نہیں ہو سکتا اس کشمکش میں ضابطہ پیمانی کو نقصان پہنچ سکتا ہے مگر خود نفس قانون کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔

۴۰۔ اپنی اخلاقی
و ذہنی زندگی کا
برقرار رکھنا۔

لے بی بور (Niebuhr) اپنی تصنیف میں جس کا نام ”پروسیا کا حق سکسونی دربار کے مقابلے میں“ ہے لکھتا ہے: ”یہ اسی تعلقات کے نسبت جو ایک نسل کی مختلف امتوں کو متحد یا متفرق کرتے ہیں عام قومیت کے حقوق سے بلند ہیں، صرف خود زبان، رسم و رواج، روایات اور مادیات ایسا رشتہ اخوت قائم کر دیتے ہیں جو غیر قابل سے انہیں علیحدہ کر دیتا اور اپنے قبیلے کے برخلاف دوسرے قبیلے کے ساتھ اتحاد کو جرم بنا دیتا ہے۔“

چوتھا باب

تعمیر سلطنت میں قومیت بحیثیت اصول کے

قومیت بحیثیت
قوی رہی ہے

تاریخ عالم کے ہر زمانے میں سلطنت اور سیاسیات پر قومیت کا زبردست اثر پڑتا رہا ہے۔ قومی یکجہانیت اور مخصوص قومی صفات کے احساس نے یونانیوں کو ایران کے مقابلے میں جنگیں پر ہرا بیگتھ کیا۔ اپنی قومی آزادی کے خاطر جرمانیوں نے رومیوں سے مقاومت کی۔ رومی عالمگیر شہنشاہی کے لاطینی اور یونانی شہنشاہیوں میں تقسیم ہو جانے کی اصلی وجہ قومیت ہی کے اختلافات تھے۔ فرانکی شاہی کا شکست ہونا، فرانس اور جرمانیا کا ایک دوسرے سے الگ ہو جانا بہت کچھ رومانی اور جرمانی زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے ہوا۔ ازمنہ وسطیٰ تک میں قومیت کے قومی اختلافات وقتاً فوقتاً نمایاں ہوتے رہے ہیں مگر موجودہ زمانے تک یہ نہ ہو سکا کہ قومیت کا اصول ایک قطعی سیاسی اصول کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہو۔ ازمنہ وسطیٰ میں سلطنت کی بنا خاندانی یا طبقاتی اغراض پر ہوا کرتی تھی اور اس کے حدود قومی کے بجائے زیادہ تر ملکی تھے، بعد کی صدیوں میں بڑی بڑی یورپی اُمتوں نے نشو و نما پائی مگر اُس وقت تک بھی سلطنت نہ تو قومیت کی بنیاد پر قائم ہو سکی اور نہ اُسے اظہار قومیت کا موقع ملا بلکہ بادشاہ اور اس کے عمال کو مرکز قرار دیکر اُس نے ایک ناظمانہ خصوصیت حاصل کر لی تھی۔

مگر سیاسیات
کے اصول کی
حیثیت سے
وہ تھوڑے کچھ
زمانے قبل قائم
ہوئی ہے۔

نیز حیثیت ایک
سیاسی نظریہ
کے۔

فطری حقوق کا نظریہ بھی اپنے حسب وخواہ سلطنت کے دعووں کی بنیاد عام قومیت پر نہیں قائم کرتا تھا بلکہ انسانی فطرت اور اُس کے ضروریات اور منفرد اشخاص کی آزادانہ مرضی برائے کی بنیاد رکھی جاتی تھی۔ روسو کے نزدیک سلطنت کی بنیاد معاشرت پر ہے نہ کہ اُمت پر قوم جس سے وہ سلطنت کی اعلیٰ طاقت کو متعلق کرتا ہے وہ ایک متحدہ اُمت نہیں ہے، بلکہ ایک مجتمع کردہ یا شہریوں کی کثرت ہے جو بلا کسی وجہ موجودہ کے ایک سلطنت کے قیام کے لئے باہم متفق ہو گئے ہیں۔ خواہ وہ

ایک ہی امت کا ایک چھوٹا سا جزو ہو خواہ متحدہ قومیتوں کے اتحاد سے مرکب ہو۔ انہیں اصول پر ۱۷۹۱ء اور ۱۷۹۳ء کے فرانسیسی دستوروں کی بنا قائم ہے (دیکھو فرانسیسی دستور ۱۷۹۱ء عنوان ۳ دفعہ ۱، ۱۷۹۳ء دفعات ۲۵-۲۸، ۱۷۹۵ء دفعہ ۱) کہیں "امت" کا اور کہیں "قوم" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مگر دونوں کا مفہوم ہی تھا کہ وہ شہریوں کا ایک مجتمعہ گروہ ہے۔ جو کچھ ہو صرف یہ تھا کہ سلطنت کی حکومت مرکز سے دائرے کی طرف منتقل کر دی گئی یعنی بادشاہ کے ہاتھ سے عوام کے ہاتھ میں آگئی۔

نیو لیسن نے جب انیسویں صدی کے اوائل میں چارلس اعظم کی سلطنت کو اتر سرخوزندہ کرنے کی کوشش کی اور فرانسیسی امت پر اعتماد کر کے یورپ پر ایک ہمہ گیر شاہی قائم کرنا چاہی تو دوسری امتوں سے جو فرانسیسی حکومت کو حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھتی تھیں اسے کھڑکریں کھانا پڑیں۔ باوجود اپنی ذہانت اور طباعی کے شہنشاہ کے لئے جو قومیت کی قدر و منزلت کو نہیں سمجھ سکتا تھا، قومی مقاومت بہت ہی سخت ثابت ہوئی، لیکن اس وقت تک بھی قومیت کے احساس میں پوری ترقی نہیں ہوئی تھی اگرچہ یہ جذبہ غیر ارادی طور پر عوام پر اثر ڈال رہا تھا مگر قومیت کی روح ابھی تک بیدار نہیں ہوئی تھی فرانسیسیوں سے انگریزوں تک کی مشغول اور دیر بانفرت بھی قومیتوں کے آزاد کرنے کی خواہشوں پر اس قدر مبنی نہیں تھی جس قدر کہ فرانسیسی انقلاب سے انگریزی طبقہ امر کی نفرت یورپ میں فرانسیسی غلبے کے خوف اور تجارتی اغراض پر منحصر تھی۔

انگریز باوجود اپنے اس بلند سیاسی احساس کے جو ان کے مردانہ غرور اور آزادانہ پاس قانون سے پیدا ہوتا ہے، قومیت کو سیاسی اصول کی حیثیت سے مشتبہ سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے جزیرے کی بادشاہوں میں مختلف قومیتیں داخل ہیں اور کلٹی آبرش لوگوں کے قومی جذبات نے ایک سے زائد بار سلطنت کے اتحاد کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ قومیت پر بہت زیادہ زور دینے سے ان کی ہندوستان اور سمندریار ملکوں کی عالمگیر شاہی کے بھی خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ فرانسیسیوں کے ساتھ شکمش میں ہسپانویوں نے اپنے اتحاد کو ایک قوم کی حیثیت

نیو لیسن اور
اقوام یورپ

سے محسوس کیا اور فرانسیسیوں کو غیر ملکی سمجھکر ان سے نفرت کرتے رہے مگر وہ اپنی ان مصلحتی کو اس درجہ قومیت کی جدوجہد نہیں سمجھتے تھے جس قدر وہ انھیں شیاطین انقلاب کے مقابلے میں اپنے جائز بادشاہ اور کیتھولک مذہب کی مساعدت تصور کرتے تھے اہل جرمانا اختلافات مذہب اور شہنشاہی کے غفلت خاندانی سلطنتوں میں منقسم ہو جانے کی وجہ سے سیاسیات میں قومیت کا احساس بالکل کھو بیٹھے تھے اور جب فشتے نے اپنی ولولہ انگیز تقریروں اور آرٹسٹ نے تحریروں سے جرمانی قومیت کے احساس کو تازہ کرنا چاہا تو صرف معدودے چند تعلیم یافتہ اشخاص نے اُدھر توجہ کی۔ روسیوں نے جب اپنے کو جنگ اور موت کے منہ میں ڈال دیا تو صرف اس لئے کہ وہ اپنے زار اور اس کی مقدس شہنشاہی کو مغرب کے بیدنیوں کے مقابلے میں بچانا چاہتے تھے ورنہ اپنے کو ایک قوم سمجھنے کا خیال ان کے ذہن میں مطلقاً نہیں تھا۔

فرانسیسی انقلاب نے مبہم طور پر قومیتوں کی آزادی کا اعلان کیا مگر شاہی کی منہج کے بعد یہ خیال پیروں کے نیچے روند ڈالا گیا۔ وائٹا کی کانگریس نے قومی حقوق پر مطلقاً لحاظ نہیں کیا اور بڑی بڑی اُمتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے واپس شدہ شاہی خاندانوں میں تقسیم کر دیا جس طرح روسیا آسٹریا اور بریٹشیا نے اس کے قبل ہی پولستان کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔ اسی طرح اب اٹلی اور جرمانا کی تقسیم متعدد شاہی سلطنتوں میں کر دی گئی اور بلجیئم ہولندیز باوجود متضاد قومیتوں کے ایک میں باندھ دیئے گئے۔

اس امر واقعہ سے کہ قومیت کو نہ تو انقلاب کے مدبروں نے اور نہ رجعت شاہی کے مدبروں نے سیاسی اصول کی حیثیت سے تسلیم کیا، اس کا اثر موجودہ زمانے کی سیاسی تاریخ پر اور بھی زیادہ نمایاں اور حیرت انگیز ہو جاتا ہے۔ علم نے بالخصوص جرمانا اور ایتا کیا میں اس کے قبل ہی قومیت کے تصور کو ظاہر اور سیاسیات میں اس کے نتائج کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ مگر اُمتوں کے اس فطرتی حق کی طرف کہ وہ اپنے کو سلطنت کی صورت میں ہو یا کریں علی توجہ تقریباً سلسلہ ہی سے ہوئی۔ قومیت کی تحریکات عوام الناس تک میں سابق کے بہ نسبت زیادہ زور کے ساتھ برانگیختہ ہو گئیں اور نہ صرف ادبیات میں بلکہ سیاسیات میں بھی خواہشوں کے پورے ہونے کا مطالبہ کرنے لگیں۔ اُتوں میں اپنے اتحاد کو سیاسی شکل میں بدلنے اور

قومیت سلسلہ
کے بعد سے

قوموں کی حیثیت اختیار کرنے کی خواہش پیدا ہو گئی، خانہ دانی دستور جو ازمنہ وسطیٰ سے یورپی سلطنتوں کی وراثت میں چلا آتا تھا اب وہ قومی مطالبات و جذبات کے خطے میں پھٹ گیا۔ تمام ملکوں خصوصاً آسٹریا کو ان مختلف قومیتوں کی آزادی حاصل کرنے کی متواتر کوششیں نے ہلا دیا جو وہاں سکونت پذیر تھیں۔ نئی ملکوں اور ان میں سب سے پہلے ایک متحدہ ایتالیہ اور جرمانی شمشاہی کا قائم ہونا اسی تصور قومیت کی ولولہ انگیزی کا نتیجہ تھا جس نے ایک امت کے منتشر اجزاء کو مجتمع کر کے انھیں ایک جسم سلطنت میں عضو بند کر دیا۔ اس قومی جوش و تحریک کی قوت میں کوئی کلام نہیں ہے کہ اس کی حدود غایت میں بحث کی گنجائش ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ قومیت کو کلیسا کے نسبت سلطنت سے زیادہ قریبی اور قوی تعلق ہے کیونکہ کلیسا کے لئے عالمگیریت کا اختیار کر لینا زیادہ آسان ہے سلطنت ایک قومی عضو ہے اور قوموں کے خصائص و جذبات زیادہ تر وہ امتیں متعین کرتی ہیں جو اس سلطنت کے اندر رہتی ہیں، اس لئے امت اور قوم کے درمیان ایک فطری تعلق اور مسلسل تعامل جاری رہتا ہے۔

امت کوئی سیاسی اجتماع نہیں ہے بلکہ ایک ایسا اجتماع ہے جو ایک مشترک تہذیب پر قائم ہے لیکن اگر واقفانہ سے دعا کی جاتی ہے تو یہ امر طبعی ہے کہ وہ اسے ایک ایسی عام آزادی کے ساتھ جو عموماً ظاہر ہو سکے ایک پوری شخصیت میں ترقی دینے کی خواہاں ہوگی یعنی دراصل وہ ایک سلطنت بن جانا چاہے گی۔

یہی ہے اس سیاسی اصول قومیت کی بنیاد جو آج مانا جاتا ہے۔ وہ اس پر قائم نہیں ہے کہ سلطنت قومی زبان، رسم و رواج اور تہذیب کی حفاظت کرے بلکہ وہ چاہتی ہے کہ خود سلطنت قومی سلطنت ہو جائے۔ مجرور و محکوم اسے یوں بیان کر سکتے ہیں کہ ہر امت کا یہ فرض اور اس کا یہ حق ہے کہ وہ ایک سلطنت قائم کرے۔ چونکہ نوع انسان کثیر القعدا و امتوں میں منقسم ہے اس لئے دنیا کو بھی اسی تعداد کی سلطنتوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ ہر امت کے لئے ایک سلطنت ہو اور ہر سلطنت کی بنیاد قومیت پر ہو۔ کیا یہ واقعہ صحیح ہے؟ ہمیں اول امت اور سلطنت کا مقابلہ با اعتبار ان کے حدود و وسعت کے کرنا چاہئے اور دیکھنا چاہئے کہ ان میں کیا کیا فرق ظاہر ہوتا ہے۔

اگر سلطنت کے حدود امت کے حدود سے تنگ ہوتے ہیں تو ان میں دو

نشانہ اصول
ہر امت کیلئے
ایک سلطنت

ایک سلطنت

امتوں اور
سلطنتوں کے

باہمی حدود

سے ان میں
تغییر پیدا
ہو جاتی ہے

ایک امت کی
سلطنتوں پر
مبنی ہو

ایک امت کی
سلطنتوں پر
مبنی ہو

ایک امت کی
سلطنتوں پر
مبنی ہو

منفرد بھان پائے جاتے ہیں۔

رجحان لغزو

اگر شہریوں میں اپنے سیاسی انتخاب کا مضبوط و زندہ احساس موجود ہے تو سلطنت کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے باشندوں کی ایک جدید و متمیز اُمت قائم کر لے چنانچہ قدیم زمانے میں ایجنٹز اور اسپاہیوں نے اپنی سیاسی تربیت اور لغزو کی وجہ سے جدا جدا قومیتوں کی صورت اختیار کر لی۔ ازمنہ وسطیٰ میں وینس اور جینیوا والوں کا یہی حال ہوا اور اس سے بھی بعد کے زمانے میں ولندیزیوں (یعنی وُچ لوگوں) اور کسی قدر سمبیر لینڈ والوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا مگر سیاسی جذبات کی قوت سے ایک نئی اُمت بن جانے کی عظیم ترین مثال شمالی امریکی سلطنتوں کا انگلستان سے جدا ہونا ہے گو کہ اس میں شک نہیں کہ اس معاملہ خاص میں جغرافیائی اختلافات کا بھی اثر ہے۔

رجحان اتحاد

لیکن دوسری طرف اگر قومی جذبات کسی تنگ سلطنت میں فشرده ہو جاتے ہیں تو وہ اُس کے حدود سے باہر نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ اسی قومیت کی دوسری سلطنتوں سے ملکر ایک بڑی اور قومی سلطنت قائم کر لیں۔ قدیم زمانے میں فرانسیسی سلطنت کی اور انیسویں صدی میں متحدہ ایٹلیا و متحدہ جرمانیا کی ابتدا یوں ہی ہوئی۔

(۲) ایک سلطنت میں متحدہ قومیں داخل ہوں وہ (الف) پہلو پہلو آباد ہوں (ب) جذب

اگر سلطنت کے حدود ایک اُمت کے دائرے سے زیادہ وسیع ہیں یعنی اس میں دو یا زیادہ اُمتیں یا استوں کے ٹکڑے شامل ہیں تو پھر۔

اگر مختلف اُمتیں ایک ہی ملک میں ایک دوسرے کے پہلو پہلو اپنی اپنی مجموعی حیثیت سے آباد ہیں تو مختلف صورتیں پیدا ہوں گی۔

(۱) سلطنت ایک اُمت کے برتر تمدن پر مبنی ہونے کی صورت میں باہرنگی دوسرے اجزاء کے ہضم کرنے کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور اس طرح تمام قوم کو ایک اُمت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ چنانچہ قدیم رومی شہنشاہی میں مغرب پر لاطینیات اور مشرق پر یونانیات چھا گئی تھیں، اسی طرح موجودہ زمانے میں سلطنتِ بلجیم جس کی بنا قوم کو لون اور اس کے فرانسیسی بائیں تخت بروسلز پر ہے وہ فلیمی (Flemish) آبادی کے اعلیٰ طبقات کو گال بنالینا چاہتی ہے اسی طرح روسی پولستان والوں کو

بزور روسی بنالینا چاہتے ہیں۔

اس طریق میں کامیابی اسی وقت ہوتی ہے جب ایک مادی وغالب امت تعلیم اخلاق طینیت اور طاقت میں دوسری امتوں سے قطعی طور پر فائق ہو۔ جرمانیوں اور ایرانیوں کی مقاومت نے روما اور قسطنطنیہ کی لائینیت اور یونانیت کی عمل پیرائی کی دھجھا اڑا دیں۔

(۲) مختلف امتیں سیاسی الفضال کی طرف مائل ہو جاتی ہیں آسٹریلینڈ میں تنسیخ اتحاد کی تحریک اہل لمبارڈی اور اہل وینس کا آسٹریا سے جدا ہو جانا خود آسٹریا میں نظام سلطنت کے متعلق بالعموم تنازعات کا برپا رہنا آسٹریا اور ہنگری کی دھڑی حکومت کی تجدید اسی طرح گیاروں اور سلاووں اور جرمانوں اور پھیشوں کا تصادم ان سب سے اسی رجحان کی مستقل قوت کا اظہار ہوتا ہے۔

(۲) انفضال

دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ سلطنت مختلف امتوں کو باہم ملائے رہے بغیر اس کے کہ کسی ایک قومیت کو مرجع سمجھ کر اسی کے موافق اوروں کی حالت کو بدل دے مگر اس صورت میں خود سلطنت کو غیر جانب دار ہونا اور تخصیص کے ساتھ قومی ہونے کے حقوق سے ہر طرح دست بردار ہو جانا چاہئے اُسے ہر امت کو اُس کی اندرونی زندگی اور تمدن میں آزادنہ اختیار دینا چاہئے اور یہ خیال کر لینا چاہئے کہ سب کے حقوق کیساں ہیں۔ اس کی طرز عمل مخصوص قومی اغراض کے زیر فرمان نہ ہونا چاہئے بلکہ عام اغراض کے تابع ہونا چاہئے یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے سے سویٹزرلینڈ نے سلطنت کے اتحاد کو خطرہ پہنچائے بغیر مختلف قومیتوں کو پہلو پہلو برقرار رکھنے کے مشکل مسئلہ کو حل کر لیا اور اس طرح جرمانیا، فرانس اور ایتالیہ کے درمیان کے اس پہاڑی ملک میں ان تین بڑی امتوں کے ٹکڑوں نے چھوٹی چھوٹی جمہوری جماعتیں قائم کر لیں اور آئین اور غیر جانبداری کے ساتھ متحد ہیں اس میں شک نہیں کہ منفرد صوبوں میں قومی خصوصیت موجود ہے۔ اب چاہے یہ اس وجہ سے ہو کہ ان خاص صوبوں میں ایک ہی امت آباد ہے جیسے شمالی اور مشرقی سویٹزرلینڈ میں جرمانی یا مغربی سویٹزرلینڈ میں فرانسیسی یا ٹینسویں ایتالوی آباد ہیں اور چاہے اس وجہ سے کہ ایک خاص قومیت کو قطعی غلبہ حاصل ہے۔ جیسے برن اور گراؤ وینو ندن میں جرمانوں کو ویشوں پر غلبہ حاصل ہے اور فرامی برگ اور وایس میں فرانسیسیوں

(۲) اختلاف کا اتحاد
(۲) غیر جانبدار حکومت کے ذریعے سے

کو جرمانیوں پر۔

(ب) بعضی
حالت کے
ذریعے سے

مختلف اُمتوں کو بلا تفریق سیاسی اتحاد میں قائم رکھنے کا ایک بالکل ہی دوسرا طریقہ جو زف ثانی کے آسٹریا کو جرمانی بنالینے کی کوشش کی ناکامی کے بعد ایک مدت تک آسٹریا کی حکمت عملی سے ظاہری کامیابی کے ساتھ چلتا رہا وہ طریقہ یہ تھا کہ ہر منفرد سلطنت کو باقی دوسری سلطنتوں کی قوت سے دبا رکھنا چاہیے لیکن جبری اتحاد کا یہ بے روح طریقہ متفقہ اجزاء کو صرف مصنوعی طور پر متحد رکھے گا اور وہ بھی صرف اُسی وقت تک جب تک جاہل طاقت کا خوف غالب ہے اگر اُس کی آہنی گرفت ڈھیلی پڑ جائے یا وہ اپنا اثر ڈال سکے تو ستم رسیدہ قومیں بہت زور کے ساتھ ٹوٹ کر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتی ہیں آسٹریا نے ۱۸۶۷ء کے بعد سے اس امر کو سمجھ لیا ہے۔

(ب) انہماک

ایک ہی ملک میں مختلف اُمتیں یکائے خود مجتمع ہو کر ایک دوسرے سے متصل نہیں ہوتی ہیں بلکہ اُس میں خلط ملط ہو کر رہتی ہیں ایسی حالت میں سلطنت کو کوئی خطرہ نہیں ہے البتہ اگر خطرہ ہے تو یہ کہ کمزور اُمت کو قوی اُمت مغلوب اور بالآخر تباہ کر دیگی۔ اعلیٰ دماغی قابلیت رکھنے والی اُمت حاوی ہو جاتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ دوسری اُمتوں کے منفرد اجزاء کو ہضم کر لیتی ہے یہی وجہ تھی کہ جو جرمانی سابق رومی صوبوں میں بستے تھے وہ بالآخر رومی ہو گئے گو کہ وہ خود حکمران نسل سے تھے اسی طرح مالک متحدہ امریکہ میں آئرلینڈی، جرمانی اور فرانسسیسی و تیریشیوں کے بعد اینگلو سیکس آبادی میں جذب ہو جاتے ہیں۔

قومیت کے
دعاوی کا غلط

اس عام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قومیت اور سلطنت کے اصول ایک دوسرے پر مشورہ ہوتے ہیں مگر اُمت اور قوم لازمی طور پر ہمہ وجوہ مرادف نہیں ہیں اس لئے ہم قومیت کے اصول کو ایک ضمنی دعوے سے زیادہ نہیں قرار دے سکتے اور زیادہ غائر نظر سے دیکھنے سے ہم نتائج ذیل پر پہنچتے ہیں۔
۱) اُمت میں یہ قابلیت نہیں ہے کہ وہ سلطنت کی بنیاد ڈال سکے اور اسے قائم رکھ سکے اور صرف وہی اُمت ایک آزاد قوم بن سکتی ہے جو سیاسی قابلیت رکھتی ہو۔ جن اُمتوں میں خود قابلیت نہیں ہوتی انہیں ضرورت ہے کہ دوسری زیادہ ذی جوہر قومیں انکی رہبری کریں، کمزور اُمتوں کو یا تو دوسری اُمتوں سے

(۱) سیاسی قابلیت

مل جانا پڑے گا یا اپنے سے زیادہ قوی طاقتوں کی حفاظت میں آنا پڑے گا چنانچہ
 قائم مغربی یورپ میں کشمکش امتوں کا مصرف ہی ہے کہ وہ بے چون و چرا رومانی اور
 یونانی سلطنتوں کی تعمیر کے لئے غیر متحرک مواد کا کام دیں۔ جنوب مغربی یورپ
 کی بہت سی مختلف اُمّتیں اپنی سیاسی ہستی صرف اسی طرح قائم رکھ سکتی ہیں کہ وہ
 ایک دوسرے پر انحصار کریں، ہندوستان میں انگریزی حکومت کا استحقاق
 اسی بنا پر ہے کہ اُس ملک کی اُمّتوں کو اپنے سے ایک بلند تر قوم کی رہبری
 کی ضرورت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک قومی سلطنت کی بنیاد ڈالنے
 اور اسے قائم رکھنے کی پوری دماغی اور اخلاقی طاقت صرف وہی اُمّتیں رکھتی ہیں
 جن میں عروانہ قوتیں (مثلاً فہم اور جرات) غالب ہوں جن اُمّتوں میں زنا نہ صفات
 غالب ہوتے ہیں وہ انجام کار میں ہمیشہ دوسری فائق قوتوں کی محکوم ہو جاتی ہیں۔
 چونکہ اُمّت کا جو ہر اعلیٰ اس کے مشترکہ تمدن میں مخفی ہے نہ کہ سیاسی اتحاد
 میں اس لئے ممکن ہے کہ کسی اُمّت کو اپنی تمدنی قرابت مندی کا احساس ہو اور پھر بھی
 وہ اپنے سیاسی خیالات میں غیر متحد ہو۔ ممکن ہے کہ ایک حصہ اُس کا شاہی کی طرف
 مائل ہو اور دوسرا جمہوریت کی طرف راغب ہو اور ہر ایک اپنے پسند کردہ سیاسی
 منتہائے خیال کے حاصل کرنے کا مصمم ارادہ رکھتا ہو اور پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ
 ایک ہی اُمّت مختلف صورتوں کے نظام سلطنت میں اپنی خصوصیت کو ظاہر کرے
 اور اسی مختلف النوع تمیل سلطنت سے اُسے تشفی حاصل ہو مگر یہ مخالفت کبھی اُمّت کی سیاسی کمزوری
 کا باعث ہو جاتا ہے۔ یونانی جو اول مقدونہ اور بعد کور و ماکے شکار ہو گئے
 اُس کی وجہ یہی تھی کہ وہ بہت سی چھوٹی چھوٹی شہری سلطنتوں میں منقسم ہو گئے تھے
 ایسی ہی تقریقوں کی وجہ سے ایتھینا لیا اور جرنانیا اپنے تیلیں بیرونی قوت کی زد سے
 پوری طرح نہ بچا سکے اور اسی وجہ سے اُن کی سیاسی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔
 دوسری جانب ایک اُمّت کا دو یا زیادہ سلطنتوں کی صورت میں نمو حاصل
 کرنا بسا اوقات اس اُمّت کے ذرائع و وسائل کو بالمال کر دیتا اور ایک مبلغ قوت
 حیات کا ثبوت دیتا ہے جیسا کہ انگلستان اور شمالی امریکہ کی اینٹھو سکیں برادرانہ

(۳) مخالفت
 جذبات کمزور
 کا سبب ہے
 طاقت کا۔

سلطنتوں کا حال ہے جن میں سے ایک میں اعیانی بادشاہت قائم ہے اور دوسری میں
عمومی جمہوریت ہے اسی طرح جرمانی شہنشاہی سے باہر ایک جرمانی سوویتیز لینن اور ایک
جرمانی آسٹریا کا وجود جرمانی اُمت کی وسعت و مسائل کا ثبوت ہے۔

دوسرا سیاسی
موزونیت۔

کوئی اُمت جسے خود اپنا احساس ہو اور جس میں سیاسی موزونیت موجود ہو اسے
ایک سلطنت میں تشکل ہو جانے کی طبعی ضرورت کا احساس ہوتا ہے اگر اس اشتیاق
کے پورا کرنے کی طاقت بھی اس میں موجود ہے تو ضرور اسے اپنی ایک سلطنت قائم
کرنے کا فطرتی حق حاصل ہے۔

کسی اُمت کی بقا و ترقی کے اعلیٰ حق کے مقابلے میں اُس کے منفرد ارکان
اور اُس کے بادشاہوں اور امیروں کے حقوق محض ایک ذیلی اہمیت رکھتے ہیں۔
نوع انسان کی غایت پوری نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہ امتیں جن سے وہ مرکب ہے اس
قابل نہ ہوں کہ وہ اپنے فرائض کو پورا کر سکیں بقول پرنس لبمارکسہ امتیں اگر زندہ
رہنا چاہتی ہیں تو انھیں سانس لینے اور ہاتھ پاؤں ہلانے کے قابل ہونا چاہئے۔
اُمتوں کے سیاسی تشکل اختیار کرنے اور اپنی عام زندگی کی حرکت و اظہار کے لئے
اپنے اعضا کو ترقی دینے کے مقدس حق کی بنیاد ہے خود انسانیت کے حق کو چھوڑ کر
بقیہ تمام حقوق میں سب سے زیادہ مقدس اور اُن سب کی بنیاد اور رابطہ بھی
حق ہے۔

ہم قومی سلطنت

مگر ایک قومی سلطنت کے قائم ہونے اور برقرار رہنے کے لئے یہ ضروری
نہیں کہ وہ اُس اُمت کے تمام لوگوں پر عادی ہو۔ قومی سلطنت کی تعمیر کا اُمت کے
صرف ایک ایسے بڑے اور قوی حصے پر محتوی ہونا کافی ہے جو اپنے اخلاق اور
جذبے کو سلطنت پر موثر طور پر کلکتہ نافذ کرنے کی کافی وسعت و قوت رکھتا ہو۔
اس لئے قومی سلطنت کے حدود کو اتنا ہی وسیع کرنے کی خواہش جتنی اُمت کی
زبان و وسیع ہو گا قومی اصول کا زائد از ضرورت کھینچ مان کرنا ہے ایسی خواہش کا
نتیجہ یہ ہو گا کہ سلطنت کے حدود بھی ایسے ہی متحرک ہو جائیں جیسے زبان کے حدود
اور یہ ترزل خود شخصیت سلطنت کے استمرار اور حقوق کی عام محافظت کے نافی
ہو گا۔ فرانس ایٹا لیا اور شاہی جرمانیا قومی سلطنتیں ہیں گو کہ فرانسیسی ایٹا لوی؟

اور جرمانی امتوں کے ایسے اجزاء بھی موجود ہیں جو ان سلطنتوں سے تعلق نہیں رکھتے۔

کوئی امت جو قوم بن گئی ہو یا قوم بننے کے قریب ہو وہ اپنے ایسے منقسمہ اجزاء کو جمع کرنے کا حق رکھتی ہے جو اس کی بقائے ہستی کے لئے ضروری ہوں لیکن اگر وہ ان کے بغیر ہی اپنا کام چلا سکتی ہے تو اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ انھیں کسی دوسری سلطنت کے اتحاد سے جس سے وہ مطمئن ہو بزدور عالمیہ کرے۔

۱۵۱۔ انہ واکل
سلطنت۔

اسی تعمیر سلطنت اپنے تئیں کسی ایک اکیلی "قومیت" (یعنی امت) تک محدود نہیں رکھتی۔ انسانیت کی ترقی اپنی شرط اولین کے طور پر یہ چاہتی ہے کہ صرف امتوں کا آزادانہ طور اور ان کے آپس میں مقابلہ ہو بلکہ وہ بار بار یہ بھی چاہتی ہے کہ امتیں آپس میں متفق ہو کر اعلیٰ اتحاد بھی پیدا کریں۔ قانون کا امتوں کی طبعی خصوصیات کے بہ نسبت انسانی طینت پر زیادہ ہے۔ مذہب قوموں کا ترقی یافتہ قانون قومی رسم و رواج سے زیادہ انسانی تعلقات کی ضروریات سے متعین ہوتا ہے سلطنت کے اصولی تنظیمات، مختلف قوموں میں ایک ہی ہیں سلطنت کا بلند ترین مقصد یہ ہے کہ سلطنت کی بسا انسانیت برہو۔

پس ایک قومی سلطنت میں مختلف قومیں شامل ہو سکتی ہیں یہاں تک کہ وہ سلطنت جس کی بنا صاف طور پر قومی اصول پر ہو وہ بھی بیرونی اجزاء کے شمول سے (جو دوسری امتوں کے تمدن سے سلسلہ ارتباط پیدا کرنے اور انھیں برقرار رکھنے کا کام دین) وسعت و تنوع حاصل کر سکتی ہے۔ یہ مخالفت کبھی سلطنت کے لئے نہایت سودمند اور معین ترقی ہوتی ہے اسی طرح جیسے اعلیٰ دھاتوں میں تابہ کا سیل ان کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ داد و ستد کی ضرورتوں میں وہ سگتہ بن کر چل سکیں۔

بخلاف اس کے سلطنت کی کچھ جہتی کے لئے یہ بہت ہی مفید ہے اگر قوم کی بنا کچھ غالب ایک معین قومیت پر ہو اور آبادی کے دوسرے اجزاء کے ترکیبی کا

(۶) کچھ جہتی۔

پڑتا اس کے مقابلے میں قلیل السعدا د ہو جیسے کہ روس میں جرمانی پر ویشیا میں سلاوی جرمانیا میں سیووی اور شمالی امریکہ میں فرانسیسی جب کہ متحدہ امتیں قوت اور اہمیت میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کر رہی ہوں اس صورت میں یہ بہت ہی مشکل ہے کہ قوم کا اتحاد قائم و برقرار رہے انگلستان کو اس مشکل پر اس طرح غالب آنا پڑا کہ پہلے سکسونی نارمنوں سے متحد ہوئے پھر انگریزوں نے اسکاچ سے اتحاد کیا اور آخر میں یہ دونوں آئرلینڈ سے متحد ہو گئے یہ وہ مشکل ہے جس پر آسٹریا ابھی تک غالب نہیں آسکی ہے۔

(۷) اسناد
اگر کوئی سلطنت مختلف امتوں سے مرکب ہو جو سب ملکر ایک قوم بنتی ہوں تو سیاسی حقوق قومیت کے اعتبار سے تقسیم نہیں کئے جاسکتے بلکہ سیاسی جمعیت اور حقوق کیسا نی بلا لحاظ قومیت کے قائم رکھنا چاہیے۔

(۸) تاریخ
بعض
قانون بین الاقوام کی نامکمل حالت میں کسی انسانی قانون کی رو سے اصل امر کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ اس حد تک کوئی امت ایک سلطنت کے قائم کرنے کی اہلیت و قابلیت رکھتی ہے اس کا فیصلہ صرف خدا کے حکم سے ہو سکتا ہے جو تاریخ عالم کے ذریعے سے ظاہر کیا گیا ہے، عموماً یہی ہوتا ہے کہ بڑی جدوجہد سے بہت تکالیف برداشت کرنے اور بہت سے کام انجام دینے ہی سے کوئی قوم اپنے اس دعوے کو حق بجانب ثابت کر سکتی ہے۔

سلطنت کو
جسٹیت جسم
قومی کے
اگر سلطنت جیسٹیت قوم کیسے جسم ہونے کے کارن جسمی کو پورا کرنا چاہتی ہے تو یہ صاف واضح ہے کہ اس کے قوانین و تنظیمات کو قوم کی ضرورتوں اور قابلیتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ خلاصہ یہ کہ اسے عام پسند ہونا چاہیے۔ ایک ایسا دستور سلطنت جو قوم کے فضائل کے لئے موزوں نہیں ہو اس کی خصوصیات کی پروا نہیں کرتا اور جو اس کے جذبات و خیالات سے موافقت نہیں رکھتا وہ ایک غیر طبعی اور ناکارہ جسم ہے۔ اگر کوئی غیر طاقت کسی امت پر ایسے غیر موزوں دستور کو جبراً عائد کر دیتی ہے یا جیسا ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کسی بڑے سیاسی ہیجان کے وقتوں میں کوئی غلط پروا اور بیمار قوم اسے خود اختیار کر لیتی ہے تو چونکہ وہ باہری طاقت کمزور پڑ جاتی ہے یا قوم دوبارہ عقل سے کام لینے لگتی ہے، فوراً ہی وہ نظام سلطنت منہدم ہو جاتا ہے مگر دونوں صورتوں میں سیاسی جسم کو ایسا شدید نقصان پہنچ جاتا ہے کہ اس میں قوم کے زوال تک کا امکان موجود ہوتا ہے۔

اور کم از کم اس کی طاقت تو ایک مدت کے لئے ضرور ہی پُروردہ ہو جاتی ہے۔ ہر بڑی اُمت جو ایک سلطنت والی قوم بننے کی موزونیت رکھتی ہے وہ بحیثیت سلطنت کے اپنا ایک خاص سیاسی نصب العین اور اپنا ایک مخصوص فرض رکھتی ہے اور یہ اُس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ قوم اپنی خاص خصلت سے سلطنت کو موثر نہ کرے کسی قوم کے قومی نظام سلطنت کے طبعی حق کا مفہوم یہی ہے۔ اس لئے نظام ہائے سلطنت کا اختلاف قوموں اور اُمتوں کے ان مواہب سے مطابقت رکھتا ہے جو خدا نے انھیں عطا کی ہیں۔

قوم کے نشوونما کے ساتھ ترقی کرنا چاہیے

مگر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ کسی قوم کے تخصیصی صفات اُس کی سلطنت میں ایک ہی بار منعکس ہو کر ہمیشہ کے لئے اُسی نہج سے رونما رہتے ہیں۔ قوم اپنے نمونے مختلف مراحل میں زندگی بسر کرتی ہے اور اس کی ضرورتیں اور اُس کے خیالات اُس کی عمر کے دوروں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں گو کہ خود قوم وہی رہتی ہے جو تھی، ایک قومی اور عام پسند سلطنت نمونے کے ان مراحل میں بھی قوم کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور اپنے اعضا عمل میں بھی اُن کے مطابق تغیر و تبدل کرتی جاتی ہے مگر اپنی شخصیت کو کلیتہً نہیں بدلتی۔ رومی ہی سلطنت کو دیکھو کہ اُس کی تاریخ کے مختلف دوروں میں اُس کی ظاہری صورت کس درجہ مختلف رہی ہے مگر اس پر بھی کتنے واضح طور سے اُس سلطنت میں رومی جبلت قومی ہمیشہ رونما رہی۔ شاہی جمہوریت اور شہنشاہی قوم کے مختلف مدارج حیات کے موافق صورت پذیر ہوتی رہی ہیں، اور ان سب میں روما کا نقش صاف نمایاں ہے، انگلستان میں خاندان ٹیوڈر کی شاہی، خاندان ہینوڈر کی شاہی سے اُسی مناسبت سے مختلف تھی جس نسبت سے سولہویں اور اٹھارہویں صدی میں انگریز قوم کی ترقی کے مدارج مختلف تھے۔ کسی قوم کے اپنے نظام حکومت کو زمانے کے موافق رکھنے کے طبعی حق کا مفہوم یہی ہے۔

خلاصہ یہ کہ وہ سلطنت مطابق فطرت ہے جو ہر وقت اُس میں بسنے والی قوم کے خصوصیات اور مدارج ارتقاء کے مطابق رہے۔

تعلقات

(۱) سیدسورکی کتاب ”ریلیک“ ج ۲ (۲۱) میں کاٹو کہتا ہے: ”دستور سلطنت نہ کسی ایک زمانے کی چیز ہے نہ نفسی انسان کی“

(۲) فریدریش آگنظم (اپنی کتاب ماکیناویل ۱۲ میں) کہتا ہے: ”کائنات میں ہر چیز مختلف ہے: انسانوں کے طبائع مختلف ہیں اور فطرت نے وہی اختلاف سلطنتوں کے طبائع میں بھی پیدا کر دیا ہے۔ سلطنت کی طبیعت سے میری مراد ہے اُس کا محل وقوع، اُس کی وسعت کے حدود، اُس میں بسنے والی قوموں کی تعداد اور اُن کے جذبات کی افاد، اُس کی تجارت، اُس کے رواج و عادات، اُس کے قوانین، اُس کی قوت، اُس کی کمزوریاں، اُس کی دولت اور اس کے وسائل“

(۳) دیسٹر (۱۷۹۶ء) اپنی کتاب ”فرانس کے تعلق خیالات“ (کون سی ویراسیون سیور لافرانس) (Considerations sur la France) باب ۲ میں کہتا ہے: ایک دستور سلطنت جو تمام قوموں کے لئے بنایا گیا ہو وہ کسی قوم کے بھی کام کا نہیں۔ وہ ایک نری تجرید ہے اور کلین کی گھڑی ہوئی ایک چیز ہے جس کا معصر نہ ہو اس کے کچھ نہیں کہ انسان کا دماغ خیال و مقدمات کے قائل کرنے کی مشق کرے اور جس کے مخاطب وہی انسان مطلق ہیں جو صرف تخیل کے افضا میں پائے جاتے ہیں۔“

(۴) نیولیوں (۱۷۸۹ء میں) سوٹ زلیینڈ والوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے: ”حکومت کی ایسی شکل جو ایک قوم کے واقعات اور کامیوں، جدوجہد اور ولولہ فریب کے ایک طویل سلسلے کا نتیجہ نہ ہو وہ کبھی جبر نہیں کر سکتی۔“

(۵) سیس مون دی اپنے آزاد قوموں کے دستور کے مطالعات (۱۸۰۰ء) مقدمہ

ص ۳۸ میں کہتا ہے: ”کسی قوم کے صرف قوانین ہی نہیں بلکہ اُس کا دستور بھی اُس کے میلان، یاد اہام اور طرز تخیل پر قائم ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک جدوجہد کے سطحی اور غلط محرک عمل ہے کہ کسی قوم کے لئے ایک ایسا نیا دستور قائم کرنے کی کوشش کی جائے جو اُسی قوم کے مزاج اور اُس کی تاریخ کے مطابق نہ ہو بلکہ جس کی

بنیاد چند عام فقروں پر رکھی گئی ہو جن کو لوگوں نے غلطی سے اصول کا با وقعت نام دے رکھا ہے پچھلے پچاس سال میں بہت سے دستور بڑے بڑے دستوروں کے ساتھ قائم ہوئے اور بہت سے دستوروں کو ایک ملک نے دوسرے سے لئے کر اختیار کیا۔ لیکن اس طویل تجربے سے بھی یہی بات ثابت ہوئی کہ ان تمام دستوروں میں سے ایک نے بھی اپنے بنانے والے کی آرزوؤں یا جس قوم کے لئے وہ دستور بنایا گیا تھا اس کی امیدوں کو پورا نہیں کیا۔

(۶) رائے (رسالہ = Zeitschrift ج ۱ ص ۹۱) کہتا ہے: ہمارا نظریہ یہ ہے کہ ہر قوم کا اپنا ایک اصول عمل ہے۔ مگر پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو قومی آزادی تمام طبائع میں جاویں و ساری ہے اس کے معنی کیا ہیں۔ کیا اس کا مطلب صرف اسی قدر ہے کہ کوئی غیر ملکی جج (حاکم قضا) ہمارے شہروں میں نشست نہ کرے اور کوئی غیر ملکی فوج ہماری زمین پر سے نہ گزرے؟ اس سے بڑھ کر کیا اس کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ ہم دوسروں سے آزاد ہو کر اپنی خاص ذہنی طاقتوں کو ان کی انتہائی حد تک ترقی دیں؟

پانچواں باب

نظم معاشرت (سوسائٹی)

فرانسیسی سیاسی نظریہ خاصکر روسو کے وقت سے اس خیال کی طرف مائل رہا ہے کہ سلطنت کو سوسائٹی کے ہم معنی اور امت و قوم کے تصورات کو سوسائٹی کے تصور کے مراد سمجھا جائیے مختلف اصطلاحوں کی اس تبلیغ کی وجہ سے سلطنت کے علم میں خلط و بحث ہو گیا ہے اور سیاسی عمل دستور کو بھی نقصان پہنچا ہے جرمانی سیاسی نظریہ زیادہ دقیق طور پر ان مختلف تصورات میں فرق کرتا ہے اور بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہتا ہے اس سے سلطنت کو ایک زیادہ قوی بنیاد اور زیادہ مستحکم عمل حاصل ہوتا ہے اور معاشرت کی آزادی سلطنت کی تعمیری سے محفوظ آ رہتی ہے۔

”قوم“ لازماً ایک مربوط مجموعہ ہے بخلاف اس کے معاشرت افراد کی ایک تعداد کا ایک اتفاقی اجتماع ہے۔ قوم سلطنت کی صورت میں مجسم ہو کر ایک ہی حیات شے کی طرح ہر اعضاء رکھتی ہے، معاشرت افراد کا ایک غیر عضونہ انبوه ہے۔ قوم ایک قانونی شخصیت رکھتی ہے، معاشرت کوئی مجموعی شخصیت نہیں رکھتی بلکہ محض ایک انبوه ہے جو بہت سی شخصیتوں سے مرکب ہے۔ قوم اتحاد ارادی سے مزین ہے اور سلطنت کے اندر اپنے اراکے کو عمل میں لانے کی قوت رکھتی ہے سوسائٹی کا نہ کوئی مجموعی ارادہ ہے اور نہ اس کی کوئی مختص سیاسی طاقت ہے، وہ نہ قانون بنا سکتی ہے نہ حکومت کر سکتی ہے نہ عدالت کو عمل میں لاسکتی ہے، اس کے قبضہ قدرت میں صرف ایک رائے عامہ ہے اور وہ سلطنت کے اعضاء پر اپنے بیشتر یا کل افراد کے خیالات، اغراض اور مطالبات کے موافق باواسطہ اثر و اتاتی ہے قوم ایک سیاسی تحلیل ہے سوسائٹی سلطنت کی قلمرو میں ذاتی حیثیت سے افراد کا

نظم معاشرت
کا تسلسل
(۱) قوم اور
سلطنت سے

ایک تغیر پذیر مجموعہ ہے۔
 اس میں شک نہیں کہ قوم اور سوسائٹی جو ایک ہی لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے
 متعدد طریق سے ایک دوسرے پر گہرا اثر ڈالتی ہیں سلطنت سوسائٹی کے لئے
 قانون وضع کرتی، اس کی حفاظت کرتی اور مختلف طریقوں سے اس کے اغراض
 کو ترقی دیتی ہے۔ دوسری جانب سوسائٹی اپنے معاشی اور ذہنی وسائل سے سلطنت
 کو تقویت پہنچاتی ہے۔ ایک مصیبت زدہ سوسائٹی سلطنت کو بھی اپنے ساتھ مصیبت
 میں ڈال دیتی ہے، ایک بیمار سوسائٹی سلطنت کو بھی خطروں سے دوچار کر دیتی ہے،
 بخلاف اس کے ایک صحتور خوش حال اور تربیت یافتہ سوسائٹی سے سلطنت کو
 تقویت ہوتی ہے اور اس طرح کی سوسائٹی سلطنت کی بہبود کے لئے شرط
 لازمی ہے۔

مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ سوسائٹی اور سلطنت کے درمیان کامل ہمخوانی
 ہو۔ بعض وقت سوسائٹی اپنے ہی خاص اغراض پر نظر رکھنے کی وجہ سے پارلیمانی
 کے سیاسی صفت اثرات سے متاثر ہو کر سلطنت سے ایسے مطالبات کرنے لگتی
 ہے جنہیں سلطنت نامنصفانہ یا غیر دانشمندانہ سمجھ کر مسترد کرنے پر مجبور ہوتی ہے
 بعض وقت سلطنت سوسائٹی سے ایسے خدمات اور ایسے اثاثہ کی خواہاں ہوتی ہے
 جن کی انجام دہی سوسائٹی پر گراں ہوتی ہے سلطنت کی دائمی حفاظت (کی ضرورت)
 کبھی کبھی وقتی اغراض و خواہشات سے ٹکرا جاتی ہے۔ وقتاً فوقتاً مباشرت میں تباہی
 پھیل جاتی ہے جسے رفع کرنا سلطنت ہی کا کام ہے، اور اسی طرح کبھی سلطنت کے
 دستور یا اس کے نظم و نسق میں ایسی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کے رفع کرنے
 کی تحریک سوسائٹی کی طرف سے ہوتی ہے۔ قانون عامہ اور سیاسیات کا ایک اہم
 فریضہ یہ بھی ہے کہ مناقشات کا فیصلہ اور ان کی تلافی عادلانہ اور دانشمندانہ طور
 پر کر دی جائے۔

اسی طرح سوسائٹی اور امت کے تصورات بھی ایک دوسرے سے تعلق
 رکھتے ہیں مگر وہ بھی بالکل مرادف نہیں ہیں۔ ایک متواتر امت کے مقابلے
 میں سوسائٹی افراد کا ایک تغیر پذیر ازدحام معلوم ہوتی ہے، امت نے اپنی روح عامہ

کے حیاتی اظہار کے لئے ایک عام زبان پیدا کر لی ہے اور سوسائٹی اپنی حسبِ سائنس قومی زبان کا استعمال کرتی ہے مگر سوسائٹی کی حیثیت سے اُس کی کوئی مخصوص زبان نہیں ہوتی، ایک اُمت شاخ و ریشخ ہو کر مختلف سلطنتوں میں پھیل سکتی ہے ہم اپنے تصور معاشرت کو صرف ایک ہی سلطنت کے باشندوں تک محدود رکھتے ہیں یا مثلاً اگر ہم یورپی سوسائٹی کہتے ہیں تو تمام متمدن یورپی سلطنتوں کے باشندوں کو اُس میں شامل کر لیتے ہیں، باوجود اس کے کہ وہ مختلف اُمتوں سے تعلق رکھتے ہیں، خود سلطنت کے اندر سوسائٹی کا تصور امتی اختلافات سے آزاد ہے اور اس میں تمام وہ لوگ شامل ہیں جو سلطنت کے اندر رہتے ہیں اُمت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کم از کم مادی حیثیت سے اپنی ایک خاص فطری تنظیم رکھتی ہے اور سوسائٹی صرف مفرد اشخاص کا ایک مجموعہ ہے۔

گنٹسٹ کی
معاشرت

گنٹسٹ نے سلطنت اور معاشرت کے فرق کو نمایاں کر کے اور اُن کے تعاون کی طرف توجہ دلا کر علمِ سیاست کی ایک خدمت انجام دی ہے مگر اُس کے ہمنوا ہو کر موجودہ زمانے کی سوسائٹی کو کاروباری سوسائٹی کہتا بہت ہی تنگ نظری معلوم ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دولت کا حصول سوسائٹی کے سبب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ وسیع الاثر غرض میں سے ہے مگر پھر بھی سوسائٹی کی صرف یہی ایک غرض نہیں ہے ورنہ یہ غرض سب سے زیادہ اہم غرض ہے۔ سوسائٹی دولت کے انتفاع سے بھی ویسا ہی تعلق رکھتی ہے جیسا اس کے حصول سے مزید براں دولت کے تمام خیالات سے قطع نظر سوسائٹی خاندانی زندگی کو بھی بڑی وقت کی نظر سے دیکھتی ہے، وہ مدینیت کی قدر کرتی ہے اور تہذیب و شائستگی ادبیات اور فنونِ بلیغہ سے پر جوش و خیم رکھتی ہے۔ سوسائٹی کی تعریف کرتے وقت محض حصولِ دولت پر زور دینا اسے زائد از ضرورت مادی اور خود غرض بنا دینا اور افکارِ مذہبی اور مہمو و قلم کے متعلق اُس کی ساری کوششوں کو نظر انداز کر دینا ہے اس دعوے کی صحت کی کافی تائید اُن کثیر التعداد ادارات و انتظامات سے ہوتی ہے جنہیں غریبوں اور بیماروں کی آسائش اور علوم و فنون کی

ترویج کے لئے سوسائٹی نے بغیر سلطنت کے دباؤ کے برضا و رغبت خود قائم کر لیا
ہیں اور کثیر دولت اُن کے لئے وقف کر دی ہے۔

پہچھا باب

قبائل

جس طرح انسانی سلیس مختلف امتوں میں منقسم ہو جاتی ہیں اسی طرح امتیں قبائل میں منقسم ہو جاتی ہیں ایک دقیق النظر سمجھ امتوں کی زبان رسم و رواج و قوانین سے ان کے آپس کی قرابت کا پتہ چلا لیتا ہے مگر خود وہی امتیں جو ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں ایک دوسرے سے بیگانہ ہو گئی ہیں اور ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھ سکتیں۔

مخلاف اس کے ایک ہی امت کے مختلف قبائل اپنی مشترکہ زبان اور رسم و رواج کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ سب کے سب ایک عام زندگی میں مربوط ہیں اور اس پر شک نہیں کہ مشترک قومیت کے احساس کی راہ میں قوم کے اندرونی یعنی قبائلی امتیازات و خصوصیات حائل ہو جاتے ہیں اور وہی اجزا جو قوم کے وسیع دائرے میں شامل تھے ایک دوسرے سے گوجدا ہو جاتے ہیں مگر امت کی زبان جس سے سب ہی قبیلوں کے کان یکساں آشنا ہوئے ہیں اُمتی کچھیتی اور قرابت کے احساس کو بیدار رکھتی ہے۔ مقامی بولیوں میں قومی اتحاد اور قبائلی خصوصیت دونوں عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان بولیوں کو زبان سے وہی نسبت ہے جو خاص قبائلی قانون کو عام اُمتی قانون سے ہے۔ امتوں کے مانند قبائل بھی تاریخ کی پیروی میں اور تاریخ ہی اندرونی تفریقات کو نشو و نما دیتی اور روشنی میں لاتی ہے۔ مگر یہ قبائل امت کے صرف ٹکڑے ہیں یعنی وہ خود کو کوئی اپنا مستقل قومی کینڈا نہیں رکھتے بلکہ وہ صرف عام قومی جذبے کو مختلف رنگ و پین نمایاں کرتے ہیں اس طرح قبیلے قائم رہتے اور اپنی جداگانہ ہستی کو مستقل کر لیتے ہیں اور ان تفریقات کو قومی خصوصیات پر اثر ڈالتی ہیں، زندہ رکھتے ہیں۔ یہ تفریقیں جہاں قومی زندگی میں برگ و بار اور رنگارنگی پیدا کر دیتی ہیں وہاں بسا اوقات اتحاد

قبائل کے آپس میں
کے اندرونی تفریق
کا اظہار ہوتا ہے۔

ان کا چھا اور
بڑا اثر۔

سلطنت کے لئے ایک روک بھی ثابت ہوتی ہیں۔ اگرچہ فرقوں کے اندرونی مناقشات سے جو فی الاصل قبائلی اختلافات پڑتی تھیں روم کو قوت حاصل ہو گئی مگر یہی قبائلی عناد کی شدت تھی جس نے یونانیوں کو ایک دیرپا مجموعی سلطنت بنانے سے روک دیا۔
دوسری نظام سلطنت یونی سے مختلف تھا اور ایٹولی نظام ان دونوں سے جدا۔

قبائلی عناد و
خصومت

جدید یورپ میں بھی قبائلی عناد بڑا اثر رکھتے تھے خاص کر جرمانیوں میں جن کا قدیم نظام حکومت قبیلوں کی تنظیم کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ازمنہ وسطیٰ کی انفرادیت پسندی کو اس سے ویسی ہی قوی مدد ملی جیسی موجودہ زمانے کے رجحان اتحاد کو اس سے سخت رکاوٹ پیش آ رہی ہے۔ ایتالیا اور جرمانیا کی تاریخوں سے یہ امر اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان دونوں ملکوں میں قدیم قبائل بہت پہلے ہی شکست ہو چکے تھے۔ ایتالیا میں زیادہ تر شہروں کی آزادانہ ترقی کی وجہ سے ایسا ہوا اور جرمانیا میں بالخصوص بادشاہوں کی طرز روش اور ملکی احرا کی تقریبی اس کا باعث ہوئی۔ بائیں سہمہ قبائلی احساس اور انفرادیت شہروں میں ایک طاقت کی حیثیت سے برقرار رہی اور اگرچہ قدیم قبائلی ڈھبوں کے ایک بار شکست ہو جانے کے بعد مختلف قبائل بڑی بڑی مملکتیں قائم کرنے کے لئے متحد ہوئے پھر بھی جرمانی شہنشاہی کے زوال میں قبائلی نفیض و عناد کا بہت بڑا دخل تھا اور جرمانی اتحاد کے مخالفین آج بھی قبائلی تعلقات سے کام لیکر قومی ترقی کو الزام لگاتے ہوئے روک نہیں سکتے تو اُس میں دقتیں ضرور پیدا کرتے ہیں۔

تاریخ میں بتاتی ہے کہ ایک نئی قوم کے بننے کے لئے قبیلہ بدلنے کا کام ویسے ہی قبیلے میں ایک امت بننے کے بجائے ایک نئی قوم اور ایک نئی سلطنت بن جانے کا (خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی سلطنت ہو) زیادہ امکان ہوتا ہے۔ امت کا بننا آتی وقت ممکن ہوتا ہے جب پوری مخالفت واقع ہو اور اس کے ساتھ ہی زبان بھی بدل جائے جیسا کہ ایتالیا میں لمبارڈی کے یوٹی (جرمانی) قبیلے کو پیش آیا یا یہ کہ قبیلہ اپنی مخصوص زبان کو ترقی دیکر ایک نئی زبان بنادے جیسا کہ ولزیوں نے کیا۔

قبیلہ ایک جہ
قوم کے تخم کی
حیثیت سے

ساتواں باب

ذاتیں

قوم اور قبیلے
کے اندر تباہی

اُمّیں، قومیں اور قبیلے سب ہی یہ ظاہر جنرافی حدود کے ذریعے جدا جدا کھنڈی دیتے ہیں، مگر ان میں امتوں، قوموں اور قبیلوں کے اندر ہی اندر ایسی مزید تفریقیں بھی موجود ہیں جو جغرافی لحاظ سے ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور جو ایک سیاسی اہمیت رکھتی ہیں ان تفریقوں کو نظم معاشرت کے مستقل عناصر یا مجموعی زندگی کے مختلف رجحانات یا سیاسی اہمیت و ترقی کے مختلف مدارج کہہ سکتے ہیں دوسرے لفظوں میں ذاتیں یا طبقات یا درجات کہیے۔

ذات کے طریقے پر ہندوستان میں تو بہت ہی داخل عمل ہوا ہے مگر مصر اور ایران میں بھی اس کا کچھ نہ کچھ اثر پڑے بغیر نہیں رہا۔ اس کا تعلق مقدنا ایشیا کے آریوں سے ہے۔ یورپ میں اسے کبھی سرسبز یا سائل نہیں ہوئی البتہ امریکہ میں گوری اور کالی نسلوں کے فرق کی وجہ سے اس کے شیوع کی ایک نئی صورت نکل آئی ہے۔ طبقات کا طریقہ بہت سی قدیم و جدید دونوں زمانوں کی قوموں میں پایا جاتا ہے۔ مگر اسے انتہائی ترقی ازمنہ وسطیٰ میں یورپ کی ٹیوٹی اقوام کے درمیان حاصل ہوئی۔ درجات کے طریقے میں اولاً ایک ایسی سلطنت کا وجود فرض کر لیا جاتا ہے جو عقلاً بہ طرح منقسم و مرتب ہو جیسی چین، تیمور یا روم کی سلطنتیں تھیں یا اس زمانے کی بہت سی سلطنتیں میں ذاتوں کی تقسیم فطرت کا فعل سمجھی جاتی ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اسے خدا نے خالق کیا ہے اور وہ غیر قابل تبدیل ہے، طبیعت نتیجہ میں تاریخ اقوام اور پیشوں کے اختلافات کا درجات نہ و سلطنت کی تنظیمات میں سے ہیں۔ ذات کی بنیاد مذہبی اعتقاد پر ہوتی ہے، طبقات میں معاشرتی زندگی اور اعتقادی اور تعلیمی حالتوں کا زور ہوتا ہے، درجات میں مدبرین کی قوت تنظیمی کا اثر رہتا ہوتا ہے۔

پس ذات لامحالہ موروثی اور غیر قابل تبدیل ہے۔ وہ گویا ایک مضبوط عمارت ہے جس کی ایک اینٹ پر دوسری اینٹ چمی ہوئی ہے۔ طبقات نباتات کی طرح بڑھتے ہیں اور امتوں اور سلطنتوں کے مازدان میں ایک چائی منو ہوتا ہے۔ ان میں پیشے آزادانہ انتخاب موروثی حقوق میں اعتدال پیدا کر دیتا یا انھیں بالکل فنا کر دیتا ہے زیادہ قریبی زمانوں میں طبقات بھی ذاتوں ہی کے مثل اور انھیں کی طرح موروثی تھے مگر جس قدر تمدن کو ترقی ہوتی جاتی ہے پیشے کی آزادی بڑھتی جاتی ہے اور طبقات درجات کے سبب جدا ہوتے جاتے ہیں۔ درجات سلطنت کے مختلف اعراض کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں، اسی طرح جیسے ایک نقاش اپنی صناعی کی اغراض کے لئے اپنی تصویر کی ہیئت کو بار بار (موقلم نگار) بدلتا رہتا ہے۔

ہندوستان میں ذات کا جو طریقہ رائج ہے اسے نمونہ کمال سمجھنا چاہیے۔ مسوکے قوانین کی رو سے وہ براہمن کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اقطاعوں نے اپنی تجزیہ سلطنت میں جس اعتقاد کو مصنوعی ذرائع سے جما جا یا تھا اس نے ہندوؤں میں پورے طور پر رقیبت کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔

سب سے اونچی ذات برہمنوں کی ہے جن میں آریہ خون اگرچہ کلیتہً دوسرے اجزاء سے بالکل غیر خلط تو نہیں رہا پھر بھی سب سے زیادہ صاف رہا، ہندو مفقدا کے مطابق برہمن خدا کے منہ سے نکلے ہیں اس لئے جیسا کہ ہونا چاہئے وہ خدا کا زندہ کلام اور الوہیت کے صاف ترین و وسیع ترین مظاہر ہیں، علم، مذہب اور قانون یہ ان کے خاص کام ہیں اس حقیقت سے ادنیٰ ترین برہمن کا رتبہ بھی بادشاہوں سے برتر ہے۔ ان کی خلقت بہمہ وجوہ رہانی ہے اور اگرچہ دنیاوی عہدوں پر فائز ہونا اور دنیاوی معاملات میں پڑنا ان کے لئے منع نہیں ہے لیکن مادی لذات سے محتر رہنے سے ان کی پاک و قدر بہت بڑھ جاتی ہے جو محض برہمن کو گھاس کی ایک پتی سے بھی مارے، وہ عقوبت و ذرخ کا سراوار ہو جاتا ہے۔

دوسری ذات چھتریوں کی ہے جن میں سے بادشاہ ہوتے ہیں وہ خدا کے بازو سے پیدا ہوئے ہیں وہ زور و جسمانی طاقت کے مظاہر ہیں وہ خلقی جنگاڑوں اور امیروں کی ذات ہے اگرچہ وہ تجارت کرنے سے منع نہیں ہیں مگر ان کا خاص

ہندوستانی
ذاتیں۔

(۱) برہمن۔

(۲) چھتری۔

کام سپہگری ہے۔

تیسری ذات دیشوں کی ہے، وہ خدا کی رانوں سے نکلے ہیں۔ اعلیٰ معاشرہ سے پیشے ان سے متعلق ہیں۔ زراعت، پرورش مویشی اور تجارت ان کا کام ہے، جو تھی اور رب سے ادنیٰ ذات شدہ روں کی ہے۔ وہ خدا کے پیروں سے نکلے ہیں وہ کمین ذات اور زندگی کی مادی ضروریات کے لئے مخصوص ہیں مکتب مقدس کا پڑھنا ان کے لئے ممنوع ہے۔

مناکحت کی اعلیٰ قسم میں نسب کی برابر ہی مقدم سمجھی جاتی ہے اگر ایک برتر ذات کا مرد و ایک کمتر ذات کی عورت سے عقد کر سکتا ہے لیکن عورت اپنے سے کمتر ذات والے سے عقد نہیں کر سکتی مگر بھروسہ رہنمائی رانہ نشوں نے بہت سی دشواریاں پیدا کر دی ہیں اور بہت سی موروں کی مخلوط ذاتیں ایسی نکل آئی ہیں جو ذات سے خارج ہیں۔ بہت شاذ و نادر ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ایک ذات سے نکل کر دوسری ذات میں شامل ہو جائے، عام قاعدہ یہی ہے کہ ذاتوں میں قطعی علیحدگی قائم رکھی جائے ذات کا طریقہ مرنے کے بعد بھی موثر رہتا ہے، آئندہ زندگی پر اس کا ایسا ہی تسلط ہوتا ہے جیسا موجودہ زندگی پر بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے اور وہ بھی ہزاروں برس کی کوششوں کے بعد کہ کوئی پیچھے کی برہمن کی مذہبی رفعت حاصل کر سکے برخلاف برہمن اگر ایک قدیم بھی غلط پڑ جائے تو فوراً وہ قعر پستی میں گر جاتا ہے جس سے نکلنے کی بہت ہی کم امید رہتی ہے۔

سو جانتے ہیں کہ ہندو اپنے اعتقاد میں غلطی پر ہیں اور ذاتیں ایک بڑی حد تک انسانی ہی تاریخ کا کارنامہ ہیں، وہ دونوں میں اس زمانے کی یاد برقرار ہے جب ایتھاری درجات موجود تھے مگر کمزور ذاتیں وجود میں نہیں آئی تھیں۔

تین اعلیٰ ذاتیں جو مجموعہ آریہ کہلاتی ہیں ان کے اور شدہ روں کے درمیان اختلاف کا پتہ اصلاً تفریق نسل میں چلتا ہے، گورے رنگ والے آریوں نے سیاہ فام شدہ روں کے ملک کو فتح کر لیا تھا، اور آقاؤں کی حیثیت سے ملک میں آباد ہو گئے تھے یہ بالکل ایسا ہی ہوا جیسے سفید رنگ یورپین امریکہ کے اصلی باشندوں میں آباد ہو گئے ہیں ذات کے لئے قدیمی لفظ برہمن جس کے معنی رنگ کے ہیں اسی گورے اور کالے

رنگوں کے اصلی اختلاف کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ ذات کے سلسلے میں جس قدر اوپر جاتے ہیں اُسی قدر گوری نسل کو زیادہ خالص پاتے ہیں اور جتنا ہی نیچے اترتے ہیں اُتنا ہی فیک سیاہ نسل کے ساتھ اُس کی آمیزش میں زیادتی نظر آتی ہے۔ دونوں بلند ترین ذاتیں تیسری سے دوسری ہی فائق و برتر ہیں جیسے اکثر آریاقوموں میں ہم عوام سے بلند تری ایک طبقہ خواص کا دیکھتے ہیں۔

مذہب -

آخر میں یہ کہنا ہے کہ اہل سیف و امرالکے خود بادشاہوں تک پر برہمنوں کی فوقیت نہ مانے کے لحاظ سے آخری عمل تھا اور میرے خیال میں اس کی وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ برہما کے لئے ہمدوست مذہب کے عروج حاصل کر کے قدیم معبودان فطرت کی تقدیرستی کو مغلوب کر دیا تھا۔ برہمنوں پر جاریوں، رشیوں اور فیوں میں مذہبی احساس بڑھ گیا تھا اور وہ ہر طرح کے خطرات برداشت کر کے اپنے مذہبی کام پر جوش و انہماک کے ساتھ ثابت قدم رہنا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے خوشی خاطر دنیاوی حکومت بادشاہوں کے لئے چھوڑ دی تھی۔

پس اس طرح ذاتوں کا طریقہ آبستنی تاریخی واقعات اور جدوجہد سے پیدا ہوا اگرچہ کوا سے مذہبی تصدیق بھی حاصل ہو گئی اور وہ ہمیشہ کے لئے جم گیا۔ نعروں کی تمام تعلیم میں معینہ مذہبی قرآن کو بھی خانگی اور عام زندگی کے تمام انتظامات میں ایسی سنگ و کاوش کے ساتھ تشو و نہاد دی گئی کہ اس سے کسی قسم کے انحراف کا خیالی امکان تک باقی نہیں رہا اور یہ طریقہ بلا کسی تغیر کے نسلاً بعد نسل چلتا رہا۔

یہ ذاتوں کی ترتیب کوئی سلطنت کی تنظیم نہیں ہے نہ وہ نظام سلطنت کا جزو ہے بلکہ یہ ایک سانچہ ہے جس میں خود سلطنت ڈھائی جاتی ہے۔ یہ دنیا کا ایک ہمہ گیر و مستقل انتظام ہے جو تمام تعلقات پر غالب ہے، اس وجہ سے سلطنت کی اعلیٰ ترقی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ سلطنت اس ذات کے طریقے کی تابع رہنے پر مجبور ہے۔ وہ خود اپنے

ایک صوبہ کا طریقہ سلطنت پر قائم جانا

لہ ہندوستانی ذاتوں کی تاریخ و قومیت کے متعلق دیکھو لاسن کی کتاب 'ہند کی قدیمیات'

(Lassen's Indische Alterthums Kunde, مقالہ ۲ صفحہ ۱۱ -)

گوبہ کی کتاب انسانی نسلوں کی مساوات "Del' inegalite de race humaines" صفحہ ۱۳

اصول زندگی کے موافق آزادانہ نشوونما نہیں حاصل کر سکتی یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی سیاسی نصب العین ان سخت ناقابل تفریق عامۃ الناس کے مقابلے میں عملی صورت اختیار کر سکے جو سلطنت کے قانون سے بھی ایک بالاتر قانون کے ذریعے سے ایک دوسرے سے جدا کر کے حالت غلامی میں رکھے گئے ہوں جس صورت میں رعایا یہ اعتقاد رکھتی ہو کہ حکومت کی اطاعت ہزار ہا برس کی مصیبت و تکلیف کا باعث ہے اس حالت میں سلطنت کے اقتدار کے کیا معنی ہو سکتے ہیں اور وہ اپنے تہدید یا اختیار کو کیونکر عمل میں لاسکتی ہے۔

انتظام و استقلال
کے فوائد حاصل
ہو سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ موروثی اصول سلطنت کے اندر بڑی اہمیت رکھتا ہے یہ گزشتہ ذائقہ کے درمیان تعلق قائم رکھنا آئیائیوں کہے کہ سلطنت کی حیثیت جسمانی کو (جو افراد کی زندگی سے زیادہ وسیع ہے) مداومت عطا کر دیتا ہے مگر جہاں وہ کلیتہً و قاطبہً قانون عام پر حاوی ہو جاتا ہے وہاں وہ بہترین قانون کو بانیہ تحریر و نقل کر دیتا ہے، سلطنت ایک جنوط کردہ لاش ہو جاتی ہے جس میں جنوط کرنے والا اپنی جا بکدستی سے موت کے اثرات کے چھپانے کی بیکار کوشش کرتا ہے۔

ذات کا طریقہ طبقات سوسائٹی کی تفریقات کو سخت دواغ کر دینے کی طرف مائل ہوتا ہے اور یہی امیرانہ ذاتیں رنجیدہ و افردی اختیار حاصل ہوتے ہیں اس طریقے سے مطمئن معلوم ہو سکتی ہیں مگر اس سے طبقہ اوسط و طبقہ ادنیٰ پر اس کا دباؤ اور زیادہ بڑھتا ہے وہ ان کی سیاسی پریشان خفارت کا ایک اور داغ لگا دیتا ہے اور کسی شخص کے لئے ان مضبوط بندشوں سے نکلنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتا۔ یہ اصول اعلیٰ طبقات کے اقتدار کو بڑھاتا اور ادنیٰ طبقات کی آزادی کو بر باد کرتا ہے۔

مگر ترقی و
آزادی تصور
ہوتی ہے

یہ صحیح ہے کہ مغربیوں میں مقابلہ زیادہ تکمیل کا حاصل ہو جانا اور اعلیٰ ترین طبقوں میں قابلِ داد وجود و ذہنی کا پیدا ہو جانا اس کا لازمہ ہے مگر نسل کے خاندانی توارث و روایت کو اعلیٰ ترین قانون بنا دینے سے وہ اس انفرادی آزادی سے کلیتہً انکار کرتا ہے جو ان حدود سے باہر نکلنا چاہتی ہے اس نے مقدس رشتے بڑے بڑے فلسفی ممتاز شاعر، ولیہ سورما، پر فضیلت باپ بچے چاہکدست صنائع پیدا کئے ہیں مگر اس نے کبھی کوئی بڑا بد نہیں پیدا کیا اور کہیں بھی آزادی اقوام کو روا نہیں رکھا۔

اس کے تمام تنظیمات معاشرت کو بحال خود برقرار رکھنے کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔
 کوئی تنظیم زندگی میں آگے قدم بڑھانے کی فکر نہیں کرتی اس کا طبع نظر سکون ہے،
 حرکت خطرناک سمجھا جاتا ہے، زندگی ایک متغیر تکرار ہے ایک چیز خفیہ ہے جو ہمیشہ ایک ہی
 سمت میں ایک ہی محور پر چلکھائی رہتی ہے، جہاں زندگی ایسی کم قدر ہو وہاں بود و بے
 مسئلہ سرواں کو دائماً ایک حال پر قائم رہنے کے مقابلے میں ایک حقیقی آسائش سمجھا جاتا
 اور اسے کثیر التعداد پیروں کا مل جانا بالکل قرین قیاس ہے، ہندوستانی تمدن کی
 کاشگونی و تہمت ہے لیکن باوجود اس کے کہ بنیادیں بہت گہری تھیں پھر بھی وہ ہمیشہ کے لئے
 ہندوستانی تمدن کو اندرونی زوال سے نہ بچا سکا، اور نہ مخالف فتوحات کے مقابلے
 میں ہندوستان کی آزادی کی حفاظت کر سکا۔

جدید ہندوستان ذات پات کی باقیات کو زمانہ گزشتہ کا ایک ورثہ قرار
 سمجھتا ہے، وہ اب اپنے نظم دنیا کے تصور کو اس بنیاد پر نہیں قائم کرتا بلکہ انگریزی جذبات
 کے متاثر ہو کر وہ اب دوسری ہی بنیادوں پر اپنی عمارت کھڑی کر رہا ہے۔

جدید ہندوستان

اکھواں باب

طبقات گروہ ذمی امتیاز

یورپ میں
طبقات کا
درجہ بندی

یورپ کی تمام قوموں میں ہم ذاتوں کے بجائے طبقات (گروہ ذمی امتیاز) کا رواج دیکھتے ہیں۔ ذاتوں کی طرح طبقوں سے بھی قوم کے مختلف اجزائیں ایک عضوی نظم و ترتیب پیدا ہو جاتی ہیں مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ طبقات تابعی کے حکم کے تحت اثر کرتے ہیں اور ان میں قوت نمونہ خصوصیت سے یورپ میں ذاتوں نے طبقات کی شکل اختیار کر لی ہے اور متعدد و متنوع اختراعات کے اندر گونا گونی ہیں۔

طبقات کی قدیم ترین شکل ذاتوں سے بہت مشابہ ہے۔ ابتدا میں وہ موروثی تھے اور جو صفات ان سے منسوب تھے ان سے (یورپ کے) طبقات کی اندرونی قرابت ذاتوں کے ہندوستانی طریقہ کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ بلکہ خود وہ افسانے بھی (ہندی افسانوں سے) بالکل مشابہ ہیں، جن کی بنا پر یہ مانا جاتا تھا کہ طبقات کو خدا ہی نے پیدا کیا ہے۔ (اسکینڈینیویا کے قدیم مجموعہ نظم و نثر کی کتاب) ایڈا میں بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح رگڑ (Rig) دیوتا نے اپنے نشت میں پہلے تمھریل (Thral) کو پیدا کیا جو کیمین آبادی کا جدا علی تھا، پھر ایک اس سے بہتر گھر میں آزاد کارل (Karl) کو پیدا کیا جو آزاد کسانوں کا موروثی اہل تھا اور آخر میں شریف یارل (Jarl) کو پیدا کیا جسے اس نے تیر اندازی اور نیزہ بازی سکھائی اور جنوں کا مقدس راز اس کے تفویض کیا۔ یہ طبقات بھی اپنے جسم کی ساخت اور رنگ میں مختلف تھے، شرفا (Noble) نہایت ہی چمکتے ہوئے گورے رنگ کے ہوتے تھے، ان کے بال ہلکے شفاف رنگ کے اور رخسار سے درخشاں غلاموں (ادنی طبقے والوں) کے چہرے بہ نما و ران کے اعضاء بڈول ہوتے تھے۔

را پکارا

کال کے ڈرویڈ (پیشوایان مذہب) برہمنوں کے مماثل سمجھے جاسکتے ہیں یہاں بھی مذہبی پیشوائی، علم اور قانون انھیں کے تفویض تھے اگرچہ یہ ڈرویڈ اور ان سے بھی زیادہ مسیحیت سے قبل کے جرمانیوں کے مذہبی پیشوا (جن کا نام گوڈی) اسی طرح کوٹ (خدا) سے مشفق ہے جیسے برہمن برہما سے نکلا ہے، قومی شرفاء کے طبقے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ ازمنہ وسطیٰ میں قبیلوں کی حیثیت مسیحی پجاریوں کے ایک خاص طبقے کے طور پر برہمنوں کی ذات سے قریبی مشابہت رکھتی ہے۔

دس طبقہ شرفا

اعیان

یورپ کی نہایت ہی ابتدائی تاریخ میں جس قدیم طبقہ اعیان کو ہم ہر جگہ پاتے ہیں وہ ایک موردنی طبقہ اور بالعموم دونوں اعلیٰ ترین ذاتوں کے فرائض کا حامل تھا۔ محاورات زبان بالعموم اس موردنی خصوصیت کے شاہد ہیں تھینز کے اپو پیرید (Eupatridai) اور روما کے پیرسی (Patricu) اسی وجہ سے ان ناموں سے موسوم ہیں کہ وہ شریف باپوں کی اولاد ہیں اور جرمانی ادالینگون (Adalinge) کا نام ایک خاندان (Adal) سے نکلا ہے جس کا خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔

ایٹریا کے لیو کو موئی (Lucumones) اور کال کے نائب (Knight) موردنی طبقہ اعیان میں سے تھے۔ افسانوں میں پسند کیا جاتا ہے کہ بڑے بڑے خاندان اور بالخصوص حکمران خاندانوں کا سلسلہ براہ راست خداؤں یا اوتاروں سے ملحق کر دیا جائے اور خداؤں کی اولاد کی طرح ان کی تعظیم توقیر کی جائے۔ پس مذہبی پیشوائی اور خدائی امور کا علم نیز قانون کا علم و عمل لازمی طور پر اسی

سہ قصہ کی کتاب دیکھا جنگ، مقالہ ۱۹، فصل ۳ مذہبی فرائض ان کے سپرد ہیں یعنی عام قربانیاں اور سفرد اشخاص کی طرف سے قربانیاں کرنا اور مذہبی احکام کی شرح بیان کرنا جو انہوں کی بہت بڑی تعداد ان کی طرف معمول علم کی غرض سے رجوع رہتی ہے جو ان کا احترام کرتی ہے، عموماً تمام اہل اور عمومی قضاوت کا فیصلہ وہی کیا کرتے ہیں۔

سہ اسٹمٹ ہنز نے اپنی کتاب "قانونی ملکی" (Statsrecht) کے صفحہ ۳۰۳ و ۳۰۴ میں اس کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔

قدیم طبقہ ایمان سے متعلق تھا۔ وہ تمام لوگوں سے پہلے بلند ترین سرکاری عہدوں پر مقرر کئے جاتے تھے اور فوجی نظام میں انھیں بلند درجہ دیا جاتا تھا۔ دوسری طرف ہندی پیشے زیادہ تر ان کے لئے بند کر دیئے گئے تھے عموماً کچھ منوسلین ان کی حفاظت میں ہوتے اور ان کی خدمت کرتے تھے اور شخصی قانون کے دائرے میں بھی مالک اراضی ہونیکے اعتبار سے ان امر کو خاص امتیاز حاصل ہوتا تھا وہ قلموں یا (گرڑھیوں) میں رہنے کے شائق ہوتے اور شہروں میں بھی بلند مقامات کو اختیار کرتے تھے۔

تمام یورپین اقوام کی تاریخ میں یہ تخصیصی ملائیں خفیف تغیرات کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ ہم اس نیم سیاسی و نیم مذہبی تنظیم کا جس قدر اگے کو پیہ چلائے جاتے ہیں اسی قدر ان میں زیادہ مماثلت پاتے ہیں۔

۳۔ آزاد
اشخاص۔

یونانیوں رومیوں اور جرمانوں میں آزاد اشخاص عوام اور قوم کی طاقت کے سنگ بنیاد تھے قومی حقوق سے وہ پورا پورا انشفاع حاصل کرتے تھے اور وہی سلطنت کے ستون ہوتے تھے بیشک طبقہ امر ان سے بلند تر ہوتا تھا مگر ہندوستان کی ادنیٰ ذات کی طرح خ ذاتوں سے ایک بالکل ہی جدا گانہ مخلوق نہیں تھے بلکہ انھیں میں سے ایک مرتفع اور ممتاز گروہ ہوتا تھا اور بہر نوع ان سے متحر رہتا تھا اور اس کی بنیاد اصلی بھی انھیں قومی حقوق پر مبنی ہوتی تھی جو آزاد اشخاص کے ہوتے تھے۔

آزاد اشخاص قدیم ترین زمانے میں بالعموم زمین کے مالک اور اس کے جوتے بولے والے ہوتے تھے ایتھنز کے ابتدائی نظام سلطنت میں گیمور ہی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی حال اسپارٹا کے عامۃ الناس روم کے پلیبین (اجلاف) اور تمام جرمانی قبائل کے آزاد اشخاص کا تھا۔ نسل اور ملک کے متعلق ان کے آزادانہ حقوق کا احترام قانوناً خاص طور پر کیا جاتا تھا۔ وہ تجارت میں بھی حصہ لیتے تھے گو کہ ابتداءً وہ اسے کم پسند کرتے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے طرز زندگی کو ہم گویا ویشوں کی زندگی کے مماثل قرار دے سکتے ہیں مگر وقت عامہ میں وہ ویشوں سے فائق تھے کیونکہ وہ ہتھیار اٹھا سکتے تھے اور زیادہ فوج زیادہ تر انھیں سے مرتب ہوتی تھی۔ علاوہ ازب ملت کے اندر وہ سیاسی حقوق بھی عمل میں لاتے تھے جن کی نوعیت نظام سلطنت کے لحاظ سے مختلف ہوتی تھی۔

وہ اگرچہ حکومت کے محکوم ہوتے تھے مگر ایک آزاد شخص کی حیثیت سے وہ کسی خاص اقامت کے تابع نہیں ہوتے تھے۔ ابتدا میں غالباً انھیں حق حمایت نہیں حاصل تھا مگر وہ اپنے خاص آدمی رکھ سکتے تھے ان کا طبقہ اصلاً ایک موروثی طبقہ تھا۔ عموماً یہ مانا جاتا تھا کہ ہر آزاد شخص آزادی پیدا ہوتا ہے۔

آخر میں ہمیں ایک ایسے طبقے کے بہت سے نشانات ملتے ہیں اسی ابتدائی زمانے میں (جس کا ذکر ہم کر رہے ہیں) شکست ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اس لئے اُس کی خصوصیات ہمارے لئے ایک محاسراہ کئی ہیں۔ یہ طبقہ متوسلین و خدام کا ہے جو ہندوستان کے شدروں کے مانند زندگی کی ادنیٰ ضروریات میں مشغول رہتا تھا کیوں تو وہ مفتوح ہاشمندوں پر مشتمل ہوتا تھا جو ہمیشہ فاتحین ہی کی نسل کے ہوتے تھے اور کیوں یہ طبقہ ان غریبوں پر مشتمل ہوتا تھا جن کے گلوں میں ظلم و قرض کی وجہ سے مستقل غلامی کا طوق پڑ گیا تھا یونان کے ہیلانٹ اور تھیت رومہ گال اور برطانیہ کے کلی انٹ اور جرمانیا کے لیٹ سب اس میں داخل ہیں۔

ان کا کوئی نہ کوئی آقا ہوتا ہے جو ان کی حمایت و حفاظت کرتا تھا۔ جسے ”حامی“ کہتے تھے۔ یونانی اسے پروس تائیس (Prostates) کہتے تھے اور رومی پاترونس (Patronus) اس طبقے کے افراد قوم کا جزو ہوتے ہیں غلاموں کے درجے میں نہیں جوتے تھے مگر ان کی آزادی اُن کے حقوق اور ان کی وقت آزاد اشخاص سے کم ہوتی تھی۔ اُن کا کام بالخصوص دستکاری تھی اور آزاد شدہ غلام بالعموم اسی درجے میں داخل ہو جاتے تھے۔

ان طبقات کی تاریخ نہ جدا گانہ سلطنت کی تاریخ میں بہت ہی گہرے تعلق کے ساتھ مدغم ہے نظام ہائے سلطنت کے تبدلات و انقلابات اکثر انہیں طبقات کے تغذات و جسات کے باطنی و غیر مرئی تغیرات کے ظاہری نتائج و مظاہر ہیں۔ ازمنہ پہلی کے قانون کا تمام مجسمہ طبقات کے تحیل کے رنگ میں نکلا ہوا اور انہیں کی خصوصیات کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے جس طرح ہر طبقے کا خاص لباس ہوتا تھا اُسی طرح ہر طبقے کے اپنے خاص قوانین اور مذمت گسٹری کے طریقے بھی ہوتے تھے۔ پادری مذہبی شریعت کے تابع تھے، حکمران قانون اہجان کے زیر اثر تھے، ٹائٹ جاگیر دارانہ قانون کے پابند تھے، خدام اپنے خاص قانون

۴۴ بتولین
و خدام

ازمنہ پہلی
کے قانون
و سیاسیات
کی باقیات

کے تحت تھے، شہری اپنے شہر کے قانون کے اور کسان اپنے علاقے کے رواج و قانون کے زیر فرمان تھے مگر ازمنہ وسطیٰ میں ان امتیازی طبقات کی موروثی حیثیت گھٹتی گئی اور اس میں پیشے کی حیثیت بڑھتی گئی۔ زمانہ مابعد کی صدیوں میں چار خاص طبقات پائے جاتے ہیں۔
 (۱) طبقہ مذہبی (۲) طبقہ اعیان (۳) طبقہ شہری یا طبقہ سوم (۴) طبقہ فزارعین و اول الذکر
 یعنی اعیانی طبقات نے حاکمانہ سیاسی حیثیت حاصل کر لی تھی تیسرے طبقے نے ملکی آزادی کو بچا یا چھوٹا طبقہ بالکل بے بس اور محکوم تھا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ازمنہ وسطیٰ کے اختتام پر یہ چاروں طبقے زوال پذیر ہو گئے اور بہت کچھ مٹ گئے مگر موجودہ زمانے میں ان کے دو ایک نشانات اس طرح باقی رہ گئے ہیں جیسے کسی تباہ شدہ عمارت کے کچھ آثار رہ جاتے ہیں۔ جدید سلطنت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ہمیں ازمنہ وسطیٰ کے ان طبقات کے معنی جاننے چاہئیں۔ انھیں سے مقابلہ کرنے سے موجودہ سلطنت کی حالت سمجھ میں آتی ہے۔

طبقاتِ اولاً
 موروثی تھے
 بوجہ پیشہ کی
 نسبت سے
 ہو گئے۔

اور بالآخر
 زوال پذیر
 ہو گئے۔

نواں باب

(الف) قیس (طبقہ مذہبی)

ازمنہ وسطیٰ کے طبقات میں مذہبی گروہ کو سب سے مقدم جگہ حاصل تھی۔ کلیسا کے صحیح اعتقاد کے موافق وہ قوم کا کوئی طبقہ نہیں تھا اور ایک مذہبی طبقہ تھا۔ کٹر کلی سلطنت محض اہل دنیا کی ایک تنظیم سمجھی جاتی تھی اور مذہبی گروہ اپنے تقدس کی وجہ سے ان سے بالاتر تھا۔ مسیحی قیس اپنے حقوق کو برہمنوں کی طرح اپنے مخصوص خدائی رشتے پر قائم نہیں کرتے تھے کیونکہ ان کا سلسلہ ازدواج کے ذریعے سے نہیں چلتا تھا بلکہ وہ اپنے حقوق کی بنا پر زیادہ تر ایک ربانی تنظیم پر قائم کرتے تھے وہ روح القدس کے اثر سے بھرے ہوئے تھے اور کلیسا کے عہود نے انھیں مقدس بنا دیا تھا۔ پادریوں میں کا کترین بلکہ بدترین شخص بھی دنیاوی لوگوں کے سنایت ہی بلند مرتبہ اور پاکباز شخص سے ایسا ہی فائق تھا جیسا سونا نوہے سے یا روح جسم سے۔

طبقہ مذہبی
نظریہ علم نہیں
ہے۔

پادریوں کا مطمح نظر تقریباً وہی تھا جو برہمنوں کا تھا فرق صرف یہ تھا کہ مسیحی پادریوں نے برہمنوں کے مانند دنیاوی حکومت کو ترک نہیں کر دیا تھا اور سلطنت کے قواعد کی پابندی کی جا نہیں کا میلان برہمنوں سے کم تھا۔ ازمنہ وسطیٰ کے کلیسا کے منطقی اصول کے موافق سلطنت کے قوانین کی پابندی پادریوں پر عائد نہیں ہوتی تھی ان کا کام یہ تھا کہ وہ خود ان قوانین کے امتحان و اختبار کے بعد یہ فیصلہ کر سکیں کہ آیا وہ برضائے خود ان کا اتباع کریں گے یا نہیں اور کریں گے تو کس حد تک۔ طبقہ مذہبی کے حقوق یا کلیسا کے اغراض کو فوراً بھی خطرہ ہوتا تو پادری معاہدہ ہر طرح کی اطاعت سے انکار کر دیتے اور کتاب مقدس کے ان الفاظ کو سپر نائیٹ کریں انسان کے بجائے خدا کی اطاعت کرنا چاہئے اور اپنی روحانی فوقیت پر زور دینے لگتے۔ دوسری جانب وہ دنیاوی حکومت سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ وہ بلا چون و چرا کلیسا کے قوانین کا اتباع کرے اور ان کی تعمیل میں

وہ سلطنت
خارج اور
سلطنت سے
بالا تر ہیں

اپنی قوت سے مدد دے۔ انہوں نے دیوانی بلکہ فوجداری مقدمات تک میں خود کو دنیاوی عدالت کے اقتدار سے علیحدہ کر لیا تھا۔ ان کے بڑے ہوئے دعاوی دنیاوی منصفوں کی توقیت کے روادار نہ تھے کیونکہ ”بھیڑوں کا گلہ بانوں پر حکومت کرنا“ کیسے ممکن تھا۔ وہ جنگ میں خدمت کرنے کے یابن نہیں تھے کیونکہ ان کا مذہبی شغل آلاتِ آہنی سے مناسبت نہیں رکھتا تھا؛ لیکن ہمیں تک نہیں تھا، وہ محصولات کے ادا کرنے کی ذمہ داری سے بھی گریز کرتے اور ہر موقع پر اپنی ”برائتِ خدمات کو پیش کرتے تھے تاکہ ہر طرح کا بار جو سلطنت کی طرف سے ماہ کیا جائے اسے دفع کر دیں۔ رونا کے پادری ہونے کے لحاظ سے وہ قومیت کے حدود سے متنفر تھے۔ وہ کسی ایک قوم یا کسی خاص ملک کے متوطن نہیں تھے۔ وہ تمام ممالک عیسوی کے ایک عام تعلق کے قائل تھے جن کا مرکز دنیا کا صدر مقام اور پوپ کا مستقر روم تھا۔ یہی قانون ان کی زندگی کا قانون تھا اور سوا کلیسا کی نرم عدالت کے اور کسی کو جوابدہ ہونے سے وہ منکر تھے۔

مگر باوجود اس کے اپنی انتہائی طاقت کے زمانے میں بھی پادریوں نے خود کو سلطنت سے کبھی کلیتہً جدا نہیں کیا اس لئے کہ کچھ تو ان کے تاریخی حالات اور کچھ ذاتی اغراض کا خیال علیحدگی کا مانع تھا۔

عیسوی کلیسا اور اس کے پادریوں کے گروہ کا آغاز اور ان کا عروج قدیم رومی شہنشاہی کے دور میں ہوا جو دنیا پر سلط اور وسیع اقتدار کی مالک تھی۔ روم کی سیاسی طاقتوں نے اپنے اقتدار کو ترک نہیں کیا تھا، وہ مقدس رومی شہنشاہی کے تمام باشندوں سے قوانین شہنشاہی حکومت اور شہنشاہی عدالت کی اطاعت کی خواستگار تھی، طبقہ مذہبی اپنے لئے منفرد امتیازات شہنشاہوں سے حاصل کر سکتا تھا مگر اُس کی حکومت میں کوئی کلام نہیں تھا۔

فرانکی شاہی بھی بدستور اسی سیرجی رہی کہ اساقفہ اور قسبے بادشاہ کے اور شہنشاہی قوانین و عدالت کے تابع رہیں گو کہ سلطنت کی طاقت گھٹ گئی تھی اور کلیسا نے زیادہ آزادی حاصل کر لی تھی۔ جرمانی شہزادوں کے تحت میں کلیسا کی برائتِ آہستہ آہستہ بڑھتی گئی، اول اول کسی قسم کے مذہبی قانون کے تسلیم کئے جانے کے بجائے زیادہ تر بادشاہ کے لطف و عنایت سے ان حقوق میں ازدیاد ہوا اور اب قانون کلیسا نے

ان کی سیاسی طاقت کی ترقی۔

تکبرانہ طور پر خود اپنے اقتدار کا دعویٰ شروع کر دیا تاہم جب کلیسا کے حقوق نے مخالفت و مقاومت کے باوجود بتدریج فتح حاصل کر لی اس وقت بھی ان کا اقتدار ہر جگہ یکساں نہیں تھا۔

اطالیہ

وقتی اغراض نے بھی طبقہ مذہبی کو عوام اور سلطنت سے بہت ہی زیادہ مربوط کر دیا تھا۔ ازمنہ وسطیٰ میں کلیسا کے سرگردہ یعنی پاپائے روم نے اس حصہ ملک پر سیاسی اقتدار شاہی بھی حاصل کر لیا تھا جو ورنہ پیٹر (Petrinonum Petri)

کہلاتا تھا، کچھ تو شاہی عطیے سے اور کچھ حکمرانوں کے نذرانوں سے کلیسا کی ایک سلطنت پیدا ہو گئی تھی جس پر قسٹیس حکمراں تھے۔ روم اور رومی مملکت میں اعلیٰ ترین روحانی اقتدار دنیاوی اقتدار شاہی کے ساتھ مل گیا، پاپاؤں کا اب بھی کام نہیں رہا تھا کہ وہ بحیثیت اسقف اعلیٰ ہونے کے بوقت ضرورت شہنشاہ اور مختلف سلطنتوں کے سامنے کلیسا کے اغراض کی نیابت کریں بلکہ اطالیہ نے واپان ملک میں سب سے بڑے والی ملک ہونے کے لحاظ سے انھیں اطالوی اغراض سیاسیہ سے بھی بہت گہرا تعلق پیدا ہو گیا تھا یہی امر فی الاصل اطالیہ کی تباہی کا باعث ہوا (دیکھا ویلی مباحث جلد ۱-۱۲) اطالیہ میں تفریقات کے قائم رکھنے کی توان میں کافی طاقت تھی مگر اطالیہ کو خود اپنی شاہی کے تحت میں متحد کر لینے کی طاقت ان میں نہیں تھی نہ وہ معاند قوموں کی یویشن سے ملک کو محفوظ رکھنے کے قابل تھے۔ یہ البتہ تھا کہ اپنی ضرورت کے لئے وہ غیر ملکی طاقتوں کے بلا لینے کے لئے ہمہ وقت تیار تھے۔

انھوں نے روم کو دوبارہ ممالک عیسوی کا اول شہر بنا دیا اور گرجاؤں اور صنعتی کاموں سے اسے مزین کر دیا مگر ان کی کلیسا کی حکومت و انضباط کے تحت میں ذہنی و مادی تمدنی اوصاف و کمالات میں اطالوی جمہوریتوں کے باشندوں سے پیچھے رہ گئے اور کلیسا کی حکومت بجائے اس کے کہ اعلیٰ سیاسی ترقی کا نمونہ ہوتی اس کے لئے ایک عبرت بھی ہو گئی۔ جدید دنیا نے یہ معلوم کر لیا کہ مذہبی حکمرانی سلطنت کی صحیح حکومت کے لئے موزوں نہیں ہے اور کلیسا کی سلطنتوں کا دنیاوی رنگ میں آجانا رومیوں کے لئے ایک بڑا سیاسی فائدہ ثابت ہوا ہے۔

مذہبی حکمرانوں کی سیاسی طاقت کو بڑھانے میں اطالیہ کے بعد جرمانیا نے

جرمانیا

۱۱ شہنشاہی
نظام حکومت

سب سے زیادہ فیاضی دکھائی۔ فرنگی شاہی کے زمانے میں بھی قومی مجالس میں اساقف کو ایک بلند درجہ حاصل تھا وہ کبھی تو دنیاوی امراء عظام خاص کر اضلاع کے کاؤنٹوں کے ساتھ مجالس اکابر میں شامل کر دئے جاتے تھے کبھی ان کی جداگانہ مذہبی مجالس قائم کر دی جاتی تھیں مگر دنیاوی طاقت و عظمت کے ساتھ ان کا تو سل جبرامنی شہنشاہی کے نظام سلطنت میں سب سے زیادہ واضح طور پر نمایاں ہوا۔ اس نظام میں ہم دیکھتے ہیں کہ سات انتخاب کنندہ والیان ملک (Electors) میں سے تین مذہبی حکمران یعنی ہائینس کوٹلن اور ٹرییر کے اساقف اعظم ہیں اور ان میں سے بھی ہائینس کا اساقف اعظم جرمانا کے چانسلر اعظم کی حیثیت سے سب سے اول رائے دیتا ہے، حلقہ انتخاب میں انھیں اول درجہ حاصل تھا، اور اس کے ساتھ ہی ملکی حکمران ہونے کے لحاظ سے انھوں نے بہت جلد فریجیریا شاہانہ آزادی بھی حاصل کر لی تھی۔

ان کے علاوہ اساقف اعظم تمام اساقف اور روسائے خاقانہ کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی جنھوں نے خاص خاص اضلاع پر اقتدار شاہی کے حقوق حاصل کر لئے تھے اور وہ شہنشاہی مجالس شوری میں شریک ہوتے اور رائے دیتے تھے۔ یہ ایسے یا تو شہنشاہی کے معمولی حکمرانوں کی حیثیت سے فرداً فرداً دی جاتی تھیں جیسا جے بریٹن ماگدے برگ دانش بزرگ کے اساقف اعظم اور دیورٹس برگ، آؤگس برگ اور بازیل کے اساقف فرداً فرداً رائے دیتے تھے یا وہ مجموعی رائے میں حصہ لیتے تھے اور یکجا ہی مذہبی مجالس منعقد کرتے تھے جو کاؤنٹوں (یا قوامسہ) کی مجلسوں کے ہمایہ بھی جاتی تھیں کتب قانون کی اعلامی ترتیب میں مذہبی حکمرانوں کا درجہ بادشاہ کے بعد ہوتا تھا دنیاوی والیان ملک اگرچہ نظام شہنشاہی میں ان کے ہمسرے تھے مگر تیسرے درجے پر رکھے جاتے تھے کیونکہ یہ ممکن تھا کہ وہ مذہبی حکمرانوں کے تابع ہو جائیں مگر اس کے برعکس ہونا نامناسب معلوم ہوتا تھا۔

پاپا یاں روما اور سکسہ فی شہنشاہوں کے مابین عطائے اسناد کے مناقشہ عظیم میں یہ بخوبی پیش ہوئی تھی کہ کلیسا کے حکمران دنیاوی حکومت کو ترک کر کے اپنی زندگی کلیسا کے لئے وقف کر دیں مگر یہ کوشش عبث ثابت ہوئی خود پوپ کی طرف سے بھی جب اس کا اشارہ ہوا تو جبرمانیا کے حکمرانوں نے غصے کے ساتھ اسے مسترد کر دیا

نتیجہ یہ ہوا کہ جرمانیا میں بھی مذہبی عہدے سیاسی عہدوں اور سیاسی اغراض کے ساتھ مخلوط ہو گئے۔

شہنشاہی کے صوبوں میں بھی یہی صورت پیش آئی۔ مقامی مقتدایان مذہبی یعنی اساقف، ریڈیان، خاقانہ پرائیروں اور زاہدوں کے مختلف فرقوں کے پیشواؤں نے اپنا ایک علیحدہ طبقہ بنا لیا اور صوبے کی مجلس میں ایک جداگانہ گروہ کی حیثیت سے یا امر کے ساتھ شامل ہو کر بیٹھے کا حق حاصل کر لیا اور اپنی جاگیروں پر کم و بیش وسیع عدالتی اختیارات کام میں لانے لگے۔ صوبہ دار طبقات میں ان کے حقوق کی بنا بالعموم ان کے ملکی امر ہونے کے اعتبار سے تھی اس لئے اگرچہ وہ اپنی ذات کے لئے محصولات و فوجی خدمات سے استثناء حاصل کر سکتے تھے مگر وہ اپنے خدام اور زرعی تابعین کیلئے جو ہمیشہ عام دنیاوی لوگ ہوتے تھے اس کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔ ملک کو ان کے محصولوں کی ضرورت تھی اور ملک کا حکمران ہمیشہ جاگیردارانہ آقا کے ان سے صلح سواروں کے مہیا کرنے کا مطالبہ کر سکتا تھا۔

ایک فوقیت جو مذہبی طبقہ امر کو دنیاوی طبقہ احرار پر حاصل تھی وہ یہ تھی کہ ان کا طبقہ موروثی نہیں تھا بلکہ شخصی تعلیم و انتخاب پر مبنی تھا۔ ایک دستکار کا لڑکا پوپ اور ایک کسان کا بیٹا اسقف اعظم ہو سکتا تھا۔

مگر جس قدر وقت گزرتا گیا، مذہبی طبقے کا یہ غلبہ اور مذہبی حکمرانوں اور دینی پیشواؤں کی یہ اعلیٰ طاقت منہززل اور تباہ ہوتی گئی۔ سو پھوس صدی کی جرمانی اصلاح نے اس دنیا وار کلیسا پر ایک ہمت ہی کا رے ضرب لگائی۔ یہ ٹیٹلی خیالات کی اشاعت کے ساتھ مذہبی ریاستیں دنیاوی رنگ میں آگئیں۔ اساقف کی جائدادیں منسوخ کر دی گئیں خاقانیں

لے پوپ گرگوری ہفتم جو خود ایک برصغی کا بیٹا تھا اس نے صاف الفاظ میں یہ بیان کیا ہے کہ روٹا کو کافروں اور عیسائیوں میں یہ عظمت حاصل ہوئی ہے اور اس لئے منسل کی نجابت یا ملکی عالی خاندانی اتنی زیادہ قابل ملاحظہ نہیں جتنی کسی شخص کی جسمانی اور روحانی خوبیاں،

دیکھو لورین کے مطالعات تاریخی، (Laurent, Etud. sur l' Hist.

توڑی گئیں اور مذہبی طبقے برطرف کر دیے گئے اصلاح کے قبل جرمانی رائٹس تاگ میں تین مذہبی حکمران اور ان کے سواتین اساقف اعظم اور انٹالیٹس اساقف نشست کرتے تھے۔ ولیٹ فالیسا کی صلاح کے بعد یہ تعداد گھٹ گئی انتخاب کنندہ حکمران ایک رائٹس برگ کا اسقف اعظم اور بین اساقف تک رہ گئی۔ اب صرف سوئیٹیا اور رائٹس کے صوبوں کی مذہبی مجلسیں برقرار رہ گئیں۔ شمال سارے کا سارا اور جنوب کا بڑا حصہ مذہبی فرمانروائی کے اثر سے نکل گیا تھا۔

جو ممالک کیتھولک طریق پر ثابت قدم رہ گئے تھے ان میں بھی یہ تغیر صرف ملٹوی ہو گیا تھا۔ جرمانا کا کوئی حصہ نہیں تھا جہاں انیسویں صدی کے اوائل کی انقلابی تحریک کے بعد مذہبی اقتدار شاہی قائم رہ گیا ہو۔ ان کے بائیں کنارے کے انتخاب کنندہ حکمران بھی اس طوفان میں بہہ گئے اور ان کے ممالک فرانس میں شامل کر لئے گئے۔ دوسرے مذہبی حکمرانوں کے ممالک دنیا وی فرمانرواؤں کو بطور معاوضے کے دیدیے گئے۔

شہنشاہی کے خاتمہ کے ساتھ مذہبی آمرانہ کے شہنشاہی طبقے کی حیثیت جاتی رہی اور صرف بعض صوبوں کی ڈائٹ (مجلس شوریٰ) میں ایک غیر قابل اطمینان حیثیت قائم رہ گئی۔ کئی صدیوں کے بعد پھر ایک مرتبہ منصب اسقفی ایک خالص مذہبی عہدہ رہ گیا جس میں سیاسی طاقت کا کوئی شائبہ شامل نہیں تھا۔ ان کا عدالتی اختیار بھی ان کے مملکتی اقتدار کے ساتھ نائل ہو گیا۔

کیتھولک طبقہ مذہبی جو اس طرح اپنی دنیاوی حیثیت و طاقت سے محروم ہو چکا تھا، وہ ازمندہ وسطی کے سطح خیال کو اب حاصل نہیں کر سکتا تھا جدید سیاسی احساس اس کا روادار نہیں تھا کہ مذہبی طبقہ عام دنیا داروں پر کسی قسم کا ظلم کرے اس نے سلطنت کے قوانین اور اس کے مخصوص اقتدارات کے لئے ہمہ گیر اطاعت کا مطالبہ کیا، طبقہ مذہبی کی برائت و امتیازات کا وقت گزر چکا تھا سب ایک قانون ایک اختیار عدالتی کے تابع تھے۔

انگلستان
فرانچس

انگلستان اور فرانس میں بھی طبقہ مذہبی کی تاریخ انہیں حالات سے ملتی ملتی سی ہے۔ ان ممالک میں انہیں وہ مملکتی اقتدار کبھی حاصل نہ ہوا تھا جو جرمانا میں حاصل

ہو گیا تھا اور ان دونوں ملکوں میں سلطنت کا دنیاوی پہلو جرمانیا کی نسبت زیادہ قوت کے ساتھ حاوی رہا تاہم پارلیمنٹ کا ایک طبقہ ضرور تھا، انگلستان میں امرائے دنیاوی کے ساتھ وہ دارالامرا میں نشست کرتے تھے۔ فرانس میں انھوں نے اپنا ایک جُداگانہ طبقہ بنایا تھا جو سلطنت میں سب سے اول تھا مگر انگلستان میں اصلاح اور فرانس میں انقلاب نے ان کی حیثیت پر پڑا اثر ڈالا۔ ازمنہ وسطی کی برکت، عام ویکساں اطاعت قانون کے اصول کے سامنے غائب ہو گئی۔

جب روس شاپرہم نے ٹیٹس جنرل کو ۱۸۶۹ء میں طلب کیا تو طبقہ مذہبی نے برضا خود اپنی جداگانہ حیثیت کو ترک کر دیا، اور قومی مجلس میں (جو ازمنہ وسطی کے طبقات کی تھیں بلکہ آزاداں لیان ملک کی قائم مقام تھیں) شامل ہونے میں امرائے ملک پر سبقت لے گئے۔ اس طرح پارلیمنٹ کا ازمنہ وسطی والا طبقہ ہر جگہ شکست ہو گیا، مذہبی اور غیر مذہبی طبقات میں جو بڑا فرق تھا اس کا اثر عملاً نازل ہو گیا اور اپنے نظم حقوق میں سلطنت نے اسے مسلم سمجھنا ترک کر دیا، پارلیمنٹ کا بڑا حصہ طبقہ متوسط میں مل گیا اور کلیسا کے اعلیٰ عہدہ دار امرائے ایمان میں شامل ہو گئے۔

سلاویوں نے مجموعۂ پارلیمنی طبقہ کی اس حیثیت کے اختیار کرنے سے انکار کر دیا تھا جو ڈوڈا ولی نے پیش کی تھی، امرائے روحانی اب بھی اپنے دنیاوی ہمہ روں کے ساتھ دارالامرا میں بیٹھے ہیں مگر اغلب یہ ہے کہ ازمنہ وسطی میں انیسویں صدی جاگیردار ہونے کی حیثیت سے حاصل تھیں نہ کہ مذہبی اعزاز کے طور پر۔ انگریزی ترجمہ

دسواں باب

(ب) طبقہ اعیان و امراء

(۱) فرامیسی امراء

قدیم روم کے نیپزی (Patrician) موروثی امراء تھے مگر اندرونی فرقہ بندیوں کی کشمکش نے انہیں بہت جلد سیاسی طبقہ اعیان میں تبدیل کر دیا کیونکہ نسب پر نہیں بلکہ عام عہدوں کے لئے قوم کے آزادانہ انتخاب پر تھی۔ سیناتی خاندانوں کا یہ سیاسی طبقہ اعیان، جمہوریت کے زمانے سے گذر کر شہنشاہی کے زمانے تک برقرار رہا، قدیم پترسی خاندان جو اگستس کے زمانے میں گھٹ کر یکاس تک آ گئے تھے اور جن میں بہت کم اضافہ ہوتا تھا قانوناً انہیں مگر واقعہً وہی بدستور اس طبقہ اعیان کی اصل و بنیاد تھے (شہنشاہوں کے خاندان بھی ان کے قانون ہمیشہ پترسی ہی ہوتے تھے) ان کے نام کی قدیمی عظمت و شوکت اسطنت کے معاملات کا موروثی تجربہ نیز اکثر ان کی بڑی بڑی جائیدادیں اور ذاتی تعلقات بھی وہ اسباب تھے جنہوں نے ان کے لئے وہ وقعت حاصل کر لی تھی جس کی وجہ سے وہ سینات میں داخل کر لئے جاتے تھے لیکن ان کے علاوہ ان ممتاز اشخاص کے اضافے سے جنہوں نے سپہ سالار اور بڑے مقرر، مقنن ہونے کے لحاظ سے شہرت حاصل کی ہوئی، طبقہ اعیان میں ہمیشہ ہی نئی جان پڑتی رہتی اور نئی قوت آتی رہتی تھی۔ جمہوری دور میں یہ لوگ عام عہدوں پر منتخب ہونے کی وجہ سے سینات میں داخل ہوتے تھے اور شہنشاہی دور میں شہنشاہ کی طلب پر شامل ہوتے تھے۔ اس طرح زیادہ مابعد کے رومی طبقہ امراء کی بنا پر سیاسی قیادت اور خدمات عامہ کے امتیاز پر قائم ہو گئی تھی اور تنزل و زوال کے زمانے میں بھی اس کی گزشتہ آزادی اور عظمت کے کچھ آثار باقی رہ گئے تھے۔

روما کے قدیم
موروثی
طبقہ امراء
کی جگہ پر ایک
سیاسی طبقہ
امراء کا قائم
ہونا۔

میسینا
کا متناہی
خیال۔

”فرانسز شہنشاہی“ (Prineipate) پر سیناس کا مشہور مقالہ اُن اساسی خیالات کا بہترین اظہار ہے جو ازمنہ شہنشاہی میں طبقہ اعیان کی بابت ایک رومی مذکر ہو سکتے تھے۔ شہنشاہ کا یہ دوست اسے صلاح دیتا ہے کہ سینات کو اُن بہت سے ناقابل ارکان سے پاک کر دے جو خانہ جنگیوں کی ابتری کے دوران میں اُس میں داخل ہو گئے تھے اور جو جگہیں اس طرح خالی ہوں اُن کو غور و فکر کے ساتھ نافر و دیگوں سے پر کرے۔ وہ یہ فطرت کرتا ہے کہ غریبی کی یاداش میں کوئی رکن سینات سے خارج نہ کیا جائے بلکہ غریب قابل اشخاص کے لئے ضروری مالی ذرائع مہیا کر دے جائیں تھے سیناتیوں کے انتخاب میں وہ صرف اٹھا لیا ہی تک اپنی نظر کو محدود نہ رکھے بلکہ اپنے طیفوں پر اور مصوبات کے لوگوں پر نظر ڈالے اور اس طرح اپنے گرد شہنشاہی کی تمام قوموں کے اُن بہترین اشخاص کو جمع کر لے جو خاندانِ اخلاق یا قوموں کے لحاظ سے قوم کے سرگرم مانے جاتے ہوں اور معاملات عامہ اور عالمگیر (رومی) حکومت میں انھیں حصہ دے اس طرح جتنے بھی زیادہ تعداد میں ممتاز اشخاص سینات میں شریک ہونے کے لئے روم میں جمع کئے جائیں گے اُسے ہی زیادہ سلطنت کے ضروریات کو پورا کرنے اور مصوبوں کی وفاداری کو قائم رکھنے کے ذرائع مہیا ہو جائیں گے۔ اس اور کہ جو زیادہ تر اپنی دولت کے لحاظ سے ممتاز ہیں اُن سے ایک دو میں طبقہ اعیان مرتب ہونا چاہیے اور اُن کے بہترین افراد کو اُس میں شامل کرنا چاہئے۔ علاوہ ازیں اس خیال سے کہ سیناتیوں کے بیٹے اپنے باپوں کی جائستہنی کر سکیں اُن کو علوم و فنون اور سپہگیری کی ایسی تعلیم دی جائے جو ان کے رتبے کے شایاں ہو۔

فرانسیسی طبقہ اعیان کی تاریخ بہت ہی ناہموار ہے، اس میں ہم ازمنہ ذیل کو ممیز کر سکتے ہیں جن میں سے ہر ایک دو خاص خصوصیات رکھتا ہے۔

(۱) فرانسیسی طبقہ اعیان کا آغاز میر وونگی و در (۱۵۰۰ء) سے تعلق رکھتا ہے۔ تعجب یہ ہے کہ فرانکی اعیان کے ایک قدیم موروثی طبقے کے آثار محض غیر متیقن ہیں

فرانسیسی طبقہ
اعیان -
میر وونگی و در
۱۵۰۰ء

البتہ اُس زمانے میں شخصی وفاداری کی بنا پر ایک طبقہ اعیان قائم ہو گیا تھا جس کی بنیاد زیادہ تر اُن تعلقات پر تھی جو بادشاہ اور اُس گروہ کے درمیان تھے۔ غالباً یہاں بھی امراء کے قدیم خاندانوں کا خاص لحاظ کیا گیا ہو گا مگر ان کے سوا دوسرے آداد فرانکوں اور جرمانوں کو بھی بادشاہ اپنے اعیان میں شامل کر لیتا تھا۔ یہاں تک کہ رومانی بھی بادشاہ کے مہانوں کی حیثیت سے اس قسم کے اعزاز سے مفتخر ہوتے رہتے تھے ایسی مثالیں بھی کچھ بہت کم نہیں ہیں کہ ادنیٰ درجے کے لوگ مثلاً غلام و خادم وغیرہ رتبی کرتے کرتے سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچ گئے اور اس طرح امراء میں شامل ہو گئے۔ پس یہ طبقہ اعیان بہت ہی مخلوط اجزآ سے پیدا ہوا تھا اور جیسا کہ شیفر نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے زیادہ تر یہ طبقہ موروثی امرکا طبقہ نہیں تھا بلکہ ذاتی امرکا طبقہ تھا جو بادشاہ کے ساتھ وفاداری کے عہد کے ذریعے وابستہ تھا زیادہ گراں دیت کا حق اس امر کا نشان و نتیجہ تھا کہ اس طبقے کے اراکین کی قدر و وقعت زیادہ تھی۔ اس کے سوا شخصی قانون میں اس کے امتیازات بہت ہی کم تھے مگر سیاسی حیثیت سے اسے متعدد طور پر امتیازات حاصل تھے۔ اعیانی حیثیت کے ساتھ سلطنت کے اعلیٰ عہدے درباری منصب مذہبی اعزاز بھی شامل ہو جاتے تھے۔ شاہی مجالس شوریٰ میں اس کی شرکت ہوتی تھی اور قومی اور ملکی مجالس میں اُسے بلند جگہ ملتی تھی۔

جس طرح اُن اشخاص میں جو اس نظام کے اعضائے ترکیبی ہیں ہم رومانی اور یوٹنی (جرمانی) اجزآ کو مخلوط پاتے ہیں وہی حال خود اس نظام کا بھی ہے مگر یوٹنی خصوصیات غالب تھیں اور وہی عنصر روز بروز زیادہ تسلط حاصل کرتا رہا۔ اس جزو سے (۱) بادشاہ کی ذاتی وفاداری یعنی اعتماد شاہی کا تعلق تھا جو خاندانی روایات اور خاندانی اغراض سے پیدا ہوا تھا اور دوسرے روسا کے تابعین تک کے لئے وسیع ہو گیا تھا (۲) نیز بڑے بڑے امراء جو شاہی عطیات سے سرفراز ہوتے رہتے تھے جو (زیادہ تر اراضی کی شکل میں ہوتی تھیں) وہ اسی طبقے کے ہوتے تھے نہایت

۱۔ شیفر نے تصنیف "فرانس کے عدالتی نظام کی تاریخ" ج ۱، ص ۱۶۱ اور مس کے آگے۔

Schaffner, Geschichte der Rechtsverfassung Frankreichs.

کے جاگیر داری طریقے کی بنا زیادہ تر انھیں دو تعلقات پر ہے۔

۲۔ حکمران خاندان کے تغیر کا بڑا سبب طبقہ امرا کا ایک انقلاب تھا محل کے کارروائی کا جب بادشاہ کے قائم مقام کی حیثیت سے طاقتور فوجی اعیان کے سرگروہ بن گئے اور امرا کو ان کی ریاستوں میں استحکام حاصل کرنے میں مدد دی اور پھر انھیں امرا کی مدد سے کمزور بادشاہوں کو بحال باہر کیا۔

جیسا کہ گیزو نے (اپنی تصنیف میں) بتایا ہے اس تحریک کو خاص اور مسلسل دو شمالی فرانس اور آسٹریلیا سے ملی جہاں جرمانوں کو غلبہ حاصل تھا اور جو اسی باعث سے جنوب کے رومانی فرانس کے مقابلے میں یونانی (یا جرمانی) فرانس کہلاتا تھا۔ مغربی فرانس نے جہاں کے امرا و مانیوں سے بہت زیادہ مخلوط تھے بالکل علیحدگی اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب فرانسیسی طبقہ امرا میں صاف طور پر یونانی رنگ پیدا ہو گیا۔ امرا کا وہ طبقہ جو عہدوں اور خدمتوں کے اصول پر قائم تھا۔ یونانی یا جرمانوں کا بلور تابعین کا ایک جاگیر داری طبقہ بنتا گیا جن میں سے ہر ایک نے اپنی حد کے اندر اپنی آزادی کا سبق سیکھ لیا تھا اس طرح شاہی عہدہ داروں کی گروہ بندی نمایاں شاہی کے آزادانہ اقتدار سے تبدیل ہو گئی اور امارت اور امرا کی جاگیریں موحی ہو گئیں۔

(۳) نئے جاگیر دار امرا کو تیسرے دور یعنی شاہان کا پیٹ سے سنٹ بوس سے ملے تک کے عہد میں انتہائی عروج و طاقت حاصل ہوئی۔ کارل اعظم اس کو سمجھتا تھا کہ سلطنت کا اتحاد کیونکر برقرار رکھا جائے اور شاہی طاقت کو کیونکر استحکام حاصل ہو مگر اس کے جانشینوں نے تخت میں فرانکوں کی عالمگیر شہنشاہی متعدد آزاد سلطنتوں میں منقسم ہو گئی اور خود فرانکی بادشاہی کے اندر عہدے اور جاگیریں زیادہ آزاد ہو گئیں، کارل اقرع کو مجبور ہو کر اپنے تابعین کے بلکہ ادنیٰ تابعین کے میٹوں کے حق میں کاؤنٹ کے عہدے اور شاہی جاگیر کے موروثی ہونے کے اصول کو تسلیم کرنا پڑا۔

کارولنگی
۹۵۲
۹۸۷

کاپٹی یا
کاپے شکیو
۹۸۷-۲۲

گیزو کے مقالات فرانس کی تاریخ پر، صفحہ ۲۵۔

Gnizot, Essais Sur l'histoire de France

۳۔ جاگیروں کی وراثت فرانس میں بہت بعد کے زمانے تک عام طور پر نہیں لگائی جاتی

اس کے بعد بہت ہی جلد جاگیروں میں قریبی رشتہ داروں کا موروثی حق بھی تسلیم کر لیا گیا۔ صرف کلیسا میں عہد پے کے اعتبار سے شخصی املا کا تحیل باقی رہ گیا ورنہ سلطنت میں اس کی صورت موروثی جاگیر داری کی ہو گئی تھی۔ اس طرح موروثی حکم النوں کی حکومت مختلف درجوں اور تختات مشکلوں میں تمام فرانس پر چھا گئی۔

اعلیٰ طبقہ امرا

ان امرا میں سے بعض کو تمام اہم معاملات میں اعلیٰ اختیارات حاصل تھے اور وہ بادشاہ کے لئے ایک بہت ہی محدود جاگیر دارانہ اقتدار سے زیادہ تسلیم نہیں کرتے تھے۔

اس اعلیٰ طبقے میں ڈیوک کاؤنٹ وائی کاؤنٹ اور بیرن شامل تھے زیادہ تر ان میں سے خود بادشاہ کے تابعین تھے بعض ان میں سے ڈیوکوں اور کاؤنٹوں کے بھی تابع تھے اور بہت ہی کم ایسے تھے جو اپنے علاقے میں آزاد مطلق ہوں۔ عدالت کے معاملے میں وہ اعلیٰ اقتدار رکھتے تھے اور فوجی نظام کے وہی سرگروہ تھے کیونکہ فوجی نظام میں اب اس کی پہلی سی قومی خصوصیت باقی نہیں رہی تھی، اور وہ جاگیر داروں اور نابلیٹوں کی خدمت کا نظام رہ گیا تھا، دوسری طرف بادشاہ کی جو فوجی خدمت ان پر لازم تھی وہ قطعی طور پر زمین و شخص تھی۔ بادشاہ ان کی رضامندی کے بغیر نہ تو قانون لٹالے کر سکتا تھا اور نہ محصول لگا سکتا تھا۔ اسی طرح سے وہ بھی اپنے حدود کے اندر اپنے تابعین کی رضامندی سے احکام نافذ کرتے اور محصول عاید کرتے تھے جو شخص بھی ان کے حدود اقتدار کے اندر رہتا تھا اسے ان کی وفاداری کی قسم کھانا پڑتی تھی اور تابعین کو صداقت اور اطاعت کی قسم کھانا ہوتی تھی خلاصہ یہ کہ وہ ان کی رعایا تھا۔

اس طرح سیاسی شاہی اقتدار ٹوٹ کر بہت سی ایسی موروثی شاہیوں میں منتشر ہو گیا جن کی بنا شخصی حقوق پر قائم تھی اور جن کے آپس میں ایک نہایت کمزور واسطہ باقی رہ گیا تھا۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ گیارہویں صدی کے نصف ثانی تک بادشاہ اس اصول کی مخالفت کرتے رہے تھے۔

اعلیٰ طبقہ امرا اب قوم کا ممتاز طبقہ نہیں رہا تھا نہ اس کی ہستی بادشاہ کی اُس وفاداری اور اُن خدمات کی شکل میں رونما تھی جو بادشاہ کے لئے اُس پر لازم تھیں۔ اب تو اُس طبقے کی خاص خصوصیت یہ بھی کہ اُس کے ارکان جاگیر دار والی اور حکمران بن گئے تھے۔ اصل یہ ہے کہ اُس نے خود بادشاہی کے حقوق حاصل کر لئے تھے۔

ادنیٰ طبقہ امرا

ادنیٰ طبقہ امرا میں بھی اسی قسم کی صورتیں پیش آئیں۔ دو ذرائع سے یہ طبقہ پیدا ہوا تھا ایک پیشہ سپہگیری۔ دوسرے درباری خدمات۔ ابتدائے پیشہ سپہگیری ہی تھا جس نے ان نائٹوں اور خادموں کی وقعت پیدا کی جو کسی رئیس کی مخصوص وفاداری کے ساتھ وابستہ ہوتے تھے، لیکن نائٹ عام طور پر آزاد ہوتے تھے اور خدام اکثر پیشہ غلاموں کی اولاد سے ہوتے تھے مگر کچھ زمانہ بعد یہ پیشہ ور طبقہ امرا بھی موروثی اور جاگیر پر طبقہ بن گیا۔ نائٹوں نے یہ راستیں پیدا کر لیں جو ان کے خاندان میں موروثی ہو گئیں اور عمدہ داروں نے درباری جاگیریں حاصل کر لیں۔ صاحب ثروت ہونے کے لحاظ سے وہ عوام سے الگ ہو گئے اور تابعین کی حیثیت سے وہ اپنے رئیسوں سے قریب تر ہو گئے۔ جس طرح رئیس نے بادشاہ کے ساتھ منیر (دسترخوان) پر بیٹھتا تھا اسی طرح نائٹ رئیس کی میز پر بیٹھتا تھا۔ جنگ اور دربار میں ان کی خدمتیں ان کی جائداد سے اُسی طرح وابستہ ہوتی تھیں جس طرح حکمرانوں کے شاہانہ حقوق اُن کی ملکیت سے وابستہ تھے۔ وہ بھی ایک طرح کا محدود مملکتی اقتدار شاہی رکھتے تھے۔ اور اپنے جاگیر پر رئیس کی عام رعایا کے اوپر ایک طرح کا ادنیٰ قسم کا اور دیہاتی عدالتی اختیار بھی انھیں حاصل تھا، ان کا طبقہ رفتہ رفتہ زیادہ علمی ہو گیا اور نائٹوں کے طبقے کی بنیاد پہلے تو محض اُن کے پیشے پر تھی لیکن اب نائٹ کی نسل سے ہونا اور اُسی کے مطابق تربیت یافتہ ہونا لازم ہو گیا تھا۔ نیا طبقہ امرا، اپنے نسب کی بنیاد پر طبقہ معززین کیلانا تھا، یہ ضرور ہے کہ محض نسب سے کوئی شخص نائٹ نہیں ہو جاتا تھا مگر یہ بھی تھا کہ جس شخص کا باپ نائٹ نہیں ہوتا تھا دماں سے بخت نہیں (وہ بالعموم نائٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف بادشاہ کسی شخص کو طبقہ امرا میں شامل کر سکتا تھا اس کے ساتھ ہی اول و اول طبقہ امرا کے ساتھ جاگیر کی ملکیت اس طرح وابستہ تھی کہ عام آزاد اشخاص جو جاگیر خرید لیتے اور میں رہتے تھے وہ اپنے اس علاقے کی وجہ سے احرا

داخل ہو جاتے ہیں اور جب ان کے پوتے اس جاگیر کے وارث ہو جاتے تھے تو وہ طبقہ معززین میں شامل ہو جاتے تھے، مگر بغیر جاگیر کے آزاد غریبیت بوسن نوعِ پہلانی کے پہلو بہ پہلو ترقی کرتی جاتی تھی وہ سب تعلیم اور پیشے کی بنا پر قائم تھی۔

اس ادنیٰ طبقہ امر کے تحت میں بھی تاج تابعین (Ranasseue)

سے لیکر تابعین (Viques) تک بہت سے درجے تھے۔ آخر الذکر کی تعداد بالخصوص جنوب میں زیادہ تھی اور اکثر انھیں درمیانی درجے کے عدالتی اختیارات حاصل تھے، انھیں میں صاحبانِ قصر (Chatelains) تھے جن میں بعض اعزاز

کے اعتبار سے بیرونوں کے ہم مرتبہ تھے اور انھیں میں وائی کا ونٹ (Vicontes)

تھے جن میں سے بعض بیرونوں سے تعلق رکھتے تھے اور بہت سے کا ونٹ جاگیری عدت میں بھی حیثیت کے لوگوں میں شامل تھے مگر مدایج و امتیازات کے ان تمام بیچ و بیچ تفاوت میں جاگیر دارانہ اصول ہر جگہ غالب نظر آتا ہے۔

(سم) چوتھے دور میں طبقہ امر کا کامل تغیر واقع ہو گیا۔ پہلے تو اقتدار شاہی کے لئے بادشاہ اور امر میں کشمکش شروع ہوئی۔ بادشاہ قومی اتحاد کے پیدار شدہ جذبات اور سلطنت کے زندہ شدہ احساس کے نمائندے تھے۔ اس کشمکش میں وہ مقنن ان کی تائید پر تھے جو رومی قانون کے اصول پر زور دے رہے تھے اور بالآخر یہ عملداری میں لے آئے۔ انھیں اپنے مسلمات کے لئے شاہی عدالت میں پارلیمنٹ کی شکل میں ایک قومی ذریعہ اظہار خیال کا ہاتھ آ گیا۔ قوم اور بالخصوص شہروں کے باشندے اگرچہ مداخلت بہت کم کرتے تھے مگر بالواسطہ وہ بھی ان کی تائید پر تھے۔

شاہی عہدہ داروں کا ایک نیا نظام جو جاگیر دارانہ تعلق سے آزاد تھا بتدریج مروج کیا گیا۔ بادشاہ کی تنخواہ اور فوجیں کسی حصہ و تعین کے بغیر شاہی احکام کی بجا آوری کے لئے حاضر تھیں، ڈیوکوں اور کا ونٹوں کی بڑی بڑی جاگیریں کیے بعد تو کسے بادشاہ کے قبضے میں آگئی تھیں، کبھی وراثت کے ذریعے سے کبھی معاہدے کے ذریعے سے اور بیشتر صلح قوت کے زور سے ان پر تسلط ہو گیا تھا اور علیحدہ شدہ شاہی طاقت ایک مرتبہ پھر تاج کے اندر مجتمع ہو گئی تھی اس طرح امر کا آزادانہ اقتدار شاہی ٹوٹ گیا۔ اکابر ملک پر بادشاہ کی فتح کو لوٹس یا زودہم (۱۴۶۱-۱۴۸۳)

سینٹ لوٹس
سے فرانسیسی
انقلاب تک
۱۴۸۹-۱۴۲۶

نے مکمل کر دیا۔

امرا کے پاس ان کے قدیمی ملکی اقتدار شاہی کے تھوڑے بہت باقیات رہ گئے تھے۔ بعض صوبوں میں وہ صوبہ دار ہو گئے مگر مملکتی امرا کے طور پر ان کی حیثیت باقی نہیں رہی۔ رعایا میں ان کی حیثیت ایک ذی امتیاز طبقے کی رہ گئی تھی اور نئے خیالات اور اعتقادات ان کے اس اعزاز و امتیازات کے یوگائیو مخالف ہوتے جاتے تھے۔ بادشاہ اور امرا میں بعد کو جو کشمکش ہوئی وہ بالکل ہی دوسری قسم کی تھی۔ درحقیقت وہ سیاسی اور مذہبی فرقوں کی کشمکش تھی اور بعض اوقات محض درباری فرقوں کی کشمکش بن جاتی تھی جن کے سرکردہ علمی العموم امرا ہوتے تھے۔

امرا اگر اثر و قوت حاصل کرنے کے خواہشمند ہوتے تھے تو وہ صرف شاہی خدمت ہی کے ذریعے سے اس غرض کو یوں کر کر سکتے تھے کہ وہ مجلس ملی اسٹیٹس جنرل میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لے سکتے تھے کیونکہ اُس نے کوئی معین و مضبوط شکل اختیار ہی نہیں کی۔

اس طرح جاگیر دارانہ طبقہ امرا کے بجائے ایک درباری طبقہ امر قائم ہو گیا جس کا انحصار سیاسی حقوق کے بجائے زیادہ تر ظاہری درجہ و اعزاز پر تھا۔ پہلی چارم نے امرا کو اپنی جاگیروں پر رہنے کا حکم دے دیا تھا۔ لوہیں چہار دہم نے انھیں دربار میں بلا لیا تاکہ دربار کی شان و شکوہ سے خیرہ ہو کر انہیں کامل انقیاد پیدا ہو جائے اور درجہ فرانس کے ہمسروں کا تھا۔

اولاً ان کی تعداد بارہ تھی جن میں سے چھ مذہبی امرا ہوتے تھے اور چھ تاج کے دنیاوی

جاگیر دارانہ
طبقہ امرا
ہو گیا

سلطنت وی تو کویل نے اپنی کتاب سلطنت قدیم میں ظاہر کیا ہے کہ طبقہ امرا کے سیاسی حقوق کے برطن کر دینے اور اس کے ساتھ ہی ان کے اقتصادی امتیازات کو برقرار رکھنے سے کس طرح ان کے خلاف قومی منافرت کو حرکت ہوئی۔ جیسا کہ وہ عدالتی فرائض انجام دیتے تھے اور بالتفصیل امور عام میں اپنا وقت صرف کرتے تھے اس وقت تک محمولات سے ان کا مستثنیٰ رہنا اور زمین اور اشخاص کے محمولات سے انھیں رقوم کا ملنا قابل فہم معلوم ہوتا تھا مگر جب شاہی عہدہ دار سلطنت کے تمام انتظامی و عدالتی کاموں کو انجام دینے لگے تو پھر یہ اقتصادی امتیازات بالکل نا واجب معلوم ہوتے تھے۔

تابعین ہوتے تھے مگر بعد میں شہزادوں اور دوسرے دنیاوی امرا کے امانے سے ان کی تعداد بڑھادی گئی اعزاز ہمسری (Peerage) موروثی تھا، انھیں بادشاہ کے حضور میں اور سپیس کی پارلیمنٹ میں جانے کا حق حاصل تھا اور ان کا مقدمہ صرف پارلیمنٹ ہی میں پیش ہو سکتا تھا۔ تاجپوشی کے موقع پر یہ لوگ ہمیشہ شاہی نشانات لیکر چلتے تھے۔ ہمسروں کے بعد ڈیوک، مارکویس، کاؤنٹ، بیرن، وای کاؤنٹ، شائیلیس (صاحبان قصر) کے درجے تھے جن کے مدارج ان کے خطابات و نشانات سے ظاہر ہوتے تھے۔

آخر میں اسکو اعزاز و معمولی جنٹلمین (شرفا) کا طبقہ تھا۔ قدیم طبقہ امرا کا انحصار زیادہ تو ریٹ پر تھا مگر مملکتی حقوق پر متصرف ہونے کا بھی ایک حد تک اثر پڑتا تھا لیکن اب اس کے پہلو پہ پہلو ایک نیا طبقہ امرا کا پیدا ہو گیا جس کی بنیاد خاکر شاہی عیٹے پر تھی، ان میں زیادہ تر وہ لوگ شامل تھے جو اعلیٰ ملکی اور قومی عہدوں کے لئے نامزد ہوتے تھے اور سب سے زیادہ شاہی عدالتوں کے قانون دان اشخاص اس میں داخل تھے جو امر جیسٹ (Noblesse de robe) کہلاتے تھے، یہ خدمتیں موروثی نہیں تھیں اور نہ زمین سے ان کا تعلق تھا پس اس لئے اس طبقے میں برابر نئے لوگ شامل ہوتے رہتے تھے۔ اسی سے قریب محققین علوم (Doctors of law) کا طبقہ تھا جو اور سب کے برخلاف شاہی غایت پر نہیں تھا بلکہ علمی فضیلت پر مبنی تھا۔

استادی نرا

طبقہ امرا میں ایک فروتر جزو ان بہت سے افراد کا تھا جو اسناد کی بنیاد پر آباؤی امرا کے زمرے میں شامل کئے جاتے تھے۔ یہ اسناد اکثر اس رقم کے وصول کرنے کی غرض سے دیے جاتے تھے جن کا ادا کرنا ایسے امیروں پر لازم تھا اور کبھی کبھی خدمات کے انعام کے طور پر بھی عطا ہوتے تھے مگر وہ خدمات ہمیشہ عزت و آبرو والی خدمتیں نہیں ہوتی تھیں۔

انقلاب

(۵) فرانسیسی انقلاب کے مخفف مگر ہولناک آشوب نے طبقہ امرا کا سارا نظام دہم و برہم کر دیا، اس انقلاب کی ابتدا اس تبدیل سے ہوئی کہ اب تک جو طبقات علمورہ علیہا تھے وہ سب ایک عام قومی مجلس میں شامل کر دیے گئے اس کے بعد طبقہ امرا کی امتیازی حیثیت مٹادی گئی اس لئے کہ امتیاز عمومی اصول مساوات کے خلاف تھا اور انجام کار امرا کا قتل عام کر کے کل سطح معاشرت کو مہوار کر دینے کی کوشش کی گئی۔

(۶) جب جوش انقلاب متنازعہ اشخاص کے خون سے پوری طرح سیراب ہو چکا اور نظریہ مساوات کی سر بلند رجحانوں سے سرگرا کر سکتے ہو گئے تو خود فرانس میں کئی بار کوشش کی گئی کہ اگلے وقتوں کے زمین و آسمان پر ایک نئے طرز کے طبقہ امرا کی بنیاد قائم کی جائے مگر ایسی کسی کوشش کو دیر پا کامیابی نصیب نہیں ہوئی سب سے زیادہ دلچسپ کوشش پنولین کی تھی جس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ طبقہ اعیان ایک طرف شاہی کو تقویت دینے اور دوسری طرف اس کے اختیارات کو محدود رکھنے کے لئے سب ضروری ہے اُس نے ”جیش اعزاز“ کے طبقے کو قائم کر کے ایک طرح کے جدید نائٹ بنائے۔ اس اعزاز کا راستہ ہر اُس شخص کے لئے کھلا ہوا تھا جو سلطنت کی کوئی نمایاں خدمت انجام دے مگر فی الحقیقت یہ ایک محض شخصی اعزاز تھا۔ پنولین یہ بھی جانتا تھا کہ ایک بلند تر موروثی طبقہ اعیان قائم کرے جس میں قدیمی تاریخی امرا کے خاندانوں کے باقیات کے ساتھ موجود فرانسیسی سپہداروں، ذریروں، درود سے اعلیٰ عہدہ داروں کی اولاد بھی شامل کرنی جائے اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس کے مرکوز خاطر یہ تھا کہ قدیم رومی شہنشاہی کی تنظیمات کو فریب تاریخ کی روایات سے ملا دے لیکن یکم مارچ ۱۷۹۰ء کے قانون موضوعہ کو جاری کر کے اُس نے طبقہ امرا کی تجدید میں پہلا ہی قدم اٹھایا تھا کہ خود اس کا زوال ہو گیا۔

پنولین اول

لوئس شانزدہم (۱۷۷۴ء) اپنے طبقہ اعیان میں انگریزی انداز کے قریب ترین گیا تھا مگر کسی قسم کا سیاسی طبقہ اعیان قائم کرنے میں اُسے بھی ناکامی ہوئی۔ قدیمی امرا کو انقلاب نے پوری طرح تباہ کر دیا تھا۔ حقوق کی مساوات اور املاک کے آزادانہ نقل و انتقال کا اصول لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسا بس گیا تھا کہ طبقہ امرا کی تجدید کسی نوع سے بھی ہوتی وہ عام حقوق پر گویا ایک قرآن و سنت انداز میں معلوم ہوتی تھی۔ قدیم امرا میں سے ایک نے حصے نے خود اپنے ملک کے خلاف ہتھیار اٹھائے تھے اور ان کے جدید دعاوی کا انحصار غیر ملکی فوجوں کے ذریعے سے فرانس کے فتح ہونے پر مبنی تھا۔ پرانی نفرت ایسی ہی قوی تھی جیسی پہلے تھی اور طبقہ اعیان نے کسی قسم کی جدید خدمت ایسی نہیں کی تھی جس سے لوگ اُٹھیں کہ ساتھ اس پر اُٹھیں کہ امرا کو پھر نئے سرے سے سیاسی عروج حاصل ہو سکے۔ ۱۷۹۰ء کے جولائی والے انقلاب نے دوبارہ موروثی امرا اور طبقہ اعظم کو منسوخ کر دیا اور صین جیاتی امارت جو اس کے بعد قائم ہوئی اسے فروری ۱۷۹۱ء کا طوفان بہا لے گیا، طبقہ امرا کے ہر طرح کے خطابات و انتیانات کے خلاف سلطنت جمہوری

لوئس شانزدہم

دوبارہ اپنے نشا کا اعلان کر دیا۔
 فرانسیسی طبقہ امرا اس کے پیچھے بھی ترقیب نہیں دیا گیا۔ سیناٹی کا منصب جو پولین سوم نے
 اپنے نظام سلطنت میں اختیار کیا تھا اس میں طبقہ لمر کے نمویانے کے آثار دکھائی دیتے تھے مگر
 اس دوسری شہنشاہی کے زوال کے ساتھ ہی یہ کوشش بھی ختم ہو گئی اس کے بعد فرانسیسی طبقہ امرا
 صرف اس حد تک از سر نو قائم ہوا ہے کہ قدیمی خطابات کا جو از تسلیم کر لیا گیا ہے اور نیچا
 استعمال کا اسرار دیا گیا ہے۔

قوم میں اب بھی اعیانی عناصر و رجحانات موجود ہیں مگر عوام کی جمہوری طبیعت کے
 مقابلے میں انھیں کامیابی کا موقع نہیں ملتا ہے۔ اب فرانسیسی امرا صرف خطاباتی امرا ہیں ان کے
 کسی طرح کے خاص حقوق نہیں ہیں اور ان کا قیام زیادہ تر خاندانی خود نمائی کی وجہ سے
 ہے نہ کہ عام تعلیمات کی وجہ سے۔

گیا رصوال باب

(ب) انگریزی طبقہ امر

جدید یورپ میں بس انگلستان ہی ایک ملک ہے، جہاں ابھی تک طبقہ امر ایک مستقل اور رفیع المنزلت قومی تنظیم کی حیثیت سے قائم ہے، نتیجہ مختلف اسباب کے جمع ہونے سے پیدا ہوا ہے۔

انضامات

(۱) فرانس کے طبقہ امر کی طرح ازمنہ وسطی کا انگریزی طبقہ امر بھی انگریزی اور نورمانی دو قومیتوں کے عناصر مشتمل تھا، فرانسیسی طبقہ امر کے نسبت یہاں ان دونوں کے درمیان رابطہ اتحاد زیادہ قریب تھا۔

اس میں شک نہیں کہ فتح (۱۰۶۶ء) کی ابتدائی صدیوں میں نورمانوں نے سکنیوں پر غلبہ قائم کر رکھا تھا مگر فرانس کے رومانوں اور فرانکیوں کے تعلقات کے نسبت ان کے تعلقات زیادہ گہرے تھے۔

سکونی آرل (Eorls) کو ایک قومی طبقہ امر کی حیثیت سے مدت سے عام آزاد گروہ (Ceorls) پر امتیاز حاصل تھا۔ اُن کی تعلیم اُن کی معاشرت، اُن کے خیالات وہی تھے جو نورمانی امر کے تھے اور اپنے نئے بادشاہوں کے مقابلے میں بھی اُنھوں نے اپنے قدیمی حقوق کو قائم رکھا۔ فتح کا اثر صرف یہ ہوا کہ اُن کی آزادانہ طبیعت میں اور زیادہ تقویت آگئی اور جس مزید جوش و قوت کے ساتھ اُنھوں نے اپنے حقوق کو قائم رکھا، اس سے طبقہ امر میں حیثیت مجموعی سیاسی آزادی کی وہ روح پیدا ہو گئی جو انگلستان کی اس عظمت کا باعث ہوئی۔

(۲) دوسری طرف فتح کا ایک بڑا اثر یہ ہوا کہ شاہی طاقت جس پر ملک کے اتحاد و امن کا بہت کچھ منحصر تھا، امر کے مقابل میں برقرار رہی اور فرانس کی طرح اقتدار شاہی چند بڑے بڑے تابعین کے درمیان منتشر نہیں ہو گیا۔

نتائج کی قوت

اور ملکوں کی طرح انگلستان میں بھی جاگیر دارانہ طریق کا دخل ضرور رہا مگر وہاں اُس کی حالت بدل گئی تھی، یہ پُرانا خیال کہ انگلستان میں اول اول اسے نورمانیوں نے رواج دیا حال کی تحقیقات سے باطل قرار پا گیا ہے قدیمی دستخطی پتھیں (منوسلین شاہی) ایک بڑی حد تک جاگیروں کے مالک تھے اور اس طرح بادشاہ کے ساتھ ایک خاص وفاداری اور فوجی خدمت کے رابطے کے ساتھ مربوط تھے، مگر یہ صحیح ہے کہ نورمانی حکومت نے فی الجملہ سلطنت کو زیادہ نمایاں جاگیر دارانہ حیثیت میں تبدیل کر دیا، فتح کے وقت جاگیر دارانہ طریقہ نورمانڈی میں انگلستان کے نسبت زیادہ ترقی یافتہ حالت میں تھا، اور فائنٹین اپنے خیالات اپنے ساتھ لائے تھے۔

(خود ولیم فاتح ہی نے یہ اصول رائج کیا تھا کہ نہ صرف بڑے متاجرین بلکہ تحت متاجرین اور بڑے بڑے قابضین اراضی براہ راست بادشاہ کی اطاعت کا حلف لٹائیں تاکہ فوجی خدمت کے واسطے میں تمام رعایا براہ راست بادشاہ کے تابع رہے۔ ایک صدی کے اندر اندر تمام ارضی جائدادیں جاگیرانہ بندش کے اندر آ گئیں اور یہ قول زبان زد ہو گیا کہ بادشاہ اپنی مملکت کی تمام جائدادوں کا رئیس اعظم اور مالک اول ہے اور کوئی شخص بالواسطہ یا بلاواسطہ شاہی عہدے کے بغیر اس کے کسی جزو پر قابض نہیں ہو سکتا۔ اس طرح تمام ارضی ملکیت کیساں طور پر سلطنت کے تابع ہو گئی) ولیم جس جاگیر کی مقدار شاہی پر عامل تھا وہ اس کے وقت کے فرانسیسی بادشاہ کے اقتدار سے بہت قوی تھا فورمانڈی کا ڈیوک (یعنی خود ولیم) جو جاگیر داری اصول سے شاہ فرانس کا ایک ماتحت رئیس تھا برائے نام اُس کے اثر میں تھا اور یہ بھی حقیقت سے خالی محض ایک ضابطہ بیانی تھی۔

اس طرح نورمانی اور کسوفی امر اگرچہ اپنے تابعین پر عدالتی اور حفاظتی اختیاراتِ ازمنہ وسطیٰ کے طرز پر عمل میں لاتے تھے۔ پھر بھی وہ حقیقتاً شاہی اقتدار کے اندر تھے اور سلطنت کا اتحادیہ سرنوں کے اوپر شاہ نہیں کیا گیا تھا۔

(۳) لیکن اگر اس اعتبار سے انگریزی طبقہ امر کے حقوق ایک طرف

تنگ و محدود تھے تو دوسری جانب ان کے سیاسی حقوق بہت ہی اہم تھے یہی حقوق ہیں جو ان کی عظمت اور مستقل اہمیت کا باعث ہوئے۔

پارلیمنٹ
میں ملکی
قوت

ان سیاسی اور قومی حقوق کے اظہار کا موقع ان عظیم الشان مجلسوں میں آتا تھا جو بہت ہی جلد پارلیمنٹ کے زیادہ منکسر نام سے موسوم ہو گئیں۔ پارلیمنٹ کی صورت میں قدرتی انکلو سکیوٹی مجلس عقلاً ایک نئی شکل میں زندہ کی گئی تھی اور دونوں نسلوں کو عام غرض و حالات کے سلسلے میں ہستی متحد کر دینے میں اس سے بڑی مدد ملی۔ بڑے بڑے تابعین کے اجتماع کی غرض اولاً اس سے زیادہ نہ رہی ہوگی کہ وہ ایسٹ وکسٹن ٹائڈ اور کرسٹس کے بتوہاروں میں تاج کی شان و شوکت کے بڑھانے کے باعث ہوں مگر آہستہ آہستہ انھوں نے بڑی سیاسی اہمیت حاصل کر لی اور سلطنت کے نہایت ہی اہم معاملات پر ان کے درمیان بحث و فیصلہ ہونے لگا، اگرچہ اولاً ان کے حدود اختیار کے لئے قطعی قواعد و ضوابط تعین نہیں کئے مگر تیرہویں صدی میں انھوں نے زیادہ مضبوط صورت اختیار کی۔

مشورہ عظم

اگرچہ جب اپنی حفاظت حقوق کے لئے ہتھیار اٹھایا اور تختہ راہ طور پر شاہ جہان سے شہنشاہ کا مشورہ عظم بردار حاصل کیا تو اس مشورے میں یہ فرق تھا کہ اس وقت عظم و دیگر اس وقت شہنشاہ کا دنٹ اور بڑے بڑے بیرن بادشاہ کے خطوط کے ذریعے سے پارلیمنٹ میں فرداً فرداً طلب کئے جائیں گے اور بادشاہ کے دوسرے بلا واسطہ تابعین شاہی عہدہ داروں کی وساطت سے عام حکم کے ذریعے سے بلائے جائیں گے اور یہ کہ جدید محصول ان کی رضامندی کے بغیر نہیں عائد کیا جائے گا۔

ایوان اعلیٰ
ایوان ادنیٰ

مرد و ریام سے طبقہ اول جو بادشاہ کا موروثی مشیر تھا اور دربار و سلطنت کے بلند ترین عہدوں پر فائز ہونے کی وجہ سے اس پر عامہ کے اہم انتظامات پر قابض تھا، ایوان اعلیٰ ہو گیا اور طبقہ دوم ایوان ادنیٰ کا ایک جزو ہو گیا۔ اولاً دونوں کو کونسل میں نشست کا حق ذاتی حاصل تھا مگر پھر طبقہ دوم کے لئے یہ حق نیابت کی صورت میں بدل گیا اور اس بارے میں یہ لوگ نائٹ تاج کے بڑے تابعین کے فروخت تابعین، شہروں اور قصبوں کے باشندوں کے ساتھ شریک کر دیے گئے۔ اس کے بعد سٹارٹ، اعلیٰ طبقہ اعیان بن گئے اور دو نمند اہل شہر شرفا کے فروتر طبقہ اعیان کے ساتھ شامل ہو گئے۔

طبقہ اہل کو سلطنت میں اپنی فطری جگہ اس وقت ملی جب تیرہویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں نظام پارلیمنٹ مکمل ہو گیا۔ ہنری سوم کے عہد میں یہ معلوم ہوا تھا کہ گویا بیرن ارل میسٹر کی سرکردگی میں شاہی کبشتی کو معرض خطر میں ڈال دیں گے اور حکومت

کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیں گے گریہ ایک عارضی مداخلت تھی اور بہت جلد یہ اصول دوبارہ قائم ہو گیا کہ طبقہ اعیان امور عامہ میں ایک معین اثر اور توضیح قانون میں مخصوص شرکت کا مستحق ہے مگر حکومت کے شاہی حقوق کے عمل میں لانے کا اُسے کوئی استحقاق نہیں ہے۔

پارلیمنٹ کی ہمت

جب شہروں اور قصبوں کے ناہین کے اضافے سے پارلیمنٹ کو وسعت حاصل ہوئی تو ان امر کی سیاسی طاقت اور بھی محدود ہو گئی اور ان کی طاقت پر اس کا بھی اثر پڑا کہ بر اعظم یورپ کی طرح انگلستان میں پارلیمنٹ کے لئے نائٹ خود اپنے طبقے کی طرف سے نامزد نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ آزاد متاجرین کی طرف سے منتخب ہوتے تھے۔

خاص طبقہ اعیان خالصتہً لارڈز پر مشتمل تھا فرانس اور جو آئینا کی طرح یہ کبھی بھی خاندانی اور مملکتی طبقہ اعیان نہیں بنا بلکہ ملک کے ایک طبقے کے طور پر باقی رہا۔ جسے بادشاہ اور قانون کے تخت میں فوجی اور عدالتی نظام کے اندر اور نیز اپنے تابع متاجرین پر اپنے اختیارات کے عمل میں لانے کے حقوق حاصل تھے۔

نائٹ -

نائٹ یعنی آزاد اشخاص جو بادشاہ یا امر کو ایک خاص رقم ادا کرنے سے اس حق پر فائز تھے انھوں نے ایک با اثر حیثیت حاصل کر لی تھی، فوج محافظ میں انھیں اولیٰ درجہ حاصل تھا اور ناظمان امن کی حیثیت سے انھیں پولس عدالت کے اختیارات تفویض تھے پارلیمنٹ کے لئے صوبوں کے قائم مقام انھیں میں سے منتخب ہوتے تھے۔ اعلیٰ شہری طبقے میں ان کے چھوٹے لڑکوں کا شمول اور نایابان قصابات کے ساتھ ان کے پارلیمنٹی تعلقات ہی سے فی الواقع طبقہ شرف کا موجودہ خیال پیدا ہوا جس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو اپنے حسب و نسب، عہدے، تعلیم یا جائیداد کی وجہ سے عامۃ الناس سے مغز ہیں۔

جسٹس (شرف)

۴۴۔ انگریزی

طبقہ امریکا

جوش عامہ

(۴۴) انگریزی طبقہ امریکی ایک بوجہ خصوصیت ہے جو خاص لحاظ کی مستحق ہے کیونکہ اس سے وہ فرانس کے اور ایک حد تک جرمانیہ کے بھی طبقہ امر سے قابل اعزاز ہو رہے ہیں۔ ممتاز نہیں۔ اسی زمانے میں جب کہ صرف بیرن ہی سلطنت میں ایک سیاسی طاقت تھے، تو وہ اپنی ذات خاص اور اپنے ذاتی حقوق کے سوا کچھ اور امور کو بھی پیش نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے ابتدا ہی میں ہمیشہ ایک قومی جامت کے اپنا یہ کام سمجھ لیا تھا کہ جمہور کے اعزاز عامہ کے لحاظ سے قوم کے حقوق کی مداخلت اور اس کی آزادی کی محافظت کریں۔ انگلستان کی سیاسی آزادی ایک بڑی حد تک انھیں کی حاصل کردہ ہے۔ جب یہ آزادی

ایک بار مضبوط بنایا دیا کہ ہر قوم کو اپنی تو اعلیٰ طبقہ اعیان جمہوریت کی موجودگی کے مقابلے میں ایک مسیحی گریستہ بن گیا، انھوں نے اپنی قومی آزادی کی محافظت کی حیثیت کو بدل دیا اور تخت اور عروش و تختیاں کی حفاظت کا کام اختیار کیا، جو اس درجہ ہر دلعزیز تو نہیں تھا، مگر نہایت ہی مفید تھا وہ بادشاہ اور عامہ قوم کے درمیان میں تھے۔ وہ خود بذات خاص حکمران ہونے کی قوت نہیں رکھتے تھے مگر ان کی آزادی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ عوام کی ہر ایک پر جو شجہ ایک یا بادشاہ کے ہر ایک مذاق طبعی کی اطاعت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے دونوں کی آزادی و حقوق کو ایک دوسرے کی زد اور برہنہ زدگی سے محفوظ رکھا۔

انگریزی طبقہ امرائے فرائض عامہ میں ہمیشہ مستقلانہ و رہبرانہ حصہ لیا ہے، ان کی تعلیم سیاسی آزادی اور شخصی حریت کے اثر سے مملو ہے، فریقہ سیاسیات ناظران امن کی حیثیت سے ان کے کام انتخابات، انتظام ضلع اور مشاغل جوڑی میں ان کی شرکت ان کی رضا کارانہ انجام، وراغراض عامہ میں ان کی امداد، غرض کہ مستعد کار زندگی کی یہ تمام شکلیں انھیں قوم کی زندگی سے باخبر رکھتی اور حکومت خود اختیاری کے فرائض اور خدمت حب وطن کی تعلیم دیتی ہیں۔

(۵) انگریزی اور روٹی اصول قانون عامہ کا ایک قاعدہ بن گیا اگرچہ اس نے ایسی قطعی اور وسیع الاثر شکل نہیں اختیار کی جیسی براعظم میں ہے۔ اول اول حق وراثت نیز امتیاز امارت زمین یا عہدے کے قبضے سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے، امارت کی کیفیت قطعی طور پر ملکتی تھی مگر بعد میں یہ تعلق توڑ دیا گیا اور امارت حقیقت ایک ذاتی اعزاز سے وابستہ منتقل ہونے لگی۔

(۵) طبقہ امرائے
میں جائیداد
کا صرف ایک
دارت کے لئے
محدود ہوا

مگر کسی مخصوص جائیداد، قصر یا عہدے سے امارت کے اس ابتدائی تعلق کی وجہ سے یہ ہم اصول پیدا ہوا کہ متوفی امیر کا صرف ایک ہی بیٹا یا ایک ہی رشتہ دار اس کے بجائے پارلیمنٹ میں شریک ہو سکتا ہے، جائیداد خلف اکبر کے اصول کے موافق صرف ایک بیٹا لارڈ ہوتا تھا یا بیٹوں کو چھوٹے درجے ملتے تھے اور اعلیٰ طبقہ امرائے وہ خارج رہتے تھے۔ نہ صرف لارڈ کے چھوٹے بیٹے قانوناً اسکو اتریں بلکہ باپ کی زندگی میں بڑے لڑکے کو بھی ”لارڈ محض“ قرار دیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک طرف تو بڑے خاندانوں کا اعزاز و متول ایک شخص کے اندر

مجتمع رہا اور دوسری طرف ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں آسانی کے ساتھ منتقل ہو جانے سے امتیازات نسب کی وقعت گھٹ گئی۔

(۶) کسی امیر کے لئے یہ لازمی نہیں تھا کہ وہ کسی امیر ہی گھرانے میں شادی کرے۔

”لارڈ گی بیوی لیڈی کہلاتی ہے خواہ وہ عام باشندگان ملک کے طبقے میں سے کیوں نہ ہو۔ اس اصول سے طبقہ امرا کے اعزاز میں کوئی کمی نہیں ہوئی اور بہت سے وہ اعتراضات رفع ہو گئے جو برابری نسب کے اصول سے پیدا ہوتے تھے۔ جس سے طبقے کے یکاے ذات کی کسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور جس پر جرمانی طبقہ امرا بہت سختی کے ساتھ جما ہوا ہے۔

(۷) آخر میں یہ کہنا ہے کہ طبقہ امرا میں وقتاً فوقتاً نئے امرا کے اضافے سے وسعت

(۷) جدید
اضافہ۔

وزندگی پیدا ہوتی رہی ہے نئے امیر بنانے کا حق بادشاہ کے لئے مخصوص ہے کیونکہ وہی تمام سیاسی عزتوں کا چشمہ ہے۔ بادشاہ ہی طبقہ امرا میں نئے اراکین کا اضافہ کر سکتا ہے اور ڈیوک، مارکوائس، ارل، وائکاؤنٹ، بائیرن کے خطابات کے ساتھ امارت کے حقوق عطا کر سکتا ہے مگر دستور یہ رہا ہے کہ یہ سیاسی اعزاز صرف ان لوگوں کو دیا جاتا ہے جو بحیثیت سپہ سالار یا مدبر کے اپنے خدمات عامہ سے امتیاز حاصل کریں اور جن کے پاس اتنی جائیداد موجود ہو یا مال جائے جو ان کی حیثیت کی ضرورتوں کی کفیل ہو سکے اس طرح ان سچی اعیانی قوتوں کے سلسل اضافوں نے انگریزی طبقہ اعیان کو جو داؤدِ قابلیت کے خطرے سے بچا لیا اس طریقے کی وجہ سے قوم کے قابل ترین اور ذہین ترین افراد یہ توقع کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے گوارا اپنے خاندان کو سیاسی زندگی کی درخشاں بلندیوں پر پہنچا سکتے ہیں۔ چنانچہ سن ۱۷۷۳ء سے سن ۱۸۰۱ء تک میں چھٹیس ڈیوک، انتیس مارکوائس، ایک سو نو ارل، پچاس وائکاؤنٹ اور دو سو اٹالیس بائیرن نے ہٹائے گئے۔ اس اثناء میں پانچ سو سے زائد شخصوں کو بیرونٹ کا خطاب عطا ہوا۔ زمانہ موجودہ میں وہ دو تین اہل شہرہ و قصبات میں بڑی بڑی جائیدادیں خرید لیتے ہیں اگرچہ امارت کا خطاب نہیں رکھتے مگر قصباتی امرا میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے۔

اب اگر ہم انگریزی طبقہ اعیان کے ان خصوصیات پر مجموعہ نظر کریں تو پھر کوئی وجہ استعجاب کی نہیں رہتی کہ کیوں تمام یورپ کے طبقہ اعیان میں صرف انگلستان

ہی کے طبقہ اعیان کا وجود غلیل طور پر باقی رہا اور نظام حکومت میں کیوں اُسے ایک کارآمد اور نمایاں جگہ دی گئی اور اس کے برخلاف براعظم کے ہر ملک میں طبقہ اعیان یا نوبالکل ہی ناپید ہو گیا ہے یا اگر باقی ہے تو کشاکشی اور پستی کی حالت میں ہے۔

بارھواں باب

(ج) جرمانی طبقہ امرا (۱) پرنس

اگر ہم جرمانیہ کے طبقہ امرا کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہمیں ہر جگہ ایک تعداد ایسے ممتاز خاندانوں کی ملے گی جو فوجی شہرت، انمول یا قوم کے رہنا ہونے کی وجہ سے تمام دوسرے آزاد شخصوں سے بلند تر ہوتے ہیں اور ملی الاٹ انھیں ایک طرح پر شہزادوں کی سی منزلت حاصل ہوتی ہے۔ یہ قدیم نسلی طبقہ امرا جو اکثر صرف چند خاندانوں تک محدود رہا کرتا ہے وہی ازمنہ وسطی کے خاندانی یا فرمانروا امرا کی بنیاد تھا۔

نائٹ کا فرد و طبقہ ازمنہ وسطی کی پیداوار تھا۔

دنیادی مدارج میں سب سے اعلیٰ درجہ پرنس کا تھا، اُس کی حیثیت کو شہنشاہی نظام حکومت سے بہت گہرا تعلق تھا۔ جن خاندانوں کے بزرگ آزادی و اقتدار شاہی کے بلند ترین درجہ پر پہنچ گئے تھے وہ نہایت آزاد و معزز یعنی احرار کامل میں شمار ہوتے تھے۔ (بارھویں صدی کے آخر سے صرف وہی دنیادی امر شہنشاہی کے پرنسوں میں سمجھے جاتے تھے جو بادشاہ کی جانب سے کم سے کم کاؤنٹی کی جاگیر رکھتے ہوں اور کسی دوسرے دنیادی امیر کے تابع نہ ہوں) مگر ان پرنسی خاندانوں کے افسوس ہی صحیح معنوں میں امیر (یا لارڈ) خیال کئے جاتے تھے۔ خاندان کے دوسرے اراکین اس درجے سے محروم تھے وہ ان پرنسوں اور امیروں کے محض ہم جنس (یا رفیق) تھے۔

دنیادی و مذہبی
پرنس۔

شہنشاہی میں اس بلند درجے کا حصول صورتاً ذیل پر منحصر تھا۔ (الف) پرنس کے منصب (یعنی ابتداءً ڈیوک کی فوجی قوت) پر فائز ہونا جس کے ساتھ نشان و علم بھی

سلطنت جرمانی اصطلاح میں: ”ہوخ فرائی“ (Hochfrei) ”زیست بار فرائی“ (Sendbarfrei)

”زیست فرائی“ (Semperfrei)

عطا ہوتا تھا۔ دنیاوی پرہنوں کے زمرے میں ڈیوک، مارکویس، کاؤنٹس اور شامل تھے انہیں کے پہلو پہلو اور بعض وقت اُن سے بھی مقدم شہنشاہی کے دینی پرہن تھے جن کے ہاتھوں میں صرف عصا ہوتا تھا۔ اول الذکر عمدہ موروثی ہو گیا تھا اور حسب دستور صرف اعلیٰ طبقہ امرا کی اولاد کو عطا ہوتا تھا۔ ثانی الذکر کلیتہً پرنسی خاندانوں تک محدود نہیں تھا۔ اکثر وہ پادری جو کسی نارٹ کی اولاد سے ہوتے تھے بلکہ ذی علم شہری بھی اس عمدے پر منتخب ہو جاتے تھے اور شاہزادہ درایسا بھی ہوا کہ کسانوں کی اولاد کیلئے اس پر پہنچ گئی۔

(ج) کاؤنٹ کا عمدہ وہ بھی ایک موروثی و مملکتی حکومت بن گیا تھا۔ طاقتور قبائلی ڈیوکوں کے زوال اور اُن کی مملکت کے مختلف حکمرانوں میں تقسیم ہو جانے کے بعد کاؤنٹ کے یہ خاندان اعزاز میں بڑھ گئے تھے اور اُن کی حیثیت بادشاہ کی جانب سے شاہی نہایت پر منحصر تھی۔ اصل یہ ہے کہ یہ ایک خاندانی مملکتی امارت تھی۔

(جج) علاوہ ان کے ایک تعداد بڑے بڑے اراضی دار امرا کی تھی ان امرانے معاہدات اور اختیارات حکمرانی کے عطیے کی وجہ سے کاؤنٹوں کے مانند اقتدار شاہی وراثتاً حاصل کر لیا تھا۔ یہ لوگ بیرن کہلاتے تھے۔

قدیمی قبائلی امرا کے وہ خاندان جنہیں شہنشاہی میں کوئی خاص جگہ حاصل نہیں تھی وہ زیادہ مدت تک شہنشاہی امرا کے اراکین میں شامل نہیں رہ سکے اور دوسرے طبقات خاص کر نارٹ کے طبقات میں منقسم ہو گئے۔

شہنشاہی کا یہ طبقہ امرا، اپنے دو سیاسی حقوق کی وجہ سے بالخصوص ممتاز ہے۔

(۱) مملکتی اقتدار شاہی۔

(۲) شہنشاہی درجات میں نشست۔

پس صحیح معنی میں یہ ایک پورا حکمران طبقہ تھا، اپنے حدود میں وہ تنہا حکمران، اور شہنشاہی میں مشترک حکمران تھا، اقتدار شاہی کا یہ پیلان طبیعتوں میں راسخ ہو گیا تھا اور شہنشاہی پر اس کا بہت تباہ کن اثر پڑا اسی کی وجہ سے نہایت ممتاز خاندانوں نے شہنشاہی عظمت کو پوپ کے دعاوی پر قربان، جرمانی شاہی کو کمزور و شل، اور جرمانی ممالک کو غیروں کے تابع کر دیا، ساری دنیا اور اپنے ملک کے خلاف اُن کے اس جرم کا معاوضہ

کاؤنٹ

بیرن

ان کے سیاسی حقوق

نہ تو ان کے درباروں میں اور محلوں کی شان و شوکت سے اور وہ ان صفتی کاموں کی عظمت سے ہو سکتا تھا جنہوں نے ان کے زیر سایہ نشو و نما حاصل کی۔
 مملکتی امارت نے کچھ دنوں بعد بادشاہی کی سی صورت اختیار کر لی مگر اس میں نہ تو اصلی طاقت تھی اور نہ آزمدہ کے لئے کوئی طمانیت تھی۔

بڑے بڑے مملکتی پرنسوں میں صرف چند ہی ایسے تھے جن میں کسی حد تک اپنی جداگانہ سیاسی ہمتی کے قائم رکھنے کی قابلیت تھی ورنہ زیادہ تر ان میں ایسے تھے جن کے وسائل اور جہن کی قابلیت اس کی تحمل نہیں ہو سکتی تھی شہنشاہی طبقے کی حیثیت سے انہوں نے شاذ و نا درہی اپنی طاقت جرمانی اغراض کے بڑھانے، عوام کے حقوق کے ترقی دینے اور عوام آزادی کی تائید کرنے میں صرف کی ہو گئی ان کی قوت بالعموم قومی خدمات سے بچنے اور خاص اراکین شہنشاہی کی طاقت کے بڑھانے میں صرف ہوتی تھی۔

ان میں خاندانی افرادیت کا میلان خصوصیت کے ساتھ قوی تھا مساوات نسب کی سخت شرط غیر کفو میں عقد کی ممانعت اور تمام لڑکوں کے لئے یکساں حقوق کی وسعت سے اس میلان کا اظہار ہوتا ہے۔ عقد کی ایک ہی صورت تھی کہ دونوں فریق اعلیٰ خاندان سے ہوں اور اس میں تقریباً کسی طرح کا استثنائیں تھا ایک اعلیٰ طبقے کے مرد کا ایک متوسط طبقے کی عورت سے بھی عقد کرنا بہت سے خاندانوں میں کفویت کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ اولاد کے حسب نسب کے مساوات کو گھٹا دیتا تھا اور بیٹوں کے پریشی حقوق پر اس کا اثر پڑتا تھا۔ البتہ بادشاہ یہ کر سکتا تھا کہ بیوی کا ورجہ بلند کر کے اس کے فقر کو رفع کر دے یا کوئی خاندان اپنے فقر و پسندی کی وجہ سے زیادہ بلند اصول اختیار کر لے یا کسی غیر مساوی عقد کی صورت خاص کو منظور کر لے۔

مساوات نسب کے سخت ترین اصول کے موافق ایک جرمانی خاندان بھی بالکل خالص نہ رہ سکا، لیکن بہت سی صورتوں میں غیر مساوی عقد اس علاقہ شرط کے ساتھ ہوتے تھے کہ اولاد اپنے باپ کے منصب کی وارث نہیں ہو گی۔ بیوی کے اہمیت ورجہ ہو سکتی غیر مشتبہ صورتوں میں بھی یہی نتیجہ ہوا کرتا تھا، خاص کر جبکہ بیوی شہر یا دیہات کے فرد تھے۔ طبقے یا غیر آزاد طبقے کی ہوتا ان کے بعد کے انتخابی قواعد کے موافق بادشاہ بھی اس دیکھ کر مٹا نہیں سکتا تھا۔

ان کی خود غرضی
 اور سفروانہ
 طبیعت -

کثرت
خطبات

دو آئینہ قوانین کے زمانے میں پرنس کا ونٹ اور بیرن کا خطاب صرف انھیں لوگوں کو دیا جاتا تھا جو وقتاً پرنس یا کا ونٹ کے فرائض انجام دیتے یا کسی بیرونی پر قابض ہوتے تھے مگر کچھ زمانہ گزرنے پر پرنسوں اور کا ونٹوں کے سب بیٹے اپنے باپوں کے خطبات اختیار کرنے اور انھیں اپنی اولاد میں منتقل کرنے لگے۔ یہ خالی خطبات بطور خانہ دلوں کی عزت بڑھانے کی غرض سے ہوتے تھے، مگر ان کی کثرت کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ عوام میں ان کا اعزاز گھٹ گیا اور مملکتی رئیسوں کے مقابل میں وہ کمزور ہو گئے۔ اسی طرح عقد کے اصول مساوات کی سخت پابندی نے اس سرچشمے کو خستہ کر دیا جس سے امرا میں تازگی پیدا ہوتی اور اسی کی وجہ سے قوم کو ان سے بے واسطگی ہو گئی۔

جنگ سی سالہ کے وقت سے خاندانی طبقہ امرا برابر تنزل کی طرف مائل ہوتا گیا یہاں تک کہ انیسویں صدی میں وہ بالکل ہی شکستہ ہو گیا۔ اس کی تاریخ میں فیصلہ کن امور حسب ذیل تھے:-

ردال

(۲ الف) مذہبی امارت کا دنیاوی حیثیت اختیار کر لینا (۱۷۹۷-۱۸۰۳)

اس کے لئے ان معاہدات امن سے راستہ صاف ہوا جو ۱۷۹۷ء میں بمقام کامپوفورمبو اور (۱۸۰۱ء میں) بمقام لیونویل فرانسیسی جمہوریہ اور جرمانی شہنشاہی کے درمیان طے ہوئے اور ایک فیڈیٹیٹیٹ کے ایک غیر معمولی فیصلے سے ۲۵ فروری ۱۸۰۳ء کو ان کی توثیق تکمیل ہوئی۔

رائن کے بائیں کنارے پر دنیاوی امرا کو جو نقصان اپنی اراضیات کو فرانس کو دے دینے سے پہنچا تھا اس کی تلافی کے لئے مذہبی امرا کی جرمانی جائیدادیں کامپولی کی گئیں اور اطالیہ کے امرا جو وہاں سے نکال دیے گئے تھے انھیں مذہبی جاگیروں سے ان کے لئے جرمانہ میں جاگیریں مہیا کی گئیں۔ تین مذہبی انتخاب کنندوں (الکٹروں) میں سے صرف مائستس کا انتخاب کنندہ پرنس اپنی حالت پر باقی رہا اور بعد کو وہ مذہبی رئیس اعظم کی حیثیت

۱۷۸۷ء میں صی کے اوائل میں ملے دساکن ریگیو نے ان قوانین کا ایک مجموعہ مرتب کیا جو سکسونیا میں رائج تھے اور اس کا نام سکسونی آئینہ رکھا۔ کچھ زمانے بعد ہسٹوریائی آئینہ شایع ہوا۔ انگریزی مترجم۔

سے ریگنس برگ (Regensburg) کو اور کچھ دنوں بعد وہاں سے شفین برگ (Aschaffenburg) کو تبدیل کر دیا گیا۔ وہ بھی اپنی رائے کے بائیں کنارے والی ارضیات کو چھوڑنا تھا۔ ٹسکینی کے گرینڈ ڈیوک کو زالتس برگ کی اسقف عظمیٰ اور برٹشیسکا ڈین کے صومے کی جائدادیں عطا کی گئیں۔ بوریہا کے پلینٹ کو دیورٹس برگ، بام برگ، فلرٹین برگ، آؤکس برگ، سپاؤ وغیرہ کی اسقفی جائدادیں مل گئیں۔ پروسیا کو ہلڈس ہائیم اور یادیون کی جائدادوں پر قبضہ حاصل ہو گیا۔ بیڈن کو کونسٹانتس اسٹراس برگ اسپائیٹ باؤل وغیرہ کے حصے مل گئے۔

اس میں شک نہیں کہ ان جائدادوں کا دینا وی مصروف میں لاشعشا ہی کے تاریخی حقوق کا توڑنا تھا، لیکن اس رائے عامہ کے تغیر اور آبادی کی ضروریات عامہ نے اس طریق عمل کو حق بجانب کر دیا کیونکہ رائے عامہ اب پادریوں کے اقتدار سیاسی پر عمل نہیں کر سکتی تھی اور ضروریات عامہ کو دنیاوی حکومت کی حاجت تھی۔

(ب) ۱۲ جولائی ۱۸۰۶ء کے اتحاد رائے کی رو سے بہت سے دیناوی روڈ سا اور اٹھارہ حالت حکومت میں آجانا۔

باکیروں کے دنیاوی حیثیت میں تبدیل کرنے کے قانون کی طرح یہ حکومت بھی زیادہ تر پنوکین اور فرانسیسی انقلاب کے خیالات کے سبب سے عمل میں آئی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے جرمانے کے سیاسی ارتقا کا ایک قدم آگے بڑھا دیا، جس میں چھوٹے چھوٹے امرا خارج تھے۔ بہتر محکوم شدہ روسا اور امرا اپنے ذاتی اقتدار اعلیٰ سے محروم ہو کر بڑے حکمرانوں کے تابع ہو گئے۔ تاہم انھیں زیر دست، عدالتی اختیارات اور بہت سے امتیازات اب بھی حاصل رہے۔ ان کی ریاستوں میں سے تیرہ ریاستیں بوسریا کو چھیل گئیں۔ دیورٹیم بیرگ کو فو بیڈن کو سات بیسے کو سات ویربارہ بیرگ کی گرنیڈی کو ملیں۔

کچھ زمانہ بعد باقی ماندہ روسا میں سے بھی بعض مثلاً زاتم اور ایرن برگ کے پرنس اور اریم بیرگ کا ڈیوک وغیرہ محکوم بنائے گئے یعنی دوسرے جرمانی ریاستوں کے تابع کر دیے گئے بعض ریاستیں رجعت شاہی کے زمانے تک قائم رہیں اور پنوکین کے محکوموں کی حیثیت میں آ گئیں۔

عشرہ

۶۔ اگست ۱۸۵۷ء کو جرمانی شہنشاہی کے امتناع نے شہنشاہی طبقہ کی حیثیت سے ان امرائے حقوق کا خاتمہ کر دیا۔

(ج) ۸۔ جون ۱۸۵۷ء کے جرمانی اتحاد نے ان خاندانوں کے شہنشاہی امتیازات کی بابت کو اس طرح تازہ کر دیا کہ انھیں حسبِ نسب کے اعتبار سے اُن جرمانی حکمران خاندانوں کے برابر قرار دیا جنہوں سے شاہی اقتدار حاصل کر لیا تھا، اور اُن کے لئے چند اعزازات و امتیازات کا ذمہ لیا جن میں سے ایک یہ تھا کہ انھیں اپنے ملک کے ایوانِ اعلیٰ میں نشست کا حق دیا گیا۔ جرمانی اتحاد کے اراکین میں سے اولاً اٹالیا میں پرنسی اور پچاس کا نوٹی خاندان بحیثیت حکمران خاندانوں کے تسلیم کئے گئے تھے۔ اُس وقت کے بعد سے اُن میں سے بعض خاندانوں کا خاتمہ ہو گیا ہے، اور بہت سے خاندانوں کی جا مکا دیں جاتی رہی ہیں۔

اکثر سلطنتوں میں آئینی قانون کی جدید ارتقا ان امرائے موروثی حقوق کے لئے مضر تھی۔ ان قوانین کے مقابلے میں جو قانونی مساوات اور مرکزیت انتظام پر زور دیتے تھے وہ اپنے مخصوص عدالتی اختیارات اور کوکوالی کی قوت کو زیادہ مدت تک برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔ اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد تو یہ بالکل ہی ناممکن ہو گیا۔ امرائے خود اپنے جداگانہ اختیارات امارت سے دست بردار ہو گئے۔

(د) ۱۸۵۷ء کے متفقہ قانون کے بموجب چونتیس بااختیار جرمانی ریاستیں تسلیم کی گئی تھیں مگر اس کے بعد سے سو، دست برداری اور ضبطی کے ذریعے اُن میں بہت کمی آگئی۔

۱۸۱۵ء
۱۸۴۱ء
۱۸۶۶ء

۷۔ دسمبر ۱۸۵۹ء کو ہولینڈ سوڈن، ہولینڈ اور ہولینڈ سوڈن زنگارگن خاندانوں کے پرنسوں نے رضائے خود اپنے شاہی حقوق سے شاہِ پربشیا کے حق میں دست برداری کر دی۔ شہنشاہی حقیقت کے قیاساً اور جنگ ۱۸۵۷ء کی وجہ سے ہولو کے شاہی خاندان ہتھیار کے انتہائی خاندان اور نساؤ کے ڈیو کی خاندانوں کو اپنے حقوق شاہی کو پروکھیا کے لئے چھوڑ دینا پڑا۔ جرمانی شہنشاہی میں اقتدار شاہی رکھنے والے مملکتی روسا کی موجودہ تعداد بائیس ہے۔

۸۔ انگریزی ترجمہ میں انچائٹس پرنس، انچائٹس کا ونٹ اور ایک سیرن درج ہے۔

جدید طبقہ
اعیان

لیکن اگرچہ قدیم مفہوم میں جرمانیک کے اندر شہنشاہی طبقہ امر اکا خاتمہ ہو گیا ہے پھر بھی منشا خاندانوں کا ایک اعلیٰ طبقہ اعیان اب بھی موجود ہے۔ اس میں کچھ تو پرانے شہنشاہی خاندان شامل ہیں و کچھ ایسے نئے خاندان ہیں جو پرنس ہمارک کا وٹ مولکے وغیرہ کے مانند عالی مرتبت اشخاص کے خدایات عامہ کی وجہ سے عام طبقہ اشرف سے سر بلند ہو گئے ہیں۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ان کے اعلیٰ طبقہ اعیان کا انداز حریت پسندی کے بجائے قدامت پسندی کی طرف مائل ہے گر ان کے خیالات میں خاص وسیع النظری موجود ہے اور اس لئے شخصیت کی تنگ خیالی و ذلت پسندی کے بجائے انھوں نے جرمانی شہنشاہی کے قومی ارتقا و عظمت کے متعلق کامل ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔

تیرھواں باب

(ج) جرمانی طبقہ امرا (۲) نائٹ

قدیم خاندانی امرا اور عام آزاد اشخاص کے مابین وہ لوگ جمعہ جو ”شوالی ایسے“ اصطلاح میں ”مائل فرائی“ یعنی متوسط آزاد طبقے کے نام سے موسوم کئے گئے ہیں جرمانیا کے جنوب میں فرانکی شاہی کے زمانے تک ان کا نشان ملتا ہے مگر چودھویں صدی کے قبل تک وہ امرا میں شامل نہیں سمجھے جاتے تھے اور نہ عام اشخاص سے بالائے تر انھوں نے فروتر طبقہ امرا کی حیثیت پیدا کی تھی اس طبقے کے خاص عناصر حسب ذیل تھے:-

(الف) آزاد اشخاص جو ایسے کے عہدے کی قابلیت رکھتے تھے ابتداءً یہ لوگ ہوتے تھے جو بڑی جاہلادوں کے مالک تھے یعنی جن کے پاس مین سوا ایکڑ یا اس سے زیادہ زمین ہوتی تھی اور آزاد اشخاص میں زیادہ دولت مند اور زیادہ اہم ہونے کے سبب سے وہ ایسے منتخب ہو جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ عہدہ بھی مثل اور عہدوں کے موروثی ہو گیا اور عام آزاد کسانوں کے پرستیدہ لوگ زیادہ مدت تک اپنی جاہلادوں کو محصولات سے آزاد اور بیلکٹ (گماشتہ شاہی) کے تحت اختیار میں آنے کے بجائے کاؤنٹ کے تحت اختیار میں رکھتے ہیں کا میاب ہو گئے۔ بعد کو وہ نائٹ یا اراضی دار امرا کے طبقے میں جذب ہو گئے۔

(ب) امرا کے تابعین اور طبقہ نائٹ کے امرا کے بعد وہ نائٹ جو اس منصب کا نذرانہ دار کر کے نائٹ بن جاتے تھے۔

(ج) بعد کو بہت سے نائٹ بغیر نذرانہ ادا کئے بھی اس میں داخل ہو گئے۔ ان میں سے زیادہ تر امرا کے تابعین کی اولاد میں سے تھے اور انھوں نے نائٹ کے مانند تعلیم پائی تھی لیکن مہر و ایام وہ سپاہی بھی اس میں شامل ہو گئے جنھیں شہنشاہ یا اس کے

فروتر
طبقہ امرا

قائم مقاموں نے نائٹ کے منصب پر فائز کر دیا تھا۔

(۵) امرا کے کثیر التعداد ختم و خدم جو اکثر غلامانہ یا نیم آزادانہ طبقے سے نکلے تھے اور تیرہویں صدی تک میں یہ لوگ نسبتاً نائٹ سے بالکل علیحدہ تھے۔ یہ گروہ درباری خدمتوں اور عہدوں سے اور نیز اپنی بڑی بڑی جائیدادوں اور شاندار طریق مالد و بود کی وجہ سے اس درجے تک پہنچا تھا، اولاً انھیں جاگیر و حقوق حاصل نہیں تھے مگر تدریجاً وہ نائٹ کی سطح پر پہنچ گئے اور اسی فرقے میں جذب ہو گئے۔

(۶) شہنشاہی کے بیشتر مگر مصوبوں کے کثیر شہروں کے وہ شریف خاندان جو اصلاً ایسروں کے طبقے سے یا نائٹ کے اخلاف اور شہری حکومت میں اپنے کاموں کی وجہ سے ممتاز تھے وہ بھی اس زمرے میں داخل ہو گئے۔

جس طرح بلند تر طبقے میں ہوا اسی طرح اس فرد تر طبقے میں بھی جائیداد، سپاہیانہ زندگی، اور درباری خدمات سب امتیازات اصول وراثت کے سامنے دب گئے اور اس طرح امرا کی ایک کثیر تعداد ایسی پیدا ہو گئی جس کے پاس امارت کا کوئی حق ایک چرانے خاندانی شجرے کے سوا اور کچھ نہ تھا اسی کے ساتھ ہی عام آزادانہ خواص اور کسانوں کے طبقے کے ساتھ ان کی روش میں خاص اسی وقت اور زیادہ تفریق پیدا ہو گئی جبکہ ان کا فرق و امتیاز حقیقی معنی میں ناپید ہوتا جا رہا تھا اس طرح شاندار خطابات کا شوق اچھی طرح پورا ہو گیا اس فرقے سے بیرونوں بلکہ کاتھولکوں اور پروٹیسٹنٹوں کی ایک کثیر جماعت پیدا ہوئی جنہوں نے اپنے خطابات باقاعدہ عیسے سے یا عصب سے حاصل کر لئے تھے مگر فی الواقع ان میں خطابات کی اہلیت مطلق نہ تھی۔

جرمانیا میں ملکی اور قومی عہدوں کے ذریعے سے طبقہ امرا کو کبھی وہ عروج نہیں حاصل ہوا جو اسے فرانس میں حاصل ہو گیا تھا۔ موروثی اصول کا صرف ایک استثناء علمائے قانون کے علمی طبقہ امرا کا تھا لیکن سادات کے ذریعے سے امرا کے قیام کی فرانسیسی شکل کو قبول کرنے میں جرمانیا نے بہت آمادگی دکھائی۔

شہنشاہی کے نائٹوں نے جا بجا اپنی جاگیروں میں ایک معقول حد تک آزادی حاصل کرنی تھی، مگر مجموعہ امرا کے اس فرد تر طبقے کو کسی قسم کا مطلق اقتدار شاہی یا شہنشاہی حقائق میں انھیں کوئی جگہ حاصل نہیں تھی البتہ جاگیر دارانہ قانون میں انھیں دخل حاصل تھا

اس کا موروثی
ہو جاتا ہے۔
اس میں لغو
پسندی کا آماج

ان کے ساتھ

اور امانت دہی اور اوقاف میں اُن کے بعض خاص امتیازات تھے اُن میں سے بعضوں کو پبلک (گماشتہ شاہی) اور مملکتی امرا کے عدالتی حقوق حاصل تھے جو انہیں اُن کی مخصوص جائیدادوں کے ساتھ ورثہ ملتے تھے۔

آخری امر یہ ہے کہ وہ اپنے ملک (کی مجلس) کے طبقات کے ساتھ نشست کا حق رکھتے تھے اور دربار کے طبقہ امرا میں داخل تھے۔

اس فرقے کی طاقت تیرہویں صدی کے بعد اپنے اوج کمال کو پہنچ گئی تھی اور سولہویں صدی کے وسط تک اس کی یہ حالت برقرار رہی مگر اُس کے بعد سے اقتصادی فوجی معاشرتی اور سرکاری تعلقات کے ناقابل مفاومت انقلابات کے سبب سے وہ زوال پذیر ہونے لگی اور جنگ سی سالہ اُس کی تباہی کو مکمل کر دینے میں مدد دی۔

جرمانیا میں آج امرا کا فروتر طبقہ ایک سیاسی تنظیم کی حیثیت سے شہنشاہی تنظیم کے اعلیٰ طبقہ امرا کی نسبت بہت زیادہ اینٹ بٹو گیا ہے اُس کو متزلزل کرنے والے بہت سے اسباب جمع ہو گئے تھے جاگیردارانہ بندش کمزور ہو گئی اور سلطنتوں کا جاگیردارانہ رنگ اور جاگیری نظام حکومت جاتا رہا فوجوں کی حالتوں میں انقلاب ہو گیا سرکاری عہدے موروثی نہیں رہے، شہری خاندان اعلیٰ مدارج پر ترقی کر گئے قدیم جرمانی شہنشاہی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے نیابتی تنظیمات میں ترقی ہو گئی نیز زیادہ قریبی زمانے کے کثیر الترقی اور تغیرات نے نیچے اور اوپر دونوں طرف سے عمل کر کے بہت سے امتیازات کو یکے بعد دیگرے اور کبھی مجبوری سے منسوخ کر دیا جس طرح پہلے فرانس میں ہو چکا تھا اب جرمانیا میں بھی طبقہ مسوم (یعنی عوام کا طبقہ) امیروں کے امتیازی حقوق کا روادار نہیں رہا بلکہ سرے سے اسی بات سے منکر ہو گیا کہ طبقہ امرا کے قیام کی ضرورت بھی ہے۔ امیروں کی ساری اولاد اور نسل کے لئے امتیازات کو غیر محدود و مست دے دینے سے امارت کے دعاوی اور اُن کے واقعی حالات کے مابین جن کی بنا پر وہ قائم تھے نمایاں تضاد واقع ہو گیا اور شہریوں کے اعلیٰ طبقے سے اُن کا مقابلہ کرنے کے سبب سے ان میں ابتری اور بھی بڑھ گئی اور مخالف میں اور زیادہ ہو گئی منشیہ کیت رائن کے حکمرانوں کی جو رع الارض کا مقابلہ جب شہنشاہی کے نیچے درجے کے حکمران نہ کر سکے تو شہنشاہی کے نائٹ کس شمار میں تھے۔ اُن کی جائیدادیں اُن حکمرانوں کی مملکتوں میں شامل کر لی گئیں۔ ۱۸۷۱ء کے عہد نامہ منشیہ کیت کا میلان اس جانب تھا کہ اُن کے خاندانوں کی

سولہویں صدی
تک اُس کا
زوال۔

ایک ممتاز حیثیت قائم ہے نیز حکومت کا استقلال، صوبوں کے بلقات میں نشست اسماعیلی عدالتی اختیارات اور سرپرستی کے حقوق، جنگلوں پر اقتدار اور درباروں میں ایک ممتاز حیثیت یہ سب باتیں انھیں حاصل رہیں، مگر یہ ساری پوئندکاری بیکار تھی قانون عامہ کے جدید تحصیل کے لئے امور وفاقی اختیار رعایت ایسا ہی ناقابل برداشت تھا جیسے ادائیگی محال سے بری رہنا۔

عام طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جرمانا کے امرا کا یہ فرد تر طبقہ اب قانوناً کسی قسم کے خاص حقوق نہیں رکھتا، سیاسی شہنشاہی تنظیم کی حیثیت سے اس کی ہستی فنا ہو گئی ہے۔ اپنے نام اور نشانات کے سوا، قدیمی عظمت کی جو یادگار ان کے پاس رہ گئی ہے اور جو کبھی کبھی عمل میں آجاتی ہے، اس میں اب محض قدیمت پسندی کی شان باقی رہ گئی ہے مگر اب بھی ملک کی امرا اور اُن سے کمتر درجے میں دربار کے وہ امرا جو صاحب جائیداد نہیں ہوتے وہ دونوں سوسائٹی میں ایک خاص منزلت رکھتے ہیں اور بالواسطہ حکومت کے طرز عمل اور سرکاری تقررات پر معقول اثر ڈالتے ہیں۔ اعلیٰ فوجی عہدے درباری مناصب اور سفارت کی خدمات پر لازماً نہیں بلکہ بیشتر اسی طبقے کے لوگ مقرر ہوتے ہیں۔

جرمن طبقہ امرا
بحال موجودہ

محض خطاب کی امرا ازواج اور مشاغل کی وجہ سے معاشرتی و سیاسی دونوں اعتبار سے اعلیٰ شہری طبقے میں جذب ہو گئے ہیں۔ جرمانا کے طبقہ 'ناٹ' کے حب قوم اور وطن پرستی کی تاریخ انگریزی طبقہ 'ایمان' کی تاریخ کی مثل نہیں ہے۔ صاحب یاست امرا کے ایک بڑے حصے نے زمانہ جدید کے خیالات اور اصلاحات کا ایک مدت تک سخت مقابلہ کیا اس میں بعض امرا جن کو ازمنہ و سطر کی کیفیات کے ساتھ ایک افسانہ دار الفت تھی وہ قوم کی آزادی کی بنسبت مطلق العنان شاہی کی خدمت کے لئے زیادہ آمادہ تھے یہی وجہ ہے کہ جرمانی طبقہ 'امرا' اُس قدر ہر و لعیز نہیں ہے جس قدر انگریزی طبقہ 'امرا' ہر و لعیز ہے۔ فرانس کے اُن امرا کی طرح جو خاندان بابرین کے مؤید ہیں جرمانا کے امرا کو بھی عوام اکثر شک اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تاہم انھوں نے بہت سے روشن خیال افراد اور ممتاز مجاہد وطن پیدا کئے ہیں، فوج کے بہترین رہبر انھیں میں سے نکلے ہیں اور قومی ترقی کے خطرہ عظیم کے وقت اصلاح کے لئے جدوجہد کرنا ان کے پیشتر اسی طبقہ 'امرا' میں سے ہوئے ہیں ایک تنظیم کی حیثیت سے جرمانی طبقے کی اصلاح

اس کی اصلاح

کے متعلق حال میں بہت کچھ بحث ہوئی ہے مگر اس کے بہترین موقع یعنی ۱۸۵۲ء و ۱۸۵۳ء کے درمیانی زمانے میں اس امر پر خیال نہیں کیا گیا۔ اصلاح کی کوشش سے صرف اتنا ظاہر ہو کہ اس طبقے کے اراکین پر نچان اصلاح کا کس قدر کم اثر ہے اور ان کا گروہ ہر طرح کے کامل اور موثر تغیر کے کس قدر مخالف ہے۔

جرمانی شہنشاہی کے قیام سے اب امکان پیدا ہوتا ہے کہ ایک نئی ترتیب پائی ہو تو فی جماعت اعیان پیدا ہو جائے اور اس جماعت سے قدیمی طبقہ امرا کے بے جان و بے مصرف اعضا کو بلار و رعایت خارج کر کے صرف ان کے مفید اجزاء باقی رکھے جائیں اور ان میں دوسرے ایسے اجزاء شامل کئے جائیں جن میں جدید خیالات موجود ہوں۔ ایک قوی آزاد اور تعلیم یافتہ طبقہ اعیان کا ہونا جرمانیوں کی عظیم الشان قوم کی ضروریات زندگی میں داخل ہے اور جس حالت میں کہ عمومی گروہوں کا پہلے اس قدر بھاری ہوتا جا رہا تھا ضروری لگا امر کے اوصاف پر ان کی تعداد سے زیادہ لحاظ کیا جائے اس طرح کا صاف شدہ طبقہ اعیان ایک درمیانی درجہ پیدا کرے گا اور وہ از سر تیا موروثی اصول میں غرق اور اس اصول کے غیر محدود غلبے کا تابع نہ رہے گا شخصی امارت کی عزت افزائی کی ویسی ہی ضرورت ہے جیسی نسلی امارت کی عزت افزائی کی ضرورت ہے۔ ایک امیرانہ نسل جو اپنی سوسائٹی کی بنیادوں سے جدا ہو جائے وہ ایک قوم میں شرافت کو بھی کھو بیٹھے گی۔

تعلیق ۱۔ رپل (Riehl) نے اپنی کتاب ”دو شہریوں کی معاشرت“ (Burgerliche Gesellschaft) مطبوعہ ۱۸۵۲ء میں جرمانی طبقہ اعیان کی معاشرتی اہمیت کی خوب ہی تصویر کھینچی ہے۔ طبقہ اعیان کو معاشرتی حیثیت اس وقت تک حاصل ہے اور اس کی بجائے خود ایک قدر و قیمت ہے مگر سیاسی عضو بندی کے بغیر ذمہ متقل ہو سکتی ہے اور نہ پوری طرح موثر ہو سکتی ہے معاشرتی گروہوں کی حیثیت سے یہ طبقات اولاً عضوی اور پھر حقیقتہً سیاسی طبقات کی محض بنیاد ہیں۔

تعلیق ۲۔ جرمانی صفات سلطنت (جلد ۳۰ وغیرہ ۱۰ و ۱۱ صفحہ ۵ وغیرہ) میں میں نے اپنے تجاویز اصلاح کی بنیاد اسکت اور عامل طبقہ امرا کے فرق پر قائم کی ہے اول الذکر نسب سے حاصل ہوتا ہے اور وہ محض بے جان ہے۔ ثانی الذکر شخصی تفوق سے روٹا ہوتا ہے

اور اس میں نام کے بجائے واقعیت سے کام لیتا ہے اس کے بعد مجھے افسوس کے ساتھ یہ پتا چلا کہ
 اب سے تین پشت قبل فٹیس موٹیز (Justus Moser) اپنی کتاب خیانتان ملن پرستی
 (Patriotische Phantasien) جلد ۱ ص ۲۴۸ میں اس خیال کو بیان کر چکا ہے
 مگر نتیجہ یہی ہوا کہ کسی نے اس پر توجہ نہ کی۔ دیکھو میری شائع شدہ علم السیاست (Geschichte)
 de Staatswissenschaft صفحہ ۲۲۳

چودھواں باب

(ج) شہریوں کا طبقہ

یورپ کا شہری طبقہ اگرچہ امرا کے فردِ تر طبقے کے بعد طور میں آیا مگر ازمنہ وسطیٰ ہی میں وہ اپنے ذاتی سیاسی حقوق کے اعتبار سے ایک قومی طبقہ بن گیا تھا اس کی اصل بنیاد ان آزاد اشخاص کا قدیمی طبقہ موروثی ہے جو اولاً مختلف جرمانی قبائل و اقوام میں اصلی قبیلے کی حیثیت رکھتے تھے مگر آزاد نشو و نما انہیں شہروں ہی کے حدود کے اندر اور شہروں ہی کے قانون و نظام حکومت کے تحت میں حاصل ہوئی۔

ازمنہ وسطیٰ کا دور عمومی آزادی کے لئے مطلقاً ناموافق تھا۔ مذہبی خاندانی اور اعیانی طبقات کو تسلط حاصل تھا اور یورپ میں تقریباً ہر جگہ آزاد مکان اراضی جاگیریں امیروں و شاہی ناظموں کے پنجے میں گرفتار تھے۔

دیہات میں
زرعی غلامی
کامیسان

کارل اعظم کے پُر زور قوانین نے بدترین مظالم کو تو روکا مگر خرابی کی ترقی کو بند نہ کر سکا فرانکی شاہی میں زراعت پیشہ آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ جو اپنی نسلی آزادی کی بنا پر کھرے جرمانی قبیلوں میں شامل تھا، شاہی یا کلیسائی جاگیروں پر یا مملکتی امرا کی زمینوں پر اس طرح آباد ہو گیا کہ وہ اپنی خاص مملوکہ زمین کی کاشت نہیں کرتا تھا یا مذہبی جذبات یا کسی خاص ضرورت کے باعث اپنی جائداد گرجاؤں اور خانقاہوں کو ہریتہ دیدیتا اور پھر مستاجرانہ انہیں واپس لیتا تھا اس طرح یہ لوگ جاگیرداروں کے متوسلوں میں داخل ہو گئے پس ان کی حیثیت زرعی غلاموں کی سی ہو گئی اور وہ اپنے بہت سے آزادانہ سیاسی حقوق سے محروم ہو گئے۔ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد چھوٹی چھوٹی جاگیریں جو آزاد مزارعین کی ملکیت رہ گئی تھیں وہ بھی شاہی ناظموں کے عدالتی اقتدار اور حکمران طبقہ اعیان کے ہاید گئے ہوئے بار سے نہ بچ سکیں۔ فوجی نظام میں جب قدیم اصول کے بجائے جس کے بموجب نائٹ اور جاگیردار فوجی خدمات انجام دیتے تھے اجیر سپاہیوں کا طریقہ رائج ہوا تو آزاد و کسان اپنی جنگی قابلیت اور سپاہیانہ

اعزاز سے محروم ہو گئے اُن پر یہ صورت اور سہیلے سے محصولات عائد کئے جاتے تھے اور اکثر ان محصولات کی کوئی وجہ موجب بھی نہیں ہوتی تھی۔ عدالتوں میں اور اُس سے بھی زیادہ ملک کی سیاسی جماعتوں میں اُن کی وہ حیثیت باقی نہ رہی جو قدیم جرمانی آئین حکومت نے اُن کے لئے محفوظ کر دی تھی۔ آزاد مالکان اراضی بھی محصلین کے حلقہ اثر کے اندر داخل ہو جانے کے سبب سے بتدریج غلام کاشتکاروں کے درجے پر اتر آئے اور دونوں پرکسان کے عام لفظ کا اطلاق یکساں طور پر ہونے لگا۔

اس طرح جو طبقہ پہلے موروثی تھا وہ اب ایک پیشہ ور طبقہ بن گیا اور کسانوں کے سیاسی حقوق بہت بڑی حد تک گھٹا دیئے گئے۔ صرف معدودے چند آزاد کسان جن میں زیادہ تر بڑے بڑے مالکان اراضی تھے ترقی کر کے نائٹ کے نئے طبقے میں شامل ہو گئے تھے صرف مستثنیات کے طور پر، موافق حالات میں آزاد اشخاص کی بعض منفرد جماعتوں کو اس قدر کامیابی ہوئی کہ وہ اپنی مالکانہ آزادی اور اپنے سیاسی امتیازات کو ازمنہ وسطیٰ کے آنے والے خطرات سے محفوظ رکھ سکیں۔ اس کی ایک بہت ہی نمایاں مثال انشوالنس کی دیہاتی جماعت ہے جس سے سو کیڑر لینڈ کی آزادی میں ایک حرکت پیدا ہو گئی اور اسی لئے وہ اشتوتسی آزادی کے نام سے موسوم ہوئی۔

اس طرح دیہاتوں میں تو قدیمی آزادی دبا دی گئی مگر اس اثنا میں شہر ایک نئی بلدی آزادی کا مسکن بن گئے تھے۔ آزادی و شہریت کے موجب وہ خیال کے نشوونما پر شہروں کی تاریخ نے ایک قطعی اثر ڈالا ہے۔ قومی حیثیت حاصل کرنے کے قبل یہ دونوں خیال بلدی ہی حیثیت رکھتے تھے شہر کے اندر شہریت کا خیال پیدا کرنے کے لئے صدیاں صرف ہو گئیں اور اس کے بعد کئی صدیاں درکار تھیں کہ یہ خیال سلطنت کی وسیع شہریت کی شکل اختیار کرے۔

اپنے تنوع اور تفرق کی وجہ سے (جو رومانی اور اُس سے بھی زیادہ میوٹنی کے اجزاء امتزاج کا نتیجہ تھا) اولاً صاحب امتیاز طبقات شہروں کی زندگی پر اثر انداز ہوئے جہاں ایک تنگ حاکم کے اندر زیادہ آبادی واقع ہوئی تھی وہاں پر یہ تنوع زیادہ نمایاں تھا۔

اکثر شہر پناہ کی دیواروں کے حلقے کے اندر ذیل کی مختلف کیفیات آبادیاں پائی جاتی تھیں۔

شہروں کے
اندرونی

شہروں
کے باہر

(۱) مذہبی پرفیس اپنی درباری شان و دراپنے خاص شاہی حقوق کے ساتھ اور انھیں کے ساتھ اساقف اور خانقاہوں کے روسا۔

(۲) ہر حالت اور ہر درجے کے ادنیٰ طبقے والے اہل کلیسا۔

(۳) اعلیٰ طبقے کے دنیاوی امرا مثلاً شاہی کاؤنٹ یا اعلیٰ بیرن۔ اطالیا کے سزار جو زیادہ تر دیہاتوں میں رہتے تھے اور اگر ان کے خاص محل شہروں میں نہیں ہوتے تھے تو محض عارضی طور پر وہاں قیام کرتے تھے۔

(۴) نائکٹوں کے خاندان جن کی جاگیریں اکثر دیہاتوں میں ہوتی تھیں۔

(۵) مذہبی اور دنیاوی امرا کے حشم و خدم۔

(۶) آزاد متوسطین۔

(الف) اطالیا اور فرانس کے رومی شہروں میں زیادہ تر یہ لوگ رومی سپاہیوں کی اولاد سے تھے جو دس سالہ شخصوں پر سردار ہوتے تھے اور شہر کے اندر جائیداد رکھتے تھے۔

یا (ب) جرمانی آزاد اشخاص جو شہر کے اندر جو اپنی زمین پر آباد اور اپنی جائیداد اور سیاسی وقعت کے اعتبار سے ذی امتیاز تھے۔

(۷) معمولی آزاد اشخاص جو ہنوز شہر کے اندر زمین پر قابض تھے۔

(۸) وہ اشخاص جو شخصی حیثیت سے تو آزاد تھے مگر شہر کے اندر امرا کی نسبنوں پر رہتے تھے اور اس لئے جاگیر داری قوانین مثلاً قواعد خاتقاہ وغیرہ کے تابع تھے۔

(۹) مختلف امرا کے ادنیٰ خدام کا جم غفیر۔ ان کی حالتیں نہایت مختلف تھیں

(الف) بعض حیثیت اہل حرفہ کے آزاد اور زندگی بسر کرتے تھے۔

(ب) بعض خدمتگاروں ملازموں وغیرہ کی حیثیت سے کسی خاندان کے تابع ہوتے تھے۔

نظام ازمنہ و سطل کے ان عناصر کے ایک شہر کے اندر مجتمع ہو جانے کا لازمی نتیجہ

یہ ہوا کہ کچھ زمانہ گزرنے پر ان کی ایک دوسرے سے علیحدگی رفع ہو گئی اور ایک نیا

اجتماع پیدا ہو گیا معاشرت اغراض اور حوادث زمانہ نیز فریقانہ جدوجہد کے اتحاد نے

ان میں زیادہ قریبی ربط پیدا کر دیا اور ایسے نئے اختلافات برپا کر دیے جو پیدائشی

شہری طبقہ کی ترقی۔

اصول سے متین نہیں ہوتے تھے۔

شہریت کے آئینی نظام کے ساتھ ساتھ نئی انجمنوں اور مجلسوں کا ظہور ہوا جن میں مختلف طبقات ایک نئے اتحاد کے دائرے میں داخل ہو گئے مختلف مقامات و اوقات کے حالات سے طریق عمل میں اختلاف پیدا ہوا مگر اصل وہ طریق عمل ہر جگہ اور ہر وقت میں ایک ہی رہا۔ اس ارتقا میں زیادہ اہم مدایح حسب ذیل تھے۔

لمبارڈی وغیرہ
میں کونسلوں
(مجلس کا
عروج۔

(۱) کسی شہر میں مدنیت کے حقوق رکھنے والے شہریوں کی آبادی کا بڑا اور اہم حصہ نائٹوں اور کارکنوں اور آزاد و متوسطین کے وہ ممتاز خاندان تھے جنہوں نے مجالس (کونسلوں) کے مشیروں (یا کارکنوں) کی حیثیت سے یہ کوشش کی کہ خود ان کی آزادانہ حالت برقرار رہے شہر کے قدیم امارت کے حقوق امارت کو انہوں نے محدود کر دیا۔ پھر عام آزاد اشخاص کے شمول سے یہ مجتہا اور بھی وسیع ہو گیا، اور قدیم اعیان یا خاندانوں اور آزاد شہریوں کے نوخیز اور سبقت جو طبقات میں نئی مخالفتیں پیدا ہو گئیں چنانچہ گیارھویں صدی کے وسط کے قریب ملان میں قانون دانوں، طبیبوں کا رول ہتاجروں کا ایک سیاسی گروہ موٹا (Motta) کے نام سے پیدا ہو گیا۔ اس میں نائٹ خاندانوں کے وہ لوگ بھی شامل ہو گئے جن کی معاشرت نائٹوں کے مانند نہیں رہی تھی، لہذا ان لوگوں نے عوام کے نام سے امر کی مخالفت کی اور بارہویں صدی میں ان کے پہلو بہ پہلو مجلس عظمیٰ میں جگہ حاصل کر لی اور اس طرح شہر کی مجلس عام کی بنا پڑ گئی۔

قضلوں کی صورت میں شہری حکام کا ظہور میں آنا شہر کے اعلیٰ طبقات کے باہم مخلوط ہونے کا پہلا قدم تھا۔ اس کے بعد مجلس عظمیٰ کا صورت پذیر ہونا اور کمیوں کے نام کا نکلنا ایک لازمی امر تھا۔ سب سے آخر میں گلد (مجلس) ماد باہمی (رو نما ہونی اور اس طرح بتدریج قومی وحدت والا اثر سوسائٹیاں (جامعیتیں) شہریت کے زیادہ وسیع حلقے میں داخل کر لی گئیں۔

۱۔ دیکھو سوتھی کی کتاب ”رومی قانون کی تاریخ از سنہ وسطیٰ میں“ جلد ۲ صفحہ ۱۰۸ وغیرہ؛
لیو کی ”تاریخ ایتالیا“ جلد ۱ صفحہ ۳۹۹؛ سہگل کی کتاب ”شہروں کا آئین ایتالیا میں“ جلد ۲۔
صفحہ ۲۱۳ وغیرہ۔

بڑترقی سب سے پہلے لوم بارڈی میں نظر آئی جہاں معاشرت اور آزادی کے متحدہ کرنے کا بیڑی میلان روم کی قدیم یادوں کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ یہاں سے بارہویں اور تیرھویں صدی میں یہ بڑیک جنوبی فرانس کے شہروں میں پھیلی۔ یہاں اسے قدیمی آزاد بلدیہ شہریت سے جس کی نمائندگی منتخب نااہلین کرتے تھے (اور جو لوم بارڈی کے یہ نسبت فرانس میں زیادہ بہت حالت میں آگئی تھی) خاص تاثر حاصل ہو گئی۔

(۲) اس سے زیادہ قطعی جمہوری خصوصیت اور مجتمعہ شکل ان کیونوں کے اندر شہریوں کے ان شہر کیات میں پائی جاتی ہے جو اُس زمانے میں شمالی فرانس میں شہروں کے امرا کے ساتھ فونریز جنگ میں مشغول تھیں۔

یہاں حقوق شہریت کے نئے عناصر بالتحقیص گھٹ کی صورت میں نظر آتے ہیں کیونکہ حقوق شہریت کا راستہ اسی گھٹ میں داخل ہونے سے مل سکتا تھا جس کے ساتھ قواعد کی اطاعت کا حلف بھی اٹھانا پڑتا تھا۔ اس طرح برقی آزادی اور مدنی حقوق محض پیدا کئے یا ملکیت اراضی سے علیحدہ ہو گئے تھے اور اس کے بجائے ایک مجتمع اقتدار پر زور دیا جاتا تھا۔ جاگیر دارانہ اصول اور قدیمی بیڑی امتیاز نے ایک جدید و شخصی اصول کے لئے جگہ خالی کر دی تھی۔

مزید برآں مجالس شہری کا نظام شہر کی آبادی کے طبقہ اسفل میں آزادی و حقوق شہریت کو وسعت دینے کے لئے زیادہ مفید تھا۔ اہل حرفہ کا گروہ عظیم جو حالت غلامی سے آزاد ہو گیا تھا اس سوسائٹی میں داخل ہو گیا اور یہ اصول قائم ہو گیا کہ جو صرف (زرعی غلام) شہر میں ایک برس اور ایک دن رہ جائے اور اُس کا مالک اس کا دعویٰ نہ ہو، وہ اس کی مستجوبی جائے وہ آزاد ہو جائے گا۔ تمام یورپ میں شہری قانون اس اہم اصول کا شاہد ہے کہ شہر کی ہوا انسان کو آزاد کر دیتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شہروں کے اندر عمومیت کے مبالغے اور حد سے تجاوز کرنے کے باعث سے اکثر محبت فقہ کی پیدا ہو گئی۔ جن بادشاہوں نے اپنے امرا کی ملکیت سے شہروں کے آزاد کرنے میں مدد دی تھی انھوں نے اب شہروں کی حکومت اپنے عمال کے توسط سے خود اپنے ہاتھ میں لے لینے کا موقع نکالا اور اُسے اور سخت کر دیا۔ اس طرح چودھویں صدی کے اوائل میں لوم بارڈی کے بہت سے شہروں کی حکومت خود اختیاری جاتی رہی اور

فرانس کے
کیونوں

گھٹ و فلیس
امداد باہمی

وہ خاص خاص حکمرانوں کے قبضے میں آ گئے۔ تیرہویں صدی میں عوام کے نئے شہری گروہ نے (جس میں زیادہ تر شہری آبادی کے ادنیٰ افراد شامل تھے) اپنے جمہوری سرداروں کے تحت میں حصول حقوق کے لئے شہری امرا سے جنگ شروع کر دی تھی اور اکثر انھیں بے بس کر کے شہر سے خارج کر دیا تھا۔

فرانس میں ان شہروں کے پہلو پہلو جن میں فصلی اور کمیونی نظام حکومت رائج تھا بہت سے شہر ایسے تھے جو امرا کے تحت میں رہ گئے تھے اور ان پر انھیں امرا کے عامل حکمران تھے اور اکثر بہت ہی خود رانی سے حکومت کرتے تھے تاہم ان شہروں میں بھی غلامی کے بوجھ برطرف یا بہت ہلکے کر دیئے گئے تھے اور اہل شہر کی ایک آزاد جماعت ہونے کا خیال ترقی کر گیا تھا اور ہر شخص شہر میں سکونت اختیار کرنے اور شاید شہری حقوق کے شاہی عطیے کے ذریعے سے بھی اس جماعت میں داخل ہو سکتا تھا۔

(۳) جرمانیا میں بھی لفظ ہیوگر (شہری) کے مختلف معنی اس خیال کے مختلف مبالغہ ارتقا کو ظاہر کرتے ہیں۔

جیسا کہ اطالیا اور فرانس میں قبل ازیں ہو چکا تھا، جرمانیا میں بھی تیرہویں صدی تک یہ دستور تھا کہ نائٹ اور شہری میں فرق کیا جاتا تھا۔ آخر ان کے وہ آزاد و انتخاص مراد ہوتے تھے جو شہری سوسائٹی سے تعلق رکھتے تھے اور شہر کی مجلس کے لئے منتخب ہو سکتے تھے مگر وہ نائٹوں کی سی زندگی نہیں بسر کرتے تھے اس جماعت شہری کی بنا شہر کے وہ آزاد مکانات تھے جو شہر کے ایسے سرداروں کی مجلس ہونے میں بالعموم ان خاندانوں کے شریک تھے جن کا نسب نائٹوں سے ملتا تھا یہ دو جماعتیں یعنی نائٹ اور شہری مجموعہ کامل الحقوق شہری یا مثل اہل خاندان کے سمجھے جاتے تھے اور اہل حرفہ اور شہر کے دوسرے باشندوں سے مغائر تھے۔

تیرہویں صدی حفاظت تجارت کے لئے بڑے بڑے شہری تنققات کے قیام کا زمانہ تھا معلوم ہوتا ہے کہ اسی صدی کے وسط کے بعد بہت سے جرمانی شہروں میں تجارت ملکیت اراضی سے قطع نظر اپنی ذاتی آزادی کی بنا پر شہری تسلیم کر لئے گئے تھے اور شہر کی مجلس میں انھیں حق نیابت حاصل ہو گیا تھا۔

اس طرح ایک حد تک شہریت کا خیال اراضی کے تعلق سے علحدہ ہو گیا تھا اور

جرمانیا میں
حق شہریت

آزاد مکانات

تجار

(الف) پادریوں اور امیروں کے مانند یہ کوئی امتیازی فرقہ نہیں ہے بلکہ ایک قومی طبقہ ہے۔ اپنے شہری تعلق اپنی تعلیم و تربیت اپنی آزادی اور اپنے قانون کے سبب سے یہ طبقہ کسانوں سے ممتاز ہے۔

(ب) بادجو و خاندانوں کی تاریخی مخالفتوں کے اور نسل در نسل کے اختلافات کے شہری جماعت اپنے تئیں ایک متحد و یک رنگ طبقہ سمجھتی ہے۔ یہ طبقہ شہری آزادی کا اور قانون کی نظر میں سب کی مساوات کا محافظ سمجھا جاتا ہے، وہ شہر کے ایک ہی شہری قانون کے تحت میں زندگی بسر کرتا ہے اور نظام حکومت کے لئے آزادانہ نظام کو مرتب رکھتا ہے اہل شہر اپنے شہر کے فرزند اور اس کا عام زندگی کے شریک کار ہیں۔ شہر کی سیاسی اور معاشرتی زندگی ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔

(ج) لیکن اس سے زیادہ یہ کہ ازمنہ وسطیٰ میں شہری طبقے نے ایک ایسی سیاسی وقعت اور اہمیت حاصل کر لی تھی جو کسی ایک منفرد شہر کے حدود سے متجاوز تھی اور جس نے متعدد شہروں کے باشندوں کو ایک متحدہ طبقے میں گھیر لیا تھا اس نئی ترقی کا اظہار ازمنہ وسطیٰ کے صوبجاتی اور شہنشاہی طبقات کی نظم و ترتیب سے ہوتا ہے تیرھویں صدی کے وسط سے انگریزی شہروں کے باشندوں نے اولاً انٹوں سے الگ اور بعد ازاں ان کے ساتھ شریک ہو کر قومی پارلیمنٹ میں نمائندگی کا حق حاصل کر لیا تھا فرانس میں اہل شہر ہی کے قائم مقاموں سے طبقہ سوم بنتا تھا۔ اولاً وہ وقتاً فوقتاً علیحدہ طلب کیا جاتا تھا مگر چودھویں صدی کے آغاز سے طبقات عامہ میں وہ بھی شامل کر دیا گیا۔

جرمانیا میں شہنشاہی ڈائری کے اندر شہروں کی نجیب نشستیں (خاندان ہائیک) شہنشاہ روڈولف تخت نشین ہونے کے بعد سے ایک حد تک شہری طبقے کی قائم مقام ہو گئی تھیں اور سوبے کی ڈائریوں (کونسلوں) میں امیروں اور پادریوں کے پہلو پہ پہلو طبقہ سوم کی حیثیت سے شہروں کو نشست دے دی گئی تھی اور وہی کا حق حاصل ہو گیا تھا۔

(د) انجام کار شہروں کے اس طبقے میں شہریت کے نئے خیالات قائم ہو گئے اور وہ تمام قوم کے وسیع حدود میں پھیل گئے اور شہر کی شہریت سے سلطنت کی شہریت کا جدید خیال پیدا ہوا۔

سلطنت

کی شہریت

پندرھواں باب

(د) کسانوں کا طبقہ

اگر ازمندہ سطحی میں آزاد اشخاص کا قدیمی طبقہ نقصان میں رہا تو غلامانہ طبقہ فائدے میں رہا۔ آزاد اشخاص کی بستی اور غلامانہ زرعی کی بلندی کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طبقے باہم سم غلط ملط ہونے لگے زرعی غلاموں کے طبقے کا ایک چھوٹا حصہ شاہی خدمات کی انجام دہی کی وجہ سے آزاد شخصوں سے بلند ہو گیا، اور فروتر طبقہ امر کا جزو بن گیا، اور باری خدمت کی وجہ سے انھیں روسا سے زیادہ قریبی تعلق پیدا ہو گیا، اور باری تربیت و آداب کے حامل کر نیکا موقع ملا۔ اس قابلیت کے ساتھ ان کی زرخیز جائیدادوں نے ملکہ انھیں ایک وقت میں طبقہ اعلیٰ کے امر کا ہپیہ بنا دیا۔

طبقہ زرعی
(غلامانہ زرعی)
کی ترقی

ان کا ایک دوسرا اور بڑا حصہ شہروں میں آباد ہو گیا جہاں تجارت کے ذریعے سے معمول ہو کر آفتوں نے شخصی اور شہری آزادی حاصل کر لی اٹالیا کے شہروں کو یہ فخر حاصل ہے کہ انھیں نے سب سے پہلے اپنے سرف غلاموں کو آزاد کیا۔ شہروں جو ہمیشہ سے آزادی کا مقدمہ ہمیشہ رہا ہے اس نے اپنے ناظم اعلیٰ (Podesta) (Accursius de Sorrecina) کی تجویز کے موافق یہ فیاضی دکھائی کہ اپنے حدود کے

آزادی

کل سرف غلاموں کی آزادی خریدی اور آئندہ کے لئے اس طریق غلامی کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ شہری زندگی کی ترقی سے دستکاروں کے طبقے کے بھی عروج حاصل کر لیا، اب تک لوگ تمام یورپ اور بالخصوص اس کے یونانی حصص میں اونی اور بے پرستے اور اس طبقے میں زیادہ تر زرعی غلام داخل تھے۔ آزاد شہریت نے اول اول اٹالیا میں بروبا ر پیدا کئے اور یہیں سے اہل حرفہ کی تعلیمی انجمنیں اسکول کے نام سے فرانس پہنچیں جہاں یونانی اثر کے تحت میں

فرانس اور جرمنیا
میں گلدہ دینی
انکے جسرہ کی
انجمنیں

انہوں نے منسٹیپا (Meniteria) اور گلڈ کی مشخصہ شکل اختیار کی اور بالآخر حیرانیا میں بھی رائج ہو گئیں ان کا اثر یہ ہوا کہ ان کے اراکین کے حقوق قومی ہو گئے (اور ان کے مالکوں کا اعزاز بڑھ گیا۔ دستکار طبقے کی منظم تعلیم اور ان کا تدریجی ارتقاء۔ فنی مہارت اور دولت میں ان کی ترقی، اپنی مجلس یا جماعت کے علم کے نیچے ہتھیار لگانے کا نیا استحقاق۔ شہر کے مفاد اور اس کی مرفحہ حالی سے ان کا مستقل تعلق ان تمام امور نے دستکاروں میں اپنی اہمیت اور اپنے حقوق کا احساس پیدا کر دیا، ان میں بہت سے سرفہ، غلام تھے مگر مکاتبت یا غلامی سے انہوں نے آزادی حاصل کرنی تھی اب یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ اپنے شہریت کے حقوق سے وہ محروم رکھے جاسکتے۔

دیہات میں زرعی
غلامی

دیہات میں آزادی کا راستہ زیادہ دشوار گزار تھا، بہت سی جگہوں میں یہ اصول تھا کہ "تو غلام بنا دیتی ہے، زرعی غلامیوں کا بالکل آزاد ہو جانا مستحیات سے تھا، گمراہتہ آہستہ آہستہ انہوں نے عام طور پر ایک طرح کی شخصی آزادی حاصل کرنی، یہ آزادی بھی اگرچہ بہت گراں بار اور سیاسی حیثیت سے بے اثر تھی مگر حفاظت قانونی سے معصون اور برابر و سمیت کی طرف مائل تھی۔ انہوں نے آزاد کسانوں سے ملکر مساویانہ حقوق کا ایک پیشہ ور طبقہ بنالیا۔

آزادی

زرعی غلامی اور آزادی کے تفصیلی تعلقات، اور ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہونے کے حالات بہت ہی مختلف تھے۔ غلامی کی منسوخی کے مانند زرعی غلامیوں کا ترقی کرنا بھی بہت کچھ کلیسا کے اثر کا زیر بار احسان ہے۔ جہاں گرجے یا خانقاہیں تھیں کسی علاقے کی مالک تھیں وہاں انہوں نے اپنے زرعی غلاموں کو زمین حقوق اور مستحیات دیکر بالعموم ایک راستہ کھول دیا، اور اس طرح اماکن مذہبی کے توالیع آزاد کسانوں کے درجے پر پہنچنے میں سب سے مقدم تھے۔ اس کے بعد بادشاہوں نے اس مثال کی تقلید کی۔ شارلین کے سلسلے کے بادشاہوں نے سکیلینون کو آزادی عطا کی، اور لوئس دہم نے ۱۷۷۶ء میں شاہی غلاموں کے زرعی غلاموں کو آزادی عطا کر کے یہ اعلان کیا کہ اس نے شاہ فرانس کی حیثیت سے اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔

کسانوں کے حقوق
ذاتی حاصل
کرے۔

جس میلان زمانہ نے بڑے بڑے بیرونوں کے حقوق شاہانہ کو موروٹی جاگیر میں تبدیل کر کے انھیں اراضی سے متعلق کر دیا تھا اور جس نے ماتحت زمینداروں کو اپنے آقاؤں کے

مقابلہ میں محفوظ مستقل حقوق رکھتے، اسی میدان زمانہ نے علاقوں کے غلامان زرعی کے لئے ان کی مفوضہ اراضی کے حقوق تسلیم کر دیئے اور علاقہ جاتی قانون کے تحت ان میں توریث کا طریقہ جاری کر دیا اور خاص قسم کا موروثی آئین و لٹھاف کا رواج قائم کیا جس میں کسان اپنے سرگروہوں (Meyer) کی سرکردگی میں شریک ہوتے تھے۔

نہایت

فرانسیسی سرف (غلامان زرعی اور ولین) وابستہ اراضی کسان کی حالت جیسا کہ خود ان کے نام سے ظاہر ہے جرمانی ہون لوتے (Hoffeute) اور گرند ہونڈن کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی مگر مونسٹرا لڈر کو ترقی بعد میں حاصل ہوئی اور فرانس کے صاحب حقوق کسانوں کے اعلیٰ طبقے یعنی (Coutumiers) اور (Roturiers) اور (Hospites) Ostes آزاد و اشخاص کی حیثیت کے زیادہ قریب پہنچ گئے۔

انگلستان

برخلاف اس کے انگلستان میں کالی و بار (۱۳۸۷ء) کے بعد زرعی غلاموں کی آبادی کو شخصی آزادی حاصل ہو گئی مگر زمین ان کے پاس نہیں تھی اور اس طرح آزاد کسانوں کے بجائے آزاد مزدوروں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا۔

جرمانیا کے کسانوں کی جگہ

کسانوں کی یہ تبدیلی آزادی بالعموم شخصی قانون اجتماعی و عدالتی نظام تک محدود تھی۔ آزاد کسان جو بیلٹ (مخلصین) موروثی اقتدار کے تابع ہو گئے تھے اور جن کی اراضیاں ان کے آقا کے قلع کے لئے بہت سے مستقل حصوں سے زیرِ باغ تھیں انھیں کے ساتھ ملکر ان سب لوگوں سے نام نہاد طبقہ کسان بننا تھا چند ملکوں کے سوا کسی جگہ بھی کسانوں کا گروہ پورے معنی میں سیاسی طبقہ نہیں بنا تھا، یہ مستثنیٰ ممالک اسکینڈینیویا، نروژ، سویڈر لینڈ وغیرہ تھے۔ اسکینڈینیویا میں خوش قسمتی سے ان کی قدیم عام آزادی اور قدیم نظام حکومت قائم رہ گیا تھا، نروژ میں دالیان ملک انھیں صوبہ جاتی مجالس شوریٰ میں طلب کرتے تھے، سویڈر لینڈ میں انھوں نے آزاد حراتی جمہوریتیں قائم کر لی تھیں۔

اپنے آقاؤں کے ہماری جوئے کو اتار پھینکنے کے لئے سولہویں صدی ہائی کسانوں کی عظیم جنگ جرمانی کا شکاروں کی سخت مگر بیکار کوشش تھی۔ جب ہم اس زمانے میں ان بارہ وفات کو بڑھتے ہیں جن میں کاشتکاروں نے اپنے مطالبات کا خلاصہ درج کیا تھا اور اس نہایت شدید غصے کا جہاں کرتے ہیں جو اس مطالبے سے اس وقت کے

تعلیم یافتہ گردہوں اور حکمران اعیان میں پیدا ہو گیا تھا، تو ہمیں یہ دیکھ کر گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ ہماری اس صدی میں بلا کسی طرح کی تشکیش کے کاشتکاروں کو انسانی اور شہری حقوق کی حیثیت سے اس سے زیادہ حاصل ہو گیا ہے جس کے طلب کرنے کی اس زمانے میں انھوں نے جرأت بھی نہیں کی تھی۔

مگر آہستہ ہی آہستہ لوگ اس خیال کے عادی ہوئے کہ کسان محض ایک ایسا محکوم گروہ نہیں ہے جو صرف فوج کی بھرتی ہی کے لائق سمجھا جائے اور دوسروں کی مرضی سے اس پر محصولی عائد کر دیا جائے۔ انگریزی آئین حکومت نے ان عوام (Yeomen) کو جو اپنی اراضی سے معمولی آمدنی لے لکھتے ہیں، دارالعوام کے لئے صوبے کے انتخاب میں حصہ دیکر ایک بار پھر اپنی عام آزادی کی قدر شناسی کو ظاہر کر دیا۔

سیاسی حقوق

مگر بہت ہی قوی زمانے تک یہ نہ ہو سکا کہ پوری شخصی آزادی اور سیاسی حقوق بالعموم تمام طبقات کے لئے وسیع کر دیے جاتے۔ اٹھارہویں صدی کے فلسفے نے انسان کے فطری حقوق کے خیال کو تسلیم کر کے اس ترقی عظیم میں ذہنی انگ پیداکر دی جرمانیا میں پروٹیا کے شاہ فریڈرک اول نے سترہویں شاہی جامدادوں میں زرعی غلامی کے طریقے کو برطرف کر کے اس معاملہ میں تقدم حاصل کیا، فریڈرک ثانی کے فرامین نے دوسرے زرعی غلاموں کی خلاصی کی بھی تائید کی اور اسے اور وسیع کیا اور شاہ چارلز ثانی نے سترہویں جرمانیا اور آسٹریا کے لئے اور سترہویں کارل فریڈرک نے باڈن (Baden) کے لئے اس مثال کی تقلید کی۔ لیکن اس دوران میں بیشتر جرمانی سلطنتیں اس کے اجرا سے رکھیں یہاں تک کہ ہر اگست ۱۷۹۱ء کے پرجوش اعلان اور فرانسیسی قومی مجلس کے اعلان "حقوق انسان" نے تمام مہذب یورپ کو چونکا دیا۔ زرعی غلامان تو ایچ کی آزادی نے زمانے کے فرض عام اور غیر قابل رد مطالبے کے طور پر تسلیم کی گئی اور مغربی یورپ میں انیسویں صدی کے نصف اول میں اور مشرقی یورپ میں اس کے بعد سے اس پر عملی کارروائی ہوئی اسی زمانے میں بلکہ اس کے بعد بھی سیاسی شہری حقوق شہروں کے باشندوں کے ماتہ کساتوں کے لئے بھی وسیع کئے گئے۔

سولھواں باب

(۵) غلامی اور اس کی فسوخی

غلام جس قوم یا خاندان کا تابع ہوتا ہے اس میں وہ ایک اجنبی کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے زمانہ قدیم میں غلامی کو جیسی کچھ وسعت حاصل تھی وہ ظاہر ہے مگر مجھے کسی ایسی قوم کا علم نہیں ہے جس نے غلامی کو ایک قومی طبقہ کی حیثیت دی ہو اور یہی ایک بات اس امر کے ثابت کرنے کو کافی ہے کہ فطرت کے لوازم میں سے نہیں ہے۔

ارسطو نے "پالیٹکس" (سیاسیات کتاب اول باب ۴-۶) میں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ بعض انسان فطرتاً آقا اور بعض فطرتاً غلام ہیں بڑی موثر گائیاں کی ہیں۔ مگر اس کے استدلال جہان تک صحیح ہیں ان سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ ایک خادم طبقے کی ضرورت ہے نہ کہ ایک ایسے مملوک طبقے کی جو حقوق سے محروم ہو اس میں شک نہیں کہ کوئی اعلیٰ قیامت کا شخص اگر اپنا کام پورا کرنا چاہتا ہے تو بالفاظ ارسطو اسے "جاندار اور زار" کی ضرورت ہوتی ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو فطرتاً جسمانی محنت کے لئے خصوصیت کے ساتھ موزوں ہیں اور ان کے فرائض کی انجام دہی کے لئے تمکدات جبری کی ضرورت ہے۔ اس سے صرف اسی قدر ثابت ہوتا ہے کہ ایک طرح کی باہمی احتیاج ہے جو آقا و خادم کارخانہ دار و کارگیر، کاشتکار و مزدور، اہل صنعت و دستکار کو باہم متحد کرتی ہے، مگر یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ مستخدم کا تعلق خادم سے وہ ہو جو باوجود نوروں کا ان کے بالکوں سے ہوتا ہے نہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ کام کرنے والے اپنی ذاتی آزادی اور انسانی شخصیت سے دست بردار ہو جائیں اور کسی خاص آقا کے لئے اشیائے محض اور اور زار محض ہو جائیں یعنی اس کے غلام بن جائیں انسان فطرتاً شخص ہے نہ شے نہیں ہو سکتا

غلامی کی نسبت ارسطو کی رائے۔

یعنی غلام نہیں بن سکتا، رومی مقنین نے اپنے نظریہ قانون میں غلاموں کو نئے ملوک قرار دینے کا خیال اس سختی سے قائم کیا ہے کہ زائد قدم تک میں وہ انگشت نہا ہو گیا تھا، انھوں نے غلاموں کو حقوق سے معراہستیاں یا محض اشتیاق قرار دیے ہیں، مگر انھوں نے بھی اس امر کو محسوس کیا تھا کہ غلامی فطرت کے خلاف ہے اور محض قوموں کے عام رواج سے پیدا ہو گئی ہے اس لئے انھوں نے یہ حکم لگا دیا تھا کہ غلام کو آزاد کرنا اس کے فطری حق کا اسے واپس دیتا ہے۔ مگر باوجود اس علم کے رومی قوانین ہزار برس سے زائد تک سخت تسلسل کے ساتھ غلاموں پر اشیائے ملوکہ کا اصول عائد کرتے رہے غلاموں پر مالکوں کے حد سے بڑھے ہوئے یا بیوج تشدد کے خلاف جو شہنشاہی احکام صادر ہوتے تھے وہ بدترین ستمگاریوں کے روکنے میں اتنا ہی اثر رکھتے تھے جتنا اس زمانے میں جانوروں پر ظلم کرنے کے خلاف قوانین کا اثر ہے مگر اس سے اصول پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا، اور غلام مثل سابق کے نہ صرف کسی قسم کی ملکیت نہیں رکھتے تھے بلکہ مٹا کھٹ اور رشتہ داری کے حق سے بھی محروم تھے۔

جرمانی قانون

جرمانی قانون نے بھی اسے پوری صفائی کے ساتھ تسلیم کیا تھا جیسا کہ آئینہ سکسویں کے مصنف کے پُر زور الفاظ سے ظاہر ہے کہ ہر طرح کی غلامی جبر، اسیری اور نا واجب سختی سے پیدا ہوئی ہے اور اب جس شے کو حق کہتے ہیں وہ محض رواج ہے، یہ رواج اگرچہ قدیم ہے مگر نامضمانہ ہے۔

یوٹنی قوموں نے ہمیشہ اپنے زرعی غلاموں کے کچھ نہ کچھ حقوق تسلیم کئے ہیں، ان کے ملکیتی اور خاندانی حقوق تکمیل تھے اور ان کی ناکافی حفاظت ہوتی تھی بلکہ درحقیقت وہ ان کے آقا کی شفقت پر منحصر تھے، مگر ان کی آزادی یا بعد کا تخم رومی قانون سے زیادہ قوی تھا۔ جرمانی غلاموں کی شخصیت کہیں ضائع نہیں ہوئی تھی اور اس لئے ان کی حالت کو ترقی دینا ممکن تھا۔

رقیت زرعی

غلامی کی

صورت اختیار

کی گئی ہے۔

میسائیت سے

یونانی جذبہ

ازندہ وسطی کے دوران میں مغربی یورپ میں قیمت (یعنی ملحق غلامی) زرعی غلامی کی زیادہ نرم صورت میں بدل کر ایک بڑی حد تک ناپید ہو گئی، انھارھویں صدی کے اوائل اور انیسویں صدی کے اوائل میں زرعی غلامی کی حتمی تیئخ سے اس کے آخری آثار ناپید ہوئے۔

اس کوشش میں ابتدائی اور تدریجی کارروائی اور حال کے زمانے کی زیادہ کامل آزادی، ایک مددگ مہائیت کی ممنون احسان سمجھی جاسکتی ہے، مہائیت نے

اگرچہ غلامی کے ظاہری قوانین پر سخت اعتراض نہیں کیا مگر اُس کی باطنی بنیاد کو ہلادیا۔ انسان پر حق ملکیت پیدا کرنا اس اعتقاد کے منافی تھا کہ تمام انسان خدا کے عیال اور ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اس تغیر کا باعث عیسائیت سے زیادہ قوم میسون کا پاس قانون و آزادی اور انسانیت کی ترقی کن روح ہے۔

روس

روس میں غلامی کی تاریخ مخصوص نوعیت کی ہے، ابتدائی زمانے میں ایک طرح کی شخصی بندش موجود تھی مگر سو پھویر صدی میں کسان زیادہ تر آزاد تھے۔ مسیح جاؤادوں کے لئے مزدوروں کی تعداد کثیر کی حاجت تھی اور اراضی و اہرام کے حق میں ہی مفید تھا کہ کسانوں کو مختلف مراعات کے ذریعے سے اپنی جاؤادوں سے وابستہ کریں اور اس طرح ان کی مزدوری نہ نقل و حرکت اور مسلسل تغیر مکان کی عادت کو (جو قدیمی خانہ بدوشی کے شوق کی وجہ سے اب بھی جاری تھی) بند کر دیں مگر کسان اُس وقت تک زرعی غلام نہیں بنے تھے جب تک کہ سلطنت کی مالی اور فوجی ضرورتوں نے ان کو زمین سے اور زیادہ وابستہ کر کے انھیں ان کے مالکوں کے زیرِ چھوڑ دیا۔ سترھویں صدی میں کسانوں کی آزادی کو کسی جبراً ایسا شدید نقصان نہیں پہنچا جیسا روس میں پہنچا یا زرعی غلام اور کسان ایک ہی غلامانہ حالت میں ڈھکیل دیے گئے جس سے اُن کی ذات اور جاؤاد بالکل نئی ان کے مالک کی مرضی پر منحصر ہو گئی مگر روس میں بھی نئے زمانے نے بہتری کی طرف قدم بڑھائے اور ہمارے وقت میں پہنچکر غلاموں کو آزادی بھی حاصل ہو گئی۔ غلاموں کے آزاد کرنے کا کام جسے باوجود کثیر تعداد اہرام کی مخالفت کے زار الکزنڈر تائی نے ۱۹ فروری ۱۸۶۱ء کے قانون سے پورا کر دیا، اسی سے روس میں شخصی آزادی کے نئے دور کی ابتدا ہوئی۔

امریکی غلامی

اس طرح بتدریج یورپ ازمۂ وسطیٰ کی غلامی کی لعنت سے پاک ہو گیا، مگر نئی دنیا میں اُسے نہ صرف ایک نئی زمین بلکہ بعض اعتبارات سے وہاں اس کا شر بھی زیادہ بڑھ گیا۔ ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۳ء تک کی امریکی خانہ جنگی جذبہ انسانیت کی اُسی تپش کی سزائے اعمال تھی۔

جشیوں کا غلام بنانا اس اعتبار سے کم قابل اعتراض تھا، کہ یونان اور روم کے غلاموں کے مانند یہ غلام اُسی گوری نسل سے نہیں تھے، جس نسل سے خود اُن کے مالک تھے، بلکہ وہ سیاہ فام اور فطرتاً ہی نسل سے تھے مگر دوسری جانب اس فرق سے سفید رنگ مالکوں کی نفی

اور غوث کو اور ترقی ہو گئی تھی کیونکہ اُن جشیوں کے متعلق وہ مشترک انسانی فطرت کے قبول کرنے پر نہ مائل تھے نہ مجبور کئے جاتے تھے اور اس لئے اُن کی جفاکاریاں زمانہ قدامت کے پر نسبت بہت بڑھی ہوئی اور زیادہ سخت تھیں۔

مونٹسکیو

ان گورے مالکوں کی اپنے جشی غلاموں کی طرف شکایت نہ نفرت کو نوٹسکیو نے اپنی کتاب (Montesquieu Exprit des Lois XV) کے صفحہ پر جس تلخ و تند طنز سے ظاہر کیا ہے اس کا قوی اثر دل پر پڑتا ہے: یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا نے جو حکیم مطلق ہے ایک روح اور پھر ایک نیک روح کو ایک کالے جسم میں ڈال دیا ہے۔

پس امریکی غلامی یورپی غلامی سے بہت ہی زیادہ سخت تھی، مالک اگر غلاموں کی کچھ غور و پروا دخت کرتے تھے تو وہ ایسی غور و پروا دخت تھی جیسے ایک کسان اپنے مویشی کی کرتا ہے۔ اُن کی انسانی عزت کا انکار ان کے ازدواج اور خاندان کا عدم لحاظ، بچی یا اخلاقی تعلیم کا فقدان، ان کی بے روک ٹوک تجارت (جو اکثر دل ہلا دینے والے مظالم کے ساتھ ہوتی تھی) ان تمام امور نے ملکر انھیں اخلاقاً و قانوناً خانگی جانوروں کی حالت میں ڈھکیل دیا تھا، یہ تمام آسمانی و دنیوی نظم کے خلاف ایک سخت گناہ تھا۔

جیمز

امریکہ کی بدقسمتی تھی کہ جیمز سن ہم سر جلالی نے اس کے اعلان آزادی میں جس نے آزادی کو انسان کا ناقابل انفکاک حق قرار دیا ہے اپنی اس تجویز کو اتمام کو نہ پہنچا سکا کہ شاہی حکومت کی وجہ سے جشی غلامی کا جو رواج ہوا اور اُس کی جو بہت افزائی ہوئی اس پر اعتراض کیا جائے غلامی کی تدریجی برطرفی کے ابتدائی خیال کی ایسی کمزورتا پیدا ہوئی کہ اپنی ملکیت کی حفاظت و ترقی کے بابت غلام رکھنے والوں کی کوشش پر غالب نہ آسکی۔

آزاد ریاستیں غلام رکھنے والی ریاستوں کے مقابلے میں مستقل حکومت کے اندر اپنے توازن کو مشکل سے قائم رکھ سکتی تھیں، ایک صدی کے اندر اندر لاکھوں کی اکائی سے گزر کر دہائی میں پہنچ گئی تھیں ریوی اور گئے کی زراعت کی عاجلانہ ترقی کا اثر اس معاملہ میں تباہ کن پڑا تھا۔

امریکی

خانہ جنگی

جنوب کی غلام رکھنے والی مشترکیت پر سلطنتیہائے متحدہ کی فتح نے شمال کی امریکی سے جشی غلامی کی ایک قدم خسروئی کو حتمی و قطعی بنادیا، اب سلطنتیہائے متحدہ اپنے حدود اختیار

جیشیوں کے
حقوق -

کے اندر غلامی کو جائز نہیں رکھتیں (ترجمہ نظام سلطنت مورخہ ۱۹۶۵ء) بالواسطہ یہ قانون تمام بزرگوار (امریکہ) کے مسئلہ غلامی کیلئے فیصلہ کن ہے، کیونکہ جنوبی امریکہ زیادہ زمانے تک اس اصول کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں کرتا۔
فی الحقیقت برازیل میں ۲۸ ستمبر ۱۸۵۰ء کے قانون کی رد سے غلامی منسوخ ہو چکی ہے۔
اس وقت تک رنگدار قوموں کی محض ذاتی آزادی اور ان کے شخصی حقوق تسلیم کئے گئے ہیں، جیشیوں کی حیثیت اور ان کے سیاسی حقوق کے مشکل سوال کا حل کرنا ابھی باقی ہے، اس وقت شمالی امریکی جیشیوں کو پورا سیاسی حقوق دینے پر مائل ہے مگر یہ مشکوک ہے کہ یہ حالت کب تک قائم رہے گی، سیاسی حقوق کے لئے مقدم شرط سیاسی قابلیت کا ہونا ہے۔

آیا بنیادی عمومیت جسے اب تک صرف سیاسی حیثیت سے ترقی یافتہ قوموں ہی میں کالہابی ہوئی ہے، جیشی گرد ہوں کے لئے حکومت کی ایک فطرتی صورت ہو سکتی ہے، آیا ایک عمومی نظام حکومت کو جس میں بڑے ہی تحمل اور مردانہ مستعدی کی ضرورت ہے یہ جیشی اُسے قابلیت کے ساتھ قائم رکھنے اور جو انفرادی کے ساتھ اس کی حفاظت کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ جو لوگ انسانی فطرت اور سیاسی تاریخ سے اچھی طرح آگاہ ہیں وہ شاید ہی اس کا جواباً ثبات میں دینے کی جرأت کر سکیں۔

سلطنت اور
غلامی -

بہر حال انسانیت کی بنیاد پر سلطنت کے اصول سے ذیل کے عمومی کلیات تسلیم کئے جاسکتے ہیں :-

(۱) ہر سلطنت کا حق و فرض ہے کہ اگر شخصی غلامی کے کچھ بھی افراد اُس کی مملکت میں باقی رہ گئے ہوں تو انہیں صاف کر دے۔ ایسا کرنا بے انصافی کا رافع کرنا ہے۔

(۲) سلطنت غلامی کے کسی نئے رواج کی روادار نہیں ہو سکتی خواہ کوئی انسان خود ہی غلام بنے کا خواہاں کیوں نہ ہو۔

(۳) کوئی غیر ملکی اگر سلطنت کے حدود کے اندر اپنے غلام پر ملکیت قائم رکھنا چاہے تو سلطنت کو اُس کی قانونی حفاظت سے انکار کرنے کا حق ہے۔

سنہ اٹھتالیس کے لئے ایک استون کی شرح دیکھنا چاہئے (کتاب اول باب ۱۴)۔ ۲۸ اگست ۱۹۳۵ء

(۴) غلام جو آنا د زمین پر قدم رکھے وہ حقیقتاً آزاد ہے۔ اور اس آزادی کے لئے وہ عدالت سے حفاظت کا استحقاق رکھتا ہے۔

(نقیبہ ماسٹیفورگزنسٹم) کے انگریزی قانون نے انگریزی نوآبادیوں میں آزادی کے قاعدے میں کئے ہیں اور یہ اعلان کر دیا ہے کہ کوئی غلام جو اپنے مالک کی مرضی سے برطانیہ عظمیٰ یا آئرلینڈ میں آئے وہ آزاد ہے۔

ستر حوال باب

جدید زمانے کے درجات کا اصول

ازمنہ وسطیٰ کے ذہنی امتیاز طبقات ہر جگہ شکست ہو گئے ہیں، پادریوں کو کسی وقت میں ذہنی عظمت کی وجہ سے جو برتری حاصل تھی وہ زائل ہو گئی ہے اب ان کی حیثیت بالعموم جداگانہ سیاسی طبقے کی نہیں رہی ہے مقتدا یا ان وین طبقہ ایمان میں شامل ہو گئے ہیں اور باقی پادری عوام میں بالآخر طبقے کا جزو بن گئے ہیں۔ زمانہ حال کی تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے واضح ہو جائے گا کہ کیا اعلیٰ اور کیا ادنیٰ ازمنہ وسطیٰ کے طبقہ امرا کا شیرازہ بالکل بکھر گیا ہے اور وہ ایک ذہنی امتیاز طبقے کے طور پر اپنی آزاد از حیثیت قائم کرنے کے لئے بالکل ہی ناموزوں ہو گیا ہے۔ شہری طبقے کے ایک منضبط فرقے کی قدیمی حیثیت زائل ہو گئی ہے تعلیم یافتہ طبقوں کو جدید بنیاتی سلطنتوں میں سابق کے نسبت بہت ہی مختلف حیثیت حاصل ہے کیسا نون تک کا طبقہ جو روایتی خیالات رواج کے مضبوط و خاموش تعلق سے وابستہ تھا زمانے کی تحریک میں کھنچ آیا ہے اور اس کی ترقی سے موثر ہو رہا ہے حرفت نے بھی ملک میں مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑ لی ہے اور کسانوں کی سادگی آمیز زندگی میں اضطراب پیدا کر دیا ہے ازمنہ وسطیٰ کے طبقات کی اصلاح کرنے اور سلطنت کو ان کی بنیاد پر قائم کرنے کی تمام کوششیں اس وقت تک کلیتہً ناکام ہو چکی ہیں قوم کا ادراک و شعور ان پر اعتبار نہیں کرتا بلکہ قومیں یہ محسوس کرتی ہیں کہ وہ ازمنہ وسطیٰ کے نظم سے آگے بڑھ گئی ہیں اور تجدید و ترقی میں بھی ان کی دوبارہ بجالی کی روادار نہیں ہیں۔

ذہنی امتیاز
طبقات کی
محدودی

تاہم یہ عیاں ہے کہ جماعتہائے قوم میں جو ناقابل انکار تفاوت موجود ہیں وہ حقیقی سیاسی اہمیت رکھتے ہیں اور یہ کہ محض تمام درجات کا ایک میں غلط ملط گردینا ناقابل اطمینان ہے۔ اگر کسی نظام حکومت میں اس تفاوت کو ہم کوئی جگہ دینا چاہتے ہیں

تو ہر طبقہ کے بجائے درجات قائم کرنا چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب بھی جن مراتب کو ہم طبقات کہتے ہیں وہ اکثر فی الواقع طبقات نہیں بلکہ درجات ہیں۔

درجات
طبقات

درجوں اور طبقتوں میں فرق یہ ہے کہ درجات سلطنت سے شروع ہوتے اور سلطنت ہی کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں لیکن طبقات کی بنیاد سلطنت کے حدود سے خارج ہوتی ہے۔ درجات اتحاد قوم کو پہلے ہی سے تسلیم کر لیتے ہیں، طبقات اس کی پروا نہیں کرتے۔ درجات سے ایک سیاسی نظم ہیں جو اتحاد قومی اور قانون عامہ پر مبنی ہوتے ہیں طبقات وہ گروہ ہیں جو انفرادی اور شخصی حقوق کی بنا پر قائم کئے گئے ہیں اور ان کا مقصد گھیرنا اصلاً سیاسی نہیں ہے۔ پادری کیسا کو سلطنت سے مقدم رکھتے ہیں امر اولاً اپنا اور اپنے خاص تمدنی اغراض کا خیال کرتے ہیں شہری اپنے کاروبار کو اور کشتکار اپنی زراعت کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں پس طبقات میں ہمیشہ مشترک تعلیم اور مشترک طریق زندگی کا تعلق نظر آتا ہے۔ ان گروہوں کی تقسیم فرق لوازم پر ہے اور اس میں سلطنت کا خیال محض بالواسطہ کیا جاتا ہے۔

طبقات کی نشوونما فطری ہے، درجات مذہب تمدن کے کرشمے اور فراست سیاسیہ کی قوت مضبوطی کے قومی نتیجے ہیں۔ اس لئے ہم ان تمدن اقوام میں جن میں سیاسی احساس ترقی پا جاتا ہے صرف درجات ہی درجات دیکھتے ہیں۔ یونانیوں بالخصوص انھیں میں سولن کے نظام سلطنت کے بعد اور روم میں سرولس کے نظام سلطنت کے بعد یہی صورت نظر آتی ہے۔ اسی قانون سے ابتدا اور بچے (class) کا لفظ نکلا۔ یہی حال موجودہ یورپی سلطنتوں کا ہے۔

اس کی کوئی وجہ نہیں کہ درجات کے قائم کرنے میں موجود الوقت طبقات کا لحاظ کیوں نہ کیا جائے مگر درجات اور طبقات کا تقابلی نہ ضروری ہے نہ مفید۔ اگر ایسا ہو تو طبقات ہی سلطنت کی تنظیم کا تعین کریں گے جیسا کہ کسی حد تک، ازمنہ وسطیٰ میں ہوتا تھا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طبقات متحد ہو جائیں اور سلطنت منقسم ہو جائے۔ مخصوص طبقات کے اغراض و میلان کو جب سیاسی مساعدا حاصل ہو جائے گی تو وہ

قوم کے عام اغراض اور اس کے بہترین خیال پر آسانی سے غالب آجائیں گے برطانویوں کے تقسیم کشمیری سے جس میں ہر درجے میں مختلف طبقات کے ارکان شامل ہوتے ہوں قومی زندگی میں زیادہ استیساس پیدا ہو جاتا ہے اور سیاسیات میں انواع و اقسام کی تحریک پیدا ہو جاتی ہے اور اسے بلند تر رتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔

درجات بیشتر ملکیت کی بنا پر قائم ہوتے ہیں اس قسم کے نظامات میں ازروسے شمار ملکیت ہی پر سیاسی قوت کا تعین ہو جاتا ہے اور اہل ملک کی قدر کا اندازہ ان کی آمدنی کی مقدار سے ہوتا ہے لیکن بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ یہ انتظام واقعات سے موافق ہو اور اس کا اصول قانون عامہ اور سیاسیات کے بجائے اقتصادیات اور شخصی قانون سے زیادہ قرب رکھتا ہے۔ اس قسم کے خالص حسابی اصول کا مقابلہ کسی دی حیات تقسیم کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا جس کی نگاہ سب سے پہلے سیاسی اہلیت و قابلیت کے اختلافات پر (جہاں تک ان کا جانچنا اور اندازہ کرنا ممکن ہے) پڑتی ہو۔ سلطنت ہائے جدیدہ میں بالعموم چار خاص درجات میں ہو سکتے ہیں۔

(۱) درجہ حکمران۔ سلطنت کے سب سے اعلیٰ درجے پر بادشاہ اور وہ عمال ہوتے ہیں جنہیں اقتدار عام حاصل ہو جس سے انہیں تمام دیگر درجات پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔

(۲) درجہ اعیان۔ جسے اس قسم کی حکومت تو نہیں حاصل ہوتی مگر جماعت حکمران اور عام قوم کے درمیان ایک آزادانہ ممیز حیثیت ضرور حاصل ہوتی ہے۔ (۳) نام نہاد طبقہ سوم یعنی امصار و دیار کے تعلیم یافتہ اور آزاد اہل ملک کی جماعت صحیح معنوں میں بھی ”درجہ متوسط“ ہے۔

(۴) عوام یا طبقہ چہارم اس میں شہروں کے ادنیٰ درجے کے باشندے اور نیز کسان شامل ہیں۔ ایسی کارکن جماعت یعنی مزدوروں کا گروہ عظیم ہے۔ درجہ حکمران سلطنت کا گنگرہ اور عوام اس کی بنیاد ہیں، ہر قوم کی قوت اور حقیقی طاقت زیادہ تر انہیں دو درجات کے صحت بخشن تعلقات پر منحصر ہوتی ہے۔ درمیان کے درجے اس طرح اس کی تکمیل کرتے ہیں کہ وہ درجہ اول کے افسال کی روک تھام کرتے یعنی بلند اعیان اور نیابتی عمومیت کے اثرات سے اس میں اعتدال

الہامی درجہ

پیدا کر دیتے ہیں۔ اپنی اعلیٰ تعلیم اور زیادہ ممتاز معاشرتی حیثیت سے انھیں موقع ملتا ہے کہ جس طرح پر قانون اور آزادی کا اعلیٰ احساس انھیں آمادہ کرتا ہے وہ عام قومی بہبود کے حالات کی نگہداشت کریں۔ وہ فزوتزین اور کثیرترین درجے کے فطرتی محافظ رہیں اور قائم مقام ہیں۔

اٹھارھواں باب

جدید زمانے کے درجات کا تبصرہ

حکمران درجہ
(جماعت)

اس وقت کا حکمران درجہ (جماعت) اپنے سرگرمیوں یعنی ریسوں کے توسط سے قیدی طبقہ اور کے ساتھ مربوط ہے۔ اگرچہ اب اس نے سلطنت میں خود امر اپرا اقتدار شاہانہ حاصل کر لیا ہے اس درجے کے فروتر ارکان، عمدہ داران و عمال اور جمہوریوں میں تمام اعلیٰ ترین عمدہ دار بھی زیادہ تر وہ درمیانی درجات کے لوگوں میں سے ہوتے ہیں اور معاشرتی طور پر انھیں سے تعلق رکھتے ہیں یا اگر ان کے والدین ادنیٰ طبقے کے وسیع تر گروہ سے ہوتے ہیں تو خود ان کی اعلیٰ تعلیم اور ان کے کام انھیں معاشرتی حیثیت سے طبقہ اعیان یا جماعت متوسط کے اعلیٰ گروہ کی بلند سطح پر پہنچا دیتے ہیں، اور ان کی حیثیت اس وقت بھی قائم رہتی ہے جب وہ اپنے عمدے سے مستغنی یا کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ ان کے عمدے کا اقتدار انھیں ان کے ہمسایوں کے بالاتر بنا دیتا ہے۔ ادنیٰ ترین انھیں اور خدمتیں سب سے فروتر درجہ یعنی غیر تعلیم یافتہ عوام کو حاصل ہوتی ہیں۔

طبقہ اعیان اب مخصوص الحقوق متحدہ طبقہ نہیں رہا ہے قانون عام و خاص دونوں کے لحاظ سے امر معاشرۃ اور قانوناً شہریت کے مشترک حقوق اور حقیقی مساوات کی بنا پر دوسرے درجات کے ساتھ مربوط ہیں، ادنیٰ درجات کے ممتاز اشخاص وقتاً فوقتاً خود اپنے کو اپنے خاندانوں کو طبقہ اعیان کی معاشرتی حد پر پہنچا دیتے ہیں اور بہت کچھ اس سے متعلق سمجھے جانے لگتے ہیں اس سے بھی زیادہ ایسا ہوتا ہے کہ طبقہ اعیان کے ارکان یا ان کے اخلاف اس حالت میں آجاتے ہیں جس سے انھیں اپنی حیثیت کا قائم رکھنا ممکن نہیں ہوتا اور مجبور ہو کر انھیں امیرانہ زندگی کی تابناک بلندیوں سے سوسائٹی کی پست تر سطح پر گرنا پڑتا ہے، یہ غیر ممکن ہے کہ طبقہ اعیان کی ظاہری حالت یا اس کے لوازم بلا جا نہ دیا آزادانہ پیشہ یا اعلیٰ تعلیم کے حاصل ہو سکیں اس لئے یہ درجہ حقیقت

تغیر پذیر اور اپنے ارکان کے مسلسل مد و جزر کے لئے وقف ہے۔ اسی مسلسل محرک سے اس کا نہایت ہی قوی تعلق شہری طبقے کے اعلیٰ و تعلیم یافتہ جماعت سے قائم رہتا اور اپنے سے نیچے طبقے کے ساتھ ساتھ باہمی میں آسانی پیدا کرتا ہے۔

ازمنہ وسطیٰ کے طبقہ امرا کا موجودہ طبقہ اعیان کی صورت میں بدل جانا، اولاً انگلستان میں ایک ایمان پسند قوم کے درمیان بندرتیج مکمل ہوا، برخلاف اس کے براعظم یورپ میں جاگیردارانہ امرا کے ذریعات باقیات کبھی کبھی عام زندگی کے راستہ میں رکاوٹ اور خرابی پیدا کر دیتے ہیں اور نئے طبقہ اعیان ہنوز محض غیر واضح تعلقات زندگی اور متنازع فیہ حیثیت رکھتا ہے۔ طبقہ اعیان کا اثر نظم معاشرت و آداب و دبا و اور اعلیٰ اعمدوں کی تقررات میں نمایاں نظر آتا ہے مگر یورپی اقوام کے ذہن و احساس میں قانونی اور سیاسی حیثیت سے اسے ابھی تک کوئی مسئلہ نہ نہیں ملے ہے۔

جرمانی شہنشاہی کو بروقت اصلاح سے اس کمی کو پورا کرنا چاہئے اور یہ اصلاح اصولاً اسی روش پر ہونا چاہئے جس کا استیلائی عالم کے تجربے نے دکھا دیا ہے، طبقہ اعیان اب ایک منفرد یا شاہی طبقہ نہیں رہ سکتا ہے، اس کی حیثیت اب اس درمیانی شخص کی ہونا چاہئے جو حکام کی سختیوں کو نرم کرے، عوام کے جذبات کو قابو میں رکھے اور عام زندگی میں بلند انداز پیدا کرے۔

تعلیم یافتہ شہری طبقہ یا ”طبقہ سوم“

فرانسیسی انقلاب کی تاریخ اس طبقے کے خصوصیات کو بہت واضح طور پر نمایاں کرتی ہے، فرانس میں طبقہ سوم کی اصطلاح جاگیردارانہ سلطنت کے نظریے سے لی گئی تھی، اس جاگیردارانہ سلطنت میں اس لفظ سے وہ شہری مراد تھے جو اسٹیٹس جنرل (مجلس شوریٰ) عام میں طلب کئے جاتے تھے اور وہاں انھیں فرقہ وندی اور امرا کے اعیانہ طبقات کے تحت میں ایک طرح کی مودبانہ پست پیشیت حاصل ہوتی تھی۔

بادری سیسے (Abbe Sieyes) جس کے مشہور رسالہ ”دربارہ طبقہ سوم“ نے فرانسیسی انقلاب کی آگ بھڑکائی، اس نے دو سوال کئے اور خود ہی ان کے جواب دیئے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ طبقہ سوم کیا ہے، جواب یہ ہے کہ وہ سب کچھ ہے۔ دوسرا سوال

دوسرا سوال
فرانس میں
طبقہ سوم
کی حالت

یہ ہے کہ سیاسی عضویت طبقہ سوم کی اب تک کیا حیثیت ہے؟ جواب یہ کہ لاشعریہ محض دونوں جواب بمالغہ آئیں گے۔ مگر پہلے جواب میں طبقہ سوم کے دعاوی میں بمالغہ کرنے سے اس کا تصور ہی قائم کرنا ناممکن ہو گیا۔ اگر فی الحقیقت یہی سب کچھ ہے تو پھر اول یا دوم یا چہارم طبقہ کا کوئی وجود ہی نہیں ہو سکتا۔ پس یہ کوئی طبقہ یا جداگانہ درجہ باقی نہیں رہتا بلکہ تمام قوم کے مرادف ہو جاتا ہے۔

پہلے فرانسیسی انقلاب کے دوران میں طبقہ سوم نے واقفانہ مطالبہ کیا کہ فرانس کے دونوں پہلے طبقات یعنی پادری اور اہل اس کے ساتھ متحد ہو کر ایک توحی جماعت قائم کریں۔ جب اس کی تکمیل ہو گئی تو طبقہ سوم نے سب کو اپنے میں جذب کر لیا اور ایک متحد القوۃ اور تساوی الحقوق قوم کی حیثیت سے سلطنت کے تمام قدیمی نظم و نسق کو جو اس وقت تک قائم تھا توڑ پھوڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا مگر ان سب کو برابر حقوق دینے کے نظریے کے باوجود قوم کے آپس کے فطری اختلافات اپنا اثر دکھا کر یہ پادری اور اہل طبقہ سوم میں غرق ہو گئے مگر پادری اور اہل بیرونی کی جہت سے ان پر ظلم ہونے لگے اور وہ انقلاب کی خونی قربانی کے نذر ہو گئے مگر حکومت اس وقت تک بھی ایک ہیو لائے محض تھی جس میں نئے مناقشات جو شہزاد تھے۔ اسی زمانے میں طبقہ چہارم نے قوت حاصل کر لی اور اسی میں سے مجلس عارضی کے سرگروہ پیدا ہوئے جن کی خونی حکومت کے سلسلے ”جرنڈ“ اور طبقہ سوم کی قوت بھی شرمناک تھی۔ پس جس انقلاب سے سینی کے الفاظ کو صحیح ثابت کرنا چاہا تھا اس سے صرف یہ ظاہر ہوا کہ یہ الفاظ باطل اور غیر مکلفی ہیں۔ طبقہ سوم نے اپنے کو قوم کا مرادف قرار دیا تھا اور اس کا قائم مقام بن بیٹھا تھا لیکن اسے یہ سبق لینا باقی تھا کہ اس سے خارج اور بھی بہت سے بڑے بڑے گروہ تھے جو اس کی بہری میں ایک عام جماعت میں جذب ہو جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔

تعلیم یافتہ شہری جماعت اور عوام کی ادنی جماعتوں کے درمیان وہی مخالفت ہوئی۔ فرانسیسی انقلاب اور شہر کے پولیٹی رجعت میں بہت ہی تیز طور پر ظاہر ہوئی اور پھر شہر کے کمیون میں اس نے دوبارہ زیادہ شدید صورت اختیار کی پولیٹی سوم نے طبقہ چہارم کی تائید پر پھر وہی طبقہ سوم کو جسے مجلس قومی میں بہت بڑی کثرت حاصل

تھی بزورِ باد دیا، اس کے بعد سیدان میں اُس کے شکست کھانے کے بعد عوام الناس کے تیسے اور چوتھے طبقوں نے اپنے جوش و خروش کی حالت میں اُسے تخت سے اتار دیا (۴۴ ستمبر ۱۹۰۵ء) لیکن طبقہ چارم نے بہت جلد پاریس (پیرس) کے تیسرے طبقے کے ہاتھ سے اختیارات چھین لے اور کیوں قائم کر دیے۔

کسانوں کی جنگ کے وقت بھی مخالفت جرمانیا میں بھی نمودار ہو گئی مگر جرمانیا کی خوش قسمتی تھی کہ اس مخالفت نے پیرس میں جس تندی و عناد کا اظہار کیا تھا وہ اس زمانے میں وہاں نہیں پیش آئی تاہم شہری اور دیہاتی کسی آبادی میں بھی یہ تحریک بالکل بے اثر نہیں ہو گئی ہے، آخر الذکر میں یہ مخالفت زیادہ تر مذہبی معاملات اور غیر تعلیم یافتہ عوام اور حکام کلیسا کے باہمی تعلقات میں ہوتی ہے اور سابق الذکر میں اقتصاد کی اور معاشرتی معاملات کے اندر اپنا رنگ دکھاتی ہے۔

شہری و
جامعت
کوئی طبقہ
ہے۔

یہ شہری جماعت اگرچہ تاریخی طور پر ازنائے وسط کے طبقہ سوم سے تعلق رکھتی ہے مگر صحیح طور پر وہ اس نام کو نہیں اختیار کر سکتی۔ اب مخصوص حقوق کا منفرد طبقہ نہیں باقی اعیان کے مانند یہ بھی ایک رواں شے ہے جس کے اجزائے برائے اور جاتے رہتے ہیں مگر زیادہ تعلیم یافتہ شہری یعنی تعلیم یافتہ درجات اب بھی حقیقتاً طبقہ اعیان اور عوام دونوں سے متمیز ہیں اور اس امتیاز کا اثر ان نظام سلطنت پر پڑتا ہے اور نظام سلطنت کے بھی زیادہ سلطنت کا طرز عمل اور اس کا انتظام متاثر ہوتا ہے۔ وہ طبقہ اعیان سے اس امر میں مختلف ہیں کہ وہ کسی اقتدار کی حیثیت کے لئے کوئی خاص دعویٰ نہیں کرتے اور اس لئے نہ وہ خطاب و منصب کے خاص امتیازات کے طالب ہیں اور نہ ایوانِ اعلیٰ میں نمائندگی کے خواہاں۔ ان کی تعلیم و تربیت میں مذہب کا عنصر غالب ہے، ان کا معاشری اور سیاسی رجحان قومیت اور عام حقوق کی بنیاد پر قائم ہے لہذا وہ بالطبع عام نیابت میں شریک ہیں رعایا کے عام حجم غیر پُر انھیں اپنی علمی یا ترقی قابلیت، تمدنی آداب اور آزادانہ پیشوں کی وجہ سے برتری حاصل ہے اس لئے کہ وہ ہاتھ کے بجائے دماغ سے کام کرتے ہیں اور اعلیٰ ذہنی کوششوں کے نسبت زندگی کی مادی ضروریات کی طرف کم متوجہ ہوتے ہیں۔

بلکہ اکٹام
دریائی و
ہے۔

وہ بھی عوام ہی کی ایک جماعت ہیں مگر عام انہو سے بلند طبقہ اعیان کے مانند

وہ ایک درمیانی طبقہ ہیں مگر وہ چوتھے درجے سے زیادہ قریب ہیں اور اسی سے برابر اضافہ حاصل کرتے رہتے ہیں۔ انگلستان میں شرفا (جٹھلیمین) اسی عنوان کے تحت میں آتے ہیں مگر جرمانیا، فرانس اور اطالیہ کی اعلیٰ شہری جماعت کے برابرت وہ زیادہ محدود و منتخب جماعت ہیں۔ اس عنوان کے تحت میں آبادی کے درجہ است ذیل آجاتے ہیں:-

- ۱۔ ایسے سرکاری عہدہ دار جن کو اعلیٰ اقتدار حکومت حاصل نہیں اور جو بالکل ادنیٰ درجے کے ملازم یعنی اہل علمہ بھی نہیں ہیں۔
- ۲۔ عموماً پادری اور معلمین،
- ۳۔ ڈاکٹر یعنی یونیورسٹی کے سند یافتہ، قانون پیشہ، طبابت پیشہ، دواسار، غیر پیشہ وراہل علم اور مصنفین،
- ۴۔ فنون لطیفہ کے ماہر، انجینیر اور اعلیٰ صنعتی پیشوں کے ارکان،
- ۵۔ بڑے تاجراور کارخانہ دار،
- ۶۔ ہنزور و دستکاروں کی اعلیٰ جماعت،
- ۷۔ سرمایہ دار۔

۸۔ بڑے بڑے زمیندار جو طبقہ اعیان میں شامل نہیں ہیں۔

اس جماعت کا حقیقی وصف اعلیٰ تعلیم ہے اگرچہ یہ لازمی نہیں۔ کہ یہ تعلیم کسی جامعہ یا اعلیٰ صنعتی تعلیم گاہ ہی میں حاصل کی گئی ہو اور اس میں بالعموم یہ بھی مہر رہتا ہے کہ ذرائع آمدنی ایسے ہوں کہ عام کاموں کے لئے وقت مل سکے۔ سرکاری عہدوں کے انتخاب کے لئے جامعہ کی تعلیم لازماً فرض کرنی جاتی ہے اور نیابتی جماعتوں کے کام میں حصہ لینے کی اعلیٰ متاسبت کے باعث اگر کوئی خاص قانون اس کے خلاف نہ ہو تو انھیں لوگوں کو قومی مجلسوں اور قانونی ایوانوں میں غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔

موجودہ زمانے کی سلطنت کی زندگی میں عموماً یہ درجہ سب سے زیادہ با اثر ہوتا ہے، معاملات عامہ میں اسے پیشرویی حاصل ہو جاتی ہے اور وہی عام رائے کو متعین کرتا ہے۔ اگرچہ اس کی شمولیت کا انحصار تعلیم، جائداد اور پیشے پر ہوتا اور سب کا کچھ ایسا لحاظ نہیں کیا جاتا، تاہم ایسے قدیمی اشخاص آزاد لگے درجے کو ازمنہ و سطی

اس کی
ہدایت کی

اس کی سیک
قوت۔

کے ورژن متوسط کے مقابل قرار دینا مناسب ہوگا انھیں کے ماتر یہ بھی سیاسی حقوق رکھنے والوں کی خاص الخاص جماعت ہوتی اور سرکاری عہدوں میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

تیم کے وسیع درجات، نام نہاد طبقہ چارم، اور غیر ملکیوں کی جماعت اس جوہر سے دوسرے میں ہم عوام کے اس جم غفیر کو شامل کرتے ہیں جو اوپر کے تین درجوں میں داخل نہیں ہیں، انھیں کوہم بسا اوقات، "عوام" کہتے ہیں اس میں بہت ہی مختلف پیشوں اور بہت ہی متباہن زندگی کے لوگ شامل ہیں مگر سب کے سب ایک عام ملک و قومیت کی زنجیر میں۔ جکڑے ہوئے ہیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ مشترک حقوق شہریت کے تعلق سے باہم وابستہ ہیں۔ اس میں ذیل کے گروہ شامل ہیں اور سلطنت کے اقتصادیات میں ان کی مختلف جگہیں ہیں۔

(الف) کسانوں کا گروہ کثیر جو بطور خود اپنے نوکروں کی مدد سے کام کرتا ہے جو ہل چلاتے میدانوں کی گھاس کاٹنے غلہ جمع کرتے انگور کی بیلوں کو چھانٹنے، مکھلیاں جمع کرتے اور پالو جانوروں کی سیوا کرتے ہیں، ایسی لوگ اس درجے کے سب سے کثیر اور سب سے قوی جزو ہیں اور یہی اس رئیس قومی قوت کا منبع ہیں جس سے دوسرے درجات نئی زندگی اور نئی طاقت حاصل کرتے ہیں۔

(ب) گلہ بان، ماہی گیر، شکاری، ملاح، کان کن اور بالعموم وہ تمام مزدور جنھیں پیشے کے تعلق سے براہ راست فطرتی اشیاء (یعنی زمین، پانی، جانوروں، درختوں، آگنے والے پھل پھول) سے ہر وقت کام پڑتا ہے۔

(ج) شہر اور قصبے دونوں کی فروتر شہری جماعت۔ اس میں اولاد کا رخاندہ دار کارگیر مع اپنے آدمیوں کے اور چھوٹے چھوٹے تجارت پیشہ لوگ شامل ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی نیچے درجے کی حرفتی جماعت بھی خواہ خود اپنے گھروں کے اندر کر گئے وغیرہ پر

۱۰ قدیم روم میں سب سے فروتر طبقہ پرولیتاریس (Proletarius) کہلاتا تھا وہ سلطنت کی خدمت دولت سے نہیں بلکہ اپنی اولاد سے کرتا تھا۔ پرولیس () کے معنی اولاد کے ہیں مگر اب اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے پاس کوئی ملک نہ ہو، صحیح ترجمہ اس کا "غیر ملکی" ہے۔ مترجم۔

کام کرتی ہوں، خواہ کارخانوں میں کام کرتی ہوں، دونوں اس میں داخل ہیں۔
(۵) سلطنت کے اور پیشہ ور اشخاص کے ادنیٰ ملازمین یا فوج کے معمولی سپاہی دفاتروں کے محرر نقل نویس وغیرہ۔

(۶) غیر ملکی یا عامی جن میں ادنیٰ ترین درجے کے ملازمین اور مزدوری پیشہ لوگ داخل ہیں۔ ان سب گروہوں میں مابداً اشتراک یہ ہے کہ وہ جسمانی محنت اور مادی ضروریات کے پیدا کرنے میں مشغول ہیں، فی الحقیقت یہ غیر ممکن ہے کہ دماغی اور جسمانی کام کے درمیان کوئی قطعی حد فاصل قائم کی جاسکے کیونکہ یہ لازمی ہے کہ ان میں ہر ایک دوسرے کے بغیر کمزور پڑ جاتا ہے مگر ان کا فرق ایک صحیح اور قابل تسلیم فرق ہے۔ دماغی کام میں نسبتاً اعلیٰ ذہنی تربیت اور اعلیٰ معاشری حیثیت کی ضرورت ہے ہاتھ کا کام بہت ہی کم تعلیم اور سادے اور معمولی طرز زندگی کے ساتھ ممکن ہے اس لئے یہ دونوں کام بالطبع دو مختلف طبقوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔

درجہ چارم کی ایک مزید خصوصیت یہ ہے کہ وہ اگرچہ تمام سلطنتوں اور عام قومی زندگی کی لابی بنیاد ہوتے ہیں مگر ان میں حکمرانی کی قابلیت نہیں ہے، اس لئے انھیں رہبروں اور قائم مقاموں کی ضرورت پڑتی ہے۔ معاشری جماعت میں وہ بالعموم ساکت و تابع جزو کو ظاہر کرتے ہیں، مگر جب ان کے جذبات انقلاب کے لئے بھڑک اٹھتے ہیں تو پھر موجودہ انتظام کے اُلٹ دینے اور اپنی مرضی کو قانون بنا دینے کی جو طاقت ان میں ہوتی ہے اسے کوئی شے روک نہیں سکتی۔ کسی حکومت کے بدل دینے یا کسی قسم کے نظام سلطنت کے بزور حاصل کر لینے کی ان میں پوری قوت ہے وہ تخت شاہی کو اُلٹ سکتے اور نئے لوگوں یا نئے خاندانوں کو اختیار تفویض کر سکتے ہیں مگر خود حکمرانی کرنے کی قابلیت ان میں نہیں ہے جہاں کہیں ان کو اس کوشش کا موقع ملا کہ خود حکومت کریں وہاں سلطنت کی حالت اُس آدمی کی سی ہو گئی جو سر کے بل کھڑا ہوا اور ٹانگیں اوپر کو ہوں۔

سیاسی زندگی میں اس طبقے کو اب تک کبھی ایسی اہمیت نہیں حاصل ہوئی تھی جیسی اس وقت اسے یورپی سلطنتوں میں حاصل ہے۔ خدشہ گار جماعت کے تنگ و محدود مفہوم میں یہ پہلا موقع ہے کہ وہ آزاد ہو گئی ہیں، فروتر جماعت تک یہ محسوس کرنے لگی ہے کہ سلطنت کی

اس طبقہ کی ہوجو
اہمیت

ہمدی میں ان کا بھی حصہ ہے اور سیاسی حقوق پر انھیں بھی استحقاق ہے۔ حالات کے اعتبار سے اب سلطنت کے ارباب اہل و عقد جمہور میں کہ اس طبقہ چارم کی حالت پر خاص توجہ کریں اب صرف اس قدر کافی نہیں ہے کہ صرف تعلیم یافتہ جماعت کی رائے سن لی جائے اور اس پر غور کیا جائے۔ اب عوام کے اپنے احساس و جذبات کا اثر اگلے زمانے کے بہ نسبت بہت زیادہ قوی ہو گیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی موجودہ زمانے کی سلطنت میں (جس سے سب سے پہلے یورپی یعنی آریائی نسل کی قوموں کی سلطنت مراد ہے) زیادہ انسانی خصائل و شامل پیدا ہو گئے ہیں۔

لیکن طبقہ چارم اس قدر وسیع ہے کہ مختلف پیشوں اور مختلف مدارج زندگی کے بڑے بڑے گروہ سب اس میں شامل ہیں، سیاسی جماعت کے (جسم کے) قوی ترین و صعب ترین اجزاء اسکے اندر تھے ہیں، سلطنت کے حفظ و بقا کے لئے اس کی ہستی لازمی ہے مگر اس نے خود سلطنت ہی کی ہستی کو خطرے میں ڈال رکھا ہے اس کا صحیح ترین حصہ کسانوں کی جماعت میں پایا جاتا ہے لیکن اگر انتظام عام کو تباہی سے بچانا ہے تو ان کسانوں کے واسطے بھی ضرورت ہے کہ کسی مذہبی یا ذہنی تحریک سے ان میں زندگی پیدا کی جائے ان کے بعد ادنیٰ شہری جماعت کا درجہ ہے و دونوں میں ایک شخص المقام تنظیم قائم ہے مگر مشوروں کے انہوہ در انہوہ عوام الناس کی ضروریات کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ در انحالیکہ اور دوسرے معاشری تعلقات ٹوٹ چکے ہیں، وہ قدیم انتظام جس سے بڑے بڑے اہل حرفہ خود آپس میں اور اپنے کاریگروں کے ساتھ متحد رہتے تھے تباہ ہو چکا ہے یہ قدیم نظم اہل ہونچکا ہے اور یہ تمام جماعتیں خاص کر کارخانوں کے کام کرنے والے ابتری میں پڑ گئے ہیں کام کرنے والوں کی خود ساختہ انجمنیں اور مزدوروں کے جتنے تنظیم جدید کے تخم اوئیں ہیں اس فساد تنظیم سے سوسائٹی (نظم معاشرت) کو نقصان پہنچ رہا ہے مختلف مزدوری پیشہ طبقات میں تعلیم کی بیکرنگی اور اغراض و ربطائع کی کچھتی اگر بالکل معدوم نہیں ہو گئی ہے تو اس میں ابتری ضرور آگئی ہے اور اس پہچان عام کا رخ اس طرف ہے کہ ہر شخص اپنے ہمسایہ سے بے ضرورت برسر پر غاش ہے۔ پولیس کی کارروائیاں لا حاصل ہوتی ہیں کیونکہ وہ مختص حالات میں خرابی کو روک سکتی یا اسے دبا سکتی ہیں۔ مگر جہاں معاہدہ اصلاحی تدابیر کی ضرورت ہوتی ہے وہاں وہ اپنے پریشان کن طریق عمل سے اکثر اس خرابی میں

اس کی
تخلیص کی

اور اضافہ کر دیتی ہیں یہ امر تعجب انگیز نہیں ہے کہ دہریت اور اشتراکیت کو طبقہ چارم کے زرین سطحوں میں بار آور زمین مل گئی ہے اور اکثر بڑے بڑے شہروں میں بلکہ دیہات کے بھی بعض حصص میں یہ اندیشہ دامنگیر ہو گیا ہے کہ یس و خاشاک قدیم زمانے کی شریف ترین پودوں کو بالکل دبا نہ دیں۔

غیر ملکی

”غیر ملکی“ طبقہ چارم کے فرو ترین درجے میں ہیں۔ اسے طبقہ چارم کے مرادف نہیں سمجھنا چاہئے، اسے ایک درجے یا فرقے کے طور پر ترتیب دینا چاہئے بلکہ انکی مدبر کا کام ہے کہ جہاں تک ہو سکے اسے دوسرے طبقات میں جذب کر دے اور اس طرح ایک جداگانہ جماعت کی حیثیت سے اس کی ترقی کو روک دے۔ یہ زیادہ تر دوسرے درجات کا جز و فضول ہے یا آبادی کے وہ اجزا ہیں جنہیں اُن کی کس پرسی اور غربت کی وجہ سے سوسائٹی (معاشرت) کی معینہ تنظیم میں کوئی جگہ حاصل نہیں ہوتی۔ یہ امر فی نفسہ غلط اور سیاسی نظر سے خطرناک ہے کہ سلطنت کے باشندوں کے درمیان ذی الماک اور غیر ذی الماک کی ایک معینہ تقابلی قائم کی جائے اور آخر الذکر کے مجموعے کو ”غیر ملکی“ قرار دیکر اُن میں اور ”ملکیوں“ میں خاصیت پیدا کر دی جائے اگر عدم ارتباط کا یہ خیال جس کی زائد از ضرورت نہمت افزائی کی گئی ہے اسی طرح پھینتا رہا اور اسے غلبہ حاصل ہو گیا تو یہ بربریت کے ایک نئے طوفان سے منہ ب سوسائٹی کو غرقاب کر دے گا۔ خوش قسمتی سے غیر ذی الماک اشخاص کا بڑا حصہ ہنوز دوسرے درجوں سے جسمانی ربط و تعلق رکھتا اور اُس پر مطمئن ہے۔ بے ملک لڑکے ”غیر ملکیوں“ کے زمرے میں شامل نہیں ہیں کیونکہ وہ اپنے خاندان کی حفاظت و ترتیب میں ہیں اور اپنے والدین کی حیثیت میں شریک ہیں نہ ہی حلقوں کی تنظیم میں نہیں تاکہ کو خاندانی زندگی حاصل ہے۔ تیر کھیتوں میں کام کرنے والے مرد و عورت جن کی کوئی ملک نہیں ہوتی وہ بھی ”غیر ملکیوں“ کے تحت میں شامل نہیں کئے جاسکتے کیونکہ وہ دنیا میں تنہا نہیں ہیں بلکہ زراعت کا ہ یا کسان کے خاندان میں انہیں جگہ ملتی ہے اور کسانوں کے طبقے کی زندگی میں وہ شریک ہیں دستکاروں کا انتظام جب بہتر تھا تو امیر و اراکام کرنے والا اپنے استاد کے خاندان کا ایک رکن ہوتا تھا اور اب اس تعلق کے ٹوٹ جانے پر بھی دستکار جماعت سے متعلق ہونے کا خیال اُسے ”غیر ملکیوں“ سے بند رکھتا ہے، خانگی ملازم بھی کسی قدر آرام کی حالت میں رہتے ہیں

اور اپنے آقاؤں کی معاشرت میں اُن کا کچھ نہ کچھ حصہ ہوتا ہے سپاہی کو تنخواہ ملتی اور سپہگری کا کام اُس کی عزت کا موجب ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ خطرناک صورت عام مزدوروں کی غیر منظم حالت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی جماعت ہے جس میں "غیر ملکیوں" کا اجتماع نہایت درجہ وسیع اور خطرناک حد کو پہنچ گیا ہے۔ بد سلطنت کا اصلی تدبیر ہونا چاہیے کہ ایک طرف وہ کوشش کر کے مزدوروں کی منظم جماعت کے اراکین کو غیر منظم "غیر ملکیوں" میں شامل ہو جانے سے روکے اور دوسری طرف تا حد امکان "غیر ملکیوں" کو اس منظم جماعت تک ترقی کرنے میں مدد دے جہاں وہ نسبتاً زیادہ قابل اطمینان ذریعہ معاش حاصل کر سکیں "غیر ملکی" اس طرح محدود ہو کر جدا کا نہ تنظیم کی ضرورت نہ سمجھیں گے جس کے لئے وہ ناموزوں ہیں بلکہ انھیں صرف ایسے سرپرستوں کی ضرورت ہوگی جو اُن کے اغراض کی حفاظت اور اُن کی نیابت کا حق ادا کریں۔

طبقہ چہارم کے
سیاسی و عاوی

طبقہ چہارم سلطنت کے عہدوں کے کام انجام دینے کی قابلیت نہیں رکھتا مگر اُس کے بہتر افراد بلدی عہدوں کی خدمات انجام دے سکتے ہیں اور وہ ان سے محروم نہیں کئے جاسکتے۔ قوم کی نیابت میں انھیں حصہ ملنا چاہیے اور سلطنت کو اس امر پر نظر رکھنا چاہیے کہ طبقہ سوم اپنی اعلیٰ تعلیم اور زیادہ فرصت کی وجہ سے اس طبقہ چہارم کو کلینتہ محروم نہ کر دے جیسا کہ اب تک ہوتا رہا ہے لیکن چونکہ اس وجہ کے اراکین کو بذات خود اپنے اغراض کی نیابت کی نہ فرصت ہے نہ قابلیت اسلئے انھیں موقع ملنا چاہیے کہ وہ اپنی جماعت سے باہر کے لوگوں کو اپنا قائم مقام منتخب کر سکیں آخر میں یہ کہنا ہے کہ اس درجے کی اہمیت اسے اظہار رائے کا مستحق قرار دیتی ہے مگر جہاں افراد مشترکہ کی معاشری اہمیت اور قابلیت اس درجہ مختلف ہو وہاں یہ نا انصافی ہے کہ سب کو برابر کا اختیار دیا جائے۔

حقیقی "غیر ملکیوں" کے حقیقی اغراض کا تقاضا قائم مقاموں سے زیادہ سرپرستوں کے لئے ہے کیونکہ وہ خود اپنے اندر قائم مقامی کے لائق افراد نہیں پاسکتے اور سرپرست کی حیثیت اور اس کا اثر جس قدر بلند ہوگا اسی قدر "غیر ملکیوں" کے حقوق کی حفاظت زیادہ موثر طور پر ہوگی۔

انیسواں باب

سلطنت کا تعلق خاندان سے

(۱) - قبائلی سلطنت - پدرسری حکومت - ازدواج

مقدمین و متاخرین سب نے خاندان کو سلطنت کا نمونہ قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ سلطنت ایک طرح پر خاندان کی توسیع ہے۔ سرسلطنت باپ کے بجائے ہے اور رعایا اُس کے بچے ہیں۔

یہ مقابلہ صرف ایک محدود مفہوم میں صحیح ہے۔ یہ صرف ایک پدرسری سلطنت پر صادق آسکتا ہے۔ سلطنت کی اعلیٰ صورتوں پر جن کی بنا قومیت اور انسانیت پر ہے یہ خیال منطبق نہیں ہوتا۔ پس ضروری ہے کہ اُن اصولی فرقوں کی تشریح کر دی جائے جن سے سلطنت اور خاندان میں تمیز ہوتی ہے۔

سلطنت اور
خاندان کے
درمیان فرق

۱۔ خاندان کی بنا ازدواج پر ہے اُس کے اراکین ازدواج کے رشتے یا خون کے تعلق سے متحد ہوتے ہیں مگر یہ خیالات جو خاندان کے لازمی ہیں سلطنت کیلئے کسی اعتبار سے لازمی نہیں ہیں ایک ہی سلطنت کے رکن ہونے کی حیثیت سے لوگوں کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ ازدواج اور خون کے وسیلے سے نہیں ہوتا انہیں ہمیشہ ازدواج باہمی کا حق حاصل نہیں ہوتا چاہئے کہ وہ سب کے سب ایک ہی نسل سے ہوں پس خاندان کے بنیادی حقوق سلطنت سے بالکل آگاہ ہیں۔

۲۔ سلطنت کی بنا قوم کی تنظیم اور اُس کے ارضی تعلق پر ہے مگر خاندان میں ان خیالات کا کوئی دخل نہیں ہے۔ سلطنت خاندانوں کے بجائے زیادہ تر افراد طبعاً یا جماعات پر مشتمل ہے اور صرف مستثنیٰ حالتوں میں خاندانی واسطے سے اپنے

ارکین تک پہنچتی ہے خاندانی زندگی میں وہ صرف اسی وقت دخل دیتی ہے جب کوئی خاص ضرورت داعی ہوتی ہے یا تولیت کی صورت پیش آتی ہے۔ آخر آئیہ کہ خاندان کا کوئی واسطہ زمین سے نہیں ہوتا۔

۳۔ دونوں حصوں (یعنی سلطنت اور خاندان) اپنی کیفیت میں مختلف ہیں۔ خاندان کا بزرگ باپ ہوتا ہے جس کا اقتدار یہ ہے کہ ایک بالغ شخص خود اپنے دم و لحم کی حفاظت کی فکر کرتا ہے فی الاصل یہ ایک طرح کی تولیت ہے۔ سلطنت میں مختلف جماعت کے اغراض اپنے سردار یعنی بادشاہ سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے خاندانوں کا تعلق بادشاہ کے خاندان سے نہیں ہوتا، نہ سلطنت کے افراد اس کے بیچے یا اس کے زیر تولیت ہوتے ہیں، سلطنت کی حکومت ایک سیاسی حکومت ہے پس خاندان عام سلطنت کا نہیں بلکہ اس کی صرف ایک صورت خاص یعنی پدری سلطنت کا نمونہ ہے اس لئے خاندانی قانون، قانون شخصی سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ قانون عام سے مگر سلطنت کی ابتدا آریائی اقوام تک میں خاندان اور قبیلے ہی کے روابط سے تعلق رکھتی ہے اول اول بادیان قوم، منصفوں اور حاکموں کو اپنے اختیار کی ضروری تائید خاندان ہی سے حاصل ہوئی اور صرف تدریجی طور پر یہ ہوا کہ ایک سیاسی نظم ایسا پیدا ہوا جو ان حدود سے بجا ذکر کر گیا۔

بقائمی
نظام

بقائمی نظام نے خاندان اور سلطنت کے مابین ایک پل کا کام دیا اور جس وقت سلطنت اپنے قیام کی طرف سے مطمئن ہو گئی اُس وقت یہ پل گرا کر الگ کر دیا گیا اکثر قدیم اقوام میں ہیں ایسے قبائل ملتے ہیں جو سیاسی اہمیت رکھتے تھے مگر جو بعد میں ناپید ہو گئے ایسے قبیلے قدیم موسوی نظام حکومت میں بھی اسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح قدیم یونانی یا قدیم رومی نظام حکومت میں جس طرح قدیم عربی قبیلے اپنے

لے گوینو نے اپنی کتاب "انسانی نسلوں کی ناسلویت (Sur e'inegalite "des races humaines) میں یہ بیان کیا ہے کہ پدری تصور حکومت جو باپ کے اقتدار کو فرمانر دایا نہ اقتدار کا نمونہ قرار دیتا ہے، اسے آریائی قوموں نے بہت سمجھ بوجھ کے اور احمق ستیات کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ برخلاف ان کے چینیوں کو جو زرخش کی سب سے بڑی قوم ہیں۔ اس طرح حکومت کی کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔

سرداروں کا پدارت احترام کرتے تھے اُسی کا منورہ ہمیں اسکا ٹلینڈی جبرگوں میں ملتا ہے جبرمانی دیہاتوں کے نام اس بات کا کافی ثبوت یہم پہنچاتے ہیں کہ وہاں جو لوگ سکونت پذیر تھے وہ قبائل یا خاندانوں کی صورت میں منضبط تھے۔ بعد ازاں انھیں قبیلوں نے اپنے متکین جھٹوں کی صورت میں عضو بند کر لیا۔ اور قدیم سلاو کسانوں کے جھٹوں کی نوعیت بھی ایک خاندان کی سی ہے۔

قبیلے اور خاندان میں فرق یہ ہے کہ ایک قبیلے کے اندر متعدد ایک جہی گروہ داخل ہوتے ہیں مگر قبیلے کا انتظام خاندان کے انتظام کے مثل ہوتا ہے، قبیلے کے سردار بالعموم وہی لوگ ہوتے ہیں جنہیں خاندانوں کے اندر ملن مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ مگر اتحادی ضرورت قبیلے کی سرداری کو ایک خاندان کے ایک ہی سرگروہ (سردار) تک محدود رکھتی ہے اور ایسا ہو سکتا ہے کہ خاندانی حق کے بجائے انتخاب یا قرعہ اندازی کے طریقے پر عمل کیا جائے۔

پدر سردری
سلطنت

جو سلطنت قطعی طور پر خاندان کے نمونے پر قائم کی گئی ہے وہ پدر سردری سلطنت ہے۔ چین کی کاہلہ شہنشاہی (جسے خود چینی، ٹیوشی شہنشاہی کے نام سے یاد کرتے ہیں) صدیوں سے مضبوطی کے ساتھ اس خیال پر جمی ہوئی ہے کہ سلطنت کا سرتاج رعایا کا باپ ہے۔ گوینیو جس نے اس یقین کے وجوہات ظاہر کئے ہیں کہ سلطنت کی اول بانی آریائی نسلیں ہیں وہ پدری خیال (سلطنت) کو انھیں کی تجویز کی طرف منسوب کرتا ہے مگر اس شہنشاہی عظمیٰ کی نہایت کشیدہ آباوی جو بتدریج ایک خاندان میں متحد ہو گئی ہے اس کی اصل ملائیائی نسل سے ہے جس میں زرد نسل کا جزو نہایت غالب ہے۔ گو کا فی نسل کے میل سے وہ بالکل بے غش نہیں رہی ہے۔ یہ آباوی جو آسان پسند مادی زندگی کی طرف مائل ہے حکمرانوں کی پدارت مطلق انسانی پرورش سے راضی ہو جاتی ہے اور سلطنت کے ردائی نظام کو ایک متجانب اندر نظام تمدن سمجھ کر اس کا احترام کرتی ہے۔ آریائی قوموں میں آزادی کا جو مضبوط احساس مطلقاً موجود ہے اس کا اس پر کچھ اثر نہیں ہے اور نہ اس کے حوصلوں میں کچھ بندی ہے نظریے کے لحاظ سے تو شہنشاہ اقتدار مطلق رکھتا ہے مگر حقیقت میں قوم کے سارے طبقوں کے سکون پسند طابع، منداریوں (یعنی چینی مالوں) کی قدیمانہ فضیلت، تاتلیلم و تربیت اور سب سے بڑھ کر نسلانہ نسل کے خاندانی رجحان

کی قوت نے اس اقتدار مطلق کو بہت کچھ محدود کر دیا ہے۔ چنانچہ گو بیٹو کہتا ہے کہ ”آسمان کا بیٹا دینی ظل اللہ“ سب کچھ کر سکتا ہے مگر اسی شرط پر کہ وہ صرف وہی کرنا چاہے جس کا علم اور جس کا رواج پڑنے زمانے سے چلا آ رہا ہے بلکہ جہاں سلطنت اور اس کے اراکین ایک پدرانہ نظام سلطنت کے ذریعے سے دائمی طفولیت کی حالت میں کچے چائے وہاں زور و اسیاسی ترقی کا ہونا ناممکن ہے۔

سلطنت کی بہبود پر خاندانی زندگی کا اثر ایک بالکل ہی جداگانہ سوال ہے اس کا اثر اگرچہ زیادہ تر بالواسطہ ہوتا ہے مگر یہ دور رس اثر ہے اور جس قدر بھی اسے بلند سمجھیں کم ہے اس لیے سلطنت پر نہ صرف یہ لازم ہے کہ وہ خاندانی قانون کی شخصی قانون کے ایک جز کے طور پر معافیت کرے بلکہ خاندانی زندگی کی بہبود کے ترقی دینے اور اس کے برقرار رکھنے پر بھی اسے خاص توجہ کرنا چاہیے کیونکہ خاندان کسی متمدن سیاسی تنظیم نہیں ہے اس لیے اس معاملے میں سلطنت کی طاقت کم اور زیادہ تر بالواسطہ ہے مگر ہنس تعلقات ایسے ہیں جن میں وہ شخصی خود سری کو روک سکتی ہے اور اسے روکنا چاہیے۔ مثلاً ازدواجی تعلق کے معاملات میں۔

تمام اعلیٰ ترقی یافتہ قومیں۔ تو حد ازدواج کو بڑی اہمیت دیتی ہیں۔ ایک ہی بیوی کے کسی شوہر ہوں تو خوں ہی میں ابتری پڑتی ہے اور ایک مرد کی کئی بیویاں ہوں تو خاندان میں منافقت پیدا ہوتا ہے۔ ازدواج کی کامل یکجہتی تب ہی حاصل ہو سکتی ہے جب ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت میں باہم اتحاد و کاشتہ قائم ہو۔ جنسوں کی دوئی جس میں انسانی دنیا منقسم ہے تو حد ازدواج کے ذریعے سے وہ دوئی پھیل کر ایک ہی بن جاتی ہے اس لیے تعدد ازدواج نہ فطرت کے مطابق ہے نہ اخلاق کے پس سلطنت کو اس کا روادار نہ ہونا چاہیے۔ جب کال کے اساتذہ میر و ونکی بادشاہوں کے تعدد ازدواج کی پرورش مخالفت کر رہے تھے اور انھوں نے اس وقت تک سپر ڈالی جیتک کہ ان بادشاہوں نے نیٹو لڑنی بادشاہوں کے اس قدیم شاہی حق سے دست برداری نہ اختیار کی جس کی رو سے ان کو کئی بیویاں کرنا مباح تھا۔ اس وقت یہ اساتذہ محض ایک مسیحی اصول کی حفاظت میں سینہ سپر نہ تھے بلکہ وہ ایک سیاسی اصول کی بھی حفاظت کر رہے تھے۔ تو حد ازدواج سے معاشرت میں بیوی کا مرتبہ پوری طرح پر شوہر کے مرتبے کے برابر ہو جاتا ہے اور شوہر

خاندان کا
اثر سلطنت پر

ازدواج ،
اس کی آئین
صورت تو حد
ازدواج ہے

پراس کا ایک عمدہ اثر مترتب ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے تعداد ازدواج عورتوں کو مردوں کی مخفی نفسانی خواہشات کے آگے بنا کر ان کو ذلیل کر دیتا ہے اور عورت کی اس ذلیل و خوار حالت کا عکس خود شوہر پر پڑتا اور اسے بھی مبتذل بنا دیتا ہے تو حد ازدواج یورپی اور سچی قوموں کی ایک خاص افضلیت ہے اور تعداد ازدواج مشرقی قوں کا موردنی طوق لعنت میان بیوی کے قانونی تعلقات کا مسئلہ بھی ایک نہایت ہی اہم مسئلہ ہے۔

اس میدان میں رومی قانون، رومی تخیل ازدواج سے پیچھے رہ گیا۔ رومیوں کے خیال کے مطابق میان بیوی کا تعلق مرد اور عورت کا ایک دلی اور عمر بھر کا اتحاد تھا مگر ان کا قدیم قانون بیوی کو لڑکی کے مثل قرار دیتا تھا۔ شوہر کو اس پر ویسا ہی اختیار مطلق حاصل تھا جیسے باپ کو اولاد پر یا مالک کو غلاموں پر۔ بخلاف اس کے زمانہ بعد کے قانون نے اس اتحاد کو محض دو آزاد و مخصوص کا تعلق قرار دے دیا۔ رومی جمہوریہ کے آخری زمانے میں جس قدر رومیوں کا اخلاق خراب ہوتا گیا اسی قدر ازدواج کا یلہ آزاد طریقہ زیادہ عام ہوتا گیا اور جمہوریہ کے زوال کو آگے بڑھانے میں اس نے مدد دی۔

اس کے مقابلے میں جرمانی قانون ہے جس کا قدیم تراصول تو یہ تھا کہ مناکحت کے اتحاد اور یکجہتی کی بنا پر بیوی قانوناً شوہر کی حفاظت میں آجاتی تھی گو مرد اور عورت دونوں اپنی اپنی ملکیت کے مالک رہتے تھے مگر بعد کے اصول کے موافق ملکیت بھی متحد ہو جاتی ہے۔ یہ قانون اس خیال کے مطابق ہے جو موسوی شریعت کے نہایت قدیم احکام میں ان دو دلکش جملوں میں ظاہر کیا گیا ہے:۔ میان اور بیوی ایک ہی جسم ہیں اور شوہر بیوی کا سر تلج ہے۔“

ازدواج کی ظاہری صورتوں سے بھی لاپرواہی نہیں اختیار کی جاسکتی۔ اس صورت کو جو بیاہ کے تعلق کی گہری یکجہتی اور تقاضے کو ظاہر کرنے کے لئے زیبا ہے اس صورت کے مقابلے میں ترجیح ہے جو اسے محض ایک معاہدے کا اختیاری نتیجہ قرار دیتی ہو۔ قدیم رومی اصول کے بموجب شخصوں کا آپس میں رضامند ہو جانا ہی بیاہ ہے۔ عمل تال ہے کیونکہ یہ اس ان خیال کی طرف منہج ہوتا ہے کہ مناکحت ایک معاہدہ محض سا تعلق ہے۔

پس اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ اکثر اقوام کے رسم و رواج میں عقد کیلئے مذہبی رسوم قرار دیے گئے ہیں اور سچی قوموں کا عمل بھی اس پر رد و دیتا ہے کہ بیاہ کر جائیں ہو

میان بیوی کا
قانون

بیاہ کی سہیں

اس بات سے بھی زیادہ اہم ہے خاندان کی قانونی حفاظت جو جھینٹہ عقد کے منافی ہے اور اس معاملے میں صرف اعلان اور تحریری توثیق ہی سے اطمینان ہو سکتا ہے۔ غیر کلیسا کی یا قانونی صورت میں پر شرائط پورے ہو جاتے ہیں۔ اگر سلطنت کی تسلیم کردہ آزادی مکت میں دخل دیکر اور قانون کو خیالات پر منحصر قرار دیکر پادریوں نے مذہبی شکل ازدواج سے بیجا کام نہ لیا ہوتا تو موجودہ سلطنتیں اس طریقے سے مطمئن رہتیں مگر ان خرابیوں اور مذہبی آراء کے موجودہ اختلاف نے ایک خالص قانونی صورت کی ضرورت لاحق کر دی ہے۔ اب دو شکلیں رائج ہیں۔

۱۔ عام سلطنت کے رد برو قانونی مناکحت جو کسی عقد کے صحیح قرار دینے کے لئے ضروری ہے۔

۲۔ مابعد کی کلیسا کی رسم جسے پادری انجام دیتے ہیں۔ اس سے مناکحت کو مذہبی قبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ امر اختیار ہی ہے۔

شہنشاہ آگسٹس نے قانون کے ذریعے سے مناکحت اور آبادی کے بڑھانے کی وسیع پیمانے پر کوشش کی۔ اس قسم کے قانون کی ضرورت اُسی وقت ہوتی ہے جب قوم ایسی غیر متدرست حالتوں میں مبتلا ہو جن کے باعث افراد جذبہ فطری کے مطابق آپس میں اتحاد قائم کرنے سے باز رہیں۔ یہ حالات خصوصاً بڑے شہروں کی معاشرت میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ شہروں میں لوگوں کو معاشرت کی ضروریات کو پورا کرنے کے علاوہ ازدواج کے اور بھی بہت سے موقعے حاصل ہیں ان کی وجہ سے ایک بے لگام اور اور قابل نفرت زندگی عام ہو گئی ہے۔ دوسری جانب شہر میں رہ کر ایک خاندان کے مصارف برداشت کرنے میں بھی خاصی دشواری ہے ایسی باتیں خاص کر اعلیٰ طبقوں میں مناکحت کی قرار واقعی روک تھام کر دیتی ہیں۔

رومان و صیت کی آزادی نے اس راہ میں ایک اور بھی روک پیدا کر دی تھی کیونکہ ایک غیر شادی شدہ دولت مند شخص کو یہ یقین ہوتا تھا کہ اُس کے بڑھاپے میں اُس کے پُر طمع اعوان و اجاب نہ کرنے کے شوق میں غلاموں کی طرح اُس کی خدمت اور خوشنماہ کریں گے۔ آگسٹس جیسا طور پر یہ کہہ سکتا تھا کہ ”مکانوں“ مسقف راستوں اور خالی بازاروں سے شہر نہیں بنتا ہے بلکہ شہر آدمیوں سے بنتا ہے اگر تم ناکتھانی پر مصر رہو

ازدواج کی
ہمت افزائی

تور وائیو اینوں بلکہ جیشیوں کا تشکار ہو جائے گا۔

مگر وہیات میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کسانوں کی اراضی کے قائم رکھنے اور جائیدادوں کی تقسیم کے روکنے کے خیال سے اس قسم کی بندشیں موجود ہیں۔ چنانچہ اکثر مقامات میں صرف دو اولادوں کو وراثت ملتی ہے۔ بعض جگہ بڑے بیٹے کے سوا باقی کل بیٹے زرعی خادم سمجھے جاتے یا باہر بھیج دئے جاتے ہیں۔ مناکحت اور تناسل کے بڑھانے کے لئے سلطنت جن ذرائع کا استعمال کر سکتی ہے وہ بلاشبہ محدود ہیں اور جیسا کہ آگسٹس کو خبر بہ ہو گیا ہر صورت میں ناگوار سمجھے جاتے ہیں۔ مناکحت پر کسی کو قطعی طور پر مجبور کرنا ممکن نہیں کیونکہ اُس کے لئے جانبین اور ان کی آزادانہ مرضی لازمی ہے۔ ایک صاحب تاج و تخت کے معاملے میں جہاں مفاد عامہ کے لئے مناکحت بسا ضروری ہے سلطنت کی مرضی کو شخصی حقوق میں مداخلت کرنے اور انسانی آزادی میں دست انداز ہونے کے بجائے زیادہ تر خود اپنی مرضی کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ اس معاملے میں ملکہ وکٹوریہ نے شاہی آزادی کو اہم سیاسی اغراض کے مقابلے میں کامیابی کے ساتھ قائم رکھا۔ سلطنت صرف اس طرح بالواسطہ کار ہو کر سکتی ہے کہ ازدواج کے لئے خاص امتیازات مقرر کرے اور بجز وہ کے منافع کو کم کر دے مگر اسے جرم نہ قرار دے۔ رومی قانون نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔

اس کے برخلاف موجودہ سلطنتوں میں عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ بہبودی علم کے خیال سے ازدواج میں روک پیدا ہو جاتی ہے اس قسم کے قانون کی ضرورت سو سائٹی (نظم معاشرت) کی غیر تندرست حالت اور خاص کر بے الماک اور بے پیشہ جماعتوں کی سقیم مالی کی وجہ ہے۔ اس صورت میں قوم اپنے نفع کے خیال سے یہ مطالبہ کر سکتی ہے کہ جو لوگ عقد کرنا اور نئے خاندان کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ثابت کریں کہ قوم یا سلطنت پر بار ڈالے بغیر وہ خود اپنے خاندان کا بوجہ اٹھا سکتے ہیں مگر اس حد سے تجاوز کرنا اور مناکحت کو سلطنت کی ٹھکانہ مرضی پر منحصر کرنا شخصی حقوق میں ایک نا واجب مداخلت ہے۔ مزید برآں مناکحت پر قانونی بندشیں عائد کرنے سے حرامی بچوں کی تعداد گھٹنے کے بجائے

ازدواج کی
روک۔

سلہ ازدواج کے روکنے والے قوانین و رسوم کے متعلق کل کی پولیٹکل اکانومی و اقتصادیات کتاب دوم باب یازدہم دیکھنا چاہئے۔ (انگریزی مترجم)

اور بڑھتی ہے اور اس طرح ایسے بے گھر بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے جن کی نپرورش ٹھیک ہوتی ہے اور نہ اچھی تربیت۔ خاندان کے قیام اور بیوی کی۔ دسے شوہر پر عمدہ اخلاقی اثر پڑتا ہے اور اقتصادی نظر سے بھی سودمند ہو سکتا ہے اسلئے علی العموم مناکحت کی کامل آزادی کو مستحسن سمجھنا چاہیے۔ اگر قانون سب کی بھلائی پیش نظر رکھتا ہے تو اسے غراب کے لئے یہ امکان پیدا کرنا چاہئے کہ ایک غریب کسی کو اپنی عزت کا رفیق اور اپنے بچوں کی جائز اور باحرمیت مان بناسکے۔

سلطنت زن و شوہر کے خانگی تعلقات میں مداخلت نہیں کر سکتی لیکن نقصان دہ فریق کی شکایت پر حق ازدواج کے توڑنے والے کو سزا دی جاسکتی ہے اور سزا دینا چاہئے تاکہ مناکحت کی پاکیزگی کی گمانیت ہو سکے۔

افلاطون نے اپنی خیالی سلطنت کے محافظین کے لئے بیویوں کی جس قسم کی جماعت عام کی تجویز کی ہے وہ ازدواج کی ذلت اور خاندان کی تباہی کا موجب ہے۔ بیویوں سے فاحشہ عورتوں کی طرح کام لینا جس پر بعض صورتوں میں اسپارٹا میں عمل ہوتا تھا وہ وحشت کی یادگار ہے، لیکن بیچ کن اجتماعی فریق، انفرادی آزادی کی ترقی کے زعم میں آزادی جسم کی جس طرح طرفداری کر رہا ہے اس سے انسان کی اخلاقی آزادی کو کتوں کی شہوانی آزادی سے پست تر بنا دیتا ہے۔

آخر میں ازدواج کے بقا اور طلاق کے حصر کے لئے سلطنت کا قانون بیان کرنا ضروری ہے عیسوی زمانے کے قبل بھی عقد مناکحت کا انفساخ محض زن و شوہر کی مرضی پر نہیں چھوڑ دیا گیا تھا، البتہ مختلف قانونی طریقوں سے شوہر کے لئے جائز تھا کہ وہ اپنی بیوی کو علیحدہ کر دے لیکن ایسا کرنے کے لئے شوہر کو بالعموم کافی وجہ ظاہر کرنی پڑتی تھی، اور جیسا کہ ہم قدیم یونانی قوانین میں دیکھتے ہیں، اگر مرد ایسا نہ کر سکتا تو اسے بھی سخت نقصانات برداشت کرنا پڑتے، برخلاف اس کے بیوی مناکحت کو فسخ نہیں کر سکتی تھی، یہ قواعد جن پر رواج نے مہر تصدیق لگا دی تھی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عام طور پر مناکحت زندگی بھر کا تعلق سمجھی جاتی تھی رومانے جب اتھینز کا اصول اختیار کر کے آزاد مناکحت کو جانین کی مرضی پر قابل فسخ قرار دیا تو اس نے اس خیال کی صاف صاف خلاف ورزی کی۔ یہ امر ایک بڑی حد تک رومانے کے اخلاقی تنزل کا نتیجہ تھا اور پھر

اپنی باری میں اُس نے خود اخلاق کو خراب کیا۔

عیسویت نے اس معاملے میں ایک نیا اور زیادہ مکمل قانون شائع کیا طلاق کے خلاف خود حضرت عیسیٰ کے الفاظ اس قدر سخت تھے کہ اگرچہ ان سے قطعی طور پر کوئی نیا قانون نہیں پیدا ہوتا تھا، نہ کوئی پرانا قانون بدلتا تھا پھر بھی ان الفاظ نے باواسطہ عیسائی سلطنتوں کے قانونی خیال پر اثر ڈالا۔ کیتھولک مذہب نے قانون ازدواج کا ایک سخت نظم قائم کیا اور باوجودیکہ حضرت عیسیٰ نے زنا کاری کو صاف طور پر طلاق کی وجہ قرار دیدیا تھا اس پر بھی ایک وقت ایسا آیا کہ کیتھولک کلیسا نے طلاق کامل کی قطعاً ممانعت کر دی تھی اور صرف ظاہری طلاق کی اجازت دی تھی اور وہ بھی صرف چند سخت وجوہات کی بنا پر۔ ازمنہ وسطیٰ کی عیسوی سلطنتوں نے اس خیال کو میاں تک قبول کیا کہ انھوں نے طلاق کے تمامی معاملات کو صرف مذہبی ہی عدالتوں کے سامنے پیش کرنے کی اجازت دی۔ زیادہ قریبی زمانے میں ان معاملات کے متعلق سلطنت نے خود کاروائی کرنے کا صحیح طریقہ اختیار کیا ہے اور پرنسٹن فرقی نے زنا کاری اور منہا اُس کے ماحول وجود پر طلاق کو تسلیم کر لیا ہے آخر الامر یہ کہ کچھ تو طبعی حقوق کے جدید خیال کا لحاظ کر کے اور کچھ شخصی آزادی کی غرض سے موجودہ زمانے کے قانون نے طلاق کے وجوہات کو وسعت دے دی اور اسے زیادہ آسان بنا دیا ہے مگر دو اصول بالعموم برقرار رکھے گئے ہیں۔

(۱) عقد کا انفساخ محض کسی ایک فریق کی مرضی یا جانین کی تراضی یا ہی سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے عدالت کی وساطت اور منظوری کی ضرورت ہے۔

(۲) ایسی منظوری بلا کافی وجہ کے نہ دی جائے گی۔

کلیسا اس وجہ سے کہ وہ انسان کی اخلاقی اور روحانی طبیعت کا مظہر ہے اس اصول کا حامی ہے کہ عقد کو ناقابل انفساخ سمجھنا چاہئے کیونکہ عقد کا منہائے خیال یہی ہو سکتا ہے۔ سلطنت اس وجہ سے کہ وہ مقتضیات خارجی سے تعلق رکھتی ہے مجبور ہے کہ حالات واقعی کی کمزوریوں پر نظر کرے اور عقد میں جب حقیقی اتحاد و یکجہتی باقی نہ رہے تو ظاہری طور پر بھی اس فسخ کی اجازت دیدے مگر جہان تک قومی رسم و رواج اور شخصی ترقی کی حالت

اجادت دے اسے ناقابل انفساخ عقد کے اصول کو منتہائے نیال کے
 طور پر قائم رکھنا اور طلاق کو سخت قیود کے تابع کر دینا چاہئے ۔

میسواں باب

سلطنت کا تعلق خاندان سے

(ب) عورتوں کا درجہ

اس وقت تک تمام قوموں نے عورتوں کو اسی ملت و قوم سے متعلق سمجھا ہے جس سے ان کے شوہر یا باپ کا تعلق ہو، سلطنت سے ان کا تعلق بالواسطہ سمجھا گیا ہے اور وہ پورے حقوق کے ساتھ سلطنت کی کامل رکن نہیں قرار دی گئی ہیں۔ لیکن دور جدید نے ایک نیا خیال پیدا کر دیا ہے۔ اب سے بہت پہلے مسیحیوں کے فرانسیسی انقلاب کے وقت عورتوں نے بادشاہ کو ایک درخواست دی تھی کہ عورتوں کو سیاسی (یعنی رائے دہی و انتخاب کے) حقوق دیے جائیں اگرچہ اُس زمانے کے فلسفی کو نند و رستے نے اس درخواست کی تائید کی تھی مگر مجلس قومی نے حفاظت کے ساتھ اُسے مسترد کر دیا۔ ہمارے وقت میں بھی مختلف ممالک میں اس مطالبے پر زور دیا گیا ہے اور بالخصوص جان اسٹوارٹ مل نے اپنی تحریروں میں اور نیز پارلیمنٹ میں اُس کی حمایت کی ہے۔ فرانس میں اید و ارد لا بوسی نے بھی وہی روش اختیار کی ہے۔ امریکہ کے بعض ممالک میں کوشش کی گئی ہے کہ عورتوں کو سیاسی حقوق اور فرائض میں حصہ دیا جائے۔

عورتوں کے
سیاسی حقوق

سلطنت میں عورتوں کو براہ راست شریک کرنے کے لئے بل نے جو خاص وجوہ پیش کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

۱۔

(الف) مردوں کی طرح عورتوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ انھیں عہدہ حکومت کا فائدہ حاصل ہو اور عہدہ حکومت ہی نیابت کا مقصود ہے۔

مگر لڑکوں کو بھی عہدہ حکومت کا فطری حق حاصل ہے۔ یعنی سلطنت پر لڑکی کی حفاظت فرض ہے لیکن اس بنا پر کوئی یہ بحث نہیں پیش کرتا کہ انھیں بھی رائے دہی کا

حق حاصل ہونا چاہیے۔ عمدہ حکومت سے انتفاع حاصل کرنے کے حق میں یہ امر دخل نہیں ہے کہ حکومت میں شہرکت یا اس پر اقتدار بھی حاصل ہو۔ اول الذکر ایک ساکت حق ہے ثانی الذکر میں شخصی قابلیت کا ہونا شرط مقدم ہے۔

(ج) حقوق ذاتی اور حقوق عامہ میں ایک طرح کا خیرہ کن تضاد ہے جسے رفع کرنا ضروری ہے، شخصی قانون کے ضمن میں عورتیں اولاً اپنے افعال میں محدود والا اختیار تھیں اور وہ اپنے شوہروں کی تولیت میں سمجھی جاتی تھیں۔ مگر جب یہ تسلیم کر لیا گیا کہ عورتیں اپنی ذاتی ملک کا خود انتظام کر سکتی ہیں تو یہ تولیت اور نگرانی منسوخ قرار پائی اور مرد و عورت دونوں برابری کے درجے پر قائم ہو گئے، لیکن دوسری طرف قانون عام میں یہ فرق بدستور برقرار ہے۔ ہم عورتوں سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ مردوں کے ساتھ محصول تولد ادا کریں مگر انھیں اس حق کے دینے سے انکار کرتے ہیں کہ وہ ان محصولات کی منظوری دیں یا ان کے اخراجات کی نگرانی کریں۔ یہ نا انصافی ہے کہ جس قابلیت کو ہم اور جگہ تسلیم کر چکے ہیں یہاں اس سے انکار کر دیں اور جو مساوات خانگی زندگی میں مفید ثابت ہو چکی ہے اسے معاملات عامہ میں دست دینے سے باز رہیں۔

(ج) ہمارے موجودہ قوانین میں ایک اور بھی تناقض ہے وہ یہ کہ بہت سی قومیں جو عورتوں کو سیاسی حقوق دینے سے انکار کرتی ہیں کبھی کبھی حکومت کا اعلیٰ سیاسی اقتدار ایک عورت کو تفویض کر دیتی ہیں اور اپنے تئیں اس کی رعایا مانتی ہیں۔

البتہ یونانیوں اور رومیوں نے استثناء کے طور پر بھی کسی عورت کو اپنا فرمانروا نہیں بنایا۔ زنانہ مزاج شہنشاہ ہیلیوگیا اس جب اپنی ماں کو سینات میں لے آیا تو رومیوں کے خیال کو اس سے ایسا صدمہ پہنچا کہ اس کے اور اس کی ماں کے قتل کے بعد مجلس نے ایک حکم یہ نافذ کیا کہ جو شخص کسی عورت کو سینات میں لاوے گا وہ تحت التری کے دیوتاؤں پر بھینٹ چڑھا دیا جائے گا (یعنی قتل کر دیا جائے گا)۔ اکثر ٹیوٹو قوموں نے بھی شاہی کو مردوں کے لئے محدود کر دیا تھا یا سیکس برطانیوں کے خصوصیات کے طور پر یہ ذکر کرتا ہے کہ وہ عورتوں کی حکومت کو قبول کر لیتے ہیں۔ اہل لومبارڈی نے بھی اکثر عورتوں کے سلسلے سے شاہی جانشینی کو جائز رکھا۔ ادھر جدید تر زمانے میں عورتیں بکثرت تخت نشین ہوئی ہیں اور آخری چند صدیوں کے اندر انگلستان، آسٹریا، روس، ہنگری اور دوسرے

حکمران شہزادوں
کی مثال سے
اجتماع ضمیمہ

ممالک میں مختلف اشکال حکومت کے تحت میں عورتوں نے حکمرانی کی ہے۔

یہ عجیب و غریب استثنا کیوں ہے جب عورتیں کسی سیاسی حق کی مطلقاً مستحق نہیں ہیں تو پھر ان کو سب سے بڑا سیاسی حق کیوں دیا جاتا ہے؟ کیا اس سے زیادہ قرین عقل یہ بات نہ ہوگی کہ ایک عورت سلطنت کے کسی ادنیٰ درجے کے عہدے پر کارگزار ہو یا مجلس میں اپنی رائے ظاہر کرے بجائے اس کے کہ وہ سلطنت کی ملکہ بنا دی جائے؟

اس کی توجیہ صرف یہ کی جاسکتی ہے کہ سلطنت کے اقتدار و اعزاز کی حیثیت ایک خاندانی ملک کی سی سمجھی گئی ہے اور عورت کے لئے تخت کی جانشینی کا وہی حق روارکھا گیا ہے کہ جو اسے اپنے باپ کی جائیداد پر حاصل ہے۔ سلطنت کی زمین جائیداد یا جاگیر کے مثل قرار دی گئی ہے اور سلطنت کی وراثت بھی قانون شخصی کے اصول وراثت کے تابع رکھی گئی ہے اس حق کی ابتداء زمانہ قدامت میں ہوئی اور بعد کو اسے وصیت دی گئی اور زمانہ جدید کی بہت سی سلطنتیں اگرچہ جاگیر دارانہ سلطنت کے خیال سے آگے نکل گئی ہیں اور دوسرے معاملات میں قانون شخصی اور قانون عامہ میں قطعی فرق کرتی ہیں مگر قدیمی دستور کی اس یادگار کو ہنوز باقی رکھے ہوئے ہیں جس میں خاندانی رشتہ خون کو سلطنت کی نوعیت اور عورت کے حق کا رکنی سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

(۱) چونکہ اکثر عورتیں خاندان میں رہتی ہیں وہ علماً اکثر اپنے بزرگ خاندان کے ساتھ ہوں گی۔ بیوی اپنے شوہر کے ساتھ رائے دے گی اور لڑکیاں اپنے باپ کے ساتھ اس طرح بزرگان خاندان کو جنہیں سلطنت کی ریڑھ کی ہڈی کہنا چاہئے زیادہ سیاسی قوت حاصل ہو جائے گی ایسے باشندوں کے مقابلے میں جو ناگتہذایا بے گھرے اور بیفکرے ہیں۔

(۲) سیاسیات میں عورتوں کا اثر جو آج بھی سو سائٹی میں اور گھروں کے اندر نمایاں ہے اُس سے ہر گز مفر نہیں ہو سکتا مگر سردست یا غیر منظم طریقے پر اور زیادہ تر خبیثہ طور سے مرتب ہوتا ہے اور ہمیشہ اس صورت سے کہ عورتیں اُس کی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتیں، اس لئے یہ بہتر ہوگا کہ اس اثر کے لئے ایک صحیح راستہ نکال دیا جائے جس کی حفاظت کا بھی بندوبست کر دیا جائے اور عورتوں کو سلطنت کے کاموں میں شریک بنائے ان پر واضح کر دیا جائے کہ کسی امر کا فیصلہ کرنے یا اُس پر رائے ظاہر کرنے میں ان پر ذمہ داریاں کیا ہیں۔

عورتوں کو رائے دی کا حق دینے کی ان دلیلوں میں جو اوپر بیان ہوئیں غالباً جو جتنی دلیل سب سے زیادہ قوی ہے گراں سے بھی زیادہ قوی دلیلیں دوسری جانب سے پیش کی جاسکتی ہیں۔

(الف) تمام متمدن قوموں کا کسی امر میں متحد الرواج ہونا ایک قطعی دلیل کی قوت تو بلاشبہ نہیں رکھتا لیکن یقیناً ہر ایک ایسے تغیر سے خبردار کرتا ہے جو فوج انسان کے مستقل حالات اور احساس کے منافی ہو۔

عورتوں کے
حق رائے دہی
کے مخالفین
دلائل۔

(ب) عورت کی فطرت عورتوں کی تخلیق کا بڑا مقصد خانہ داری کا انصرام ہے اور اگر وہ سیاسی کاموں اور سیاسی جدوجہد میں زیادہ مشغول ہوئیں تو ان کے اصلی فرائض کی اہمیت ان سے جاتی رہے گی، زانی خویوں کو اس سے نقصان پہنچے گا ماں اور بیوی کی حیثیت سے عورتوں کی محبت و الفت خانہ داری کی مہارت، اخلاق کی لطیف حیثیت و دلاوت پر سب خوبیاں بر باد جائیں گی اور اس کی تلافی کے لئے سیاسی قابلیت سے کچھ نفع نہ پہنچے گا۔

(ج) سلطنت کی مردانہ فطرت۔ سلطنت جو بحیثیت ایک قوم کے بالارادہ اپنائتیں اور اپنے اوپر حکمرانی کرتی ہے وہ اپنی مردانہ خصوصیت اور مردانہ روح کو زندہ کر دیتی اور رنگ مزاجی کی آئینہ نش سے کمزور کرنا ہرگز کو ارا نہ کرے گی۔

(د) یہ عظیم خطرہ کہ ملک کے سیاسی فریقوں کے مناقشوں میں (عورتوں کی ذکی الاحساس فطرت کے باعث) وجدانی جوش و خروش بڑھ جائے گا اور مردانہ شعور کی کار فرمائی گھٹ جائے گی اور اس پر ایک روک عائد ہو جائے گی۔ انفعالی قوتیں ترقی ایک سلطنت کو نقصان پہنچائیں گی اور فاعلی قوتیں کمزور پڑ جائیں گی۔

پس اگرچہ ہم خاص خاص ششیاں جیسے عورت کی تخت نشینی کے رد اور ہو سکتے ہیں جس سے موزوں حالات اور متمدن ملک میں کسی خطرے کا اندیشہ نہیں ہو سکتا لیکن عورتوں کو عام طور پر سیاسی حقوق دیدینا ملک ثابت ہو گا۔

عورتوں کا
بالواسطہ اثر

لیں اگرچہ عورتیں معاملات عامہ میں براہ راست حصہ لینے سے اس طرح پر خارج رکھی گئی ہیں تاہم یہ وہ عامہ کے کاموں میں ان کے بالواسطہ اثر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے لیکن یہاں بھی اگر اس اثر کی رہبری سیاسی اغراض کے تابع ہوگی تو وہ آسانی سے ذلت کی حالت

میں آجائیکا۔ وہ مناف اور سود مند اسی وقت رہتا ہے جب تک اخلاقی اور مذہبی محرکات اس کے باعث ہوں۔ جو عورتیں سیاسیات میں مشغور رہی ہیں۔ اُنہوں نے بالعموم اپنی سلطنت اور اپنے دوستوں کو نقصان ہی پہنچایا ہے۔ ان کی چالاکی اور زیرکی خطرناک سازش میں تبدیل ہو جاتی ہے اور جب ایک بار سیاسی نفرت، انتقام اور حرص کی آگ عورت کے سینے میں جلنے لگتی ہے تو پھر وہ بے طرح بھڑک اٹھتی اور ایسی پھیل جاتی ہے کہ مرد بھی اُس کی جیپٹ میں آئے بغیر نہیں رہتے۔ یہ بات کچھ فراموشیوں کی آستانوں ہی تک محدود نہیں بلکہ ان شریف بیویوں اور ماؤں تک پر صادق آتی ہے جنہوں نے دنیا کی تاریخ میں نام پیدا کیا ہے۔ روم کی تاریخ، فرانسیسی انقلاب، فرانسیسی بادشاہوں کے دربار سب یہی قصہ دہراتے ہیں۔

برخلاف اس کے مدبرین کو عورتوں کے اُس خاموش اثر سے اکثر نفع پہنچا ہے جس کا ذکر تاریخ میں کہیں شاذ و نادر ہی آتا ہے۔ بہت سے مدبروں کو اپنے گھروں میں وہ آسائش حاصل ہوتی ہے جس سے سیاسی زندگی کے شور و شر کی تلافی ہو جاتی ہے اور فرائض کے ادا کرنے کے لئے اُن میں از سر نو تازگی اور قوت پیدا کر دیتی ہے۔ بار بار عورتوں کی نرم دلی نے مردوں کی سخت مزاجی کو تبدیل کر کے اُن کو افراط و تفریط سے بچایا ہے اور اکثر اُن کے حُرمت نے مردوں کو خطاؤں سے باز رکھا اور اُن کے رواج و اخلاق کے احساس نے غلط کاریوں سے محفوظ رکھا ہے اور عورتوں کی ہمت نے اُڑے وقت میں مردوں کو بچایا ہے عورت کی طاقت کسی وقت میں بھی ایسی قوی و معاون نہیں ہوتی جیسی خطرے اور مصیبت کے وقت میں ہوتی ہے۔ مردوں سے دیا وہ صابر ہونے کی وجہ سے وہ ذلت اٹھائے بغیر مصیبت کے برداشت کرنے میں مرد کی مدد کر سکتی ہے۔ عورت کی وفا شناسی مرد کو اپنے ملک پر قربان ہو جانے کے لئے آمادہ کرتی ہے اور اس کی جانب سے مرد کی جرأت و شجاعت کی شناخت و صفت مرد کو اس وصف کے حصول پر براہِ گنجشہ کرتی ہے۔

اس لئے خصوصاً یونانی قوموں کے قانون عامر کی یہ ایک لطیف خصوصیت ہے کہ بیوی اپنے شوہر کے سیاسی مرتبے میں شریک سمجھی جاتی ہے اس طرح عورت کو نظم سلطنت میں اپنی صمیم جگہ حاصل ہو جاتی ہے اور سیاسی حقوق کی محرومیت کا کافی دوا فی معاوضہ ہو جاتا ہے۔

تسلیق

ریل (Riehl) نے اپنے اس معاشرتی و سیاسی مقالے میں جو اس نے "عورتوں" پر لکھا تھا (اور جو تجربانی سہ ماہی رسالے "Deutsche Vierteljahrsschrift" میں ۱۸۷۷ء میں شائع ہوا تھا) اور اپنی کتاب "خاندان" (die Familie) میں دوسری بہت سی لطیف رابیوں کے ساتھ ساتھ مختلف طبقات میں مرد و عورت کے اختلاف تعلق کے بابت بھی نہایت صحیح طور پر توجہ دلائی ہے۔ کسان کی عورت کے عادات اور اس کے اطوار زندگی بہت کچھ کسان ہی کے عادات اور اطوار زندگی کے مانند ہوتے ہیں لیکن اعلیٰ طبقے کی تعلیم یافتہ شہری عورت عادات و خصائل میں اپنے موئے نسبتاً اتنی مماثل نہیں ہوتی مگر اس کے ساتھ سابق الذکر پر غامی پابندیاں بھی زیادہ سختی کے ساتھ عائد ہوتی ہیں جو آخر الذکر پر اس حد تک نہیں ہوتیں اس لئے کہ وہ نسبتاً زیادہ آزاد ہوتی ہے۔ مجھے ریل کی اس رائے پر ضرور اعتراض ہے کہ وہ عورت کے لئے ایک مین فریقی خصوصیت پیدا کر کے اسے کٹسٹروٹیو قرار دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی فرقوں سے عورتوں کی دلچسپی صرف بالواسطہ ہے اور یہ دلچسپی تمام فریقوں پر مشتمل ہے۔ اگر ہم فرقوں کی تقسیم رومر کی رائے کے موافق مردانہ اور زنانہ فرقوں میں کریں تو صاف ظاہر ہے کہ احبار و محافظین اول الذکر کے تحت میں آئیں گے اور اصولی استبداد و ثانی الذکر کے تحت میں ہوں گے۔

اکیسواں باب

سلطنت کا تعلق افراد سے

(الف) اپنے ملک والے اور غیر ملک والے

افراد کا تعلق سلطنت سے کسی خاندان، طبقے یا جماعت کے رکن ہی ہونیکے اعتبار سے نہیں ہے بلکہ سلطنت سے ان کو بلا واسطہ بھی تعلق ہے۔ زمانہ حال کے سیاسی نظریے اور جدید نظام ہائے حکومت اس بلا واسطہ تعلق پر زور دینے کی طرف مائل ہیں اسلئے ہمیں امور ذیل پر خیال کرنا ہے۔

(۱) اہل ملک یعنی سلطنت یا قوم کے اراکین اور غیر ملک کے اشخاص کے درمیان فرق۔

(۲) قوم کے شہری اور اس کے دیگر اراکین کے درمیان فرق۔ شہری جماعت کے مختلف مدارج پر ہمیں اس وقت تک بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے جب تک کہ ہم نظام حکومت پر تفصیلی بحث نہ کریں۔ پہلا فرق زیادہ تر نسل پر منحصر ہے اور ابتداء کے کار میں محض شخصی فرق ہے وطن پذیری کے ملحوظات دوسرے درجے پر ہیں۔ انسان کا پہلا تعلق قوم سے ہے۔ زمین سے اس کا تعلق اتنا ضروری نہیں ہے۔

قدیمی خیال یہ تھا کہ غیر ملک کے شخص کو کسی قسم کا حق حاصل نہیں ہوتا اور اسے ایک معزز حقوق سہتی سمجھنا چاہیے جب تک کہ وہ کسی خاص شخص کی حفاظت میں نہ آجائے۔ یونانی اگرچہ اس خیال پر قائم تھے مگر فی نفسہ یہ خیال قدیمی تمدن پر وحشت کا ایک دھبہ ہے۔

لے روتا کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس خیال کا یہ منشا نہیں تھا کہ غیر ملکی غلام کے درجے پر

یٹوؤنی اصول میں زیادہ انسانیت تھی۔ ان کا اصول یہ تھا کہ ہر شخص اپنی قوم کے قانون کا پابند ہوگا۔ موجودہ قانون اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ غیر ملکی حقوق رکھنے والے اور ان کے بموجب قانون ان کی حفاظت کرتا ہے۔

کس قوم کے
کون شخص
ملکی ہوتا ہے

(۱) ملکی کسے خیال کرنا چاہئے اور کون کی شخص کسی قوم کا رکن کس طرح ہو جاتا ہے؟ اس سوال کے مختلف جواب دیے جاتے ہیں نسب اور توطن اس کے لازمی اجزاء ہیں مگر ان عناصر کے باہم جمع ہونے کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں جن کو ہم مختلف نظاموں سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کی تفصیل یہ ہے:-

اصلی مقام
پیدايش

(الف) مقام پیدائش ازمنہ وسطیٰ کے آخری حصے میں یہ خاص خیال رائج تھا۔ اس کا اصول یہ ہے کہ ملک میں پیدا ہونا مولود کی خصوصیات کی بنا ہے۔ انگریزی قانون کا اصول ابھی تک یہی ہے جو فطری رعایا اور اجنبیوں میں امتیاز کرتا ہے۔ کسی انگریزی جہاز پر یا کسی انگریزی سفارت خانے میں پیدا ہونا انگلستان میں پیدا ہونے کے برابر سمجھا جاتا ہے لیکن اس اصول میں اب اس حد تک نرمی روا رکھی گئی ہے کہ انگریزوں کی اولاد جو بیرون ملک میں پیدا ہووے بھی انگریزی شہریوں میں شمار ہوتی ہے اور حقوق توطن کا طریقہ حصول زیادہ آسان کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ متحدہ امریکہ کا قانون بھی اسی اصول پر چل رہا ہے۔

جہاد مقام
سکونت

(ب) مقام سکونت یہ شکل جو مملکتی اصول پر مبنی ہے وہ زمانہ حال کے خیالات سے زیادہ موافقت رکھتی ہے کیونکہ یہ اتفاقیہ مقام پیدايش پر زور نہیں دیتی بلکہ یہ والدین کے مستقل مقام سکونت پر اور ہر فرد کو خود اس شخص کے مقام سکونت پر زور دیتی ہے لیکن

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نفع بلکہ اس سے صرف یہ مفقود تھا کہ ان کے حقوق رومی سلطنت میں غیر محفوظ تھے۔

ہوسٹس (Hostis) کے اصلی معنی مہمان کے ہیں اجنبی اور دشمن کے کہیں ہیں۔

سلہ قانون سکونت کے بموجب حقوق توطن کا حصول اور بھی آسان کر دیا گیا ہے۔

نہ کا لکھنؤ کے حدود کے اندر پیدا ہونے سے حقوق شہریت حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اہل ملک کی جو اولاد بیرون ملک میں پیدا ہو اس کو بھی نسب کی بنا پر حق شہریت حاصل ہوتا ہے۔ اجنبیوں کو حقوق توطن حاصل کرنے کیلئے ممالک متحدہ میں آباد ہونا شرط لازمی ہے اور یہ صورت نہایت کثرت سے پیش آتی رہتی ہے۔

آباد کاری جس قدر آسان یا مشکل کر دی جائے اسی انداز سے اس میں بھی اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ سابق زمانے میں آسٹریا کا کسی حد تک یہی اصول تھا اور مفروضہ جرمانی سلطنتوں کا بھی یہی اصول ہے وہاں بھی وطنی حقوق کے شخصی عطا کی مختلف صورتوں سے اس میں اعتدال پیدا کروایا گیا تھا۔

(۴) ان دونوں کے مین مین کیون کی رکنیت کا سویزر لینڈی اصول ہے جو کنٹیننٹ (ضلع) اور سویزر لینڈ کی مشترکیت کی رکنیت کے لئے بنا کار ہے۔ کیون میں حقوق کا انحصار جائے پیدائش یا سکونت پذیری پر نہیں ہے بلکہ ایسے والدین کی اولاد ہونے پر منحصر ہے جو کیون کے رکن ہوں خواہ وہ اس سے باہر ہی کیوں نہ رہتے ہوں۔ یہ اصول اہل روم کے اس قبایع بلدی قانون سے غیر متاثر نہیں ہے جس کی بنا بھی کسی خاص رکن بلدی کے سلسلہ نسب میں ہونے پر منحصر تھی۔

کیون کی
رکنیت

(۵) قومیت۔ جدید سلطنتیں بالعموم قومیت کو شخصی تعلق کی بنا پر تسلیم کرتی ہیں اور اسے مقام پیدائش یا سکونت پذیری پر خصوصیت کے ساتھ منحصر نہیں کرتیں بلکہ اراکین قوم کی اولاد ہونے یا شخصی طور پر سلطنت کی رکنیت میں قبول کئے جانے پر منحصر سمجھتی ہیں۔ جائے پیدائش یا سکونت پذیری اس خیال کی تکلیف کرتی ہیں یہ اصول بالخصوص فرانس، پریشیا اور جرمانہ میں رائج ہے، یہ طریقہ جدید سیاسی خیال سے بہت مطابقت رکھتا ہے

سلطنت
شخصی تعلق

سلاویا کا مجموعہ قوانین دفعہ ۲۹ جنہوں کو ملکی حقوق صورتہائے ذیل میں حاصل ہو سکتے ہیں اس کا راجہ لازمت میں داخل ہوں، ایسا کاروبار اختیار کریں جس سے ملک میں عین طور پر رہنا لازمی ہو سلسلہ دین بریں تک ملک میں سکونت پذیر رہے ہوں، علیحدہ ۳۱۔ وہمیشہ شہر کے قانون اساسی کی دفعہ ۳ کے بموجب اجنبی اس وقت تک سرکاری ملازمت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک کہ انھوں نے حقوق شہریت حاصل نہ کر لئے ہوں دوسرے شرائط یکم مئی ۱۸۷۱ء کے شہنشاہی فرمان اور ۲۷ اپریل ۱۸۷۱ء کے فیصلہ عدالت کی رومس برطون کر دئے گئے۔

سلاوی قانون مجریہ ۳۱ دسمبر ۱۸۷۱ء کے بموجب پریشیا میں قومیت بالتحصیل سب پر منحصر ہے اہل پریشیا کے جائز ملک پریشیا کے ملکی شہر کے شہر ہوتے ہیں خواہ وہ باہر کیوں پیدا ہوئے ہوں۔ توطن پذیری کے لئے خاص شرط سکونت ہے۔

سلاوی جرمانہ شہنشاہی کو رکنیت کے لئے شرط مقدم شہنشاہی کے کسی صوبے میں حقوق شہریت کا حاصل ہونا ہے

جو قوم سے شخصی تعلق کو تخیل سلطنت کا بنیادی اصول سمجھتا ہے۔
مگر مختلف طریقے ایک دوسرے کے قریب پہنچتے اور اس کی منزلت مائل میں۔
نسب، مقام، پیدائش، مقام سکونت، توطن، مناکحت جو از نسب سبب کے سبب بالواسطہ یا
بلاواسطہ حقوق شہریت کے شرائط پر اثر ڈالتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ کسی سلطنت کی رکنیت ذیل کے طریقوں سے حاصل ہوتی ہے:-
(۱) پیدائش۔ جائز لڑکوں کی حالت میں باپ کو سلطنت کا رکن ہونا چاہیے
ناجائز لڑکوں کی حالت میں ماں کو۔ رکنیت سلطنت کے لئے سب سے زیادہ عام بنیادی ہے
لا وارث بچے اس ملک سے تعلق رکھتے ہیں جس میں وہ پائے جائیں۔
(۲) ازدواج (مناکحت) غیر ملکی بیوی اپنے شوہر کے خاندان و قوم کی
رکن ہو جاتی ہے۔

(۳) حقوق توطن اس ذریعے سے ایک اجنبی شخص اپنی خواہش پر رکن سلطنت
بنایا جاسکتا ہے لیکن مختلف ممالک میں اس کے شرائط مختلف ہیں۔ بعض ممالک داخلہ
ملک کی ترغیب دیتے ہیں اور بعض اس سے کارہ ہیں۔ بعض ملکوں میں اطلاع یا بلا اطلاع
کے مستقل سکونت اختیار کر لینا ہی کافی ہے اور دوسری جگہ حکومت بلکہ مجلس تشریفی کے خاص
حکم کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہیں سرکاری عہدے پر تقرر کے ساتھ ہی حقوق ملکی بھی حاصل
ہو جاتے ہیں کہیں ایسا نہیں ہوتا۔ بعض سلطنتیں چاہتی ہیں کہ غیر ملکی اپنی قدیمی سلطنت کے
حقوق سے بالا اعلان بری کروئے جائیں یا کم از کم وہ خود علانیہ طور پر اس تعلق کو ترک
کر دیں بعض سلطنتیں اس شرط کی پروا نہیں کرتیں۔

(۲) کسی شخص کا تعلق سلطنت سے حالات ذیل میں منقطع ہو جاتا ہے۔

(۱) موت اکثر لوگ اپنی زندگی بھر اسی ایک سلطنت کے رکن رہتے ہیں جس میں وہ
پیدا ہوئے تھے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ اور اس کا انحصار بیشتر نسل یا توطن نہیں ہے بلکہ جراثیمی جراثیم
کی دفعہ حسب ذیل ہے غیر ملک میں پیدا ہونے کی صورت میں (شمالی افریقی باپ کی جائز اولاد اور شمالی، جرمنی
ماں کی جائز اولاد دونوں جراثیمی شمار ہوں گی۔

سلطنت کی
رکنیت کن امور
سے قائم ہو جاتی
ہے۔

(۲) عقد۔ جو عورت غیر ملکی شخص سے نکاح کر کے اُس کی قومیت کو قبول کر لیتی ہے وہ اپنی سابقہ قومیت کو زائل کر دیتی ہے۔

(۳) قوم کی رکنیت سے خارج کر دیا جانا۔ چونکہ اب یہ رکنیت بالعموم ایک شخصی حق سمجھی جاتی ہے اس لئے یہ محض کسی غیر ملک میں آباد ہو جانے بلکہ مستقل اقامت اختیار کر لینے سے بھی زائل نہیں ہوتی۔ یہ تعلق اس صورت سے منقطع ہوتا ہے کہ اس حق کا رکھنے والا شخص اپنی طرف سے اپنے حق سے دست بردار ہو جائے اور سلطنت بھی اپنی جانب سے اسے سبکدوش کر دے۔ اسی سے اس تعلق کی باہمی کیفیت ظاہر ہوتی ہے لیکن زمانہ حال کی بیشتر سلطنتیں اس بات کو اپنی شان کے شایاں نہیں سمجھتیں کہ کسی شخص کو جو قومیت سے دست برداری کا خواہاں ہو اس فعل سے روکیں۔ اس طرح یہ شخصی آزادی کا لحاظ کر کے وہ آزاد دست برداری کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں۔ بہت سی صورتوں میں مثلاً ایسے ترک وطن کی حالت میں جس میں واپسی کا خیال نہ ہو اس شخص کے فعل سے ترک قومیت مراد لی جاتی ہے۔

آزادانہ ترک وطن کے حق کے تسلیم کرنے میں انگریزی قانون اگرچہ سب سے اول تھا مگر اس نے اس جاگیر دارانہ نظریہ کو ہمیشہ برقرار رکھا کہ بادشاہ کی مرضی کے بغیر رعایا اس کی اطاعت کو ترک نہیں کر سکتی اس لئے انگریزی رعایا محض ترک وطن سے اپنی اس حیثیت سے خارج نہیں ہوتی۔

انگریزی قانون

۱۷۹۱ء فرانسیسی ضابطہ دیوانی (دفعہ ۱) ایک فرانسیسی اگر کسی غیر ملک میں جا پے اور واپسی کا ارادہ اُس کے افعال سے نہ ظاہر ہو تا ہو تو وہ اپنی حیثیت کو کھودیتا ہے۔ تجارتی ضروریات سے غیر ملک میں بسنے سے یہ نہ تصور کیا جائے گا کہ وہ واپسی کا ارادہ نہیں رکھتا۔ آسٹری قانون اساسی مجربو اہر دسمبر ۱۷۹۷ء (دفعہ ۴۴)۔ ترک وطن کی آزادی صرف فوجی خدمت کے فرض سے محروم ہے اور شہداء کا پر وسی نظام حکومت بھی اس کے مش ہے (دفعہ ۱۱) پر وسی قانون اور بھی سخت تھا۔ جرمانی شہنشاہی کے قانون مجربو یکم جون ۱۷۹۷ء کے بموجب دستاویز باہر رہنے سے ملک اور شہنشاہی کی رکنیت زائل ہو جاتی ہے مگر اس زمانے کا حساب اُس وقت سے ہوتا ہے جب پاسپورٹ کی میعاد ختم ہو جائے لیکن کسی تفصل خانے میں اندراج حاضری سے اُس کی تجدید ہو سکتی ہے (دفعہ ۲۱)

درانیوں

کسی غیر ملک میں قیام اختیار کر لینے یا فرانسیسی حکومت کی منظوری کے بغیر کسی غیر ملکی ملازمت میں داخل ہو جانے کو فرانسیسی قانون ترک وطن کے برابر سمجھتا ہے یہ طریقہ دست برداری کے اصول سے تجاوز کر جانے کا ہے کیونکہ اکثر ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی غیر ملکی حکومت سے تعلق پیدا کرے مگر خود اپنی سلطنت سے قطع تعلق کی اسے مطلقاً خواہش نہ ہو تاہم فرانس کے قانون نے اتنی گنجائش رکھی ہے کہ واپس آنے کی صورت میں اس کے لئے حقوق سابقہ کا حاصل کر لینا آسان ہو۔

دوسلطنتوں
میں وطن حقوق

یہ ناممکن نہیں ہے کہ ایک ہی شخص کو ایک ساتھ دو سلطنتوں میں وطن حقوق حاصل ہوں اور موجودہ حالات فی الواقع اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ جب شاذ و نادر فرض میں تصادم ہو جاتا ہے تو ان دونوں کو پورا کرنا مشکل ہو جاتا ہے یہ اصول ہمیشہ محفوظ اصول نہیں سمجھا جاتا کہ سابق حق کو تقدم حاصل ہونا چاہئے خاص کر ایسی صورت میں کہ وہ حق منقطع ہو اور ابعد کا حق عملاً موجود ہو۔ ان صورتوں میں پہلا فرض یعنی فوجی خدمت اسی ملک کے لئے واجب ہے جس میں وہ شخص رہتا ہے اس سے بالطبع یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو سلطنت کسی غیر ملکی کو حق تو وطن عطا کرتی ہے یا اسے کسی عہدے پر مامور کرتی ہے وہ مجاز ہوتی ہے کہ اس سے حقوق سابقہ کے ترک کا مطالبہ کرے یا انھیں بحال خود

لے فرانسیسی ضابطہ دیوانی دفعہ (۱۷۰)

۱۷۰ ایک شخص دو سلطنتوں کی غیبت میں ایک ہی وقت میں شریک ہو سکتا ہے بہت سے جرمانی روس اور دو دوتین تین سلطنتوں کے دیوان اعلیٰ کے رکن ہیں اور ان سب میں ان کی جاگیریں واقع ہیں اور انھوں نے ہر ایک کی وفاداری کا حلف اٹھایا ہے۔ یہ خیال کرنا بالکل ناممکن نہیں ہے کہ کسی شخص کی دو مختلف سکونتیں ہوں مثلاً ایک شہر میں ایک دیہات میں یا ایک کاروباری شخص کی حیثیت سے اور ایک جاگتی شخص کی حیثیت سے فون بار (Von Bar) اپنی تصنیف میں تو قومی شخصی و فوجداری قانون صفحہ ۷۵ میں ان ساری امکانی صورتوں سے انکار کرتا ہے لیکن اگر واقعی حالات پر نظر کیجئے تو ثابت ہو جائیگا کہ واقعات نظریے سے زیادہ وسیع ہیں کسی شخص کو یہ اجازت دینا کہ وہ نئی سلطنت کا رکن ہو جائے بغیر اس کے کہ اپنی سلطنت سے تعلق منقطع کرے ترک وطن کے آزادانہ حق کا محدود کرنا نہیں ہے۔

۱۷۱ بلیک اسٹون اپنی تصنیف میں جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے لکھتا ہے کہ لیرے ذاتی تجربے نے مجھے

رہنے والے۔

نظام نوین

(۳) چونکہ قومی حقوق کے حاصل کرنے اور ان کے زائل ہونے کے شرائط مختلف ملکوں میں مختلف ہیں اس لئے جب دو سلطنتیں کسی ایک ہی شخص کے اپنی رعایا ہونے کی دعویٰ اور اس کے خدمات کی خواہاں ہوں یا دونوں اسے قبول کرنے سے انکار کر دیں تو ایک تصادم پیدا ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے تصادم رفع کرنے کے لئے امریکی سفیر ہنگر افٹ کی کوشش سے شمالی جرمانی مشترکیت اور ممالک متحدہ امریکہ میں ایک معاہدہ ۲۲ فروری ۱۸۶۷ء کو طے پایا تھا۔ اس معاہدے میں یہ قرار دیا گیا کہ جابین میں سے کسی سلطنت میں پانچ برس کا توہن سابقہ تعلق کو منقطع کر دے گا اور دونوں سلطنتیں اسے تسلیم کریں گی۔ یہی اصول انگلستان اور ممالک متحدہ کے درمیان مشابہ ع میں قرار پایا اور اب یہ اصول عام طور پر پسند کیا جاتا ہے۔

(۴) کسی سلطنت کی کنیت کے نتائج کا تعلق ایک حد تک شخصی قانون اور ایک حد تک عام قانون سے ہے۔ شخصی قانون میں ملکی اور غیر ملکی شخص کے درمیان امتیاز اس وقت کے پست پہلے بہت زیادہ تھا۔ اس زمانے میں شخصی اور عام قانون کے حد و زیادہ قطعی طور پر مبہم ہو گئے ہیں اور اس لئے شخصی قانون میں قومیت کا کوئی دخل نہیں ہے کیونکہ یہ فی الاصل ایک سیاسی خیال ہے۔ علی العموم شخصی قانون میں ملکی اور غیر ملکی دونوں کے لئے کامل حقوق کے انتفاع کا حق سمجھا جاتا ہے۔

ملکی شخص کی
مشیت
الغنا شخصی
حقوق۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ یہ کھلایا ہے کہ ان حالات میں کسی شخص کے اصلی وطن کو اس خدمات پر پہلا دعویٰ ہے۔

سلہ بویریا کا فرمان دفعہ ۶۔ اتحاد سوئزرلینڈ کا نظام حکومت (مجموعہ ۱۸۷۵ء دفعہ ۴۳) اس کے خلاف ہے۔ کوئی صوبہ غیر ملکوں کو ملکی حقوق نہیں دے سکتا جب تک کہ وہ اپنے سابقہ حقوق کو ترک نہ کریں اس وقت کے قانون کے لئے سوئزرلینڈ کا قانون اتحادی مجریہ ۳۲ رجولائی ۱۸۷۵ء کو دیکھنا چاہئے۔ سلہ پروسی قانون تہید دفعہ ۴۳۔ غیر سلطنتوں کی رعایا جو ملک میں رہتی یا کاروبار کرتی ہے اس کا مفروضہ بھی قوانین مولد بالاک کی رو سے ہوگا۔ ضابطہ آسٹری دفعہ ۳۳ غیر ملکوں کو اصل ملک کے برابر ملکی حقوق حاصل ہیں اور اس پر کسی ہی ذمہ داریاں عائد نہیں ہونے چاہتوں کے جہاں سلطنت کی کنیت صریحاً مشروط ہے۔ ضابطہ دیولائی دفعہ ۱۱۱

قدیمی اصول کہ غیر ملکی زمین کی ملکیت نہیں حاصل کر سکتے اب صرف شہنشاہ میں شمار ہوتا ہے بعض بعض پیشوں کے اور خصوصاً کسی دستکاری کے مستقلاً اختیار کرنے بلکہ خوردہ فروشی کیلئے بھی غیر ملکوں پر عام طور سے زیادہ بندشیں عائد ہیں۔

دوسری جانب غیر ملکوں کا قانون (Jus albinagu) ہے جس کی رو سے ملک کا بادشاہ غیر ملکوں کی جائیداد کا وارث ہو جاتا تھا اور جو وراثت بیرون ملک میں جاتی تھی ان پر محصول لگایا جاتا تھا۔ اب تقریباً ہر جگہ یہ طریقہ ناپید ہو گیا ہے اور اس طرح ترک وطن کی آزادی عام طور پر تسلیم کی گئی ہے۔

مگر قانون عامہ کی حد میں ملکی اور غیر ملکی کا فرق پوری قوت کے ساتھ باقی ہے خاص عطا کردہ حالات کے سوا حقوق ذیل صرف ملکوں کے لئے مخصوص ہیں۔
(الف) ملک میں دائمی قیام کا حق کوئی ملکی شخص کسی غیر ملکی کے سوا نہیں کیا جاسکتا اور نہ سخت سیاسی وجوہ کے بغیر ملک وطن کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ انگلستان کے متعلق ہیکسٹن کی تصنیف شرح جلد اول باب دہم دیکھنا چاہئے۔ شہنشاہ کے بعد سے غیر ملکی جائیداد غیر منقولہ حاصل کر سکتے ہیں قانون موضوعہ (Statute) ۲۲ و نوویا باب ۱۸ سو فیئر لینڈ کے بعض عمومی صوبوں میں یہ عادت بنو زنا فہ ہے۔

۲۔ جب تک گلا (انجمن دستکاران) کا وجود قائم تھا یہ روک حق بجانب تھی مگر ان انجمنوں کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی اکثر یہ حال تھا کہ صرف ملکوں کو ان میٹوں کے کرنے کی اجازت تھی۔

۳۔ ۱۸۳۵ء کے فرانسیسی قانون اساسی دفعہ ۱۲ کی رو سے پیشہ اور حرفت کی آزادی شہریوں ہی کے حق میں محفوظ کی گئی۔ لیکن فرانسیسی طرز عمل غیر ملکوں کے حق میں بھی پیشہ کی آزادی کو روکا تھا۔

۴۔ مفققت سوئٹزر لینڈ کے نظام سلطنت کی دفعہ ۶۳ کی رو سے غیر ملکی سلطنتوں میں آباد ہونے والی زمین داروں کو عین مساویہ کے شرط پر کی جاتی تھی۔ دیکھو جرمانی مشترکیت کا قانون جغریہ ۱۸۱۵ء اور جوہر ۱۸۱۵ء یکم نومبر ۱۸۱۶ء کے جرمانی شہنشاہی قانون نے جرمانی سلطنتوں کے مابین شش وطن کی کامل آزادی عطا کی۔ اب یہ آزادی عام طور پر غیر ملکوں کے لئے بھی وسیع کر دی گئی ہے۔

۵۔ سوئٹزر لینڈ کا ۱۸۴۸ء مفقعتی نظام سلطنت دفعہ ۷۰ مشترکیت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی مملکت سے ایسے غیر ملکوں کو خارج کر دے جو اس کی حفاظت کے لئے خطرناک ہوں۔

(ب) اپنی سلطنت کے زیر حفاظت ہونے کا حق خواہ وہ ملک سے باہری کیوں

نہ رہتا ہو۔

(ج) اسے وہی اور ایک کامل شہری کے حقوق کو کام میں لانے کا اختیار۔

(د) سرکاری خدمت حاصل کرنے کا حق ملے

(ک) بعض وقت اس قسم کے عام سیاسی حقوق مثلاً انجمن یا اجتماع قائم کرنے، غرضت

پیش کرنے یا آزادانہ اخبار نویسی کے حقوق، ملکیت کے حقوق میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غیر ملکی ان حقوق سے کلیتہً محروم کر دیئے گئے ہیں بلکہ وہ

ذاتی طور پر یہ حقوق نہیں رکھتے اور صرف سلطنت متعلقہ کی مراعات یا رواداری کی بنا پر ان سے

استفادہ حاصل کر سکتے ہیں۔

لکھنؤ یا کاشمیر کا شہر ان کا فرمان دفعہ۔ کوئی غیر ملکی اعلیٰ شاہی عہدے، ملکی ملازمت کے خدمات کو قوم کے اعلیٰ عہدے، کلیسا کی عہدے یا وظائف حاصل نہیں کر سکتا اور نہ بوریہ کے شہری ہونے کے حقوق سے کام لے سکتا ہے۔

بائیسواں باب

سلطنت کا تعلق افراد سے

(۳) سلطنت کے شہری

قوم اور ملک کے افراد کے عام مجمع سے سلطنت کے شہریوں کی وہ بلند رتبہ جماعت پیدا ہوتی ہے جو اس لقب کی پوری مستحق ہے۔ سلطنت کے شہری اپنی شہریت کی حیثیت سے سیاسی حقوق رکھتے ہیں اور خاص کر مجلس ملی میں نمائندہ کو منتخب کر کے اس مفہوم کے لحاظ سے سلطنت کی شہریت کے حق کے لیے پہلی بنیادی شرط ہے قوم کی رکنیت لیکن مزید براں اس میں کامل سیاسی حقوق بھی داخل ہیں۔ پس یہ سلطنت کے ساتھ افراد کے تعلق کا مکمل اظہار ہے۔

قدیم یونانی اور قدیم رومی سلطنتوں میں اس کا انحصار حکمران شہر (یعنی صدر شہر) کی شہریت کے حقوق رکھنے پر تھا۔ ازمنہ وسطیٰ میں حریت کے رتبے پر اور ازمنہ وسطیٰ کے اخیر دور میں ذمی اختیار ملتے کے حقوق اور ارضی ملک رکھنے پر۔ مودودہ زمانے کی سلطنت کی رو سے یہ وصف اکثر ملکوں میں ایک بڑی حد تک اقوام کی رکنیت کے مترادف ہو گیا ہے۔

اب عام طور پر سلطنت کی شہریت کے حدود حسب ذیل تسلیم کئے جاتے ہیں :-
(۱) عورتیں اس سے خارج ہیں۔ سیاسیات مردوں کا کام ہے اس لیے سیاسی حقوق بھی مردوں ہی کے لئے ہیں۔ (دیکھو اسی مقالہ کا بائیسواں باب)

(۲) نابالغ اس وجہ سے خارج ہیں کہ سیاسی حقوق کے علمبردار کے لئے پختہ رائے کی ضرورت ہے۔ زمانہ حال کی بعض سلطنتوں میں سیاسی بلوغ کی غیر شخصی قانون کی عمر بلوغ سے مختلف مقرر کی گئی ہے سیاسی اغراض کے لئے سن کم کر دیا گیا ہے مگر اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے

اس سے
حدود -

کہ روزانہ زندگی کے معمولی معاملات کا صاف طور پر سمجھ لینا زیادہ آسان ہے بر نسبت سیاسی معاملات کے جن میں ایک ہی امر بہت مشکل ہے کہ انتخاب کے وقت امیدواروں کی سیاسی قابلیت کا محاکمہ کیا جائے۔ فرانس، انگلستان، شمالی امریکہ اور اطالیہ میں سیاسی اور قانونی حد بلوغ دونوں اکیس برس مقرر ہیں اور بویریا کے مانند بعض جرمانی سلطنتوں میں بھی ایسا ہی ہے لیکن پروشیا، جرمانی شہنشاہی اسپین اور پرتگال وغیرہ میں اس کے وہی کے لئے پچیس برس کی حد مقرر ہے۔ آسٹریا میں چوبیس برس سویزر لینڈ میں بعض صوبے، سیاسی حد بلوغ تمدنی حد سے قبل مقرر کرتے ہیں یعنی بالعموم بیس برس پورے ہونے پر۔

(۳) بہت سے لوگ ایسے خارج کئے جاتے ہیں جن کی ملکی حیثیت خراب ہو گئی یا ضائع ہو گئی ہے مثلاً سنا یا فتہ یا جو لوگ فضول خرچ قرار دیئے گئے ہوں یا دوائے یا بروج کوں کو خیرات خانے سے امداد ملتی ہے۔

بعض سلطنتوں میں شہریت کے حقوق حاصل کرنے کے لئے مزید اوصاف بھی درکار ہوتے ہیں :-

(۴) ایک حد تک ظاہری خود مختاری جس کی مختلف سلطنتوں میں مختلف حدیں مقرر کی گئی ہیں تمدنی جرمانی قانون میں زمین کا یا علمحدہ گھر کا ہونا ضروری تھا۔ بعد کے جرمانی قانون میں آزادانہ پیشے یا کسی کیوں کی عاملانہ رکنیت۔ پہلا خیال انگلستان اور شمالی امریکہ کے بعض ممالک میں پھیلا ہے اور دوسرے خیال کو جدید جرمانی

موجودہ شہری

سویزر لینڈ کا قانون متفقہ ۱۸۷۴ء و ۱۸۷۵ء میں برس سے زائد عمر والا سویزر لینڈ کا ہر باشندہ اس کے وہی کا حق رکھتا ہے کہ زیورچ کا قانون اساسی (۱۸۷۴ء) سیاسی حد بلوغ میں برس مقرر کرتا ہے حالانکہ وہاں کے ملکی قانون کی رو سے حد بلوغ چوبیس برس ہے۔

۱۸۷۴ء اصلاح ۱۸۷۴ء کے بموجب قصبات کی رائے دہندگی پیشہ اور ادائے ابواب (مصولات) پر منحصر ہے۔ ۱۸۷۴ء کے قانون رائے دہی نے ضلع کی رائے دہی کو قصبہ کی رائے دہی سے ملادیا ہے اور خدمتی رائے دہی کا اضافہ کیا ہے۔

نظامِ جانے سلطنت میں مگر ملی ہے۔ یہ قاعدہ تمام اجرتی لازموں کو اور اکثر کارخانوں میں کام کرنے والوں کو کم از کم ان میں سے ادنیٰ درجہ والوں کو اور اکثر مزدوری پیشہ دستکاروں کو خارج کر دیتا ہے۔ بعض جدید سلطنتوں نے عام حق رائے دہی کی طرف قدم بڑھائے ہیں اور اس شرط کو نرم کر دیا ہے یا بالکل ہی منسوخ کر دیا ہے۔ سوئیزرلینڈ کے نظہائے حکومت کا سنہ ۱۸۳۲ء کے بعد سے یہی حال ہے۔ ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۰ء کی فرانسیسی جمہوریتوں کا بھی یہی حال تھا۔ علی ہذا فرانسیسی شاہی ۱۸۷۱ء کی شمالی جرمانہ شریکت ۱۸۷۱ء کی جرمانی شہنشاہی اور ۱۸۶۳ء کا یونانی نظامِ حکومت سب اسی جانب مائل ہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ بھی اسی رجحان کی متابعت کی کوشش میں ہیں کہ شہرخص کو انتخاب کا حق ملے۔ پس یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے زمانے کا عام میلان اسی عمومیت کی طرف ہے۔

ملکیت

۵۔ بعض سلطنتوں میں ملکی حقوق ایک خاص مقدار جائیداد کی ملکیت پر مشروط ہوتے ہیں۔ یہ بالکل بجا ہے کہ اختیار رائے دہی کی تقسیم میں جائیداد کو ایک اہم جز قرار دینا چاہئے مگر کسی شخص کو محض ناکافی جائیداد کی بنا پر حقوق شہریت سے محروم کرنا سلطنت کے خیال کی بھرتی کرنا ہے، بشرطیکہ وہ شخص انسانی ذہنی طور پر معاملات عامہ میں حصہ لینے کی قابلیت اور خود مختارانہ حیثیت رکھتا ہو۔ اگر ملکیت سے مراد آمدنی یا ماحصل کا ذریعہ ہے اور حد ایک معمولی گذراوقات پر مقرر کی جائے، تو اس میں کوئی اعتراض نہیں۔ بہتر اس صورت میں یہ شرط سابقہ وصف کے ہم معنی ہو جائے گی۔ ممالک متحدہ امریکہ، بوسنیا (۱۸۷۸ء) اور کسی حد تک آسٹریا اور پروشیا کے نظاماتِ حکومت کے نتیجے ایک ہی ہیں۔ ان سب ممالکوں میں رائے دہی کا حق بلا واسطہ ادائی محمول پر ہے۔

مذہب

۶۔ کچھ زمانہ قبل تک مسیحی سلطنتوں میں نصرانیت کا اقرار بھی ضروری تھا، یہودیوں اور مسلمانوں، اور دوسرے مذہب والوں سے اگرچہ رواداری کا برتاؤ کیا جاتا تھا مگر

۷۔ بوسنیا کا نظامِ سلطنت (۱۸۷۸ء دفعہ) ملکی حقوق کے لئے نہ صرف اہلی بائیسہ ملک ہونے بلکہ سلطنت میں رہنے کا بھی خواہاں ہے، یہ سکونت خواہ محمول جائیداد، سامان وغیرہ کے لحاظ سے ہو یا قابلِ محصول تجارت کا کام کرنے کے باعث ہو، یا سرکاری عہدے کی خدمت کی وجہ سے ہو۔ آسٹریا کا شہنشاہی قانونِ انتخاب (۲۱ اپریل ۱۸۷۳ء دفعہ ۹) کسی جماعت عامہ کی رکنیت کو آزادی کے ہم معنی خیال کرتا ہے۔

یہ اصل جرمانی کتاب (پنچلی) میں ۱۸۷۱ء ہے، اور انگریزی ترجمہ میں ۱۸۷۵ء تا ۱۸۷۸ء تک ہی صحیح ہوگا، مترجم

سیاسی حقوق سے رہ خارج تھے۔ ازمنہ وسطیٰ میں مذہب و قانون کلیسا و سلطنت ایک دوسرے سے فہمی طور پر وابستہ تھے مذہبی سوماتی سے خارج ہونا سیاسی سوماتی سے خارج ہونے کے ہم معنی تھا۔ غیر مذہب والے زیادہ سے زیادہ جس امر کی امید کر سکتے تھے وہ راجداری تھی۔ خود امت مسلمہ کی اندر اختلاف عقاید سیاسی نتائج پیدا کرتا تھا بعض ملکوں میں صرف کتھولیکوں اور ایس میں صرف پروٹسٹنٹوں کو پورے حقوق حاصل تھے۔ ویسٹ فیلڈ کی مل نے برطانیہ میں ملکی حقوق کے لحاظ سے کتھولیکوں اور پروٹسٹنٹوں کو ایک حد پر کر دیا مگر سیاسی حقوق کے اعتبار سے ایسا نہیں ہوا۔ ۱۸۱۵ء کی جرمانی شریکت نے جرمانیہ کے مسلمہ مذہبی فرقوں کے لئے سیاسی مساوات قائم کر دی ان میں کتھولک، پیروان لوٹھر اور پیروان کالوین داخل تھے اور دھامتوں کی حیثیت کو غیر متیقن چھوڑ دیا علیہ

زمانہ حال کی سلطنتوں کا قطعی میلان یہ ہے کہ سیاسی حقوق مذہبی اعتقاد سے کلیہً آزاد کر دئے جائیں، اس کا باعث محض مذہبی لاپرواہی نہیں ہے، اپنا پختہ سلسلہ کی امریکی کانگریس نے جب کسی ایسے قانون کے منظور کرنے کو رد کر دیا جس کی رو سے کسی ایک مذہب کو غلبہ حاصل ہو تو اس کا مقصود یہ نہیں تھا کہ وہ سمیت کی طاقت سے لاپرواہی نہ اس کا یہ ارادہ تھا کہ عیسوی تنظیمات کو مدد دینے یا ان کی حفاظت کرنے سے سلطنت کو باز رکھے۔

مذہبی آزادی

موجودہ اصول کی بنیاد فی الحقیقت اسی خیال پر ہے کہ مذہبی اعتقاد کا تعلق تمام و کمال دل سے ہے، اور وہ جبر کی حد سے خارج ہے، اس لئے کسی بھی اعتقاد سے ہٹنے کی وجہ سے کسی قسم کی سیاسی ناقابلیت نہ عاید کرنا چاہئے۔ اہل امریکہ نے مذہب اور سلطنت کے مابین ایک قطعی تمیز قائم کی اور وہ اس طرف مائل تھے کہ دونوں کو آزاد چھوڑ دیں اور اسی خیال سے انھوں نے مذہبی بنا پر ان لوگوں کو سیاسی حقوق دینے سے بھی انکار نہیں کیا جو اور اعتبار سے اس کی اہلیت رکھتے تھے لیکن دوسری جانب انہیں اصول کا فرانسیسی انقلاب میں امتیاز کیا جانا یقیناً آزادی کی رعایت پر مبنی نہیں تھا بلکہ اس وقت کی متواتر مذہبی ستم شایروں سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ اس کی بنا زمانے کی تناکلی خیال پرستی مئی جہیزہ گردی سے شروع

علیہ قانونی شریکت جرمانی دفعہ ۱۱۶ جرمانی شریکت کے ملک میں عیسوی مذہب کے اندر اختلاف عقاید کی وجہ سے ملکی یا سیاسی حقوق میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا جائے گا۔

ہو کر مسیحیت کی دشمنانہ نفرت پر ختم ہوئی علہ

جرانیا میں بھی اس اصول کا تطبیق ظہور ۱۸۴۸ء میں ہوا اور اب وہ مسلم سمجھا جاتا ہے شہرین کے عام حقوق کی بابت آسٹریا کا قانون اساسی ۱۸۴۹ء (دفعہ ۱) اور ۲۱- دسمبر ۱۸۶۷ء کا قانون نیربرڈینا کا ۱۸۵۷ء والا نظام سلطنت اس شہنشاہی نظام سلطنت کے مسودے سے متفق ہیں جو فرانک فورٹ اور برلن میں تیار ہوا تھا اور جس میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ملکی اور سیاسی حقوق کے انتفاع کو مذہبی اعتقاد سے کوئی تعلق نہیں دانشمندانہ طور پر یہ بھی اضافہ کر دیا گیا تھا کہ ”مذہبی اعتقاد ملکی فرائض کی بجا آوری کے لئے عذر نہیں ہو سکتا“

شمالی جرمانی شریکیت کے ۳- جولائی ۱۸۶۹ء والے قانون میں (جو اس شہنشاہی کا قانون ہے) یہ قرار دیا گیا ہے کہ ملکی اور سیاسی حقوق کے جس قدر قیود اختلاف عقائد پر مبنی ہیں وہ سب اس قانون کے ذریعہ سے منسوخ کئے جاتے ہیں ناسکر جماعتی اور قومی نیابت کی شرکت اور سرکاری عہدوں کا تقرر مذہبی اعتقاد سے آزاد ہوگا۔

اس سے ان ممالک میں یہودیوں کی حیثیت بالکل بدل گئی ہے۔ پہلے یہ لوگ جرمانیا میں سیاسی حقوق سے تقریباً بالکل ہی محروم تھے مگر اب مذہب کی بنا پر ان کے لئے ان حقوق سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

مذہبی آزادی
اسی کا نام مال
نہیں ہوئی ہے

لیکن یہ نیا اصول ابھی عالمگیر طور پر تسلیم نہیں کیا گیا ہے بلکہ پوپ کے ماننے والوں کی طرف سے برابر ملعون ٹھہرایا جا رہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ ان کیتھولک سلطنتوں میں جہاں پادریوں کا اثر غالب ہے جزایا کا مسٹر دیا گیا ہے بلکہ ناروے کے اور سویڈن آئینک اس سے منکر ہیں۔ سویزر لینڈ میں ۱۸۶۶ء کے نظام سلطنت تک میں سیاسی حقوق عیسوی مذہب کے اقرار پر منحصر تھے، انگلستان تک میں جہاں مخفوں اور کیتھولیکوں (اور یہودیوں) کے موانع اس صدی کے اوائل میں

علہ یہ نیا اصول ۱۸۸۹ء میں اعلان حقوق انسان کی دفعہ اول میں ظاہر ہوا بعد کے کسی نظام سلطنت نے شہریت کا انحصار عقیدے پر نہیں رکھا ہے۔

علہ۔ ناروے میں لوہر کی پیروی کرنے والے اب سلطنت کے صرف اعلیٰ عہدوں سے خارج ہیں ۲۱- جولائی ۱۸۵۱ء کے قانون نے یہودیوں کو بھی داخل کر دیا ہے مسئلہ جرمانی میں سوڈن کا ذکر نہیں ہے بلکہ ناروے اور روس ہے۔ مترجم۔

رفع کئے جائیں گے، وہاں بھی جدید اصول بھی کامل طور پر مسلم نہیں ہو اسے۔
 بہر حال جدید سلطنت جو اپنی آزادانہ اور قومی بنیاد پر صداقت کے ساتھ قائم
 ہے۔ مختلف مذاہب کے پیروں کو اپنی عام تنظیمات میں داخل کر کے متحد کرنے کی طرف
 قطعی طور پر رائیں ہے اور ازمائش وسطیٰ کے خیالات کے مطابق حقوق عامہ کو معین مذہبی شرائط
 یا کلیسائی قواعد سے وابستہ کرنے کے مسلک کو تدریجاً منسوخ کرتی جاتی ہے۔

تیسرا مقالہ

سلطنت کا بنیادی اصول بیرونی نظریہ کا لحاظ سے

زمین

پہلا باب

آب و ہوا

سارے ادنیٰ حیوانات کے برخلاف انسان دنیا کے ہر خطے میں رہنے کی قابلیت رکھتا ہے اور اپنی خصوصیات کو قائم رکھ سکتا ہے۔ خارجی اثرات کی مقاومت کی قوت اور پرخطر آب و ہوا کے مقابلہ کو سامان اس کے پاس نہشتا و افزا درمیں ہے مگر پھر بھی گرمی اور سردی اور لیل و نہار کا اثر اس کے جسم و دماغ پر پڑتا رہی ہے۔ وہ خطا استویا خطین سے جس قدر قریب ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کی زندگی گئے حالات بدلتے جاتے ہیں۔ اگرچہ شمال یا جنوب میں سفر کرنے سے یا کسی خاص عرض البلد میں زیادہ قیام کرنے سے ایک مفرد شخص کی حالت بہت کم بدلتی ہے مگر من حیث المجموع ایک گروہ پر آب و ہوا کا اثر پڑتا ہے اور چند نسلوں کے گزرنے پر جس کی ساخت میں اور اس سے زیادہ اس کی جبلت میں تغیرات پیدا ہو جاتے ہیں۔

مشرق میں جا کر دویسویں میں زمانہ پن آگیا۔ افریقہ کے شمالی ساحل پر پہنچ کر عبرانیوں کا کس بل محل گیا اور سینہ درہ رات میں جا کر انگریز بہت جلد سست اور شہوت پرست ہو جاتے ہیں۔ بودین کتاب مخم کوٹھکڑ کتاب چہارم انیلکیری کتاب چہار و ہم پانزدہم اور کل تاریخ تمدن جلد اول باب دوم نے عام زندگی پر آب و ہوا کے اثرات کے متعلق بحث کی ہے اور اس کے قوانین میں کرنے کی کوشش کی ہے۔

نویں صحت پر
آب و ہوا کا اثر

مستدل اقلیم

بہت زمانہ قبل یہ خیال ظاہر کیا جا چکا ہے کہ گرم ممالک (۲۳ درجے ۲۸ دقیقہ تک) اور سرد قطبی اقلیم (۶۶ درجے ۲۳ دقیقہ کے آگے) سلطنتوں کے نشوونما کے لئے اس قدر موزوں نہیں ہیں جس قدر ان کے درمیان کے مستدل اقلیم موزوں ہیں۔ زمین کی خشکی کا آدھے سے زیادہ حصہ انہیں مستدل اقلیموں میں واقع ہے اور شمال نصف کرے میں جہاں بیشتر مستدل قومیں آباد ہیں، خشکی اور تیزی کا حصہ قریب قریب برابر ہے۔ یعنی ۱۱۴۶۰۰ مربع میل خشکی اور ۲۳۱۰۰۰ مربع میل تری۔ اس کے خلاف دیگر حصوں میں پانی کا حصہ بہت ہی زیادہ ہے۔ سرد ممالک میں انسان کے لئے اجتماعی حالت میں رہنا دشوار ہے کیونکہ غذا اور ایندھن وہ اپنی آس پاس کی جگہوں سے جیسا نہیں کر سکتا اور منتشر خاندانوں کو اپنی سستی ہی قائم رکھنے کے لئے فطرت سے اس قدر سخت مقابلہ کرنا پڑتا ہے کہ اعلیٰ اعزاز پر کماحقہ توجہ کرنے کے لئے نہ انہیں وقت ملتا ہے، نہ ان کو اس کی خواہش ہوتی ہے۔ دوسری جانب گرم ممالک کا ہلی پیدا کر دیتے ہیں اور جذبات کا ہنگامہ خیز جوش و تھاؤ تھاؤ بھر رکھتا ہے۔ وہ انسان کی فاعلی قوتوں کو اس کے ساکت میلانات کے مقابلے میں بہت کم ترقی دیتے ہیں مگر سلطنت کو جس کا مقصد خود داری و آزادی ہے مستعد کاری اور مردانہ صفات کی ضرورت ہوتی ہے۔ سرد اقلیموں کے باشندے آزاد ہوتے ہیں مگر ان میں سیاسی اتحاد کی کمی ہوتی ہے۔ دوسری طرف گرم اقلیموں کے باشندے اپنے حقوق کی حفاظت کرنے یا ایک آزاد سلطنت کے ترقی دینے کے بجائے مطلق انصاف قوت کو زیادہ آبادی سے انگیز کر لیتے ہیں۔ بودین آج سے بہت پہلے اپنی تصنیف کے (مقالہ ۵، ص ۶۱) میں کہہ گیا ہے کہ درمیان خطوں کے باشندے جنوبی اقلیم کے رہنے والوں سے قوت میں زیادہ اور چالاک ہیں کم ہوتے ہیں اور شمالی اقلیم والوں سے دفاعی جوہر میں زیادہ اور قوت میں کم۔ اور (اس لئے) وہ جمہوریوں پر مگرانی کرنے اور ان کو چلانے کے لئے زیادہ موزوں اور اپنے افعال میں نہایت عدل پسند ہیں۔ [دیکھو اسطو کی سیاسی

سردی اور گرمی کی تباہی

باب ۱، ضل ۱۔ انگریزی مترجم
آج کل کے ریاضی علوم کی مدد سے شمسی حساب کے بوجہ آب ہوا عرض بلد سے ظاہر کی جاتی ہے اور جس کا انحصار آفتاب کے ساتھ سطح زمین کے تعلق پر ہے اس کے علاوہ موجودہ سائنس نے طبعی آب ہوا بھی دریافت کی ہے مختلف مقامات کی اوسط حرارت و برودت کا اندازہ کرنے سے وہ خطوط اتحاد الحرات قائم کرتی ہے جو دائر عرض بلد سے تمام موافق نہیں ہوتے بلکہ جس طرح آب ہوا پر سمندر کی سطح سے زمین کی بلندی، خلیج و بحر کی قربت، آب و ہوا کی

رقتار و غیرہ دوسرے اسباب کا اثر پڑتا ہے اُسی طرح یہ خطوط شمالاً یا جنوباً ملتے جاتے ہیں۔ اسلئے انھیں زیادہ کثیر التعداد اور نازک امتیازات کے معلوم کرنے کا موقع ملتا ہے مگر اس سے صرف اسی سابقہ تحریر کی تائید ہوتی ہے کہ انتہائی اقلیموں کے مقابلے میں معتدل اقلیم تمدن کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

دارالطنت و
محل وقوع

یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ تقریباً تمام اہم سلطنتوں کے مستقر معتدل اقلیم کے عین وسط میں واقع ہیں جہاں گرمی کا اوسط (سودرجے والے حرارت پیمائی رو سے) ۸ اور ۱۶ درجوں کے درمیان رہا کرتا ہے تقریباً تمام ہی یورپی سلطنتوں اور بیشتر ایشیائی سلطنتوں کے (جہاں خطوط اتحاد الحکارت بہ تیزی تمام جنوب کی طرف مڑ جاتے ہیں) اور اسی طرح شمالی امریکہ کی اکثر سلطنتوں کے پایہ تخت اسی اقلیم کے اندر واقع ہیں۔ ان میں بلاذیل شامل ہیں۔ روم (۵۵ درجے ۴ دقیقے) میڈرڈ (۴۱ درجے ۲ دقیقے) پیرس (۴۸ درجے ۸ دقیقے) لندن (۵۱ درجے ۸ دقیقے) دسلیا (۵۰ درجے ۵ دقیقے) قسطنطنیہ (۴۱ درجے ۵ دقیقے) برلن (۵۱ درجے ۱۱ دقیقے) ہام برگ (۵۸ درجے ۵ دقیقے) کوپن ہاگن (۵۸ درجے ۲ دقیقے) زیورخ (۵۸ درجے ۸ دقیقے) لمغ (۵۸ درجے ۵ دقیقے) ڈریسڈن (۵۸ درجے ۳ دقیقے) میونخ (۵۱ درجے ۱۱ دقیقے) بوسن (۵۱ درجے ۶ دقیقے) وائن (۵۳ درجے ۵ دقیقے) فلاڈلفیا (۵۱ درجے ۹ دقیقے) رچمنڈ (۵۳ درجے ۸ دقیقے) پٹن (۵۱ درجے ۳ دقیقے) یورپ کے جو مستقر زیادہ سرد اقلیم میں واقع ہیں وہ بس چند ہی ہیں۔ پیرس برگ (۵۳ درجے ۱۱ دقیقے) کرسٹینا نا (۵۰ درجے ۳ دقیقے) اسٹوک ہولم (۵۰ درجے ۶ دقیقے)۔ مگر گرمی میں ان کی اوسط حرارت ۵۱ یا ۱۶ درجے تک پہنچ جاتی ہے۔ مونٹریل کا اوسط مزاج ۶۱ درجے ۴ دقیقے) ہے۔ ٹریموگ گرامیں حرارت (۵۰ درجے ۵ دقیقے) پر پہنچ جاتی ہے۔ زیادہ جنوبی شہروں کا اوسط مزاج معتدل اقلیم کی حد سے کچھ ہی تجاوز ہے۔ ان میں پٹیز (۵۱ درجے ۴ دقیقے) لسن (۵۱ درجے ۴ دقیقے)۔ مکیکو (۱۶ درجے ۶ دقیقے)۔ بیونوس ایرس (۱۶ درجے ۹ دقیقے) ہانوا (۱۶ درجے ۲ دقیقے)۔ سڈنی (۳۸ درجے ۱۱ دقیقے) ناگاساکی (۳۵ درجے ۳ دقیقے) داخل ہیں۔ برخلاف ان کے کیٹن کی اوسط حرارت (۲۱ درجے ۶ دقیقے) قاہرہ کی (۲۲ درجے ۴ دقیقے) ری یوڈی جیرو کی (۲۳ درجے ۱ دقیقے) کلکتہ کی (۲۵ درجے ۸ دقیقے) سنگاپور کی (۱۶ درجے ۸ دقیقے) ہے مگر یہ خیال رکھنے کے قابل ہے کہ چین پر حکمرانی پکن سے ہوتی ہے اور ہندوستان کا تمدن پنجاب اور بالائی گنگا کے زیادہ معتدل مقامات سے آیا ہے۔

مستدل تعلیم میں چار موسموں کا یکے بعد دیگرے بدل کر آنا اور ان چاروں کا ایک دوسرے سے واضح طور پر ممتاز ہونا انسان کے دماغ میں ایک امنگ پیدا کرتا ہے، اس لئے کہ مناظر فطرت کے پیہم تغیرات اسے نئے مشاغل کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اقلیوں کا یہ اختلافت تو ایک ہی تعلیم کے اندر بھی واضح طور پر نمایاں ہوتا ہے گو اس سختی کے ساتھ نہیں جیسا دو اقلیوں کے درمیان میں ہوتا ہے ایک ہی قوم اور ایک ہی ملک کے اندر ہم دیکھتے ہیں کہ ذہانت، اعتدال پسندی، جسمانی طاقت اور قوت برداشت اسی ملک کے زیادہ سر و حصوں میں نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے اور اسی طرح چالاک، قوت تخیل، محروم الزاجی اور اشتغال پذیر اعصاب زیادہ گرم حصوں میں پائے جاتے ہیں ہم اٹالیوں، فرانسیسیوں، جرمنوں اور روسیوں پر نظر کریں اور ہر ملک کی شمالی آبادی کا اس کی جنوبی آبادی سے مقابلہ کریں (لیکن مقابلہ مجموعات کا ہو افراد کا نہ ہو) تو یہ حقیقت فوراً ہی منکشف ہو جاتی ہے۔ جو زمین نے تو مہانے کے ساتھ یہاں تک کہہ دیا ہے کہ شمالی قومیں جنوبی قوموں کو جنگ میں شکست دیدیتی ہیں اور تدبیر سیاسیہ میں خود ان سے شکست کھا جاتی ہیں لیکن مستدل تعلیم کی شمالی اور جنوبی آبادی کا مزاجی فرق ایک حقیقی فرق ہے اور مدبر کے لئے لازم ہے کہ وہ اس کا لحاظ کرے۔

آب و ہوا کے خراب اثرات کے خلاف سیاسیات بہت کم کچھ کر سکتی ہیں فطرت کی طاقتیں سیاسیات سے زیادہ قوی ہوتی ہیں۔ آب و ہوا کے فوائد سے مستفیع ہونے اور اس کے مضرات سے بچنے کے لئے مدبر سے جو کچھ ممکن ہو وہ اسے کرنا چاہئے۔ تعلیم اور قانون سے کچھ ہو سکتا ہے، مختلف آب و ہوا سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں انھیں کے موافق قانون بھی مختلف بنانا پڑے گا مگر اس وضع قانون میں مختلف آب و ہوا کے ضروریات پر بھی لحاظ کرنا پڑے گا مثلاً یہ کہ سرد ممالک کے مزدوروں کو گرم ممالک کے بنسبت کوشت اور شراب کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اور سخت غیثات جو گرم ملکوں میں خطرناک ہوں گی وہ سرد ملکوں میں ضروریات میں داخل ہوتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ شراب کے متعلق آنحضرتؐ کی ممانعت، غرب کے موافق ہے مگر اہل یورپ کے لئے غیر ممکن ہے۔ زیادہ سرد ممالک میں مزدوروں کو بحال خود چھوڑ دینا چاہئے

ملہ الحق بیوہ دلائلی۔ خدا کی قدرت ہے کہ امریکہ میں شراب کا کلی سد باب ہو گیا۔ یورپ کے بیشتر ممالک

آب و ہوا اور
توضیح قانون

مگر زیادہ گرم ملکوں میں ان کی ہمت افزائی کی ضرورت ہے لیکن ان تمام معدلات کے باوجود جو آب و ہوا سے پیدا ہوتے ہیں انسانی فطرت تمام اقلیموں میں ایک ہی رہتی ہے اور ایک حد تک ہر آب و ہوا کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کی قابلیت رکھتی ہے۔ اسباب قوت و ثروت کو اس سے زیادہ پریشانی نہیں ہوتی۔

جب کسی دار الحکومت کی بنا ڈالنے یا منتقل کرنے کا سوال پیش آتا ہے تو آب و ہوا کے خیالات کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ اوٹو سوم سے سخت سیاسی لغزش سرزد ہوئی کہ اس نے روم کو جرانی شہنشاہی کا دار الحکومت بنانا چاہا اور اسی طرح کلکتے سے ہندوستان پر حکمرانی کرنا کوئی اچھی رائے نہیں ہے۔ برلن کو پر دستیا کے دار السلطنت منتخب کرنے کے خلاف بھی بہت کچھ کہا جاسکتا ہے مگر کوئینکس بیرگ سے یہ بہر نوع بہت بہتر ہے۔ سلطنت اٹالیا کے دار السلطنت کے لئے فلورنس کا عارضی انتخاب اس لحاظ سے اچھا تھا کہ ٹیوران کی سستی اور ایملیز کی نرمی کے بین بن خوشگوار آب و ہوا قومی خصلت کی میزان کو برقرار رکھنے کے لئے خوب موزوں ہے۔

(ابقہ ماسیہ - فوگوشہ)

اسی طرف کا مزن ہیں اور ہر مالک شراب کے استعمال کو رو رکھتے ہیں وہ بھی اب اس حد تک تسلیم کرنے لگے ہیں کہ اس کا خاد کم و خضا زیادہ ہے کوئی دن جاتا ہے کہ وہ اسے "جسٹ من عل الشیطان" ماننے پر مجبور ہو جائیں گے۔ (مستہ جم)۔

اسے کسی شہر کی بہترین جائے وقوعہ کی نسبت اسطو کی رائے کے لئے جو صرف یونانی عالمک اور بہت ہی چھوٹی چھوٹی شہری حکومتوں کے لحاظ سے لکھی گئی ہے "سیاسیات" اسطو باب ہفتم فصل یا زوہم دیکھنا چاہئے۔ انگریزی مترجم

دوسرا باب

ملک کی مہیت اور قدرتی اشکال

ملک کی مہیت اور اس کے باشندوں کے تمدن کے باہمی تعلق پر کارل برٹر کے وقت سے جغرافیہ دانوں نے زیادہ توجہ کی ہے مگر یونانی بہت پہلے اس مسئلہ پر ڈال چکے ہیں۔
قدیم ترین متمدن سلطنتیں پنجاب میں اور بالائی گنگا، کیل، وجلہ و فرات اور پہلو کی دلدلوں میں قائم ہوئی تھیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بڑے دریاؤں کے کنارے کی زندگی انسانی قوی اور انسانی تخیل کی ابتدائی ترقی کے لئے خصوصیت کے ساتھ موزوں ہے۔ انسان جب جہازات بنا لیتا ہے نہریں کاٹ لیتا ہے اور دریاؤں سے کام لینے لگتا ہے تو اسے خود اپنے پر اعتماد پیدا ہو جاتا ہے اور وہ دولت کے حاصل کرنے میں لگ جاتا ہے اور پانی کی زندگی سے اس میں مبادرت و تجارت کا شوق ترقی کر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جزائری ممالک جن میں بندرگاہیں واقع ہوتی ہیں جلد ترقی کر جاتے ہیں۔

دریا

سمندر

یونان اور اطالیہ کی قدیمی فوقیت مغرب میں اسپین اور پرتگال کی کامیابی انگلستان اور ولندیزیں آراء سلطنتوں کا عجلانہ عروج یہ سب کچھ زیادہ تر ان کے بحری مواقع کی وجہ سے تھا، اگر سمندر کو تابع فرمان کرنے میں زیادہ محنت اور کوشش کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کا اثر بھی دریاؤں کے بہ نسبت زیادہ زوردار ہوتا ہے۔

پہاڑ

خفعلت اور طینت پر پہاڑی ملکوں کا خصوصیت کے ساتھ قوی اثر پڑتا ہے

انسانی طبائع کے بلند اور قوی کرنے میں مختلف الجسامت پہاڑوں کی شوکت سہمیں سمندروں سے کم موثر نہیں ہوتی پہاڑوں کے رہنے والے مجبور ہیں کہ روزانہ اپنی انتہائی قوت سے کام لیں اس سے ان میں ایک طرح کی طاقت اور اپنی آپ مدد کرنے کی ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے جو ان میں مردانہ صفات پیدا کر دیتی ہے علاوہ اس کے پہاڑی ملک کی منتشر کیفیت اور اس کی ایک دوسرے سے بے تعلق کثیر التعداد اولیاں چھوٹی چھوٹی ملتوں کی ترقی کی مہم سداونہ ہو جاتی ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر زور دار آزادی کے ساتھ ترقی کرتی اور ہر طرح کے حلوں کے روکنے میں ثابت قدم رہتی ہیں۔ یہ خصوصیات اسرائیلیوں اور عربوں میں اسی طرح ہو رہی ہیں، جس طرح ایرانیوں میں۔ کوہ قاف کے قبائل میں اس کا ظہور یونانیوں، سویزر لینڈوں اور سمنانیوں سے کم نہیں ہوا مگر آزادی کا جوش سمندر اور پہاڑ کے اثر سے مختلف رنگ اختیار کر لیتا ہے رومانی یہ خاص خوبی قسمت تھی کہ اسے پہاڑ اور سمندر دونوں کے اثرات سے ایک ساتھ فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔

اندرونی ملک

اندرونی ممالک خاص کر وہ ممالک جن میں وسیع میدان ہوں، اپنی رفتار ترقی میں نسبتاً زیادہ سست ہوتے ہیں کیونکہ وہاں کوئی قدرتی محرک نہیں ہوتا، سلطنت کو فرانس میں المانیا کے بعد اور جرمانیا میں انگلستان کے بعد نشوونما حاصل ہوا۔

سب سے بدتر موقع سمندر سے دور افتادہ سطح ملکوں ملک جن میں نہ کوئی بڑا دریا ہو تا ہے نہ پہاڑ بلکہ صرف وسیع دشت و بیابان ہوتے ہیں۔ آخر لیبیہ کا یورپ سے ایشیا کے اندرونی ممالک کا یہی کے سوا حلی ممالک سے، مغربی یورپ کا مشرقی یورپ سے مقابلہ کیجئے تو یہ فرق فوراً ہی عیاں ہو جاتا ہے۔ ایسے ممالک کی بلید الطبع آبادی مطلق العنان حکومت کی اطاعت کو بے چون و چرا اپنے اوپر لازم کر لیتی ہے۔

انسان کی طاقت
قدرت پر

انسان ان قدرتی حالات کو پیدا نہیں کر سکتا، مگر آب و ہوا کے بہ نسبت اسے ان حالات پر زیادہ قدرت حاصل ہوتی ہے وہ پہاڑوں کو بلکہ سے ہٹا نہیں سکتا نہ سمندر کو اپنے ملک سے ملا سکتا ہے مگر وہ دریاؤں کو قابل سفر بنا سکتا نہیں کاٹ سکتا ہے، ریل جاری کر سکتا اور تار برقی کا ایک جال سارے ملک میں پھیلا سکتا ہے۔ یہ وہ ملک کی ساکت حالت میں تجارت کے ذریعے سے زندہ دلی پیدا کر سکتا اور ملک کے اندرونی حصے کو سمندر سے ملا سکتا ہے۔ کرہ ارض کے تمام قابل سکونت حصوں کو ایک مسلسل اور

بار آورنا اور کے زواری میں رہتے کرینے کا عظیم انسان کام مہذب جدید کے پیش نظر ہے اور انجام کار تکمیل کو پہنچ جائے گا۔

طاس کل نے زیادہ عارضی اور تغیر پذیر نوامیس کے اثرات کی طرف توجہ دلائی ہے یہاں بھی سمندر اور پہاڑ کے مناظر اندرونی میدان کے منظروں کے بہ نسبت زیادہ گہرا اور دل پذیر اثر پیدا کرتے ہیں گراس کے سوا اور اثرات بھی ہیں گرم اقلیم کے ملکوں میں فطری حالت اکثر ایسی ہے قابو کر دینے والی ہوتی ہے کہ انسان اسے مغلوب کرنے سے مایوس ہو کر تمام کوششیں ترک کر کے بچھ رہتا ہے اور اس کے تخمین میں فطرت کی حبیب قوت کے سوا اور کوئی بات نہیں آتی۔ اس کا دل خوف اور وحش سے بھر جاتا ہے۔

برف باری کی شدت، برف کی چٹانوں کی روانی، پسند آری اقطاع میں برافٹ کا طوفان شدید بارش اور سیلاب اور اکثر گرم ممالک میں خوفناک طوفان اور بگونوں کا اٹھا زین کا سرسبز حالت سے دفعہ آتی وہی میدان ہو جانا۔ حشرات الارض کا تباہ کن دل، وحشی جانوروں کا خطرہ یہ سب وہ اثرات ہیں جو ان ممالک کے باشندوں کی طبیعتوں کو ابھارنے کے لئے ہوتے ہیں اور پریشان کر دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے انسانی طبائع کی ترقی کے لئے معتدل ملک سب سے زیادہ موزوں ہے۔ یکساں آب و ہوا میں طبیعت کو کافی تحریک نہیں ہوتی اور شدت انسان کو پریشان کر دیتی ہے۔ انسانی خیالات کے ابھرنے اور اس کی کوششوں کے برائے ممکنہ ہونے کے لئے متنوع اور معتدل آب و ہوا کی ضرورت ہے۔ انسانی طبیعت جو گرم اقلیم کے ملکوں میں از خود رفته ہو جاتی ہے، معتدل حالت میں ایک منظم و مقبول رفتار سے نشو و نما حاصل کرتی ہے۔

معتدل آب و ہوا کا فائدہ

مگر گروائیس طبعی ہی اہمیت میں ہیں مبالغہ نہ کرنا چاہئے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ان پر وہ انحصار نہیں ہے جو انھیں خود انسان کے ذریعہ سے انسان کی اخلاقی اور ذہنی تعلیم پر ہے۔ گرم ممالک میں شعور فطری (عقلیت) کی تربیت ہو سکتی ہے اور احساس حسن کے ذریعہ سے وہم و تخیل کی دوک ہو سکتی ہے، اور اسی طرح (بلا عظیم) معتدل ملک میں ادبام خود رو گھاس کی طرح بڑھ کر پھیل سکتے ہیں۔ انسان فطرت کی قوتوں کا بندہ نہیں ہے اسے ہمت اور آزادی کے ساتھ فطرت کا مقابلہ کرنا چاہئے جو وہ فطرت سے مل سکتی ہو اس سے فائدہ اٹھائے اور جو مضرتیں اس میں ہوں ان کے انشاد اور اصلاح میں جدوجہد کرے

تیسرا باب

زمین کی زرخیزی

جس ملک کی زمین زرخیز ہوتی ہے وہاں بسر اوقات نسبتاً آسان ہوتی ہے اور اسی انداز سے آبادی بھی بڑھ جاتی ہے۔ بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ زرخیز زمین نظم معاشرت و سلطنت کی ہر جہت کے لئے سب سے زیادہ مفید شے یعنی اسی سے خوش عیش بہشت کا خیال پیدا ہوا جہاں رنگ و رنگ کے خوش ذائقہ پھلوں کے لئے صرف ہاتھ بڑھانے کی ضرورت ہوگی اور طفل مزاج اور سست طبع لوگوں کا منتہائے خیال ابھی تک یہی ہے مگر بچنگی بن اور انسانی کوشش سے اس حالت سے ایک نفرت پیدا ہو جاتی ہے جس میں زندگی کے صحیح مقصد اور فطرت انسانی کے نمو اور تکمیل کا کوئی خیال نہ ہو۔

بنجر زمین

یہ یقینی ہے کہ بالکل بنجر زمین معاشرتی زندگی کے لئے ناموزوں ہے کیونکہ اس حال میں انسان مجبور ہوتا ہے کہ تجارت کے ذریعے سے اپنی غذا کسی دور دراز مقام سے مہیا کرے ان حالتوں میں تجارتی شہر قائم ہو جاتے اور ترقی کرتے ہیں۔ جیسا کہ بے غم سمندر کی آغوش میں شہر و شہر نے پرورش پائی مگر بنجر ملکوں میں پوری پوری قومیں صرف تنگ دستی اور تکلیف ہی کے ساتھ بسر کر سکتی ہیں۔ آبادی کم ہوتی ہے اور اس کی ترقی بھی ضعیف ہوتی ہے کسی معین جگہ کا توطن بھی بدشواری ممکن ہوتا ہے لوگ غمگین خاندانوں اور گروہوں کی صورت میں خاندان بدوش زندگی بسر کرتے ہیں۔ بگل نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ مغلوں اور تاتاریوں نے خود اپنے بنجر میدانوں میں بہت کم ترقی کی اور چین اور ہند کی قابل زراعت زمینوں میں پہنچ کر

انہوں نے ایک تمدن کو حاصل کیا۔ اسی طرح اہل عرب بھی اس وقت تک کوئی ترقی یافتہ سلطنت نہ قائم کر سکے جتنا کہ وہ عرب کو جھوڑ کر ایران کی زرخیز زمین اور بحر متوسط کے ساحل پر نہیں پہنچے۔ سرد آب و ہوا میں سلطنت کی سست ترقی کا صرف یہی سبب نہیں ہوتا کہ گرم سامان کے مہیا کرنے اور فطرت سے سخت کشاکش کی مشکل درپیش رہتی ہے بلکہ یہ بھی سبب ہوتا ہے اور بہت بڑا سبب ہوتا ہے کہ محدود ممالک کی زمین بھجرتی ہے۔ یہی اثر ہے ان گرم ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں جہاں ظاہر از زرخیزی بہت ہوتی ہے مگر کثیر وقوع اور اتفاقی حادثات جیسے کیرلوں کی بلیا سیلاب اسے غارت کرتے رہتے ہیں کیونکہ یہ سرد اور خشک کے جمع کرنے اور محفوظ رکھنے کی مشکلات بھی معاشری زندگی کے لئے ویسی ہی سہارا دہی جیسی پیداوار کی قطعی قلت۔

نہایت ہی زرخیز زمین جو بلا محنت کے کافی غذا مہیا کر دے ایسی زمین سے بہتر ہے جس میں کچھ پیدا نہ ہو لیکن سلطنت کے لئے کسی بیج سے یہ بہترین بنیاد نہیں ہے اور اس کے اسباب حسب ذیل ہیں۔

زرخیز زمین سے یہ نتیجہ ہوتا ہے

۱۔ کابلی

انسانی کوشش کا خاص محرک غذا کے مہیا کرنے کی خواہش ہے۔ اگر یہ ضرورت فطرت کی فیاضی سے رفع ہو جائے تو انسان بہت ہی کم کام کرتا ہے بلکہ مطلقاً کام نہیں کرتا اور بالعموم کابلی اور شہوت پرستی میں غرق ہو جاتا ہے۔ جہاں انسان کام سے باز رہتا ہے وہاں اس کی فطرت کے مخفی وسائل کو نشوونما نہیں ہوتی اور اس لئے معاشرت میں بھی ترقی نہیں پیدا ہوتی۔ گرم تعلیم کے متعدد جزیروں میں لوگ خوشحالی کے ساتھ عیاشانہ زندگی بسر کرتے گزراں کے ساتھ ہی اقوام غیر تمدن رہتے ہیں۔ نیپلز نے جب اپنے کابل آباد گردہوں کو محنتی مزدوروں کی حالت میں بدل دیا تو اس نے انسانی تہذیب میں بہت ترقی کر لی جہاں محنت کی ضرورت نہیں ہوتی وہاں محنت اور محنت کرنے والے دونوں مقیر نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ قوم کے عام آدمیوں کی زندگی کسی شمار میں نہیں ہوتی۔ انسانی زندگی سے ایسی وحشیانہ لاپرواہی کہیں نہیں آتی جیسی آخر تک کی جشی مطلق العنان سلطنتوں میں ہوتی ہے، جہاں خاکست و درو کے زمین سے پیداوار حاصل ہو جاتی ہے اور محنت کو وقعت دینے کے لئے کوئی صنعت و حرفت موجود نہیں ہے۔

۲۔ محنت کی قلت

زمین کی زیادہ زرخیزی سے ملکیت کی غیر مساوی تقسیم کو ترقی ہوتی ہے، چہندہ تمدن

مساویت کی غیر مساویت

عیش فراوان میں زندگی بسر کرتے ہیں، متوسط طبقہ جتنا ہی نہیں اور عام لوگ غلامانہ حالت میں رہتے ہیں۔ چونکہ زمین کی بار آوری انسانوں کی بار آوری کو بھی ترقی دیتی ہے یعنی نئے غلامانہ آسانی سے بنتے ہیں اور روزی کمانے کی فکر بچوں کی پیدایش اور پرورش کے مواقع کو نہیں گھٹاتی اس لئے ان ممالک میں آبادی پر کوئی روک نہیں ہوتی بلکہ اس میں تیزی کے ساتھ ترقی ہوتی جاتی ہے مگر وقتاً فوقتاً قحط یا جنگ اس بے پروا آبادی کو مصیبت میں مبتلا کر دیتی ہے (اور اس وقت) وہ چند اشخاص جنہیں اپنی پیداوار کے جمع کر رکھنے کا سامان حاصل ہوتا ہے وہ عوام کو مجبور کرتے ہیں کہ غذا کے عوض وہ اپنے بچوں کے درخت اور زمین ان کے حوالے کر دیں۔ فوجی سردار محافظت کے عوض میں محصول اور خدمت لیتے ہیں، پر دہشت جو دیوتاؤں کو راضی کرتے اور ان کی نوازش حاصل کرتے ہیں، اپنے مستبدین سے بڑی بڑی جاگیریں پاتے ہیں اس طرح آہستہ آہستہ دولتمند زمینداروں اور رئیسوں، امیروں اور پرمہنوں کا ایک طبقہ پیدا ہو جاتا ہے جو ممالک کا مالک ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ کسی حد تک تہذیب بھی حاصل کر لیتے ہیں اور بہت بڑی دنیاوی ثروت کے مالک بن جاتے ہیں۔ وہ ماتحت طبقات سے محنت لیتے ہیں مگر اس محنت کو ازراں رکھتے ہیں کیونکہ مزدوروں کی کثرت ہوتی ہے اور اس لحاظ سے انسان کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ عوام فلاکت زدہ، حقیر اور بالکل ہی دوسروں کے تابع ہو جاتے ہیں۔ وہ خدمتگاری کی سست اور وحشیانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور ہر طرح کے ہندوبکن اثر سے بالکل ہی الگ ہوتے ہیں۔

ہندوستان

بالکل پہلا شخص تھا جس نے زمین کی بہت زیادہ زرخیزی کے ان نقصانات پر پورا زور دیا اور تاریخی طور پر انہیں قائم کیا، لیکن جب وہ ہندوستان کی قدیم تہذیب اور ذاتوں کے طریق کو اسی سبب کے تابع قرار دیتا اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ تمدن سے پہلے دولت کی کثرت ضروری ہے تو یقیناً وہ حد سے متجاوز ہو جاتا ہے۔ تمام انگریزوں کے مانند وہ بھی اقتصادی حالات پر زالیہ از ضرورت زور دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نہایت بلند مرتبہ برہمنوں اور بودھ مت والوں نے، خلاص کو دولت پر ترجیح دی ہے چھتری دولت سے زیادہ طاقت کے دلدادہ اور جرات و ہمت کے قدردان تھے ابنتہ دیش اپنی محنت و تجارت اور سود سے دولت جمع کرتے اور اس کی بڑی قدر کرتے

تھے لیکن ان کا تعلق طبقہ ایمان سے نہیں تھا۔ شہر غلامانہ حالت میں ڈال دے گئے تھے، نہ اس وجہ سے کہ وہ غریب تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ ایک پست درجے کی مفتوح قوم سے تھے۔

تاہم یہ صحیح ہے کہ چاول کی خرداں پیداوار آسانی کے ساتھ ایک بڑی آبادی کی بسر اوقات کو کافی ہوتی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جب آہستہ آہستہ سارے ملک کی زمین ریسوں اور امیروں کی جاگیر ہو گئی تو معدودے چند دولتمندوں اور کثیر التعداد غریب کے درمیان ایک فرق قائم ہو گیا اور اب تک باقی ہے۔ ایک طرف ایک مختصر اور اعلیٰ تمدن جماعت ہے جسے غایت درجے کی دنیاوی آسائش حاصل ہے اور دوسری طرف ایک حقیر و مظلوم حجم غیر ہے۔

یہی حال مصر کا ہوا۔ وہاں بغیر زیادہ تردد کے کہوڑے درختوں سے کثیر پیداوار ہو جاتی ہے۔ مصری بادشاہوں کی عالیشان تعمیرات کی بہتات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان عمارت میں انسانی خدمات اور محنت کا کیسا فطیر صرف ہوا ہے۔ غلامانہ مزدوروں کی سنگستہ حالت کی داستان یہودیوں کے (عبرانی) وقایع سے معلوم ہوتی ہے۔ حضرت یوسفؑ کی صلاح فرعون کے خزانہ کے لئے کار آمد ہوتو ہو کر رعایا کے لئے برباد کن تھی۔

مکسیکو اور پیرو میں بھی ہم دولتمند اور صاحب قوت اشخاص کی ایک مختصر جماعت دیکھتے ہیں کہ عوام کے غرق محنت پر قابض تھی اور یہاں بھی اس خرابی کی وجہ ایک حد تک بظاہر فطرت کی فیاضی ہے، جس نے جو اے اکیلا اور آلو بکثرت پیدا کر دیا ہے بچلے طبقوں میں برہنہ تہنی اور غلامی، اوپر کی طرف دولت کی زیادتی، افنون لطیفہ اور حکومت، باہر کی جانب کمزوری، ایک طرف سر بفلک عمارات دوسری طرف فلاکت زدہ جمہوریاں۔

نہیں یہی تصویر ہے ان مبارک ملکوں کی۔
آباد بر اس خرابی کو رفع کر سکتے ہیں؟ اگر وہ ایک مستور قومی زندگی کے دل سے ترقی دینے میں مہنک ہو جائیں تو بیشک وہ اسے رفع کر سکتے ہیں۔ باوجود زمین کی زرخیزی کے یہ ممکن ہے کہ ادنیٰ طبقات اعلیٰ طبقات کی حرص اور زیادتی سے محفوظ رکھے جائیں، انھیں آزاد انسان بننے کی تعلیم دی جائے، مالا مال کی زیادہ بہتر تقسیم کو ترقی دی جائے اور متوسط طبقے جو نہایت ضروری ہیں قائم کئے جائیں۔

مصر

مکسیکو اور پیرو

مستقل زمین
زمین سب سے
بہتر ہے۔

پس انسان کی اجتماعی زندگی کے لئے سب سے زیادہ موزوں مستقل زمینیں
زمین ہے کہ جس کے لئے قرار واقعی اور بالاستقلال محنت صرف کرنے کی ضرورت ہوتی
ہے۔ وہاں محنت اور محنت کرنے والوں کی مناسب قدر کی جاتی ہے گران پرزائیڈ
از ضرورت بار نہیں پڑتا اور نہ ان کی حالت تباہی کو پہنچتی ہے۔ انسانی طاقتوں کو
نشوونما اور شرائط زندگی کی تکمیل ہوتی ہے معقول خوشحالی کے ساتھ خاندانوں کو محفوظ معیشت کا لطف
حاصل ہوتا ہے اور دولت کی تقسیم اس طرح ہوتی ہے کہ متوسط طبقوں کے لوگوں کی کمزرت
ہوتی اور ان کی حالت اچھی رہتی ہے۔ بتدریج ایک طبقہ دوسرے طبقے سے جا ملتا ہے
اور یہ خطرہ نہیں رہتا کہ نیچے کا طبقہ غلام بنالیا جائے گا یا اوپر کا طبقہ ایک ذی امتیاز طبقہ ہو جائیگا۔
پیشوں کے اختلافات کمزرت ہوتے ہیں مگر قوم کا ایک مربوط مجموعہ قائم رہتا اور ان میں ایک
مشترک جوش موجزن ہوتا ہے۔

بیشک تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ان حالات سے یہ لازم نہیں آتا کہ دولت
کی مساوی تقسیم ہو جائے اور متنوع قومی زندگی پیدا ہو جائے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت
سے قوی اسباب شامل ہیں لیکن اگر ہم یورپ کا مغربی اور جنوبی ایشیا سے یا شمالی
امریکہ کا وسطی اور جنوبی امریکہ سے بلکہ اگر صرف جنوبی اٹالیا کا لوہارڈی اور سویٹزرلینڈ سے
مقابلہ کریں تو یہ امر عیاں ہو جائے گا کہ ایک اوسط درجے کی حاصل خیز زمین اور اس کے
ساتھ اوسط درجے کی محنت کا صرف کرنا اس سے ہر طرح پر بہتر ہے کہ محض زمین کی زرخیزی
بمقدار زیادہ ہو اور محنت کی تقریباً ضرورت ہی نہ ہو۔ اس میدان میں سلطنت کا خاص کام یہ
ہو گا کہ صحیح فطرتی حالات کو انسانی مداخلت سے محفوظ رکھے اور طاقتوں کا ایسا توازن
قائم رکھے کہ باہمی امداد و ترقی کو برتری حاصل ہو۔ وضع قانون اور اقتصادی حالت سے
زمین کے خراب ہو جانے یا بیکار ہو جانے سے بچانے میں مدد ملے۔ اراضی کا چند افراد کے
پاس مجتمع ہو جانا (خاص کر رہن کی صورت میں) ارک جائے اور دولت کی فطرتی تقسیم میسر
آئے۔ حکومت بعض وقت بنجر زمین کو زرخیز بنا سکتی اور علیٰ ہذا دلدلوں کو خشک کر کے
اور میدانوں میں آبرسانی کا سامان کر کے ملک کی پیداوار کو بڑھا سکتی ہے۔

قانون

چوتھا باب

زمین

جس طرح سلطنت کی ششقی بنیاد قوم پر قائم ہے اسی طرح اس کی مادی بنیاد زمین پر قائم ہے۔ کوئی قوم مستقل سلطنت نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ ایک رقبہ زمین نہ حاصل کرے۔

دنیا کے جس حصہ پر کوئی قوم قابض ہوتی ہے یا کوئی سلطنت حکمرانی کرتی ہے وہ اس کی زمین یا مملکت (ٹاک ارضی) کہلاتی ہے۔ اس مملکت کی وسعت قوم کے نشوونما کے مانند تاریخی واقعات سے متعین ہوتی ہے۔ سلطنت کی قانونی ہستی کے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی شاہیاں اور جمہوریتیں ہمیشہ رہی ہیں اور ایک حد تک انہوں نے اپنے بڑے بڑے ہمسایوں کے پہلو پہ پہلو برابری کے مرتبے کو قائم رکھا ہے اسلئے سلطنت کی ٹاک ارضی کے لئے کسی اوسط حد کے مقرر کرنے کی کوشش غیر ممکن ہے یونانیوں کی شہری سلطنتیں رومی شہنشاہی کے مقابلے میں بیچ معلوم ہوتی ہیں مگر تاریخ عالم میں ایتھنز کو روم کے پہلو پہ پہلو ملے جاتی ہے۔ بااں ہمہ سلطنت کی وسعت اس کی سیاسی حیثیت اور اہمیت پر بڑا اثر رکھتی ہے اور بہت سے واقع سیاسی مسائل سے اس کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔

سلطنت اور
اس کی ٹاک
ارضی

سلطنت کے یہ دو ضروری عنصر (زمین اور قوم) بدیہی طور پر ایک دوسرے پر اثر رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ زمین قوم کے لئے بہت تنگ اور اس کی دماغی (ذہنی) اور مادی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے ناکافی ہو، آبادی کی زیادتی سے ضرورت پیش آئے کہ نوآبادیاں قائم کی جائیں تاکہ فاضل حصہ وہاں بس سکے۔ یا قوت کا احساس اور تمدن کی

ضروریات کا تقاضا یہ ہو کہ مملکت کو وسعت دیجائے اور یہ غرض الحاق یا فتح سے حاصل کی جائے۔ اس صورت میں یہ مشکل ہے کہ وسعت و ترقی کے طبعی حق کو دوسری قوموں کے تاریخی حقوق سے موافقت دیجائے۔

اسو اس کے جب کوئی سلطنت اس قدر چھوٹی ہو جائے کہ دوسری ترقی پذیر سلطنتوں کے مقابلے میں وہ اپنی ہستی کو محفوظ نہ رکھ سکے تو وہ یا تو کسی دوسری سلطنت کی طرف ہو جاتی ہے یا اپنے کو کسی زیادہ قوی سلطنت میں یوں ہی جذب ہو جاسکتی رہتی ہے۔ دوسری جانب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک منتشر آبادی اپنی ملک ارضی کو ضرورت سے زیادہ وسیع سمجھے یا اس کا کوئی خاص حصہ خود مختار ہو جانے کا خواہشمند ہو۔ صورت اول میں سلطنت بیرونی آباد کاروں کی آمد کی ہمت افزائی کرے گی اور صورت ثانی میں وہ انفریق یا انتشار کی روش اختیار کرے گی۔

بڑی سلطنتوں کی
جانب میلان

اس امر میں زیادہ حال کا میلان ازمنہ وسطیٰ کے رجحان سے بالکل ہی مختلف ہے اس زمانے میں عام میلان چھوٹی سلطنتوں کی طرف تھا اور اب بڑی سلطنتوں کی جانب رہا ہے۔ اس زمانے میں اطالیا، فرانس، جرمانیا، اسپین اور اتر جزیرہ برطانیہ اور سلاوی ممالک سب چھوٹی چھوٹی شاہیوں یا جمہوریتوں میں منقسم تھے۔ رومی شہنشاہی کا اتحاد علی ہونے کے بجائے زیادہ تر خیالی تھا۔ بڑی سلطنتیں قائم کرنے کا میلان انگلستان سے شروع ہوا اور بر اعظم میں پندرہویں صدی کے نصف آخر سے نظر آتا ہے اور ابھی تک اپنی پوری حد کو نہیں پہنچا ہے۔

ازمنہ وسطیٰ کی سلطنتیں لاتعداد تھیں۔ تقریباً ہر امارت بہتر سے شہر اور اکنہ مذہبی بلکہ دیہات تک اپنی آزادانہ سیاسی ہستی رکھتے تھے۔ ان نظامہ کے حکومت میں سے اب صرف چند ہی باقی رہ گئے ہیں اور ان کے بھی قائم رہنے کی بہت کم امید ہے۔ قدیم رومی خیال اتحاد کے ان لاتعداد نظاموں میں منقسم ہو جانے میں بہت سے اثرات نے ایک دوسرے کی مدد کی۔ انھیں میں ذیل کے وجوہ بھی تھے سرکوں اور منزلوں کی کمی، ذرائع نقل و حرکت کا نامکمل ہونا، خاص حقوق کی جانب میلان، پولیس کا ناقص طریقہ جاکر دارانہ نظام (جس کی فوجی خدمتیں معین تھیں اور جس کا سامان جنگ ناقص تھا) روپیہ کا محدود درواج (جائیدادوں کی علمدگی، خاندانی حکمرانی اور شخصی قانون کے بنیادی

آبادی حدود ارضی
سے زیادہ اہم ہے

مگر کسی سلطنت کی قوت کا اندازہ محض اس کی وسعت سے نہیں ہونا چاہئے جس پرانی
شہنشاہی کی ملک ارضی دو لاکھ دس ہزار مربع میل ہے مگر یورپ میں وہ سب سے زیادہ طاقتور
سلطنت ہے فرانس کی وسعت یورپ میں دو لاکھ چار ہزار مربع میل ہے مگر بدربھراقل اس کی قوت
روس کے برابر ہے جس کے حدود ارضی ایک اکیس لاکھ مربع میل ہیں اس سے وہ چند ہیں۔
برطانیہ عظمیٰ کی یورپی مملکت صرف ایک لاکھ اکیس ہزار دو سو بیستیس مربع میل ہے مگر اس کے
ذریعہ سے وہ ان مستعمرات و تابعات پر حکومت کرتی ہے جو خود اس سے بڑھ کر زیادہ وسیع ہیں
کسی قوم کی طاقت کے تعین میں آبادی کو وسعت ارضی کے بہ نسبت بدربھرا زیادہ اہمیت حاصل
ہے گو کہ ملک کی وسعت بھی بجائے خود ایک اہمیت رکھتی ہے۔

حدود ارضی جس قدر وسیع ہوتے جاتے ہیں اسی قدر نقل و حمل کی مشکلات بڑھتی جاتی
ہیں اور اسی نسبت سے حکمرانی میں مشکل پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس کی مقتدر قوتیں صرف آہستگی
کے ساتھ جمع کی جاسکتی ہیں اور اس کے دور افتادہ صوبجات کامل نگرانی کے اندر نہیں ہوتے۔
آمد و رفت کے ترقی یافتہ ذرائع سے اس مشکل میں کمی ہوگئی ہے مگر وہ بالکل رفع نہیں ہوگئی
ہے۔ سلطنت کی انتہائی حد پر بحالی کی تیزی کے ساتھ حکم پہنچ سکتا ہے مگر بالمشافہ اقتدار کا زور
اس میں نہیں ہوتا۔ اس میں غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے یا اگر عایا اس پر رضامند نہ ہو تو اس سے گریز
کر سکتی ہے۔ ریل کے ہوتے ہوئے بھی آدمی، خوراک اور سامان کے پہنچانے میں وقت صرف
ہوتا ہے اور جن صوبوں کی آبادی کم ہوتی ہے ان میں ریل کا جاری کرنا بھی ہمیشہ ممکن نہیں
ہوتا، اکثر شاہراہوں کی بھی کمی ہوتی ہے۔

اس لئے مملکت کی وسعت سے ہر حال میں طاقت کی وسعت کے معنی نہیں
لئے جاسکتے۔ اگر نسبتاً چھوٹی مملکت پر حکمرانی آسان ہو تو ایسی حالت میں فتوحات کے پھیلانے
سلطنت کمزور ہو سکتی ہے۔

بڑی سلطنتوں کی
قوت اور کمزوری

کسی وسیع الحدود سلطنت کے مختلف مقامات پر حملہ کر کے اسے پریشان کرنا آسان ہے
مگر کوئی مستقل کامیابی حاصل کرنا دشوار ہے۔ دشمن کے لئے یہ ممکن ہے کہ وسیع قطعات کو بلا
مخالفت طے کر جائے مگر اس پر قائم رہنا اس کے لئے مشکل ہے اس کا موقع صرف یہی ہے کہ
وہ سلطنت کی مجتمعہ طاقت پر حملہ کرے اور اسے شکست دیدے۔ روس اور جنوبی
امریکہ کی حال کی جنگوں سے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے لیکن سلطنت کا زیادہ پھیلاؤ

جہاں اسے بے بس اور پریشان کر دیتا ہے وہیں اس کے فوائد بھی ہیں۔ برہی سلطنت کے ذرائع وسیع ہوتے ہیں جو ایک لمحے میں ختم نہیں ہو جاتے اس لئے خطرناک نازک وقت میں وہ واقعات کے تغیر کا انتظار کر سکتی ہے۔ ایک ضرب سے اس کا مغلوب ہو جانا شاندار نادر ہی ہو سکتا ہے

سلطنت کی وسعت، اس کے نظام حکومت کی صورت پر بھی اثر رکھتی ہے بلکہ عموماً (Democracy) صرف چھوٹے ملکوں میں ممکن ہے، جہاں لوگ مجلس ملی میں اکثر جمع ہو سکتے ہیں۔ برہی شاہی کے طریقہ لیا بٹ کے واسطے زیادہ وسیع حدود کی ضرورت ہے۔ روہی شاہی کی وسعت، محدود جمہوریت کے تعزل کرنے اور قوت کے ایک مطلق العنان شہنشاہ کے ہاتھ میں آ جانے کے اسباب میں سے ایک خاص سبب تھی۔ روس میں بھی زار کی مطلق العنان طاقت کا باعث ایک حد تک اس کی یہی وسعت ملکیت ہے۔ اور انگلستان تک یہ نہیں چاہتا کہ ہندوستان کو پارلیمانی تنظیمات دیدی جائیں۔ لہذا سلطنت کی برہی حکمت عملی کو اپنے ملک کی خصوصیت اور وسعت پر خیال کرنا اور اسی کے مطابق روش اختیار کرنا چاہئے۔

سلطنت کے مطلق حدود دایمی اور ناقابل تغیر نہیں ہیں وہ محض قوتوں کی ترقی و تزلزل پر منحصر ہیں۔ اگرچہ وہ اس کی آبادی کے حدود سے زیادہ معین و مستقل ہیں اور صرف بڑے واقعات کی وجہ سے کہیں کہیں ان میں تغیر ہوتا ہے۔

سلطنت کے حدود یا تو اسے کسی دوسری سلطنت کے حدود سے جدا کرتے ہیں یا کسی ایسی زمین سے جدا کرتے ہیں جو کسی سلطنت کی ملک نہ ہو۔ اول الذکر حالت میں سرحد کا ایک معین خط ہوتا ہے اور تھروں، خندقوں اور دیواروں سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ ثانی الذکر صورت میں کسی قطعی خط کے کھینچنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ بغیر اس کے کہ دوسری سلطنتوں سے جو پیر کی پیدا ہو، حدود دکھائے بڑھائے جاسکتے ہیں۔ اول الذکر صورت میں اشیاء کے ذریعہ داخل ہیں۔

(الف) دریا اور چشمے، لیکن یہ سرحدیں ایسی قطعی طور پر معین نہیں رہتیں جیسی ارمنی سرحدیں معین ہوتی ہیں۔ دو سلطنتوں کے درمیان قطعی سرحد یا تو دریا کے وسط میں مقرر ہوتی ہے یا خاص دریا کی تہ میں یعنی بہاؤ زیادہ سے زیادہ جہاں تک پہنچتا ہے لیکن چونکہ

سلطنت کا اثر
نظام حکومت پر

حدود

کشتی رانی اور تجارت کے لئے بیج کے دھارے ہی سے بالتحقیق کام پڑتا ہے اس لئے ان غرضی کے لئے یہ دونوں سلطنتوں میں مشترک سمجھا جاتا ہے مگر یہ دونوں حدیں دریا کے کناروں کے کاٹ دینے یا چھوڑ دینے یا دھارے کے بھاؤ کے بدل جانے کی وجہ سے بدل سکتی ہیں۔

(ب) پہاڑ - پہاڑ بالعموم ایک قبیلے کو دوسرے قبیلے سے اور ایک تمدن کو دوسری قوم کے تمدن سے جدا کر دیتے ہیں۔ آمد و رفت کے وسائل کم ہوتے ہیں اور ہوتے بھی ہیں تو صرف ایک ہی ایک راستہ ہوتا ہے۔

علی العموم پہاڑ کی بلند ترین چوٹی جو پانی کے حصوں کو بھی جدا کرتی ہے فطرتی سرحد خیال کی جاتی ہے ثنائی الذکر صورت اشیاء ذیل کو شامل ہیں۔

(الف) سمندر اور وسیع خلیج جو فطرتاً کسی سلطنت کے تابع نہیں ہوتے اور تمام دنیا کے کام کے لئے کھلے ہوتے ہیں۔

(ب) صحرا و بیابان اور بعض وقت جنگل اور غیر آباد پہاڑ جس قدر تمدن کو ترقی ہوتی جاتی ہے یہ قطعات سلطنت کے مقاصد کے لئے کارآمد ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے فطرتی سرحد کا کام یہ شاذ و نادر ہی دیتے ہیں۔

حد بندیوں کی مزید تشریح قانون بین الاقوامی سے تعلق رکھتی ہے۔

بعض وقت متعدد ممالک متحد کر لئے جاتے ہیں یہ صورت مختلف طریقوں سے واقع ہو سکتی ہے۔

(الف) جو ممالک متحد ہوں وہ اپنی ہمتی کو قائم رکھیں اور سب برابر کے درجے پر ہوں جیسے ممالک متحدہ امریکہ یا جرمانی شہنشاہی میں ہے۔

(ب) ممالک کی جداگانہ ہمتی قائم رہے مگر مدارج مختلف ہوں ایک ملک شہنشاہی کے رتبے پر سمجھا جائے اور دوسرے ممالک اس کے ماتحت ہوں۔ جیسے برطانیہ عظمیٰ اور اس کے مستعمرات و نوابع یا فرانس مع الجزائر۔

(ج) سابقہ ممالک ایک سلطنت کے سو بے ہو جائیں جیسا کہ روس کی وسعت سے ہوا

لیکن چونکہ مکمل سلطنت کے منتہائے خیال کی بنا قوم پر نہیں بلکہ نوع انسان پر ہے اس لئے مکمل مملکت تمام روئے زمین ہے۔ جن میں مختلف ممالک کے متضاد اوصاف ایک ہم رنگ مجموعے میں متحد ہوں جس سے ایک دوسرے کی تکمیل و تقویت ہو

متعدد مملکتوں کا اتحاد

اتم و اکمل مملکت

لیکن موجودہ سیاسیات کے لیے جو ابھی منتہائے خیال کے حصول سے بہت دور ہے، عملی اصول یہ ہے کہ ایک مختلف النوع مملکت سلطنت کے لئے بہترین مملکت ہے یہ مملکت ایسی ہو جس میں پہاڑ اور وادیاں، دریا اور جھیلیں سمندر کے ساحل اور میدان سب کچھ ہوں اسے بہترین کچھ اس وجہ سے قرار نہیں دیا ہے کہ ایسے ممالک زیادہ زرخیز ہوتے ہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اس طرح باشندوں کے مختلف قومی کو حرکت اور انتہائی ترقی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف بدترین مملکت اندرون ملک کے وسیع اور ویران بیابان کی مملکت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قطعات ہمیشہ خانہ بدوش قبائل کے مسکن بنے رہتے ہیں جو سیاسی زندگی کے رتبے کو نہیں پہنچتے۔

پانچواں باب

ملکیتی فرمانروائی

تمام ملکیت پر سلطنت کے شاہی حقوق اکثر ملک سلطنت کے نقطہ سے موسوم ہوتے ہیں لیکن یہ نام اگرچہ ایشیا کی قدیم سلطنتوں یا جاگیر کی طریق کی سلطنتوں کے لئے ناموزوں نہیں تھا مگر موجودہ سیاسی خیالات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ جیسے یہودیوں کی قدیم سلطنت میں ساری زمین صرف خدا ہی کی ملک سمجھی جاتی تھی اور مصر میں فرعون نے تمام زمین کے تنہا مالک خیال کئے جاتے تھے اور دیگر اشخاص کو اس سے عارضی انتفاع کا حق حاصل تھا۔ اُسی طرح رومی شہنشاہی میں مفتوح موبجبات کی زمین حسب مضابطہ رومی قوم یا شہنشاہ کی ملکیت خیال کی جاتی تھی اور اہل صوبہ اگرچہ واقعات میں پر قابض رہتے تھے مگر ان کی ملک ادنیٰ درجہ پر سمجھی جاتی تھی۔ ازمنہ وسطیٰ کی بعض سلطنتوں میں (مثلاً نارمنی فتح کے بعد انگلستان میں) بادشاہ تمام زمین کا مالک اعلیٰ اور جاگیر دارانہ رئیس متصور ہوتا تھا اور رعایا اپنی جاگیر اور پر جاگیر کے طور پر قابض ہوتی تھی۔ ان تمام حالات میں ملک سلطنت کا خیال باطل ہے اس طرح پیدا ہوا کہ شخصی ملکیت کا خیال سیاسی فرمانروائی سے مخلوط کر دیا گیا، مگر اب کہ شخصی قانون اور عام قانون ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ یہ خیال ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔

اس لئے چاہئے کہ ہم سلطنت کی ملک کے اندر اس کے حقوق فرمانروائی کو اس کی ملک سے علیحدہ کریں بلکہ ایک شخصی قانون کا معاملہ ہے خواہ وہ ملک سلطنت ہی کی کیوں نہ ہو۔ فرمانروائی فی الحقیقت ایک سیاسی شے ہے اور اس کا تعلق صرف سلطنت یا سلطنت کے گروہ سے ہو سکتا ہے۔

علیہ قدیم زمانے کے لوگوں نے بھی اس فرق کو سمجھا ہے، ہو غور نویس اپنی لاطینی تصنیف ”قانون جنگ“ میں

اس کے نتائج

(۱)۔ ایجابی جانب اس فرمانروائی کا منشا یہ ہے کہ سلطنت کو اپنی تمام مملکت پر اپنے قوانین کے نفاذ، اپنے احکام کی تعمیل اور اپنے اختیارات عدالتی کے عملدرآمد کی پوری طاقت حاصل ہے۔ اس کی طاقت صرف اشخاص ہی پر نہیں بلکہ زمین و ایشیا پر بھی وسیع ہے مگر یہ طاقت صرف سلطنت سے تعلق رکھتی ہے اور شخصی قانون کی حد سے خارج ہے۔

(۲)۔ سلبی جانب میں سلطنت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہر ایک دوسری سلطنت یا طاقت کو اپنی مملکت کے اندر فرمانروائی کے نفاذ یا اور کسی طرح کی مداخلت سے باز رکھے، اس لئے موجودہ زمانے کی سلطنت اپنی مملکت میں کسی غیر ملکی طاقت کو عدالت یا پولیس کے اختیار کے عمل میں لانے کی اجازت نہیں دیتی۔ کسی ملک کا کلا یا جزا علیحدہ ہو کر رہنا ملکتی فرمانروائی کے اس سیاسی تصور کے منافی ہے، ازمنہ وسطیٰ کے روسا جس طرح اپنے ملک کو ذاتی ملک کی طور پر فروخت کر دیتے، یا ارہن رکھ دیتے یا تقسیم کر دیتے تھے۔ اب ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔

جدید قانون عام اس اصول پر بنی ہوئی ہے کہ سلطنت کی ملک ارضی نہ قابل انفکاک ہے اور نہ قابل تقسیم ہے۔

مستثنیٰ حالتوں میں انفکاک صرف قانون عام کی صورتوں میں اس وقت ممکن ہے جب کوئی قانون اس ضرورت سے وضع کیا جائے، یا بین الاقوامی معاہدات عمل میں آئیں جن میں صلح کے عہد نامے بھی شامل ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کی جلد باب ۳، دفعہ ۴ میں یہ لکھا گیا ہے کہ "بادشاہ کو پورا اقتدار حاصل ہوتا ہے اور مندرجہ اشخاص کو محض حق ملکیت حاصل ہے" اور ڈیو کیو کیسٹ کا قول ہے کہ "تمام ملک سلطنت کی ملک ہے مگر پھر بھی ہر مندرجہ اشخاص اپنی حاصل کردہ جائیداد کو پورا ملک ہے۔"

۱۔ قد است، اس کی مثالیں صرف ان میں ملتی ہیں جہاں مکران کو ملک اور آبادی پر اختیار مطلق حاصل ہوتا تھا۔ اس کی مثالوں کے لئے دیکھو جوہر غریب، ص ۱۲، ص ۱۳۔

۲۔ فرانسیسی نظام سلطنت (۱۷۹۱ء)، دفعہ ۱۱، سلطنت ایک چیز ہے اور تقسیم نہیں ہو سکتی۔ جرانی سلطنتوں کی مثالوں کیلئے دیکھو تھنارے (Zacharia) کی کتاب "جرانی سلطنت اور مشرکت کا قانون" (ج ۱، دفعہ ۸۳)۔

۳۔ ہر کسی نظام سلطنت (۱۷۹۱ء) دفعہ ۲۲، جس ملک کے حدود صرف ایک قانون کے اجراء سے بدل سکتے ہیں۔

ظہری حق کے نتیجے کے طور پر غرور میں یہ مطالبہ مزید کرتا ہے کہ جب ملک کا کوئی حصہ تسلیم کیا جائے تو تمام سلطنت کی منظوری کے ساتھ خاص اس حصہ ملک کے باشندوں کی منظوری بھی حاصل کرنا چاہیے۔ یہ مطالبہ ایک منصفانہ مطالبہ ہے کیونکہ ان کی تمام سیاسی و معاشی ضرورتیں خطر میں آجاتی ہیں اور مجلس وضع قانون جب اتحاد سلطنت کے شکست کرنے پر آمادہ ہو تو اس صورت میں یہ مجلس اس حصہ ملک کی موزوں نمائندہ تسلیم نہیں کی جاسکتی، مگر اگر فرانسوں میں "ضرورت" حقوق ظہری سے زیادہ قوی ثابت ہوگی۔

کسی سلطنت کی فرمازدانی کا دوسری سلطنتوں کے حق میں محدود کر دینا ممکن ہے اور شخصی قانون کی نظر سے یہ غلامی کے مثل ہے۔ مگر اس کی بنا قانون عام پر ہونا چاہیے اور اس کی غرض عام غرض ہونا چاہیے، ہمسائے کو اجازت دی جاسکتی ہے کہ اس کی مملکت کے اندر سے ہو کر کسی فوجی سرک سے گزر جائے یا اس کے ڈاکٹروں کو کام میں لائے یا وہ اپنی بندرگاہوں کو اس کے لئے کھول دے۔ مگر فرمازدانی کی آزادی کو دخلت بوجہ اسے محفوظ رکھنے پر اس سے زیادہ فکر کی ضرورت ہے جس قدر شخصی قانون میں آزادی ملک کی حفاظت کی حاجت ہے، کیونکہ کسی قسم کی مستقل پابندی سلطنت کے اتحاد و یکجہتی اور بیہود عام کی غرض سے اس کے تشظیات کی آزادانہ نشوونما کے لئے ایک مہلک مدد ہے۔

تعلیقات (۱) انقلاب پر فرانسیسی بادشاہوں کا خطاب بجائے شاہ فرانس کے شاہ فرانسیسیان ہو جانا اس سابقہ خیال سے مخالفت کو ظاہر کرتا ہے کہ فرانسیسی ایک موردنی بادشاہی ہے اور اس مدت تک اس سے سیاسی خیال کی ترقی کا اختیار رہا ہے۔

عہدہ - دیکھو ہونو غرور میں کی دوسری جلد فصل ۱۶، دفعہ ۱۰ وغیرہ۔ لیٹا کا آخری قانون ۱۸۳۰ء کے مطابق ہے۔
 مگر کسی مشترکیت کی مملکت کے حقوق فرمازدانی سے برائے خودست رد اور جاننے کے لئے اس میں ملک کی آزادی و یکجہتی کی کمی کی کمی کے لئے جو مشترکیت کی مملکت کے تمام اراکین کی ہونی کا حاصل کرنا ضروری ہے۔
 دیکھو پٹن کی تصنیف "معدبہ قانون اقوام" دفعہ ۲۸۶

عہدہ - شمش "میتز" قانون سلطنت "معدبہ" (۱۸۰۹) "کسی سلطنت کی ملک ارضی میں ایک غیر سلطنت یا بادشاہ کی ذاتی ملکیت کے تابع ہونے سے اس سلطنت کے اقتدار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔"

{ شاہ فرانسیسیاں کا خطاب اولاً ۱۶۹۱ء کے نظام سلطنت میں پیش ہوا اور ۱۸۳۰ء کے فرانسیسی ایوان نے لوئس فلپ کو یہی خطاب دیا تھا مگر لوئس فیروز دہم اور چارلس دہم اس خطاب کو استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اپنے سابقین کے مانند شاہ فرانس تھے مگر ملکی بادشاہی کی اہمیت جب ایک بار مسلم ہو گئی تو پھر اس کا کوئی اثر نہیں کہ خطاب کی کونسی صورت اختیار کی جاتی ہے اسٹال (اپنی تصنیف ”نظریہ سلطنت“ جلد دوم صفحہ ۳۸ میں) جب قومی خطاب کو دیشناہ لکھتا ہے تو وہ حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ رومی اور جسروانی شہنشاہیوں نے اسے ترجیح دی ہے اور ملکی خطاب کے بہ نسبت یہ زیادہ موثر ہے کیونکہ قوم کا درجہ ملک سے بڑا ہوا ہے۔

۳۔ سرحد کی تصحیح، انفکاک کے تحت میں شامل نہیں ہے کیونکہ اس سے محض حدود موجودہ کا تعین ہوتا ہے، لیکن جب کوئی سلطنت درستی حدود کے لئے یورپ کے پورے آباد قطعات کا کرد و سر سے قطعات سے انھیں بدل لے تو اسے محض تصحیح سرحد نہیں کہہ سکتے۔

{ ملکی فرامزدائی کے تصور کے لئے مین کی کتاب قانون قدیم (صفحہ ۱۰۲) دیکھنا چاہئے۔ انگریزی مترجم }

چھٹا باب

ملک کی تقسیم

سلطنت کی ملک ارضی علی العموم اپنی وسیع ہوا کرتی ہے کہ عکرائی کے اغراض کے لئے اس کا تقسیم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس تقسیم کی چار تمیزیں ہوتی ہیں:-

۱) صوبجات۔ دومی شہنشاہی کے صوبجات فی الامسل وہ آزاد سلطنتیں تھیں جو روٹا کی محکوم بنائی گئی تھیں۔ زمانہ حال کے صوبجات بھی اکثر قدیم سلطنتوں کی یادگار ہیں جو نسبتاً ایک بڑی سلطنت میں جذب ہو گئے ہیں مگر بسا اوقات سلطنتیں خود اپنے صوبوں کی بنا ڈالتی ہیں اور جرمانی شہنشاہی کے مانند اکثر یہاں بھی ہوتا ہے کہ صوبجات (Duchies) سے نئے ممالک پیدا ہو جاتے ہیں۔

صوبجات کی مخصوص نوعیت اس کا نسبتاً آزادانہ اختیار ہے، ان کی حکومت عام حکومت کے تابع ہوتی ہے مگر خود اپنے وسیع اختیارات بھی رکھتی ہے۔ مزید براں، نیابتی نظام سلطنت میں بسا اوقات اس میں اپنے معاملات کیلئے مجلس وضع قوانین بھی ہوتی ہے جو (ایک معنی کر) صوبے کی پارلیمنٹ ہوتی ہے۔ موجودہ زمانے کا میلان اتحاد سلطنت کے اندر اس تقسیم کا چابندار نہیں ہے۔ صوبجات کے جداگانہ وضع قانون کے اختیارات، فرانس اسپین اور انگلستان میں منسوخ ہو گئے ہیں اور آسٹریا کے شاہی ممالک (Kronlander) میں اقتصادیات اور تعلیم کی حد تک محدود کر دئے گئے ہیں، لیکن اگرچہ اتحاد تنظیم سلطنت کے لئے مفید ہے مگر ساتھ ہی اس کے (صوبوں کی) آزادی کلیتاً منسوخ کر دینا (جس سے مختلف اضلاع کی مخصوص ضروریات و خصوصیات لازماً نظر انداز ہو جاتی ہیں) قومی زندگی کے سمور

دبار اور اجراء کے لئے مقرر ہے۔ ٹیوٹونی اقوام رومانی اقوام کے بہ نسبت صوبائی آزادی کی ضرورت کو زیادہ شدت سے محسوس کرتی ہیں۔

۲۔ حلقہات، وسیع سیاسی اضلاع پر مشتمل ہوتے ہیں مگر علمدہ ممالک خیال کئے جانے کا انھیں حق نہیں ہوتا۔ قدیم فرانکی اور جرمانی شہنشاہی کے نظام سلطنت میں امارتیں

۲۔ حلقہات

(Duchies) اور ریاستیں (Princedsoms) صوبوں کے بجائے سمجھی جاتی تھیں اور کینٹن (Cantons) حلقہات کے بجائے۔ اس تحت میں انگلستان اور ممالک متحدہ امریکہ کی کوئی جرمانیا کے حلقے (Kreise) (فرانس کے صیغے۔

دوے پارتماں (Departments) اور روسیہ کے حکومتی حلقے یا ضلع (Regierungsbezirke) داخل ہیں۔ یہ تقسیم مقامی یا قبائلی اختلافات

کی بنا پر نہیں قائم کی گئی ہے بلکہ ایک منضبط انتظام عمل کی ضرورت سے قائم کی گئی ہے لیکن پھر بھی ضلع کے تاریخی تعلقات اور اس کی آمدورفت کے فطرتی وسائل کا خیال کرنا پڑتا ہے۔ صوبہات کو ایک تھر کی مختلف عمارتوں سے اور حلقہات کو ایک مکان کی مختلف منزلوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

ان کے انتظام کی بالعموم ایک مرکزی قوت اور ایک اعلیٰ عدالت ہوتی ہے۔ مزید برآں اس زمانے کی سلطنتوں میں یہ میلان بھی پیدا ہو گیا ہے کہ حلقے کی آبادی اپنے خاص اغراض پر توجہ کرے اور ایسے حدود میں عام ضروریات مثلاً سڑکوں، مخزنوں، (میگازینوں)، اشفا خانوں، مدرسوں، محتاج خانوں، نادیب خانوں وغیرہ کا انصرام کرے اس سے حکومت خود اختیاری اور تنظیمات نیابتی کے لئے ایک بار آور موقع پیدا ہو جاتا ہے۔

۳۔ اضلاع بالعموم حلقہات کی تقسیم ثانی ہوتے ہیں اور انھیں تختانی قسم کا نظم نسق اور اختیار عدالتی حاصل ہوتا ہے۔ اپنی جگہ پر انھیں بھی ایسی مشخصہ جماعت سمجھ سکتے ہیں جو اپنی خاص ملکیت اور تنظیمات رکھتی ہیں۔

۳۔ اضلاع

۱۔ ویوین (Vivien) کی تصنیف "مطالعات" (Etnnd. etc) ج ۲ باب ۲۔

۲۔ دیکھو ویوین کی تصنیف محمولہ بالا ج ۲، باب ۳۔ فرانس کے کینٹن کی مشیت ایک کارپوریشن کی سی نہیں ہوتی بلکہ محض عدالتی اور انتخابی اغراض کے لئے سرکاری طور پر طے قرار دیدے جاتے ہیں۔

جرانیا میں یوٹونی جہد کے "تعلقیات" عدالتہائے صوبہ اور تقسیمات، فرانس میں کینٹن کی اور ہر دسیا میں کرائسز کی ہی نوعیت ہے۔

صرف انتخاب کی غرض سے جو حلقے قرار دئے جائیں وہ اس صنف میں داخل نہیں ہوتے کیونکہ وہ محض عارضی ہوتے ہیں اور سلطنت کا عضوی جزو نہیں ہوتے۔ اس قسم کی غیر عضوی تقسیمات پر خیال رجوع کرنے کی ضرورت بہت کم ہوتی ہے۔

شہر اور پیر و نجات کے کمیون۔ یہ کمیون، سلطنت کی سادہ ترین تقسیم ہیں مگر لجاہت اہم ہیں۔ کمیون ضلع کے لئے وہی حکم رکھتا ہے جو سیاسی طور پر منضبط قوم اپنے ملک کیلئے رکھتی ہے۔ اپنی عام زندگی سے وہ اس میں جان ڈال دیتی ہے، گو کہ یز زندگی سیاسی زندگی نہیں ہوتی بلکہ عام معاشرتی اور اقتصادی اغراض پر مشتمل ہوتی ہے۔

بڑے بڑے شہر، ضلع کے مثل اور بڑے بڑے دار الحکومت (جیسے برلن) ایک حلقے بلکہ صوبہ کے مانند ہوتے ہیں۔

کسی ملک کی سیاسی تقسیمات کا رد و بدل، ایک قانونی معاملہ ہے۔ ان تمام مراحل میں سلطنت کو اپنے عام اغراض اور اپنی تنظیم کی ہم رنگی پر نظر رکھنا پڑتی ہے مگر اعلیٰ مراحل میں اغراض عامہ کا اثر زیادہ ہوتا ہے اور سلطنت کو تقسیمات کے تعین میں زیادہ آزادی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے کمیون موجودہ مشخصات سے فطرتاً اس قدر گہرا تعلق رکھتے ہیں کہ ان کی خواہشوں پر لحاظ کرنا ضروری ہوتا ہے ان استقامات میں سلطنت کو جن خاص خیالات کا پابند ہونا پڑتا ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

(الف) تقسیم کی سیاسی غرض؛

(ب) فطری اثرات جیسے دریا، وادی وغیرہ کا تعلق؛

(ج) باشندوں کی تاریخ؛

(د) تجارتی تعلقات۔

تعداد اور رقبے کا حسابی لحاظ ان خیالات کے تحت میں آتا ہے۔

ساتواں باب

ملک شخصی سے سلطنت کا تعلق

ملک شخصی یعنی دولت پر انسان کا اختیار اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود انسان۔ انیس
انسان جب اپنی غذا کے لئے پہل توڑتے یا کوئی غار اپنی سکونت کے لئے پسند کرتے بلکہ جب
وہ پیتا یا چمکتے سے اپنے جسم دھانکتے تھے تو وہ اپنے ان افعال سے ملک پیدا کر رہے تھے
ملک اصلاً سلطنت کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ اپنی نہایت قدیم، غیر مکمل اور غیر
معموٰی شکل میں یہ انفرادی زندگی کا فعل ہے۔ گویا یہ افراد کے وجود خارجی کی ایک طرح
کی وسعت ہے۔ انسان ان چیزوں پر قبضہ کرتا ہے جو اس کے آس پاس واقع ہوتی
اور اس کی طاقت کے حد میں آجاتی ہیں وہ انہیں اپنے خاص مصرف و خدمت میں لاتا
یعنی ان سے منتفع ہوتا ہے۔ جب اس کے ساتھ یہ احساس شامل ہو جاتا ہے کہ اسے
ان چیزوں کو قبضے میں رکھنے کا حق حاصل ہے تو ملک کا خیال عمل ہو جاتا ہے۔
خانہ بدوش جنہیں کسی قسم کا مفید سیاسی ربط نہیں ہوتا وہ بھی اپنے لباس، اپنے ہتھیار اپنے
گلے اور اپنے سامان کی ملک رکھتے ہیں رابنسن کرومبوک نے اپنے دیران جزیرے
میں اپنی ملکیت کو ترقی دی تھی۔

ملک کی
تیار کی

اشتراکیت

اشتراکیت جو ملک شخصی کے قرین انصاف ہونے سے انکار کرتی اور اسے
فراقی قرار دیتی ہے علوہ انسانی فطرت سے جیسا کچھ کہ اسے خدا نے پیدا کیا ہے جنگ

علوہ بدوہن کا قول ہے "جسے لوگ حق مالکان کہتے ہیں وہ (حقیقت میں) قزاقی ہے"

کرتی ہے۔ ”سمندر کی مچھلیاں“ ہوا کے پرندے اور زمین کے مویشی اور جو کچھ اس پر ہے سب پر ان کو قدرت ہو“ (کتاب پیدائش باب اول آیت ۲۶) یہ طریق بنی نوع انسان کی تمام تاریخ کے بھی خلاف ہے جو تمام اقوام اور تمام اوقات میں ایک کو تسلیم کرتی رہی اور اب بھی اس کی ترقی میں مشغول ہے۔

اشتراکی جس طرح ملکیت کا بطلان تجویز کرتے ہیں وہ شخصی آزادی کی تباہی اور تمدن و خاندان کی بربادی کے مرادف ہے۔ ایک لفظ میں یہ کہ وہ ایسی وحشت ہے جو وحشی ترین معاشرت میں بھی نہیں پائی جاتی ہے علیہ

اجتماعیوں کا اصول نظام زیادہ معتدل اور انسانیت کو لئے ہوئے ہے مگر وہ بھی ایسا ہی ناممکن عمل اور اشتراکیت سے بھی زیادہ متناقض ہے ہم فرد و بس (Frobel) کو اس خیال کا ناسخہ سمجھ سکتے ہیں اس کے نزدیک ملک ایک جاگیر ہے جو سوسائٹی کی جانب سے قابض کے اختیار میں ہوتی ہے، اور انفرادی حق عام مرضی کا ایک نتیجہ ہے جسے ان لوگوں کی ایک تعداد نے تسلیم کیا ہے جو فرمانروایانہ جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں انسان کی انفرادی فطرت و آزادی کے لئے یہ عقیدہ بھی اشتراکیت سے کچھ کم غلط نہیں ہے۔ ہر چند کہ یہ اصول محمول اور وقتی قبضے کو تسلیم کرتا ہے مگر اس کا منشاء یہ ہے کہ آزادانہ ملک کو از منہ و سطلے کے جاگیردارانہ طریق کی ایک مبالغہ آمیز مماثلت سے تبدیل کر دے یعنی تمدن کے فرد نے طبقت کی طرف پلٹ جائے، کیونکہ اس خیال کی اس سے زیادہ کچھ حقیقت نہیں ہے کہ یہ وہی غلامی کا اصول ہے جسے تاریخ کے تاریک ترین زمانوں کے خود مختار حکمرانوں کو مکارتانہ تلقین نے سکھایا تھا اور جس کے چہرے کو اب اجتماعیت کے خوش آئند فقروں نے اپنے پردے میں چھپا کر دلفریب بنا دیا ہے۔

ملک شخصی پر سلطنت کو اختیار مطلق ہرگز حاصل نہیں ہے اور اس حیثیت سے سلطنت ملک کی محافظہ ہے۔

علہ۔ دیکھو تیسری کتاب ”ملکیت“ جلد ۲ نظمہ ۱ اشتراکیت و اجتماعیت کی تنقید اس نے بہت خوب کی ہے مگر تصور ملکیت کے متعلق فلسفیانہ ماخذ کے قرار دینے میں وہ کامیاب نہیں ہوا ہے۔
علہ فرد و بس کی تصنیف ”اجتماعی سیاسیات“ (Sociale Politik) ج ۲ ص ۳۹۲ د ۴۰۰

وہ قانون عامہ کے حدود سے واقفیتاً خارج ہے۔ سلطنت نہ اسے پیدا کرتی اور نہ اسے برقرار رکھتی ہے اور اس لئے اسے لے بھی نہیں سکتی ہے اور جس طرح تمام انفرادی حقوق کی حفاظت کرتی ہے، صرف اسی طرح اس کی بھی حفاظت کرتی ہے اور اس پر اس کو وہی اقتدار حاصل ہے جو اپنے باشندوں پر حاصل ہے پس ملک شخصی کے ساتھ سلطنت کے تعلق کے خاص خاص اصول حسب ذیل ہیں۔

(۱) سلطنت ملکیت کی حفاظت اور آزادی کی ضمانت ہوتی ہے علیہ

(۲) ملک کے علمبردار کر دینے کے لئے سلطنت کو علی الاطلاق اختیار حاصل نہیں ہوتا۔

(۳) سلطنت کو حق حاصل ہے کہ اغراض عامہ کے لئے ملکیت پر محصول عائد کرے۔

ملکیت شخصی سے سلطنت کے تعلقات انہیں امور پر ختم نہیں ہو جاتے بلکہ چند بنیادی کے ساتھ اس کے حقوق ملک شخصی کی آزادی پر حاوی ہوتے ہیں۔

بعض اشیاء فطراناً اسی ہیں کہ ملک شخصی ہونے کے لئے ناموزوں ہیں اور عامۃ الناس کے استعمال میں آتی ہیں اس قسم کی جمہوری چیزیں ندیاں اور سمندر، سواحل جہاں مد و جزر کی آفتاب رہتی ہے اور بندرگاہیں وغیرہ ہیں علیہ

ملک شخصی کے حدود

اس تحت میں وہ برف اور یخ سے ڈھکی ہوئی بلند پہاڑی زمینیں اور میدان بھی داخل ہیں جنہیں کچھ پیدا نہیں ہوتا ناقابل گزر غار اور میدان وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں

علیہ۔ یہ اصول بہت سے ملکوں کے نظام سلطنت میں پایا جاتا ہے۔ ہنری سوم نے جو منشور اعظم ۱۲۲۵ء میں دوبارہ جاری کیا اس میں بھی اس مضمون کے کئی جملے تھے۔ فرانس میں نظام جمہوریت ۱۷۹۱ء کے فقرہ ۱۱ اور منشور ۱۸۱۵ء کے فقرہ ۱۹ میں یہ جملہ موجود ہے، "ہر ملک غیر قابل دست اندازی ہے" پروس میں نظام سلطنت ۱۸۵۰ء فقرہ ۹ "ملک غیر قابل دست اندازی ہے"

علیہ۔ اریکاؤس (Dig I Tit 8.) میں کہتا ہے "ندیاں تقریباً سب کی سب اور بندرگاہیں عام (یعنی جمہوری چیزیں) ہیں، اپینائوس (Dig XLIII Tit 12.) میں کہتا ہے "کالیوس کی تعریف کے مطابق وہ ندی عام ہے جو ہمیشہ بہتی ہو" بنویوں کے ضابطے کی دفعہ ۳۲۵ کی رو سے عام (یا جمہوری) ندی کا مفہوم زیادہ محدود ہے، "سرکس" اس سے اور گلیاں جو سلطنت کی گزرنی میں ہیں ان کے اندیاں جن میں جہاز رانی یا کشتی رانی ہو سکتی ہے ان کے ساتھ یا سواحل انہ زمینیں جن پر سے سمندر کا پانی بہتا گیا ہو، بندر، بندرگاہیں، گھاٹ اور عموماً فرانس میں زمین کے وہ سب حصے جو کسی شخصی ملکیت میں نہیں ہیں۔ ارضی عامۃ میں شامل سمجھے جاتے ہیں نیز دیگر

مگر برف کے پہاڑوں کی برف ایک تجارتی شے ہو گئی ہے اور برقیہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر پھان خانے (ہوٹل) تعمیر ہو گئے ہیں۔ ان صورتوں میں یہ ملکیت سلطنت سے حاصل ہوتی ہے۔ ان فطری انعامات کے پہلو بہ پہلو متمدن سلطنت کے وہ کام ہیں جو عام اغراض کے لئے وقف ہیں، خاص کر عام سڑکیں اور نہریں، عام میدان وغیرہ یہ سب جمہور کی ملک ہیں اور جب تک اس حالت میں رہیں سلطنت بھی شخصی ملک کے طور پر ان پر قبضہ نہیں کر سکتی، مگر ان کی نگرانی کو بعض وقت ملک سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ ان کے سوا ایسی بھی چیزیں ہیں کہ وہ اگرچہ فطرتاً قابل ہیں کہ ملک شخصی ہو سکیں مگر وہ سلطنت کے لئے محفوظ ہیں کیونکہ یہ عوامتہ سے ان کا گہرا تعلق ہوتا ہے یا یہ کہ ان کے انتظام کے لئے ایسے وسائل درکار ہوتے ہیں کہ شخصی مالک بالعموم ان وسائل پر قابو نہیں پاسکتے۔ اس صنف میں معاون ملک کی کانیں اور دوسرے اسی طرح کے اور اجارات شامل ہیں۔

۳۔ ملک عامہ کے محدود مفہوم سے علیحدہ ایسی چیزیں بھی ہیں جو بالتحقیق ضروریات عامہ کے لئے علیحدہ کر دی گئی ہیں، خاص کر عمارات عامہ، سرکاری عمارتوں یا محلوں کی اقامت گاہیں، قلعے، سلاح خانے (دارالمناعت) اور بارکیں (سپاہیوں کی قیام گاہیں) ان چیزوں کو صحیح طور پر سلطنت کی ملک کہہ سکتے ہیں مگر خدمات عامہ میں استعمال ہونے کے باعث وہ شخصی ملک اور شخصی کاروبار کی حد سے خارج ہو جاتی ہیں۔ ان کا سلطنت کی نگرانی میں رہنا ضروری ہے تاکہ وہ عام اغراض کے کام آسکیں۔

۴۔ اگلے زمانے میں سلطنت اپنی مفتوحہ زمین کو اپنے جنگ آوروں اور قبائل میں تقسیم کر دیتی تھی اس لئے اولاً وابتداءً جائیداد زیادہ تر سلطنت ہی سے حاصل کی جاتی تھی بہت سی سلطنتوں میں اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ جب کئی خاندانوں کے ترک وطن کرنے یا موت کے باعث زمین دباؤ ہو جانے سے زمین پر اس کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے تو زمین سلطنت کے پاس واپس ہو جاتی ہے، ابھی تک انگریزی اور امریکی قانون اسی راے پر قائم ہے کہ جدید مستعمرات کی زمین سلطنت کی ملک ہے اور آبادکاروں کے لئے لازم ہے کہ اسے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) "سکسونی آئینہ" ج ۲ ص ۲۸، دفعہ ۴ "پیرس کی قانون" ج ۲ ص ۱۱۵ دفعہ

۱۳۸ و ۱۴۱ اور آسٹریائی ضابطہ دفعہ ۴۰۰۔

سلطنت سے خرید کریں، جو زمین ہنوز ملک شخصی میں نہیں آئی ہے یا اس کی یہ حیثیت ختم ہوگئی ہے اس کے متعلق یہ عملدرآمد ملکی فرمانروائی کے اصول کے مطابق (جس سے شخصی ملکیت کا انضباط ہوتا اور ملک شخصی کی عدم موجودگی میں اسے خود پورا اختیار حاصل ہوتا ہے) بالکل بجا ہے لا وارث جائیداد بھی اسی طور سے سلطنت کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر ہر کس و ناکس کے قابض ہو جانے سے سخت ابتری پیدا ہو جاتی ہے۔

رومی قانون نے زیادہ صحیح طریقہ اختیار کیا تھا کہ لا وارث قسے (Res nullius) پر سلطنت کو دیگر اشخاص سے زیادہ حق حاصل نہیں تھا۔ ملکی اور غیر ملکی دونوں اس پر قبضہ کر سکتے تھے اور اسی قبضے سے وہ اس کے مالک ہو جاتے تھے۔ یہ خلاف اس کے ازمنہ وسطے کی جاگیر کی شاہی شخصی، ان اشیاء پر بھی ملک سلطنت کے وسیع کرنے کے جانب مائل تھی، جن پر شخصی قانون کا اطلاق ہوتا تھا اور یہ خیال بہت سی جدید سلطنتوں کے قانون میں قائم رہ گیا ہے۔

الف۔ پر کسی قانون کے مطابق بعض ایسے املاک پر جن کا کوئی دعویدار نہ ہو یا جو متروک پڑے ہوں، خاص کر زمین یا مویشی وغیرہ کے قسم سے، سلطنت کو قبضے کا مقدم حق حاصل ہے، مگر ان چیزوں کے علاوہ جو ایسی چیزیں ہوں کہ ان کا دعویدار کوئی نہواں کے متعلق پر کسی قانون بھی آزادانہ قبضے کا حق تسلیم کرتا ہے مثلاً

ع۔ دیکھو (ایتالی مصنف) پیپیر انتونی کی کتاب ”نیپیز کا قانون اساسی“ ج ۱، ص ۳۰۶ اور اس کے آگے، ”سلطنت کی ملکیت“ کا بیان۔

ع۔ ہسٹینیاؤس کے روابط ۱، ۱۲، ص ۱۳۔ ”جو چیزیں ملک (لا وارث) ہے اس پر جو قبضہ کرے وہی اس ملک ہے دیکھو گروس ج ۲ دفعہ ۶۶۔ مکیو برنے ”جرمانی شہریت کے قانون عامہ“ دفعہ ۳۴ میں یہ نظر یہ پیش کیا ہے کہ لا وارث چیز کو ایک غیر ملکی سلطنت کے اندر اپنے قبضے میں نہیں لاسکتا مگر جب کوئی غیر ملکی شخص ایک چڑیا کو جو اور اس ملک میں آگئی ہو پکڑے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے بھی دیا ہی حق حاصل نہ ہو جیسا ایسی حالت میں ایک ملکی شخص کو ہو گا۔

ع۔ پردسیا کا ”ملکی قانون“ ج ۲، ص ۱۱ دفعہ اوغیرہ۔

(ب) انگریزی قانون بیشتر غیر دعویدار ملک کا مالک بادشاہ کو قرار دیتا ہے مگر بعض قابل انتقال اشیاء پر قبضہ کرنے کا آزادانہ حق وہ اب بھی تسلیم کرتا ہے۔
(ج) فرانسیسی قانون انگریزی قانون کے مثل ہے وہ اپنا عام اصول یہ بیان کرتا ہے کہ "جن چیزوں کا کوئی مالک نہیں وہ سلطنت کی ملک ہیں"۔

(د) آسٹری قانون نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ جن چیزوں کا کوئی مالک نہ ہو ان پر آزادانہ تصرف کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ ملک اور رعایا پر سلطنت کی فرمانروائی اور اعضاء سلطنت کے مسترد مستقل بقاع کے تحفظ کی ذمہ داری کی وجہ سے جو قیود پیدا ہوتے ہیں ان میں ملک ذاتی پر اجراءے محصول اور انتظام کو تواری شامل ہیں۔

۶۔ حق بیدخلی سے پیدا شدہ قیود۔ بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ رومی، حق بیدخلی کو تسلیم نہیں کرتے تھے بلکہ جب نفع عامہ کے لئے بھی ترک ملکیت کی ضرورت ہوتی تھی تو بھی آزادی ملکیت غیر مشروط طور پر محفوظ رہتی تھی۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ وہ کسی عام حق ترک کو تسلیم نہیں کرتے تھے لیکن اگر انفرادی حالتوں میں سلطنت کو ترک ملکیت کے نافذ کرنے کا اختیار نہیں حاصل تھا، تو پھر ان کی طویل نہیں، ان کی مستقیم فوجی سرٹکس، ان کے پانی کے خزانے اور ان کے قلعے آخر کیونکر وجود میں آسکے۔ غالباً انھوں نے وہی کیا ہوگا جو اس وقت انگریز کرتے ہیں یعنی خاص خاص حالتوں کے لئے مخصوص قانون منظور ہوتے رہے ہوں گے۔

۷۔ ملک استون (ج ۱ ص ۸) برلین کا ایک قول نقل کرتا ہے: "اسی لادارت چیزیں جن کا شمار اہلک میں ہو اور نظری قانون کے مطابق اس شخص کے ماتحت ہو گئی ہوں جس نے انہیں سب سے پہلے پایا ہو تو وہ اس سے قبل ہی قانون اقوام کی رد سے بادشاہ کی ملک ہو چکی ہوں گی۔"

۸۔ ملک استون ج ۲ ص ۲۶۱

۹۔ فرنیسی ضابطہ دیوانی فقرہ ۱۱۳: "جس مال کا کوئی مالک نہ ہو وہ سلطنت کی ملک ہے" متقابلہ کر و فقرہ

۱۰۔ ۵۳۹، ۴۲۳، ۶۸

۱۱۔ دفعہ ۳۸۱ وغیرہ

انگلستان میں اگر عام مقاصد کے لئے مالکوں کو ان کی ملکیتوں کے ترک کرنے پر مجبور کرنا ہوتا ہے تو اس کے لئے پارلیمنٹ کے خاص قانون کی ضرورت ہوتی ہے۔
براعظم یورپ میں حق بیدخلی عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے، اور اس کے قواعد معین ہو گئے ہیں، بہت سے جدید نظامہائے سلطنت میں یہ اصول داخل ہے کہ پورا معاوضہ ادا کرنے کی صورت میں سلطنت کو یہ حق حاصل ہے کہ بہبود عامہ کے اغراض کے لئے ترک ملک کو جبراً اعلیٰ میں لاسکے۔

معاوضہ

اس خیال سے کہ جہاں افراد کے حقوق شخصی اور عوام کے حقوق عامہ کا تضادم ہو جائے وہاں موخر الذکر کو غلبہ حاصل ہونا چاہئے، یہ اصول بالکل سچا ہے مگر اسی حد تک جس قدر مقتضائے حالات ہو متضاد اغراض میں آشتی کی صورت اس طرح پیدا کی گئی ہے کہ ایک طرف سے ترک حق کیا جائے دوسرے طرف سے معاوضہ دیا جائے۔

علاقہ مقابلہ کروئیک اسٹونج (ص ۱۱) اور متعدد نئے قوانین نہروں اور ریلوں کے متعلق ممالک کے لئے دیکھو تجدید ترین ضابطہ بیدخلی، "مطبوعہ نیورن برگ ۱۸۳۶ء" [خصوصاً دیکھو گریون ہول کا "قانون بیدخلی" ص ۲۶ اور آگے۔]

علاقہ بریٹیا کا ملکی قانون ۱۸۵۶ء (۳) دفعہ ۲۔ پروس کی ملکی قانون (۱۱) دفعہ ۴، [تہمید، دفعہ ۵، ص ۴۶] مہمبیون کا ضابطہ، فقرہ ۴۵: "کوئی شخص اپنی ملک سے دست بردار ہونے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا بشرطیکہ سوومندی عامہ کی غرض سے ایسا نہ کیا جائے اور پہلے سے ایک واجب معاوضے کے ذریعے اس کے نقصان کی تلافی نہ کر دی گئی ہو" آسٹریائی ضابطہ (دفعہ ۳۶۵)، اگر نفع عام کیلئے ضرورت ہو تو ہر کن سلطنت کو اپنی ملکیت (الاک) واجب معاوضے پر دے دینا چاہئے، "فرانس کے نظام سلطنت ۱۸۳۸ء" فقرہ ۱۱ منشور ۱۸۱۲ء فقرہ ۹ اور ضابطہ کا، نیز، "جمہوریت کے نظام ۱۸۳۱ء" فقرہ ۱۱ اور ایتالیا کے نظام ۱۸۴۸ء فقرہ ۲۹ اور آسٹریا کے قانون اساسی ۲۱ دسمبر ۱۸۶۷ء، فقرہ ۵ کا منشا بھی یہی ہے۔ پروس کی نظام حکومت ۱۸۵۵ء فقرہ ۴ ملکیت ناقابل تنقیص ہے اور بجز بہبود عامہ کی بنا پر حسب قانون پیشگی معاوضہ ادا کر کے یا شدید ضرورت کی صورت میں کم سے کم اس قدر معاوضہ دے کہ جتنا بحالات موجودہ تخمینہ کیا جاسکے، اور کسی صورت میں نہ مالک اس سے بیدخل کیا جاسکتا ہے اور نہ اس پر کسی طرح کی قید عاید کی جاسکتی ہے۔

یہ سوال کہ کسی خاص حالت میں اغراض عامہ کے لئے بید قفل کی ضرورت ہے یا نہیں اس کا تعلق قانون عامہ سے ہے اور اس لئے عدالت دیوانی سے اس کا فیصلہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ اس کا تصفیہ خاص ارکان حکومت کا کام ہے، خواہ وہ وضع قانون کے ذریعے سے ایسا کریں جیسا انگلستان اور ممالک متحدہ امریکہ میں ہوتا ہے یا خود عمال سلطنت اس کا فیصلہ کر دیں جیسا جرمانیا میں دستور ہے یا عدالتوں نے انتظامی کے ذریعے سے ایسا کیا جائے۔ آخر الذکر طریقہ زیادہ قرین انصاف ہے کیونکہ یہ کام حکومت کا ہے کہ وہ ہر ایک صورت خاص میں یہ طے کرے کہ نفع عام کے لئے کیا درکار ہے اور مجوزہ ذرائع کے اندازہ کرنے کے لئے سب سے زیادہ وہی موزوں ہے مگر طریق کار دیوانی ایسا ہونا چاہئے کہ مطلق النان حرم و ہوس کو شخصی حقوق میں مداخلت تہیجا کا موقع نہ ملے ترک ملک پر مجبور کرنے کا حق صرف سلطنت سے یا مختصر حلقوں میں کیوں سے تعلق رکھتا ہے مفروضہ اشخاص سے کسی صورت میں اس کا تعلق نہیں ہو سکتا، مگر سلطنت افراد یا جماعتوں کو خاص کاموں کے لئے ترک ملک کے مطالبے کا حق دیکھتی ہے۔ انگلستان اور امریکہ میں ریلوے کمپنیوں کو اکثر یہ اختیارات دئے جاتے ہیں۔

بہت سی مجالس وضع قوانین اس حق کو جائیداد منقولہ اور بعض خاص نامزد اشیاء تک محدود رکھتی ہیں، مگر یہی اصول بالکل اسی طرح جائیداد غیر منقولہ (یعنی سامان وغیرہ) اور اغراض عامہ پر جوئے انکشافات اور ترقی تمدن سے پیدا ہوں عامہ ہوتا ہے۔

دوسری جانب تشیخص معاوضہ کلیتہً شخصی قانون کا مسئلہ ہے اور اس کا تصفیہ بھی اگر باہمی معاملے کے ذریعے سے نہ ہو گیا ہو تو عدالت دیوانی سے ہونا چاہئے سلطنت کا بہر حال یہ فرض ہے کہ وہ پورا معاوضہ ادا کرے یعنی بعض معمولی قیمت نہ دے بلکہ اتنی بڑھا کر قیمت دے کہ مالک کے نہ صرف بلا واسطہ بلکہ بالواسطہ مفاد کا بھی کافی عوض

تشخیص معاوضہ

ملہ۔ بوئر یا قانون مجسمہ یہ ۱۸۳۷ء۔ دیکھو تراش رگی تحریر جہی بید قفل پر (رسالہ قانون جرمانی ج ۱۲ حصہ ۱) میں [بید قفل تحریریں اس بحث پر یہ ہیں گریون ہوت کات قانون بید قفل ۱۸۴۷ء۔ وہ تحریریں جن کا حوالہ فن ہولش درف کی قانونی قاموس ج ۱ ص ۴۷، وغیرہ میں دیا گیا ہے۔]

ہو سکے بخلاف اس کے سلطنت کے لئے یہ بات ضروری نہیں ہے کہ وہ کسی ایسی قدرت کا معاوضہ دے جس کا وجود حقیقت میں نہیں ہے بلکہ جسے مالک نے محض زعم و فرض کر لیا ہے۔ بعض جگہ کے قوانین اس بالواسطہ منفعت کو جو اس تغیر سے پیدا ہو جائے مالک کے بالواسطہ نقصان کے مقابل میں قرار دیتے ہیں۔ مگر بعض بعض جگہوں کے قانون اس پر لحاظ کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ طریقہ اول جس طرح پرکہ زوریچ (Zurich) کے قانون نے اسے محدود کر دیا ہے، زیادہ قرن انصاف ہے کیونکہ نفع و نقصان کے حقیقی تعلقات سے وہ زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

[تعلیق۔ اس سارے مسئلے پر دل کی "علم اقتصاد" کتاب دوم باب یکم و دوم دیکھا جائے نیز لائپزیگ کی اجتماعیت عصریہ (Le Socialisme Contemporain) اور رے کی بھی اجتماعیت عصریہ (Contemporary Socialism) دیکھنی چاہئے۔ انگریزی ترجمہ۔]

۱۸۳۵ء۔ فرانسیسی قانون ۱۸۳۵ء فقرہ ۵۱۔ زوریچ کا قانون ۱۸۳۵ء دفعہ ۲، ملکیت کا حصہ مالک کے ہاتھ میں باقی رہ جائے اس کے نقصان بعیدہ کا اندازہ کرنے کے لئے اس نفع کو اس کے مقابل قرار دینا چاہئے جو اسے حاصل ہوتا ہو مثلاً کسی باغ کے اندر سے اگر سڑک نکلے تو جو حصہ بیچ رہے گا وہ باغ کی حیثیت سے کم قیمت ہو جائے گا مگر عمارتی زمین کی حیثیت سے اس کی قیمت بڑھ جائے گی۔ سلطنت کے لئے خلاف انصاف ہے کہ وہ نقصان اول کا معاوضہ دے۔

۱۸۳۵ء۔ بوبیر یا کا قانون ۱۸۳۵ء فقرہ ۶۔

پہلو کا مقالہ

سلطنت کا عروج اور زوال

پہلا باب
تمہید

عروج سلطنت
کی دو نوعیتیں
تاریخی اور خیالی

عروج سلطنت کے سوال پر دو مختلف نظروں سے بحث ہو سکتی ہے۔ ہمارا منشا کیا تو یہ ہو گا کہ واقعی سلطنتوں نے جس طرح عروج حاصل کیا ہے ان کے شرائط و حالات کی جانچ کریں یا یہ کہ اس لابی سبب کو معلوم کریں جس پر تمام سلطنتوں کی بنیاد قائم ہے یعنی یہ کہ قانوناً و انصافاً سلطنت کی بنیاد کیا ہے۔ پہلے سوال کا جواب تاریخ کو دینا چاہئے اور دوسرے کا جواب تخیل یا فکر کو۔ تاریخ جن کثیر واقعات پر بحث کرتی ہے ان کے لحاظ سے وہ ان مختلف شکلوں میں امتیاز کرتی ہے جن سے سلطنتیں پیدا ہوتی ہیں، تخیل سلطنت کے توحید خیال کو لئے ہوئے شروع ہوتا ہے اور اس لئے وہ توحید بنا کا بھی خواستگار ہوتا ہے۔

ہمیں اول تاریخ کی طرف رجوع کرنا چاہئے اور جتنک کہ ہمیں اقوام کے تجربے کا حال نہ معلوم ہو جائے اس وقت تک ہمیں تخیل بحث میں نہ بڑھنا چاہئے۔

ہمارا تاریخی علم جس زمانے تک پہنچتا ہے اس سے بہت پہلے ابتدائی سلطنتوں کا قیام ہو چکا تھا۔ تاریخ کا احساس اس وقت تک نہیں ہوا تھا جب تک کہ زمین پر بہت سی سلطنتیں قائم نہیں ہو چکیں۔ یہودیوں کی قدیم مقدس کتابوں میں بھی جن سے ہمیں سلطنت یہودی کی آفرینش اول کا حال معلوم ہوتا ہے، مصری سلطنتوں کا مقدم وجود مان لیا گیا ہے

مگر یہ نہیں بنایا گیا ہے کہ یہ سلطنتیں پیدا کس زمانے میں ہوئی تھیں، شاید ہندوستان کی سلطنت نے مصری سلطنت کیلئے نمونے کا کام دیا ہو گا۔ مگر ہندوستانیوں کی مقدس تحریریں بھی اس معاملہ پر کوئی روشنی نہیں ڈالتیں اس زمانے کے بعد سے تاریخ نے بہت سی سلطنتوں کا آغاز و انجام دیکھا ہے اور اس لئے ان کے عروج و زوال کے متعلق ہمیں محض قیاس و تخمین کی نسبت تاریخ کے ذریعے سے زیادہ معلومات حاصل ہیں۔ تمام قدیم یورپی سلطنتیں صدیاں گزر گئیں کہ قضا ہو چکی ہیں اور تقریباً تمام قدیم ایشیائی سلطنتوں کا بھی یہی حال ہو چکا ہے حال کی سلطنتوں میں بیشتر ایسی ہیں جو اس زمانے میں قائم ہوئی ہیں جیسا کہ علم تاریخ کو حاصل ہے ان میں سے اکثر ابھی بالکل نو عمر ہیں۔ اگرچہ تمام روحانی اور جسمانی تخلیق کے مانند ان سلطنتوں کی قوت تخلیق بھی ایک خدائی راز کی طرح پوشیدہ ہے مگر جو حالات و اثرات ان سلطنتوں کے وجود میں آنے کے باعث ہوئے ہیں وہ ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

لیکن بہر نوع سلطنت کے عروج کا طریقہ محض عظیم ذہنی و تاریخی چرچہ ہی کا مظہر عجیب نہیں ہے بلکہ سلطنت کی تمام زندگی میں اس کا اثر برابر جاری رہتا ہے اور ایک بڑی حد تک دوسری سلطنتوں کے ساتھ اس کے تعلقات کا یقین بھی اسی سے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے قانون عامہ کے مطالعے کے لئے سلطنتوں کی مختلف النوع آفرینش پر غور کرنا اس سے زیادہ اہم ہے جس قدر کہ شخصی قانون کے لئے حصول ملکیت کی مختلف صورتوں کی جانچ کرنا اہم ہے مگر اس زمانے کے لوگوں نے سابق الذکر تحقیقات سے بالکل ہی غفلت اختیار کر رکھی ہے حالانکہ موخر الذکر پر وہ بہت ہی توجہ کے ساتھ غور و فکر کرتے ہیں۔ ہم اس میں تین مختلف گروہوں کو تمیز کر سکتے ہیں۔

۱۔ اولین تخمین سلطنت، یعنی کسی قوم و ملک میں سلطنت کی بنا اس طرح پڑے کہ وہ کسی سابق سلطنت کی قائم مقام نہ ہو۔

عروج سلطنت
کی تین تاریخی
منظمتیں۔

۲۔ فرانسیسی مصنف دی ٹوک ول کی تعریف جمہوریت امریکہ میں دیکھو انگریزی ترجمہ (Democracy in America) مترجم (Reene) حصہ اول باب دوم "تمام قوموں میں ان کی تین اول کے کچھ نہ کچھ نشانات پائے جاتے ہیں اور جو حالات بوقت آفرینش ان کے ساتھ تھے اور جنہیں ان کے عروج میں حصہ ملا ہے وہ ان کی مہمی کے تمام اخیر زمانے پر سوثر جوتے ہیں"

۲۔ اشکالِ ثانوی، یعنی سلطنت اپنی اندرونی حیثیت سے کسی ایک قوم کے ذریعے سے پیدا ہو مگر پھر بھی اس کا انحصار ایسی سلطنتوں پر ہو جو پہلے سے قائم ہوں اور اب یا تو باہم ملکر ایک ہو جائیں یا کئی مختلف سلطنتوں میں منقسم ہو جائیں۔

۳۔ تحریری کوین سلطنت۔ یعنی سلطنت کو تحریک و ہدایت خود اندرون سلطنت سے نہ ہو بلکہ بیرون سلطنت سے ہو۔

یہاں ہم صرف نئی سلطنتوں کے بننے کا ذکر کر رہے ہیں، اسے محض نظامِ سلطنت کے تغیر میں غلط ملط نہ کر دینا چاہئے، یودین نے اس فرق پر بہت صحیح طور پر توجہ دلائی ہے، (وہ اس دوسری صورت کو "بدلی" کہتا ہے) قدیم رومی شاہی کے جمہوریت میں تبدیل ہو جانے سے کوئی نئی سلطنت نہیں پیدا ہوئی اور اسی طرح دوبارہ جمہوریت کے شکست ہو جانے اور شہنشاہی کے قائم ہو جانے سے بھی کوئی نئی سلطنت وجود میں نہیں آئی حکومت کی صورت کے تغیرات سے ایک ہی سلطنت کی زندگی کے مختلف زمانے ظاہر ہوتے ہیں، اس سے مختلف سلطنتوں کا آغاز نہیں ہوتا۔

دوسرا باب

تاریخی تنکوین کی صورتیں

(۱) تنکوین اولین کی صورتیں

ایک بالکل
نئی سلطنت
کی تنکوین

جن متعدد طریقوں سے کوئی سلطنت پیدا ہو سکتی ہے ان میں سب سے زیادہ اصلی طریقہ روم کی بنیاد کے افسانے سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہاں ہر چیز نئی ہے۔ بہت سی مختلف نسلوں کے اجزائے نکل کر لوگ عام سرداروں کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور یہ سب متحد ہو کر ایک رومی قوم بن جاتے ہیں۔ غیر مرزوعہ وغیرہ مستاعویہ اراضی پر قبضہ کیا جاتا ہے اور یہی زمین اس ابد مدت شہر کی بنیاد ہو جاتی ہے۔ اس افسانے سے ہمیں ایک بالکل ہی نئی تنکوین کا تصور حاصل ہوتا ہے ایک انبوہ کا منتظم ہو کر ایک قوم کی شکل اختیار کر لینا ملک ارضی کے حصول سے قبل نہیں ہوتا بلکہ اول ہی سے ان کا تعلق شہر کے ساتھ قائم ہو چکا ہے۔ دونوں اجزاء متفق ہو جاتے ہیں اور دیوتاؤں کی مبارک دعاؤں کے ساتھ ماسلطنت کی بنیاد قائم کر دی جاتی ہے اور نئے بادشاہ کی جانب سے رعایا کو فرامین عطا ہونے سے اور رعایا کی جانب سے ان کے قبول کئے جانے سے قانوناً سلطنت قائم ہو جاتی ہے۔ بادشاہ کا تنکوینی خیال اور قوم کی سیاسی مرضی سلطنت کے قانون میں اس طرح یکجا ہو جاتی ہیں گویا وہ دونوں ایک متحدہ فعل ہیں اور سلطنت یا ارادہ قومی مرضی کا ایک آزادانہ فعل ہو جاتی ہے

عہ۔ یسٹو اپنی "تاریخ عالم" (Weltgeschichte) میں لکھتا ہے کہ روم کی بنائیں معاہدہ ایک مخصوص

اس امر میں شک کرنے کی کافی وجہ ہے کہ آیا اس قسم کا سیاسی عمل تکوین "غنی الحقیقت" کبھی واقع بھی ہوا مگر اس سلطنت کے خیل کے یہ نہایت ہی کامل طور پر موافق ہے جو ہمہ تن مکمل ہو کر اس طرح وجود میں آجائے گویا زیوس کے سر سے اٹھتے پیدا ہو گئی۔

۲۔ ایک مہین
حکومت کے
پیشقدموں
کی تنظیم پر مبنی

انسانیہ کہ مملکت اور قوم دونوں موجود ہوں مگر قوم میں اس وقت تک الحاق سیاسی کا احساس نہ پیدا ہوا ہو۔ ایسے موقع پر جو شے سلطنت کو پیدا کرنے والی ہوتی ہے وہ قوم کی تنظیم ہے۔ اس کا بھی ایک نمایاں نمونہ قدیم افسانے میں ملتا ہے۔ اہل ایجیپٹ (ایگپٹ) زمین (A'v Jones) کے فرزند ہیں اور انہیں سلطنتوں کے قیام سے صدیوں پہلے وہ اس ملک میں رہتے تھے اس سلطنت کا آغاز لیک اپس (Cecoops) کے زمانے سے سمجھا جاسکتا ہے جس نے ان اکھڑ باشندوں کو اول اول دیوناؤں کا احترام کرنا سکھایا، خاندان کا نظم برپا کیا، زراعت اور ریتوں کے درخت لگانے کو رواج دیا، لوگوں کو قبیلوں یا ذاتوں میں ترتیب دیا اور حکومت اور عدل کو قائم کیا۔ ایک دوسرے قصبے کے بموجب یہ تمام باتیں شاہ نٹھے سے اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں جس نے ملک کی منتشر جماعت کو ایک سلطنت کی صورت میں جمع کیا اور ایجیپٹ کو حکومت کا مرکز بنایا۔ بہر حال دونوں ممالک کے موافق سلطنت کا وجود میں آنا اسی طرح ہوا کہ اس قوم کی تنظیم کی گئی جو زمین کی مالک تھی۔
سلسلہ میں اسلینڈ کی سلطنت جہوی کا قائم ہونا اس قسم کی تکوین سلطنت کی ایک نہایت مفرد تاریخی مثال ہے کہ ایک خاص ملک میں قوم کی تنظیم سے اس طرح سلطنت قائم ہو گئی۔ اول اول اس جزیرے میں صرف کثیر العدد اور سرداروں (Goden) کی منفرد آبادیاں تھیں۔ یہ آبادیاں آزاد گودورڈوں (Godorde) کی زیر حکومت بسیاں تھیں جنہیں

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ جزو ہے اور لی الحقیقت رومی وضع قانون کی قدیمی صورت لازمی معاہدے کی رومی شکل کو یاد دلاتی ہے، مابین ہمہ رومی قانون نفس واقعہ میں دو آزاد شخصوں کے درمیان کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہے بلکہ حیثیت مجموعی رومی قوم کا ایک واحد نمل ہے۔

۳۔ مختلف جماعتوں یا قلعوں سے اس طرح باہم مربوط ہو کر جو سلطنت بنی ہو اسے اہل ایجیپٹ زینوی کیا (Suvoikid) کہتے تھے۔ اس بحث پر دیکھو ویشر (W. Vischer) کا مفید رسالہ "قدیم یونان میں سلطنتوں اور اجتماعوں کا قائم ہونا" جو بازل (Basel) میں ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا تھا۔

ان کی عبادت گاہیں اور جائیدادیں (Dingstatte) داخل تھیں مگر اس زمانے میں اُلف لیوٹ (Ulfjot) کی تجویز برسرِ داروں کے اتفاق سے جزیرے کی تمام آبادی کے لئے ایک عام مجلس (Alding) قائم کی گئی اور قانون سازی اور انتظام عدالت کے لئے ایک مشترک ذریعہ مہیا کیا گیا اور سب سردار (Godorde) اس کے تابع ہوئے۔ اس طرح جزیرے کی آبادی ایک سلطنت والی قوم بن گئی۔ سلطنت کلیفورنیا کی بنا ہمارے ہمعصروں کی آنکھوں کے سامنے کی بات ہے۔ یہ تین ممالک متحدہ امریکہ کی حدود کے اندر بننے والی ایک نئی قوم کے برصائے باہمی اپنے لئے ایک مملکت قائم کر لینے کی عمدہ مثال ہے۔ سونے کی طبع تمام دنیا سے ہر قسم کے لوگوں کا ایک غیر متفق انبوه جمع کر لائی تھی۔ انھوں نے یکم ستمبر ۱۸۴۹ء کو ایک موسس مجلس کیلئے قائم مقام منتخب کئے اور ۱۳۔ اکتوبر کو نئی سلطنت کا مجوزہ نظام قوم کی منظوری کے لئے پیش کر دیا گیا۔ تمام تاریخ میں اس سے بہتر مثال اس امکان کے ثابت کرنے کے لئے نہیں مل سکتی کہ کس طرح افراد کے آزادانہ اتفاق سے ایک سلطنت بن سکتی ہے اور پھر بھی اگر اس واقعے کو زیادہ غور سے دیکھئے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ یہ فیصلہ بھی تمام افراد کے معاہدے پر منحصر نہیں تھا بلکہ کثرت کی مرضی پر اس کا انحصار تھا اور یہ کہ قوم (جماعت) کا اتحاد ضرورۃً پہلے فرض کر لیا گیا تھا۔ نظام سلطنت افراد کی مرضی سے نہیں بلکہ تمام آبادی کی مشترک مرضی سے پیدا ہوا تھا۔

ممالک متحدہ امریکہ کی موجودہ تعمیر سلطنت میں بھی تاثر یہی خصوصیت رہی ہے۔ پہلے ایک "مملکت" کی پیدائش کر کے اسے آباد کاروں کے لئے کھول دیا ابتداً وہ امریکہ متحدہ کا ایک صوبہ سمجھی جاتی رہی اور حکومت متحدہ اس کے انتظام کا سامان کرتی رہی، جب آبادی بڑھ گئی اور سوچا کہ ایک قوم کی شکل اختیار کرنے لگی تو اسے ایک نیا نظام سلطنت عطا ہوا اور کانگریس (مؤتمر) نے اس مملکت کو ایک نئی سلطنت تسلیم کر لیا۔

زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ پہلے ایک قوم بن جاتی ہے اور بعد ازاں ہی سلطنت کے دوسرے لازمی جزو کے طور پر وہ زمین پر قبضہ حاصل کرتی ہے۔ اسے قبضہ مملکت کہہ سکتے ہیں۔ پس تینوں سلطنت کی پہلی صورت ہم فتح کو قرار دے سکتے ہیں۔ جس سے اکثر کام لیا گیا ہے یعنی سلطنت قائم کرنے میں پہلے کوئی آباد ملک فتح کر لیا جاتا ہے۔

۳ کسی موجودہ قوم کا کسی مملکت پر تابع ہونا

یہودیوں کی پہلی سلطنت، ڈوریا کی یونانی سلطنتوں کا ایک معتد بہ حصہ اور جرمانی قوموں کی سلطنتیں جو رومی صوبوں اور سلاوی زمینوں پر قائم ہوئیں وہ سب کی سب اسی طرح وجود میں آئیں، اس صورت میں مفتوحہ ملک کے باشندوں پر فاتح قوم کی فوجی قوت کا غلبہ قائم کیا جاتا ہے، جنگ جہاں ایک طرف تباہی کا ایک آلہ ہے وہاں دوسری طرف ایک مثبت طاقت یعنی سلطنتوں کے پیدا کرنے کی قدرت بھی رکھتی ہے۔ جنگ حصول غلبہ اور مردانہ اقتدار کے صفات کو نرتی دیتی ہے اور ایک فتحیاب قوم، مفتوح ملک میں ایک نئی سلطنت قائم کرنے کی خصوصیت کے ساتھ قابلیت رکھتی ہے۔

جو سلطنتیں اس طریقہ سے پیدا ہوتی ہیں انہیں ابتداء سے وجود میں بہت سی اندرونی و بیرونی مشکلات پر غالب آنا پڑتا ہے۔ اگر مسلح مخالفت کی تجدید نہ بھی ہو تو بھی عام طور پر فاتح و مفتوح کے تمدن میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے اور یہ کشمکش اس وقت تک جاری رہتی ہے، جب تک کہ مخلوط قوم کا سیاسی اتحاد مکمل نہ ہو جائے۔ اپنی جدید تنظیم کردہ قوم کو اس خطرے سے بچانے کے لئے حضرت موسیٰ نے یہود کو حکم دیا تھا کہ جو ارض مقدس خدا نے انھیں عطا کی ہے، اس کے تمام باشندوں کو آگ اور تلوار سے فنا کر دیں۔ بہت سی فاتح قومیں اس خطرے میں غرق ہو گئی ہیں اور مفتوح نسل کے اعلیٰ تمدن نے دوبارہ انھیں دبا لیا ہے۔

فتح طاقت ہی کے زور سے کیوں نہ ہو مگر تمام قوموں میں وہ ہمیشہ سیاسی حق کا منبع سمجھی جاتی رہی ہے۔ سکندر اعظم کا مقولہ آج بھی صحیح ہے کہ فاتح قانون عطا کرتا ہے اور مفتوح اسے قبول کرتا ہے۔

جہاں بیرونی قوت نئے حقوق کے پیدا کرنے اور پرانے حقوق کے تباہ کرنے پر اس قدر قوی اثر ڈالتی ہو وہاں بالیقین نظم حقوق ہمنو زنا مکمل حالت میں ہوگا، لیکن فتح کی صورت کیسی ہی خشن کیوں نہ ہو پھر بھی اس میں ایک اخلاقی وقت شامل ہے۔ جس کی اہمیت وضع قوانین میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ قدیم اور فاسکریو ٹونی قومیں جنگ کو ایک بڑا بین الاقوامی مقدمہ قانونی اور فتح کو فاتح کے حق میں خدا کا فیصلہ سمجھتی ہیں علیہ

علیہ تنبیہ، مطالعات، (Studien) صفحہ ۲۰۲: جنگ قانون بین الاقوام کے برقرار

رکھنے کی وہ ہیئت شکل ہے جو اس وقت تک جاری ہے مگر اب یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ جنگ اس

اس وجہ سے کہ فتح سے محض جسمانی غلبے کا اظہار نہیں ہوتا تھا بلکہ اس اخلاقی قوت کی بھی تصدیق ہوتی تھی جو اقتدار سیاسی کو حق بجانب ثابت کرتی ہے۔ یہ خیال سلطنت کے تخیل جدید سے، جو اسے ایک انسانی تنظیم سمجھتا ہے، خلاف نہیں ہے لیکن فی الحقیقت ہر فتح حق کا ثبوت اور ہر شکست غلطی کا نشان نہیں سمجھی جاسکتی۔ آلات جنگ کا غلبہ اب کسی حیثیت سے بنائے حق نہیں خیال کیا جاسکتا۔ مگر عظیم تاریخی ارتقاء کا نتیجہ جو وقتاً فوقتاً متخاضم قوموں کے مناقشے کو طے کر دیتا ہے، وہ وسیع فوجی اور سیاسی رفتار میں زمانے اور فطرت کا فیصلہ سمجھا جاتا ہے اور چونکہ اس میں اخلاقی اجزاء کا عمل بھی ہوتا ہے اس لئے اسے تاریخ عالم کے فیصلے کی اہمیت ماضی ہوتی ہے۔ ”دنیا کی تاریخ دنیا کا دیوان عدالت ہے“ بعد میں حالت جدید کا تسلیم کیا جانا خواہ عہد نامہ صلح کے ذریعہ سے ہو یا باشندوں کی اختیاری اطاعت سے ہو، ابتدائی قبضے کے قانونی نقائص کو درست کر دیتا ہے۔

زمین پر قبضہ کرنے کی ایک دوسری اور زیادہ پر امن صورت یہ ہے کہ کوئی سیاسی جماعت کسی غیر آباد یا کم ترقی یافتہ زمین پر نئی سلطنت قائم کرنے کی غرض سے جا بسے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں بہت سی یورپی نوآبادیوں کی یہی نوعیت ہے۔ اگر آباد کاری آبائی سلطنت کی نگرانی میں عمل میں آتی ہے تو وہ تھوڑی سی تنکون سلطنت کی ایک مثال ہے (دیکھو اسی مقالے کا باب ۴۱)۔ لیکن اگر آباد کار اپنا ایک تنظیم اجتماع قائم کر چکے ہوں (جیسا کہ نیو انگلینڈ میں آباؤ زائرین (Pilgrim Fathers) نے کیا) اور خاص اپنی کوششوں اور اپنی ذمہ داری سے ایسی زمین پر جو ان تک کسی سلطنت سے متعلق نہ ہو، ایک نئی جماعت قائم کریں تو یہ اصلاً و دقتاً ایک نئی سلطنت کی بنا ہوگی۔ اگر ملک کے قدیم وحشی باشندے نوآبادی کی مملکت میں رہیں تو دونوں آبادیوں کے درمیان تعلقات کچھ درست کرنے کی مشکلات تقریباً ویسی ہی سخت ہوتی ہیں جیسی

پڑا
آباد کاری

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کارروائی کی صرف ہمید ہے جو انسانیت کے لئے زیادہ قرین انصاف اور زیادہ سزاوار ہے [یہ خیال سب سے پہلے مشہور جرمانی شاعر شلر نے اپنی ایک نظم میں ظاہر کیا دیکھو جرمانی فلسفی نیگل کی تصنیف ”فلسفہ حقوق“ فقرہ ۳۴۰]

علیٰ بنعلی ”قوم جدیدہ (Moderne Volker)“ فقرہ ۱۰۰ فتح سے ایک جدید پر امن قانونی حالت اس وقت تک نہیں پیدا ہوتی۔ جب تک کہ مفتوح اطاعت نہ قبول کرے یا صلح کا معاہدہ نہ ہو جائے۔

کسی مفتوحہ ملک میں ہوں مگر وحشی قوم پر متہدن قوم کی فوقیت لازماً آخر الذکر کے غلبے کا سبب ہو جاتی ہے۔

تیسرا باب

(۲) تکوین ثانوی کی صورتیں

دو یا زیادہ سلطنتیں جنہیں انفرادی حالت میں رہ کر اپنے کمزور ہو جانے کا اندیشہ ہو یا جو ایک ہی قوم کے اجزاء ہوں اور اس لئے قومی اتحاد کے حاصل کرنے کی خواہاں ہوں وہ باہم ایک جدید اور وسیع متحدہ سلطنت میں متفق ہو سکتی ہیں اس کی بنا فرانس کے معاہدے سے نہیں ہوتی بلکہ سلطنتوں کے معاہدے ایسے اتحاد کو قائم کرتے یا کم سے کم اس کے لئے راستہ تیار کرتے ہیں مگر ایک نئی مجموعی سلطنت اس وقت تک وجود میں نہیں آتی جب تک کہ اس کے لئے ایک متفقہ نظام سلطنت نہ مرتب کر لیا جائے۔

الف متعدد
سلطنتوں
کے معاہدے
سے ایک
مرکب
سلطنت
کی تکوین

سلطنت کی اس نئی صورت کی مثالیں بوئیویا (Boeotia) کی قدیم یونانی مشترکیت میں، ایپامیون ڈاس کی اس ناکام کوشش میں جو اس نے آرکاڈیا دلوں کو متحد کرنے میں کی تھی، پیلوپونسیا کے محالفے میں، جو اسپارٹا کے تحت تھا، اور ایٹولیا اور اکیسیا کے معاہدات میں پائی جاتی ہیں۔ اطالیا میں معاہدہ سستانی اور ازمنہ وسطی کے آخری حصے میں جرمانیا کے تجارتی شہروں (Hanse towns) کے معاہدات اہل سویزر لینڈ اور ولندیزی سلطنتوں کے مشترکات سب اس کی مثالیں ہیں۔

اس طریق سے جو سلطنت پیدا ہوتی ہے، وہ مفرد نہیں بلکہ مخروج (یامرب)، ہوتی ہے کیونکہ مختلف سلطنتیں جن سے اس کی ترکیب ہوتی ہے وہ بحال خود برقرار رہتی ہیں اور صرف ایک نئے تعلق میں متفق ہو جاتی ہیں۔ چونکہ یہ تعلق ابتداً قانون

سلطنت سے زیادہ معاہدہ سلطنت پر مبنی ہوتا ہے، اس لئے آئندہ نئیں ایسی حالت متضاد کی وارث ہوتی ہیں جس میں متعدد سلطنتیں اسلحا ایک دوسرے سے باطل آزاد ہوتی ہیں اور دوسرے اعتبارات سے اس مرکب سلطنت کی فی الواقع تابع بھی ہوتی ہیں۔ اس تضاد سے ایک مستقل عمل اور رد عمل (Reaction) پیدا ہوتا ہے اور اکثر مجموعی اور خصوصی میلان میں ایک طرح کا تصادم رد نما ہو جاتا ہے۔

اگر اتفاق کا احساس زیادہ قوی ہو جاتا ہے اور مشترک تنظیم کو زیادہ نشوونما حاصل ہو جاتی ہے تو پھر معاہدہ سلطنت کی صورت کے بجائے ایسی قانون کی صورت قائم ہو جاتی ہے، اس امتیاز پر اتحاد سلطنت کی دو خاص شکلیں مبنی ہیں۔ یعنی مشترکیت (Confederation) اور متفقیت (Federtion)۔

اجسام ہیں اور اس حد تک محالفہ (Alliance) محض سے جس سے کوئی نئی سلطنت نہیں بنتی مختلف ہیں۔ مگر اول الذکر میں سلطنتوں کے اجتماع میں معاہدے کی خصوصیت قائم رہتی ہے اور ثانی الذکر میں ایک اجتماعی سلطنت یا اتحاد بننے کی طرف میلان کی ترقی منظر ہوتی ہے۔

متعدد سلطنتوں کو ایک سیاسی ارتباط میں جمع کر لینے سے، مشترکیت کم از کم خارجی اعتبار سے ایک سلطنت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، مگر بایں ہمہ وہ ان مخصوص سلطنتوں سے جداگانہ مرکزی سلطنت کی صورت میں منظم نہیں ہوتی، مجموعی سلطنت کا انتظام یا تو بحیثیت صدر کے کسی ایک سلطنت کو تفویض ہو جاتا ہے یا تمام مختلف سلطنتوں کے وکلاء نائبین کی جماعت کے سپرد ہوتا ہے۔ اسپارٹا اور اتھنز کی سرکردہی (Hegemony) میں معاهدات یونان کی نوعیت اول الذکر قسم کی سی تھی، اور ثانی الذکر صورت ۱۸۴۸ء تک سویزرلینڈ کی مشترکیت اور ۱۸۱۵ء کی جرانی مشترکیت کی تھی۔

برخلاف اس کے متفقیت میں یہی نہیں ہوتا کہ اس کی بعض سلطنتیں اپنی اپنی جگہ پر بہم دجو مضبوط ہوں بلکہ ایک مضبوط مشترک مرکزی سلطنت ہی ہوتی ہے متفقیت علیہ مقابلہ کردہ فرہین کی حکومت متفقہ جلد اول باب دوم صفحہ ۹-۱۵ ”مقابلتی سیاسیات“ صفحہ ۲۸، انگریزی مترجم۔

کے اختیارات منفرد سلطنتوں میں سے کسی ایک سلطنت کے ہاتھ میں نہیں رہتے، ان سلطنتوں کی کسی مجلس کو سپرد ہوتے ہیں بلکہ وہ اپنے مخصوص متفقہ اور قومی اعضائے کا سپرد کر لیتی ہے جن کا تعلق صرف اسی مجموعی جسم سے ہوتا ہے، ایسا کامعادہ جس میں قوم کی ایک مشترک مجلس بحیثیت جماعت وضع قوانین کے تھی، معاملے کے سردار کی حیثیت سے ایک متفقہ سپہ سالار تھا اور متفقہ مجلس شورٰی عدالت موجود تھی۔ یہ معادہ ایک حد تک اس قسم کی متفقہ سلطنت رہ چکا ہے۔ ازمنہ جدیدہ میں سلطنت کی شکل اور اشکال امریکہ کی سلطنت ہائے متحدہ میں پیدا ہوئی مگر اس کے قانون اتحاد کے قبل اس کا نظارہ کامل نہیں ہوا اس کے بعد سوزر لینڈ نے اپنے ۱۷۸۷ء کے متفقہ نظام سلطنت میں اس کی نقل کی۔ ان دونوں نظام ہائے سلطنت کا انحصار اب سلطنتوں کے کسی باہمی معاہدے پر نہیں رہا ہے، بلکہ ایک عام قوم اور ایک عام سلطنت کے مفہوم پر شامل ہے، جس کی تنہا مرضی سے نظام سلطنت کی ترتیب ہوتی ہے اور وہ قلیل الشعداد جماعتوں بلکہ منفرد سلطنتوں تک سے بھی اطاعت کی خواہاں ہوتی ہے اس طرح مشترکیت کے ابتدائی درجے کو چھوڑ کر متفقیات یا اتحاد کے اعلیٰ درجے پر قدم رکھ دیا گیا ہے۔

مرکب سلطنت کی یہ دونوں شکلیں لٹامیوں کی بہ نسبت جمہوریتوں کے لئے زیادہ موزوں ہیں اگر ہم شمالی امریکہ اور سوسن لینڈ کے نظام ہائے حکومت کی تاریخ کا مقابلہ اس کشاکش سے کریں جو جرمانی مشترکیت کی اصلاح کی بابت پیش آتی رہی ہے تو یہ امر صاف طور پر واضح ہو جائے گا۔

۱۸۶۷ء کی شمالی جرمانی مشترکیت اور ۱۸۷۱ء کی جرمانی شہنشاہی کے نظام سلطنت عملاً قانوناً فی الواقع جرمانیا کی مختلف سیاسی طاقتوں اور قوتوں کو ایک عام قومی دائرہ عمل میں متحد کرتے ہیں لیکن اگر ہم اصول پر خیال کریں تو اس نظام سلطنت کی مثال اس تہی کی سی ہے جو ابھی پوری طرح پر خول سے نکل نہیں چکی ہے ایک جانب اس کے ابتدائے کار کی صورت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تمام منفرد سلطنتوں یعنی باو شاہوں

۳۔ جرمانی مشترکیت
ایک متفقہ
شہنشاہی
بنائی گئی

۱۷۔ اس بحث پر فاکس کریمو ویلٹن اور میڈسن کی تصنیف "Federalist" اور مالک متحدہ کے نظام سلطنت کی شرح مصنفہ اسٹوائی، لیمپلی کی تصنیف "سوسن لینڈ کے قانون متفقیات کی تاریخ" ج ۱ ص ۳۵۲ اور اس کی سیاست ۱۸۶۳ء

نیز مجلسوں کے آزادانہ معاہدے سے اس کی ابتدا ہوئی سے گرد و سری جانب واقع کی حیثیت سے یہ نظام سلطنت پر دسی حکومت اور (جرمانی قوم کے قائم مقام کی حیثیت سے) شہنشاہی ڈاٹ کی محنتوں کے اشتراک سے وجود میں آیا ہے۔ اس موقع پر معاہدہ اور قانون کچھ عجیب طرح پر باہم لگے ہیں مگر مجلس متفقہ (Federal council) میں متحدہ سلطنتوں کی نیابت اب تک مشترک جبرمانی مجلس کی یاد دلاتی ہے۔ صدارت متفقہ کا ابتدائی لقب جو پردیشیا کے تاج شاہی کو دیا گیا تھا اس میں بھی اس مشترک خصوصیت کی صفت پائی جاتی ہے، لیکن اگر ہم صدر کے واقعی اختیار خاص کر اس کے سپہ دار اعظم ہونے کے لحاظ سے، اس اختیار پر نظر کریں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ شہنشاہی جبرمانی کا سترج ہمارے سامنے موجود ہے اور اب شہنشاہی کے نظام سلطنت نے اسے شہنشاہ جبرمانیا کے پر شوکت لقب کے ذریعے سے تسلیم کر لیا ہے۔ شہنشاہی ڈاٹ کی تنظیم خیالاً اور علاؤدینوں طرح پر شمالی امریکہ کی کانگریس (موتمر) اور سوئزر لینڈ کی مجلس متفقہ دونوں سے زیادہ متحدہ مرکب ہے۔ جبرمانی شہنشاہی کا نظام سلطنت جمہوری متفقیات سے جن اہم امور میں مختلف ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

جبرمانی شہنشاہی
اور جمہوری
متفقیات
کے فرق

(الف) اس نظام سلطنت کی رو سے مجموعی سلطنت کے بعض اعضاء اعلیٰ کی ذوات میں لازماً یا دو اقتدار مند سلطنتوں کے مناصب حکومت بھی جمع ہو گئے ہیں۔ مثلاً جبرمانی شہنشاہ پر روسیا کا پادشاہ بھی ہے مجلس متفقہ کے ارکان اور منقر سلطنتوں کے حکمران ایک ہی ہیں۔ شہنشاہی صدر اعظم اور نیز شہنشاہی کے اعلیٰ عہدہ داروں میں سے بہت سے عہدہ دار وہی ہیں جو پر روسیا کے وزیر ہیں۔ برخلاف اس کے متفقہ سلطنتوں میں یہ دونوں فرائض کلیتہً جدا ہوتے ہیں۔

(ب) متفقیات میں مختلف سلطنتیں طاقت اور وسعت کے لحاظ سے فی الواقع ایک دوسرے کے برابر نہیں ہوتیں مگر اتحاد کے مقابلے میں بہت ہی کمزور ہوتی ہیں اور اس اعتبار سے ایک دوسرے کے مثل ہوتی ہیں لیکن جبرمانی شہنشاہی میں سلطنت پر روسیا باقی تمام شریک سلطنتوں کے مجموعے سے بھی زیادہ طاقتور ہے اور اس لئے اسے سبکا سرتاج اور سب پر اقتدار سمجھنا چاہئے اسی پر شہنشاہی کی اصلی قوت کا انحصار ہے۔ بغیر اس کے جبرمانی شہنشاہی کچھ بھی نہیں ہے اور اسی کے گرد بقیہ جبرمانی سلطنتیں مجتمع ہیں۔

(ج) شہنشاہی اور بیشتر منفرد سلطنتوں کا نظام سلطنت شاہی ہے۔ یہ اختلافات ایسے اہم ہیں کہ متفقہ سلطنت کے رائج الوقت خیال کے تحت میں جرمان نظام سلطنت کا شامل نکرنا ہی بہتر ہے۔ اسے متفقہ شہنشاہی کا نام دینا چاہئے اور متفقہ سلطنت کی ایک جدید و متوازی صورت خیال کرنا چاہئے۔

جس صورت پر ہم بحث کر رہے تھے اسی کے قریب قریب دو یا زائد سلطنتوں کا ایک خاص مفہوم میں اتحاد ہے۔ خواہ ایک مشترک حکمران کے تحت میں ہو یا ایک بنی سلطنت کی صورت میں۔ اس کے مختلف اقسام و مدارج ہیں۔ اتحاد جب تک محض ذاتی وجہ پر مبنی ہوتا ہے وہ نامکمل رہتا ہے۔

اگر ایک ہی شخص اتفاق سے دو مختلف سلطنتوں کے تحت کا وارث ہو جائے تو یہ اتحاد بالکل عارضی ہوتا ہے اور بعد میں اگر بھی جانشینی دو مختلف شخصوں کو حاصل ہو جائے تو یہ اتحاد زائل ہو جاتا ہے۔ چارلس پنجم کے تحت میں جرمانی شہنشاہی اور اسپین کا متحد ہو جانا اگستس (دوم دسوم) کے تحت میں پولینڈ اور سکسونیا کا یا خاندان برنس وگ کے مرد حکمرانوں کے تحت میں انگلستان اور ہنور کا یا سنہ ۱۶۲۳ء کے معاہدے کے موافق اسلیش وگ ہول اسٹائن اور ڈینمارک کا اتحاد یہ سب اسی قسم میں داخل تھے۔ اتحاد کا یہ طریقہ سب سے کمتر درجے کا ہے اس سے کوئی نئی متحدہ سلطنت نہیں پیدا ہوتی بلکہ دو آزاد سلطنتیں محض بیرونی تعلقات کے لحاظ سے ایک بادشاہ کے تحت اقتدار میں آ جاتی ہیں۔

جب دو سلطنتوں کا تاج ایک ہی خاندان کے پاس ہو اور ایک ہی قانون تحت اس کے موافق اس کا سلسلہ جاری رہے تو یہ شخصی اتحاد مستقل صورت اختیار کر لیتا ہے اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔ تاج آسٹریا کے تحت میں جو سلطنتیں متحد تھیں ان کے لئے سنہ ۱۸۰۶ء کا فرمان شہنشاہی (جسے سنہ ۱۸۰۶ء میں ہنگری کی مجلس نے بھی سلطنت ہنگری کیلئے منظور کر لیا تھا) سنہ ۱۸۰۶ء میں شاہ پروسیا کا امارت نیو شٹال کا حاصل کر لیا، سنہ ۱۸۱۴ء میں ناروے اور سویڈن کا متحد ہو جانا۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں سلطنت ہنگری اور آسٹریا کا وفاق اس مستقل خاندانی اتحاد سے حقیقتاً ایک نئی مرکب سلطنت پیدا ہو سکتی ہے مگر یہ اتحاد بہت ہی نامکمل ہوتا ہے اور بالعموم اس میں کسی قسم کی علی اہمیت نہیں ہوتی جب تک کہ

ب۔ اتحاد

شخصی اتحاد

خود حکمران کی ذات میں مطلق انسان اختیار مجتمع ہونا چاہئے۔ اس کے سوا تمام دوسری حالتوں میں فی الحقیقت ایک طرح کے تضاد و تخالف کی صورت رونما ہو جاتی ہے۔ ایک طرف متضاد اغراض و خیالات کی دو سلطنتیں ہوتی ہیں دوسری طرف ایک مشترک بادشاہ ہونا ہے جو ایک سلطنت کے حکمران کی حیثیت سے دوسری سلطنت کے خلاف اعلان جنگ تک کے لئے مجبور ہو سکتا ہے۔ اس لئے شخصی اتحاد کی یہ صورت نیابتی حکومت کے ساتھ با صحت طریق جمع نہیں کی جاسکتی۔

اعلیٰٰ تو حد اس طلب میں پایا جاتا ہے جسے حقیقی اتحاد کا نام دیا جاتا ہے۔ حقیقی اتحاد سے اسے وہی نسبت ہے جو شخصی اتحاد کو مشترکیت سے ہے۔ اس صورت میں نہ صرف حکمران کی شخصیت ایک ہوتی ہے بلکہ قانون سازی اور حکمرانی بھی ایک ہوتی ہے۔ بلاشبہ متحدہ سلطنتوں میں گو نہ اندرونی آزادی ہو سکتی ہے اس لئے کہ معین حدود کے اندر ان کے خاص مجالس وضع قوانین اور ان کے خاص اعمال ہو سکتے ہیں مگر پھر بھی تمام سلطنت کا ایک نظم ہوتا ہے اور اس کے سب سے اعلیٰٰ اغراض ایک ہی ہاتھوں میں مجتمع ہوتے ہیں۔ ایسے حقیقی اتحاد کی مثالیں یہ ہیں: ۱۵۳۶ء
کے شاہنشاہی قانون کے موافق ناروے کا سلطنت ڈینمارک سے متحد ہو جانا۔ کیسٹائل اور ارگون کا اتحاد اگرچہ ابتدا ہی دیہی (۱۴۹۹ء) میں مکمل نہیں ہوا مگر بعد کو شاہان یابس برگ کے تحت میں مکمل ہو گیا۔ سب سے نمایاں مثال ۱۸۴۹ء کے قانون اساسی اور ۱۸۶۱ء کے نظام سلطنت کے موافق آسٹریائی شاہی کی ہے۔ ۱۸۶۶ء سے آسٹریائی کا نظام سلطنت دو خاص سلطنتوں کی دوگوئی کے ساتھ اتحاد شخصی کی شکل کو پہنچ گیا ہے اس وجہ سے کہ معاملات خارجہ کی وزارت شاہنشاہی فوج اور مالیات ایک ہیں۔ نیز آسٹریا اور ہنگری کی دو قائم مقام جماعتوں کی ایک مشترک سفارت ہے۔ اس شخصی اتحاد

۱۔ پرنسپل ”قاموس علم السیاسۃ“ کی فصل ”اتحاد“ میں، شخصی اور حقیقی اتحاد میں کچھ اور امتیاز قائم کرتا ہے۔ اس کے نزدیک شخصی اتحاد ایک اتفاقی چیز ہے اور حقیقی اتحاد دویا زیادہ سلطنتوں کے اقتدار کا بنیادی قانون کی بنیاد پر ایک ہی شخص کی ذات میں جمع ہو جانا ہے۔ اس طرح پر اس کی نظر میں سویدن اور ناروے کا اتحاد بھی حقیقی اتحاد ہے۔

۲۔ اصل جرمانی میں ۱۵۳۲ء ہے

میں حقیقی اتحاد کے عناصر موجود ہیں۔ یہ دونوں خاص سلطنتیں اپنی اپنی جگہ پر شخصی اتحاد سے شروع ہوئیں مگر اب ان کا اتحاد حقیقی ہو گیا ہے۔

اتحاد کامل سے متحدہ سلطنتوں کی تفریق ختم ہو جاتی ہے، اور اس سے ایک مرکب نہیں بلکہ ایک واحد سلطنت بن جاتی ہے۔

۲۔ اتحاد کامل

انگلستان اور اسکاٹ لینڈ ابتداً محض شخصی اتحاد سے مربوط ہوئے تھے مگر ۱۷۰۷ء میں برطانیہ عظمیٰ کا نام پا کر ان کے متحد ہو جانے اور بعد میں کینٹنٹ میں، برطانیہ عظمیٰ اور آئر لینڈ کا اتحاد ہو جانے سے وہ اتحاد کامل کی مثال بن گئے۔ ان کی جداگانہ پارلیمنٹیں ختم کر دی گئیں اور اب تمام قلمرو کے لئے ایک پارلیمنٹ ہے۔ زیادہ جدید زمانے کی مثالیں حسب ذیل ہیں:-

۱۸۴۹ء میں امارتہاے ہونہنت سورن کا پردسپا میں شامل ہو جانا
۱۸۶۰ء میں اطالی امارتہاے ڈیوکی اور سلطنت سپیلز کا اطالیہ کی ایک نئی سلطنت بنانے کی غرض سے پدمونٹ میں ملحق ہو جانا سب سے بڑھ کر یہ کہ ہنود کی سلطنت سے۔ نساؤ، اشلیس وگ اور ہول اشتائن کی امارت اور فرانک فرٹ کے آزاد شہر کا پردسی صوبوں میں تبدیل ہو جانا۔

زمانہ سابق میں قانون عامہ ان اتحادات و تغیرات کو خالصتہً فائدہانی نقطہ نظر سے دیکھنے کی طرف مائل تھا۔ گویا یہ معاملہ ایک ہی شخص کا ذاتی حیثیت سے متعدد قطعوں کے اراضی کا حاصل کر لینا یا ان کا وارث ہو جانا تھا اور بس۔ دو صیت اور وراثت کی صورتوں میں (شخصی قانون کسی شخص کی زندگی میں اور نیز موت کے وقت انتقال ملک کی جو صورتیں تجویز کرتا ہے وہی اس معاملے میں بھی تسلیم بھی جاتی تھیں۔ گویا قوم اور ملک ایک ترکہ تھا جسے ایک شخص واحد جس طرح چاہتا، کام میں لاسکتا تھا۔ جدید قانون عامہ اس رائے کو جو ہمارے تخیل سلطنت سے متصادم ہے مسترد کرتا اور اس امر پر زور دیتا ہے کہ اس قسم کے تغیرات چونکہ حقیقتاً قوم کے عام نظام سلطنت سے متفق رہتے ہیں اس لئے عوام کے قائم مقاموں کی مرضی کے بغیر انہیں طے نہ کرنا چاہئے اتحاد کا عکس ایک بڑی سلطنت کا دو یا زائد نئی سلطنتوں میں منقسم یا متفرق ہو جانا ہے۔

۳۔ تقسیم

تقسیم اعتبار
قومیت

قومیت کے اعتبار سے تقسیم کا موقع بالخصوص ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں مختلف قومیں جو اپنے اہلک ارضی ہی کی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا ہوں حقیقی اتحاد کے بغیر ظاہری طور پر ایک نئی سلطنت میں متحد ہو گئی ہوں اگر وہ جامع قوت جو اب تک انھیں متحد کئے ہوئے تھی کمزور ہو جائے تو طبیعتی اختلافات رونما ہو جاتے ہیں اور انفرق کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور اس موجودہ اجتماع کو متعدد جدید و آزاد سلطنتوں میں منتشر کر دیتا ہے چنانچہ وہ عظیم الشان عالمگیر سلطنت جسے سکندر نے اپنی قابلیت سے ذرا دیر کے لئے بنا دکھایا تھا اس کے مرتے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ نویں صدی کی خرابی شاہی کے بھی قومیتوں کے اعتبار سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ نتیجہ کسی قدر خاندانی اختلافات کی وجہ سے بھی ہوا۔ چوتھیں کی شہنشاہی جس میں اسکی بنائی ہوئی تابع سلطنتیں بھی شامل تھیں۔ اس کے زوال کی بھی ایک بڑی حد تک یہی وجہ ہو سکتی ہے اور یہی وجہ ۱۸۰۱ء میں بلیئم کے دلہنیز (بالینڈ) سے جدا ہونے کی ہے۔

تقسیم مذہب
در اشانت

از منہ وسطی میں اکثر ایک سلطنت متوفی حکمران کے مختلف بیٹوں میں بالکل اسی طرح تقسیم ہو جاتی تھی جیسے کوئی وراثت مختلف وارثوں میں تقسیم ہو جائے۔ یہ طریقہ جو شخصی قانون کے اصول سے متفرع ہے سلطنت کے بہبود و اتحاد کے بالکل منافی ہے اور صرف زمانہ جدید کے سیاسی ناقابل تقسیم اصول کے تسلیم کئے جانے سے یہ طریقہ ساقط ہوا ہے۔

اعلان
آزادی

دوسری صورت اس وقت ظاہر ہوتی ہے۔ جب کسی سلطنت کا کوئی حصہ اپنے نیس آزاد ظاہر کرتا اور ایک جداگانہ سلطنت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بالعموم سلطنت کے جزو ہونے کی حیثیت سے اس حصے کو کل کے خلاف بغاوت کرنے اور بزدل اس سے جدا ہونے کا استحقاق نہیں ہے۔ تاریخ نے انفرق کی بہت سی ناوا حبیب اور بد بخت کوششوں کی روایتیں ہم تک پہنچانی ہیں اور وہی تاریخ آزادی کے ایسے اعلانات کا بھی حال بتاتی ہے جو پوری طرح تسلیم کئے گئے ہیں اور جنہوں نے کافی طور پر اپنے کو حق بجانب ثابت کیا ہے۔

۱۸۶۹ء میں اسپین سے سو بجات متحدہ کی علیحدگی ۱۸۷۱ء میں شمالی امریکہ کی سلطنتوں کا اعلان آزادی اور ہمارے زمانے میں یونان کا ترکی تسلط سے

آزاد ہو جانا یہ سب اسی طریقے کی یاد دلاتے ہیں اس اصول میں کسی قدر حصر کی ضرورت ہے جسے بطریق ذیل بیان کر سکتے ہیں۔ مستقل حالتوں میں جبر و کاکل سے علمدہ ہو جانا حق بجانب ہے بشرطیکہ اس کے دائمی اور اہم اغراض اس کل کے اندر محفوظ اور قابل اطمینان ہوں جس سے اس کا تعلق ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی ہو کہ خود اس جبر و میں اپنی فکر کرنے اور اپنی آزادی کے برقرار رکھنے کی اہلیت موجود ہو۔ صرف حقیقی ضرورت اور ناقابل برداشت مصیبت ہی علمدگی کے لئے کافی وجہ ہو سکتی ہے اور اس کے مسلم سمجھنے کا حق صرف اس اخلاقی قوت سے پیدا ہوتا ہے جو خود کو فقیاب ثابت کر دے اور تمام مشکلات پر غالب آجائے ان دو مفروضات کے ساتھ تاریخ کا فیصلہ اس پر مہر اعتراف لگا دے گا علیہ

علم امریکہ کا اعلان آزادی اس اصول کو زیادہ ہلکے طور پر زیر بحث لایا ہے، اور اس وقت کے حقوق نظری کے رائج الوقت نظریے کو ان نقطوں میں تسلیم کرتا ہے :- ہم ان حد اقلوں کو دیدی سمجھتے ہیں کہ تمام آدمی یکساں درجے پر پیدا کئے گئے ہیں۔ خالق اکبر نے انھیں جنس نہ بدلنے والے حقوق عطا فرمائے ہیں اور اس زندگی کے ساتھ آزادی اور اپنی خوش حالی کی کوششیں وابستہ ہیں جو انھیں حقوق کے تحفظ کے لئے انسانوں میں حکومتیں قائم کی گئی ہیں جو اپنے جائز اقتدار کو محکموں کی مرضی سے حاصل کرتی ہیں۔ جب حکومت کی کوئی شکل ان اغراض کے منافی ہو جاتی ہے تو قوم کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اس حکومت کو منسوخ کر دے اور اس کی جگہ پر نئی حکومت قائم کرے اور اس کی بنیاد ایسے اصولوں پر رکھے اور اس کے اختیارات کو اس طرح پر ترتیب دے جو اپنی حفاظت اور خوشحالی کے لئے قوم کی فطرت میں سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوں۔ مانیت اندیشی کا اقتضا ضرور یہ ہوگا کہ جو حکومت مدت دراز سے قائم ہو وہ خفیف اور عارضی وجہ سے تبدیل نہ کی جائے اور اسی لئے تمام ممبران سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ خرابیاں جینک قابل برداشت ہوتی ہیں لوگ انھیں برداشت کرتے رہتے ہیں اور یہ نہیں کرتے کہ حکومت کے جن اشکال سے وہ افسوس ہوں انھیں منسوخ کر کے خود حاکم بن جائیں لیکن جب کجروی اور بدکرداری کا ایک طویل سلسلہ بلا تغیر اسی ایک غرض کے لئے جاری ہو جائے کہ انبائے ملک کو مطلق العنان حکمرانی کے تحت میں لے آئے تو پھر لوگوں کا یہ حق بلکہ ان کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ ایسی حکومت کو بطرف کریں اور آئندہ کے لئے اپنی محافظت کی تدبیریں عمل میں لائیں [اس اعلان کے خیالات و الفاظ کا لاک کے رسالہ "مکومت ملی" جلد دوم فقرات ۲۲۲ و ۲۲۵] سے مقابلہ کرو۔

چوتھا باب

(۳) تہذیبی تکوین کی صورتیں

یونانیوں کی آباد کاری جس نے ایشیائے کوچک، اطالیہ اور سسلی میں بحر متوسط کے ساحلوں کو اور یونانی جزیروں کو نئے شہروں اور سلطنتوں سے پر کر دیا تھا وہ فی الواقع نئی سلطنتوں کی ارادی تخلیق تھی۔ نئی آبادی اپنے آبائی شہر سے اس طرح نکلتی تھی جیسے بیٹا خود اپنا گھر بنانے کے لئے اپنے باپ کے خاندان سے نکلتا ہے، یہ نئی آبادی فوراً ہی ایک نئی سلطنت ہو جاتی تھی جو آبائی شہر سے آزاد ہوتی مگر اپنی نسل، اخلاق، قانون اور مذہب کے روابط سے اس کے ساتھ وابستہ رہتی تھی۔ نوخیز شہر اپنے آبائی شہر کے ایوان (Prytaneum) سے آتش مقدس لے جاتا تھا اور اس طرح خاندانی دیوتا نئے وطن کو منتقل ہو جاتے تھے۔ یونانیوں نے کوئی بڑی شہنشاہی نہیں قائم کی مگر ان کی مستشرق آبادیوں نے مشرق کو یونانی رنگ میں رنگ دیا۔

رومی نوآبادیوں کا حال اس سے بالکل مختلف تھا۔ ان کی غرض رومی تسلط

۱۷۔ مقابلہ کردہ ہرمن (Herrmann) ”یونانی سلطنت کے آثار و قدامت باب ۴۰، جو تہذیب کی قدیم تر آباد کاری ابتدا ہی سے نئی سلطنت کی بنیاد نہیں ہوتی تھی مگر بعد میں تھوڑے ہی دنوں میں اس نے شکل اختیار کر لی“

اور اقتدار کی حفاظت اور توسیع تھی اور اس لئے مستقر سے ان کا تعلق سخت تابعدار نہ حیثیت میں قائم رہتا تھا۔ وہ نئی سلطنتوں کی بنائیں نہیں تھیں بلکہ ایک ہی قائم شدہ سلطنت کی توسیع تھیں۔

اب جدید آباد کاری اس سے بھی مختلف ہے اگر ہم یورپی سلطنتوں کی قائم کردہ زمانہ حال کی نوآبادی کے ابتدائے کار پر غور کریں، خاص کر امریکہ کی نوآبادیوں پر تو یہ واضح ہو جائے گا کہ ان سے براہ راست نئی سلطنتوں کی بنیاد نہیں پڑی بلکہ زیادہ تر ان کی غرض یہ ہوتی ہے کہ قدیم ملک کے تسلط اور تمدن کو وسعت دیجائے یا نئی اقتصادی ہستی پیدا کی جائے اور کبھی وطن کے جو روتندی سے بچنا بھی اس کا باعث ہو کرتا تھا جنوبی امریکہ کی نوآبادیوں کی دہشت گردی یورپ کی رومانی سلطنتوں سے اشمال کی نوآبادیوں کی نسبت زیادہ تھی۔ اس لئے کہ شمال میں آزادی کا ٹیوٹونی احساس اور قیام شخصیات کا میلان ایک بڑی حد تک آباد کارانہ آزادی کا باعث ہوا یا کم از کم یہ کہ اس آزادی کا موئد رہا۔ لیکن ان نوآبادیوں کی مابعد کی ترقی اور تباہی پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یورپی حکومت سے اپنی آزادی خود حاصل کی ہے اور اس طرح ان سے علیحدہ ہو کر آزاد سلطنتیں بن گئی ہیں۔ اس قسم کی نوآبادی کی نتیجہ مثال نیچے کی پیدا نش سے دیکھا جاسکتی ہے، جو ایک تابع رکن کی حیثیت سے خاندان کی افزائش کا باعث ہوتا ہے مگر جب وہ جسمانی اور عقلی ترقی کر جاتا ہے تو الگ ہو کر خود ایک نیا خاندان قائم کر لیتا ہے ازمنہ وسطیٰ میں ایک دوسری طرح کی ٹیوٹون سلطنت اکثر یوں واقع ہوتی رہی ہے کہ سلطنت کے مخصوص حصوں کو فرمانروایانہ حقوق عطا کر دئے جاتے تھے اس طور پر بادشاہ سے مخصوص فرمانروایانہ حقوق حاصل کر کے (بالتخصیص جرمانی، اضلاع، امارات، ممالک اور شہنشاہی امصار کا) ایک پورا سلسلہ قائم ہو گیا اور بتدریج ان کے حقوق بڑھتے رہے یہاں تک کہ بادشاہ کے لئے کسی قسم کی اصلی قوت باقی نہیں رہی، محض ایک ظاہری نوعیت رہ گئی۔ اس طرح جو ممالک ایک ہی سلطنت کے اجزاء تھے وہ صدیاں گزرنے پر آزاد سلطنتیں بن گئے۔ ان عطیات کی خارجی صورت اکثر خریداری یا قرض کے ذریعے سے شخصی حصول حق ہو کرتی تھی اور اس لئے یہ طریقہ موجودہ سلطنت کے لئے موزن نہیں ہے۔ ازمنہ وسطیٰ تک میں یہ لازمی شرط نہیں تھی اور اس لئے موجودہ زمانے میں علما یہ

انج اجدید

م فرمانروا
حقوق کا
عطا کرنا۔

ممکن ہے کہ کوئی سلطنت اپنے ممالک جن کے کسی حصے کو صاف طور پر یہ سمجھ کر کہ وہ اسے فرمانروایانہ حقوق عطا کرے گی اس طرح تربیت دے کہ وہ اس قابل ہو جائے اور اسے یہ حق عطا کر دے۔ انگلستان، کناڈا اور اپنے دوسرے ملحقات کے ساتھ اسی روش پر چل رہا ہے۔

۳۔ غیر ملکی
حکمران کی
نئے سلطنت

کسی نئی سلطنت کی بنا کا آخری طریقہ یہ ہے کہ کوئی غیر ملکی حکمران اسے قائم کرے، خاص کر فاتح جسکے حکم سے قدیم سلطنتیں برباد اور نئی سلطنتیں پیدا ہو جائیں نیو لینی حکومت کے دوران میں یورپ نے دیکھ لیا ہے کہ شہنشاہ کی مرضی سے متعدد سلطنتیں برباد اور ان کے بجائے نئی سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں مگر ایک آن واحد کی طاقت کے ان خود رایانہ مخلوقات کو کسی طرح کی حقیقی زندہ قوت نہیں حاصل ہوئی اور انھیں وجود میں آئے ابھی دیر نہیں ہوئی تھی کہ وہ از خود فنا ہو گئیں یا برباد کر دی گئیں یہ ایک بدیہی ثبوت اس امر کا ہے کہ محض سلطنت کی تمام صورتوں میں سب سے زیادہ نامکمل اور سب سے کم محفوظ صورت یہی ہے۔

پانچواں باب

سلطنتوں کا زوال

ساری زمین منہدم سلطنتوں کے کہندروں سے بھری پڑی ہے اور دنیا کی اب تک کی تاریخ سلطنت کے غیر فانی ہونے کے خلاف شہادت دے رہی ہے۔ جس طرح افراد میں موت کے اسباب مختلف ہوتے ہیں اسی طرح سلطنتوں میں بھی اس زوال کے مواقع اور اشکال مختلف ہیں، لیکن اس امر واقعی سے کہ تمام سلطنتیں بالآخر زوال میں آجاتی ہیں جہان کے فنا ہونے کے ایک مشترک سبب کو فنا بنا دیا کرتے ہیں۔ یہ سبب قوموں کی اخلاقی بستی میں نہیں مل سکتا کیونکہ زوال کے لئے اخلاق کی بستی نہ لازمی ہے اور نہ ہر ایسے موقع پر اس کا موجود ہونا ثابت ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بدست اخلاق والی قومیں اسی طرح مدتوں زندہ رہ سکتی ہیں جس طرح ایک بد اخلاق آدمی بسا اوقات بڑی عمر تک پہنچ جاتا ہے۔ حکومت کی خرابی کو بھی اس کا سبب قرار نہیں دے سکتے کیونکہ بہت سی سلطنتیں خراب حکمرانوں کی کئی کئی نسلوں تک زندہ رہی ہیں، نہ جیسا کہ کوئی نوسنہ حال میں دعویٰ کیا ہے۔ کسل کے اختلاط اور بستی میں یہ سبب نظر آتا ہے۔ اس امتزاج خون سے مہرت سی سلطنتوں نے عظمت و قوت حاصل کر لی ہے اور اگرچہ قومی نسل حقیقتاً بدل گئی مگر سلطنت بدابر سرسبز حاصل کرتی رہی۔ روم

فنا کی سلطنت
کا مشترک سبب
اس کی خرابی
فطرت میں
پیدا ہوتا ہے

انگلستان اور ممالک متحدہ امریکہ اس کی مثالیں ہیں۔ پس اصل سبب وہی ہے جو تمام دنیوی عضوی زندگی کے قانون عظیم میں پایا جاتا ہے کہ مرور ایام اسے ترقی دیتا اور اسے ختم بھی کر دیتا ہے قوموں اور سلطنتوں کی زندگی پر وہ خفا سے نکلتی اور جو کچھ اس کے اندر موجود ہے اسے بتدریج ظاہر کرتی ہوئی اپنے مقصد کو پورا کرتی اور فنا ہو جاتی ہے، یعنی زمانے کی نہ تھکنے والی ترقی اس سے آگے نکل جاتی اور اسے پیچھے چھوڑ دیتی ہے اس لئے کہ فرسودہ زندگی اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔

ترقی پذیر عالم انسانی کو کسی مخصوص سلطنت میں کامل اطمینان نہیں حاصل ہوتا اور وہ تمام سلطنتوں کو نکل جاتا ہے۔ اگر کبھی انسانیت کی وسیع بنیاد پر تمام نسل انسانی کی ایک عالمگیر سلطنت وجود میں آجائے تو ہم یہ امید کر سکتے ہیں کہ یہ سلطنت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک انسان خود باقی رہیں۔

سلطنتوں کے زوال کی خاص شکلیں ایک بڑی حد تک تکوین سلطنت کی صورتوں کے مقابل ہوتی ہیں اور بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ نئی سلطنتوں کے قائم ہونے سے پرانی سلطنتوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

قوم کی تنظیم کا عکس ہے قومی تنظیم کا فساد یا اس کا بکھر جانا۔ تنظیم کے بکھر جانے کی مخصوص صورت لاکھیت ہے۔ اگر اقتدار حکومت کا پاس دلخاکہ قوم میں باقی نہ رہے اور جس شخص کی نظر میں جو مناسب معلوم ہو وہ وہی کر گزرے اور کوئی شخص جماعت کے لئے نہ کسی طرح کی فکر کرے نہ اس کے لئے کسی قسم کا اہتمام کرے تو ایسے وقت میں سلطنت نفی کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ایک منظم قوم ایک غیر منظم انبوه میں تبدیل ہو جاتی ہے لاکھیت نہ صرف سلطنت کی موجودہ صورت کو بلکہ نفس سلطنت کو اٹھا دیتی ہے مگر ایسی قلمی اور دیر پا لاکھیت جو سلطنت کی موت کے ہم معنی ہو جاتی ہے، اقوام کی تاریخ میں نہایت ہی شاذ و نادر پائی جاتی ہے۔ زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ لاکھمی کیفیتیں صرف گزر جانے والی چیز اور ایک بخار کا مار مئی بحران ہوتی ہیں جن سے سلطنت کی زندگی خطرے میں ضرور پڑ جاتی ہے مگر اکثر یہ کیفیت نظام سلطنت کی ایک نئی حیثیت کی تیاری ثابت ہوتی ہے یہی وہ پر آشوب اور ہنگامہ خیز اوقات ہیں جنہیں آریائی قوموں کی عجیب خلعت کا اظہار ہوتا ہے۔ جس وقت کہ وہ چر غضب نفرت کے ساتھ سیاسی نظم

سلطنتوں کے
زوال کی
خاص خاص
شکلیں
قومی فساد یا
لاکھیت

کوالٹ دیتی ہیں اس وقت میں بھی وہ سیاسی ہستی کی لازمی سورتوں کی مطیع ہو جاتی ہیں اور جس حال میں کہ خیالات کی پراگندگی سے وہ لاجحکیت کی شہید الی ہوتی ہیں۔ اس حالت میں بھی وہ آنکھ بند کر کے ان سرگردہوں کی تقلید کرتی ہیں جو سب سے زیادہ بیباک اور سب سے زیادہ سخت گیر ہوتے ہیں۔ آزادی کے نقشے نہایت اور ساری قیدوں سے آزاد انجوهوں کے جنوں ٹھنڈی کے بالکل عجب میں آمر مطلق (Dictator) کے چہرے کے فولادی خط و خال دکھائی دیتے ہیں اور ندیم نظام سلطنت کے سہدم آثار پر قوم فوراً ہی اپنے لئے ایک نیا اور نشانہ پہلے سے بدتر سیاسی مسکن تیار کرتی ہے۔ جلیل القدر آریائی نسل تکی قومیں بھی غیر فانی نہیں ہیں مگر ہشک ان کی زندگی باقی ہے وہ اپنی ہستی کی سیاسی زندگی سے اس سے زیادہ بے نیاز نہیں ہو سکتیں جس قدر پچھلی پانی سے یا چڑیا ہو اسے بے نیاز ہو سکتی ہے۔ تمام تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ہے کہ ایک آریائی قوم سلطنت کے قیود سے مستلاً آزاد ہو گئی ہو یا خانہ بدوشوں کی حالت میں رہیں چلی گئی ہو۔ سوھویں صدی میں بازار اصطباغیوں نے سلطنت کے خیال کو اسی طرح کلیتہً مسترد کر دیا تھا جس طرح ہمارے زمانے میں اشتالی اسے مسترد کرتے ہیں مگر جب انھیں اپنی غیر سیاسی جماعت کے ناظم کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے بھی ایک سلطنت بنا کر کھڑی کی گو وہ کیسی ہی مضحکہ خیز نہ رہی ہو۔

۲۔ ترک وطن

جب کوئی قوم اپنے آبائی وطن کو ترک کر دیتی ہے (جیسے قیصر کے عہد میں اہل سوئزر لینڈ نے کوشش کی تھی) یا کوئی قوم اپنے وطن سے خارج کر دی جاتی ہے (جیسا کہ شہنشاہی روم کے زوال پر وحشیوں کے نفوذ کے دوران میں اکثر واقع ہوا) تو ان دونوں صورتوں میں سلطنت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور یہ اسر بالعموم غیر متیقن ہوتا ہے کہ آیا اس طرح اپنے وطن سے نکلنے والی قوم کسی دوسرے ملک میں پائدار حکمرانی کے حاصل کر لیتے اور اس طرح ایک نئی سلطنت کی بنیاد اٹھتے ہیں یا میاب ہو گئی یا نہیں۔

۳۔ فتح

کسی غیر ملکی طاقت کا کسی ملک کو فتح کر لینا اور کسی تاحال آزاد قوم کا مطیع کر لینا ایک نئی سلطنت پیدا کرنے کے بجائے زیادہ تر ایک قدیم سلطنت کا برباد کر لینا ہوتا ہے۔ نتیجہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ فاتح سلطنت میں کچھ اور زیادہ وسعت ہو جاتی ہے اسی طریق پر روم بہت سی سلطنتوں کو نگل گیا اور ان کے ملک اور آبادی پر اپنے

تسلط کو وسعت دیدی مگر ذر قوم کی اطاعت ظاہر میں رضا مند نہ ہوا کرتی ہے مگر بالعموم ضرورت اور مجبوری سے ایسا ہوتا ہے اور اس وجہ سے یہ محض استیلا کی ایک صورت ہوا کرتی ہے کامل اتحاد کے ساتھ ساتھ وہ سلطنتیں جو اتحاد میں شامل کر لی گئیں ناپید ہو جاتی ہیں، لیکن چونکہ اس وقت میں اسی اتحاد سے ایک بڑی نئی سلطنت پیدا ہو جاتی ہے جس کے افراد انہیں ناپید قوموں کے افراد کو شامل ہوتے ہیں اس لئے منقرض سلطنتوں کی جانب سے اپنی جد اگانہ ہستی کا ترک ایک رضا مند ان فعل قرار دیا جاسکتا ہے۔

۴۔ رضامندانہ
انجذاب

۵۔ رضامندانہ
جدائی اور
مجبورانہ تقسیم

چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے ایک بڑی مجموعی سلطنت میں جذب ہو جانے کا عکس ہے ایک شہنشاہی کا کئی سلطنتوں میں منقسم ہو جانا یا ایک سلطنت کا کئی مغائر سلطنتوں میں متفرق ہو جانا اول الذکر بلا کسی بیرونی دباؤ کے منظم طریقے پر اس طرح واقع ہو سکتا ہے کہ مختلف حصے یا مافیما اپنی خصوصیت کو زیادہ تسلیم کرتے جائیں اور بالآخر ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں لیکن آخر الذکر صورت بالعموم کسی غالب غیر ملکی قوت کے فعل سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جو اپنی روشن خیالی اور انسانیت پر نازاں تھا، پولینڈ کی تقسیمات (۱۷۹۳ء تا ۱۷۹۵ء) اس قسم کی ناجائز بردستی کی ہولناک مثال ہیں۔

۶۔ شاہی حقوق
سے دست کشی
یا ان کا ترک

بمطرح فرمانروایان حقوق کے عطیے سے نئی سلطنتیں بن جاتی ہیں اسی طرح ان حقوق سے دستکش ہو جانے یا ان کو ترک کر دینے سے موجود آزاد سلطنتیں تبدیل و اپنی سیاسی ہستی کو زائل کر دیتی ہیں۔ جرمان شہنشاہی کی تاریخ اس قسم کی سلطنتوں کے بننے کے طریقے اور فرانس کی تاریخ ان کے مٹنے کے طریقے کی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ فرانس کے ایک مرکز کی طرف رجوع ہو جانے سے بالخصوص پہلی یازدہم کے زمانے سے ایک ایک کر کے ذی اقتدار امارتوں کی ایک کثیر تعداد کو شکست کر دیا مگر جرمان نے بھی انقلاب کے وقت سے بہت سی چھوٹی ریاستوں کو بڑی سلطنت کے بالواسطہ تابع بنا کر ایسا ہی طرز عمل اختیار کیا ہے۔

چھٹا باب

تخیلی یا تخیلی نظریے

(۱) نام نہاد فطری حالت

۱۔ عہد زریں

فلسفیانہ تخیل اس کا مشتاق ہے کہ پہلے ایک ایسے عہد ابتدائی کا تصور پیدا کرے جب انسان بلا کسی قسم کی سلطنت کے رہتا تھا اور اس کے بعد یہ بحث کرے کہ انسان اس حالت سے سلطنت کی حالت میں کیونکر آیا۔ عوام کی قوت تخیل نے اس ابتدائی حالت کو مصوہیت کی اور فطری مسرتوں کے و فور کی خنداں و شاداں تھادیر سے مزین کیا ہے اور اس جنتی عہد زریں کا خواب دیکھتی رہی ہے جس میں ابھی خرابیوں اور نا انصافیوں کا دخل نہیں ہوا تھا اور سب کے سب اپنی پر امن مہستی سے غیر محدود و آزادی و خوشحالی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ ان تخیلات کے مطابق اس ابتدائی حالت میں کسی قسم کی ملک نہیں تھی۔ کیونکہ قدرت کی بہتات سے ہر شخص کو کافی طور پر وہ تمام چیزیں مل جاتی تھیں جو اس کے بے نقص اور غیر مکرر ذوق کے لئے ضروری تھیں۔ اس وقت تک درجہات بلکہ پیشیوں تک کا کوئی فرق نہیں تھا۔ ہر شخص دوسرے کے مانند تھا۔ نیز اس وقت میں نہ کوئی راعی تھا نہ کوئی رعیت نہ کوئی حاکم تھا نہ کوئی مسدیف تھا نہ کوئی فوج تھی اور نہ کسی قسم کا محصول لگتا تھا۔

ایسے تخیل کے مقابلے میں انسان کی مابعد کی سیاسی حالت لازماً ایک طرح کا خوب و تنزل معلوم ہوگی ایک ایسی طاقت کی ضرورت جو بدکاروں کی تحریف و تہنیہ کر سکے اور بکے

سلطنت
الکلابی
خرابی کی
حقیقت

استقامت کو خصل اندازی سے محفوظ رکھ سکے پہلے پہل اس وقت لاحق ہوئی جب لوگوں کو ان دباؤں سے سابقہ پڑا جن کا پہلے کہیں نام و نشان بھی نہ تھا، جب ان کے دلوں میں جذبات نے جھڑک کر نئے خطرات پیدا کر دیے اور جب ارتکاب جرائم نے ان کی رگوں کے سکون کو غارت کر دیا۔ پس لوگوں نے اگر سلطنت کو ایک ایسی خرابی نہیں بھی سمجھا جس کے اختیار کرنے سے کوئی مفرتہ تھا تو کم سے کم یہ ضرور تصور کیا کہ سلطنت ایک ضرورت اور مجبوری کی چیز ہے جس کے ذریعے سے خود اس سے بڑی ہوئی خرابیوں سے ہم محفوظ رہ سکیں گے۔

فطری حالت
جنگ کی
حالت عقلی

بہشت کے اس بچوں کے سے دل خوش کن تصور کے مقابلے میں دوسرے فلسفی اور اکثر شک مزاج فلسفی انسان کی قدیم غیر سیاسی حالت کو اس کی سیاسی حالت سے کہیں بدتر سمجھتے ہیں۔ ان کا خوف زدہ تصور اس غیر سیاسی حالت کو بجائے ایک خدائی امن کے ایک ایسی حالت جانتا ہے جس میں ہر شخص دوسرے جملہ اشخاص کے خلاف نامتناہی تنفر اور جنگ میں مبتلا تھا اور یہ فلسفی اگر سلطنت کو برا بھی سمجھتے ہوں تو بھی ان کے نزدیک یہ خرابی اس ابتدائی فطری حالت کے مقابلے میں جس میں انسان وحشی جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ (الف) زیادہ قابل برداشت اور کم تکلیف وہ ہے۔ اس فلسفیانہ خیال کو اس مذہبی تصور کی خوش آئند تصدیق بھی حاصل ہو گئی جو سلطنت کو بہشت کی نہیں بلکہ مہبوطیافتہ انسان کی تنظیم سمجھتا ہے۔

دونوں دہائیں
انسان کی
سیاسی فطرت
کو نظر انداز
کر گئی ہیں۔

یہ دونوں رائیں انسان کی سیاسی فطرت کو نظر انداز کر جاتی ہیں دونوں اس صداقت سے اغماض کرتی ہیں جسے اسطونے نہایت ہی خوبی سے ظاہر کیا ہے کہ انسان

علیہ شیکسپیر نے اپنے ڈراما "ٹمپسٹ" (Tempest) باب ۲ پر وہ اسطر ۱۴۰ سے ۱۴۱ تک میں بہت ہی نفیس جہو کی شکل میں اس حالت فطری کا نقشہ کھینچا ہے۔

(الف) (بائس کی ۱۴۰ سے ۱۴۱ کے موافق "لیویاتھن" (Leviathan) حصہ ۱۔ باب ۱۳۔ ۱۴ انسان کی فطری حالت (یعنی ملکی سلطنتوں سے خارج اس کی حالت) ایک دوسرے کے خلاف جنگ کی حالت تھی۔ اسپینوزا کا بھی یہ خیال ہے دیکھو (Tract Pol) باب ۲۔ ف ۴۱ انسان فطرتاً ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور باب ۵ ف ۲ انسان تمدن پیدا نہیں ہوتا مگر تمدن بن جاتا ہے۔ مگر بائس اور اسپینوزا کے

ساتواں باب

(۲) سلطنت چشتیہ میں ربانی

سلطنت کے ربانی تنظیم ہونے کا اعتقاد زمانہ قدیمہ و ازمنہ وسطیٰ و دونوں میں ہمارے ان وقتوں سے زیادہ پھیلا ہوا اور زیادہ قوی تھا مگر اس وقت بھی سلطنت کی اس ربانی بنا کے مختلف مفہوم سمجھے جاتے تھے۔

ایک خیال کے موافق قیام سلطنت خداوند تعالیٰ کا بلا واسطہ فعل یعنی زمین پر خدائی حکومت کا بلا واسطہ ظہور تھا۔ اسی خیال پر یہودیوں کی مذہبی سلطنت مبنی تھی اور اس کا منطقی نتیجہ ہمیشہ مذہبی سلطنت کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا ہے کیونکہ صرف یہی صورت اس کے لئے نوزد ہو سکتی ہے۔ اگر خدا نے سلطنت کو بلا واسطہ قائم کیا ہے تو یہ ایک طبعی امر ہے کہ وہ اسے براہ راست برقرار رکھے اور اس پر حکمرانی کرے۔

دوسرا خیال یہ ہے کہ خدا نے سلطنت کو بلا واسطہ قائم کیا اور وہ بلا واسطہ ہی اس پر حکومت کرتا ہے۔ اس خیال میں اہل یونان اور اہل روم دونوں غریک تھے ان کی سلطنتیں کسی اعتبار سے مذہبی سلطنتیں نہیں بلکہ اسلاف کا ملائسانی سلطنتیں تھیں۔ تاہم قدیم زمانے میں کوئی

عہد۔ اس مفہوم میں نیا دور نے اپنی تصنیف ”زمانہ انقلاب کی تاریخ“ ص ۲۱۱ میں اس سلطنت کو ”تظم قرار دیا ہے جسے خدا نے معین کیا ہے اور جواز دوجی اور پردری تعلق کے مانند انسان کی حقیقی فطرت سے تعلق رکھتی ہے۔ مگر یہ ایک ایسی تنظیم ہے

۱۔ خدا کا سلطنت
۲۔ بلا واسطہ
۳۔ قائم کرنا۔

۲۔ خدا کا
سلطنت
۳۔ بلا واسطہ
۴۔ قائم کرنا۔

کارروائی عامہ جس میں کچھ بھی اہمیت ہو بلا دعا اور قربانی کے عمل میں نہیں آتی تھی اور طیور سے فنگون لینے کے کام کو جس سے دیوتاؤں کی مرضی معلوم ہوتی تھی رومیوں کے قانون عامہ میں بہت بلند مرتبہ حاصل تھا ان میں انسانی آزادی اور تعین ذات کا احساس اس اعتقاد کے ساتھ ملا ہوا تھا کہ انسانی معاملات کی بہرہ ریزی خدا کے ہاتھ میں ہے اور جبکہ افراد کی قسمتوں میں دیوتاؤں کی طاقت واضح اور محسوس تھی تو وہ اسے اور بھی زیادہ بڑھ رہی سمجھتے ہیں کہ وہ اخلاقی جماعت جسے ہم سلطنت کہتے ہیں خدا کی مرضی اور اس کے فضل سے کسی طرح جدا نہیں کی جاسکتی علیہ تو کیا یہ دگ غلطی پر تھے؟ یہ بجائے خود مسلم ہے کہ عیسائیت سلطنت کو دینا کے خدائے انتظام و حکومت سے خارج نہیں قرار دے سکتی۔ عیسویوں کے خیال کے لئے یہ امر نہایت اہم ہے کہ جبکہ شہنشاہ نیز د عیسائیوں پر سلطنت کے لئے جو روئے کر رہا تھا اس وقت رسول پادلوں نے رومیوں سے ان مشہور الفاظ میں خطاب کیا تھا ”ہر شخص کو اس حاکم کے تابع ہونا چاہئے جس کا اقتدار اس پر ہے“ کیوں کہ کوئی حاکم نہیں مگر خدا کی طرف سے، اور اگر کوئی حاکم ہے تو وہ خدا ہی کے حکم سے ہے“ (پادلوں کا تیسرا ہواں خط رومیوں کے نام فقرہ ۱۱) اس لئے یہ پچھلے تعجب نہیں کہ ازمنہ و سطی کے سارے دور میں ہر ایک عیسائی سلطنت کے اندر فرمانروایانہ اقتدار خدا ہی سے حاصل شدہ قرار دیا جاتا تھا اور شہنشاہ کا اعلیٰ ترین اقتدار ہر کسی غیر کے واسطے کہ خدا ہی سے حاصل شدہ سمجھا جاتا تھا۔

ابقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ، جو اس عالم میں مکمل نہیں ہو سکتی سلطنت و اقتدا جس حال میں موجود ہے وہ سلطنت کے ربانی تصور کا صرف سایہ ہے۔

عہد ہارڈ (Haller) نے پلٹ مارک کا ایک نفس جملہ نقل کیا ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ ایک شہر کا بلازمین کے قائم کر لینا اس سے آسان ہے کہ خدا پر اعتقاد رکھنے بغیر سلطنت قائم کر لیا جائے زمانہ حال میں بھی دانشنگش اپنی دستاویز کی، کانگریس کی تقریر افتتاحی کا وہ کہتا ہے کہ ”نہایت نامناسب ہو گا کہ اپنے اس پہلے سرکاری کام میں اس خداوند قادر مطلق کے نسبت اپنی پر جوش افاعت کا ذکر کروں جو تمام عالم پر حکومت کرتا توہموں کے مشوروں کی بہرہ ریزی کرتا اور اپنی کار سازانہ امداد سے ہر انسانی نفس کی تلافی کر سکتا ہے۔ اسی کا فضل ہے کہ ممالک متحدہ کی آزادی و خوشحالی کے لئے ایک ایسی سلطنت، عطا ہوئی جسے خود اہل ملک نے ان اہم اغراض کیلئے قائم کیا ہے اور اس کے فضل سے یہ امید ہے کہ اس سلطنت کے نظم و نسق میں جلد رکارکن شامل ہیں ان میں

سلطنت کی
خدا کی رحمت
کے نسبت
بعض غلط
خیالات

جو نیاں سلطنتوں کے عروج و زوال کو دنیا کی ربانی حکمرانی سے متعلق کرتا ہے وہ کیسا ہی پرہیزگاری کیوں نہ ہو اور ہمیشہ اسکی اخلاقی اہمیت کیسی ہی اعلیٰ کیوں نہ سمجھی گئی ہو مگر میں کسی حال میں اس امر کو نظر انداز کرنا چاہئے کہ یہ از ابتدا تا انتہا ایک مذہبی خیال ہے۔ سیاسیات سے اسے تعلق نہیں ہے اور اس وجہ سے یہ خیال جب ایک سیاسی اور قانونی اصول قرار دیا جاتا ہے تو وہ غلطیوں اور خرابیوں کے پیدا ہونے اور ان کے شائع ہونے کا سبب بن جاتا ہے مثلاً

شاہانہ تعصبات

۱۔ اس میں شک نہیں کہ خدا نے انسان کو ایک سیاسی مخلوق بنایا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اسے اس امر میں آزاد رکھا ہے کہ وہ سلطنت کے اس خیال مرکوز کو اپنی خاص کوششوں اور اپنے فہم و ادراک کے موافق اپنے مناسب حال صورتوں میں عمل میں لائے۔ یہ ایک سخت غلطی ہے کہ سلطنت کی خاص خاص شکلوں کو مثلاً جمہوریت کو اس بنا پر رد کر دینا چاہئے کہ خدا دنیا پر مثل ایک بادشاہ کے حکومت کرتا ہے۔

دہمیتہ حاشیہ معصوم گزشتہ) سے ہر ایک کو وہ اپنے فرض کو کامیابی کے ساتھ ادا کرنے کی قوت عطا فرمائے گا میرا یقین ہے کہ تمام عام و خاص افعال نیک کے لئے خالق اکبر کے حضور میں اس اظہار اطاعت سے جس اپنے ہی احساس کو نہیں بلکہ اس سے زیادہ آپ کے احساس کو اور اس سے بھی بڑھ کر اپنے تمام مہم وطنوں کے احساس کو ظاہر کر رہا ہوں۔ ممالک متحدہ امریکہ کی قوم سے زیادہ کسی قوم پر اس پرشیدہ دست ایزدی کے اعتراف و تعظیم کا فرض عائد نہیں ہوتا جو انسانی معاملات کا بادی رہ رہے۔ ایک آزاد قوم کی حیثیت حاصل کرنے میں انہوں نے جو قدم اٹھایا اس میں خدائی مدد کا کوئی نہ کوئی نشان ضرور پایا گیا ہے۔ (سوانح عمری و اشعار جلد دوم مسندہ اسپارکس) دہمیتہ صفحہ نمبر ۲۹۸)۔ لڈوگ شاہ بویریا کے نظام سلطنت ۱۳۳۵ء کا نشانہ بھی یہ ہے۔ جو حکمرانی کے جلال اور اقتدار و الامان لایا گیا ہے وہ بلا واسطہ معصوم خدا کی طرف سے (یعنی پوپ کے واسطے سے نہیں) ہے اور انتخاب کرنے والے امریکہ انتخابی سے مقرر ہوا ہے اور سچا بادشاہ اور رویوں کا شہنشاہ تسلیم کئے جانے کا قطعاً مستحق ہے۔ آگس برگ کے اقرار ۱۵۲۳ء کا فقرہ ۱۶ یہ تعلیم دیتا ہے کہ دنیا میں جتنا کچھ اقتدار اور حکومت اور نظم و قانون ہے اسے خدا ہی نے بنایا ہے اور اسی نے قائم کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ تمام قانونی نظم خدا کی مرضی کا نتیجہ ہے۔

بادشاہ
بحیثیت
نائب خدا

۲۔ اس میں شک نہیں کہ اقتدار حکومت اصولاً و عملاً خدا ہی کے قبضہ قدرت میں ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا نے چند معین اور مخصوص افراد کو انسانی کمزوریوں سے بالاتر کر کے اپنے سے زیادہ قریب کر لیا اور انہیں گویا نیم خدا (یا اوتار) بنا دیا ہے نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ خدا نے انسانی حکمرانوں کو اپنا ذاتی قائم مقام بنایا ہے اور ان سلطنتوں کے حدود کے اندر انہیں بالکل اپنے مثل قوی اور مقتدر کر دیا ہے۔ اس قسم کے تصورات جو مذہب اور سلطنت کو غلط طوط کرنے سے پیدا ہوتے ہیں وہ ان لوگوں کی انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہیں جنہیں سلطنت کی حکمرانی کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ لوئس چار دہم کا یہ پر غور مقولہ کہ ہم بادشاہ اس ذات کی زندہ تصویریں ہیں، قدس و قداً مطلق ہے خدا کی شان میں گستاخی اور کسی زیر فرمان مخلوق کی (جس کا ہر فرد لوئس کے برابر ہے) توہین کرتا ہے۔

۳۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان شخصوں کی ذات سے علیحدہ جو اسے عمل میں لاتے ہیں اقتدار اعلیٰ بجائے خود فوق الانسان اور سیاست خداوندی ہے۔ انشائاً کہتا ہے، ”سلطنت کا اقتدار خدا کا اقتدار ہے“ نہ صرف اس معنی کر کہ تمام حقوق مثلاً ملکیت، ازدواج، اقتدار پدری سب خدا کے حقوق ہیں، بلکہ اس کے صاف اور قطعی معنی یہ ہیں کہ یہ خدا ہی کا فعل ہے اور وہی اس کو چلاتا ہے۔ سلطنت صرف اسی بنا پر حکمرانی نہیں کرتی کہ خدا نے اسے اقتدار دے رکھا ہے۔ جیسے باپ بچوں پر حکمرانی کرتا ہے

اختیار کا من
میث الاختیار
خدا ہی ہونا۔

عہ۔ دیکھو انشائاً کا ”نظریہ سلطنت“ (Staatslehre) کی دوسری اشاعت ج ۲، صفحہ ۴۷۷، ”ازمنہ وسطیٰ کے نظری تصور کے موافق عالم مسیحی کے سردار خود خدا کے قائم مقام ہیں اس لئے جملہ حکمران دپوپ شہنشاہ۔ بادشاہ اپنی ذات میں خدا کی طرف سے پورے اختیارات رکھتے ہیں۔“

عہ۔ دیکھو لوئس چار دہم کی تصانیف ج ۲، ص ۳۱۷، جہاں یہ تشریح بھی درج ہے، ”جس ذات نے انسانوں پر بادشاہ مسلط کئے ہیں اس کا منشا یہ ہے کہ بادشاہ کا احترام اس کے نائب کی حیثیت سے کیا جائے صرف یہ اعتبار ذات باری نے اپنے لئے رکھا ہے کہ حکمرانوں کے فعل اور ترک فعل پر محاکمہ کرے جو رعایا کی حیثیت سے پیدا ہوا ہے اس کو بے چون و چرا اطاعت کرنا چاہئے۔ یہی ہے حقیقت الہی۔“

عہ۔ ”نظریہ سلطنت ج ۲، ص ۴۳ دوسری جانب کے لئے میکا کے کی عبارت کو دیکھنا چاہئے جو اس کتاب کے مقالہ باب ۴ کے حاشیہ (۲) میں منقول ہے۔

بلکہ وہ خدا کی طرف سے حکمرانی کرتی ہے اور یہی باعث سلطنت کے نشان عظمت کا ہے۔ مگر ایسا کرنا فی الحقیقت حکومت مذہبی کے خیال پر واپس آجانا ہے اور اس کا نتیجہ عملاً یہی ہوتا ہے کہ حکمران خدا کا ذاتی قائم مقام سمجھا جانے لگے اور تمام مفروضات اور خرابیاں جو اس سے وابستہ ہیں وہ پھر پیدا ہو جائیں۔ یہ ایسا نیپال ہے کہ اسٹال خود اسے رد کرتا ہے۔ خود حضرت عیسیٰؑ نے یہ فرما کر کہ ”جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو“ نہایت ہی واضح اور قطعی طور پر سلطنت کی انسانی خصوصیت ظاہر کر دی ہے اور سیاسی اقتدار کو مختص خدائی حکمرانی کے مرادف کرنے کے ہر ایک خیال کو مسترد کر دیا ہے۔ اس لئے علم ایسا ست کا یہ طریقہ بہت اچھا ہے کہ وہ سلطنت کے وجود اور اس کے تنظیمات کو انسانی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔

خدائی حق

۴۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ایک قائم شدہ نظام سلطنت اور بالخصوص حکمران کی ذات یا اس کا خاندان اس اصول پر ناقابل تبدیل قرار دیدیا گیا ہے کہ موجود اوقات اقتدار خدا کی مرضی سے قائم ہوا ہے مگر تمام تاریخ عالم سے یہ ظاہر ہے کہ ہر دینی اشکال اور شخصی تعلقات کا ناقابل تبدیل ہونا ربانی حکومت عالم کا کوئی لازمی وجود نہیں ہے اور یاد لوں کی نصیحت کہ حاضر اوقات اقتدار کی اطاعت کرنا چاہئے بجائے خود تنظیمات سیاسی کا قابل تغیر ہونا بالسنی تسلیم کرتی ہے۔ سترہویں صدی میں نصیحت یقیناً بہت سے متورع انگریزوں کے دلوں میں ایک صداقتا نہ پہنچ دیا کہ اگر سکتی تھی کہ آیا جمہوریت کے نظم و جو کا مقابلہ کرنا اور اسے تخت سے اتار دینا درست ہو گا یا نہیں، مگر جب ولیم آرنج کو قوم اور پارلیمنٹ نے بادشاہ تسلیم کر لیا تو نہایت ہی محتاط اور باایکان مذہب پرست ٹوری کے لئے بھی اس کی طاقت کو مرضی خدا سمجھ کر اس کا احترام کرنا ممکن ہو گیا (الف)

غیر مذہبی

۵۔ ذمہ داری کے مسئلے کا بھی یہی حال ہے۔ جو اصول اوپر بیان ہوا ہے اس سے

(الف) [غیر معاہدہ ٹوریوں نے ولیم سوم کو بادشاہ تسلیم کرنے میں کوئی ایسی غلبت نہیں کی وہ اس رائے پر قائم ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص علما بادشاہت پر قابض ہو وہ قانوناً بھی بادشاہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہینلی نے محتاط مذہبی ٹوری کا یہ خیال ”کہ ذات برے سے اخذ کیا ہے۔“ انگریزی مترجم۔]

یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مدبرین جن کو بہت کچھ تفویض کیا گیا ہے اور بادشاہ جن کو اقتدار عطا کیا گیا ہے اپنے فضل اور ترک فعل کے لئے خدا کے سامنے ذمہ داریاں گراں اصول سے اس مزید سوال کا کوئی فیصلہ نہیں ہوتا کہ یہ لوگ کسی انسانی منصف کو بھی جوابدہ ہیں یا نہیں اور ہیں تو کس حد تک یہ سلطنت کی اعلیٰ ترین طاقت کے لئے انسانی منصف کے روبرو عدم جوابدہی کا دعویٰ اس وجہ سے نہیں کیا جاتا کہ وہ مخصوص ربانی طاقت ہے بلکہ یہ دعویٰ محض اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ وہ سب سے فائق طاقت ہے کسی مدبر کو اس اعتقاد کے بہرہ سے پر کہ خدا قوموں اور سلطنتوں کی قسمت کو معین کرتا ہے اور اس اعتماد پر کہ خدا کی حکومت ہر حال میں اچھی ہی ہوتی ہے یہ نکرنا چاہئے کہ خدا کو پھنسا کر آپ دامن جھاڑ الگ ہو جائے۔ اس سے تو اور زیادہ یہ لازم آتا ہے کہ وہ اپنی ذمہ داری سے اس وقت تک بری نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنی بہترین طاقت سے ایمان داری کے ساتھ اس کام کو پورا کرے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے۔

فقہ بنیات
ایزی کی گیت

تعلیق۔ بادشاہوں کے لقب کے ساتھ فقہ "بنیات ایزدی" کا جو طرہ لگا ہوتا ہے اس کی تاریخ قابل توجہ سے مختلف اوقات میں اس کا مفہوم مختلف رہا ہے۔

الف ایہ فقرہ بالخصوص ازمنہ وسطیٰ میں استعمال ہوتا تھا جو بزرگی بادشاہ فخرت ذیل اول بدل کے استعمال کیا کرتے تھے: "بفضل خدا"، "خدا نے نگہبان کے حکم سے"، "خدا نے مہربان کے فضل سے"، "خدا کے رحم و فضل سے"، "مرحم ربانی سے" اس زمانے میں ان فقرہ کا مفہوم صرف اس قدر ہوتا تھا کہ بادشاہ کی طرف سے خدا کے حضور میں عاجزانہ تقدیس اور مذہبی اتمان کا اظہار ہو کیونکہ وہ اپنی ذاتی رفعت کو خدا ہی کی طرف منسوب کرتے تھے۔ شاہ چین جسے ایک انقلاب کی وجہ سے بادشاہی حاصل ہو گئی تھی ان متداول فقرہ کا استعمال اسی طرح کرتا تھا جس طرح اس کا میثا چارلس اعظم کرتا تھا۔

علامہ۔ لمارتین اپنی تصنیف "۱۸۴۸ء کا انقلاب" (Revolution de 1848) ج ۱، ص ۴۴۰ غراپنے متعلق کہتا ہے اور خوب کہتا ہے "لمارتین نے خدا اور انسانوں پر اس بار کو ڈالنے کی کوشش کی تھی اور اب اپنے نتئیں اس غلطی پر سخت ملامت کرتا۔ یہ نہایت سخت نا انصافی ہے کہ جو چیز خدا نے انسان پر عائد کی ہے یعنی ذمہ داری انسان الٹا اسے خدا پر ڈال دے۔ یہ گویا خدا سے لڑنا ہے۔"

فرانگی دور میں ان سے فرمانروایانہ قوت کا اظہار نہیں ہوتا تھا اساتذہ اور روسائے
خاقانہ اگرچہ قانوناً بادشاہ کے منتخب کردہ یا مقرر کردہ ہوتے تھے اور دنیاوی کاؤنٹ اگرچہ
شاہی عہدہ دار ہوتے تھے مگر یہ لوگ بھی اپنے القاب کے ساتھ یہ فقرے لگا دیا کرتے تھے۔
(ب) اجمالی رومی امتوں کی شہنشاہی میں یہ فقرہ اولاً اسی طریقے پر جاری رہا۔ پھر صرف
منتخب شدہ بادشاہ بلکہ ڈیوک اور کاؤنٹ جو بادشاہ کے ماتحت ہوتے تھے اور اساتذہ
اور روسائے خاقانہ سب کے سب یکساں طریقے پر عنایت ایزدی کو مسلم سمجھتے تھے۔ بعض
اوقات دنیاوی امر عنایت خدا کے ساتھ "عنایت شہنشاہ" کا اور مذہبی امر "عنایت پوپ" کا بھی
اضافہ کر لیتے تھے مگر آہستہ آہستہ یہ ہوا کہ عنایت خدا کے فقرے کے مخصوص معنی یہ سمجھے جانے
لگے کہ یہ اقتدار بلا تو سوا اور براہ راست خدا سے حاصل ہوا ہے اور کسی ماتحت کا حاصل
شدہ اختیار ایک شے خدا کا نہ ہے۔ اس فقرے کو ازمنہ وسطی کے اس میلان سے
بہت زیادہ مناسبت تھی کہ تمام اقتدار خدا سے حاصل ہوا ہے۔

(ج) "اصلاح" کے بعد لوگوں کے ماننے والے عالموں نے پادشوس کے اس قول کو کہ "جو قوت
اقتدار اس خدا کی مرضی سے قائم ہوئے ہیں" عیسوی متقدمت میں داخل کر دیا اور صاحبان
اقتدار کو خدا کا مقرر کردہ قائم مقام ثابت کرنے لگے۔ لوگوں کو خدا اس معاملے میں بہت زیادہ
آزاد خیال تھا اس نے ایک مرتبہ ہنری ہشتم شاہ انگلستان کو لکھا تھا کہ "تاریخ لوگوں کی جانب
سے عنایت ایزدی اہل کلیسا میں داخل ہے ہنری کو جو خدا کی عدم عنایت سے انگلستان
کا بادشاہ ہے" جن مذہبی عالموں نے محض الفاظ کو پکڑ رکھا تھا انہوں نے یہ خیال نہیں
کیا کہ رسول پادشوس نے یہ قول رومی شہنشاہ فیروز کی نسبت کہا تھا جسے رومی قوم کی طرف
سے اختیار حاصل ہوا تھا اور اس قول سے پادشوس کا اصل مقصد یہ تھا کہ اُن مذہب پرست
یہودی عنایت عیسائیوں کی رائے کی مخالفت کرے جو اس کا فر شہنشاہ سے متفق تھے۔
انہوں نے اس واقعے کو نظر انداز کر دیا کہ رسول پتروس نے جب عیسائیوں کو انسانی
حکومت کی اطاعت کی صلاح دی ہے تو اس کا بھی بالکل یہی منشا تھا پتروس باب
دوم درس ۱۳۔ وہ اس امر پر اناں تھے کہ وہ دنیاوی بادشاہوں کے خدائی اختیار
کے محافظ ہیں۔

(د) فرانس کے نوٹس چہارم اور انگلستان کے تیسرے دوں نے اس سے بھی

زیادہ قطعی طور پر نہایت خدا کو ایک سیاسی اعتقاد بنا کر بادشاہ کی مطلق العنانی کے لئے ایک اعلیٰ منظوری حاصل کرنا چاہی۔ ملک، خاندان، پارلیمنٹ، غرض تمام انسانی حقوق کے برعکس بادشاہ کے اقتدار کا بالخصوص خدا کی طرف سے ہونا چاہا جاتا تھا۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہی تھا کہ اسے اختیار مطلق حاصل ہو جائے یعنی وہ انسانی قانون کے دست رس سے بالاتر قرار دیا جائے اس اشارہ میں فرانسیسی طبقات نے بادشاہ کے سجناب اللہ ہونے کو از روئے قانون مان لینے سے انکار کیا اور انگریزی پارلیمنٹ نے اور بھی زیادہ زور کے ساتھ اس کی مخالفت کی۔ انگلستان کے انقلاب ۱۶۸۸ء اور فرانس کے انقلاب ۱۷۸۹ء نے اس مذہبی اصول کو قطعی طور پر مسترد کر دیا۔

(۵) اس اصول کے نہایت مسلم دشمن جرمنی کے اہل علم فیئین دوزف اور تھوماسیٹس تھے مگر اس کا سب سے زیادہ مخالف فریڈرک اعظم تھا۔ جس نے یورپی سیاسیات کی اس اصولی غلطی کو سمجھ لیا تھا۔

(۶) زمانہ حال میں اس مسئلہ نے اس غلط خیال کو از سر نو جامہ قبول پہنانے کی کوشش کی ہے اور مطلق العنان بادشاہ کی شخصیت کو مرجع اختیار قرار دینے کے بجائے اختیار کو فی نفسہ ایک خدائی حق بنا کر اسے از سر نو نظریہ سلطنت میں خفیہ طور پر داخل کر دینے کی کوشش کی ہے مگر یہ فعل عبث ہے۔ بنیائے جدید اس کمزور خیال کے بے نتیجہ رشحات سے ہرگز فریب میں نہیں آ سکتی۔

آٹھواں باب

(۳۰) نظریہ جبر

سلطنت تہری تسلط کا نتیجہ ہے اور اس کی بنا پر بادہ قوت رکھنے والے کے اتقاق پر ہے اکثر فلسفی اور ان سے بھی زیادہ مطلق العنان بادشاہ ہمیں ہی باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ اصول مومنوہ مطلق العنانی کے لئے مفید ہے کیونکہ اس سے ہر زیادتی حق بجانب ثابت ہو سکتی ہے مگر لفظ اب پسند جس وقت اپنی قوت حاصل کر لیں کہ علانیہ اسے آفاق کر سکیں تو ان کی غرض بھی اسی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ حق کو باطل کرنے والی جابرانہ قوت اکثر اسی کو پسند کرتی ہے۔ یہ ایک طرح کا ممانعہ ہے جو صرف طاقتوروں کو پسند ہے۔ وہ اس سے کمزوروں کو تباہ کر سکتے ہیں مگر انہیں دھوکا نہیں دے سکتے۔ جو شخص اس اصول کا حامی ہو وہی اس کے غریب میں آسکتا ہے۔ دوسرے اس غریب میں نہیں آسکتے کھاتا ہے کہ تاریخ سے اس رائے کی صداقت ثابت ہوتی ہے بیشک سلطنتوں کے قائم کرنے میں سادہ سے زیادہ جبر کا اظہار ہوتا ہے مگر اسے بہت کم ہوا ہے کہ بعض جابرانہ نقیض ہیں

علامہ پلٹارک نے اسوای کیلوس باب میں یہ خیال کیا تھا کہ ان کی زبان سے یہ نظریہ ادا کیا ہے کہ تمام قوانین میں سب سے قدیم تر قانون جو خدا سے لیکر بنائے گیا ہے وہی ہے قوی کو کمزور پر حکمران بنانا ہے

قوت نے خاص اپنے زور سے سلطنتیں قائم کر دی ہوں اور ایسا ہوا بھی ہے تو ایسی سلطنتیں کبھی وسیع اور دیر پا نہیں ثابت ہوئی ہیں۔ علی العموم نئی سلطنتوں کے قیام میں اگر قوت کو خاکہ جنگ کی صورت میں دخل ہوا ہے تو بھی یہ طاقت ہر طرح پر اسل دعوادی حق کے تابع تھی وہ خود حق کا مخرج نہیں تھی بلکہ اس نے صرف ان موانعت کو رفع کر دیا تھا جو حق بقعدا رسیدہ میں حائل تھے۔ قوت نے حق کو پیدا نہیں کیا بلکہ اس کی تائید کی اور اس کے تسلیم کئے جانے پر لوگوں کو مجبور کیا۔ تاریخ میں جہاں کہیں قوت اپنی دشمنانہ سختی کے ساتھ رونما ہوئی ہے وہاں یہی ثابت ہوا کہ اس میں کسی نئی چیز کے پیدا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے بلکہ وہ نئی بنائی چیزوں کے بگاڑنے کا اور موت و تباہی کا ایک آلہ ہے۔

یہ اصول موضوعہ شخصی آزادی کے خیال کا نہایت ہی سخت مخالف ہے۔ یہ ہول صرف آقا اور غلام کو جانتا ہے۔ آزاد شخص سے آزاد شدہ شخص مراد لیتا ہے۔ اسی طرح یہ اصول حق اور قانون کے خیال کا بھی سختی کے ساتھ مخالف ہے اس لئے کہ قانون میں رعیت اور اخلاق کو بہت زیادہ دخل ہے اور برخلاف اس کے اصول مذکور ظاہری قوت کی دشمنانہ برتری کو تخت حکومت پر متمکن کرتا ہے۔ طاقت محض کو حق کی خدمت گزار بنایا جائے۔ پس اگر وہ خود حق بننے کا ادعا کرے تو وہ اپنے مالک کے خلاف سرکشی کرتی ہے غلط

تاہم اس اصول کی غلطیوں میں بھی کسی قدر صداقت کا شائبہ مضمر ہے۔ سلطنت کے لئے جو اجزاء لازمی ہیں ان میں سے ایک جزو یعنی قوت کو یہ اصول نمایاں کرتا ہے اور مخالف نظریے کے مقابلے میں جو سلطنت کی بنا افراد کی آزادانہ مرضی پر قرار دیتا اور جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سلطنت کی اقتداری طاقت سلب ہو جاتی ہے یہ اصول گو نہ حق بجانب ہے۔ یہ اصول ظاہری صورت کی حقیقت اور لائق حالات پر زیادہ زور دیتا اور محض خیالی خوابوں کے

اس اصول
میں صدقیت
کا جزو

۱۔ اشٹ ہنر (علم الیاسات) ج ۱، ص ۳۱ میں نے اس بحث سے متعلق روسو کے اس نفیس متون کو نقل کیا ہے کہ "قوی سے قوی بھی اپنی قوت کا سکہ سلطنت کے مراعات میں نہیں بٹھا سکتا جس تک کہ اس میں یہ قابلیت نہ ہو کہ اپنی قوت کے غلبے کو قانون اور محکموں کی اطاعت شعاری میں مبدل کر سکے۔" (دیکھو روسو کی کتاب

"عہدہ معاشری" Contract Social ج ۱، ص ۲)

پورا کرنے کی عبت کو تشنوں کے خلاف (جہاں فطرتی قوتوں کے آپس میں تصادم ہوتا ہو متنبہ کرتا ہے۔

طاقت کے بغیر نہ کوئی سلطنت وجود میں آسکتی ہے اور نہ قائم رہ سکتی ہے۔ اندرونی اور بیرونی دونوں قسم کی ضرورتوں کے لئے طاقت کی حاجت ہے۔ طاقت جب پائدار اور دیرپا صورت پیدا کر لیتی ہے تو پھر وہ حق کے ساتھ واسطہ پیدا کرنا چاہتی ہے اور اکثر وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے یعنی وہ حق کے ذریعے سے خود کو تسلیم کرنا اور پاک اور محترم بنانا چاہتی ہے۔ حق کے بغیر قوی کا زور محض بہائم کا سا زور ہے وہ ایک بہیڑیا ہے جو بکری کو پہاڑ کر ٹکڑے کر ڈالتا ہے۔ مگر حق سے ملکر یہی زور انسان کی اخلاقی طبیعت کے سزاوار ہو جاتا ہے۔

نواں باب

(۴) نظریہ معاہدہ

فاسکر و سوس کے وقت سے اس نظریے کو بہت وسیع قبول عام حاصل ہو گیا ہے کہ سلطنت خالص معاہدہ ہے یعنی باشندوں کے آپس کے قرار و داد کا نتیجہ ہے۔ اس سے لوگوں کے عجیب و غریب عقائد مٹ گئے ہیں۔ ہر شخص اپنے تئیں ایک بانی سلطنت خیال کر سکتا تھا۔ یہ نظریہ ہر شخص کی خواہش کے موافق ہو سکتا تھا کیونکہ ہر شخص جس طرح چاہتا اس معاہدے کے شرائط کی تادیل کر سکتا تھا۔ فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں اس نظریے کو نہایت ہی ہلکے اقدار حاصل ہو گیا تھا۔ اس کی بدولت سے قدیم سیاسی صورت و اشکال شکست کر رہے گئے اور مختلف طرح سے جمعیوں کی گلیں کہ اس کو نہ پر ایک ایسی نئی عمارت تعمیر ہو جس سے ہر شخص راضی ہو سکے مگر کسی اس کو ششدر میں نہ کیا یا نہیں ہوئی لیکن اگرچہ یہ نظریہ اب اس قدر نہایت قبول اصول تصور کیا جاتا ہے تاہم اس سے قبل اس نظریے سے مطلق انسان حکومت کی حقیقت ثابت کرنے کا کام بھی بار بار لیا جا چکا تھا (الف)

معاہدہ
سلطنت
کا

(الف) یہ نظریہ کہنا چاہیے کہ اس کے لاک اور روسو نے نظریہ معاہدہ کو مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے اس کی رائے کے موافق بیوی یا تھن بابت انسان حالت فطرت سے حالت معاشرت میں صرف اس طرح

نظریہ جبر (قوت) کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کا عکس یہاں صادق آتا ہے۔ نظریہ جبر عام طور پر قوت کی مطلق العنانی کا سوید ہے مگر مستثنیٰ صورتوں میں انقلاب کے نتائج کے لئے اسے عذر واپس کر سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے، نظریہ معاہدہ خصوصیت کے ساتھ لاکھیت کا معاہدہ ہے، مگر مستثنیٰ صورتوں میں وہ قلیل التعداد گروہوں کو دبانے میں مطلق العنان کثیر التعداد گروہوں کا مطلق العنان کثرت کے قوت پر زیادتی یا اطاعت پذیر مشنوں پر ظم کرنے کے معاملے میں فاتح کا وہ دگایا ہوتا ہے۔

یہ نظریہ اپنی ہمہ گیر صحت کا دعویدار ہے اس نظریے کی رو سے تمام سلطنتوں کا وجود میں آنا اور بعض امور کے لحاظ سے ان کا قائم رہنا بھی معاہدے پر منحصر ہے۔ مگر تاریخ میں جس نے

یہ نظریہ واقعات
تاریخی کے خلاف

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) آتے ہیں کہ وہ اپنے حقوق کسی ذی اختیار (بادشاہ) کو سپرد کر دیں (یہ ذی اختیار شخص ایک ہو، چند ہوں یا کثیر التعداد ہوں)۔ لاک (رسائل حکومت) کتاب دوم باب ۶ (میں) حقوق یعنی آزادی اور ملک کو ایسا قرار دیتا ہے کہ وہ حالت فطرت میں موجود ہیں۔ پھر ابتدائی اجتماع کے ذریعے سے حکومت کی ایک شکل قائم کی جاتی ہے تاکہ یہ حقوق محفوظ ہو جائیں (یہ بد نظر ہے کہ لاک اجتماع کا لفظ استعمال کرتا ہے نہ کہ معاہدے کا)۔ روسو کے خیال کے موافق انسان حالت فطرت سے حالت معاشرت میں معاہدہ معاشری کے ذریعے سے آتا ہے (یہی نظریہ ہاس کا ہے) مگر یہاں وہ قوی اختیار جسے سب اپنے حقوق تفویض کر دیتے ہیں وہ خود قوم ہے پس اس طرح ہر شخص بادشاہ بھی ہے اور رعایا بھی (دیکھو اس کی تصنیف معاہدہ معاشری)

(Contrat social) (ج ۱، باب ۶) یہ اقتدار فرامزدائی ناقابل انتقال ہے (جلد ۲، باب ۱) حکومت معاہدے سے نہیں قائم ہوتی (ج ۲، باب ۱) بلکہ حکومت صرف مرضی عامہ کو عمل میں لاتی ہے اس طرح ہاس کے قول کے موافق حکومت موجود اوقت کے خلاف ہے وہ بادشاہی کے مرادف قرار دیتا ہے کسی قسم کا انتظام حالت فطرت اور لاکھیت کی طرف بازگشت کرتا ہے اور یہ کسی طرح جائز نہیں قرار دیا جاسکتا لاک کے قول کے موافق انقلاب اس وقت حق بجانب ہو سکتا ہے جب حکومت اپنے کارمندان یعنی آزادی شخصی کی حفاظت کرنے سے معذور ہو جائے۔ روسو کے قول کے موافق انقلاب صرف وزارت (قوت عامہ) کا تفر ہے۔ عام خیال کے بالکل برعکس لاک حکومت اور رعایا کے کسی معاہدے کا مطلقاً کوئی ذکر نہیں کرتا اس کا نظریہ قریب قریب وہی ہے جو روسو کا ہے۔ ن۔ ایچ گرین کے تصانیف جلد ۲ ص ۲۱۶-۲۱۷۔ انگریزی مترجم]

مکمل سلطنت کے متعلق ہمارے لئے معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ مہیا کر دیا ہے ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس میں فی الواقع افراد کے باہمی قراردادوں اور معاہدوں سے کوئی سلطنت پیدا ہوئی ہو البتہ بعض منفرد مثالیں ایسی ہیں کہ دو یا زیادہ سلطنتوں کے درمیان ایسے معاہدے ہوئے ہیں جن سے ایک نئی سلطنت پیدا ہو گئی۔ ایسی بھی چند صورتیں موجود ہیں جن میں بادشاہوں یا سرداروں نے قوم کے مخصوص درجات یا طبقات کے معاہدے سے نئے نظام سلطنت قائم کر لئے ہیں مگر ایسی کوئی مثال نہیں ملتی جس میں تجارت یا بیسے کی کمپنی کی طرح ملک کے تمام رتبہ شہریوں نے شرکت باہمی سے کوئی سلطنت قائم کر لی ہو اس خیال کی بھی تاریخ سے کسی طرح تائید نہیں ہوتی کہ بقائے سلطنت افراد کے درمیان مسلسل تجدید معاہدہ پر منحصر ہے بلکہ بجائے اس کے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہر فرد کن سلطنت کی حیثیت سے پیدا ہوتا اور تربیت پاتا ہے اور قبل اس کے کہ وہ اس حد کو پہنچے کہ اپنی کوئی رائے قائم کر سکے اور اس رائے کو ظاہر کر سکے اس کی پرداخت نشوونما اور تعلیم معین قومی اور ملکی خصائص کے موافق پوری ہو جاتی ہے۔

پس تاریخ کی شہادت قطعاً اس نظریے کے خلاف ہے۔ جس زمانے میں معاہدہ معاشرتی کے اصول کے ماننے والے زیادہ سے زیادہ تعداد میں تھے اور یہ نظریہ اپنے اثر میں نہایت کمال تھا اس زمانے میں بھی اسے کبھی یہ قدرت نصیب نہیں ہوئی کہ فطرت کی واقعیت جس سے وہ متناقض تھا غالب آگیا ہو۔ یہ البتہ ہوا کہ قوم آزاد اور ہم رتبہ شہریوں میں منقسم ہو گئی تھی مگر قلت کی ابتدائی مجالس تک میں کثرت کے ساتھ میزان دہی اور کثرت اس طرح مال رہی گویا اس کی مرضی کو فوقیت ہے اور صرف اسی کی مرضی کو اقتدار حاصل ہے نظام سلطنت کو وضع کرنے والی عام مجلس (Constituent assembly) کے نسبت بیشک یہ خیال کیا گیا تھا کہ وہ ملک کے جملہ باشندوں کی قائم مقام اور ان کی پسند کردہ ہے اور اس کا مفروضہ کام یہ تھا کہ وہ بالاتفاق ایک نظام حکومت قرار دے اس میں بھی انفرادی معاہدے کے بجائے طریق کار نے یہ صورت اختیار کی کہ ایک متحدہ جماعت ہر کام کا فیصلہ کر لیتی تھی۔ لوگوں نے معاہدے کا ایک ”ہم“ پیدا کر لیا تھا اور خود اپنے کو اور دوسروں کو افراد کی مرضی کہہ کہہ کر وہ دے دیتے تھے حالانکہ کثرت سب کی طرف سے آلہ کار بن کر اختیار کو اس طرح کام میں لا رہی تھی کہ یہ اختیار رات اکشر ناقابل برداشت

ظلم کی حد کو پہنچ جاتے تھے۔

یہ نظریہ منطق کے کسی غلطی

یہ نظریہ جس طرح تاریخ سے غلط ثابت کیا گیا اسی طرح معقولی تنقید کے سامنے بھی وہ نہیں ٹھہر سکتا۔ یہ نظریہ معاہدہ کرنے والے افراد کی آزادی اور ان کی مساوات کو مسلم سمجھتا ہے مگر سیاسی آزادی جو یہاں پہلے ہی مان لی گئی ہے صرف سلطنت کے اندر ہی ہو سکتی ہے سلطنت سے باہر اس کا ہونا خیال میں بھی نہیں آ سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ انسان میں اس آزادی کا شوق بالکل اسی طرح موجود ہوتا ہے جس طرح اس میں سلطنت کے دلوے اور اس کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے مگر اس آزادی کا علی حصول سلطنت کے حضوری تعلقات باہمی کے باہر بر گز نہیں ہو سکتا۔ مزید براں اگر انسان سب برابر ہوتے تو سلطنت کبھی وجود میں نہ آ سکتی اس لئے کہ دیسا سی ہر مراتب کی غیر مساوات جس کے بغیر نہ کوئی حاکم ہو سکتا ہے نہ محکوم ہو سکتا ہے، سلطنت کے وجود کے لئے ایک لازمی شرط ہے۔ مزید براں اس نظریے کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ افراد کو معاہدہ کرنے والا فرض کرتا ہے۔ افراد اگر معاہدہ کرتے ہیں تو اس سے شخصی حقوق پیدا ہوتے ہیں سلطنتی حقوق ہر گز نہیں پیدا ہوتے۔ ایک منفرد شخص کی حیثیت سے کسی کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کی ذاتی املاک اور اس کا شخصی مقبوضہ ہوتا ہے۔ اس پر اسے پورا اختیار ہے اور اس کے متعلق وہ جو چاہے معاہدہ کر سکتا ہے۔ مگر معاہدوں کو سیاسی نوعیت اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتی جب تک کہ پہلے ہی سے افراد سے بالاتر ایک متحدہ الاغراض جماعت نہ موجود ہو کیونکہ معاہدہ اگر سیاسی ہوتا ہے تو وہ افراد کی ذاتی ہمسود سے بحث نہیں کرتا بلکہ جماعت کی عام ہمسودی سے بحث کرتا ہے۔

غرض کہ افراد کے باہمی معاہدے سے نہ کوئی قوم پیدا ہو سکتی اور نہ کوئی سلطنت، انفرادی مریضوں کے مجموعے سے کوئی مشترک مریض نہیں پیدا ہوتی۔ شخصی حقوق کتنی ہی بڑی تعداد میں کیوں نہ ترک کر دئے جائیں مگر ان سے کوئی حق عامہ نہیں پیدا ہوتا۔

ع۔ ر۔ سوسد ج ۱، ص ۱، ایک ابتدائی اتحاد رائے کو فرض کرتا ہے جس سے اس کے خیال میں بعد کو کثرت کا قانون پیدا ہوا، مگر یہ فرضی شکل بھی متناقض کو رنج نہیں کرتی۔

ع۔ ارسطو۔ "سیاسیات" (جلد ۲، ص ۱۱۰)

یہ نظریہ عملاً
خطرناک ہے

علی سیاسیات کے لئے یہ اصول نہایت درجہ خطرناک ہے کیونکہ یہ اصول سلطنت اور اس کی تنظیمات کو افراد کی حرص و ہوس کا ایک شگوفہ بنا دیتا ہے اور موجود الوقت افراد کی مرضی کے موافق اسے قابل تغیر قرار دیتا ہے۔ یہ قانون عامہ کے تصور کو تباہ کر دیتا ہے، باشندگان ملک کو غیر آئینی حرکات کے لئے اکساتا ہے اور سلطنت کو غایت درجے کی بے اطمینانی اور ابتری کے لئے وقف کر دیتا ہے اس لئے اسے ایک سیاسی اصول سمجھنے کے بجائے لاشعریہ کا نظریہ سمجھنا زیادہ موزوں ہے۔

تاہم اس میں
صدرا وقت کا
کچھ عنصر بھی ہیں

بائیں بہم اس نظریے میں بھی صداقت کا کچھ عنصر مضمر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نظریے کی غلطی سخت دہوکے میں ڈالنے والی اور نہایت ہی خطرناک ہے پھر بھی اسی کے اندر ایک ایسی سچائی بھی چمک رہی ہے جو ہر شخص کو دلھائی دے رہی ہے۔ اس نظریے کے مقابلے میں جو سلطنت کو محض فطرت کی پیداوار سمجھتا ہے یہ نظریہ اس امر واقعی کو ابھارتا ہے کہ انسانی مرضی سلطنت کی نگوین کو متاثر کر سکتی ہے اور اس کی ایسا کرنا ایک جائز فعل ہے خلاف عقل استبداد کے مقابلے میں یہ نظریہ انسانی آزادی کے حقوق کی حمایت کرتا ہے اور سلطنت پر یہ کہ مطابق عقل ہونے کو ثابت کرتا ہے۔

تعلیقات

۱۔ ارسطو کے اس مشہور جملے سے کہ سلطنت منفرد شہریوں سے اسی طرح سابق ہے جس طرح کل، جزو سے سابق ہے ”سیاسیات“، ج ۱، فصل ۲، فقرہ ۱۲، اس خیال کی تزیید ہوتی ہے کہ افراد سلطنت کو پیدا کر سکتے اور بنا سکتے ہیں۔ ایک سیاسی فرد یا شہری جسم سلطنت کا صرف ایک عضو ہے اور کل سے علاحدہ ہو کر اس کی کوئی ہستی عضو سلطنت کی حقیقت سے باقی نہیں رہ سکتی۔

۲۔ سلطنت کو افراد کی مرضی پر مبنی بنانے کی غلطی کا تعلق ایک دوسری غلطی سے ہے جو بہت زیادہ رائج ہے اور جس میں وہ لوگ بھی جو نظریہ معاہدہ کو مبتذل سمجھتے ہیں اکثر مبتلا ہیں یعنی یہ فرض کر لینا کہ حق یا قانون، آئین اور مرضی، ہی کا نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی آواز اور مرضی کو یہ قدرت ہے کہ وہ بعض حالتوں میں حق یا قانون کو وضع کرے، بدلے یا اسے نئی شکل میں ڈھلے لیکن حق و انصاف کا بیشتر حصہ نظم عالم فطرت انسانی اور حالات ماحول کے بموجب ازل سے متعین ہو چکا ہے اور انسانی مرضی اسے کلیتہً آزاد ہے۔ حق کا سب سے زیادہ حصہ وہ ہے جو ایجاد نہیں کیا جاتا بلکہ منکشف ہوتا ہے اور لوگ اسے تسلیم کر لیتے ہیں۔ وہ دستیاب ہو جاتا ہے، بنایا نہیں جاتا۔ قانون کے پیدا کرنے میں ”ہم چاہتے ہیں“ کے بجائے ”تمہارا فرض ہے“ زیادہ موثر ہے۔ جیگل نے حق کا استخراج مخصوص انفرادی مرضی سے نہیں بلکہ ”مرضی صادق“ سے کیا ہے جو انسان کے اندر مرکوز اور از خود قائم ہے، لیکن اس نے بھی

حق کی نوعیت کو صحیح طور پر سمجھا نہیں ہے گو کہ نظریہ معاہدہ کی غلطی کو اس نے پوزی طرح سے سمجھ لیا ہے دیکھو فلسفہ حقوق (Rechtsphilosophie) فقرہ ۲۵۸، ۳ ص ۱۱۰ (ڈوینو) کے شہری اور سونے اپنی قوت مناظرہ کے زور سے عام رائے میں نظریہ معاہدہ کو فتنہ کر دکھایا۔ ایک دوسرے سونے یعنی شہر برن (سوئٹزر لینڈ) کے پیرٹری لڈوگ فون ہلنے مروجہ عقیدہ قانون فطرت پر بہت شد و مد سے حملہ کیا اور نظریہ معاہدہ کو پوری طرح سے باطل ثابت کر دکھایا لیکن اسے اپنے طریق کے مثبت حصے میں جسے وہ ”رجعت“ کہتا تھا کم کامیابی ہوئی۔ اس کے اصول کو نظریہ قوت میں خلط ملط کر دینا اور اسے ہر طرح کی مطلق انسانی کاموئید سمجھنا حق بجانب نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح روسو انقلاب کا معلم ہے اسی طرح وہ جبت تہقیری کا معلم ہے۔ ہر سلطنت کی بنیاد اس فطری قانون پر قائم کرتا ہے کہ قوی تر مکران ہوتا ہے۔ ساری حکومت اور ساری ماتحتی کا انحصار وہ ایک کی فوقیت اور دوسرے کی ماحبت پر قرار دیتا ہے اسے وہ خدا کا ایک ابدی اور نہ بدلنے والا نظم جانتا ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ اس کے نزدیک قوت جبر کے ہم معنی نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں کے فرق کو وہ زیادہ تفصیل کے ساتھ یوں بتاتا ہے: ”قوت کو احساس فرض کے اس اخلاقی قانون نے محدود کر رکھا ہے جسے خدا نے انسانوں کے دلوں پر نقش کر دیا ہے جس کا اظہار بچوں کی قوت امتیازی سے اور نیز تمام قوموں میں تمام وقتوں میں ہوتا رہتا ہے وہ اخلاقی قانون یہ ہے کہ بدی سے بچو اور نیکی کرو اور کسی کو صدمہ نہ پہنچاؤ اور جو جس کا ہے وہ اسی کے پاس رہے دو قانون عدل اور قانون الفت طاقت کو تعدی کی شکل اختیار کرنے سے بچاتے رہتے ہیں۔ یہ دونوں قانون خدا نے انسان کے اندر جمادے ہیں وہ اس کی پیدا شدہ صفت ہو گئے ہیں اور وہ جا لگے اور لا بدی ابدی اور ناقابل تغیر ہیں۔ ہر شخص انہیں سمجھ سکتا ہے اور جس بلند ترین اور قوی ترین شخص کے تابع تمام انسانی قوانین ہوں اسے بھی کوئی شخص ان قوانین کی پابندی سے آزاد نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ قوانین نہایت ہی نرم اور نہایت ہی محبت آمیز بھی ہیں ان کی پابندی آسان اور ان کا بار ہلکا ہے۔ اس فرض شناسی کے قانون کی بنیاد نہ تو تمام قوم کی مرضی ہے نہ عام نفع کا خیال نہ کسی انسانی زیاتی کا خوف، بلکہ صرف خدا کی مرضی اس کی اصل ہے اور اس وجہ سے صاحب قوت پر اس کا پورا پورا اطلاق ہوتا ہے۔ اس سے کسی طرح بھی تجاوز کرنا تو کے ناجائز اشمال کی حد میں داخل ہو جاتا ہے خواہ اس کا ارتکاب کسی چھوٹے سے خاندان

کے بزرگ سے ہو یا کسی بڑے سے بڑے، بادشاہ سے۔ اس سے مدد و حمایت کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ عدل کا مطالبہ قوی سے اسی طرح ہونا چاہئے جس طرح کمزور سے۔ محبت اور بخشش طبیعت انسانی کا شریف تر جزو ہے اور انسان سے اس کی توقع کی جانا چاہئے۔ اعلیٰ ترین طاقت کی امکانی غلط روی کا کوئی چارہ کار انسانی انتظامات کے ذریعے نہیں ہو سکتا۔ بادشاہ کے مقابلے میں کوئی انسانی حکم نہیں ہے۔ سوا خدا کی مدد کے اور کوئی علاج نہیں ہے۔ بقول پلوٹارک کے خدا کا اعتقاد ہی تمام انسانی نظم معاشرت کا واسطہ و رابطہ اور عدل کا پشتیباں ہے۔ صرف مذہب ہی وہ شے ہے جو قوت کو اس کی حد کے اندر رکھ سکتی ہے اور کمزور کی تقویت کا باعث ہو سکتی ہے۔

ہلکر کے اصول و مسلمات کے خاص مباحث کو ہم نے اسی کے الفاظ میں ادا کر دیا ہے یہ عجیب بات ہے کہ وہ حق کو اور سلطنت کو عدل پر نہیں بلکہ قوت پر مبنی کرتا ہے اور اول الذکر کو ثانی الذکر کے لئے ایک مدد بنی سمجھتا ہے۔ اس کی رائے میں قوت اور صرف قوت ہی سے حق کا ظہور ہوتا ہے جس قدر قوت بڑھی ہوئی ہوگی اسی قدر حق بھی بڑھا ہوا ہوگا گو اس کے برخلاف اصلیت یہ ہے کہ قوت بجائے خود واقعتاً ضرور ایک شے ہے مگر قانوناً مسلم نہیں ہے۔ یہی سلسلہ خیال ہلکر کے سارے نظام استدلال میں جاری رہا ہے۔ طاقت واقعی کے احترام کی وجہ سے وہ اکثر قانون کی انتہائی اخلاقی خصوصیت کے دیکھنے سے باز رہ جاتا ہے، اعلیٰ ترین طاقت اور بادشاہ کے حق کو ہر طرح کی مداخلت سے محفوظ کرنے کی خواہش سے رعایا کی ان تمام کوششوں کی طرف سے جو اس اعلیٰ طاقت کے غلط استعمال کے خلاف ہوں اور اس کے عکس آند کو محدود کرنا چاہیں ایک طرح کی حقارت و نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہا جاسکتا ہے کہ انسانی تقاضوں کے مقابلے میں انسانی انتظامات کے ذریعے سے خدائی قانون فرض کی غلط کرنا ایک جرم ہے، اس لئے ہلکر تمام آئینی طریق کا مسئلہ مخالف ہے اور ازمنہ و سطلی کے اس خیال کی کہ شاہی ایک ملک ہے وہ نہایت غلو کے ساتھ تدوین کرتا ہے۔

[بہنجلی کی اس باب کی تنقید کے لئے فریڈلے کی علم معاشرت

ہم عصر (A. Fouillee La Science Sociale Contemporaine)

باب اول دیکھنا چاہئے موسیو توہایے معاہدہ معاشرتی کے نظریے کی اس
خیال سے حمایت کرتا ہے کہ اس سے کامل ترین سلطنت کا اظہار ہوتا ہے
انگریزی مترجم۔ ا

دسواں باب

(۵) انسان کی فطری تکمیل پذیری اور اس کی سیاسی احساس

سلطنت فطرت
انسانی کے
وجدان معاشری
سے پیدا ہوتی ہے

مروجہ تحقیقی نظریوں کا مسترد کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ ضرورت ہنوز باقی ہے کہ ہم سلطنت کے اشکال ظاہری کی متعدد ہمتوں سے ممیز اس ایک سبب کو دریافت کریں جس سے سلطنت کی تکوین ہوئی ہے۔ یہ مشترک سبب جو تمام تکوین سلطنت کی علت الفعل ہے جس انسان فطرت میں قضا ہے فطرت انسانی میں اس کے انفرادی اختلافات کے ساتھ ساتھ اجتماع و اتحاد کے میلانات بھی موجود ہیں یہ میلانات ترقی کرتے ہیں اور لوگوں (People) میں ایک قوم بننے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اس احساس کے مناسب حال ایک ظاہری صورت قائم ہو جائے۔ پس اس طرح معاشرت کا یہ باطنی وجدان ایک مردانہ خود اختیار کی حکومت کی صورت میں مشترک زندگی کا ایک بیرونی نظم پیدا کر دیتا ہے یعنی اس سے سلطنت کی شکل رونما ہو جاتی ہے۔

یہ معاشرتی وجدان
غیر قوتی درجہ
سے گزر کر قوتی
درجہ پر آ جاتا ہے

سلطنت بنانے کا یہ معاشرتی میلان ابتدا میں محض جبلت کی بنا پر عمل کرتا ہے اور اسے کو اس میں دخل نہیں ہوتا ہے۔ بہت سے لوگوں کی نظر میں ایک ساتھ کسی ایسے سردار پر پڑتی ہیں جس کی اعلیٰ ہمت اور دماغی قابلیت کے وہ قائل ہوتے ہیں اور اپنی جماعت کے اعلیٰ فرد کی حیثیت سے اس کی عزت کرتے ہیں اور وہ اس پر بہرہ و سامعی رکھتے ہیں

اور اس سے ڈرتے بھی ہیں۔ پس وہ اس کے تحت میں خود کو منتظم کرتے اور اس کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں۔ مگر تمدن اور تجربے کی ترقی کے ساتھ پوشیدہ وجدان بتدینج ظاہر ہونے لگتا ہے اور سلطنت کے لئے وقوف و ارادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک طبعی امر ہے کہ اولاً اس کا احساس قوم کے رہبروں اور سرداروں ہی کو ہوتا ہے ان میں سلطنت کا مستعدانہ وقوف اور اس کے لئے منتظم و موثر ارادہ پیدا ہو جاتا ہے مگر عام محکومین ہنوز سلطنت کے انفعالی وقوف سے آگے نہیں بڑھتے۔ آہستہ آہستہ یہ وقوف نظم معاشرت کے اعلیٰ جماعات و طبقات میں بڑھتا جاتا ہے اور بالآخر نیچے کے جماعات و طبقات میں بھی سرایت کر جاتا اور ان میں بھی فاعلی اور موثر حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

فطرت انسانی میں اس سیاسی میلان کا پہلے بلا وقوف اور بعد میں باوقوف حیثیت سے تسلیم کرنا سلطنتوں کی تاریخی آفرینش کے مخالف نہیں بلکہ اس کا واضح کرنے والا ہے طاقت رکھنے والوں میں اس سے غلبہ حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ کمزوروں میں یہ غلامانہ اطاعت کی صورت اختیار کر لیتا ہے مگر آزاد لوگوں میں یہ احساس خیمہ خوارانہ کے ذریعہ درخشاں اور اس اخلاقی خود شناسی سے ملبہ ہو جاتا ہے جو اجتماعی وقوف اخلاقی کے ہمنوا ہوتی ہے۔ صرف آزاد سلطنت ہی سچی سلطنت ہے کیونکہ صرف اسی میں وہ عام سیاسی جذبہ پایا جاتا ہے جو تمام طبقات قوم میں جاری و ساری ہوتا ہے

اس رائے میں جسے قدما بھی اس سے پہلے ظاہر کر چکے ہیں۔ وہ تمام صحیح خیالات شامل ہیں جو غلط غنیمتی نظریوں میں پائے جاتے ہیں مگر اس کے ساتھ ان کی غلطیاں اس میں داخل نہیں ہیں۔ سلطنت بالواسطہ زبانی ہے کیونکہ خدا ہی نے معاشرتی وجدان فطرت انسانی میں ودیعت کیا ہے اور اس طرح سلطنت کا عبور پذیر ہونا اسی کی مرضی سے ہوا ہے۔ پس ہمارے اس اعلان سے کہ سلطنت کی ابتداء کے کار انسان کے عمل واقعی سے ہوئی ہے، سچ مذہبی احساس کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔ مزید براں ہماری اس رائے

اس رائے میں وہ تمام صدائیں داخل ہیں جو مختلف نظریوں میں پائی جاتی ہیں

عہدہ۔ دیکھو اوپر باب (۹) تعلیق (۱) اور سسر کی کتاب ”جمہوریہ“ ج ۱، فقرہ ۲۵: ”قوم کا اولین مقصد لوگوں کا باہم جمع ہو جانا ہے اور یہ کچھ اس سبب سے نہیں کہ انسان کمزور ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ اس وجہ سے کہ وہ بالطبع اجتماع کی طرف مائل ہے۔“

میں قوت واقعی کی وہ اہمیت تسلیم کی گئی ہے جو تکوین سلطنت کے لئے لازم ہے کیونکہ حقیقی طاقت نظرت انسانی کے وجدان عام پر منحصر ہے۔ آخر میں 'مرضی' آزاد کے جرم کو بھی اس کے مناسب حقوق دے گئے ہیں مگر ہم منتشر انفرادی مرضیوں کے بجائے قوم یا سلطنت کی ایک مشترک مرضی کو تسلیم کرتے ہیں۔

قوم میں جس طرح اتحاد تنظیم کا میلان (جسے ہم سیاسی میلان کہتے ہیں) طبعاً پایا جاتا ہے اسی طرح اس اجتماعی مرضی کا تخم بھی اس کی سرشت میں مضمر ہوتا ہے یہ مشترک مرضی جب ظاہر ہوتی ہے تو وہ سلطنت کی مرضی بن جاتی ہے۔ برخلاف اس کے انفرادی مرضی اس حالت میں بھی انفرادی ہی رہتی ہے جب دو افراد باہم کوئی معاہدہ کریں اس لئے اس مشترک مرضی کے لئے مناسب لفظ معاہدہ نہیں ہے بلکہ اس سے اگر مستقل نظم مقصود ہے تو اسے اجتماعی قانون کہنا چاہئے، اسی طرح جیسے "حکم" وہ ہے جو ضبط انتظامی کی بنا پر ہو اور "فیصلہ" اسے کہیں گے جو نفاذ عدل کے لئے ہو سلطنت کے اندر وہ ذرائع عمل موجود ہوتے ہیں جن سے اجتماعی مرضی کو خود اپنا دتوف ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ارادوں کو مستحکم کرنے اور ان کے عمل میں لانے کے قابل ہو جاتی ہے۔

اس سلطنت کوئی ایسا انتظام نہیں ہے جس کی غرض صرف بدخواہشوں کو قابو میں رکھنا اور اگر ضرورت ہو تو روایات کی مصداق ہو بلکہ وہ ایک ایسا عمل نیک ہے جسے لازم و ضرورتاً ہونا چاہئے سلطنت ہی کے ظہور پذیر ہونے سے یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اقوام (Peoples)، اور بنی نوع انسان جو حیثیت مجموعی اپنے حقیقی باطنی اتحاد کو ظاہر کریں اور ایک آزاد اجتماعی ہستی پیدا کریں، سلطنت نظم مشترک کے اتمام اور جملہ امور عامہ میں حیات مشترک کی تکمیل کی تنظیم ہے۔

جب اس طرح دیکھا جائے تو سلطنت اولاً ایک انسانی اور ارضی ہی تشکیل معلوم ہوتی ہے مگر اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے کہ ہم ایک غیر مرمی کلیسا کے مذہبی خیال کے پہلو پہ پہلو ایک غیر مرمی سلطنت کا سیاسی خیال قائم کر دیں کیونکہ اول الذکر ایک طرح کا اجتماع جذبات ہے جو مذہبی طور پر متحد ہو گیا ہے اور ثانی الذکر وہ اجتماع جذبات ہے جو سیاسی طور پر متحد ہو گیا ہے۔ جس طرح اہل مذہب آسمان پر ایک زیادہ مکمل کلیسا کے ہونے کا ذکر کیا کرتے ہیں اسی طرح اہل سیاست

سلطنت ایک ضروری عمل نیک ہے

بھی دنیاوی سلطنت کو آسمانی سلطنت تک پہنچنے کا محض پہلا زینہ تصور کر سکتے ہیں۔
 مگر واقعی کلیسا کی طرح واقعی سلطنت بھی وہی ہے جس میں ہم رہتے اور
 کام کرتے ہیں۔ علم سیاست کو صرف اسی سلطنت سے بحث سے اور فطرت انسانی
 پر غور کرنے سے اس قسم کی سلطنت کی پوری طرح توضیح و تشریح ہو سکتی ہے۔

پانچواں مقالہ

سلطنت کی غایت

پہلا باب

سلطنت غایت ہے یا وسیلہ؟ کس حد تک غایت ہے اور کس حد تک وسیلہ؟

اکثر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ سلطنت غایت المرام ہے یا وسیلہ المرام یعنی سلطنت فی نفسہ مقصود بالذات ہے یا اس سے محض یہ غرض ہے کہ وہ افراد کے لئے حصول غایت کا وسیلہ ہو۔

نظریہ سلطنت
غایت المرام
ہے

قدما کا خاص کر یونانیوں کا نظریہ سلطنت انسانی زندگی کا بلند ترین مقصد سلطنت کو سمجھتا تھا اور سلطنت ہی کو کامل انسانیت تصور کرتا تھا۔ اس لئے اس کا میلان اس طرف تھا کہ وہ سلطنت کو فی حد ذاتہ غایت المرام سمجھتا تھا۔ اس کا جب سلطنت سے مقابلہ کیا جاتا تھا تو وہ محض اس کے اجزا معلوم ہوتے تھے، یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت سے علاحدہ بھی ان کے کچھ شخصی حقوق ہیں۔ جس طرح جسم کا ہر عضو مجموعہ جسم کی خدمت کرتا ہے اسی طرح سلطنت کا ہر فرد سلطنت کا خدمت گزار تھا۔ سلطنت افراد کی خدمت گزار نہیں تھی۔ اس لئے

لوگوں کے ذاتی مفاد بلا تامل سلطنت پر قربان کر دئے جاتے تھے، اور صاف تو یہ ہے کہ لوگوں کی ہستی اسی حد تک ضروری اور قابل قدر سمجھی جاتی تھی جس حد تک وہ سلطنت کے کام آسکتی تھی۔ اسی طرح ہر شخص کی آزادی، قومی آزادی کا محض ایک جزو سمجھی جاتی تھی اور جب کوئی شخص قوم و سلطنت کی بہبود عام کے خلاف اپنے خاص طریق پر آزادانہ چلنا چاہتا تھا تو نہ اس کی ہمت افزائی ہوتی تھی اور نہ اس کی حفاظت کی جاتی تھی۔

قدما کے اس اساسی نظریے کے بالکل برعکس ان انگریز اور امریکی مصنفین کی رائے ہے جن کا یہ دعویٰ ہے کہ سلطنت فی نفسہ مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ وہ محض افراد کے حصول بہبود کا ایک ذریعہ ہے۔ میکا کے نے اپنے تحریرات میں متواتر یہ دعویٰ کیا ہے کہ قدیم مدبرین اور مایا ویلی کی سیاسیات کا خاص نقص یہی ہے کہ یہ لوگ متاخرین کی طرح اس اصول اعظم کو تسلیم نہیں کرتے کہ نظامہائے معاشرت اور قوانین صرف شخصی خوشحالی کی مجموعی مقدار کے بڑھانے کے لئے ہیں۔ یہ فرقہ متاخرین، سلطنت کو محض ایک ایسی تنظیم یا کل سمجھتا ہے جس سے افراد کو اپنے جان و مال اور شخصی آزادی کی حفاظت حاصل ہوتی ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ ایک مصنوعی آلہ ہے جو اس غرض سے پیدا کیا گیا ہے کہ تمام یا کم سے کم اکثر افراد کی بہبود اور خوشحالی کو بڑھائے اور ترقی دے۔ لیکن کے زمانے سے لیکر اب تک نہ صرف ارباب سیاست نے بلکہ ان ارباب فن نے بھی (جنہیں محض نظریات سے بحث تھی) جوش کے ساتھ اس رائے کی حمایت کی ہے جو شخص سلطنت کو محض افراد کا ایک مجموعہ سمجھتا ہے وہ فی الواقع اس رائے سے انکار نہیں کر سکتا۔ میکا کے تو یہاں تک یقین کرتا ہے کہ جدید زمانے میں امور عامہ میں جو ترقی ہو رہی ہے وہ بیشتر اسی نظریے کے اثر سے ہے۔ روبرٹ فون مول اسے بالکل محال خیال کرتا ہے کہ انسان کو اور ایک ایسی تنظیم محض کو جو انسان کی بہتری کے لئے ہو یکساں اہمیت دیجائے۔

نظریہ سلطنت
وہی ہے

علی دیکھو میکا کے کے مضامین معمولی اشاعت صفحہ ۴۴ میں وہ مضمون جو اسے لکھا ویلی پر لکھا ہے۔ انگریزی مترجم

دونوں نظریے
یک نظر میں

میرے نزدیک ان قدیم اور جدید دونوں دعووں میں صداقت کا ایک عنصر ضرور شامل ہے مگر دونوں میں یہ غلطی ہے کہ وہ معاملے کے صرف ایک ہی رخ پر نظر ڈالتے ہیں اور دوسرے رخ کو نظر انداز کر جاتے یا اس سے انکار کرتے ہیں۔

یہ سوال کہ سلطنت وسیلہ ہے یا غایت ہے؟ ایک ایسا سوال ہے جس کا اسلوب ہی انسان کو صرف ایک رخ پر نظر کرنے اور اس سے غلطی میں پڑنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ ایک ہی شے ایک نظر سے دوسرے مقاصد کے حصول کا ذریعہ معلوم ہوتی ہے اور دوسری نظر سے وہ خود اپنی غایت ہوتی ہے۔ ایک تصویر اکثر کسی مصور کی معاش یا کسی تصویر فروش کے نفع کا ذریعہ ہوتی ہے لیکن ایک اہل فن کی نگاہ میں اس کا انتہائی مقصود صنعت کا اعلیٰ کام ہوتا ہے اس میں اسے اپنی حیات کا نہایت ہی نمایاں اظہار اور اپنے منتہائے خیال کا مجسمہ نظر آتا ہے اس اعتبار سے اس کی غایت خود اسی میں ہوتی ہے، اسی طرح بلا شک و شبہ مناکحت میاں بیوی دونوں کی انفرادی ضروریات زندگی کے پورا کرنے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے اور اس سے دونوں کے لئے زیادہ مسرت آمیز زندگی ممکن ہو جاتی ہے مگر وہی مناکحت ان دو جنسوں میں اتحاد بھی قائم کرتی ہے جنہیں فطرت نے ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے اور اسی اتحاد سے خاندان کی بنا قائم ہوتی ہے، یعنی اسی اتحاد سے ایک اعلیٰ مجموعی فرد بن جاتا ہے اور تمام ارکان خاندان کی انفرادی ہستی اسی کے تابع ہوتی ہے۔ خاندان کا ہر رکن اس امر پر آمادہ رہتا ہے کہ وہ اپنے شخصی اغراض و مرضی کا ایک حصہ اس اعلیٰ مقصد پر قربان کر دے جو مناکحت اور خاندان پر محتوی ہے۔

یہی امر سلطنت پر بھی صادق آتا ہے۔ ایک طرف سلطنت اپنے مشتملہ افراد کے نفع کا ایک وسیلہ ہوتی اور دوسری نظر سے وہ خود اپنی غایت المرام ہوتی ہے اور افراد اس کی ضرورت کے تابع اور اس کی

خدمت پر مجبور ہوتے ہیں۔

متقدمین کی یکطرفہ رائے نے قوم کے اندر افراد کو نظر انداز کر دیا تھا اور اس سے افراد کی آزادی و بہبود سخت خطرے میں پڑ گئی تھی اور اسکا بلا واسطہ نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کی قدرت مطلق کا تصور پیدا ہو گیا جو آسانی سے مطلق العنانی کی بتدل صورت میں تبدیل ہو گیا۔

اسی طرح متاخرین کی یکطرفہ رائے جنھیں درختوں کے کھڑے ہونے کی وجہ سے جنگل دکھائی نہیں دیتا سلطنت کی غمت و جلالت کے تسلیم کرنے میں ناکامیاب رہی اور اس طرح اسکا میلان یہ ہو گیا کہ سلطنت کو افراد کے ایک پریشان انبوه میں تحلیل کر دے اور اختلال سلطنت کی ہمت افزائی کا باعث ہو۔

متقدمین سلطنت کے اس اہم فرض کی طرف توجہ کرنے میں ناکام رہے کہ شخصی آزادی اور سواد اعظم کی شخصی بہبود کا ترقی دینا سلطنت کا فرض ہے۔ متاخرین ارباب سیاست یہ فخر کر سکتے ہیں کہ انھوں نے سلطنت کے اس فرض کو تسلیم کیا اور قدما کے یہ نسبت وہ اسے زیادہ وسعت کے ساتھ عمل میں لائے۔ موجودہ زمانے میں وہ حکومت ضرور حقارت اور نفرت کی مستوجب ہے جس کا طرز عمل یہ ہو کہ افراد کی بہبودی ایک گیند ہے جسے حکمران اپنی خواہش نفس کے موافق جدمرچا ہیں لڑھکاتے رہیں یا اسے محض اتفاقات زمانہ کے بھروسے پر چھوڑ دیں۔ اب یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ قانون اور اس کے عمل میں لانے والے افراد پر محض حکمرانی نہیں کرتے بلکہ وہ ان کی نہایت ہی ضروری اہم خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس زمانے کی بہت سی کار آمد اور نفع بخش تنظیمات کی اصل اسی خیال پر مبنی ہے۔ یہی وہ شے ہے جس سے ازمنہ جدید کی شخصی آزادی اور آزادی رائے کا پتہ چلتا ہے۔ عیسائیت نے اس سے مذہبی زندگی میں کام لیا اور یٹو ٹوٹیوں کے احساس قانون نے اسی کو افراد کی متسام قانونی ہستی پر

نظر کا خطرہ

نظر کا خطرہ

افراد کو جو خیال

عائد کیا۔

سلطنت
ایک
واقعی
ہے

مگر باوجود اسکے یہ دعویٰ کرنا ایک منطقی اور سیاسی غلطی ہے کہ سلطنت محض افراد کے ذاتی اغراض کے لئے ہے اور نظم و نسق سلطنت کی کوئی غرض سوا اسکے اور کچھ نہیں ہے کہ وہ افراد کی بہبود کا خیال کرے۔ اس قسم کا ادعا سلطنت کے اصلی جوہر ہی کو برباد کر دے گا اور قانون عامہ کو محض ”قانون شخصی“ کی ایک تہید بنا دے گا۔ جن قوموں میں مردانگی ہوتی ہے ان میں سلطنت کے خطرے یا ضرورت کے وقت ہزار ہا آدمی بارگراں برداشت کرنے اور اپنی جانوں اور اپنے خاندانوں کو خطرے میں ڈالنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس جذبہ ایثار کی تعبیر سوا اس خیال کے اور کسی طرح پر نہیں ہو سکتی کہ یہ لوگ سلطنت کی حفاظت و بہبود کو اپنی ذاتی حفاظت و بہبود پر ترجیح دیتے ہیں، اگر سلطنت صرف انفرادی اغراض کے پورا کرنے کا وسیلہ ہوتی، اگر قوم کی مجموعی زندگی افراد کی زندگی سے کوئی بلند تر حقیقت نہ رکھتی ہوتی تو پرانے وقتوں کے سوراؤں نے جو کارہائے نمایاں کئے ہیں وہ محض مجنوناہ حماقت سمجھے جائیں گے۔ قومی زندگی کو جب مشکلات شدیدہ و خطرات عظیمہ کا سامنا پیش آ جاتا ہے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سلطنت محض باہمی سہی کی کپنی نہیں ہے بلکہ کوئی اعلیٰ و ارفع شے ہے جس وقت وطن کی محبت کے شعلے بھڑک رہے ہوں اس وقت افراد کی خود غرضانہ حرص و ہوس جل کر خاک ہو جاتی ہے، اور عوام میں جب ایک مرتبہ سلطنت کی نسبت اپنے فرض کا احساس برانگیختہ ہو جاتا ہے تو اس سے ان کی طبیعتوں میں جوش اور خیالات میں رفعت پیدا ہو جاتی ہے۔

سلطنت افراد
کی بہبود قابل
تقریبی ہیں۔

جس طرح سلطنت اپنے اشخاص مشتمل کے مجموعے سے کچھ زائد شے ہے بعینہ اسی طرح قومی بہبود انفرادی بہبود کے مجموعے سے کچھ زائد ہے یہ صحیح ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک گہرا تعلق ہے اور یہ کہ عام طور پر ان کا عروج و زوال ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ اگر سلطنت کے سوا داعظم

کی انفرادی بہبود کم ہو جاتی ہے تو اس سے بالعموم سلطنت کی بہبود میں بھی سخت خرابیاں لاحق ہو جاتی ہیں مگر دونوں کی سمتیں اور راہیں ہمیشہ متوازی نہیں ہوتیں بعض وقت وہ ایک دوسرے کی مخالف اور بعض وقت بالکل ہی ایک دوسرے سے جدا ہو جاتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً سلطنت خود اپنی بقا یا اپنی آئندہ نسلوں کے مفاد کے خیال سے مجبور ہوتی ہے کہ اپنے موجود الوقت اراکین سے سخت مطالبات کرے یا ان پر بہت بھاری بوجھ ڈال دے۔ کبھی یہ بھی صورت پیش آ جاتی ہے کہ انفرادی بہبود سلطنت سے غیر معمولی امداد و تائید کی خواہاں ہوتی ہے اور اس سے سخت ذمہ داریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمیں زیادہ وقت نظر سے اس امر کو جانچنا چاہئے کہ کن حالات میں سلطنت انفرادی اغراض کا وسیلہ ہے اور کن حالات اور کن حدود کے اندر سلطنت خود اپنی غایت المرام ہے اور اپنے ارکان کو فرداً فرداً اپنی ضرورت کے تابع کرنے کا حق رکھتی ہے۔

دوسرا باب

سلطنت کی غایت کے متعلق غلط خیالات

نظریات میں اور اس سے بھی زیادہ عملیات میں اکثر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ سلطنت کی غرض یہ ہے کہ اعلیٰ طاقت حکمرانی کرے خاص کر بادشاہ اپنی رعایا پر حکمراں رہیں۔ اگر سلطنت کی غایت اسی حکمرانی کا برقرار رکھنا ہے تو اس خیال کا منطقی نتیجہ یہ نکلا جائے کہ حکومت جس قدر بھی ممکن ہو مطلق العنان اور وسیع ہو یعنی سیاسی کوشش کا آخری نتیجہ یہ ہو کہ ایک عالمگیر مطلق العنان بادشاہی بلکہ ایک عالمگیر خود سر پادشاہی قائم ہو جائے لیکن یہ منصوبہ ہم کو سلطنت کے حقیقی منہائے خیال تک نہ پہنچائے گا بلکہ اس کے ساتھ قومی آزادی اور انسانی قومی کی ترقی کا جمع ہونا ناممکن ہو جائے گا۔

اس تمام خیال کی بناء تو انسانی فطرت میں پائی جاتی ہے نہ ان معاشرتی تحریکات میں جو فطرت کی طرف سے انسان میں حریت کی گئی ہیں بلکہ جو کچھ ہے وہ حکمرانوں کی خود پرستی اور اپنی عظمت کو بلند کرنے کی مغرورانہ خواہش ہے۔

اوسطاً اپنے مشہور مقالے میں مدتوں قبل اس رائے کو ستر ذکر کیا ہے جس نظام

سلطنت سے محض حکمران کا نفع مقصود ہو وہ صحیح نظام سلطنت کی تحریف یا تحریب ہے۔ لوگ اسے بھلا دیتے ہیں کہ سلطنت کے اندر قوم بھی کوئی شے ہے یہ کہ رعایا بھی حکمرانوں ہی کی طرح کے انسان ہیں اور ان میں بھی وہی انسانی صفات، حیثیات اور قویٰ موجود ہیں جو حکمرانوں میں ہیں اور اس لئے یہ امر اصولِ نظرت کے بالکل منافی ہے کہ ایک حصہ تو تمام سیاسی حقوق کا تہنا مالک سمجھا جائے اور دوسرے کی غرض محض یہ سمجھی جائے کہ اس پر حکومت کی جائے یعنی وہ شخص جسے بجائے شے قرار دے دیا جائے۔ وہ ساری دلیلیں جو غلامی کے خلاف پیش کی جاتی ہیں اس مطلق العنانی کے خلاف بھی عائد ہوتی ہیں۔

اس میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا کہ حکمران طاقت، سلطنت کی ایک لازمی صفت ہے مگر وہ سلطنت کی غایت نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس وہ غایت سلطنت کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ حکمرانوں کے حفظ نفس کے لئے ایک حق ہونے کے بجائے حکمرانی ایک فرض ہے جو قوم کی جانب سے عائد کیا گیا ہے۔

اس لئے ضرورت ہے کہ نظام سلطنت کے ذریعے سے حکمرانی کی حدود تعریف معین کر دی جائے سلطنت کا وہ تصور جو امکانی حد کمال تک پہنچ سکتا ہے وہ مطلق العنان حکمرانی کا نہیں بلکہ آئینی حکمرانی کا تصور ہے یعنی آئینی حکمرانی باہمی حکمرانی کے مرادف ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک خاص قسم کی حکومت نیک نیتی سے قائم کی گئی مگر کچھ زمانہ گزرنے کے بعد وہ قوم کے تبدیل شدہ حالات کے موافق نہیں رہی۔ اس صورت میں صحیح حکمت عملی یہ نہیں ہو سکتی کہ سلف سے طریق حکمران جس طرح چلا آتا ہے اسی طرح بلا تغیر و تبدل برقرار رکھا جائے بلکہ ایسے وقت میں کوشش یہ ہونا چاہئے کہ اس ازکار رفتہ طریق میں اصلاح کر کے اس میں اور قومی زندگی کے دوسرے حالات میں ہم آہنگی پیدا کر دی جائے۔

مذہبی حکومت کے نظریے کے موافق سلطنت کی غایت یہ ہے کہ زمین پر خدا کی پادشاہی کا ظہور ہو جائے۔ انشائاً اللہ کہ سلطنت کا وہ اُسے فرض خدا کی خدمت کی بجا آوری ہے۔ سلطنت پر لازم ہے کہ خدا کی حکومت قائم کرے اور عدل، انتظام اور اخلاق جو معاشرتی زندگی کے لئے خدا کے احکام ہیں انہیں برقرار رکھے۔ از مرید علی

سلطنت کی غرض
خدا کی مرضی کو پورا
کرنا ہے

میں عیسائی اور مسلمان دونوں علی العموم اسی خیال کے متفقہ تھے۔ دنیا سے جدید اگرچہ اس رائے کی مذہبی اہمیت سے انکار نہیں کرتی ہے اور اس امر کو پوری طرح سمجھتی ہے کہ کیونکر دنیا کے تمام کاروبار کے طریقے ربانی نظم و نسق کی روشنی میں برگزیدہ نفوس پر ظاہر ہوئے مگر جس طور پر حکومت ربانی معاملات کی رہبری کے لئے کام میں لائی جاتی تھی اسے وہ قطعاً لغو اور مہلک قرار دیتی ہے۔

جس تشبیل پر مذہبی حکومت کے خیال کا دار و مدار ہے۔ یعنی پادشاہ ایک قوم پر اسی طرح حکومت کرتا ہے جس طرح خدا دنیا پر حکومت کرتا ہے وہ خود علانیہ غلط ہے۔ اس لئے کہ دنیا پر خدا کی حکومت مقید ہستیوں پر ایک طاقت علی الاطلاق کی یا مخلوق پر خالق کی حکومت ہے۔ پس وہ ایک ایسی حکومت ہے کہ ہم نہ اس کی کنہ کا پتہ چلا سکتے ہیں نہ اس کے ذرائع اور غایت کو معین کر سکتے ہیں۔ کسی قوم پر پادشاہ کی حکمرانی ایک انسان کی دوسرے انسانوں پر حکمرانی ہے جو اسی کے مثل ہیں اور جن کی زندگی کا منبع وہی ہے جو پادشاہ کی زندگی کا جن کے صفات اسی طرح محدود ہیں جس طرح پادشاہ کے صفات۔ پس محکموں میں بھی اس امر کی پوری قابلیت ہے کہ وہ انسانی نقطہ نظر سے پادشاہ کی نسبت ایک رائے قائم کریں اس لئے پادشاہ کو خدا سے تشبیہ دینا ہر اعتبار سے غلط ہے اور چونکہ اس سے غرور اور انتہائی خود بینی پیدا ہو جاتی ہے اس لئے یہ مضر بھی ہے۔ سلطنت کا مقصد وہ ہونا چاہئے جسے انسان تسلیم کر سکے انسانی فطرت کے مطابق اس کا تعین کیا جاسکے اور اگر بالکل نہیں تو جہاں تک ممکن ہو انسانی دسترس کے اندر ہو

یہ امر بالکل ہی مردود ہے کہ سلطنت کی غایت اس قوم اور اس ملک سے باہر قرار دی جائے جس پر سلطنت مشتمل ہے اور اس طرح وہ محض بیرونی اغراض کے حصول کا ایک وسیلہ بن جائے۔

پادریوں کی جماعت کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ کلیسا کی سلطنتوں کی ضرورت اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ رومن کیتھولک کلیسا کی آزادی و اقتدار کے لئے ایک پوپ کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے روم کا بااقتدار حکمران بھی ہونا چاہئے مگر وہ اس پر نظر نہیں کرتے کہ یہ استدلال خود ہی رومی مذہبی سلطنت کا واضح طور پر

سلطنت کی
غرض کی بڑی
مقصد کا مثل
کرنا ہے۔

بطان کرتا ہے اس لئے کہ اس سے ان سلطنتوں کی آزادی کا انکار واجب ہو جاتا ہے جو پوپ کے تابع ہوں اور اس حالت میں ان کی حیثیت ہی سلطنت کی نہیں باقی رہتی کیونکہ کوئی سلطنت جو اپنی مرضی پر عامل نہ ہو سکے اور قانونی حقوق سے دست بردار ہو کر کسی بیرونی طاقت کی غلام بن جائے سلطنت کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتی خواہ یہ بیرونی طاقت رومن کیتھولک کلیسیا ہی کی کیوں نہ ہو۔ پادری صاحبان یہ فرض کر لیتے ہیں کہ رومی قوم نے جس پر یہ سلطنت مشتمل ہے ایک مذہبی اور غیر سیاسی جماعت کے مفاد کے خیال سے سیاسی زندگی کو ترک کر کے سیاسی غلامی اختیار کر لی ہے مگر یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جو اس قوم کی طبیعت اور کلیسا کی مذہبی نوعیت دونوں سے یکساں طور پر منافی ہے۔

تاریخ عالم نے اس صریح ضلالت کے خلاف اپنا فتویٰ صادر کر دیا ہے۔ روم اب کیتھولک عیسویت کے تابع نہیں ہے جو خود ہی مختلف سلطنتوں میں منقسم ہے، روم کا تعلق اب رومی بلکہ ایتالوی قوم سے ہے اور اس ایتالوی قوم کے اجراء عناصر رومی ہیں۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ موجودہ زمانے تک میں اس غلطی کی متعدد مثالیں موجود ہیں مثلاً آسٹریا کی امارت کا وجود بحالات ظاہر اس جھوٹے سے گاموں اور اس کی مختصر آبادی کے لئے نہیں ہے، اس سے صرف ایک خارجی غرض پوری ہوتی ہے، وہ اسی امیر خاندان کی عزت و وقعت کا کام دیتی ہے جو ملک سے باہر آسٹریا کے شہنشاہی دربار میں رہتا ہے صاف ظاہر ہے کہ اس سلطنت کی غایت خود اس کے اندر نہیں ہے۔

تیسرا باب

سلطنت کے غایت المرام کی نسبت مکمل یا نیم آزادی

سلطنت کا مقصد
اشتیاق و مالک
کے حقوق کا محفوظ
کرنا ہے۔

کانٹ اور فیشے کے زمانے سے ایک مدت تک جرمانا میں یہ رائے قائم رہی کہ سلطنت کی اصلی غایت محض تحفظ حقوق ہے خاص کر اشخاص و املاک کا تحفظ حقوق۔ کانٹ نے ”نظریہ حقوق“ (Rechtslehre) فقرہ ۴۹-۴۰ میں تاکید کے ساتھ یہ کہا ہے کہ سلطنت کی سلامتی (یعنی اس کی غایت) باشندوں کی بہبود و خوشحالی میں نہیں بلکہ اس کے نظام سلطنت اور اصول قوانین کے تطبیق میں مضمر ہے۔ فیشے ”حقوق طبعی“ (Naturecht) ”تفصیل“ ص ۵۲ میں کہتا ہے کہ غرض اس کے حقوق کا تحفظ ہی عام مرضی (یعنی سلطنت کی مرضی) ہے۔ کانٹ کی اس رائے کو بنیاد قرار دے کر ولہلم فون ہبولٹ ”سلطنت کے میدان عمل“ کے نہایت ہی تنگ حدود میں کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ لبرونی و شمنوں اور اندرونی تنازعوں سے محفوظ رکھنا ہی ”غایت سلطنت“ ہے۔ خود ہماری اس انیسویں صدی میں جبکہ قومیت کا خیال اس درجہ قومی ہو گیا ہے اے اوے ٹوئیس اپنی تصنیف ”خیالات جدیدہ“ Mdrne Ideen ج ۲ ص ۹۱ میں اسی

(الف) [۱] نے اپنی کتاب ”آزادی“ کا طغرائے عنوان ہبولٹ ہی کی تصنیف حدود و فرائض حکومت

خیال پر قائم ہے کہ سلطنت کی غرض افراد کی حفاظت ہے۔
 یہ رائے گزشتہ صدی کے نصف آخر کی ہے۔ ان دنوں لوگوں کو
 ضرورت تھی کہ اس زمانے کی روشن خیال مطلق العنانی کے دنوں حکمرانی کے لئے کوئی اصولی
 حد قائم کریں یہ وہ فوراً کر چہ بھی خواہی پر مبنی تھا مگر لوگوں کے لئے ایک بارگراں اور شخصی آزادی
 کا تباہ کرنے والا اور بیہود عامہ کے عذر سے خاندانی زندگی اور آزادانہ ذرائع معاش
 اور ذاتی آمدنی کے انتظام میں دخل دینے کو حق بجانب سمجھنے لگا تھا۔ پس لوگوں نے
 یہ رائے قائم کی اس حد سے بڑھ ہی ہوئی حکمرانی کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنے کی
 بہترین تدبیر یہی ہے کہ تحفظ قانون کو سلطنت کی غایت قرار دیں۔ چنانچہ اس طرح کی محدود
 سلطنت کا نام ”قانونی سلطنت“ (Rechtsstaat) قرار پا گیا اور اس کے مقابل
 میں دوسری صورت جس سے لوگ متنفر تھے ”حسابی سلطنت“ (Polizeistaat)
 کہلائی۔ (ج)

غایت سلطنت کو اس طرح مقید کر دینے سے زندگی عامہ میں جو تنگی پیدا ہوئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ Spiere and duties of Govt سے یہاں آئے کے
 خیالات کے لئے اس کی تصنیف ”علم سیاست مدن“ کی کتاب خیم بھی دیکھنا چاہئے، لیکن عملاً سلطنت
 کے لئے بہت وسیع اختیارات جائز رکھا ہے ہر برٹے اسپنسر کی رائے کے مطابق یہ حدود اور بھی
 زیادہ وسیع ہیں۔ دیکھو اس کی کتاب انسان اور سلطنت کا مقابلہ“ (The Man

Vergus the State انگریزی مترجم)

اب [اس خیال کا سلسلہ قدامت یونان کے سفسطائیوں تک پہنچتا ہے۔ اسکو نے اپنی سیاسیات
 میں میکافرن سفسطائی کی زبان سے یہ ادا کیا ہے کہ قانون کا مقصد صرف حقوق باہمی کا تحفظ ہے وہ

باشندوں کو اچھا یا بُرا نہیں بنا سکتا۔ لاک نے بھی اپنے رسائل حکومت Treatises as

Government میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سیاسی اجتماع حکومت کا مقصد یا خود اسی کے الفاظ
 میں یہ کہ انسان جس وجہ سے سوسائٹی میں داخل ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ اس طرح سے ہر شخص اپنی ذات
 اپنی آزادی اور اپنی ملک کو زیادہ محفوظ بنا لیتا ہے۔ انگریزی مترجم۔]

ج (دیکھو پوپر پہلا مقالہ سا توں باب ص ۶۸) انگریزی مترجم۔]

وہ نہ موجودہ قوموں کے مذاق کے موافق ہوئی اور نہ ان کے ضروریات کو پورا کر سکی۔ اس میں کسی کو شک نہیں تھا کہ حقوق کا تحفظ قانونی سلطنت کے فرائض میں داخل ہے مگر موجودہ زمانے کی کوئی قوم یا حکومت اپنے سیاسی میدان عمل کے لئے ایسی تنگ وسعت پسند نہیں کر سکتی اس رائے کے بڑے حامیوں کو بھی ذاتی تجربے نے مجبور کر دیا کہ ان حدود سے تجاوز کر کے کلا اعلیٰ مقاصد کی طرف توجہ کریں۔ فہستے نے پہلے یہ دعویٰ کیا تھا کہ حفاظت ملک سلطنت کی بڑی غایت ہے مگر نبولین کی ہمہ گیر مطلق العنانی کے مقابلے کے لئے وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا گوکہ نبولیونی مطلق العنانی ملک کی حفاظت کے لئے کافی طور پر آمادہ تھی۔ اس دوران میں فہستے کا خیال ایک ایسی قومی سلطنت کی طرف مائل ہوا جو قومی جذبات کی ترجمانی کا کام دے سکے دل سلیم فون ہم بولٹ جب پر ویشیا کا وزیر تھا تو اس نے سلطنت کے مدارس کے ذریعے سے اہل پر ویشیا کی ذہنی ترقی کی کوشش کی گوکہ اپنے نظریہ میں وہ اس کی تردید کر چکا تھا یہہذا اس نے سلطنت پر ویشیا کی طاقت کو بھی وسعت دی حالانکہ قانون حقوق و جرائم کو نافذ کرنے کے لئے یہ طاقت پہلے ہی کافی تھی۔

اس خیال کے نقائص

فی الحقیقت تحفظ قانونی کا یہ اصول سلطنت کی غایت کو اور خالص کردہ زمانے کی مہذب سلطنتوں کی غایت کو کلیتہً ختم نہیں کر دیتا ہے یہ اصول ازمنہ وسطی کے خیالات کے زیادہ مناسب ہے جس میں خیالات شخصی قانون کے تصور سے زیادہ آگے نہیں بڑھے تھے۔

کسی قوم کی عینی قوت صرف پاس قانون ہی تک محدود نہیں ہے۔ سڑک نہر ریل۔ ڈاکخانہ وغیرہ کی سب سے بہت سی اقتصادی ضرورتیں بھی ہوتی ہیں جنہیں تحفظ قانون سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ صرف سلطنت ہی ان ضروریات کو پورا کر سکتی ہے لیکن اگر سلطنت کی غایت صرف تحفظ حقوق ہی ہے تو وہ ان کاموں کے کرنے کی جرات نہیں کر سکتی۔ ان کے علاوہ قوم کے اہم ذہنی اغراض بھی ہیں مثلاً قومی مدارس۔ مدارس علوم و فنون، صنعتی مدارس۔ ان کے لئے سلطنت کو فکر کرنا لازمی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ چیزیں شخصی دہم و خیال اور کلیسا کے خود غرضانہ اقتدار کے بھر دے پر جو ہمیشہ سلطنت کو زیر اثر لانے کی فکر میں رہتا ہے (جیو ٹرڈی جابیں)۔ ازمنہ وسطی میں چونکہ سلطنت کی نسبت یہ تنگ خیالی شائع تھی کہ وہ قانونی حقوق کے تحفظ کی ایک تنظیم ہے

اس کے نتائج

اس لئے اس زمانے میں ان اغراض سے بے پروائی برتی جاتی تھی۔
مزید براں قوم ایک سیاسی اہستی ہے جس کا منصب صرف یہی نہیں ہے کہ
شخصی حقوق کی حفاظت کے لئے قانون بنائے اور اس کو عمل میں لائے بلکہ سیاسی
حکومت اور آزادی کی ترقی کا نہایت ہی اعلیٰ فرض بھی اس پر عائد ہوتا ہے۔
سلطنت کی اس نامکمل تعریف کی جب حالات دائمی پر تطبیق کی جائے تو
اس سے نتائج ذیل ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

(الف) اقتصادی اغراض سے بے پروائی۔

(ب) عام ذہنی اغراض سے بے پروائی۔

(ج) قوم کے جذبات عامہ کا مفلوج اور مردہ ہو جانا اور اس باعث سے سلطنت
کا کمزور ہو جانا۔

(د) قانون کی خفیف اور رکیک کج بحیثوں کا رواج جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ
لوگوں میں مقدمہ بازی کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور یہ سلطنت کے لئے ہلکا ہے۔
جس طرح خیال سابق ضرورت سے زیادہ تنگ ہے اسی طرح دوسرا مروج
خیال کہ سلطنت کی صحیح نایت خوشحالی عامہ کا حصول ہے ضرورت سے زیادہ وسیع
ہے بیشتر انسان کی فراغ بالی کو سلطنت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بہت سے
مادی اسباب بھی ہیں جن پر انسان کی خوشحالی کا انحصار ہے مثلاً مکان، غذا، لباس
اور آمدنی یہ سب سلطنت کے ذریعے سے نہیں بلکہ افراد کی محنت اور جہد ہی سے
حاصل ہوتے ہیں۔ روحانی امور کی بابت جن پر انسان کی دماغی دولت اور خوشحالی کا
انحصار ہے یہ کلیہ اور بھی صادق آتا ہے۔ انسان کی ذہانت اور قابلیت، سلطنت
نہیں عطا کرتی ہے۔ یہ فطرت کے عطیے ہیں اور وہ سب میں یکساں ہونے کے بجائے
افراد کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ سلطنت کسی کو دوستی اور محبت کی سر میں مطالعہ علی
شاعرانہ مصورانہ تخلیق کا لطف، مذہبی اطمینان و تسلی یا خدا کے ساتھ روح کے تعلق
کی پاکیزگی و لطافت نہیں عطا کر سکتی۔

انسان اپنی تمام زندگی و ہستی کے اعتبار سے محض سلطنت کا ایک جزو نہیں
ہے بلکہ مختلف افراد اپنی اپنی طبیعت کے مطابق ایک مخصوص قابلیت اور خاص خاص

۲۔ سلطنت
کی غرض خوشحالی
عام کا حاصل
کرنا ہے۔

فرائض زندگی رکھتے ہیں سلطنت کی بنا قوم کے اجتماعی خصائص پر ہے، نہ کہ افراد کے اخلاقی طبائع پر۔ اس لئے اس کی غایت شخصی زندگی کی عام غایات پر شامل نہیں ہو سکتی سابق الذکر غلطی کی طرح اس غلطی کو بھی جب واقعی حالات پر تطبیق دیجائے تو اس سے سخت مضرت نائج پیدا ہوتے ہیں۔

اس خیال کے
مضرت نائج

(الف) سلطنت زندگی کے ایسے شعبوں میں دخل دینے لگتی ہے جو اس کی حکمرانی سے تعلق نہیں رکھتے اور جس حال میں کہ اسے خود کو شخصی آزادی کی حفاظت تک محدود رکھنا چاہئے، وہ قدر کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔

(ب) چونکہ سلطنت میں شخصی زندگی کے اُن شعبوں کے انتظام کی فی الحقیقت قابلیت نہیں ہوتی اس لئے شخصی خوشحالی کے مجموعے کو بڑھا دینے کی خواہش کے باوجود سلطنت اپنی نامتبی کی وجہ سے شخصی زندگی کے لئے نقصان رساں ہوتی اور اس کی فطری ترقی میں خلل ڈال دیتی ہے۔

(ج) چونکہ اس طرح سلطنت ایسے مقاصد کے لئے سعی کرتی ہے جن کا حاصل کرنا اس کے لئے ممکن ہی نہیں اور اس غلط سمت میں کوشش کر کے وہ اپنی قوتوں کو ضائع کرتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے اصلی اغراض سے ہٹ جاتی اور پیش افتادہ فرائض کے پورا کرنے میں اپنی قوت کا ایک حصہ ضائع کر دیتی ہے۔

قدیم زمانے کی سیاسی زندگی میں یہ غلطی سخت نقصان کا باعث ہونی گراٹھارویں صدی کی روشن خیال جماعت بھی اسی طرح سے بہک گئی موجودہ زمانے کے سیاسیات میں سلطنت کی غایت المرام کی زیادہ صحیح تعریف و تمجید ہونا چاہئے۔

چوتھا باب

سلطنت کی صحیح غایت

اگرچہ مختلف قوموں، ملکوں اور زمانوں میں مختلف طور پر عدل و آئد ہوا ہے مگر سلطنت کا تصور صرف ایک ہی ہے اس لئے باوجود اس کے کہ تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف صاحب سلطنت قومیں مختلف اغراض کے درپے رہی ہیں پھر بھی غرض مشترک کا اتحاد ان تمام مخصوص اختلافات کو قبول کر لیتا ہے مگر وہ ان سب میں ربط اور یک رنگی بھی پیدا کر دیتا ہے روبرٹ فون ہول کا یہ دعویٰ صحیح تھا کہ ہر قوم کا فرض ہے کہ اپنی مخصوص نوعیت اور ضروریات کے اعتبار سے مختلف اغراض کے حصول کی فکر کرے (انسٹیکو پیڈیا صفحہ ۲۲۱) مگر اس کے نظریے میں تنہا کی اس یک رنگی کی کمی تھی جو غلط خیالی سے روکتی ہے اور آج راہی کا انسداد کرتی ہے۔ برخلاف اس کے فون ہول کشین و درف جس نے اس موضوع پر خاص توجہ صرف کی ہے ہمارے اتحاد غایت سلطنت کو اغراض سلطنت کی مہنوائی کا نام دیتا ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس واحد اعلیٰ غایت سلطنت کی تعریف کس طرح کی جائے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ”عدل“ یعنی حصول مقصد قانون ہے۔ یہ تعریف ہمیں بہت ہی تنگ معلوم ہوتی ہے اور اگر قانون میں قانون عامہ اور قانون مین الا قوام دونوں شامل ہیں اور وہ افراد کے قانونی تحفظ تک محدود نہیں ہے تو یہ بجائے خود غلط ہے

سلطنت کی غایت
ایک ہی عام
غایت ہے

۲۔ ”عدل“ بہت
تنگ ہے

ملاحظہ ہو باب سوم۔ قانون مجملہ شرائط سیاسیات کے ایک شرط ہے اس کی غایت نہیں ہے۔ اقوام کی زندگی محض عدالتی زندگی نہیں ہے اقوام میں اقتصادی اور ذہنی زندگی بھی ہوتی ہے اور اس کے سوا طاقت قومی کی بھی ایک زندگی ہوتی ہے رومی جو باطلیج قانون کی طرف مائل تھے وہ بھی عدل کو سلطنت کی غایت اعلیٰ نہیں سمجھتے تھے۔

اخلاق زیادہ ضرورت سے پہلے ہے

ہیکل کا قول ہے کہ اخلاق اور قانون اخلاق کا عمل پیرا ہو نا سلطنت کی غایت ہے اور اس سے مدتوں قبل افلاطون کا بھی یہی قول تھا مگر وہ دو طاقتیں جسے اخلاق زندگی میں دمرتب ہوتی ہے یعنی خدا کی مرضی اور انسان کی روح انفرادی یا دونوں کی دونوں انسانی قدرت سے باہر ہیں۔ اخلاق کے حدود سلطنت کے حدود سے بہت زیادہ وسیع ہیں اور اگر سلطنت اخلاق کے نگران ہونے کی کوشش کرے تو وہ اپنے حدود مناسب سے تجاوز کر جائے گی اور اخلاق پر مضرت ڈالے گی۔

۳۔ حصول بہبود عام

رومی سلطنت کا اصلی فرض بہبود عام کو سمجھتے تھے ان کے دو فقرے "نئے عامہ" (Res publica) اور "مانیت عامہ" (Salus publica) زبان اور منطق

دونوں کے لحاظ سے آپس میں ربط رکھتے ہیں ان دونوں میں دہی واسطے جو جو ہر اور عرض میں یا قوت اور فعل میں ہے۔ غایت سلطنت کے اس کلیے کا مفہوم اکثر غلط سمجھا گیا ہے خاص کر اس وجہ سے کہ افراد کی حیثیت اجتماعی پر نہیں بلکہ ان کے انبواء پر یا مگر انوں کی بد احکامیوں پر زیادہ توجہ کی گئی ہے۔ بادشاہوں یا جاعتہا سے غالب کی طلق انسان خود مختاری کے عذر کے لئے بہت کثرت سے اس کا استعمال ہوا ہے اور پیرس کی مجلس تحفظ عامہ (۱۷۹۳ء تا ۱۷۹۵ء) کے ہولناک اعمال نے اسے بالکل ہی ساخط الاعتبار کر دیا ہے لیکن اگر سلطنت کے حدود طبعی اور خاص کر اس کے عدالتی انتظام اور نظم و نسق پر لحاظ کیا جائے اور امن حدود سے خارج امور جیسے افراد اور مذہبی جماعتوں کی آزادی زندگی میں دخل دینے سے پرہیز کیا جائے تو یہ فقرہ فی الحقیقت اعتراض سے پاک ہے کبھی اور کہیں کوئی بد برائیا نہیں ہو جس کی جدوجہد کا نصب العین اپنی قوم کی بہبودی نہ ہو اور ملک کا ہر محب وطن باشندہ اپنے وطن کی سلامتی کا جوش رکھتا ہے۔ اس لئے بہبود عام حکمت عملی کی ایک لازمی غرض ہے اور اس کا ترقی دینا بے شک و شبہ سلطنت کا خاص فرض ہے۔ غایت سلطنت کی اس تعریف میں قانون کا ارتقاء کمال

غلط نہیں ہے

اندونگنی کے عام تعلقات و حالات کی ترقی عمومی بھی شامل ہے اس میں قانون کا عمل درآمد بھی داخل ہے جو امن رفتار زندگی کے تحفظ کے لئے ضروری ہے اور جس سے جماعت کو نقصان پہنچانے والی زیادتیوں کی روک اور تادیب ہوتی ہے۔ رومیوں کے اس سیاسی اصول میں کہ قوم کی سلامتی سب سے بڑا قانون ہے غلطی یہ نہیں ہے کہ وہ زائد از ضرورت تنگ ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ سلطنت کی طاقت کو بہت پھیلاتا ہے اور اسے غیر متعلق امور پر وسیع کرتا ہے۔

ہم بڑے مشکلات
میں ناکافی ہیں

تاہم ایک نظر سے یہ فقرہ ناکافی ہے۔ اگرچہ معمولی اوقات میں سلطنت کی حکمت عملی یہ ہوگی کہ قومی بہبود کے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے مگر قوموں کی زندگی میں ایسے بھی اوقات آتے ہیں جب انہیں غیر معمولی فرائض سے سابقہ پڑتا ہے۔ ایسے حالات پیش آجاتے ہیں جبکہ افراد کی طرح سلطنت کو بھی اپنی ہستی اور اس کے ساتھ قومی خوشحالی کو نظر میں ڈال دینا پڑتا ہے۔ ایسے وقت میں جب وطن کا اقتضایہ ہوتا ہے کہ زندگی جب عزت کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی تو اس زندگی ہی کو خیر باد کہہ دینا چاہئے فرض کیجئے کہ ایک نہایت ہی قوی دشمن کسی چھوٹی قوم کو بہت سے خارجی فوائد دیتا ہے مثلاً وہ محصولات کم کر دیتا ہے امن کا تحفظ کرتا ہے ملک کے نظم و نسق کی حالت کو بہتر کر دیتا ہے پس اگر محض بہبود عامہ پر خیال کیا جائے تو اس شرط کا قبول کر لینا ہی قطعاً مناسب معلوم ہوتا ہے اور اس کے رد کرنے میں سلطنت کے مشکلات میں پڑ جانے بلکہ تباہ ہو جانے کا احتمال غالب ہوتا ہے مگر بائیں ہند اس آڑ سے وقت کا فرض بھی ہوگا کہ برصغیر خود غیر ملکی قوت کے طمع ہو جانے پر جان جو کہوں اور عزت کی موت کو ترجیح دے جائے اور شاید یہی دلیلہ انہ اور جانیانہ کو کشش آگے چل کے سلطنت میں از سر نو زندگی پیدا کر دینے کی نصاب ثابت ہو ہمیں ٹوٹکیس کے زمانے میں اہل اچھنز نے اس کی ایک بہت ہی شاندار مثال پیش کی ہے۔ بسا اوقات جب ہستی کا قائم رکھنا ممکن نہیں ہوتا تو اس کا ختم کر دینا ہی ہر طرح پر ضروری اور شایان شان ہوتا ہے۔ کاربج یا رد شکم کے عبرتناک خاکے پر افسوس ہوتا ہے مگر جو کچھ ہوا اس سے کوئی سہتر نہ تھا۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ جب کسی سلطنت کے باشندوں میں یہ قابلیت باقی نہیں رہتی کہ وہ اپنی مستقل ہستی کو قائم رکھ سکیں اور وہ لوگ قوم کی اعلیٰ تر مجموعی زندگی میں داخل ہونا چاہتے ہیں تو سلطنت کو فنا کر دینا پڑتا ہے کوئی بے تعصب جرمانی یا تالوی

ان چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے تباہ ہونے پر افسوس نہیں کرے گا جو بیکار اور بیکار
ہو گئی تھیں بلکہ وہ اس بات پر فخر کرے گا کہ ان سب سے بیکار ایک زیادہ وسیع اور زیادہ معتد
سلطنت بن گئی ایسی صورتوں میں ہمارا یہود عامہ کا کلیہ ناکافی ثابت ہوتا ہے
بجز اس کے کہ وہ نئی جماعت پر عائد کیا جائے۔

بیچ تمریف

لیکن اگر ہم سلطنت کا مختص و بلاد واسطہ مقصد اس اصول پر قرار دیں کہ قوم کی
قابلیتوں کا نشود نما تو فی زندگی کا کمال اور بالآخر اس کا تمام سلطنت کا غایت المراد ہے
تو یہ تمام اعتراضات رفع ہو رہے جاتے ہیں مگر اس کی لازمی شرط یہ ہے کہ یہ اخلاقی سیاسی
ارتقا اور نوع انسانی کے مقصد آخری کے خلاف نہ ہو۔ اس کلیے میں وہ تمام امور جمع ہو گئے
ہیں جو سلطنت کے موزوں فرائض قرار دیے جاسکتے ہیں اور جو امور سلطنت کی حد سے
باہر ہیں وہ سب خارج ہو گئے ہیں۔ اس میں مختلف اقوام کے مخصوص خیالات اور مختص
ضروریات کا لحاظ کیا گیا ہے اور اس طرح جہاں وہ غایت سلطنت کے اتحاد کو مضبوطی سے
قائم رکھتا ہے وہیں وہ اس کے مختلف طریق ارتقا کو بھی محفوظ کر دیتا ہے اور اس طرح
سلطنت کو خود ایک شخص تسلیم کر کے قوم کی پوشیدہ طاقتوں کو ترقی دیتا اور اس کی قابلیت
کو ظاہر کرنا اس کا فرض قرار دیتا ہے۔ لہذا سلطنت کے دہرے فرائض قائم ہو جاتے ہیں
اول قومی طاقتوں کا قائم رکھنا دوسرے ان کو کمال پر پہنچانا سلطنت پر لازم ہو جاتا ہے
کہ وہ عہد ہائے گزشتہ کے فتوحات کو محفوظ رکھے اور مستقبل میں انھیں وسعت دے
اس عام غایت کے اندر بعض خاص میلانات بھی داخل ہیں اکثر انھیں خاص
میلانات کے مطابق عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جاتی ہے اور کسی خاص قوم کے مخصوص حالات
کی بنا پر ایسا طرز عمل جائز قرار دیا جاتا ہے مگر یہ طریقہ سلطنت کے لئے بحیثیت جمہوری نظرات
سے خالی نہیں ہے اس کی کچھ مثالیں یہ ہیں:-

۱۔ یہ عام تمریف
خاص میلانات
پر حاوی ہے۔

۲۔ قومی طاقت
ترقی دینا ہے۔

(۱) سلطنت کی طاقت کا نشود نما سلطنت کو اپنی آزادی کے قائم رکھنے اور اپنے
احکام کے نافذ کرنے کے لئے طاقت کی ضرورت ہے صرف طاقت ہی سے سلطنت کی بقا
اور زندگی باقی رہ سکتی ہے مگر اس طاقت کی نوعیت اور مدارج کے لحاظ سے سلطنتوں
میں بڑا تفاوت ہے۔

(الف) عالمگیر طاقتیں (یا دول) ہم ان سلطنتوں کو کہتے ہیں جن کی اہمیت اور

حدود عمل ان کی خاص ملکیت سے بہت ہی دور دراز ممالک تک وسیع ہوں اور جو دنیا کے دو مختلف حصوں یا تمام عالم کی سیاسیات میں نمایاں حصہ رکھتی ہوں اور اس لئے ان کو ماری دنیا کے امن اور نظم و نسق کی فکر بھی ہو۔

(ب) بڑی طاقتیں (یا دولتیں)۔ بڑی طاقت (یا طاقتِ عظمیٰ) کے لئے ایک عالمگیر طاقت ہونا ضروری نہیں۔ لیکن کوئی عالمگیر طاقت ایسی نہیں ہے جو طاقتِ عظمیٰ نہ ہو۔ عالمگیر طاقت کے لئے ضروری ہے کہ وہ بحری طاقت ہو کیونکہ سمندر کے تعلق کے بغیر وہ دنیا کے معاملات پر اپنا اثر نہیں ڈال سکتی مگر کسی طاقتِ عظمیٰ کے لئے یہ شرط ضروری نہیں ہے۔ ایک بڑی طاقت بھی طاقتِ عظمیٰ ہو سکتی ہے جیسے جرانی شہنشاہی کی تکمیل سے پہلے پروسیا کی سلطنت تھی اسی طرح آسٹریا ہنگری ایک عالمگیر طاقت ہونے کے بجائے زیادہ تر ایک طاقتِ عظمیٰ تھی اور اب بھی ہے ایک طاقتِ عظمیٰ بھی اپنے خاص حدود ملک سے بہت دور دراز تک اپنے وسیع اثر کو کام میں لاتی ہے اور جس پر اعظم میں وہ واقع ہے اس کی حالتیں گراہم تغیرات واقع ہوں تو یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ نظر انداز کر دی جائے یا اس کی آواز پر لحاظ نہ کیا جائے اگر کسی وقت میں ان دونوں قسم کی سلطنتوں میں سے کوئی سلطنت نجی اپنی قوت کے بجائے استعمال سے دوسری جائز سلطنتوں کو پریشان کرے تو دوسری طاقتوں کو اس کے روکنے کا حق حاصل ہے۔

نیپولین اول کی سی اعلیٰ قابلیت کا شخص بھی فرانسیسی قوم کی طاقتِ عظمیٰ کا غلبہ تمام یورپ پر قائم نہ کر سکا اور اسی کو پیش کی ناکامی اس کے زوال کا باعث ہوئی اسی طرح روس کو اتنی قوت نہیں حاصل ہو سکی کہ وہ ترکی کو اپنا مطیع کر لیتا آسٹریا، ایتالیہ پر اپنی حکومت نہیں قائم کر سکے۔ انگلستان باوجود اپنی بحری فوقیت کے دوسری قوموں کی ہمسری کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

(ج) متوسط اور ضعیف طاقتوں (یعنی غیر جانبدار سلطنتوں) میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ ممالک غیر کے سیاسی معاملات میں زیادہ دخل دے سکیں وہ زیادہ تر اپنے اندرونی ہی معاملات میں مستغرق رہتی ہیں۔ ان سلطنتوں کی حکمت عملی اگرچہ بہت ہی مستدل ہوتی ہے مگر یہ حکمت عملی صرف اپنے ہی باشندگان ملک کے لئے خاص اہمیت نہیں رکھتی بلکہ اس اعتبار سے بھی اہم ہوتی ہے کہ وہ ہمہ گیر سیاسیات کی رفتار

محدود اور معتدل کر دیتی ہے۔

(۶) ہمارے زمانے میں جبکہ وسیع تر اور قوی تر سلطنتوں کے قیام کو ترجیح دی جاتی ہے، صحیح معنوں میں چھوٹی سلطنتوں کا وجود بہت ہی مشکوک اور غیر محفوظ ہے۔ انکی بقا صرف اسی طرح ممکن ہے کہ وہ کسی بڑی سلطنت کو اپنا محافظ بنالیں یا کسی قوی تر سلطنت سے ملجائیں مگر آرمینہ وسطیٰ کامیلاں اس کے خلاف تھا اور یورپ کی قوتوں خاصکر جرمانیوں اور ایتالیوں کا رجحان اس طرف تھا کہ جہاں تک ممکن ہو چھوٹے سے چھوٹا سیاسی اتحاد اختیار کیا جائے۔

کسی سلطنت کے لئے غیر سلطنتوں کے مقابلے میں اپنی طاقت کو بڑھانے کے دو ہی بڑے ذریعے ہیں ایک سیاسی فراست (ڈپلومیسی) دوسرے فوج (برمی اور بحری) جو سلطنت اپنی فوجی قوت اپنے ارکان کی جنگی ہمت اور اپنے سلاح جنگ کے قائم رکھنے کو اپنا خاص فرض سمجھتی ہو وہ جنگی سلطنت کہلاتی ہے۔ اس قسم کی سلطنتوں کی مثال یونانیوں میں اسپارٹا اور جرمانی شہنشاہی کے قیام کے پہلے سلطنت پروشیا تھی جب کسی سلطنت کو باہر سے خطرہ ہو اور وہ اپنے ضروری حدود تک پھیلنا چاہتی ہو تو اس کی جنگی قوتوں پر یہ غیر معمولی بار لادنا ہو جاتا ہے مگر ایک اوسط درجے کی سلطنت جو اپنی پوری ترقی پہنچ گئی ہو اسے کبھی اس امر کو خواہش نہ کرنا چاہئے کہ فوجی قوت اس کے اجراء کے کار کا صرف ذریعہ ہے، غایت نہیں ہے، اور اس قوت پر غیر ضروری بار ڈالنا سلطنت کے صحیح اغراض کے لئے مضرت رسان ہوگا

یا اغراض
(اقتصادی)

(۲) بعض اوقات اقتصادی اغراض کو خاص طور پر نمایاں جگہ دیا جاتا ہے چنانچہ جب باشندوں کا بڑا کام مویشیوں کی پرورش اور پرورش ہو تو سلطنت کو "سلطنت راعیہ" (Pastoral) اور زراعت سب سے اہم مشغلہ ہو تو "سلطنت زرعیہ" اور صنعت و حرفت پر دار و مدار ہو تو "سلطنت صناعیہ" اور تجارت اصل چیز ہو تو "سلطنت تجارتیہ" کہتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ یہ اغراض زیادہ تر خاص افراد کے ہوتے ہیں اور صرف جزدی طور پر تمام قوم کے اغراض میں شمار ہوتے ہیں مگر خاص اسی وجہ سے کہ لوگ انہیں میں کلیتہً یا غیر ضروری طور پر پہنچک ہو جاتے ہیں، سلطنت کے دوسرے اغراض کی طرف

سے غفلت پیدا ہو جاتی ہے اور تمام دیگر اغراض کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ علاوہ اس کے ایسی قوموں میں سیاسی جذبے کو کبھی پوری ترقی نہیں ہوتی بلکہ ذاتی اغراض کے محدود اور خود غرضانہ اہماک میں وہ خراب ہو جاتا ہے۔ ایک راعی سلطنت میں قوم غریب اور جاہل رہے گی۔ زرعی سلطنت میں لوگ اعلیٰ تعلیم و تربیت کو شک اور تنفر کی نظر سے دیکھیں گے، کیونکہ ان کے کام کے لئے طبعاً سختی پسند عادات کی ضرورت ہے۔ صناعی سلطنت میں تحت مزدوری کرنے والوں کی بد امنیاں اور اشیائے بیرونی کے اخراج سے خاص خطرے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور اعلیٰ ہند سلطنت تجارتی محض دکانداری کو اپنا منتہیائے خیال سمجھ کر رہے رہی ہیں۔

یا غرض ذہنی

۱۳۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی قوم کی زندگی خاص کر ذہنی و دماغی اغراض کی طرف مائل ہو اور اس سے ایسی سلطنت پیدا ہو جائے جسے ہم ذہنی سلطنت کہتے ہیں۔ یہ کلیس کے زمانے میں اسپارٹا کی فوجی سلطنت کی مقابل ایتھنز کی ذہنی سلطنت تھی ایتھنز کی ذہنی سلطنت اپنے شغف علمی اور اپنے باشندوں کے حصول علم کی قابلیت کا غیر فانی ثبوت اپنے بعد کی نسلوں کے لئے چھوڑ گئی ہے۔ فلورنس وینس اور ایشورپ میں ایسے دور گزرے ہیں جب ذہنی اغراض تمام دوسرے اغراض پر غالب آ گئے تھے۔ اس زمانے کی چینی سلطنت بھی اس کی ایک مثال ہے مگر اس کی ذہنی قابلیت ترقی کن نہیں رہی ہے بلکہ ساکت ہو گئی ہے اسی طرح زیورچ اور جینیوا دونوں کو اس امر پر غرہ ہے کہ وہ اپنے مدارس عامہ پر خاص توجہ کرتے ہیں۔ ان اغراض کے اعلیٰ و افضل ہونے میں کوئی شک نہیں مگر قوم کی دوسری طاقتوں کو نقصان پہنچا کر انھیں غیر معمولی ترقی دینا ایک مضر طرز عمل کی علامت ہے۔

یا آزادی کی
قانونی ضمانتیں

۱۴۔ بعض سلطنتوں میں خاص کام یہ سمجھا جاتا ہے کہ قومی اور انفرادی آزادی کی قانونی ضمانتوں کو ترقی دیا جائے اور اس طرح آزاد قانونی سلطنتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کی نمایاں مثالیں سوئٹزرلینڈ کے شمالی صوبجات اور شمالی امریکہ کی ریاستیں ہیں۔ جن کلیات کا اوپر ذکر ہو چکا ہے ان سب سے زیادہ یہی کلیہ غایت سلطنت کی عام خیال کی تہ میں موجود ہے۔

یا اتحاد قومی

ایک صورت یہ بھی ہے کہ جب قومیت کا احساس زیادہ قوی جوش کے ساتھ

سیاسی زندگی کو متاثر کر دیتا ہے اور چونکہ قومی اتحاد کا اظہار ہی سلطنت کی خاص غایت سمجھا جانے لگتا ہے تو اس سے قومی سلطنتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اگلے زمانے میں فرانس کا یہی حال تھا اور ہمارے زمانے میں سلطنت ایتالیہ اور جرمانی شہنشاہی پر ہی اثر غالب ہے۔ سلطنت کی اس لازمی اور بلا واسطہ غایت کے علاوہ جس کا تعلق خود قوم سے ہے سلطنت کے ان تمام با واسطہ فرائض پر بھی لحاظ کرنا چاہئے جن کا تعلق محض شخصی زندگی سے ہے اس موقع پر با تخصیص ضروری ہے کہ سلطنت کے حدود عمل کے لئے کوئی تعین قائم کیا جائے۔ سلطنت کے فرائض کی طرح افراد کے فرائض کا بھی یہ کلیہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ انفرادی خصوصیت و قابلیت کا ارتقا و اظہار ان کا کام ہے مگر اس کے ساتھ ہی خاندان قوم اور نوع انسان کے اغراض سے اس کا ہم آہنگ ہونا بھی ضروری ہے۔ ان فرائض کی انجام دہی کے لئے شخصی آزادی لازمی ہے۔ سلطنت کا پہلا فرض یہ ہے کہ شخصی آزادی کو ناجواب درست اندازی سے محفوظ رکھے اور خاص کر خود اپنی طرف سے اس شخصی آزادی کو محدود کرنے اور اسے مضطرب و پریشان کرنے سے بچتی رہے۔

سلطنت کے
بالواسطہ فرائض

عمل سلطنت
کی نہ بندی

ایک مقدم ضرورت یہ ہے کہ سلطنت خود اپنی نوعیت کے لحاظ سے جس طرح محدود ہے اس کا ایک صاف تصور قائم کر لیا جائے۔
(۱) سلطنت حیات عامہ کی ایک خارجی تنظیم ہے اس لئے اس کے قواعد عمل صرف انھیں اشیاء کے لئے ہیں جو خارجہ یا محسوس ہوتی ہیں واضح ہیں باطنی روحانی زندگی کے لئے نہیں ہیں جس کا اظہار کبھی الفاظ و اعمال سے نہیں ہو سکتا ہے اس لئے سلطنت کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ حیات انفرادی کے تمام اغراض پر محتوی ہو جائے کیونکہ اس زندگی کے بہت سے پہلو اور ایسے پہلو جو سب سے زیادہ اہم ہیں اس کی نظر سے مخفی ہیں اور وہاں تک اس کی طاقت کی رسائی نہیں ہے۔ افراد کے فطری عطیات سلطنت سے بالکل آزاد ہیں۔ سلطنت بیوقوف کو با عقل بر دل کی باہمت اور نابینا کو بینا نہیں بنا سکتی۔ دونوں میں محبت کے شعلہ زلن ہونے میں سلطنت کا کوئی دخل نہیں ہے وہ کسی پڑھنے والے کے خیال کا ساتھ نہیں دے سکتی اور روایات کی غلطیوں کی اصلاح کر سکتی ہے جس وقت افراد کی زندگی اور نمائش کر روحانی زندگی کا سوال پیش آ جاتا ہے سلطنت کو فوراً یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کی دور بینی اور طاقت ایسے حدود کے اندر بند ہیں جن سے وہ کسی

طرح کر نہیں سکتی۔

(۲) سلطنت کی بنیاد تمام تر انسان کی عام فطرت اور خاص کر اپنی ہی قوم کی عام فطرت پر قائم ہے اس لئے شخصی زندگی کی خالص انفرادی کیفیت پر اسے قابو نہیں مل سکتا بلکہ اس کا قابو صرف وہیں تک ہے جہاں تک کہ یہ زندگی انسان کی عام فطرت اور مشترک ضروریات کے تابع ہے۔ مثلاً سلطنت یہ کہہ سکتی ہے کہ تمام لوگوں کے لئے کسی مادی شے یعنی ملک کا قبضہ مساویانہ طور پر محفوظ کر دے مگر اس ملک کا مصرف و انتظام اسے افراد ہی پر چھوڑنا پڑے گا۔ پیشینی کے پاس بیل (دانیوین) اور لک کے پاس پانوا اور کاؤل باج کے پاس کھوپا کی رنگین نپسوں کا ہونا بالکل اس سے مختلف حیثیت رکھتا ہے کہ یہی آلات کسی ناواقف شخص کے پاس ہوں۔ ملک کی اس مزید کار آمد صورت سے سلطنت کو کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ یہ مشترک حیثیت نہیں بلکہ انفرادی حیثیت ہے، علیٰ ہذا سلطنت سرسری اور عمومی طور پر مداخلت کے شرائط اور زوجین کے حقوق معین کر سکتی ہے بلکہ حقیقتاً یہ اس کا فرض ہے کیونکہ اس پر خاندان کی حفاظت اور قوم کی صحت اخلاقی کا دار و مدار ہے مگر یہ کہ کوئی خاص عقد کس طرح پھیل کو پہنچا اور خاندانی زندگی کی جزوی صورتیں کیا ہیں یہ امور سلطنت کے حیطہ اقتدار سے باہر ہیں۔ وہ لہجہ فون ہمبولٹ نے اسے محسوس کیا اور وہ اسی خیال میں بہک گیا کہ معاملات مداخلت کو قانونی اثر سے نکال دے اور اسے بالکل ہی افراد کی مرضی پر چھوڑ دے۔ مذہبی قانون اس کے برعکس غلطی میں مبتلا ہو گیا اور اس نے ان معاملات پر ایسے قانونی ضوابط عائد کرنا چاہے جن کا تعلق ذاتی آزادی سے تھا۔ سلطنت نے جب ارتداد کو جرم قرار دے کر اس کے لئے سزا دی تو وہ اپنے حقوق حدود سے تجاوز ہو گئی اور شخصی آزادی میں اس نے غیر ضروری مداخلت کی۔

(۳) سلطنت کی نظریاتی حد قانون سے زائد وسیع نہیں ہے کیونکہ ہر ایسی عکرائی جسے جبر کی طاقت حاصل ہو قانون ہی کی بنیاد پر قائم ہو سکتی ہے مگر قانون خود اپنی جگہ پر اسباب ذیل سے محدود ہے۔

(الف) افراد کے باہم امن و آشتی کے ساتھ رہنے کی ضرورت یعنی حیات عامہ کے ضروری شرائط کا تسلیم کرنا (اس ضمن میں قانون شخصی اور قانون قصاصی وغیرہ داخل ہیں) اور (ب) قوم کی ہستی اور ارتقاء اور جہاں تک تحفظ مذہب و کی حاجت ہے۔ افراد

کی شخصی زندگی کا اس کے تابع ہونا اس ضمن میں محصول، فوجی خدمات، آئینی اور انتظامی قوانین شامل ہیں۔

جہاں تک قانون کی بحث ہے، سلطنت کو اعلیٰ اختیار حاصل ہے کیونکہ قانون کی توضع اور اس کا عمل درآمد فی نفسہ وہ چیزیں ہیں جن کا تعلق سلطنت سے ہے۔

(۴) سلطنت اپنی انتظامی خبر گیری اور نتیجتاً اپنے اثر کو تنظیمات قانونی کے حدود سے آگے بڑھا سکتی ہے مگر اس صورت میں اسے جبر کا اختیار باقی نہیں رہتا اور اس کے فرائض صرف اس حد تک رہتے ہیں کہ جن اہم معاشری امور میں سلطنت کی مدد کی ضرورت ہو وہ ان کی تائید و ہمت افزائی کرے اس کی مثال سلطنت کی اقتصادی اور تعلیمی کارروائیاں وغیرہ ہیں۔ اس موقع پر سلطنت کی خبر گیری قومی بہبود سے تجاوز کر کے معاشری بہبود پر وسیع کی گئی ہے مگر صرف اس وجہ سے کہ آخر الذکر کو اس کی مدد کی ضرورت ہے۔

(تعلیق - مل اور اسپنسر کے ان تصانیف کے علاوہ جن کا ذکر تیسرے باب کی تعلیق (الف) میں ہو چکا ہے افعال سلطنت کے تحدیدات کے متعلق انگریزی کی کتب ذیل میں بھی مختلف نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہیں۔

برگس علم سیاست (Political science) حصہ اول کتاب دوم باب چہارم، گٹسمان سیاسیات و اقتصادیات (Politics and Economics) ڈانسٹراپ "انفرادیت" (Individualism) گرین خطبات دربارہ ذمہ داری سیاسیہ دور تصانیف جلد دوم، اور خطبہ دربارہ آزادی و وضع قانون و آزادی معاہدہ اور تصانیف جلد سوم، گوٹن خطبہ عدم مداخلت و دوست اندازی حکومت (ڈومبر خلاصہ کمال انسٹیٹوٹ، فیئر "سلطنت بقیہ تجارت" جیونز "سلطنت بقیہ مزدوری" ڈیہ دونوں انگلش سنٹرل سیزر میں ہیں) میک (مدیر) اندر حریت (A plea for Liberty) (مع تہید ایچ اسپنسر) مائیکو "تحدیدات آزادی افراد" (Limits of Individual Liberty) جی، اصول مداخلت سلطنت (Principles of State Interference) لوک، علم الاقتصاد (Political Science) کتاب سوم۔ مبادی سیاسیات حصہ اول جے۔ ایف اسٹون حریت مساوات و برت (Liberty, Equality, Fraternity) دولزی "علم سیاست" حصہ دوم باب پنجم۔ انگریزی متبجم۔

چھٹا مقالہ

سلطنت کی شکلیں

پہلا باب

ارسطو کی تقسیم

دو ہزار برس سے زیادہ ہو گئے کہ ارسطو نے اشکال سلطنت کی تقسیم کی تھی جو آج بھی عموماً مسلم مانی جاتی ہے۔ اس تقسیم کے قائم کرنے میں اُس نے فرمانروائی بلکہ حکمرانی اقتدار کے تصور سے استدلال کی۔ اُس نے یہ قرار دیا تھا کہ ہر سلطنت میں ایک سب سے بڑا کارکن ایسا ہوتا ہے جو طاقت کا مرکز ہو، اور تمام دوسرے کارکن اس کے تابع ہوں۔ اس اعلیٰ کارکن کی حیثیت سلطنت پر اپنا خاص نقش قائم کر دیتی ہے پس یہ قرین فطرت اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہی سلطنتوں کی تقسیم کی بنیاد قرار دیا جائے۔

ارسطو کی تقسیم

ارسطو سلطنت کی جائز شکلوں میں اُن سب کو شمار کرتا ہے جن کا مقصد جماعت (یا ملت) کی بہبودی ہے۔ یہ خلاف اسکے جو سلطنتیں صرف حکمرانوں کے مطلب پر نظر رکھتی ہیں انہیں وہ "فاسد" قرار دیتا ہے۔

جائز سلطنتیں

اس خیال کی بنا پر اسے سلطنت کی صحیح بنیادی شکلیں صرف تین مانتی ہیں اور اُن میں ہر ایک کے ساتھ ایک فاسد شکل بھی لگی ہوئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اعلیٰ طاقت یا تو کسی ایک فرد واحد میں مرکوز ہوگی (چند افراد (قلت) یا متعدد افراد (کثرت) کے ہاتھ میں ہوگی۔ اس سے حسب ذیل صحیح شکلیں پیدا ہوتی ہیں :-

۱۔ بادشاہی یعنی فرد واحد کی حکومت جسے ارسطو "بادشاہی" کہتا ہے آج کل کے

مماورے میں اسے شاہی حکومت (Monarchy) کہتے ہیں۔

۲۔ اعیانی حکومت یعنی چند قلیل (انعداد) ممتاز ترین افراد ملک کی حکومت۔

۳۔ کثرت یا عوام کی حکومت کو ارسطو نے حکومت عامہ (پالیٹی Polity) کہا ہے اسکے زمانے میں یونانی شہروں اور خاکسراہیتفکر کی عمومی حکومت ذیل ہو گئی تھی اس لئے وہ کثرت کی اس حکومت کے لئے جو اغراض عامہ کو مد نظر رکھے حکومت عمومی، کا لفظ استعمال کرنے سے بچنا چاہتا ہے اور اس لفظ کو اس حکومت کی فاسد صورت کے لئے مقرر کرتا ہے مگر بعد کو اس تیسرے طریقہ حکومت کیلئے حکومت عمومی کا لفظ پھر عام طور پر استعمال ہونے لگا اور ہم اسی مفہوم میں اسکا استعمال کریں گے۔

فاسد صورتیں

تین فاسد صورتوں کو ارسطو نے حسب ذیل بیان کیا ہے۔
۱۔ حکومت خود سری، یعنی ایک فرد واحد کی حکومت جسکی مقدم غرض خود اپنے ذاتی اغراض ہوں۔

۲۔ عدیبت، اہل ثروت کی حکومت خاص اپنے فائدہ کے لئے۔

۳۔ از دعاتیت، یعنی غریب (اور غیر تعلیم یافتہ) عوام الناس کی بے قید حکومت اسکو ارسطو "عمومیہ" (Democracy) کا نام دیتا ہے۔

کیفیت کے نسبت
کیفیت زیادہ
اہم ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس تقسیم میں ارسطو نے صاحبان اقتدار کی تعداد پر خاص زور دیا ہے مگر یہ امر خود اسی کے اس بنیادی اصول کے خلاف پڑتا ہے کہ سلطنت کی شکل حکمرانوں کی کیفیت سے متعین ہونا چاہئے نہ کہ کثرت سے۔ ارسطو نے خود اس لغزش کو محسوس کر لیا تھا اور اس لئے اس نے یہ جتا دیا تھا کہ تعداد کا فرق بالطبع حکمران طاقت کے خصائص سے تعلق رکھتا ہے اور اس آخر الذکر صفت کو آخری منبع قرار دینا چاہئے، تاہم اصول کیفیت کی قطعیت کو اس نے کافی طور پر ظاہر نہیں کیا ہے۔

۱۰۔ ارسطو سیاسیات اس مسئلے کے متعدد جدید بیانات سے غلطی میں پڑ کر پہلے اسے نظم انداز کر گیا تھا اور اسلئے اس سیاسی فلسفی عظیم پر یہ سچا اعتراض کیا تھا۔ اسپارٹا میں اگرچہ دو بادشاہ ایک ساتھ حکومت کرتے تھے مگر وہ حکومت شاہی تھی (مگر ارسطو کی رائے کے موافق ایسا نہیں تھا کیونکہ وہ اسے لامہیانت تھا اس پست ترین مفہوم میں کہتا ہے جس مفہوم میں یہ لفظ مرکب سلطنت کی شکل پر عاید ہوتا ہے۔ اسپارٹا کی بادشاہیت کو وہ صرف "موردی میں حیات سپہ سالاری" سمجھتا تھا ہے اور یہ ایک عمدہ تاج حکومت کی شکل سے طاقت بیکار سمجھتا تھا) دینس میں اہیانت تھی، گوکہ سلطنت کا سرگردہ "فوج" ہوا کرتا تھا۔

اسطو کی تقسیم
ناکمل ہے

ایک اور اعتبار سے بھی اسطو کی تقسیم میں اصلاح کی ضرورت ہے یہ تقسیم نامکمل ہے کیونکہ تاریخ میں بہت سی ایسی سلطنتوں کے حالات ملتے ہیں جو اسکی ان تینوں جائز اشکال میں سے کسی شکل کی تحت میں نہیں آسکتیں۔ ان تینوں شکلوں میں اعلیٰ طاقت کا تعلق انسان سے ہے، خواہ وہ ایک شخص سے ہو یا چند افراد سے یا تمام قوم سے مگر ایسی سلطنتیں بھی ہو گزری ہیں جن میں کسی قسم کا انسانی اقتدار نہیں تسلیم کیا گیا ہے بلکہ اعلیٰ طاقت خدا، یا کسی دیوتا، یا کسی دوسرے فوق الانسان ہستی یا کسی خفیل کے تابع سمجھی گئی ہے۔ حکمرانی کرنیوالوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ خود اپنے اختیار سے حکومت نہیں کرتے بلکہ وہ کسی غیر مرئی حکمران کے خادم یا نائب ہیں جو انسان کی فطری کمزوریوں سے مبرا ہے۔

سلطنت کی یہ چوتھی شکل جب رعایا کے بہبود کی جانب مائل ہو تو اصطلاح میں حکومت نیرہی ہو سکتی ہے اور اسکی فاسد صورت "حکومت اودامیہ" ہوگی۔ تعلیق۔ اشکال اخیر نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ سلطنت کی یہ تین قدیم قسمیں یعنی حکومت شاہی و اعیانی و عمومی، سب کی سب ہمیشہ ایک دوسرے میں ملی رہتی ہیں۔ مثلاً حکومت عمومی میں سربراہ وہ اشخاص کو اعیان حکومت سے تشبیہ دیا جاسکتی ہے اور بعض وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ پریکٹس کی طرح ایک شخص بادشاہ کا انداز اختیار کر لیتا ہے حکومت شاہی پر بھی یہی امر صادق آتا ہے اور مرایو کا یہ کہنا بجا تھا کہ "ایک اعتبار سے جمہوریت شاہی ہے اور ایک اعتبار سے شاہی جمہوریت ہے" تاہم یہ قدیم تقسیم بے معنی نہیں ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ اعلیٰ طاقت کی حیثیت ظاہری کا قطعی اثر تمام نظام سلطنت پر پڑتا ہے اور نہایت ہی اہم سیاسی اصول کا اس سے قریب ترین واسطہ ہوتا ہے۔

دوسرا باب

نام نہاد مزوج سلطنت

جمہوریہ روم

قدیم زمانے میں بھی یہ کوشش کی گئی تھی کہ ارسطو کی تقسیم میں ایک چوتھی شکل مزوج سلطنت کی برپا دی جائے۔ سسرو کا خیال تھا کہ روم کی سلطنت ایک ایسی سلطنت ہے جو اس چوتھی شکل کا نمونہ ہے، یعنی وہ بادشاہی، اعیانی اور جمہوری، سب شکلوں کا ایک مجموعہ مرکب ہے اور سسرو کا یہ دعوئے ہے کہ چاروں میں یہی شکل سب سے بہتر ہے۔

سلطنت مزوج
سیکھا مقصد ہے

سلطنت مزوج کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ اس میں بادشاہی، اعیانی اور عمومی اشکال حکومت متبدل کر دئے گئے ہیں یا دوسرے سیاسی عناصر نے ان کی وسعت کو محدود کر دیا ہے، مثلاً اعیانی سینات (یعنی ایوان اعلیٰ) یا نیا تہی مجلس عوام کے قیام سے حکومت شاہی کے اختیارات محدود کر دئے جائیں۔ اس صورت میں یہ صحیح ہے کہ اس قسم کا تقسیم شدہ نظام سلطنت اس سے بہتر ہے کہ ایک شخص واحد یا چند افراد یا فریق غالب یا روک ٹوک مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرے، مگر اس قسم کے امتزاج سے سلطنت کی کوئی نئی شکل نہیں پیدا ہوتی۔ کیونکہ حکمرانی کی اعلیٰ طاقت بہر نوع بادشاہ، اعیان ملکیت یا عوام کے ہاتھ میں مرکوز ہوتی ہے۔

برخلاف اسکے اگر اس سے یہ سمجھا جائے کہ اعلیٰ حکمران طاقت بنفسبہ بادشاہ، اعیان ملکیت اور عوام میں تقسیم کر دی گئی ہے اور اس طرح دو اعلیٰ حکومتیں بلوہ پیلو قائم ہو گئی ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے سے آزاد ہے تو اس صورت میں ٹاسیٹس کا یہ کہنا بالکل بجا ہو گا کہ اس قسم کی مرکب سلطنت کا خیال ہی ترک کر دینا چاہئے اسکا دعوئے ہے اور صحیح دعوئے ہے کہ اول تو اس قسم کی سلطنت کا وجود میں آنا ہی ممکن ہے اور اگر ایک وقت کیلئے وجود میں آ بھی جائے تو اسکا برقرار رہنا کسی صورت سے نہیں ہو سکتا۔

(الف) ارسطو نے خود بھی مزوج نظام کے تسلیم کیا ہے۔ انگریزی ترجمہ

زمانہ مابعد کے لوگوں نے انگلستان کو اسی قسم کی ایک مزوج سلطنت خیال کر لیا ہے جہاں حکمرانی بادشاہ، امراء اور عوام کی تین اعلیٰ طاقتوں میں منقسم ہے اور ان لوگوں نے یہ دعوے کیا ہے کہ انگریزی نظام سلطنت ہر طرح پر مکمل ہے محض اس وجہ سے کہ اس مزوج شکل کی عملی صورت کی یہ انتہائی حد ہے مگر یہ خیال کتنا غلطی ہے کہ انگریزی نظام سلطنت، اعلیٰ طاقت حکمرانی کی تقسیم سے پیدا ہوا ہے یہ قدیم زمانہ میں یہاں کی سلطنت کی مخصوص شکل بادشاہی کی تھی اور یہی بادشاہی اولاً امراء کے ذریعے سے اور بعد ازاں عوام کے شمول سے بتدریج محدود کر دی گئی ہے۔ سلطنت کی خارجی شکل ہمیشہ شاہی رہی ہے اور نہ صرف اعلیٰ طاقت حکمرانی (یعنی عالمانہ طاقت) بلکہ جماعات قانون سازی (یعنی پارلیمنٹ) میں بھی بلند ترین منصب بادشاہ ہی کی جانب منسوب رہا ہے۔

علاوہ اسکے بالعموم اسکا خیال نہیں رکھا جاتا کہ ارسطو کا اصول تقسیم قشری اختیار کی نوعیت و ترکیب پر مبنی نہیں ہے، کیونکہ ہر ایک ترقی یافتہ سلطنت میں قانون سازی میں بالعموم تمام قوم کے خاص عناصر کی نمائندگی ہوا کرتی ہے، اسکے بجائے اس اصول کا انحصار حاکم و محکوم کے مخالف باہمی اور اس امر کے تصفیے پر ہے کہ اعلیٰ انتظامی قوت کس کے اختیار میں ہے۔ یہ انتظامی طاقت تقسیم نہیں ہو سکتی حتیٰ کہ ایک بادشاہ اور اسکے وزراء کے درمیان بھی اسے منقسم نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے دو علی یا سہ علی پیدا ہو جائیگی اور یہ امر بجائے خود سلطنت کی خصوصیت حقیقی کے خلاف ہوگا اس لئے کہ ایک زندہ جسم کے مانند سلطنت کو اتحاد کی ضرورت ہے تمام ذی حیات موجودات میں مختلف قویٰ اور مختلف اعضائے عمل ہوتے ہیں مگر اس تعدد کے باوجود سب کے سب

خیال کرنا ہے
حکومت ہے نہ کہ
فلسفہ و معنویت

(ب) (کسی حکومت کا مزوج ہونا اور کسی حکومت کا اجزائے مرکب سے پیدا ہونا ایک ہی بات نہیں ہے۔ ایجنٹس میں سولن کے ترتیب دادہ نظام حکومت کے متعلق ارسطو نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں انہیں دیکھنا چاہئے۔ انگریزی مستبدم)

(ج) (اس تمام کتاب میں منجلی نے انگریزی نظام حکومت میں بادشاہ کی طاقت کو جس مبالغے سے بیان کیا ہے اُس میں اُسے مغالطہ ہوا ہے۔ اسکے بارے میں زیادہ صحیح خیال معلوم کرنے کے لئے بھٹ کی کتاب "نظام سلطنت انگلشیہ" دیکھنا چاہئے۔ انگریزی مستبدم)

متحد ہوتے ہیں، بعض اعصاب علیہ اعلیٰ (رئیس) ہوتے ہیں اور بعض ادنیٰ (خادم) مگر ہمیشہ ایک اعلیٰ عضو ہوتا ہے اور وہی کار فرمائی کی تمام قوت کا مرکز ہوتا ہے میرا جسم زندگی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے علیحدہ اور آزاد نہیں ہیں مگر وہ دونوں ہم مرتبہ بھی نہیں ہیں اسی طرح سلطنت میں بھی ایک اعلیٰ کار فرما کا ہونا اسکی ہستی کے لئے لازمی شرط ہے اور اگر اتحاد سلطنت کا قائم رکھنا مقصود ہو تو اعلیٰ قوت کو مختلف اجزاء میں منتشر نہیں کر سکتے۔

پس سلطنت کی کوئی ایسی چوتھی شکل نہیں ہے جسے سلطنت مفروضہ کا نام دیا جاتا ہے اور امتزاج جہاں تک ممکن ہے اس پر انہیں تین مذکورہ بالا مجرد سلطنتوں کے بیان میں بحث کیجا چکی ہے۔

تعلیق - ہمارے اس زمانے میں ”جمہوریت ناشاہی“ کا بہت چرچا ہو رہا ہے اور اس قسم کی سلطنتوں کا قائم کرنا اس زمانے کا بابہ الامتیاز کام سمجھا گیا ہے، اگر اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ اندولوں شاہی کی بنیاد پسندیدگی جمہور پر قائم ہونا چاہئے اور شاہی کو جمہور سے قریبی تعلق ہونا چاہئے تو خیال صحیح ہے مگر اس قسم کی سلطنت خالص شاہی حکومت ہوگی۔ کسی امتبار سے وہ مفروضہ سلطنت نہیں ہوگی۔ اگر اسکا مفہوم یہ ہے کہ شاہی جمہوری تنظیمات سے محدود ہو۔ جیسے فرانس میں مشملہ میں جولائی والی بادشاہی تھی جو ”جمہوری تنظیمات سے گہری ہوئی تھی“ تو اسکا بھی ایک مطلب ہے مگر تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس صورت میں خطبہ لگا رہتا ہے کہ دونوں طریقوں کے اصول ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے اور ترقی کن عمومیت جمہوریت شاہی کو الٹ دیگی، لیکن اگر اس قسم کی سلطنت کا مفہوم یہ ہو کہ اعلیٰ اختیار علانہ اس طرح پر مخلوط یا منقسم ہے کہ نصف شاہی اور نصف عمومی ہے تو اسکا کوئی قرین عقل مطلب نہیں معلوم ہوتا اور بالغوب وجوہ ایسی سلطنت قائم نہیں رہ سکتی۔ ۱۸۹۰ء کے فرانسیسی مجلس واضع نفی سلطنت کا بہ شمول روسو خیال تھا کہ اقتدار شاہی کا دو برابر حصوں میں تقسیم کرنا ممکن ہے تاکہ اس میں سے ایک قوم کے اختیار میں ہو اور دوسرا بادشاہ کے اختیار میں، مگر عمل میں آتے ہی معلوم ہو گیا کہ یہ طریقہ برخود غلط اور ناقابل انضباط تھا پیر فریئر نے اصول حقوق عامہ (Principes du droit public)

میں یہ غا ہر کیا ہے کہ شاہی میں جب امتیازات، برطرف کر دئے جائیں تو وہی جمہوریت ہے مگر امتیازات کے تحت میں اُسے ہر طرح کے اعیانی اعزاز کو بھی داخل کیا ہے پس اُسکے نزدیک اس فقرے کے مفہوم میں صرف وہ بادشاہی داخل ہے جس میں عمومی جماعات ہوں مگر اعیانی جماعات نہ ہوں یعنی یہ ایک نامکمل صورتِ سلطنت کی ہوگی جس میں اعیانی جسدِ اکاملا لحاظ نہ کیا گیا ہو یا اُسے دبا دیا ہو۔ تقابلاً کہ وہی مقالے کے باب ۱۴، ۱۵، ۱۶ سے جن میں آئینی بادشاہی سے بحث کی گئی ہے۔

تیسرا باب

نظریہ ارسطو کے ترقیات

پولیسکیو نے اگرچہ اصلاً ارسطو کی تقسیم کی پیروی کی ہے مگر اُس نے بادشاہی، اعیانی اور عمومی تینوں حکومتوں کے لئے (حکمرانوں کی تعداد سے قطع نظر) روحانی اور اخلاقی اصول کا پتہ لگا کر ایک نیا علمی ترقی دکھائی ہے۔ یہ ایک دوسرا سوال ہے کہ اس مقصد میں اسے کامیابی ہوئی یا نہیں، اسکی رائے میں نیکوکاری (صلاح جمہوریت کا) اعتدال اعیانیت کا اور اعزاز بادشاہی کا اور خوف، حکومت خود سرائے کا اصول ہے۔ اُس نے اس طرح خود سرائے حکومت کو سلطنت کی ایک چوتھی قسم قرار دیدیا ہے۔ مگر ارسطو کے نزدیک وہ معتدل حکومت کی فاسد شکل ہے اور یہی زیادہ بہتر ہے۔

اشلائیئر مآثر نے قابل قدر کوشش یہ کی ہے کہ سلطنت کی متعدد شکلوں کو سیاسی حساس کے ارتقائی مارج کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔ سلطنت کی ابتدا اُس وقت ہوتی ہے جب لوگوں میں "حکومت اور رعایا" کے امتیاز لازمی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اس جانب پہلا قدم اُس وقت اٹھایا جاتا ہے جب کسی چھوٹی سی قوم (People) یا کسی قبیلے میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے اور یہ نیا جذبہ بالعموم "اُس تمام جماعت میں جو سیاسی زندگی کے لئے تیار ہوتی ہے، سرایت کر جاتا ہے"۔ اسکے بعد اس امتیاز کا خیال سب میں نشو و نما پاتا ہے۔ وہ سب کے سب حکومت کے بنانے میں متحد ہو جاتے ہیں اور پھر اُس سے الگ ہو کر رعایا کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ یہ ابتدائی حکومت جمہوریت ہوتی ہے جس میں جذبات عامہ اور اغراض شخصہ کے درمیان تحالف بہت ہی خفیف صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگرچہ تمام جماعت سیاسی زندگی کے لئے تیار ہو مگر سلطنت قائم کر نیکی تحریک سب پر یکساں اثر نہ ڈالے بلکہ سیاسی حساس اولاً کسی ایک فرد یا چند افراد میں نشو و نما پائے۔ اس سے ناسادات پیدا ہو جاتی ہیں اور اسکا نتیجہ شاہی یا اعیانی حکومت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس درجے میں جب تک کہ

سلطنت چھوٹی رہتی ہے، تینوں شکلیں ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہوتی ہیں اور بہت آسانی سے ایک دوسرے کی صورت اختیار کر سکتی ہیں مگر فطری میدان ہمیشہ عمومیت کی طرف رہتا ہے کیونکہ عوام بہت جلد اُس ایک شخص یا اُن چند اشخاص کے برابر ہو جاتے ہیں جن میں سب سے پہلے سیاسی احساس پیدا ہوا تھا۔

دوسرے درجے میں متعدد قومیتیں شامل ہو جاتی ہیں اُن میں سے کوئی ایک قبیلہ باقی دوسرے قبیلوں پر حکمرانی کرنے لگتا ہے۔ جس طرح سابقہ درجے میں سلطنت کی شکل اصلاً جمہوری ہوتی ہے، اُسی طرح اس درجے میں اُسکی شکل اصلاً اعیانی ہوتی ہے۔ اُسکا جمہوری ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ تمام قبیلے ایک حکمران قبیلے کے تابع ہوتے ہیں اور اسنے ان میں مساوات نہیں ہوتی۔ خارجی حیثیت سے یہ بادشاہی کی شکل اختیار کر سکتی ہے مگر بادشاہ لازماً حکمران قبیلے کا ہوگا اور اس طرح وہ اعیان میں شامل سمجھا جائیگا۔

اس آخر الذکر درجہ میں درجہ آخری درجہ اسوقت آتا ہے جب ایک بڑی قوم (People) پوری طرح قومی اتحاد کو محسوس کرنے لگتی ہے۔ پہلے درجے کی عمومی خصوصیت میں حاکم و محکوم کا سیاسی امتیاز پوری طرح نشوونما نہیں پاسکتا۔ اور اس حالت میں ایک بڑی قوم کی وسعت پیدا ہو سکتی ہے۔ دوسرے درجے کی اعلیٰ حکومت میں حکمران قبیلے کے اغراض ہمیشہ اوروں سے علیحدہ ہوتے ہیں اور قومی اتحاد اس سلطنت کا اصول نہیں ہو سکتا مگر تیسرے درجے میں اگر صحیح معنوں میں بادشاہی پورا نشوونما حاصل کرتی ہے اور بادشاہ اپنی ذات سے سلطنت کے اتحاد اور حکومت کی پوری طاقت کا مظہر بن جاتا ہے۔

اشلائیر باخ کا یغیبال سلطنت کی تینوں مسلمہ شکلوں کو ایک ذہنی بنیاد پر قائم کرتا اور سیاسی خیال کے ارتقا کے مدارج کے ساتھ انھیں متحد کرتا ہے۔ جمہوریت سب سے پہلے درجے میں اور بادشاہی سب سے آخری درجے میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں اگرچہ کوئی نیا اصول تقسیم نہیں پیش کیا گیا ہے بلکہ انھیں مختلف شکلوں کی تہ میں نظر غائر سے کام لیا گیا ہے مگر اشلائیر باخ کے اس منطقی ارتقا سے تاریخ کا دور کسی طرح پر موافقت نہیں کرتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخی ترتیب اکثر اس کے برعکس ہوتی ہے۔ پہلے شاہی پھر اعیانی پھر عمومیت واقعاً۔

یہی زیادہ فطری ترتیب معلوم ہوتی ہے کیونکہ سوسائٹی کے اعلیٰ طبقات جو زیادہ بہتر حالات میں ہوتے ہیں انہیں میں اولاً احساس سیاسی اپنا زور دکھاتا ہے اور ان سے گزر کر بتدریج وسعت حاصل کرتا ہوا اداۓ حلقوں میں پھیلتا ہے۔

چوتھا باب

سلطنت کی چار بنیادی شکلوں کے اصول

ارسطو کے قیاس کے مطابق سلطنت کی مختلف شکلوں کی تقسیم تعینی کا انحصار حکومت اور رعایا کے بابت مختلف خیالات امتیازی پر ہے۔ اُس میں خاصکر حکمرانی کی کیفیت کو (ذکرہ اسکی کیفیت کو) زیادہ دخل ہے۔

۱۔ پہلی شکل تصوری حکومت ہے جسکا اعلیٰ ترین نمونہ مذہبی حکومت ہے اُس میں لوگ اپنے حکمران کو ایک افوق الانسان ہستی سمجھتے ہیں جو ازل سے قدرت ان سے بالاتر ہے۔ خود خدا سلطنت کا حقیقی حاکم سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ تصوری حکومت کے بالکل برعکس عمومی حکومت ہے۔ اول الذکر میں لوگ اپنے سے کسی خارج و برتر بیرونی طاقت کے تابع ہوتے ہیں اور خواہہ الذکر میں لوگ خود اپنے اوپر حکومت کرتے ہیں۔ یعنی مجموعہ وہ حاکم ہوتے ہیں اور منفرد رعایا۔

۳۔ ایمانی حکومت میں حاکم و محکوم کا امتیاز خصائص انسانی کے تابع اور قوم کے حدود کے اندر ہے۔ کوئی اعلیٰ طبقہ یا قبیلہ حکمران ہو جاتا ہے اور دوسرے طبقات و قبائل محکوم ہو جاتے ہیں۔ درانحالیکہ موخر الذکر طبقات کو حکمرانی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا مگر حکمران طبقہ کے افراد بھی اپنی انفرادی حیثیت سے رعایا ہی میں شمار ہوتے ہیں۔

۴۔ شاہی میں حاکم و محکوم کا امتیاز کامل ہو جاتا ہے مگر پھر بھی وہ انسانی ہی حد کے اندر رہتا ہے۔ حکومت ایک فرد واحد میں مرکوز ہو جاتی ہے، وہ صرف حکمران ہوتا ہے اسکا شمار کسی حیثیت سے رعایا میں نہیں ہوتا مگر وہ ہمہ تن سلطنت سے متعلق ہوتا ہے اور اسکی شخصیت اتحاد قوم کا منظر ہوتی ہے۔

یہ چاروں بنیادی شکلیں ایک ایک ابتدائی نمونے کے پر تو ہیں۔ مذہبی حکومت، خدا کی حکومت عالم کی قائم مقام ہے مگر یہ حکومت براہ راست ہوتی ہے اور ایک اعتبار سے سخت و علی الاطلاق حکومت ہے۔

سلطنت کی
چار شکلیں

تصور حکومت

ایک ابتدائی
نمونے

شاہی، ایک فرد واحد کے وسیلے سے نوع انسان کے اتحاد کی شان و شوکت کو بڑھاتی ہے۔ حکمران تمام سلطنت کا نمائندہ ہوتا ہے اور بادشاہ کی ذات میں قومی اتحاد کا جلوہ نظر آتا ہے۔

عمومیت، قوم یا افراد کی جماعتی حیثیت کو ظاہر کرتی ہے اور سلطنت کو ایک مذہبی حلقے یا کیون کے رنگ میں دکھاتی ہے۔

ایمانی حکومت قوم کے اعلیٰ اور اونے اجزاء کے امتیاز پر مبنی ہوتی ہے اور حکومت اول الذکر کے ہاتھ میں رہتی جاتی ہے۔ جس طرح عمومیت کا نمونہ کیون ہے اسی طرح ایمانی حکومت کا نمونہ عالی خاندان اور بلند رتبہ امرا ہیں۔

ان کے مقابلے پر غور و فکر

ایک نقطہ خیال کے موافق مذہبی اور شاہی حکومت، ایمانییت اور عمومیت کے مقابل معلوم ہوتی ہیں۔ دو اول الذکر صورتوں میں حکومت کا اعلیٰ اختیار و اقتدار اس درجہ مجتمع ہو گیا ہے کہ حکمران میں کسی نوع سے رعایا کی حیثیت باقی نہیں رہتی اور وہ کسی قسم کے شخصی اغراض کا نہیں بلکہ صرف سلطنت کے اغراض کا نمائندہ ہوتا ہے۔ مذہبی حکومت میں حکمرانی کی وقعت و عظمت رہتی ہوتی اور اس وجہ سے حکومت علی الاطلاق ہوتی ہے۔ شاہی میں جلالت و شوکت انسانی ہوتی ہے، اور اس لئے اس میں نسبت باہمی قائم رہتی ہے۔ اسکے خلاف ایمانی اور عمومی حکومتوں میں حاکم و محکوم کے درمیان کوئی ایسا طبعی فرق ظاہر نہیں ہوتا۔ وہی لوگ ایک وقت میں حکمران ہوتے ہیں اور دوسرے وقت میں بطبع احکام۔ اُنکے اغراض عام و خاص دونوں ہوتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اکثر اُن دونوں کو ایک ہی نام رپبلک (جمہوریہ) کے تحت میں شامل کر دیتے ہیں۔ عمومیت میں فرائض کا یہ امتزاج تمام قوم (People) میں وسیع ہوتا ہے اور ایمانییت میں حکمران طبقے تک محدود رہتا ہے۔ آخر الذکر، دوسرے افراد قوم کے مقابلے میں محض حکمران ہوتے ہیں اور باخود انکا نظم باعموم عمومیت کا ہوتا ہے اور اس لئے وہ ایک ہی وقت میں حاکم بھی ہوتے ہیں اور محکوم بھی۔ پس ایمانییت ایک سطح پر عمومیت اور شاہی کے مابین ہوتی ہے۔

لیکن ایک دوسری نظر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہی اور ایمانییت ایک دوسرے سے تعلق رکھتی ہیں اور بقیہ دو شکلوں کے خلاف ہیں۔ ان میں حاکم و محکوم کا امتیاز منجانب انسان

ایسے طور پر مرتب ہوا ہے کہ حکمران اس امر کو محسوس کرتے اور جانتے ہیں کہ وہ آزاد ہیں قوم انھیں ایسا ہی سمجھتی ہے، وہ اپنے ہی نام اور اپنے ہی آزادانہ اختیار سے حکومت کرتے ہیں، البتہ اعیانیت کی بر نسبت شاہی میں یہ حالت زیادہ کامل ہوتی ہے۔ برخلاف اسکے جب خدا یا قوم کو حکمران سمجھا جائے تو لازماً اس کا اختیار کسی وسیلے سے عمل میں آئے گا خواہ کاہنوں کے وسیلے سے عمل میں آئے، یا دنیاوی حکام کے وسیلے سے۔ یہ لوگ بذات خود طبقہ رعایا سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ خدا یا قوم کے خادموں کی حیثیت سے صرف مفعولہ اختیار کو عمل میں لاتے ہیں، اس لئے انھیں حقیقی حکمران نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ ان حقیقی حکمرانوں کی جانب سے جو بذات خاص کار حکومت کو انجام نہیں دے سکتے صرف انتظام کرتے ہیں۔ انھیں ہمیشہ ایک اعلیٰ طاقت کی طرف رجوع کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے جو خود ان پر حکومت کرتی ہے اور جو انھیں وہ اختیارات تفویض کرتی ہے جنہیں وہ براہ راست خود نہیں حاصل کر سکتے۔

اشکال حکومت کے اعتبار سے سلطنتوں کا فرق نظام سلطنت کے قوانین کی بنیاد ہے، اور اس کا تعلق قانون عامہ سے ہے۔ یہی فرق انکی سیاسی زندگی کے میلانات میں بھی پایا جاتا ہے اور یہ میلان ان کے نظام سلطنت کی ظاہری شکل کے مخالف بھی ہو سکتا ہے۔ ایسا ہونا ممکن ہے کہ کوئی سلطنت کلیسا کی فرمانروائیسوں کی کسی جماعت کے تحت انسانی حکمران کو تسلیم کرتی ہو، مگر اسکے ساتھ اس کا انداز حکومت نہ ہی کی جانب مائل ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی سلطنت اعیانیت کی طرف مائل ہو اگرچہ اس کا قانون عام کسی قسم کی اعیانیت کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ اسکی مثال سلطنت انگلستان ہے جسکی شاہی شکل اعیانی روح سے ملوے۔ ایسی ہی سلطنتیں ہیں جو اصولاً عمومی نہیں ہیں مگر عمومیت کی جانب مائل ہیں۔ جیسے ناروے۔ اسی طرح بعض سلطنتوں میں اگرچہ کوئی واقعی بادشاہ نہیں ہوتا مگر انکا میلان بادشاہی کی طرف ہوتا ہے جیسے جمہوریہ فرانس۔

تعلیق - ف۔ رومر ("اصول فرق سیاسیه" فقرہ ۲۱۶ وغیرہ میں) انسان کی زندگی کے موافق سلطنت کو چار مداح میں تقسیم کرتا ہے اور اس تقسیم میں وہ سلطنت کی شکل کا خیال نہیں کرتا بلکہ اس کے سیاسی جذبات یعنی خصوصیت فرق کا خیال کرتا ہے۔ اسکی

چار تقسیمیں حسب ذیل ہیں :-

مذہبی سلطنت (ایڈول شٹاٹ Idolstaat) جسکا سیاسی جذبہ تھیوتالی (Rodical) ہوتا ہے۔

فردی سلطنت (ایڈول شٹاٹ Individualstaat) جسکا سیاسی جذبہ انفرادی (Libral) ہوتا ہے۔

قبائلی سلطنت (راسے شٹاٹ Rassestaat) // مسقط (Conservative) ہوتا ہے۔

شخصی سلطنت (فورمن شٹاٹ Formenstaat) // مطلق العنان (Absolutist) ہوتا ہے۔

پس ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی شاہی ان سیاسی جذبات کے تمام مدارج سے سلسلہ وار گزر کر آخری درجے پر پہنچے۔ ر۔ فون مول نے (علم سلطنت) ج ۱، ص ۲۸۲ میں اس نظریے پر یہ اعتراض کیا ہے کہ قوم نہ جوان ہو سکتی ہے نہ بوڑھی، کیونکہ قوم میں بچے بھی ہوتے ہیں اور بوڑھے بھی مگر اسکا یہ اعتراض اس نظریے کے غلط سمجھنے پر مبنی ہے۔ قدما نے صائب طور پر محسوس کر لیا تھا کہ اقوام مجموعہ ذی حیات ہونیکے لحاظ سے افراد کے مانند جوانی اور بوڑھاپے کے دور زندگی سے گزرتی ہیں، اور فون سوینی نے جرمانیا کے قانونی حلقوں میں اس خیال کو بہت واضح طور پر سمجھا دیا تھا، مگر کسی قوم کی تاریخ میں ان دوران کے سپہم گزرنیکے علاوہ یہ بھی خیال کرنا ضروری ہے کہ ہر قوم کی اپنی خاص اندرونی خصوصیت ہوتی ہے، جس طرح بعض افراد کا مزاج فطرتاً بچوں کا سا ہوتا ہے اور زیادہ عمر پر پہنچ کر بھی انکی یہی کیفیت رہتی ہے اور اسکے برخلاف بعضوں کے مزاج میں پختگی ہوتی ہے اور یہ پختگی سن و ملت میں بھی نمایاں ہوتی ہے، بالکل اسی طرح بعض قوموں میں فطرتاً بچپن اور بعض میں پختگی ہوتی ہے۔ کئی ہزار برس گزر جائے پر بھی جتنی قوم کا مزاج اتنا بچوں کا سا ہے۔ برخلاف اسکے امریکہ کے اصلی باشندوں نے کئی صدی تک پختگی سن کے خصوصیات کا اظہار کیا ہے۔ براعظم یورپ جہاں متعدد قومیں آباد ہیں وہاں بلا اس خیال کے کہ سپانیوں نے کتنے مدارج طے کر لئے ہیں ان کے پختگی سن کا اظہار ہوتا ہے اور جرمانیا سے تو جو نامہ جوش کا۔ بہر حال جوانی ہو یا بوڑھاپا اور بوڑھاپا فطری خصوصیت کے باعث ہو یا حسب معمول، دور ہائے تاریخی کے گزرنے کے باعث، مگر قوم کی حالت کا اثر اس سلطنت پر بڑے غیر نہیں رہ سکتا جس میں وہ رہتے ہیں آئینی شاہی کی مراد وضع قوم بائبل میں پھر غرض یہ کہ مکمل ہوجاتی ہے

پانچواں باب

سلطنت کے تشکال ثانوی کا اصول

سرگروہ سلطنت کی حیثیت پر سلطنت کی مکمل شکل کا دار و مدار ہے لیکن نظام سلطنت کی قانونی حیثیت کو پوری طرح منصفانہ کرنے اور ازسبغ کی تقسیم کی تکمیل کیلئے یہ ضروری ہے کہ دوسرے درجے میں رعایا کے حقوق پر بھی بحث کی جائے۔

سلطنتوں کی
تقسیم یا حقیقت
رعایا۔

جس طرح حکومت کی بحث میں حکمران جماعت پر نظر پڑتی ہے اُسی طرح رعایا یعنی محدود معنی میں قوم کی بحث میں اس امر پر نظر کرنا پڑتا ہے کہ انھیں حکومت پر کس حد تک نگرانی حاصل ہے اور قانون سازی میں اُن کا کیا حصہ ہے۔

تقسیم کے اس اصول کی پیروی کرنے سے حسب ذیل تین (یا چار) ثانوی نکلیں حاصل ہوتی ہیں۔

۱۔ رعایا محض جسم بے جان سمجھی جاتی ہے اور بغیر کسی شرط کے اُس پر حکمران جماعت کی اطاعت فرض ہوتی ہے، انھیں نہ نگرانی کا کوئی حق ہوتا ہے، نہ قانون سازی میں اُن کا کوئی حصہ۔ اس قسم کی سلطنت میں مطلق العنان حکومت ہوتی ہے اور ہم اُسے غیر آزاد شکل کہہ سکتے ہیں۔ سلطنت صرف اُسی صورت میں غیر آزاد نہیں ہے جب وہ کسی خود سر بادشاہ کی خود رایانہ آزر و حرص کی شکار ہو (یعنی خود سر بادشاہی قائم ہو) بلکہ اُس صورت میں بھی وہ غیر آزاد ہے جب کہ حکمران قانون کی پابندی کو تسلیم کرتا اور شخصی ملک و شخصی آزادی کی حفاظت کرتا ہو (یعنی حکومت علی الاطلاق ہو)۔

غیر آزاد

۲۔ رعایا کا کچھ حصہ یعنی طبقات اعلیٰ، نگرانی کا حق رکھتے ہوں اور معاملات عامہ میں انھیں دخل ہو اور اس طرح حکومت محدود ہو جائے لیکن رعایا کا باقی حصہ اور خاص کر ادنیٰ الطبقات کو کسی قسم کا سیاسی حق اور آزادی نہ حاصل ہو۔ یہ سلطنتیں نیم آزاد ہیں۔ انکی مثال ازمنہ وطلی کی وہ سلطنتیں ہیں جو جاگیر دارانہ اصول یا طبقاتی حقوق پر مبنی ہیں۔

نیم آزاد

۳۔ تمام طبقات کو سیاسی حقوق حاصل ہوں۔ تمام ملک و قوم کو حکومت پر نگرانی

آزاد

اور قانون سازی میں شرکت حاصل ہو۔ یہ آزاد سلطنت، یا اس لفظ کے وسیع مفہوم میں جمہوریت ہے (اسی کو "قوم کی سلطنت" بھی کہہ سکتے ہیں)۔

حکومت میں اس شرکت و فکرائی کا علم درآمد یا تو (الف) اہل شہر کی مجالس کی توسط سے براہ راست ہوتا ہے جیسا قدیم زمانہ کی جمہوری سلطنتوں میں تھا۔ یا (ب) بالواسطہ مجالس و نائبین کے ذریعے سے ہوتا ہے جیسا موجودہ زمانے کی نیابتی سلطنتوں میں رواج ہے۔

اب اگر ہم بنیادی شکلوں اور ان ثانوی تقسیموں کو یکجا کریں تو نتائج ذیل حاصل ہونگے۔

۱۔ مذہبی حکومت اپنے اصول کے لحاظ سے غیر آزاد سلطنت کی طرف مائل ہوتی ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ خود سر حکومت ہو کیونکہ ممکن ہے کہ کار فرما خدا یا صاحب الہام کا من و پرہیز امت کے قانون کو تسلیم کرتا اور اس کی عزت کرتا ہو اسلئے اس خدائی حکومت میں جس حد تک ایمانی جماعت یا قومی مجلس کی شرکت ہوگی اس حد تک ممکن ہے کہ وہ دوسری یا تیسری شکل تک پہنچ جائے۔ اس لحاظ سے یہودیوں کی مذہبی حکومت جمہوری تھی۔

۲۔ اعیانی حکومت بالذات دوسری صنف یا نیم آزاد سلطنت کی طرف مائل ہوتی ہے، لیکن جب عوام کو مطلق کسی قسم کے سیاسی حقوق نہ حاصل ہوں تو اسے غیر آزاد سمجھنا چاہئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب روم کی طرح عوام کو حقیقی نیابت کا موقع دیا جائے تو یہ سلطنت ایک آزاد و قومی سلطنت تک ترقی کر جائے۔

۳۔ عمومیت فطرتاً تیسری صنف سے تعلق رکھتی ہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ قلت کیلئے عمومیت خود سرانہ حکومت کی حیثیت اختیار کر لے یا شہریوں کیلئے فرداً فرداً وہ ایک مطلق العنان حکومت بن جائے۔ ماسوا اسکے ملوک طبقے کے لئے (جیسے قدیم زمانے میں غلام اور نیم غلام تھے یا اس زمانے میں امریکہ میں مشنری ہیں) نیم آزاد سلطنت کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔

۴۔ شاہی جو سلطنت کے تمام اصناف میں سب سے زیادہ مختلف النوع ہے وہ ان تینوں صنفوں سے ملکر بہت سی شکلیں پیدا کر لیتی ہے۔ مشرق کی خود سر حکومتیں اور مغرب کی مطلق العنان حکومتیں بدیہی طور پر غیر آزاد ہیں۔ ازمنہ وسطیٰ کی بادشاہتیں اور امانتیں جن پر پادریوں اور ملکی اسپدوں کی روک تاقم تھی وہ نیم آزاد تھیں۔ روم کی بادشاہت کو (جس صورت سے کہ اسے سرویس پولیس نے ترتیب دیا تھا) اور قدیم فریسیوں اور جدید اہل ناروے کی بادشاہتیں آزاد شاہی کے مثال کا کام دے سکتی ہیں، کیونکہ ان سب

سلطنت کے چار بنیادی شکلوں تقسیم کی گئیں

بادشاہتوں میں قومی مجلس کو حکومت میں صریح حصہ دیا گیا تھا۔ زمانہ حال کی آئینی بادشاہت اس آزاد سلطنت کے بہت ہی قریب پہنچ گئی ہے جس میں نیابتی نظام سلطنت رائج ہو۔
 ارسطو کی تقسیم اوپر سے شروع ہوتی ہے اور یہ بالکل بجا ہے۔ ہم نے اس تقسیم کو نیچے سے شروع کر کے اس بحث کی ہے۔ جب ارسطو کی تقسیم کو اس سے ملا کر اسکی تکمیل کرو گئی تو اسکے تمام اعتراضات رفع ہو گئے۔ اب یہ دعویٰ کرنا ممکن نہیں ہے کہ اس میں قطعیت نہیں ہے یا وہ زمانہ حال کی نیابتی عمویت اور آئینی بادشاہت کے باہمی تعلقات یا مطلق العنان بادشاہت اور رائٹہ وسلطی کی محدود بہ حقوق طبقات بادشاہت کے حقیقی فرق کے مباحث سے عاجز ہے۔

تعلیق۔ سلطنتوں کی ان ثانوی شکلوں کو قائم کرنا خیال مجھے گینو رنگ وائٹس کی سلطنتوں کی مختلف شکلوں کی دلچسپ تحقیق سے پیدا ہوا۔ (سیاسیات Politik صفحہ ۱۰۰ وغیرہ) وائٹس جمہوریت، اس سلطنت کو کہتا ہے جس میں حکومت کا انحصار یا تو قوم پر ہو یا قوم کے منتخب کردہ قائم مقاموں پر ہو۔ برخلاف اسکے، بادشاہت وہ ہے جہاں ایک شخص واحد اپنی ذاتی قوت کے بل پر قوم سے بالکل آزاد ہو کر حکومت کرتا ہو۔ وائٹس کے خیال میں ارسطو کی تقسیم، ثانوی تقسیم ہے اور خود اسکی تقسیم اولین تقسیم ہے۔ اس کی رائے کی رو سے روما کی شہنشاہی جمہوریت قرار پاتی ہے اور جرمانی شہنشاہی بادشاہت قدیم رومی سلطنت امپانی بادشاہت ٹھہرتی ہے اور نیولین کی شہنشاہی جمہوریت ہو جاتی ہے لیکن اس ترتیب سے دونوں تقسیموں کے اندر خوبی کے بجائے اتری پیدا ہو جاتی ہے۔ اوپر جو ترتیب دی گئی ہے اوپر کسی بنا حکمران کے اوصاف اور رعایا کے حقوق دونوں پر رکھی گئی ہے نہایت ہی صاف و واضح ہے، اور ارسطو کی تقسیم کے مکمل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ اس سے قابل اطمینان طور پر یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ کیوں آئینی بادشاہت مطلق العنان بادشاہت کے بجائے نیابتی عمویت سے زیادہ قریب ہے۔

چھٹا باب

تصوری یا مذہبی حکومت

مذہبی حکومت سلطنت کی وہ شکل ہے جس کا تعلق نوع انسان کے ہم طبعیت سے ہے سیاسی ارتقا کو سب سے پہلے ایشیا اور شمالی افریقہ میں نشو و نما حاصل ہوا اور یہیں پہلے پہل مذہبی سلطنتیں دکھائی دیں۔

مذہبی حکومت کا
ابتداء کئے عالم میں
پہلی ہونا

نوع انسان کے زمانہ طفولیت میں امداد و ربانی اور فطرت کی پراسرار قوتوں پر انحصار کرنا بہت نمایاں نظر آتا ہے اور انسان کی زندگی یا تعلیم پر خدا یا فطرت کا اثر اُس سے زیادہ بلا واسطہ اور قوی تھا جیسا اسکے بعد رہا ہے۔ قدیم زمانے کے تمام تہذیبی کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی نوع انسان کے ایک یا زائد دیوتاؤں کے ساتھ شخصی تعلقات قائم تھے۔ افلاطون نے یونانی قوم کی جوابدہائی حالت بیان کی ہے وہ تمام دوسری قدیم اقوام کی حالت سے متفق ہے۔ اُس نے مفصل لکھا ہے کہ کیونکر اسوقت کے انسان کی کمزوری اور ناقابلیت خیال کر کے کروٹوس نے آدمیوں کے بجائے انسان سے بالاتر اور خدائی نسل کے دیوتاؤں کو بادشاہ اور حکمران مقرر کیا۔ افلاطون خود بھی اس مذہبی تصور کا جانبدار تھا اور اس قدیم ربانی حکومت کی طرف لوگوں کو مائل کر نیلے لئے اس نے اپنے نظریہ سلطنت میں طرح طرح کے حیلے استعمال کئے ہیں۔

خداؤں اور دیوتاؤں کو سلطنت کا اصل حکمران سمجھنے کے اعتقاد کا نتیجہ تھا کہ قیسوں کا اثر سب پر حاوی ہو جائے کیونکہ فانی انسانوں میں یہی وہ برگزیدہ لوگ تھے جو خداؤں کی خدمت کیلئے وقف ہوتے تھے اور وہی انکی مرضی اور انکے کلام کو سمجھ سکتے تھے۔ لامحالہ اس قسم کی قوموں میں قیسوں کو سب سے اعلیٰ مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ بعض قوموں میں قیسوں پر اور است ایک یا زائد خداؤں کے نام سے حکومت کرتے ہیں بعض میں سلطنت کی زمام حکومت بادشاہوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے مگر ان کی حکمرانی صرف خدا کے نائب اور اُس کے عامل کی حیثیت سے ہوتی ہے اور یا تو وہ خود قیس انکم ہوتے ہیں یا دوسرے

اس سے نیسوی
حکومت لازم
ہو جاتی ہے

قیسوں کے اثر و اقتدار میں ہوتے ہیں۔ اول الذکر کو خالص سلطنت قیسی اور ثانی الذکر کو محدود سلطنت قیسی کہہ سکتے ہیں اور اس سے حکومت مذہبی سے گزر کر شاہی کی طرف قدم آگے بڑھتا ہے۔

میرٹے

میرٹے میں اہل جیش کی سلطنت خالص قیسی سلطنت تھی۔ قیسوں کی ذات سب ذاتوں سے بلند مرتبہ تھی، وہ اپنے گروہ میں سے چند بہترین افراد کو نامزد کرتے تھے اور باوقار رسومات کے ساتھ خدا کن میں سے ایک کو منتخب کر لیتا تھا۔ لوگ خدا کے اس نامزد کردہ شخص کے سامنے فوراً اظہار اطاعت کرتے اور نائب خدا کی حیثیت سے اُسکی وقعت کرتے تھے مگر خدائی قوانین اور قیسوں پر مبنی خدا کے انکشافات کے ذریعے سے اس سردار کے اختیار ہر طرف سے محدود ہو گئے تھے۔ نہایت سخت رسومات نے اسکے جملہ حرکات کو منضبط کر دیا تھا اور اسکے لئے آزادانہ روش کا کوئی موقع باقی نہیں چھوڑا تھا۔ قیس ہر جگہ اسکے ہمراہ اور اسکے کاموں میں شریک رہتے تھے۔ اسکی زندگی تک محفوظ نہیں تھی اگر وہ خدا کو ناخوش کرتا تو خدا قیسوں پر اُسکو نکشف کر دیتا تھا اور وہ خدائی غضب سے اُسے مطلع کر دیتے تھے اور اسکے لئے کوئی چارہ کار سوا اسکے باقی نہیں رہتا تھا کہ وہ خود کشی کر کے خدا کے غصے کو فرو کرے۔

مخلوط قیسی سلطنت کی مثال مصر کی سلطنت میں ملتی ہے، عام روایت یہ ہے کہ اولاً دیوتا براہ راست حکومت کرتے تھے چند صدی بعد انسان بادشاہ ہونے لگے مگر وہ بھی باخدا ہی سمجھے جاتے یا خدا کی اولاد سمجھے جاتے تھے اور اُسکے اختیارات خدائی قانون معینہ رسوم و آداب اور ایک اعلیٰ فرقہ قیسین کے اثر سے محدود تھے۔ خدائی احکام اس قدر جبریت پر حاوی تھے کہ بادشاہ اپنا کھانا تک خود پسند نہیں کر سکتا تھا بلکہ اُس کی قلیل غذا ہمیشہ کیلئے وقف ہو جاتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اُسکی زندگی میں قیس یہ جرات نہیں کر سکتے تھے کہ اُس پر کوئی حکم صادر کریں مگر اُس کے مرینکے بعد وہ ایک عام عدالت قائم کر کے اُسکے متعلق فیصلہ صادر کرتے تھے اور اُسی فیصلے پر اختلاف میں اُس کی عزت کا دار و مدار ہوتا تھا اور دوسرے عالم میں اسکی روح کو اُس کے موافق جزا و سزا ملتی تھی بلکہ اُسکا

حشر ثانی بھی اسی پر منحصر ہوتا تھا۔ اہل مصر کو حیات بعد از موت پر اعتقاد تھا کہ وہ مردے کے جسم کو خراب ہونے سے بچانے کے لئے بے انتہا کوشش کرتے تھے۔ اسکی تزئین میں نہایت اسراف کرتے اور اُسکے رکھنے کیلئے ایسا عمل بناتے تھے جس میں تمام ضروریات زندگی کا لحاظ ہوتا تھا۔ پس ظاہر ہے کہ اُس فیصلے پر کسی کچھ امیہ ویم کی حالت رہتی تھی اور اس ذریعے سے قیسوں کے ماتمیں کسی ہیبت طاقت لگتی تھی۔

قدیم ہندوستانی سلطنت بھی مصر کی سلطنت سے مشابہ تھی اور بالکل تقابلی سلطنت تھی۔ ذات کی ترتیب میں بادشاہ برہمن سے نیچے درجے پر تھا۔ برہمن اپنی راج کی بادشاہ کو دینا اپنی لڑکی کی ذلت سمجھتا تھا۔ بائیں ہاتھ شای غنیمت کا پایہ اس قدر بلند خیال کیا جاتا تھا کہ اُس میں ایک حد تک الوہیت کا شمول سمجھ لیا گیا تھا۔ منو کے قوانین کے موافق بادشاہ کا جسم پاک اور مقدس ہے کیونکہ اسکی ترکیب اُن عناصر سے ہوتی ہے جنکی تخلیق دنیا کے آٹھ خدائی خالقین سے ہوتی ہے۔ وہ آسمان کی طرح آسمان اور دل کو خیرہ کر دیتا ہے اور کوئی شخص اُسے رو رو دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ خدا نے اُسے تمام مخلوقات کے محفوظ رکھنے کیلئے پالیا ہے۔ زمین میں بھی کوئی اسکی تحقیر نہیں کر سکتا اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ایک معمولی انسان ہے کیونکہ ایک بہت بڑی خدائی قوت اسکے اندر موجود ہوتی ہے۔

ہندوستانی بادشاہ کے گرد و پہنوں کا مجمع رہتا تھا۔ تخت نشینی کے وقت لازم تھا کہ وہ اسکی تقدیس کریں۔ سات یا آٹھ وزرا جن سے تمام معاملات میں صلاح لینا اُس پر لازم تھا وہ تقریباً سب کے سب برہمن ہوتے تھے۔ ذی سلم برہمنوں کی صلاح لئے بغیر وہ کوئی اہم کام نہیں کر سکتا تھا۔ نہایت سخت رسوم و رواج نے اُسے پابند بنا رکھا تھا اور اگرچہ منو کے قوانین اسکی ذمہ داری کو بہت قطعی الفاظ میں ظاہر نہیں کرتے تاہم وہ نہایت پرہیزگاری اور افسانوں کی ذمہ داری اُسے یاد دلاتے رہتے ہیں۔ وہ بیوقوف جو اپنی نا انصافی سے اپنی عیبت کو پریشان کرے بہت جلد وہ خود اور اسکا سارا خاندان اپنی سلطنت اور اپنی جان کھو دیکھا۔

پھر بھی ہندوستانی سلطنت چونکہ اعلیٰ آریائی خصوصیات رکھتی تھی اس وجہ سے وہ مصر کی سلطنت سے زیادہ آزاد تھی۔ مصر کے اور مصر کی سست اور کامل سلطنتوں کے مقابلے میں یہاں شاہی عظمت و سطوت زیادہ کامل طور پر ترقی کر گئی تھی مگر ان سب سلطنتوں میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ذات کا طریقہ سختی کے ساتھ قائم تھا اور قیسیوں کو بہت بڑے امتیازات حاصل تھے۔ قوم کی آئینی زندگی بالکل انھیں کے قبضے میں تھی اور دنیاوی ساز و سامان سے بھی وہ باخراط بہرہ اندوز تھے۔ مصر میں وہ ایک تہائی زمین کے مالک تھے اور ہندوستان کا قانون یہ تھا کہ بادشاہ اگر تنگدستی کی وجہ سے مریجی رہا ہو تو بھی کتب مقدسہ کے عالم برہمنوں پر کسی قسم کا محصول نہیں لگا سکتا اور نہ وہ اسکا روادار ہو سکتا تھا کہ ایک ایسا برہمن فاقہ کشی کی تکلیف اٹھائے۔ پیپے طبقے کے لوگ ہر طرح پر پریشان کئے جاتے اور قابل نفرت سمجھے جاتے تھے اور شخصی ترقی کے ذریعے سے اپنی اس سخت قسمت کو آسان بنایا۔ ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مصر کے کسان محض وابستہ اراضی غلام تھے جنکا کام صرف یہ تھا کہ وہ قیسیوں، بادشاہوں اور جنگجویوں کی زمیں کی کاشت کریں۔ گڈے اور دستکار اپنے موروثی پیشے کا کام کرنے پر مجبور تھے۔ ان پر سیرغ محصول لگائے جاتے اور سیاسی تنظیمات میں انھیں کسی قسم کا عملی حق حاصل نہیں تھا۔ ہر قسم کی جبری مزدوری (بیگار) ان مالک میں عام تھی۔

صدیوں تک مذہبی حکومت کی خصوصیت ایشیا کی سلطنتوں میں قائم رہی۔ اور اب بھی مشرقی مالک میں اسکا اثر برابر محسوس ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ملکی حکمرانوں نے جب وسیع ممالک کے فتوحات سے اپنی طاقت بڑھالی تو مذہبی پیشواؤں کا اقتدار اندر پڑ گیا اور انکی منزلت گھٹ گئی، مگر ان حالتوں میں خود حکمران ہی خدا بن گئے اور اس طرح ہر سلطنت کا مذہبی طریق حکمرانی بدستور قائم رہا۔ البتہ اسکی قدیم شکل میں فرق پڑ گیا۔ اولاً خدا بذات خود حکمرانی کرتا تھا اور بادشاہ اور مذہبی پیشوا اسکے کارکن تھے اُس کے بعد حکمرانی آہستہ آہستہ کر کے مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں آنے لگی اور انھیں میں سے یا فوجی لوگوں میں سے

کوئی شخص اُنکے سرگروہ کے طور پر بادشاہ ہونے لگا۔ آخر میں بادشاہ نے خود خدائی عظمت و منزلت حاصل کر لی اور فوق انسانی مطلق العنانی پیدا ہو گئی۔ ایرانیوں کی شہنشاہی میں یہی صورت پیش آئی اور یہاں تک کہ موخر زمانے کے مسلمان سلاطین اور شاہان چین کی بھی کچھ ایسی ہی روش تھی۔

گشتاسب (دشتاسپ) جو شتہ کے قریب ایران کا بادشاہ تھا اور اسکے زمانے میں زردشت کا ظہور ہوا تھا وہ اپنے کو "موبد بادشاہ" کہتا تھا اور ایران کی کتب مقدسہ "زند" و "اوستا" میں ہندوستان کی طرح بادشاہ اہل سیف کی ذات سے نہیں ہوتا تھا بلکہ اسکا شمار موبدوں (یعنی عالمان قانون و مذہب) میں کیا جاتا تھا۔ تمام سیاسی نظم و نسق مذہبی اصول پر تھا قانون اور اخلاق کے درمیان کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ یزدان اور اہرن کا غیر مرئی عالم انسان کے عالم مرئی سے ہمہ وقت تعلق رکھتا ہے، مگر جب ایران میں فرقہ مذہبی سے باہر بادشاہ ہونے لگے تو سلطنت یوں آہستہ آہستہ خود سرانہ ہوتی گئی اور موبدوں کا اثر اگرچہ پھر بھی بہت کچھ باقی رہا مگر قدیم زمانے کا اُتنا نہیں رہا۔ بادشاہ کو ویسی ہی اہم گیر طاقت حاصل ہو گئی جیسے خود اُس خدا کو تھی جس نے اُسے بادشاہ بنایا تھا۔ اُسکا دربار دنیا میں یزدان کے آسمانی دربار کی نقل تھا۔ خدا کے مانند اُسکی تعظیم و تکریم کی جاتی تھی۔ وہ سرخ لباس پہنکر اور سر پر طرہ لگا کر اپنے بلند ہونے کے تحت پرٹھکتا تھا اُس کے ہاتھ میں سونے کا عصا ہوتا تھا اُسکی بغل میں آفتاب کی سی چمک دار تلوار ہوتی تھی اور غیر ملک کے سفیر اسکے سامنے اس طرح زمین بوس ہوتے تھے

عہ۔ (مسلمان بادشاہوں سے تعلق کا خیال مبالغہ پر مبنی ہے۔ اردو مستزہم۔)
عہ (یہاں ہونا چاہئے تھا۔ "ایران کی مقدس کتاب اوستا" بمطبعی کے زمانے تک تقریباً سارے مصنف یہ غلط خیال رکھتے تھے کہ زند اور اوستا دو کتابیں ہیں حقیقت میں "اوستا" اہل مقدس کتاب ہے اور "زند" اور "بازند" اسکے ترجمے اور تفسیریں ہیں۔ اردو مستزہم)

عہ فرس کی تعریف "چند اوراق زردشت کے مذہب کے متعلق" (Fragmente ueber die Religion des Zoroastro) صفحہ ۳۳ تا ۴۹۔ متبادل کروا پیگل تعریف "اوستا"

لائپزگ ۱۸۵۲ء

جیسے کوئی غلام اپنے آقا کے سامنے یا عبادت کرنا والا اپنے خدا کے سامنے سر بسجود ہو۔ اس کے سامنے مذہب اس طرح پیش ہوتی تھیں جیسے خدا کے سامنے قربانی پیش ہوتی ہے اور جب وہ مر جاتا تو اٹھ کر (Persipolis) کے شاندار مقبرے کے اندر رکھا جاتا تھا کہ وہاں وہ (ظاہری موت کے بعد بھی) اپنی تبرک زندگی کا سلسلہ قائم رکھے۔ بادشاہ مقدس راسم اور مجنہ رسوم سے موثر ہوتا مگر درحقیقت یہ مراسم اُسے ایک زمین جال کی طرح سے گھیر لیتے تھے۔ اسکی تمام آزادی جاتی رہتی تھی اور اُسکا پُر خرازا تیز سطلق ایک مغلکے جاتا تھا۔

بائیں ہندو مذہبی فرقے سے نکل کر سطلق العنان شاہی کی طرف بڑھنا ترنی کا ایک قدم آگے بڑھنا تھا۔ ستاروں کی گردش کو مذہبی فرقے کے لوگ خدائی الہام جانتے تھے اور اسی سے امور سلطنت کو بھی طے کرتے تھے اور سلطنت کے احکام کو خدائی احکام سمجھ کے ایسا اٹل بنادیتا تھا کہ اُن میں ایک نقطے کی کمی بیشی ممکن نہ تھی۔ اُنکی ان سخت بندشوں کو اس تغیر نے شکست کر دیا۔ مطلق العنانی ہی سہی مگر معاملہ عام میں ایک آزاد انسان کی رائے اپنا عمل کرنے اور سیاسی حالات کے تغیر اور قوم کی نئی ضروریات پر توجہ کرنے لگی اس طرح ذات کی آہنی پٹری ایران میں بہت پہلے ٹوٹ گئی۔

قدیم مذہبی حکومتوں میں سب سے زیادہ نمایاں حکومت یہودیوں کی حکومت تھی جو حضرت موسیٰ کے ارشادات کے بموجب قائم ہوئی تھی موسوی مذہب کی پاکیزگی اور دنیا کے بنانے اور قائم رکھنے والے خدائے واحد پر پکا ایمان وہ مستحکم بنیاد تھی جس پر یہودیوں کی مذہبی حکومت کی عمارت تعمیر ہوئی تھی۔

یہودیوں کی
حکومت مذہبی

یہودیوں میں خود خدا یا وہ (ایاہوا (Gehovah) کے

نام سے بادشاہ تھا، وہ ایک فانی مگر برگزیدہ قوم کا غیر فانی رب تھا وہ مقنن بھی تھا اور حکم ان بھی تھا۔ وہ تمام نظام قانون جسے ہم موسوی قانون کہتے ہیں، اُس خدا کا الہام کردہ قانون سمجھا جاتا تھا جس سے حضرت موسیٰ قلعہ کوہ کی تنہائی میں ہمکلام ہوتے جس کے احکام کو وہ خوف و دہشت کے ساتھ قبول کرتے، اور اپنے رب کے حکم کے مطابق حرف بحرف اپنی امت میں انھیں شائع کرتے تھے۔ کوہ سینا پر رعد و برق سے خدا کی موجودگی کا اظہار ساری امت پر ہوتا تھا۔

اس ربانی حکومت سے تمام قوم کی سطح بلند ہو گئی تھی، مگر مصر میں لوگ ہنوز

اُس سے نفرت کرتے اور ہر اعلیٰ ذات والا مصری یہودیوں کو مردود سمجھتا اور یقین کرتا تھا کہ اُن سے میل جول رکھنے سے انسان نجس ہو جاتا ہے۔ اب انکے خیالات اس تصور سے بلند ہو گئے تھے کہ وہ خدا کے برگزیدہ اور پسندیدہ لوگ (امت) ہیں۔ اگرچہ وہ خاندانی قبائل میں تقسیم تھے اور ان میں سے لیوی (Leui) قبیلہ خاص طور پر مذہبی قبیلہ تھا مگر وہ سب کے سب حضرت ابرہیمؑ اسحاقؑ اور یعقوبؑ کی اولاد میں سے تھے اور ساری قوم مذہبی مشیواؤں کی ایک قوم مانی جاتی تھی۔ معہذا ذاتوں کا مین امتیاز اصولاً اٹھ گیا تھا اور قبائل کی برادری نے ایک اصول کی حیثیت حاصل کر لی۔

خدا کا قانون ایک تابوت کے اندر رکھا ہوا تھا جس پر سونا چڑھا ہوا تھا اور اس کے اوپر زریں عرشِ جنت تھا دو کرویاں اسکی حفاظت کرتے تھے اور اہلکامات ربانی کے مقام کے طور پر لوگ اُسے مقدس سمجھتے تھے تابوت اور عرشِ رحمت، دونوں مقام اقدس کے اندر قبۃ العہد (Tabernacl) میں ایک پردے کے پیچھے رکھے ہوئے تھے اور یہ قبہ گویا خدا کا قیام گاہ سمجھا جاتا تھا اور احبار نہایت احتیاط کے ساتھ اسکی حفاظت کرتے تھے۔ یہیں پر ربی اعظم، یائوسے کے احکام حاصل کرتا اور انھیں لوگوں کو سناتا تھا۔ ربی اعظم موسیٰ کے بھائی ہارونؑ کی اولاد میں ہو سیکے باعث مرضی خدا کے اظہار کا طبعی ذریعہ تھا اور خدا کے حضور میں اپنی قوم کا نائب بھی تھا۔ مستثنیٰ طور پر نازک وقتوں میں یائوسے، نبی بھیجتا تھا تاکہ وہ اسکے احکام کی طرف سے لوگوں کی غفلت کو دفع کریں۔ بادشاہوں یا خود امت کے خوابیدہ ایمان کو بیدار کریں، مذہب کے ترک کرینکی سزا دیں، استغفار اور کفار سے کی تاکد کریں اور امت کی آئندہ قسمت کا اظہار کریں۔ قبائل میں عدل رسی کے انتظام کے لئے جو قضاۃ مقرر ہوتے تھے وہ یائوسے کے نام سے احکام نافذ کرتے تھے کیونکہ عدالت خدا ہی کی ہے، اسلئے اُن پر لازم تھا کہ فیصلہ میں کسی کے رتبے کا خیال نہ کریں بلکہ ادنیٰ و اعلیٰ سب کی سنیں اور کسی انسان سے خائف نہ ہوں۔ اگر کوئی مقدمہ انکی قوت فیصلہ سے باہر ہوتا تو اُن کو لازم تھا کہ قبۃ العہد کی طرف رجوع کریں اور وہاں سنیں کہ خدا برہیوں کی زبان سے کیا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ اُنکا فرض تھا کہ اس فیصلہ کی تعمیل کریں ورنہ اپنی جان دیدیں۔

بطرح کہ قوم یائوسے کی سخت مگر بابرکت حکومت کی رعایا بھی ہی طرح سے ایضاً موعودہ کی

تعامہ اراضی یا وے کی ملک تھی، اور مختلف خاندان محض مستاجر کے طور پر اس پر قابض تھے۔ خدا کی ملکیت کے اقرار میں زمین اور مویشی کی پیداوار کا دسواں حصہ ربیوں کی گزر اوقات کے لئے قبتہ العہد میں پیش کرنا لازم تھا۔ جس طرح انسان کیلئے ہر ساتواں دن آرام کا دن تھا اسی طرح زمین کے لئے ہر ساتواں سال آرام کا سال تھا۔ اس سے وہ زمین بھی مستثنیٰ نہیں تھی جس پر کاشت نہ ہوتی تھی جب اسی طرح ساتواں برس سات مرتبہ ہو چکنا تو جشن کا زمانہ آتا اور زمین از سر نو تقسیم کی جاتی، اور افلاس زدہ خاندانوں کو انکی زمینیں واپس لیا تیں اور جن لوگوں نے دولت جمع کر لی ہوتی انھیں اپنی دولت کا زائد حصہ چھوڑنا پڑتا تھا۔ کوئی یہودی کسی حال میں غلام نہیں بنایا جاسکتا تھا۔ اگر افلاس کی وجہ سے وہ خود اپنے کو فروخت کرنے پر مجبور ہوتا تو وہ ایک اجرتی خادم یا مزدور سمجھا جاتا اور جشن کے سال میں آزاد ہو جاتا تھا۔ یہودیوں میں غلام ہمیشہ غیر نسل کے ہوا کرتے تھے۔

بعد کے زمانے میں جب یہودیوں نے اپنے میں ایک بادشاہ ہونیکی خواہش کی
لہذا کہ وہ بھی دوسری قوموں کی ہمسایہ کر سکیں تو یواوے نے امن کے قاضی القضاۃ
شموئیل (سموئیل) نبی کی زبان سے انکی اس خواہش کے پورے ہونیکی انھیں اطلاع دی۔
اور خود نبی کو ان الفاظ میں تسلی دی کہ ان قوم کے لوگ تم سے جو کچھ کہیں اُسے سنو۔
کیونکہ انھوں نے تم سے نہیں بلکہ تجھ سے انکار کیا ہے تاکہ میں اُن پر حکمرانی کر دوں پس
بصرف سلطنت خالص مذہبی حکومت سے گزر کر شاہی بن گئی مگر یہ شاہی ہمیشہ ایک
حد تک مذہبی رہی اور قوم یہودی کی سرپا مذہبی طبیعت اور مقصد کا اُس پر اثر پڑتا رہا۔

یورپ میں اس قدیم حکومت مذہبی کا اثر کہیں خال خال نظر آتا ہے اور وہ بھی کمزور۔ رومی قیصر کا لیگواسونے کی ڈاڑھی لگائے ہوئے اور پٹی کی سی جھک کے ساتھ جوڑا (مشرقی) کی حیثیت سے عوام میں ظاہر ہوتا۔ ہیلوگابلس ایک فیس کی حیثیت سے آفتاب کو مذخر تھا تا ہے۔ سوزر لینڈ کے حصوں میں گیسٹر آزاد پہاڑیوں کو حکم دیتا ہے کہ فہنشاہ کی ٹولی کی حکمت کریں۔ یہ سب ایک سلطنت کی تباہ شدہ شکل کے

۱۱۰ سمبولیک، ہفتہ

سہ (برائی شمول) (شر ساکن اور ی مجموعی) کا معنی ہے سموع کل۔ اردو مستبحم)

صرف خا کے ہیں اور انھیں دوام حاصل ہونیکا کوئی حق نہیں ہے مگر حکومت مذہبی کے کچھ آثار رومی شہنشاہی میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً زندہ شہنشاہوں کے عیسوں اور ان کے مندر میں کا بننا۔ مرنیکے بعد انھیں ”خدا کے نام سے یاد کرنا۔ زمانہ مابعد کے بڑھپنی و بار کے آداب و رسوم بھی اسکے شاہد ہیں۔

ازمنہ وسطیٰ میں پادریوں کے اثر نے عیسوی سلطنتوں کو ایک طرح کی مذہبی حکومت کا رنگ دیدیا تھا کیونکہ یہ لوگ ہمیشہ مذہبی حکومت کے اصول کے قائل رہے اور اُس پر زور دیتے رہتے تھے یہ رنگ دنیاوی اور مذہبی دونوں قسموں کی امارتوں میں نمایاں تھا لیکن آخر الذکر پر طبعاً یہ رنگ زیادہ گہرا چڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ شہنشاہ کیلئے ضروری تھا کہ وہ اہل مذہب کے ہاتھ سے تقدیس حاصل کرے۔

لیکن ازمنہ وسطیٰ میں لوگ ہر قسم کے استحقاق و اقتدار کو خدا کی طرف منسوب کر نیکے کیسے ہی شایقی کیوں نہ رہے ہوں، انھوں نے اپنے حکمرانوں کو کبھی انسان سے زیادہ نہیں سمجھا اور انھوں نے انکے اختیار پر بے شمار انسانی قیود عائد کر دیئے تھے۔

یورپ میں حقیقی مذہبی حکومت کلیسا نے عیسوی ہے جسے پادریوں نے اپنی حکومت مقدس بنا لیا ہے۔ دنیاوی حکمرانوں اور حکومتوں کو کلیسا ہمیشہ انکی انسانی حیثیت یاد دلاتا رہتا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ کی سلطنتوں کی بنیادی شکل و حقیقت مذہبی حکومت کے بجائے ایمانی یا شاہی حکومت کی ہے۔

برخلاف اسکے ازمنہ وسطیٰ میں جو اسلامی سلطنتیں قائم ہوئیں انکی نوعیت کے لحاظ سے ہم انھیں مذہبی حکومت کہہ سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان، یہودیوں کی طرح یقین نہیں رکھتے تھے کہ خدا براہ راست اور باقاعدہ حکمرانی کرتا ہے۔ انھیں صرف اللہ علیہ وسلم نے عیسوی مذہبی حکومت کو دوبارہ قائم نہیں فرمایا مگر قرآن شریف نے یہ تسلیم دی ہے کہ

(ب) سات الگ الگ انتخاب کنندے جب ایک حکمران کو منتخب کر دیتے تھے تو وہ ”شاہ روسیاں“ کا لقب امتیاز کرتا تھا وہ باضابطہ اس وقت تک شہنشاہ نہیں ہوا جب تک کہ پوپ اسے تاج نہ پہنائے اور اس میں اکثر تاخیر ہوا کرتی تھی۔ چارلس تیسم آخری شہنشاہ تھا جس نے پوپ کے ہاتھ سے تاج پہنا۔ انکے جانشینوں نے انتخاب کے ساتھ ہی ”شہنشاہ“ کا لقب اختیار کیا۔ مثلاً میں فرانسس ثانی کے دست کش ہو جائے پھر جس رومی شہنشاہی کا خاتمہ ہو گیا۔

خدا جسے چاہتا ہے حکومت عطا فرماتا ہے اور اسکی رو سے سلطنت کا حکمران خدا کا مقرر کیا ہوا عامل اور نائب خدا ہوتا ہے۔ اسلام کے سیاسی نظم کا منہائے خیال خلافت ہے اس میں امام اور بادشاہ دونوں کے فرائض داخل ہیں۔ گویا خلیفہ شہنشاہ بھی ہے اور پوپ بھی مذہب اور قانون کے درمیان اور دینیات اور فقہ میں کافی امتیاز نہیں کیا جاتا جو علمائے دین ہیں وہی فقہ بھی ہیں۔ عیسویت کی بہ نسبت اسلام مذہبی حکومت سے زیادہ موافق ہے۔

دنیا نئے جدید سلطنت کے اس مذہبی انداز اور اس سے مشابہت پیدا کر نیوالی تمام چیزوں کے علائقہ خلاف ہے۔ مذہبی امارات کا توڑ دینا۔ اور شاہ میں پوپ کے دنیاوی اختیارات کا سلب کر لینا اس زمانے کے میلان کے شاہد عادل ہیں۔

مذہبی رنگ کی سلطنتوں کے عام خصوصیات حسب ذیل ہیں :-

۱۔ اُن میں مذہب اور قانون، مذہبی اور سیاسی تنظیمات، اقوال بہت ہی خلط ملط ہو جاتے ہیں اور وہ اس طرح پر کہ مذہبی جبر کو غلبہ حاصل رہتا ہے۔ حیات بعد ممات کا خیال دنیاوی زندگی پر اس قدر طاری ہو جاتا ہے کہ اسکے آزادانہ نشوونما میں خلل پڑ جاتا ہے۔

۲۔ اصول اقتدار فوق انسانی حد تک بلند ہو جاتا ہے اور از خود اُس میں مطلق العنانی پیدا ہو جاتی ہے۔ تمام معاشری و سیاسی زندگی اُسی میں منحصر ہو جاتی ہے۔ حاکم و محکوم کے درمیان انسانی تعلق باقی نہیں رہتا۔ مشترک حب الوطنی، مشترک قومیت اور مشترک کفصل کا واسطہ جاتا رہتا ہے۔ حکمران کی وقت و عظمت کو کوئی پہنچ نہیں سکتا، اور وہ حاکم علی الاطلاق بن جاتا ہے۔

۳۔ جب یہ اقتدار ایسے وحی و الہام پر مبنی ہو جاتا ہے جب کا سلسلہ توں قبل منقطع ہو چکا ہے۔ جیسے یورپوں میں موسوی احکام اور مسلمانوں میں قرآن شریف، تو اس میں ایک مستحکم مرکز قابل تغیر نظم قائم ہو جاتا ہے۔

لیکن اگر اسکے خلاف یہ صورت سمجھی جائے کہ تغیر پذیر حالات اور وقتی ضروریات کیلئے خدا نئے احکام جاری کرتا رہتا ہے تو اُس کے انسانی قائم مقاموں کے لئے اُس خدائی مرضی کے سمجھنے کے صرف دو طریقے ہوتے ہیں یا تو اسکے اظہار کی کوئی معینہ ظاہری علامت ہوتی ہے یا اسکا مسلم باطنی انکشاف سے ہوتا ہے۔ کلدانیوں نے اول الذکر طریقے پر چل کر ستاروں کی شناخت سے کام لیا۔ یہودیوں نے طلوع آفتاب کی حالت پر

نظری - رومی کا ہنوں اور چین گویوں نے قربانی کے جانوروں کی آنتوں اور جڑیوں کے اڑنے سے شگون لئے۔ یونانیوں نے خاص خاص مقامات میں الہامی قوت سمجھ کر ان مقامات سے سوال کئے اور جرنیوں نے ہانوں سے کام لیا۔ ہس سے ہمیشہ ہم پرستی اور فریب دہی کا زور رہا۔ دوسری جانب انکشاف پر اعتماد کرنے سے تو اُنے ذہنی اپنے فعل سے معطل ہو جاتے ہیں، اور متوقع انکشاف پر ایک غیر معمولی اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مذہبی حکومت میں تو اُنے انسانی جمہوریت و حکومت کے حالات کے فیصلے کے لئے لازمی ہیں، بہت ہی نامکمل طور پر ترقی کرتے ہیں اور کبھی اُن پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

۴۔ دنیاوی حکام قیسوں کے تابع ہوتے ہیں جو اپنے کو خدا سے زیادہ قریب سمجھتے ہیں۔ اگر وہ خود براہ راست حکومت کرتے ہیں تو سلطنت صاف طور پر مذہبی سلطنت ہے اور اگر کوئی دنیاوی بادشاہ بھی اُنکے ساتھ شریک کا رہتا ہے تو بھی پس پردہ قوت انھیں کو حاصل رہتی ہے اور مذہبی سلطنت کی صرف صورت پوشیدہ ہو جاتی ہے۔

ہر ایک مذہبی گروہ میں عورتوں کی سی کچھ نہ کچھ کمزوری ضرور ہوتی ہے، اس لئے لامحالہ مذہبی سلطنت میں مردانہ قوتیں زمانہ قوتوں کے تابع ہو جاتی ہیں اور خود اعتمادی و آزادی کبھی پوری طرح نشو و نما نہیں حاصل کرتی۔ اہل مذہب کی حکمرانی میں عام لوگوں کو ہمیشہ قہر میں پیش آئیں گی اور وہ پس پشت ڈالنے جائیں گے۔

۵۔ جرم کے قوانین سخت اور سزائیں ظالمانہ ہوتی ہیں۔ انسانی عدالت کا حکم خدا کے غضب کا قائم مقام سمجھا جاتا ہے۔ عقل انفرادی کو کام میں لانا ایک فعل شنیع تصور ہوتا ہے۔ اور انسانی ساقی بھی اجداد خداوندی کی ہتک سمجھا جاتا ہے۔

۶۔ قوم کی تسلیم تمام فرقہ مذہبی کے ہاتھ میں آ جاتی ہے۔ مدارس مذہبی اغراض کے حاصل کرنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ علوم و فنون اور تمام مذہبی کمالات کی وہیں تک ہمت افزائی کی جاتی ہے جہاں تک وہ مذہبی اغراض کو پورا کریں اس کے سوا سام طور پر علوم و فنون مشتبہ نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور اُن سے اغراض ہوتا جاتا ہے اور اگر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اُن سے مذہبی

اقتدار پر کوئی اثر پڑے گا تو وہ حکماً ممنوع قرار دیدئے جاتے ہیں اور اُن کے
 پڑھنے پڑھانے والوں کو سزائیں دی جاتی ہیں علم و ہنر میں فی نفسہ کوئی خوبی نہیں
 سمجھی جاتی نہ وہ ذہن انسانی کی آزادانہ تخلیق خیال کئے جاتے ہیں بلکہ وہ محض
 مذہب کے غاشیہ بردار تصور ہوتے ہیں۔

ساتواں باب

شاہی کی بڑی بڑی قسمیں

روئے زمین کی مختلف قوموں میں سلطنت کی سب سے زیادہ مسلمہ شکل شاہی ہے۔ یہ شکل تمام براعظموں میں پائی جاتی ہے۔ ایشیا اور یورپ میں تقریباً ہر جگہ یہی شکل ہے اور تاریخ کے شروع ہونے سے اس وقت تک یہی حالت رہی ہے۔ مگر شاہی کا پھیلنا اور اسکی صورتیں ایک دوسرے سے اس قدر متاثر ہیں کہ انھیں حسی اصفانہ میں نصف ظاہر کا شکل ہے۔ ۱۔ سلطنت نے جب مذہبی طریق حکومت سے گزر کر انسانی بادشاہت کی شکل اختیار کی تو اس نے خود سری کی شکل اختیار کی۔ یہ شکل ایشیا میں بالخصوص زیادہ مروج ہوئی۔ خود سر حکومت کا خاص نشان یہ ہے کہ تمام حقوق بادشاہ کی ذات واحد میں اس طرح جمع ہو جائیں کہ اس سے ملحدہ یا اس کے مخالف کوئی حق باقی نہ رہے۔ لیکن اسے کہ وہ خود اپنے اوپر مذہبی یا اخلاقی ذرائع کے قیود کو تسلیم کرے یا اپنے کو خدا کا ذمہ دار سمجھے مگر رعایا کے حقوق سے اسکی طاقت پر کسی طرح کا حصہ نہ ہو کیونکہ رعایا اس کے آزادانہ رحم و کرم کے بندے اور اس کے تابع ہیں۔

اس قسم کی خود سر حکومت خود کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے کسی حد تک خدا کے اقتدار مطلق کی طرف رجوع کرتی ہے۔ خود سر حکمران کو مذہبی حکومت سے بہت گہرا تعلق ہے اور باوجود حکمران کے انسانی حیثیت کے اس میں مذہبی حکومت کے عناصر موجود ہیں۔ ازمنہ وسطیٰ کی اسلامی سلطنتوں میں خود سری کی جانب یہ میلان موجود تھا اور صرف اب ہمارے زمانے میں وہ ایک گونہ بقیہ یورپ کی انسانی شاہی کی حد کے قریب پہنچی ہے۔

۲۔ خود سرانہ حکومت کو شاہی کی حشیانہ شکل کہہ سکتے ہیں۔ آریائی نسل کی قوموں نے اسے ذلیل سمجھ کر مدت سے ترک کر دیا اور بادشاہوں اور حکمرانوں سے ملحدہ طبقات و افراد کے حقوق کو تسلیم کر لیا ہے۔ رعایا اپنے کو غلام نہیں بلکہ آزاد سمجھتی رہی ہے جب کبھی

ایسا ہو کہ اقتدار شاہی خود سری کی حد کو سنجیدہ معلوم ہو اور عایا نے اسے انصاف خیال کیا اور پہلا ہی موقع ملنے پر انھوں نے بادشاہ کو اپنے حقوق کی وقعت کرنے پر مجبور کر دیا ہے اس نئے مہذب شاہی حقوق عامہ کی حفاظت کے لئے ہمیشہ عدالتی انتظام سے مشروط و محدود رہی ہے۔ اس سے بادشاہ کی منزلت و طاقت کھٹنے کے بجائے بڑھ جاتی ہے کیونکہ ایک غلامانہ ابنوہ کی حقیرانہ اطاعت کی رہبری کر نیکیے بجائے ایک آزاد قوم کی سیاسی قوتوں کی رہنمائی کرنا زیادہ سہل و آسان اور شریفانہ کام ہے۔ سلطنت میں جس قدر زیادہ لوگوں کا اتحاد اور زور شامل ہوگا اور جس قدر اسکے ارکان کو آزادانہ ترقی کا موقع حاصل ہوگا، اسی قدر اس کا نظم و نسق مکمل ہوگا مگر یہ صرف مہذب شاہی ہی ممکن ہے، خود مختار حکومت میں بالکل ناممکن ہے۔

انسان نے اپنی عقل کے مطابق مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں اُن قطعی حدود کے تعین کی کوششیں کی ہیں جو شاہی پر عائد ہونا چاہئے۔ ایک قدیم ترین شکل خاندانی یا پدر سری بادشاہت مسمیٰ ہے۔ بادشاہ کسی خاص خاندان کا سرگروہ اور تمام نسل کا بزرگ اور باپ سمجھا جاتا ہے یہ قدم سادہ انتظام جو ہندوستانی اقوام کے ہزار پائی میں اور جاپانی قبائل کے کوننگ میں پایا جاتا ہے اسکا انضباط خاندانی تعلقات و خیالات سے ہوتا ہے۔

اسی طرح ازمنہ وسطیٰ کی موروٹی امارتیں خواہ وہ جاگیر طریق کی ہوں یا براہ راست حکمرانی کرتی ہوں، شخصی ملک و حفاظت کی تعلیمات سے متعین نہیں۔ خاندانی حقوق اور سلسلہ حکمرانوں کے خیالات کا اُن پر اثر پڑتا تھا مگر اُن میں بھی سلطنت کے ساتھ ملک انہی خطہ مطبوعہ جاتی ہے اور حکمران کی ملکیت کا حق بھی داخل ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں شکلیں جن میں سیاسی ادراک نے ابھی پوری طرح نشوونما نہیں پایا ہے شاہی کی نامکمل صورتیں کہی جاسکتی ہیں۔

۳۔ جب کہ سیاسی ادراک میں صرف جزوی بیداری پیدا ہوئی ہو اور اسکا رجحان حکمران قوت کے صرف ایک فرض کی انجام دہی کی طرف ہو تو اسے شاہی کی یکطرفہ شکل کہہ سکتے ہیں۔ اس صورت میں جب مقدم خیال فوجی ضرورت کی طرف ہو تو اسے فوجی ولایت کہیں گے، ورنہ جب حاکم انصاف ہی حکمران ہو تو اسے عدالتی ولایت

نہیں گے۔ اول الذکر زیادہ مطلق العنان اور زوردار ہوتی ہے۔ اور ثانی الذکر نسبتاً زیادہ مفید اور باہن ہوتی ہے۔
۴۔ جب حکمران میں سیاسی اور ایک بہت زیادہ ترقی کر جاتا ہے تو مرکزی قوت بغیر تمام
اسکے ہاتھ میں آجاتی ہے اور رعایا کو کسی قسم کے سیاسی حقوق نہیں حاصل ہوتے
یہ شاہی علی الاطلاق، جیسا کہ خود سری کے مقابلے میں حکومت کی ایک مہذب
شکل ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس شکل میں بادشاہ ایک عدالتی تنظیم کو تسلیم کرتا اور
کم از کم اصولاً اسے موثر سمجھنے پر رضامند ہوتا ہے۔ موجودہ سلطنتوں کی بہ نسبت
رومی شہنشاہی میں یہ قوت زیادہ مطلق العنان تھی بلکہ ازمنہ وسطیٰ تک میں آزادی کی
نشو و نما اور عیسائیت سے اس مطلق العنانی میں روک پیدا ہو گئی تھی۔

۵۔ محدود شاہی زیادہ مسز ہو چکے ساتھ ہی زیادہ متناسب بھی ہوتی ہے۔ اس میں
مرکزی قوت کی وحدت و فوقیت قائم رہتی ہے اور اسکے ساتھ ہی قوم کے تمام طبقات
و افراد کی آزادی بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی شاہی بطرح زمانہ حال میں دنیا بھر
اور آئینی صورتوں سے محدود ہے اسی طرح ازمنہ وسطیٰ میں امرا و طبقات
رعایا کے حقوق خاص سے متعین تھی۔

۶۔ شاہی کی بحث میں یہ ضروری ہے کہ بادشاہی اور شہنشاہی میں فرق کیا جائے
یہ فرق ترقی کے تمام مدارج میں پایا جاتا ہے۔ خواہ ایشیا کی جیسا کہ خود سر حکومت ہو
یا یورپ کی مہذب سلطنت۔

بادشاہی کے خیال کا تعلق قوم سے ہے۔ شہنشاہی کا تعلق انسان سے ہے۔
بادشاہی نام ہے، ایک واحد قومی سلطنت کی تنظیم اعلیٰ کا برخلاف اسکے شہنشاہی
دنیا کی حکمرانی ہے۔ جس طرح نوع انسان کو مجموعاً منفرد اقوام پر فوقیت
حاصل ہے، اسی طرح شہنشاہ کا درجہ بادشاہوں سے بلند ہے۔ مثلاً شہنشاہیوں
کے حکمران ہمیشہ بادشاہوں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ قیصر جو کیس لے خیال
پیدا کیا کہ روم کی عالمگیر سلطنت قائم ہو اور تاریخ نے سلطنت کے اس اعلیٰ خیال کو
اسی کی جانب منسوب کر کے اسکا نام "قیصریت" رکھ دیا، لیکن اس خیال کی
پوری تعبیر اس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک کہ دنیا اس درجہ تک ترقی نہ کر جائے
کہ تمام بنی نوع انسان کا ایک عالمگیر نظم قائم ہو جائے جب تک یہ نہ ہو

اُس وقت تک شہنشاہی کے دوبارہ قائم کرنیکی تمام کوششیں مثل سابق کے
جسذوی اور نامکمل ہوں گی۔

۱۔ ”تہذیب“ کے تخیل و تاریخ کے تعلق ”جرمانی قاموس سیاسیات“ (Deutsches
staatswoerterbuch) میں اس کے متعلق مضمون کو دیکھنا چاہئے۔

اصحوال باب

(الف) یونانیوں اور جرمانوں میں خاندان بادشاہی

یونان اور جرمانیا کی ابتدائی زمانے کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ان دونوں قوموں کے قبیلوں اور سلطنتوں کی باگ بادشاہوں کے ہاتھ میں تھی اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان قوموں میں سلطنت کا خیال کیا تھا اور وہ اسے کس طرح چلاتی تھیں اور یہ کہ ان دونوں قوموں کے قبیل اور عمل میں کیسی تعجب خیز یکسانیت تھی۔ برخلاف اسکے قدیم روپیوں میں (جو زمانے کے اعتبار سے ان دونوں قوموں کے درمیان ہیں) بادشاہی کا خیال اپنی اہم خصوصیات میں ان دونوں سے مغاثر ہے۔

یونانیوں اور جرمانوں کی بادشاہی سلطنت کی ایک ایسی شکل تھی جو مشرق کے شخص واحد کی مذہبی حکومت کی صورت سے منقلب ہو کر انسانی اور سیاسی تنظیم کی شکل میں آگئی تھی۔ اسکے بادشاہ اپنے نسب کا سلسلہ عموماً دیوتاؤں سے لاتے تھے، یونانی زیادہ تر زمرے اس سے اور جرمانی ووڈن (یا اوڈن) سے، اور عوام بھی اس عقیدے کو مانتے تھے؛ مگر باوجود اس خدائی رشتہ داری کے بادشاہ خود انسان تصور کیے جاتے تھے اور انسانی پابندیوں کے بھی تابع تھے۔

اس لئے بادشاہ کی جس قدر عزت کیجاتی تھی وہ اسکے اختیارات سے بہت بڑھی ہوئی تھی۔ وہ دیوتاؤں کے سامنے قوم کا قائم مقام ہوتا تھا اور قربانی اور عبادت کی انجام دہی جب کسی خاص فرقہ کے پرہت سے متعلق نہیں ہوتی تھی تو قوم اور دیوتاؤں کے درمیان بی ہونگی حیثیت سے ان کاموں کو بھی بادشاہ ہی انجام دیتا تھا۔

۱۔ ارسطو، "سیاسیات" اسکینڈینیویہ ملک میں یہ خصوصیات جبقہ ردایاں ہیں اس قدر کسی جرمانی سلطنت کی معلومہ تاریخ میں نظر نہیں آتے (اگرچہ شاہ ناروے) اگرچہ سیاسیات کی جانب مائل تھا مگر منہ زکافر کاشتکاروں کی وجہ سے مجبور ہو کر اسے قدیمی طرز پر تنگ میں قربانی کرنا، جلم مقدس میں شراب پینا اور کھوڑے کا گوشت کھانا پڑتا تھا۔

چنانچہ ایٹھن میں جب شاہی کا خاتمہ ہو گیا۔ تب بھی وہ ارخون (عہدہ دار) جس کے سپرد قربانی (یا نذر نیاں) کا کام تھا، بادشاہ ہی کے لقب سے موسوم تھا۔
 بادشاہوں کی مالی قدر قیمت دوسرے ارکان ملت کے نسبت بہت زیادہ سمجھی جاتی تھی۔ جسراٹیا میں بادشاہ کی دیت بالعموم امرا کی دیت سے چند و چند زیادہ ہوتی تھی۔ دولت کے اعتبار سے بھی وہ اپنی رعایا سے بہت بڑھے ہوئے ہوتے تھے۔ زمین کا بہت بڑا حصہ ان کی ملک میں ہوتا تھا اور مفتوحہ علاقے میں انھیں سب سے بڑا حصہ ملتا تھا۔ اُنکی قیام گاہ واپس اور مکانات کے مقابلے میں زیادہ بلند، زیادہ وسیع زیادہ خوبصورت اور زیادہ آراستہ و پیراستہ ہوتے تھے۔ اُنکے خزانے جواہرات اور زیورات سے مالا مال ہوتے تھے۔ اُنکے شاہی منصب کیلئے خارجی علامات بھی ہوتے تھے۔ مثلاً یونانیوں کے ہاں عصائے شاہی اور جرابیوں کے ہاں جریب شاہی اُنکے بیٹھے کیلئے ایک بذتخت ہوتا تھا۔ جرابانی بادشاہوں کے آگے آگے بھٹکا بھی ہوتا تھا جس سے انکی جنگی طاقت کا انہما مقصود تھا۔ یونانیوں کے ہاں بادشاہ کے برآمد ہونے وقت نقیب اعلان کرتے اور لوگوں کو خاموشی کا اشارہ کرتے تھے۔ فرانکی بادشاہ زیبا نش کے طور پر کاکلیں رکھتے تھے۔ بادشاہ کا لباس ہمیشہ شاندار اور چمکدار ہوتا تھا۔ ہندوستان اور چین کے قدیم بادشاہ ہمیشہ لمبی زرتار قبائیں پہنکر نکلتے تھے اور ایک زرد رنگ کا چتر اُنکے ساتھ ہوتا تھا۔

شاہی خاندانوں کی موجودگی اور اُنکے دیوتاؤں کے نسل سے ہونیکے خیال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قدیم زمانے کی شاہی موروثی تھی، تاہم جانشینی کا کوئی معین قاعدہ نہیں تھا۔ یونانیوں میں شخصی ہمت و قابلیت کا لحاظ کیا جاتا تھا۔ عورتیں اور بچے اس سلسلے سے تقریباً ہمیشہ خارج کردئے جاتے تھے اور چونکہ امرا اور عوام کی منظوری کی شرط تھی اس لئے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ موروثی سلسلہ ترک کر دیا جاتا تھا۔

۷ یہاں ہم کو اڈیلڈس کا قصہ یاد آتا ہے۔ ہندوستانیوں میں ہی ہم (سلسلہ خلف اکبر) حکمران کے اس قسم کے موروثی حق کو رائے اور انتخاب کے ساتھ مزوج دیکھتے ہیں۔ دیکھو فون ہولش من کی "ہندوستانی کہانیاں" (Indische sagen) جلد ۲۔ صفحہ ۱۸۴۔

جرمانیوں میں یہ سیرت رائج تھا کہ امر انتخاب کرتے اور عوام اُس پر منطوری دیتے تھے مگر جانشینی بالعموم موروثی ہوتی تھی اور یونان کے بہ نسبت وہاں بچے زیادہ کثرت سے وارث تاج و تخت ہو جاتے تھے لیکن کوئی ایسا قاعدہ نہیں تھا کہ اگر ایک آزاد قوم شاہی خاندان کے کسی بعیدی رکن کو حکمرانی کے زیادہ قابل سمجھ کر اُسے ترجیح دینا چاہے تو ایسا نہ کر سکے۔

ان بادشاہوں کی سیاسی طاقت بہت زیادہ تھی مگر اُس پر چند اہم قیود بھی عائد تھے۔

۱۔ بادشاہ مجلس حکمرانوں اور جمعیّت قومی دونوں کا صدر ہوتا تھا اور دونوں کی کارروائی کی رہبری کرتا، لیکن بقول ٹامس ہش ان دونوں مجموعوں میں اُس کے اقتدار کا انحصار ترمیم سے زیادہ ترغیب پر ہوتا۔

۲۔ وہ انصاف کا حاکم اعلیٰ ہوتا تھا اور اگرچہ وہ خود فیصلہ نہیں کرتا تھا مگر وہ قانون کے قیام و دوام کی حمایت کرتا تھا۔ اُس کا اختیار بھی بالکل خود مختار نہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ عدالت کے فیصلے کے ماننے پر مجبور ہوتا تھا۔

۳۔ وہ فوجی تنظیم کا صدر ہوتا تھا اور بالعموم فوج کا پیشرو بھی وہی ہو کرتا تھا۔ جنگ ہی سے اُس کی طاقت میں اضافہ ہوتا تھا لیکن چونکہ یونانیوں کی بہ نسبت جرمانی موروثی حق کا زیادہ خیال کرتے تھے اس لئے اگرچہ نابالغی کے زمانے میں فوج کا قائد عظم بادشاہ ہی سمجھا جاتا تھا مگر اکثر بوجہ مجبوری عملی کام کیلئے کسی متولی کا تقرر ہو جاتا تھا۔

۴۔ یونانیوں اور جرمانیوں میں اگرچہ حکومت کے تخم بادشاہ کے مذکورہ بالا اوصاف میں مضمر تھے مگر حقیقی حکومت کو ان میں بہت کم ترقی ہوئی تھی۔

۵۔ دونوں قوموں (نسلوں) میں بادشاہ کا وجود اور اُس کے حقوق دیوتاؤں اور انسانوں کے حقوق سے گہرے ہوئے تھے۔ یونانی خصوصیت کے ساتھ اس امر پر زور دیتے تھے کہ اُن کے بادشاہ خدائی احکام اور قومی قوانین و مراسم کی پابندی کریں اور اُسی کو ایشیا کے مطلق العنان بادشاہوں کے مقابلے میں اپنے بادشاہوں کا بابہ الامتیاز وصف سمجھتے تھے۔ بادشاہ عدالتی نظم کے اندر ہوتا تھا۔ اُس سے بالاتر نہیں تھا۔ وہ قوم کا صدر ضرور تھا مگر قوم سے خارج نہیں تھا۔ جرمانی بادشاہ سارے گردہ احرار کے حقوق سے

اور بھی زیادہ گھرے ہوئے تھے۔

لیکن جسہرانی بادشاہی کی ایک خصوصیت خاص تھی جس سے اُسکی قوت بہت بڑھ گئی تھی۔ جہرانی بادشاہوں کے جلو میں ایک گروہ ایسے پییدہ ممتاز اشخاص کا ہوتا تھا جو بادشاہ کی ذات سے وابستہ ہوتا تھا۔ یہ لوگ بادشاہ کی ذات کے ساتھ وفاداری کی قسم کھاتے تھے اور انکا مستقل کام یہ ہوتا تھا کہ ہر ایک مخالف کے مقابلے میں بادشاہ کی عزت و طاقت کی حمایت کریں۔ بعد کو ازمنہ وسطیٰ میں جو جاگیر داری تنظیم پیدا ہوئی اُس کا تخم یہی ہے اور اس جاگیر داری تنظیم نے قدیم نظام سلطنت کو اکثر لوڑ دیا اور اس میں بہت کچھ دست اندازی کی اور ایک بڑی حد تک اُسے بدل دیا۔

نواں باب

(ب) قدیم روما کی قومی شاہی

بعض خصوصیات میں قدیم روما کی بادشاہی کو یونانیوں اور جرمنوں کی بادشاہی سے بہت قریبی تعلق معلوم ہوتا ہے لیکن اور حالات کے اعتبار سے ان میں اس قدر اہم تفاوت ہے کہ ہم اسے بادشاہی کی ایک نئی اور زیادہ ترقی یافتہ صورت خیال کرنے پر مجبور ہیں۔ خود بادشاہوں کے تقرر میں وہ خصوصیات اخلاقی طبع پر قابل لحاظ ہیں ایک یہ کہ نامزدگی اور تقرر کے مقابلے میں موروثی جانشینی کم نمایاں نظر آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ عام اعتقاد میں بادشاہ دیوتاؤں کی نسل سے نہیں سمجھے جاتے۔

یہ صحیح ہے کہ روما کے بانیوں کی نسبت یہ اعتقاد تھا کہ ان کی رگوں میں دیوتاؤں کا خون دوڑ رہا ہے اور رومولس مرے کے بعد دیوتاؤں میں شامل کر دیا گیا تھا لیکن اسکے بعد سے بادشاہوں کے انتخاب اور تمام دوسرے معاملات میں دیوتاؤں کا اثر شگون کے آثار روح کی غیر مرئی تحریک اور قسمت کی اُچی قوت سے ظاہر ہوتا تھا۔ پس اگرچہ خدائی اثر کا خیال قائم رہا، مگر روما کی بادشاہی خاص انسانیت کی بادشاہی تھی شخصی دور بینی اور مرضی کا خیال نسل و خاندان سے زیادہ کیا جاتا تھا۔

روما کے بادشاہ کا انتخاب یا تو اسکا پیشرو کر جاتا تھا یا سینات کی مدد اور خدائوں کی پسندیدگی سے متولی سلطنت اسکا انتخاب کرتا تھا۔ یہ انتخاب صرف اسکی زندگی بھر کیلئے ہوتا تھا اسلئے کوئی موروثی سلسلہ نہیں قائم ہوا اور انکا انحصار نسل کی نسبت خدائی قابلیت پر زیادہ رہا۔ بادشاہ خود اپنا "قانون شاہی" تجویز کرتا تھا جسکے موافق اسے شاہی اختیار اور شگون کی برتری دی جاتی تھیں۔

اسے ہی حل رمیوں میں ورانت کا تھا۔ ورانت کا انحصار خدائی تعلق پر اتقد نہیں ہوتا تھا جتدر میت کرنوا کی شخصی مرضی پر تھا کیونکہ ہر شخص اپنا وارث مقرر کر سکے گا اسلئے اسکا آزاد تھا۔

اسلئے یہ وہی قانون شاہی (lex regia) ہے جسکی تجدید شہنشاہی کے زمانے میں ہوئی۔

یہ بالکل وہی صورت تھی جس طرح مابعد کی جمہوریت میں حکام داناظموں کو اختیار اعلیٰ (imperium) عطا ہوتا تھا۔ پس اس طرح رومی بادشاہی اول ہی سے ایک طرح کی شخصی نظامت تھی۔

شاہی کا یہ تصور صاف طور پر یونانیوں اور جرمانوں کے خیال سے بالکل مغائر ہے علیٰ ہذا اختیار شاہی کی کیفیت میں بھی اہم تفاوت نظر آتا ہے۔ بعض امور میں دونوں میں مماثلت ہے۔ بادشاہی وہ مذہبی مقتدری ہوتا تھا جو قوم کی طرف سے مذہب چڑھاتا تھا وہی سنیاں اور مجلس عام کو طلب کرتا اور انکی رہبری کرتا وہی انصاف کا حاکم اعلیٰ ہوتا تھا البتہ بعض صورتوں میں اسکے احکم کے خلاف قوم سے مرافعہ کیا جاسکتا تھا وہ فوجی قیادت کا حقدار اور فوج کا سپہ سالار ہوتا تھا۔ اراضی و آمدنی کے اعتبار سے وہ دولت مند ہوتا تھا۔

لیکن اسکے اختیارات یونانی بادشاہوں کی نسبت زیادہ زور دار اور زیادہ مکمل ہوتے تھے اگرچہ یونانی بادشاہ موروثی بادشاہ اور دیوتاؤں کی اولاد ہوتے تھے تاہم رومی اپنے حاکموں کو اس غرض سے کہ وہ پیہو و عامہ کی حفاظت میں پر زور کارروائی کر سکیں جس قدر وسیع انتظامی اختیارات عطا کرتے تھے اُس سے انکی سیاسی معاملہ فہمی اول ہی سے نمایاں نظر آتی ہے اختیار اعلیٰ (imperium) کے طریقے کی ابتدا خالصتاً رومیوں سے ہوئی اور انکی بادشاہی اور سابق کی بادشاہیوں میں ہی امر بار الاقرار ہے۔

رومی بادشاہوں کی خارجی علامات بھی ویسی ہی اثر انگن تھیں جیسی یونانی یا جرمانی بادشاہوں کی علامات تھیں، مگر انکی وقعت اختیار سے بھی ان علامات کا اظہار ہوتا تھا۔ بارہ عصا برداروں کا کوڑے لٹے ہوئے انکے آگے آگے چلنا بعض علامات کے طور پر نہیں تھا بلکہ یہ فی الحقیقت نافرمانی کرنیوالوں کی تادیب کیلئے تھا۔ اختیار اعلیٰ اور عصا برداروں کے کوڑے علاوہ خیالاً رومیوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔

اختیار اعلیٰ جو شگونوں کے ساتھ بادشاہ کی جانب منتقل کر دیا جاتا تھا اُس سے بادشاہ کو فرمان نافذ کرنے اور قانون کے اصول معین کرنے دونوں امور کا حق حاصل ہو جاتا تھا۔ اسے ہرگز بھولنا نہ چاہئے کہ روم کی سلطنت ایک بادشاہ نے قائم کی تھی اور روایتاً اُسی کے اختیارات اسکے جانشینوں کی طرف منتقل ہوتے رہتے تھے۔

مستقل قوانین کے لئے سینات کی منظوری کی ضرورت تھی۔ اور سر ڈیٹس لولیس کے وقت سے عوام کی رضامندی کا حاصل کرنا بھی ضروری ہو گیا تھا، مگر اُسکے ساتھ ہی بادشاہ کی مرضی بھی لازمی اور بالعموم قطعی ہوا کرتی تھی۔ صرف بادشاہ ہی قانون تجویز کر سکتا تھا اور جس قانون کے متعلق وہ چاہتا بحث کرنے اور رائے دینے کی ممانعت کر سکتا تھا۔ ان قوانین کے علاوہ بادشاہ اپنے فرمان میں بغیر کسی شور سے یا منظوری کے اُن قانونی اصولوں کو معین کر سکتا تھا جن کی وہ متابعت کرنا چاہتا تھا۔ یہ مندرجہ ذیل قوانین (Jus edicendi) بلا بحث و حجت بادشاہوں کے حقوق میں داخل تھے۔ اگرچہ اُن پر عہد رآمد کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی۔ یہ قاعدہ اول اول زمانہ مابعد کے حاکموں کے لئے وضع نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان کے پیشروں سے دست بدست اُن تک پہنچا تھا۔ پس رومی بادشاہوں کا عدالتی اختیار جرمانی بادشاہوں کے اختیار سے بدرجہا بڑھا ہوا تھا۔ دونوں اولاد ذات خاص عدالتوں کی صدارت کرتے تھے مگر بادشاہ اپنے ایسٹروں کی رائے کا پابند نہیں تھا وہ نہ صرف مقدمہ کی کارروائی کی ہدایت کرتا تھا بلکہ وہ خاص اصول معین کرتا تھا جسکے مطابق کسی مخصوص مقدمے میں کارروائی ہونا چاہئے۔ ابتدائی زمانے میں وہ اکثر خود فیصلہ سنا تا تھا۔ معاملات وجرائم کے قوانین کے تقریباً تمام انتظام کا دار و مدار اُسی پر ہوتا تھا۔

رومی بادشاہوں کا فوجی اختیار بہت وسیع تھا۔ میدان جنگ میں بادشاہ کو افسروں اور سپاہیوں دونوں کی زندگی و موت کا کامل اختیار ہوتا تھا۔ ہم جمہوری زمانہ تک میں یہ دیکھتے ہیں کہ نہ صرف آمر مطلق، جسکی طاقتیں بادشاہوں کے برابر ہوتی تھیں بلکہ تفصل بھی فوج کی التجا کے باوجود افسروں کو موت کی سزا دیتے تھے بلکہ پورے پورے فوجی دستے میں ہر دسویں آدمی کو قتل کر دیتے تھے۔

بادشاہ تمام سیاسی اور مذہبی عہدوں کا سربراہ ہوتا تھا (tribunus celerum) وہی یعنی امپریلہ مہندہ دار (praeffectus urbi) والی شہر یعنی نائب السلطنت کا تقرر کرتا تھا جو ایک عدم موجودگی میں شہر کا حکمران ہوتا تھا، اسی سے فال گو اور پیشوایان مذہبی اپنے اداے فرائض کا اختیار اور اپنے مقدس قانون کا علم حاصل کرتے تھے۔

اختیار اعلیٰ (imperium) کا لقب باب یہ تھا کہ وہ ایک زبردست نظامی قوت تھی، رومی بادشاہ کی اہم حیثیت

جوسیاسی ضروریات اور ہنگامی حالات کے محل و موقع کے لحاظ سے حتیٰ قطعی کارروائی کر سکتی اور ہیرو و عامہ کی کارروائیوں کو بزور راج کر سکتی تھی۔ یونان کے بادشاہ اس قسم کے اختیار کا استعمال صرف ایک خفیف حد تک کر سکتے تھے اور جرمانی بادشاہوں میں تو اسکا مذکور تک نہیں تھا مگر رومی سلطنت میں اس اختیار نے اول ہی سے نہایت اہم حیثیت پیدا کر لی تھی۔ اہل روما جسطرح اپنے خاندان اور اپنی جائیداد پر کامل حکمرانی چاہتے تھے اسی طرح وہ سیاسی اختیار اعلیٰ (imperium) کو بھی کامل و مکمل دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے بادشاہ حالت امن میں صرف حاکم انصاف ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ مملکت کے طمران یا دالی بھی ہوتے تھے۔ ”رکس“ اور ”ریگیس“ کے لفظوں ہی سے یہ فہم پیدا ہوتا ہے۔

اس طرح یہ بخوبی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ دور شاہی میں سلطنت روما کی تمام طرز عمل شاہی مرضی کے تابع تھی۔ تمام تنظیمات کا تعلق بادشاہ سے تھا اور ان میں ایسے ایسے کاموں کے شروع کرنے اور انھیں تکمیل کو پہنچانے کا اختیار تھا جو اس زمانے میں بھی بہت عظیم الشان معلوم ہوتے ہیں۔ بادشاہ کو غذا کی فراہمی اور کاشت راضی پر نظر رکھنا پڑتی تھی اہل شہر کے اخلاق کی نگرانی کرنا پڑتی تھی اور بہت وسیع احتسابی اختیارات کو عمل میں لانا ہوتا تھا وہ تمام فرائض جو بعد میں ”قنصل“، ”سینٹ“، ”کنسل“ اور ”میرٹیرات“ کے درمیان تقسیم ہو گئے تھے ابتداً صرف ایک بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ تاریخ میں روما ہی وہ پہلی سلطنت ہے جس نے انسانی اور عمومی شاہی کا شیعہ کیا اور اس شاہی میں کامل سیاسی اقتدار اور تقریباً اعلیٰ الاطلاق انتظامی اختیار جمع کر دیا۔

دسواں باب

(ج) رومی شہنشاہی

شہنشاہی
جمہوری مہدوں کے
مجموعہ کا نام
نہیں تھا

وہ رومی شہنشاہی جسکی بنا قیصر جولیس نے ڈالی، جسے آگسٹس نے استوار کیا اور جس نے بعد کے تمام سیاسی نشوونما پر اس قدر قوی اثر ڈالا۔ وہ شہنشاہی (جیسا کہ بعض وقت خیال کیا جاتا ہے) محض جمہوری حکمرانوں کے اختیارات کو یکجا جمع کر لینے سے نہیں پیدا ہو گئی تھی بلکہ وہ درحقیقت زیادہ وسیع بیانے پر قدیم شاہی اختیارات کی تہ یہ تھی جس میں درمیانی زمانے کے تغیرات مد نظر رکھے گئے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ شہنشاہوں نے بہت سے وہ فرائض اختیار کر لئے تھے جو جمہوریت کے حاکموں سے متعلق تھے مثلاً صدارتی (تریبیونی) اقتدار کی بنا پر انکی ذات پر مروج کے الزام سے بری تھی۔ انھیں قوانین کی نامنظوری کا حق حاصل تھا اور وہ ادنیٰ طبقوں کے حامی کی حیثیت اختیار کر سکتے تھے۔ احتسابی اختیار کی رو سے انھیں اخلاقیات کی نگرانی کا حق حاصل تھا اور وہ سینات کے ارکان اور امرا (یعنی جاگیرداروں) کی فہرست پر نظر ثانی کر سکتے تھے، مقتداۓ اعظم (pontifex maximus) کے رہتے کے باعث وہ مذہبی قانون کے اہم مسائل کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ وقتاً فوقتاً وہ قنصل کے عہدے کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، مگر شہنشاہوں کے اختیار کا خیال ان مہدوں کے اجتماع پر مبنی نہیں ہے، بلکہ ایک نئی مرکزی حکومت یعنی ایک حقیقی شاہی کے قائم ہو جانے پر

(ب) آگسٹس کو احتساب کا اختیار اپنے قنصل ہونے کی حیثیت سے حاصل تھا مگر احتساب کا منصب ایک علیحدہ عہدے کی حیثیت سے بدستور قائم رہا اور بعد کے شہنشاہوں نے بھی اُس منصب کو اختیار کیا جن میں کلاؤڈیس، نیکلیس و سپاسریان اور ٹیسٹس داخل ہیں۔ ڈومیتیان نے اُسے منسوخ کر دیا اور اُس کے فرائض کو شہنشاہ کے محدود اختیارات میں شامل کر دیا گیا۔ دیکھو موثرین کی تصنیف: لاروی قانون سلطنت، جلد ۲، صفحہ ۳ فقرہ ۶۔ انگریزی مستحجم)

جنی ہے۔ ظاہر جمہوری حیثیت کے باعث یہ تفریق ایک زمانے تک پوشیدہ رہا مگر ادب افہم و ذکا کو آگسٹس ہی کے زمانے میں یہ تفریق صاف نظر آنے لگا تھا ٹیبریوس کی تخت نشینی کے وقت انیسویں گلاس نے شاہی کے اصول کو صاف طور پر اپنے اس دعوے میں ظاہر کر دیا کہ "نا قابل تقسیم شے کو تقسیم کرنا غیر ممکن ہے۔ سلطنت ایک جسم واحد ہے اور صرف ایک ہی شخص کا دماغ اس چکر میں کر سکتا ہے۔"

شہنشاہوں نے صرف پرنسپ (princeps senatus) کا سنگل لقب اختیار کیا تھا مگر ان کے اختیارات اس قدر وسیع تھے کہ ان کے بیجا امتیاز کی طمع سے بہت کم شہنشاہ اپنے کو محفوظ رکھ سکتے تھے اور اکثر ان میں سے ذہنی یا اخلاقی حیثیت سے تباہ ہو گئے۔ شہنشاہی سوروٹی نہیں بلکہ انتخابی تھی۔ اول اول جو لوگ اس منصب پر فائز ہوئے ان کا انتخاب دس برس کیلئے ہوتا تھا مگر حقیقتاً اُسے زندگی بھر کیلئے سمجھنا چاہئے وہ خدائی نسل سے نہیں سمجھے جاتے تھے اور وہ قوم کی فوقیت کو تسلیم کرتے تھے۔ ان کے اختیارات انھیں قوم کے ایک قانون کے موافق عطا ہوتے تھے لیکن اگرچہ شہنشاہ کے انتخاب میں شل اور خاندانی تعلق کا لحاظ اصولاً نہیں کیا جاتا تھا مگر عام طور پر عسلا اسکا بہت بڑا اثر پڑتا تھا اور منتخب شدہ بادشاہ کو اپنی ذات سے وہ تمام وسیع اختیارات حاصل ہو جاتے تھے جو جمہوریت کے زمانہ میں تمام رومی قوم کو حاصل تھے۔ یہ اختیار جب ایک بار عطا ہو جاتا تھا تو پھر نہ اُس میں کمی ہو سکتی تھی اور نہ وہ واپس لیا جاسکتا تھا۔ علاوہ ان خاص ناظرانہ اختیارات کے جو بالعموم شہنشاہ کو حاصل ہوتے تھے شہنشاہی اختیارات کا تجزیہ حسب ذیل طور پر ہو سکتا ہے:-

۱۔ سلطنت کی تمام فوجی طاقت اور شہر کی حفاظت کرنیوالی سپاہ کا نظم و نسق اور اعلیٰ اختیار۔ حدود و سلطنت کی وحدت کے ساتھ مستقل فوج کا قیام بھی ضروری ہو گیا اس سے شہنشاہی کی بقا کی طرف سے اطمینان ہو گیا اور بزور اطاعت حاصل ہونے لگی۔ اپنے اس فرض کی وجہ سے شہنشاہوں کا لقب امپراتور (imperatores) ہو گیا جس کے معنی اُس ابتدائی زمانے میں اس سے بہت مختلف تھے جو اب سمجھے جاتے ہیں۔

۲۔ نہایت ہی زرخیز اور اہم صوبوں کی حکومت علی الاطلاق جن سے شہنشاہوں کو بے اندازہ دولت و قوت حاصل ہوئی یہ حیثیت مجموعی نظام سلطنت کے اس تفریق سے صوبے

شہنشاہی کیلئے
انتخاب

شہنشاہی اختیارات

بہت فائدے میں رہے۔ ان اصولوں کے ذریعہ رتبہ انعام کو شہنشاہ، شہنشاہیت میں داخل کر لیتے اعدائے کو اعلیٰ منصبوں پر فائز کرتے تھے۔ معزز شہنشاہی ممال کی جو زیادتی اور اتھمال، جمہوریت کے ہمیشہ بدلنے والے حکام اور سپہ سالاروں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ شہنشاہوں کے زیادہ مستقل اغراض کے ساتھ نظم و نسق میں نسبتاً زیادہ درجہ اور انتظام سے کام لیا جانے لگا۔

۴۔ تمام غیر ملکی معاملات کا فیصلہ، صلح و جنگ اور معاہدہ کرینیکا حق۔
۵۔ مجلس سنیات کے جمع کرنے، بحث طلب امور کے تجویز کرنے اور مجلس کے فیصلوں کو قانونی قوت عطا کرینیکا حق۔ یہ اجماعی طرح معلوم ہے کہ سنیات ان شہنشاہوں کی کس قدر خوشامد کرتی اور انکی کس درجہ بلیغ تھی۔

۵۔ نظامت اور تمام اہم ہندوں کے تقررات کا آخری فیصلہ، مجلس عام (comitia) جو کچھ مدت تک جب ظاہر قائم رہی اور مجلس سنیات، دونوں اذروئے قانون امید داروں کی بابت شہنشاہ کی سفارش کا لحاظ کرنے پر مجبور تھیں۔

۶۔ سلطنت کی ہبوط و عزت کیلئے ہر ایک کارروائی کا قطعی اختیار۔ درحقیقت یہی اختیار شہنشاہی قوت کی اصلی بنیاد تھا۔ اس اختیار کی بدولت صرف اُسکے فرمان بلکہ فیصلے اور اسکی قانونی ہدایت تک کو قانون کی پوری قوت حاصل ہو جاتی تھی اور اس طرح وہ قانون سازی کی تمام وسعت پر حاوی تھا۔

مخالفانہ اعتراض و مقادمت کے روکنے کے لئے صاف طور پر یہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ شہنشاہ کا قانون تمام دوسرے قوانین پر فائز ہے، خواہ وہ سنیات کا قانون ہو خواہ خواص کا ہو، خواہ عوام کا۔ نیز یہ کہ شہنشاہی قانون کی بجا آوری میں ان اخرا لک قوانین کے توڑنے پر کوئی شخص جوابدہ نہیں ہو سکتا۔ شہنشاہ کی عدم ذمہ داری صرف اسکی ذات تک محدود نہیں تھی بلکہ اسکے تمام وزراء و اہل مال تک وسیع تھی یہ طریقہ موجودہ زمانے کے بالکل بغاوت تھا۔

درحقیقت شہنشاہ کا اختیار بالکل مطلق العنان اور غیر محدود تھا۔ سلطنت میں اُسے وہی حیثیت حاصل تھی جو خانگی زندگی میں ملک ذاتی کی اور جو ایک خاندان میں اقتدار پدری (patria potesta) کی ہے، گویا روما کی مالکیت سلطنت ایک فرد واحد کے ہاتھ میں جمع ہو گئی تھی۔ اسکا فیصلہ اصول ہبوط و عامہ تھا گریہ اصول جبرائیل سے شکل عمل میں بہت کم آتا تھا۔

رومیوں کا عظیم سیاسی اصول (کم از کم ازمہ مابعد میں) سلطنت کے تمام معاملات میں شخصی حق سے زیادہ اہم سمجھا گیا تھا اگرچہ شخصی قانون کے حدود میں آخر الذکر کو بہت ترقی ہو گئی تھی۔

شہنشاہی روم کی تاریخ اگرچہ جزاً جزاً نہایت عظیم الشان معلوم ہوتی ہے مگر دنیا کو وہ پہنچتی دیکھتی ہے کہ ایسا دانشناری اختیار نہ کر ان کیلئے مفید ہے اور نہ اکی برعایا کے لئے۔

شہنشاہی کے عروج کی تعبیر یہ کیجا سکتی ہے کہ عام خرابی اور کمزوری کی وجہ سے اس کا قیام ایک ناگوار ضرورت تھی۔ روم کے امرا میں وسیع سلطنت کے کام کو سرانجام دینے کی طاقت، وقابلیت نہیں رہی تھی۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے سابقہ اختیار و اثر کے حاصل کرینی کی کوششیں کیں مگر انھوں نے حالات زمانہ کے سامنے انھیں خاموشی کے ساتھ سرخم کا دینا پڑا۔ عوام کو حکومت کا کوئی دعویٰ نہیں رہا تھا۔ سپہگری کے بھی اب وہ دعوے نہیں رہے تھے بلکہ لوگ پر اس زمانے کے کاروبار اور خوشیوں میں غرق تھے۔ انھوں نے سنیا کی حکومت کیے بے ایک شہنشاہ کی حکومت کو ترجیح دی اور امر کی دولت سے اپنی کمزوری کی تسلی کر لی۔ رومی قوم کا اخلاق اُنکے قابلیت کے بہ نسبت جلد تر خراب ہو گیا اور خود اُن کی غلامی اُن سے سیر مونیوانی حرص کا عومش تھی جو انھیں ان حالات کے پیچھے لے پھرتی تھی۔

شہنشاہی
کے اسباب

سے کلاؤٹیس کی تخت نشینی کے وقت جو واقعات پیش آئے اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ روم کے رومی الطبقوں کو جمہوری نظام سلطنت سے زیادہ الفت نہیں رہی تھی۔

گیارہواں باب

(د) فرانکی شاہی

جرمانیوں کے فرانکی قبیلے نے رومی سرزمین پر ایک بہت بڑی شہنشاہی قائم کر لی۔ فرانکی شاہی میں رومی اور ایتالیائی دونوں عناصر شامل تھے اور اسی وقت سے قدیم دنیا کی تنظیم و ترتیب از مئے وسطیٰ کی تنظیم و ترتیب کی طرف تبدیل ہونا شروع ہوئی۔ فرانکی بادشاہ اپنے جرمانی پیشروں کے نسبت بہت زیادہ صاحب اختیار تھا مگر رومی شہنشاہوں کے مقابلے میں اس کا اختیار مطلق کم تھا۔ کارل (چارلس) اعظم کے وقت میں جو شاہی قائم تھی اس میں جرمانیوں کی آزادی اور ان کے قانون کے خیال کے ساتھ سلطنت کے قوت و عمل کے متعلق رومیوں کا تصور بھی ملا ہوا تھا۔

کارولنگی (یعنی سلسلہ شارلمین) کے بادشاہوں کی طاقت کے بڑھانے میں بہت سے اسباب جمع ہو گئے تھے، از انجملہ قابل اور خوش اقبال بادشاہوں کی پیہم جانشینی ان کی وسعت مملکت کی عجلانہ ترقی، جس سے ایک پر زور اور حاوی حکومت کی ضرورت پیدا ہوئی ایک ایسی مضبوط فوجی طاقت کی بھی حاجت پیش آئی جو ہمہ وقت آمادہ پیکار ہو اور اپنی جنگ پر اس فوج نے فتوحات حاصل کیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی رعایا کا بیشتر حصہ رومی شہنشاہی کے زیر اثر رہ چکا تھا اور اس وجہ سے وہ رومیوں کے خیالات اور ان کی پرزور تنظیمات کا عادی تھا۔

ایک اعتبار سے فرانکون میں شاہی کا قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ملک شخصی کی تبعیت میں موروثی اصول قائم ہو گیا اور قدیم انتخاب کا طریقہ بالکل بے معنی ہو گیا، یہی امر اس کا موجب ہوا کہ شہنشاہی مختلف بیٹوں میں تقسیم ہو گئی جس سے سلطنت اور قوم دونوں کو سخت نقصان پہنچا۔ تخت کی جانشینی کا تعلق صمیم معنی میں سیاسیات اور قانون عامہ سے ہے اور ان کا تقاضا یہ ہے کہ سلطنت میں اتحاد قائم رہے لیکن فرانکی طریق نے حکومت کے فرائض کے ساتھ بالکل شخصی یا خاندانی ملک کا سامنا کر لیا اور اس اعتبار سے اس خیال کی

موافقت کی جسے ہم اوپر آبائی اصول سے تعبیر کر چکے ہیں۔

فراکون کے شاہی اختیار میں جو خاص تغیرات کئے وہ حسب ذیل ہیں :-

۱۔ منفرد جبرمانی قبائل کے محدود حلقے میں قانون سازی کو جو درجہ حاصل تھا فراکی شہنشاہی میں اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی اور اس کے ساتھ قانون سازی پر بادشاہوں کا اثر سابق کے نسبت زیادہ غالب آگیا، رومیوں کا یہ اصول کہ شہنشاہ کی مرضی قانون کے مثل ہے جبرمانی الاصل قوم کے لئے بالطبع ناقابل قبول تھا لیکن فراکون میں قانون کے تجویز کرنے کا حق بادشاہ اور اس کی مجلس کو حاصل ہو گیا تھا اور یہ حق علی العموم عظمیٰ سمجھا جاتا تھا قانون کو جائز قرار دینے کے لئے بادشاہ کی منظوری کی شرط تھی اور اسی کے نام سے قانون کی اشاعت ہوتی تھی۔

فراکون میں
قانون سازی
کا طریقہ

لیکن یہ یاد رکھنا بھی نہایت ضروری ہے کہ رواج اور قانون دونوں کی رو سے مذہبی اور ملکی روٹسا کی جماعت کا مشورہ اور ان کی منظوری بھی ویسی ہی لازمی تھی جیسی بادشاہ کی منظوری، مگر رعایا کی منظوری کچھ ایسی اہم نہ تھی اور ان معاملات کے سوا جن میں کلیسا سلطنت کے یا خود رعایا کے حقوق کے تحت ہوتی تھی دیگر معاملات میں اس کا لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔

۱۔ امرا کی یہ شرکت طبقات کی اس نیابت کا پہلا قدم تھی جس نے بعد کی صدیوں میں اس قدر نشو و نما حاصل کیا اور جس سے نیا جاتی سلطنت کا ظہور ہوا۔

حکومت

۲۔ حکومت۔ سلطنت کی وسعت اور مسلسل سیاسی تغیرات کی اہمیت کے باعث ایک ایسی انتظامی قوت کی ضرورت پیش آئی جس سے قدیم جبرمانی نا آشنا تھے۔ اب صرف امن و قانون کے قائم رکھنے ہی کا سوال نہیں تھا بلکہ یہود عامہ کا بھی کچھ لحاظ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ رومیوں کے اختیار اعلیٰ (imperium) کا خیال فراکون کے لئے بہت بعید از فہم تھا اس لئے انہوں نے اپنی نئی حکومت کے لئے ایک ایسا خاص اصول صیانت (mundium) قائم کیا یہ صیانت شاہی، رومیوں کے اختیار اعلیٰ سے وہی نسبت رکھتی ہے جو جبرمانی باپ یا شوہر کے اختیار کی روم کے بزرگ خاندان کے اختیار کے مقابلے میں تھی۔ یہ اختیار خود مختارانہ یا علی الاطلاق نہیں تھا، بلکہ اس کے خاص فرائض رعایا کے حقوق کی حفاظت اور یہود عامہ کی نرتی تھے۔ حقیقت اس میں اشیانہ کے ساتھ

ادائے فرائض کا خیال ناقابل انفکاک طور پر منظم تھا۔ یہ جدت طرازی ہنوز پوری دامن نہیں ہوئی تھی مگر اسکے اندر ایسی صحتور طاقت کا تخم موجود تھا جس میں حقیقی سیاسی ترقی کی قابلیت تھی۔

فوجی اختیار

شاہی کی اس صورت میں بادشاہ کو فوج کی سرکردگی کا اختیار تھا اور اس پر لازم تھا کہ وہ خود فوج کی سربراہی کرے۔ اسکے احکام میں (ban) کے نام سے نافذ ہوتے تھے، جو اپنی نوعیت میں عدالتی و فوجی دونوں ہوتے تھے وہ اپنے فوجی حکم کی رو سے سلطنت کی تمام مسلح قوت کو بطرح چاہتا کام میں لاسکتا تھا، مگر کبھی رسم و رواج اور خدمات کے معینہ قواعد سے اسکے اختیارات محدود تھے لیکن طاقتور بادشاہوں اور خاص کر چارلس اعظم نے اپنی جارحانہ جنگوں کے لئے بھی اپنے جاگیرداروں کے علاوہ رعایا کے پورے پورے مسلح دوزین طلب کئے اور تعمیل حکم نہ کرنے والوں کو ساڑھ شلنگ جرمانے کی دھمکی دی۔

ملکی اختیار

عدالتی حکم جو ملک کے انتظام کے لئے اس قدر اہم تھا، وہ بھی بادشاہ سے متعلق تھا، مگر بالعموم اسکا نفاذ اضلاع کے کاؤنٹیوں کے ذریعے سے ہوتا تھا جنہیں بادشاہ کی جانب سے اختیار حاصل ہوتا تھا۔ سلطنت کا نظم و نسق جب ترقی کر گیا تو تنازعات حقوق اور واقعات جبرمانہ میں ذاتی جنگ کے قدیم اختیار پر روک قائم ہوئی اور تمام ملک میں اُنکا انتظام بادشاہ کی جانب سے ہو گیا اور قدیم قومی امن کا طریقہ جسے لوگ آسانی سے شکست کر دیتے تھے منسوخ ہو گیا۔

بادشاہ کے صرف خاص اور خزانہ عامہ کی آمدنی بہت بڑھ گئی تھی اور ریکل آمدنی کلیدی بادشاہ کے اختیار میں تھی۔ رومی صوبوں کے فتح ہونے اور بادشاہیوں اور امارتوں کے معدوم ہونے سے شاہی جاگیروں میں بہت اضافہ ہو گیا تھا اور تمام ملک میں جا بجا شاہی دکانیں اور شاہی محلات بنے ہوئے تھے اور انکے ارد گرد بہت بڑی بڑی جاگیریں تھیں۔ صوبوں کی اراضی اور اشخاص کے محصول بہت بڑے قائم رکھے گئے تھے۔ مال و اسباب پر جو محصول رومیوں کے وقت میں عاید ہوتا تھا وہ بڑھا دیا گیا تھا۔ مفتوح اقوام پر خراج لگایا جاتا تھا اور بطور تادان جنگ کے ان سے بہت بڑی بڑی فیس وصول کی جاتی تھیں۔

نظامی مال

۳۔ مال کا ایک منظم طریقہ قائم ہو گیا تھا، یہ تمام مال بادشاہ کے تاج ہوتے تھے اور انھیں کے دیلے سے بادشاہ کی قوت، انتظام کے ہر حصے میں محسوس ہوتی تھی نیز بیعتی دربار کے طرز پر ان مال میں سے اعلیٰ مال بادشاہ کے قصر میں حاضر رہتے تھے ان میں حسب ذیل عہدہ دار شامل تھے جملدار و حاجب اعلیٰ حاکم انصاف و نائب السلطنت بادشاہ کا پیش نماز جو دربار کے تمام پادریوں کا سرگروہ ہوتا تھا اور مذہبی معاملات کی اطلاع دی ہی اسی سے متعلق ہوتی تھی۔ خزانہ دار جو خزانہ شاہی کا صدر ہوتا تھا اور دوسرے مالک سے مراسلات کی خدمت بھی انجام دیتا تھا۔ ناظر تشریفات جو دربار کی شان و شوکت اور ساز و سامان کو درست رکھتا تھا، داروغہ محل جو ملازموں کا کارکن اور خانگی معاملات کا منظم ہوتا تھا۔ داروغہ توشہ خانہ (میر سامان) جو جناس وصول کرتا اور شاہی میز کے لئے شراب ہیا کرتا، داروغہ اہطلبل۔ میر سفر حبکا کا یہ ہوتا تھا کہ سفر میں بادشاہ کی مناسب قیاسگاہ کا انتظام رکھتے۔ چار میر شکار اور بازدار۔

بادشاہ کے گشتی عہدہ دار سلطنت کے مختلف صوبوں کے محلے کے لئے سال بسال روانہ کئے جاتے تھے۔ انھیں کے توسط سے بادشاہ کو بیع حالات معلوم ہوتے اور رعایا کی شکایات و خواہشات اس تک پہنچتی تھیں۔ جہاں کہیں قانون کی اطاعت یا نظم عامہ کی حفاظت کی ضرورت ہوتی وہاں انھیں کے توسط سے یہ کام بھی انجام پاتا تھا۔

ضلعوں کے کاؤٹوں کو اعلیٰ عدالتی اختیارات حاصل ہوتے تھے اور حلقوں کے کاؤٹوں کے اختیارات محدود ہوتے تھے چونکہ روئے زمین پر سب سے اعلیٰ حاکم انصاف بادشاہ ہوتا تھا، اس لئے ان دونوں قسموں کے کاؤٹوں کو عدالتی اختیارات اسی سے حاصل ہوتے تھے۔ اول الذکر کو براہ راست اور ثانی الذکر کو بواسطہ۔ اُنکے فوجی اختیارات کا حشریمہ بھی بادشاہ ہی ہوتا تھا۔ فوجی مشین کے بتائی جانے میں کاؤٹ کی حیثیت موروثی نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ ایک ذاتی عہدہ تھا اور بادشاہ کو اس پر تقرر کا حق حاصل تھا لیکن جارس اعظم کے تحت میں موروثی جانشینی کے طبیعی میلان نے بہت جلد عہدے کی حیثیت کو پوشیدہ کر دیا اور اس منصب پر ایک موروثی حق پیدا ہو گیا۔

تبدیل گشتی عہدہ دار قصہ پارینہ ہو گئے۔ امارتیں پھر قائم ہو گئیں اور بادشاہت کے عہدے خانہ دانی ملک بن گئے۔ اس طرح اس رومی جرنالی شاہی کی طاقت فنا ہو گئی

اور اسکے بجائے شہزادوں اور امیروں کی اعیانی حکومت قائم ہو گئی۔

۴۔ فرانکی شاہی کی ایک اور قابل ذکر خصوصیت مغربی شہنشاہی سے اُس کا گہرا تعلق ہے جسے چارلس اعظم نے قائم کیا تھا اور پھر عیسائیت اور کلیسا کی وسعت کے ساتھ ساتھ شاہی اور شہنشاہی دونوں کے تعلقات کا مد و جزر بھی قابل ذکر ہے۔

سلطنت نے مذہب عیسوی قبول کر لیا تھا اور بادشاہ نے بھی ایک قیس کے ہاتھ سے تبریک قبول کی تھی۔ بادشاہ اپنے کو مہر بھٹاتا تھا کہ وہ اپنی ملکیت میں خالص مذہب عیسوی کو قائم رکھے اور اسے وسعت دے۔ اسکے ساتھ ہی پریشیت شہنشاہ کے اُسکا فرض تھا کہ جہاں تک اُسکا اختیار چل سکے وہ کفر و مادہ خدا کی بیخ کنی کرے۔ چارلس اعظم نے اس فرض کو بہت وسیع پیمانے پر اور بہت سختی کے ساتھ پورا کیا۔ تمام عالم عیسوی ایک جسم سمجھا جاتا تھا جسکے دو نظام تھے ایک قیسی اور ایک شاہی یعنی کلیسا اور سلطنت۔ بادشاہ اگرچہ سلطنت کا صدر تھا مگر اُس نے پادریوں میں بھی مسلمہ عیسوی انضباط و ترتیب کو بزور راج کر دیا تھا۔ وہ مجالس مذہبی کو طلب کرتا، اسافقہ اور صوامعہ کے طور و طریق پر نظر رکھتا، کلیسائی معاملات کے متعلق متعدد قوانین و احکام جاری کرتا رہتا تھا۔ علیٰ ہذا سیاسی تنظیمات اور ملکی نظم و نسق کے قانونی اصول پر حکومت مذہبی کا بھی نمایاں اثر پڑتا تھا۔

شہنشاہی اور
کلیسا کے قریبی
تعلقات

بارصوال باب

(ھ) جاگیر شاہی اور شاہی محدود و بحقوق طبقات

(۱۱) جاگیر شاہی -

فرانکی شاہی میں ایک صبیح شاہی کے تمام لازمی شرائط موجود تھے اور اس لحاظ سے وہ جدید سلطنت کے لئے ایک نئی شاہراہ ترقی تھی مگر قوم میں مخالف قوت و جذبات اس قدر قوی تھے اور جرمانی امرا اور آزاد اشخاص کی روایات ایک مضبوط مرکزی تنظیم کے اس قدر مخالف تھیں کہ صرف غیر معمولی ہی قوت کے حکمران اپنے شاہی اقتدار کو پوری طرح عمل میں لاسکتے اور سلطنت کی اصلی خصوصیت کو ظاہر کر سکتے تھے ورنہ کمزور بادشاہ بالکل بے بس تھے انکے عہد میں یہی سان صاف ظاہر ہو جاتا تھا کہ اتحاد سلطنت ٹٹا دیا جائے مرکزی قوت محدود اور بے اثر کر دی جائے اور مقامی حکومتوں کو آزادی دیدی جائے۔

خاندان چارلس کے زوال و انقطاع سے شاہی اقتدار بالکل معدوم ہو گیا اور حکمران ملک اور امرا نے علم و علم و قوموں اور حصوں کے انتظامات پر قبضہ کر لیا ورنہ جرمانی عالمگیر شاہی کے بجائے جاگیر شاہی قائم ہو گئی۔ یہی طریقہ ازمندہ وسطی کی خاص سیاسی خصوصیت ہے۔

خاندان چارلس
کی شکست کا زوال

جاگیر شاہی

جاگیر شاہی کی نہایت نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں :-

۱۔ اس سے پہلے کی ہر ایک شاہی کی بنیاد تو قبیلے پر یا قوم پر یا متحدہ نسل پر رہی اور اس لئے اسے ایک قومی یا نسلی تنظیم کہہ سکتے ہیں۔ برخلاف اس کے جاگیر شاہی اگرچہ بادشاہ کی ذات کی وجہ سے کسی خاص قوم سے متعلق رہی ہو مگر اسکی اصلی بنیاد اس شخص کی عہد و فاداری پر تھی جو بادشاہ اور اسکے تابعین کے درمیان ہوتا تھا۔ بادشاہ ملک کا مالک اعلیٰ ہوتا تھا اور تابعین کو اختیار منصب و عبادت اس سے حاصل ہوتے تھے۔ عام رعایا چونکہ جاگیر زبخی میں وابستہ نہیں ہوتی تھی اسلئے اسکی حیثیت کمتر

اسکی خصوصیات
اسکی بنیاد پر

اور اسکا تعلق بعید ہوتا تھا، پس اس طرح شاہی بجائے قوم کے گویا ایک خاص درجے یا طبقے کی تنظیم ہو جاتی تھی۔ اسکا انحصار قوم پر اس قدر نہیں ہوتا تھا جقدر جاگیردار کا تابعین پر۔

۲۔ قلعہ فی وفاداری میں عزت کے خیال سے شرف اور زور پیدا ہو گیا تھا اور سیاسی نقطہ خیال سے اب اسکی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ تابعین جب اپنے آقا سے جاگیر حاصل کرتے تھے تو اسکی وفاداری اور اطاعت کا حلف اٹھاتے تھے۔ اس حلف اور جاگیر داری طریق کی تمام کیفیت انگلستان کی بادشاہت کے سکسویں نورمانی قانون میں بہت واضح اور نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ بادشاہ کے تابعین گھٹنوں کے بل جھک کر بادشاہ کی اطاعت کا حلف اٹھاتے تھے اور پھر گھر سے ہو کر انجیل پر ہاتھ رکھ کر وفاداری کی قسم کھاتے تھے۔ اساتقہ اور روسائے خاندان اس سے مستثنیٰ تھے۔ انکے لئے صرف انجیل اٹھانا کافی تھا۔ اطاعت کے حلف کا تعلق خصوصیت کے ساتھ جاگیر کے قبضے سے ہوتا تھا۔ وفاداری کا حلف نسبتاً زیادہ عام تھا اور دوسرے افراد اور عیال سے بھی جو جاگیر داری تعلق سے مربوط نہ ہوں، یہ حلف لیا جاسکتا تھا۔ اسکی مثالیں خاندان چارلس کے بادشاہوں کے وقت میں بھی ملتی ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ اسکا سبب یہی جاگیری خیال کا اثر تھا۔

وفاداری کی اس قسم کی پابندی دونوں جانب عاید ہوتی تھی۔ تابع کی طرح آقا بھی وفا شکاری کا پابند تھا مگر اطاعت کی پابندی صرف تابعین پر عاید ہوتی تھی۔

۳۔ جاگیری شاہی کی اس کوشش سے کہ تمام رعایا تابعین کے ضمن میں آجائے، قبضہ اراضی پر بہت بڑا اثر پڑا۔ انگلستان کے نورمانی بادشاہوں نے یہ کوشش کی کہ وہ ملک کی تمام زمین کے مالک اعلیٰ سمجھے جائیں تاکہ صرف جاگیریں نہیں بلکہ وہ ریاستیں بھی جو حلف اطاعت سے قائم نہیں ہوئی تھیں، بادشاہ کی عطا کردہ سمجھے جانے لگیں۔ پس اس طرح آزادانہ جائداد کا حق قومی ناجائز قبضے کے جاگیری حق میں بدل گیا۔ یہ طریق جاگیر داری کی یہ عام خصوصیت ہے مگر انگلستان کی تاریخ قانون میں یہ خاص طور پر نمایاں ہے۔

یہ دیکھو دوسرا مقالہ، دوسرا باب، تالیق۔

بادشاہ سے
حاصل شدہ
اختیارات

۴۔ اس مطابقت سے بتدریج یہ بھی خیال کیا جانے لگا کہ تمام سیاسی اختیارات بادشاہ سے حاصل ہوئے ہیں اور بادشاہ کا اختیار خدا کا عطیہ ہے بلکہ جس طرح سیاروں کو آفتاب سے روشنی حاصل ہوتی ہے، اسی طرح امرا کو حکمرانی کا حق آفتاب سے ملتا ہے یعنی بادشاہ سے حاصل ہوتا تھا لیکن وہ محض سلطنت کے عہدہ دار یا عامل کے طور پر حکومت نہیں کرتے تھے بلکہ جس طرح وہ اپنی جائیداد پر قابض ہوتے تھے اسی طرح وہ اپنے حق کی بنیاد پر اپنے حسب و نحوہ حکومت کرتے تھے۔ سیاسی حکمرانی کے ساتھ شخصی آزادی کا یہ اجتماع اور بعض خاندانوں اور ریاستوں کے ساتھ مختلف مدارج کے اختیارات کا موروثی حق حاصل ہوتا تھا، انھیں اختیار عطا کرنے سے بادشاہ انکار نہیں کر سکتا تھا، نہ وہ ان کے اختیار کے نفاذ میں مداخلت کر سکتا تھا، نہ اس کے لئے کوئی پابندی یا حد قائم کر سکتا تھا۔ نظم و نسق کا ہر ایک حصہ حقیقتاً ایک دوسرے سے میسر و آزاد تھا۔

پس سلطنت کا اتحاد محض ظاہری تھا۔ قوتِ رائے سے کام کر لینی ہر ایک کو شمشیر میں نہ مل سکنے والی مشکلات کا سامنا ہوتا تھا۔ چھوٹے اور بڑے سب امرا مرکزی قوت کے کارکن کی طرح کام کر نیکیے بجائے دقتیں مایل کرتے اور ردِ یک پیدا کرتے تھے۔ قومی زندگی مختلف انفرادی حصوں میں منتشر اور ایک ایک سلطنت متعدد دشاہیوں میں منقسم ہو گئی تھی۔ افراد اور بالخصوص امراء عظام کی مرضی اور خیال کے اظہار کے لئے وسیع مواقع حاصل تھے مگر مجموعہ کوئی مشترک سیاسی کارروائی ممکن نہ تھی۔ صرف امرا کا طبقہ زور دار اور آزاد تھا۔ بادشاہ کی صرف توقیر تھی اسے کوئی قوت نہیں حاصل تھی۔ رعایا اپنے قوتوں کے فطری نشو و نما کے لئے ہر طرف سے راستے بند پاتی تھی۔ ادنیٰ طبقے جس قدر مرکزی قوت یعنی بادشاہ سے دور تھے اسی قدر ان کے دینیاتی آقا یعنی امرا ان پر بے روک ٹوک ظلم کرتے تھے۔

امرا کے اختیارات

۵۔ "سکسونی آئینہ" (Sachsenspiegel) جلد اصفہا کے بموجب خدا نے دنیاوی حکومت کی تلوار صرف شہنشاہ کو دی تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ بادشاہوں کو اختیارات صرف شہنشاہ کے توسط سے حاصل ہوتے ہیں، مگر یہ رائے عام طور پر قبول نہیں کی گئی اور بارشاہ اگرچہ شہنشاہ کے بندہ رہتے کا احترام کرتے تھے مگر وہ یہ کہتے تھے کہ انھیں اختیارات براہ راست خدا سے حاصل ہوئے ہیں۔

جرمانی اقتدار شاہی کے دو خاص اجزاء یعنی فوجی اور عدالتی اختیارات اسی طرح پریشمار تاجیں و امرا کے درمیان تقسیم ہو گئے تھے۔ علاوہ حکومت فدرال کی بادشاہوں کے مقابلے میں بہت زیادہ کمزور اور محدود تھی۔ شاہی اگرچہ زیباٹس کے طور پر باقی تھی مگر تمام نظام سلطنت آئینی ہو گیا تھا۔ کیننگلی خاندان کے بادشاہوں کو امرائے نظام پر کچھ ایسا امتیاز نہیں حاصل تھا۔ جرمانی بادشاہ تک اکثر اندرونی معاملات میں ولیان ملک کی کارروائی سے پریشان ہو جاتے تھے، صرف مستثنیٰ طور پر جب کہ حالات خصوصیت سے موافق ہوں یا خطرات بالخصوص خوف دلائولے ہوں ایہ ہوتا تھا کہ بادشاہ مضبوطی کے ساتھ اپنی مرکزی قوت کو کام میں لا سکتے تھے۔ نورمانی فتح کے بعد انگلستان میں اس حالت کے پیش آئینی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ نورمانی امرا بادشاہ کے ساتھ متحد ہی رہنے میں اپنی حفاظت سمجھتے تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ نئے خاندان کو تخت پر قائم رکھنے کے لئے ایک مضبوط حکومت کی ضرورت تھی۔

۵۔ گیزو نے اس سوال کو اٹھایا کہ کیوں جاگیر داری طریقہ ہمیشہ رعایا کو ناپسند رہا ہے۔ یہ نفرت صرف تنزل ہی کے زمانے کے متعلق نہیں تھی بلکہ جب یہ طریق اپنے معراج کمال کو پہنچا ہوا تھا اُس وقت بھی یہی کیفیت تھی اُس نے اسکی خاص وجہ یہ بیان کی ہے کہ جاگیر داری طریقہ چھوٹے چھوٹے بادشاہوں بلکہ مطلق العنانوں کا ایک اتحاد تھا۔ اُن میں باہم مساوات نہیں تھی، وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حقوق و فرائض کے پابند تھے مگر اپنے اپنے حدود میں انھیں اپنی اپنی رعایا پر کامل مطلق العنانی حاصل تھی ظالمانہ حکومتوں میں سب سے بڑی حکومت وہ ہے جو اس طرح اپنی رعایا کا شمار کر سکے اور اپنے مستقر سے اپنے حدود و حکمرانی کو دیکھ سکے۔ یہاں انسانی خود رائی کے تئوں کا انحصار ناقابل برداشت طریقوں سے اور ایسی شدت کے ساتھ ہوتا تھا کہ اسکا مقابلہ کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ وہ طریقہ تھا جس کی حالات کی نامساوات بہت بُری طرح نمایاں کیجاتی تھی۔ دولت، اختیار، آزادی ہر طرح کے منافع اور حقوق ایک طرف ہوتے تھے اور عین انھیں کے مقابلے میں افلاس، کمزوری اور غلامی کا منظر دوسری طرف دکھا ہوں کے سامنے ہوتا تھا۔ خود مختاری اس حد تک بڑھی ہوئی تھی جیسی کسی خاص بادشاہی میں ہونا چاہئے، امتیازات اُس حد تک ترقی کر چکے تھے جو بعد کسی منظم ایمانی سلطنت میں

ہو سکتے ہیں اور ان دونوں کا اظہار نہایت ہی برے اور تکلیف دہ طریقے سے ہوتا تھا۔ تختہ نگاہ کی دوری اور بلند پایگی کی وجہ سے مطلق العنانی میں جو کمی ہو جاتی ہے اُس کا یہاں وجود نہیں تھا۔ امتیازات پر کسی عظیم الشان مجلس کی عظمت کا نقاب نہیں ڈالا جاتا تھا۔ اُن دونوں کا تعلق ایک ایسے شخص سے ہوتا تھا جو بروقت موجود رہتا تھا۔ کوئی اس کا شریک کار نہیں تھا اور وہ ہمیشہ اپنی رعایا کے پاس ہی پاس ہوتا تھا۔

یہ طریقہ تمام تر
بائت تکلیف ہی
نہیں تھا۔

اس بیان میں کچھ سچائی ضرور ہے مگر اس کا کلی اطلاق صرف فرانس پر ہو سکتا ہے ازمنہ وسطیٰ کی سب سلطنتوں پر نہیں ہو سکتا۔ جاگیر داری طریق ہر جگہ نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور کسانوں تک کے امیروں سے رضا مند ہو چکی مثالیں کم نہیں ہیں۔ اس طریقے کے لئے یہ بھی لازمی نہیں تھا کہ امرا کو اپنے تابعین پر کامل مطلق العنانی حاصل ہو۔ جہاں اس قسم کے اختیار پر عمل ہوتا تھا جیسے فرانس، اور اکثر دوسرے ممالک میں بھی، وہاں یہ اختیار اُس طریقے کے بالکل مخالف تھا، جس نے اوپر سے نیچے تک انتظامی حلقے قائم کر دیے تھے جن میں اختیارات ایک دوسرے سے بالاتر آزاد قوت سے حاصل ہوتے تھے۔ نیم غلاموں تک کے موروثی حقوق معین تھے انکی ذمہ داریوں میں محض آقا کی مرضی سے اضافہ نہیں ہو سکتا تھا۔ نہ رسم درجہ کے خلاف آقا اُن کو بچ سکتا تھا۔ ادنیٰ طبقے کے لئے، حلقے کا قانون اُسی طرح معین و مروج تھا جس طرح اعلیٰ طبقے کے لئے جاگیر داری قانون رائج تھا۔

لیکن ان حالات سے قطع نظر بھی جہاں آنا اپنے حقوق سے تجاوز کر جاتے تھے اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ حکومت کی یہ مختصر وسعت اور اس شخص کی حکم و جور سے بچنے کے مشکلات جو اس قدر قریب ہوتا تھا، جاگیر داری طریقے کی بدترین خصوصیات میں سے ہیں۔

۶۔ جاگیری سلطنت سب سے مقدم ایک قانونی سلطنت تھی، اگرچہ مفاد عام کا اصول نظروں سے غائب تھا مگر مختلف سیاسی حقوق بہت صاف طور پر معین و مشخص تھے۔ ذاتی اور شخصی حقوق کی طرح یہ سیاسی حقوق بھی حسب خواہش فروخت، مبادلہ، ہبہ اور وراثت وغیرہ کے معمولی قانونی کارروائی کے ذریعے سے علمہ کئے جاسکتے تھے۔ انکی حفاظت یا تو عملاتی طریق سے ہوتی تھی یا اسکے لئے شخصی جنگ کا حق تسلیم کیا جاتا تھا۔

سیاسی حقوق کی
موجودگی۔

ایک طرف ایک معینہ قانونی انتظام تھا جس سے افراد اور علیحدہ علیحدہ جماعات کی آزادی تو محفوظ تھی مگر عام قوم کی آزادی محفوظ نہ تھی۔ دوسری طرف اندرون ملک میں ہمیشہ جنگ و جدل کا بازار گرم رہتا تھا جس سے بد امنی کا ایک نامتناہی سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ ازمنہ وسطیٰ کی جاگیر سلطنت کے یہ دو متضاد رخ ہیں۔

(۲)۔ شاہی مدد و حقوق طبقات۔

شاہی اختیار
کی تجدیدات

ازمنہ وسطیٰ کے ختم ہونے کے قبل، تدریجاً جاگیر شاہی کی جگہ شاہی محدود حقوق طبقات نے لے لی۔ یہی شاہی زمانہ حال کی نیابتی بادشاہت کی پیشرو ہے، کم و بیش ۱۲۵۰ء سے یہی طریقہ یورپ کی اکثر سلطنتوں میں رائج ہو گیا اور تین صدیوں تک جاری رہنے کے بعد سولہویں صدی میں اس نے مطلق العنان شاہی کی صورت اختیار کر لی۔

بادشاہ یا حکمران اب بھی اپنے اختیارات خدا سے یا اپنے سے اعلیٰ طاقت سے حاصل کرتا اور اُن اختیارات کو اپنی اور اپنے خاندان کی ملک سمجھتا تھا۔ اپنے حدودِ حکمرانی میں وہ اپنے کو بالکل مالک سمجھتا تھا اور اپنی مرضی کے خلاف کسی مخالفت کا تحمل نہیں ہوتا تھا لیکن یہ حدودِ حکمرانی اب ہر طرف سے محصور ہو گئے تھے۔ طبقات جماعات اور افراد کے حقوق سے ہر جگہ مقابلہ پڑتا تھا وہ جس طرح اپنے حقوق کی عزت چاہتا تھا اُسی طرح وہ خود اُن حقوق کی حفاظت کرنے پر مجبور تھا۔ یہ صاحبانِ حقوق بشر ضرورتِ بزورِ اسلحہ یا قانون کے یا امن ہتھیار کے ذریعے سے اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

وضع قانون

بادشاہ کو بذاتِ خاص قانون سازی کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ بادشاہ کے فرامین کے لئے قومی طبقات (مجلس شوریٰ) کے مشورے اور منظوری کی شرط تھی اور وایان صوبہ جات کیلئے صوبے کے طبقات کی منظوری درکار تھی۔

نظم و انتظام

اُس وقت تک انتظامی قوت نے بہت کم ترقی کی تھی اور بہت محدود تھی۔ مرکزی حکومت کے مشاکی تعمیل کے لئے کوئی جماعت عمال کی نہیں تھی۔ جن رو ساسٹے عظام کو شاہی اختیارات تفویض ہوتے تھے، وہ اُن اختیارات کو اپنے حدود کے اندر مثل اپنے اختیار کے استعمال کرتے تھے۔ دربار کے عہدے اکثر موروثی تھے اور بادشاہ کے جوتابعین و وزراء اُن پر مامور ہوتے تھے وہ شدائدِ قدیم کے مطابق اُس خدمت کو

انجام دیتے تھے جس میں اصلیت کے بہ نسبت نمائش زیادہ ہوتی تھی۔ رواج و آداب مختلف طبقات کی روایات، خاندانی خیال، فرائض قانونی اور مفاد عامہ کے احساس سے زیادہ موثر ہوتے تھے۔ صوبے کی مجلس شور جی میں امرا کا غلبہ ہوتا تھا اکثر اپنی شکایات و تعرضات کی وجہ سے صوبے کی حکومت کے لئے پریشان کن ثابت ہوتی تھی، وہ اکثر والی صوبہ کے وزیر پر اعتراضات کرتی رہتی اور انکی موقوفی و سزا دی کا مطالبہ کرتی تھی۔ بسا اوقات وہ خود والی کی ذات کو اپنی نگرانی میں لے لینا چاہتی تھی یا یہ دعویٰ کرتی تھی کہ انکے مقرر کردہ اہتمام حکومت میں شامل کئے جائیں۔

عدالتی اختیار

بادشاہ باستور انصاف کا حاکم اعلیٰ سمجھا جاتا تھا اور کبھی کبھی دادرسی کے لئے بذات خاص اجلاس آتا تھا لیکن فیصلے کا اعلان ایسر کرتے تھے اور بادشاہ صرف اُس فیصلے کو عمل میں لاتا تھا، وہ خود بھی قانون کا پابند ہوتا تھا اور اپنی غلطیوں کی اسے جوابدہی کرنا پڑتی تھی۔ یہ ایک پرانا جرمانی دستور تھا کہ جس امیر کو عدالتی اختیارات حاصل ہوں اس پر اگر کوئی الزام لگایا جائے تو اسکا مقدمہ اسی کے قائم مقام کے سامنے پیش ہونا چاہئے چنانچہ جرمانی بادشاہ باوجودیکہ وہ رومی شہنشاہ اوتام عالم عیسوی کا دنیاوی سرگروہ ہوتا تھا، بعض صورتوں میں راجن کے پیلٹائن کاؤنٹ (والی) کے روبرو طلب کیا جاسکتا اور ان والیوں کے فیصلے کے سامنے اسے جھکنا پڑتا تھا۔ علی ہذا والی کے مقدمہ کا فیصلہ اسکا کارکن مجسٹریٹ (حاکم) کر سکتا تھا۔

پولس کے انتظام نے ترقی نہیں کی تھی اور بالعموم منصفوں کے فرائض میں یہ کام بھی داخل کر دیا جاتا تھا۔ اُس وقت تک جندار (مددگاروں) کا رواج نہیں ہوا تھا اور موجودہ مفہوم میں پولیس کا وجود نہیں تھا۔

فوجی اختیارات

حکمران کی فوجی طاقت بھی جاگیر داری قوانین اور رسم و رواج سے محدود تھی، تابعین پر صرف ایک معینہ اور بہت ہی محدود خدمت عائد ہوتی تھی اور اُسے وہ اپنی زمین کا معاوضہ سمجھتے تھے اور اُسے کسی پر زور طریقہ پر کام میں لانے کو وہ روکنا چاہتے تھے۔

جرمانی بادشاہوں کو اکثر یہ تجربہ ہوتا رہتا تھا کہ بڑے بڑے نابان سلطنت کی تہذیب آزادی کو روکنا کس قدر دشوار کام ہے اور یہ کہ شہنشاہی کے حکمرانوں کی

وفا داری پر ہمنشاہ کو کس قدر کم اعتماد کرنا چاہئے۔

بادشاہوں اور حکمرانوں کیلئے یہ ارکان موجود تھا کہ وہ اُن لوگوں سے زیادہ مطیع اور کار آمد فوج اجرتی سپاہیوں کی تیار کر لیں اور اکثر ایسا ہوتا رہتا تھا، لیکن اجرتی سپاہیوں کو تنخواہ دینی پڑتی تھی اور اگر مجلس شوری اس غرض کے لئے کوئی خاص محصول عاید کرنے سے انکار کر دیتی تو بادشاہ کو خود اپنی جیب سے یہ رقم ادا کرنا پڑتی اور اس سے وہ اکثر قرضدار ہو جاتا اور مشکلوں میں پھنس جاتا تھا۔ علاوہ اسکے چونکہ یہ اجرتی سپاہی اکثر غیر ملک کے ہوتے تھے، اس لئے جس ملک پر وہ متعین کئے جاتے تھے اُسکے باشندوں کو بادشاہ کی طرف سے متفرک دیتے تھے۔

اجرائے محصول

بادشاہ کو اسوقت تک کسی قسم کے محصول کے وصول کر نیکا حق نہیں تھا، جب تک کہ پہلے مجلس شوری اُس محصول کی ضرورت کو تسلیم اور اسکے اجرا کو منظور نہ کر لے لیکن ایک اعیانی جماعت باسانی اُس پر راضی نہیں ہو سکتی تھی۔ آہستہ آہستہ اکثر محصول جائداد غیر منقولہ پر عائد کر دیے گئے۔ اُنکا بار زیادہ تر کاشتکاروں کی زمین پر پڑتا اور اس طرح وہ ایک معینہ اور ناقابل تنبیخ محصول بن گئے۔ اس سے اور بعض دوسرے معاملات سے بھی صاف ظاہر ہے کہ مجلس شوری اور افراد دونوں میں سلطنت کے مشترک فرائض کے احساس میں کمی تھی۔

تیرھواں باب (۹) زمانہ حال کی مطلق العنان شاہی

ازمنہ وسطیٰ کی شاہی جو ذمی امتیاز طبقات کے حقوق سے محروم تھی اس کے بعد ہی زمانہ حال کی نیا تہی شاہی نہیں قائم ہوئی بلکہ اُسکے بعد مطلق العنان شاہی قائم ہوئی جسے طبقات (مجلس شوریٰ) کے خلاف جدوجہد سے قوت حاصل ہو گئی تھی سلطنت کی موجودہ صورت حاصل کرنے کے قبل جرمانی رومی مخلوط قوموں اور خالص جرمانی قوموں دونوں کو اس درجے سے گزرنا پڑا۔

مطلق العنانی
کی تہی۔

مطلق العنانی کا گھور سب سے زیادہ نمایاں طریقہ پر اولاً فرانس اور ہسپانیہ میں ہوا۔ جہاں جہاں قوم میں جرمانی عنصر غالب تھا وہاں بادشاہوں کے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ قانونی مسلمات اور جرمانی روایات کے خلاف مطلق العنانی قائم کر لیں، لیکن رومی روایات جواب اصولاً اور عملاً دوبارہ زندہ کی جا رہی تھیں شاہی کے حق میں مفید تھیں۔

رومی قومیں

بارہویں ہی صدی سے جب کہ جاگیر داری طریق اپنے اوج کمال پر پہنچا ہوا تھا، فرانسیسی مقنن بالاتفاق یہ کوشش کر رہے تھے کہ شاہی کو روم کے شہنشاہی قانون کی قدیم بنیاد پر قائم کریں، انکے گروہ کا اصول مسلمہ یہ تھا کہ حکومت، واحد ناقابل تقسیم اور علی الاطلاق ہونا چاہئے، اور ان صفات کو وہ مجموعہ "اختیار شاہی" سے ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ اس نظر سے وہ جاگیر دار امرا کے عدالتی اور حکومتی اختیارات کو دراز دستی اور خرابی قرار دیتے اور اسے بادشاہ اور رعایا کے اغراض کے مخالف بتاتے اور اسے بالکل نیست و نابود کرنے جہاں تک ہو سکے محدود کر دینا چاہتے تھے۔ وہ فرانسیسی بادشاہوں کو رومی شہنشاہوں کے جانشین اور صرف رومی قانون کو صحیح قانون ظاہر کرتے تھے۔ وہ جاگیر داری طریق کے قانونی دستوروں کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے ان نظریات کو خیال سے عمل میں لانے کے لئے صدیاں گزریں جب کہیں امرا کی حکومت کا خاتمہ ہوا، لیکن اندرونی کشمکش اور سخت جنگ

ختم نہیں ہوئی جب تک کہ جاگیر داری طریق کی ہر ایک صورت فنا ہو کر اسکی جگہ پر مطلق العنان شاہی (جو یوٹائیوٹا زور پکڑتی جاتی تھی) قائم نہ ہو گئی۔

رومی قانون کا یہ مقولہ کہ ”جو بات بادشاہ کو پسند ہے، وہ قانون کا حکم رکھتی ہے“، معمولِ قدامت سے نکال کر دوبارہ ایک الہدی اصول سلطنت بنایا گیا اور اُس نے فرانسیسی میں اس قانونی ضرب المثل کی صورت اختیار کی کہ: ”جو بادشاہ کو چاہتا ہے وہ قانون کو چاہتا ہے“ جب قانون سازی کا غیر محدود اختیار بادشاہ کے ہاتھ میں آ گیا تو پھر بہت آسانی کے ساتھ وہ تمام مشکلات رفع ہو گئیں جن کو جاگیر داری طریق اور حقوق طبقات (مجلس شوریٰ) نے مرکزی حکومت، قومی جوش اور یہود عامہ کی ترقی میں حائل کر رکھا تھا۔ نئے علمائے قانون کے زیر ہدایت جو طرز عمل عدالتوں اور خامکر (پیرس اور صوبہ جات کی) شاہی پارلیمنٹوں نے اختیار کیا تھا اُس نے اس میلان کو نکامیا بنانے میں بڑی مدد دی۔ عام رائے، خامکر اُن شہروں کی رائے جہاں رومی تہذیب مدتوں سے جاگزیں تھی اور جو ایک حد تک جاگیر داری اثرات سے آزاد رہے تھے، اس نئے خیال کی موید تھی۔ اہل شہر جس قدر بادشاہ سے خائف تھے اُس سے کہیں زیادہ وہ چھوٹے چھوٹے امرا سے متنفر تھے اور انھیں یہ امید تھی کہ ان جاگیر دار امرا کو نیا دکھا کے اور انھیں کمزور کر کے وہ اپنی تجارت اور صنعت و حرفت کی ترقی کو محفوظ کر لیں گے۔ اپنے ستانے والوں پر بادشاہ کے قوت کے بڑھ جانے سے کسان بھی نقصان کے بجائے نفع میں رہنے کی امید کرتے تھے۔

فرانس میں شاہی کو جاگیر داری طریق پر لوٹس یازدہم کے عہد (۱۳۱۴ء تا ۱۳۲۸ء) میں فتح حاصل ہوئی اور ہسپانیا میں فلپ دوم کے دور (۱۵۵۶ء تا ۱۵۹۸ء) میں فرانس میں وقتاً فوقتاً رجعت تہقیری بھی ہوتی رہی مگر ہسپانیا میں مطلق العنانی بہت مضبوط طور پر قائم ہو گئی تھی اور فرانس کی بہ نسبت زیادہ ظالم اور جفا کار ثابت ہوئی۔ خیال کر کے روٹنے لگے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ فلپ دوم نے یہ جرأت دکھائی کہ نذر لینڈز کی تمام آبادی کو مجرم قرار دیدیا حالانکہ اس ملک پر اُسے حکومت کے بہت محدود اختیارات حاصل ہوئے تھے۔ فرانس میں مطلق العنانی لوٹس چہار دہم کے وقت میں اپنے انتہائے کمال کو پہنچی اور اُسکے بعد سے برابر تنزل کرتی گئی، یہاں تک کہ انقلاب نے اُس کا خاتمہ کر دیا۔

جہاں دنیا کے سب چھوٹے بڑے حکمران خاندان لوٹس چار دہم کی نقل پر آمادہ ہو گئے یہاں تک کہ اٹھارویں صدی میں ایک عیسائی حکمران جوزف اول نے بویریا کی تمام قوم کے خلاف (جن پر اس نے غاصبانہ حکومت قائم کر لی تھی) موت کا حکم صادر کر دیا اور اپنے اس فعل کو اپنے اختیار بجانب خدا کی بنا پر جائز ٹھہرایا۔

اس نئی مطلق العنانی کے سیاسی اصول کو لوٹس چار دہم نے اپنے ایک مشہور فقرے میں حیرت انگیز سادگی کے ساتھ ظاہر کیا ہے کہ ”میں ہی سلطنت ہوں“ بادشاہ اب اپنے کو جماعت قومی کا سرگروہ یعنی سب سے بڑا اور سب سے طاقتور رکن نہیں سمجھتا تھا بلکہ وہ اپنی ذات اور سلطنت کو بالکل ایک سمجھتا تھا، پس گویا اُسکے سو سلطنت کے کسی رکن کو سیاسی حقوق نہیں حاصل تھے۔ اسکی شخصی ہیبت و سلطنت کی ہیبت و قوت اُسکے ذاتی حقوق سلطنت کے حقوق تھے۔ وہی سب کچھ تھا اور اسکے سوا کچھ نہ تھا۔

مطلق العنان
بادشاہی کے
اصول

”شاہی“ اور ”سلطنت“ کا اس طرح ایک دوسرے میں مدغم ہونا اس سے بالکل جدا گانہ امر ہے کہ بادشاہ سلطنت کے عظمت و اقتدار کا مجسمہ سمجھا جائے۔ اس کا روائی کی ہیبت اور اسکا خطرہ اس وجہ سے اور بھی بڑھ گیا تھا کہ اُسی کے ساتھ سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یہ نظریہ بھی ترقی پر تھا کہ سلطنت کو ”اختیار مطلق حاصل ہے“ ازمنہ و سنی میں سلطنت چند محدود و آزاد ٹکڑوں میں منقسم ہو گئی تھی اور اُن ٹکڑوں پر اُسے کوئی قطعی اختیار حاصل نہ تھا۔ اب دوسری جانب یہ نظریہ سرعت کے ساتھ عروج کو پہنچ گیا تھا اور کوئی سیاسی حیثیت ایسی نہ تھی جو سلطنت کی گرفت سے باہر خیال کیجاتی ہو۔ قانونی معاملات اور شخصی حقوق تک سلطنت کے پیدا کردہ اور اس کی مرضی کے تابع سمجھے جاتے تھے۔

اس خیال سے جو نقصانات پیدا ہوئے اُسکی ذمہ داری ایک بڑی حد تک اُس زمانے کے سیاسی اور قانونی اصحاب نظریات پر عائد ہوتی ہے۔ اول الذکر اس فکر میں مستغرق تھے کہ شاہی درازدستیوں کے لئے کوئی لگتی ہوئی توجہ پیدا کریں اور ثانی الذکر نے اُس مخالفت سے کلیتہً پہلو تہی کی جو بطور فرض کے اُن پر عائد ہوتی تھی۔ اُس زمانے کے درباری علمائے مذہب بھی (خواہ وہ یسوعی تھے یا بائی چرچ والے یا لو تھر کے مشرعی پیر) اسکو آسانی سے زمان کے انھیں لوگوں نے توڑ مروڑ کے

اصحاب نظریات
اور پارلیمنٹ کا اثر

یہ مذہبی عقیدہ نکالا تھا کہ حکومت کی بنیاد ربانی ہے اور بادشاہ زمین پر خدا کا قائم مقام ہے۔ گویا وہ ایک طرح کے دنیاوی دیوتا ہے۔ چونکہ خدا اس دنیا کا حکم الحاکمین ہے جسے اُس نے پیدا کیا اور اپنی روح سے اُسے منور کیا، اسلئے بادشاہ بھی اگرچہ قوموں کے پیدا کر نیوالے اور انکے زندہ رکھنے والے نہیں ہیں تاہم وہ اُنکے اعلیٰ حکمران ہیں۔ جس طرح رومی شہنشاہ دیوتاؤں کی ہیئت اختیار کر نیکی متمنی رہا کرتے تھے، اُسی طرح لوٹس چہار دم نے جو پیٹر کا سوانگ بھرا تھا مگر عیسوی کے بجائے یہ سوانگ کچھ زمانہ کفر ہی کے لئے زیادہ موزوں تھا۔

مطلق العنانی کا زوال

عین اُسی زمانے میں جب کہ اس قسم کی "قدرت مطلق" بادشاہوں کی طرف منسوب کی جا رہی تھی اور اکثر اس پر عمل بھی ہوتا تھا۔ ہمیں بادشاہوں کی ایسی مثالیں ملتی ہیں جو بالکل بے بس تھے اور اپنے بلند حوصلہ ذبیروں یا اپنی حریفیں بلگیوں کے طاعت شعار غلام بن گئے تھے۔ اس نظام کاری میں تمام باتوں کا انحصار بادشاہ کی شخصی طبیعت پر تھا نمایاں قابلیت اور طاقت کے بادشاہ بھی اگرچہ اس سرگردان ملندی پر مستحکم طور پر قائم نہیں رہ سکتے تھے، تاہم وہ کسی نہ کسی طرح اس "قدرت مطلق" کی ظاہری حالت سنبھالے ہوئے تھے، چنانچہ لوٹس چہار دم کی طاقت جب تک عیش پرستی اور پیرائے سالی کے باعث زائل نہیں ہو گئی اسکی حالت ایک مثال تھی لیکن انگلستان کے چارلس دوم ہسپانیہ کے فرڈیننڈ ہفتم اور فرانس کے لوٹس پاز دوم کے ایسے کمزور بادشاہوں نے وہ مطلق العنان اختیار جو خالص بادشاہ کے ساتھ مخصوص تھا، دوسروں کے قبضہ قدرت میں دیدیا تھا۔ رعایا ہر جگہ ناقابل بیان مصیبت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ جہذب یورپ پر اس مطلق العنانی کا جو اثر پڑا اسکو جو شخص پوری طرح سمجھنے کا خواہشمند ہو اُسے چاہئے کہ ہسپانیہ اور آسٹریا کی سترہویں صدی تک کی معاشرتی تاریخ کا مطالعہ کرے۔

خوش قسمتی سے بہت سی مختلف روایات و نظریات عہد قدیم سے ایسی چلی آرہی تھیں جنہوں نے اس سیاسی اصول کی کامل اور مستقل ترقی کو روک دیا جو ایشیائی قوموں کے لئے تو موزوں ہوتا مگر یورپ کی حالت کے بالکل مخالف تھا۔ انگلستان میں خاندان اسٹوارٹ کے بادشاہوں نے دوبارہ تخت نشین ہونیکے بعد بیس چہار دم کی نقل کرنا چاہی اور چھبیس دوم نے نہ صرف پارلیمنٹ کے قیدی اور مسلمہ حقوق پر کڑے بلکہ

کلیسا کے جدید الترتیب نظام حکومت کو بھی نشانہ بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہت اُس کے خاندان سے نکل گئی اور زمانے کا سب سے بڑا دہرا اور حکمران ولیم (آئینج) تخت نشین کر دیا گیا۔ اسکی تخت نشینی سے زمانہ حال کے نیا بتی طریق کی بنیاد مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئی۔ انگلستان میں مطلق العنان شاہی کا دور تہ خاتمہ ہونا اور اسکا قطعی طور پر مٹ جانا یورپ کے دوسرے ممالک میں اس تنظیم خیلے فوراً ہی ہلک نہیں ثابت ہوا لیکن اُسکا اعتماد بالکل جاتا رہا اور تباہی کی طرف اُسکے قدم بڑھتے گئے۔ اٹھارھویں صدی کے وسیع الحیال فلسفے نے مطلق العنان شاہی کے اصول کو مسترد کر دیا۔ فریڈرک ثانی کی ذات نے اس فلسفے کو ایک ترقی کن سلطنت کے تخت پر پہنچا دیا۔ اُس نے اپنی تخت گاہ سے اس اصول کا اعلان کیا کہ بادشاہ نہ زمین کا مالک ہے نہ رعایا و سلطنت کا آقا ہے بلکہ وہ سلطنت کا اولین خادم ہے۔ مطلق العنان شاہی کا اصول انقلاب فرانس کے پہلے ہی بھیاں ہو چکا تھا اور اُس طوفان کے مقابلے کی اُس میں طاقت نہیں رہی تھی۔ جب قوموں میں آزادی کا احساس پیدا ہو گیا تو یہ اصول مختلف رنگ اختیار کرنے کے بعد انجام کار میں بالکل فنا ہو گیا۔

پھر ممالک میں

روس

اب اس زمانے میں صرف روس میں مطلق العنان بادشاہی باقی رہ گئی ہے۔ مشرق کا مذہبی احساس مغرب سے بالکل جدا گانہ ہے۔ ملک بہت وسیع ہے اور تمدن کی ترقی نسبتاً کم ہے۔ ان اسباب سے وہاں ایک مضبوط مرکزی حکومت کی ضرورت ہے۔ نہایت اہم اصلاحات جیسے الگزنڈر دوم کا نیم غلاموں کو عطا کی آزادی (۱۸۶۱ء) وغیرہ شہنشاہ کے قطعی حکم کے بغیر عمل نہیں آسکتی تھیں۔

۱۔ روسی قوانین زار کو ایک آزاد اور مطلق العنان بادشاہ قرار دیتے ہیں اور علانیہ طور پر اُسکے اقتدار کی بنا اس خدائی حکم پر رکھتے ہیں کہ خدا خود یہ حکم دیتا ہے کہ اُسکے بادشاہ کے اعلیٰ اقتدار کے طبع رہنا چاہیے کسی سر کے خوف سے نہیں بلکہ ایک مذہبی فرض کے طور پر وضع قانون کا اختیار حاصل ہے اگرچہ وہ بالعموم اپنی مجلس شاہی سے اس معاملے میں مشورہ کرتا ہے مگر اب اس واحد مطلق العنان بادشاہی کا ہوا اُسکے ساتھ فوراً کا بھی خاتمہ ہو گیا ہے۔ ۲۔ مشرب سرقتی تاج و تخت۔ سحر و جادو سے بڑھ کر دقت۔ ایک گردش پر خیلو فری۔ زندہ بنانا و نئے نادر۔ اور دستہ جم (۱)

طبقہ امراسے بہ مشکل یہ توقع کیجا سکتی تھی کہ وہ اسکا روادار ہوتا اور آزاد اور تعلیم یافتہ شہریوں کا تو بہ حیثیت ایک سیاسی اور معاشری قوت کے کہیں وجود ہی نہیں تھا۔ ادنیٰ طبقے کے لوگوں میں اتنی قابیلیت تو ہے کہ وہ اپنے دیہاتوں اور اپنی کارباری انجمنوں میں اپنے معاملات کا انتظام کر سکیں، مگر سیاسیات اور قانون سازی میں کسی قسم کا اہتمام بالشان حصہ لینے کی اہلیت اُن میں نہیں ہے۔

چودھواں باب (ن) آئینی شاہی

شاہی آئینی کا
عروج

۱۔ آئینی شاہی کی ابتدا اور اس کی اشاعت۔
آئینی شاہی نئے زمانے کا ثمر ہے مگر قبول مائٹیکو اسکا تخم قدیم جرمانیا کے جنگلوں میں بویا گیا تھا۔ سلطنت کی جس شکل کو اب ہم آئینی کہتے ہیں اس کے پیدا کر نیکی (اگرچہ نامکمل مگر) پہلی اہم کارروائی اس وقت ہوئی جب جرمانی حکمرانوں نے رومی ملکوں پر تسلط حاصل کیا اور رومی سیاسی خیالات کا ازدواج جرمانی حقوق سے ہوا۔

اس کے بعد وہ دور آیا جب جاگیر داری شاہی کی بنا پڑی اور ایک پرزور طبقہ اعیان نے شاہی طاقت کو محدود کر دیا۔ سلطنت کا اتحاد جاتا رہا۔ رعایا کی بیہودگی طرف سے غفلت برتی جانے لگی اور بادشاہ میں اس کے مرتبے کے موافق قوت نہیں رہی۔ بعدہ قومی اتحاد کے خیال نے پھر زور پکڑا اور جرمانیا کی سلطنت میں روم کے سیاسی اصول سے پھر تازگی اور قوت آ گئی۔ قوموں میں بھی اسی زمانے میں تحریک پیدا ہوا مگر حکمرانوں نے بہت کر کے مطلق العنانی کا گزرا نہی سنبھال لیا۔ مختلف طبقات نے ایک دوسرے کے ساتھ اور آپس میں کشاکش شروع کر دی۔ ازمنہ وسطی کا دور جس قدر خستہ کے قریب ہوتا گیا اسی قدر حکومت کے نظام جدید کا زمانہ نظر کے سامنے آتا گیا۔ اس دور کا خستہ ہونا گویا ایک ہزار برس کی تاریخ کے دور کا ختم ہونا ہے۔ رومی جرمانی سیاسی زندگی نے نگیل حاصل کی اور یہی یورپ کی اصلی سیاسی تہذیب ہے۔

۱۔ انگلستان
میں

سلطنت کی اس شکل نے سب سے پہلے انگلستان میں نشو و نما حاصل کی جہاں اس میں ایک مدت سے بتدیج پختگی پیدا ہو رہی تھی۔ ازمنہ وسطی میں یورپ کے کسی ملک میں بادشاہ کو اتنی قوت نہیں حاصل رہی جتنی انگلستان میں تھی مگر اسکے ساتھ ہی کسی دوسری جگہ امرا اور عوام کے حقوق آزادی کی حفاظت بھی اس جرات کے ساتھ نہیں کی گئی

اور نہ یہ آزادی حقوق کسی اور جگہ ایسی مستحکم بنیاد پر قائم ہوئی۔

انگلستان کے
انقلابات

لیکن انقلاب کی آفت سے انگریز بھی محفوظ نہ رہے۔ دو بڑے انقلابوں نے عمارتِ سلطنت کی بنیاد تک ہلا دی۔ پہلا انقلاب تیرھویں صدی کے وسط کا وہ انقلاب تھا جب بیرونوں نے یہ کوشش کی تھی کہ حکومت کا کام بادشاہ کے ہاتھ سے نکال کر خود اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ مثلاً کے قوانین آکسفورڈ جنہیں سائمن ڈی مانتفرٹ نے جبرِ نہری سوم سے منظور کرایا تھا، انکا منشا یہی تھا۔ دوسرا انقلاب جو سترھویں صدی میں چارلس اور طویل العہد پارلیمنٹ کی عصمت سے پیدا ہوا، اس میں جمہوریت پسند پورٹینوں کا ایک گروہ بادشاہ و امراء دونوں کو سیلِ فنا میں بہا لے گیا۔

لیکن ان دونوں موقعوں پر اس مرض کا دورہ اتنی دیر تک نہیں رہا کہ جسمِ عامہ کو مستقلاً کمزور کر دیتا۔ ظاہری علامات اگرچہ خراب معلوم ہوتی تھیں مگر اندرونی طور پر اس نے اتنا زور نہیں پکڑا تھا کہ قومی زندگی کی روش کو پھیر دیتا۔ دونوں مرتبہ انگلستان اس مدد سے بہت جلد بچ گیا۔ گزشتہ زمانے سے تاریخی ربط ٹوٹنے نہیں پایا اور قومی نشوونما کی حالت میں ترتیب و تعین قائم رہی۔ اول الذکر انقلاب کے وقت سے شہروں کے قائم مقاموں کو پارلیمنٹ میں جانکی، جو ابتدا ہوئی اسی سے زمانہ مابعد کے دارالعوام کی بناڑی۔ دوسرے انقلاب کی تکمیل اس طرح ہوئی کہ سولہویں صدی میں نئی آئینی شاہی قائم ہو گئی، اور اس وقت سے ہی آئینی طریقہ قومی تنظیم بن گیا ہے۔

آئینی شاہی کی
خصوصیات

آئینی شاہی سلطنت کی تمام دوسری شکلوں کی جان ہے۔ اس میں سب سے زیادہ تنوعات موجود ہیں اور اسکے ساتھ ہی مجموعے کے اتحاد و اتفاق کو نقصان نہیں پہنچا ہے۔ ایک طرف امر کو اپنی قوت کے عمل میں لایا کا پورا موقع دیا گیا ہے، دوسری طرف رعایا کے جمہوری میلان پر بھی کوئی روک نہیں قائم کی گئی ہے۔ اس نظام میں قانون کا احترام گویا فوق انسانی حد تک پہنچا ہوا ہے لیکن بادشاہ کے ذریعے سے مختلف المقاصد جماعت اپنی اپنی حد پر قائم ہیں اور وہی تمام نظریہ سلطنت کا زندہ رئیس ہے۔

انگلستان میں
آئینی شاہی کے
مراحل

انگلستان میں آئینی شاہی نے ترقی کے مختلف مراح طے کئے ہیں ان میں سے درج ذیل کا تعلق ولیم (آئینج) کے زمانے سے ہے :-
۱۔ مطلق العنان شاہی، خلاف آئین قرار دی گئی اور اس لئے مسترد کر دی گئی۔ وہ ایک

ایسی چیز سمجھی گئی جسکی رواداری ممکن نہ تھی اور جسکا مقابلہ کرنا جائز تھا۔

۲۔ پرانے خیال کے علمائے مذہب، اپنے پراسرار خیالات کی وجہ سے حقوق شاہی کو ربانی وقعت دیتے تھے۔ اُنکے اس خیال کے خلاف یہ اعلان کر دیا گیا کہ یہ حقوق انسانی ہیں اور نظام سلطنت کے حدود کے اندر ہیں۔ ان حقوق کی وہی کیفیت ہے جو پارلیمنٹ میں امرا اور عوام کے قائم مقاموں کی ہے یا جو کیفیت ہر انگریز کی شخصی آزادی کی ہے۔

۳۔ اعلان حقوق (۱۶۸۹ء) نے باضابطہ طور پر پارلیمنٹ کے حقوق اور رعایا کی آزادیوں کو معین و مشخص کر کے انھیں محفوظ کر دیا۔ اس اعلان کو مسئلہ جانشینی کے ساتھ ملا دینے سے آئندہ بادشاہ کے لئے یہ غیر ممکن ہو گیا کہ وہ اُن حقوق اور آزادیوں کو علحدہ کر سکے۔

۴۔ بادشاہ کی غیر ذمہ داری نظام سلطنت کا ایک اصول قرار دی گئی تھی مگر شاہان اسٹوارٹ کے اخراج سے صاف طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ جسوقت بادشاہ اور رعایا میں ناقابل اصلاح تصادم ہو جائے تو اس اصول میں استثنائی ممکن ہے۔

۵۔ وزرا پارلیمنٹ کے جوابدہ بنائے گئے، دارالعوام کو اُنکے خلاف استغاثہ کرینکا اور دارالامرا کو فیصلہ کرینکا حق دیا گیا۔

پارلیمنٹ کے اور حقوق بھی تسلیم کئے گئے مثلاً :

۶۔ قانون سازی میں شرکت۔

۷۔ محصولوں کا منظور کرنا اور بادشاہ کے صرف خاص کا انتظام کرنا،

۸۔ علاوہ عہدہ داروں کی نگرانی کرنا،

۹۔ عدالتی انتظام جسکی بنا رعایا کی منتخب کردہ حلفی جوری پر رکھی گئی تھی، بالکل آزاد کر دیا گیا اور اسکے اختیارات بڑھادئے گئے۔

۱۰۔ اخباروں اور سیاسی جلسوں کی آزادی منظور کی گئی تاکہ عام رائے حکومت کے کاموں کی نکتہ چینی کر سکے اور اُس پر قابو رکھ سکے۔

خاندان ہنور کے بادشاہوں کے لئے اُن اصول اور اُنکے نتائج کا کما حقہ سمجھنا مشکل تھا مگر صورت حالات ایسی تھی کہ اُن کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ آزاد نظام سلطنت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ خود ہمارے زمانے میں شہزادہ البرٹ نے خاندان شاہی پر

یہ اثر ڈالا کہ وہ ہمہ تن آئینی طسریق کا پابند رہے۔ اسکا اثر یہ ہوا کہ شاہی کی عزت و قوت میں کوئی فرق نہیں آیا اور خاندانی روایات سے جو مخالف اثر پیدا ہوتے تھے وہ رفع ہو گئے اور شاہی نے پوری قومی حیثیت اختیار کر لی۔

انگلستان کے بادشاہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ انکی ذات صرف انکی مرضی کی نہیں بلکہ سلطنت کی مرضی کی نمایندہ ہے۔ پس لا محالہ یہاں کے وزرا کا اثر امورِ مملکت میں براعظم کے وزرا سے بہت بڑھا ہوا ہے اور چونکہ انگلستان کے وزرا کا برسرِ اقتدار رہنا پارلیمنٹ بلکہ دارالعوام کے اعتماد پر مبنی ہے، اسلئے قوم کے قائم مقاموں کا اثر حکومت پر حاوی ہے۔ اس اعتبار سے انگریزی بادشاہی کو پارلیمنٹی یا جمہوری کہہ سکتے ہیں مگر تاج کا حتمی نام جیسا قومی انگلستان میں ہے، ویسا کسی اور جگہ نہیں ہے اور طبقہ امرا اور پارلیمنٹ کی قوت کتنی ہی زبردست کیوں نہ ہو مگر پھر بھی انگلستان کا نظام سلطنت بدستور شاہی ہے۔

آئینی شاہی کے قسائم کرینکی دوسری عظیم الشان کوشش فرانسیسیوں نے کی۔ ۱۷۹۱ء کے نظام سلطنت کے مرتب کرنیوالی جماعت کے اصول شاہی کے بجائے زیادہ تر جمہوری عمومیت کی طرف مائل تھے۔ اس جماعت پر انگریزی نظام حکومت کا اس قدر اثر نہیں تھا جس قدر روسو کے نظریئے کا اثر تھا کہ اقتدار شاہی رعایا اور دو طاقتوں کو حاصل ہے اور اسکے بعد ان پر امریکہ کے جمہوری نظام کا اثر تھا جس میں تین طاقتیں تھیں اور ہر طاقت دوسرے سے آزاد تھی مگر قوم کے اقتدار اعلیٰ کے زیر اثر سب متحد تھیں۔ پس ۱۷۹۱ء کا نظام سلطنت فی الحقیقت عمومی تھا۔ بادشاہی کا جز اس میں بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا تھا۔ بادشاہی گویا گزشتہ زمانے کی ایک یادگار ہو گئی تھی جس کے تمام لوازم کو انقلاب نے کلیتہً درہم برہم کر دیا تھا۔

نپولین نے شاہی اقتدار کو از سر نو زندہ کیا اور قوم جس قعرِ مذلت میں گر گئی تھی

یہ مصنف نے اس موقع پر شاہی کی قوت کے ثابت کر نیکے لئے برگ اور ابرٹ پیل کے اقتباسات دیئے تھے مگر انگریزی مترجم نے انہیں ترک کر دیا۔ اور حاشیہ پر لکھا ہے کہ اس کتاب کے انگریزی ترجمے کے پڑھنے والوں کیلئے یہ ظاہر کرنا کچھ ضروری نہیں ہے کہ انگلستان کا نظام سلطنت ظاہر شاہی ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے بلکہ انگلستان کے اہلی فرائض حیثیت کے نظام سلطنت انگلیشیہ سے معلوم ہو سکتے ہیں۔

۲- داس کا
۱۷۹۱ء کا
نظام سلطنت

پیشکش شاہی

اُس سے اُسکو ابھارا۔ مرکزی اقتدار نے پبولین کے ہاتھ میں پہنچ کر پھر ایک بار اجتماعی ہمیت اختیار کی۔ انقلاب کا اثر ابھی تازہ تھا اور یورپ کی جنگ میں قوم کی سربراہی کیلئے ایک زبردست آمر مطلق کی ضرورت تھی، لیکن پبولین کی قوتِ حکمرانی اس قدر قوی تھی کہ اسکے ہاتھ سے فرانس میں ایک نئی آئینی بادشاہی کا قائم ہونا مشکل تھا اور یہ زمانہ اس قسم کے تجربے کیلئے موزوں نہیں تھا۔ تاہم اُس نے بادشاہی کی کچھ ظاہری شکل پسند کر دی تھی۔ اُس نے یہ تسلیم کیا کہ قوم ہی اُسکے اختیار کا سرچشمہ ہے اور تمام اہل فرانس کیلئے اُس نے عزت اور ترقی کی راہیں یکساں طور پر کھول دیں۔ اس نے سنیاں میں ایک نیا طبقہ امرا قائم کرنا چاہا، اُسکی نسبت اس نے یہ کہا تھا کہ جب تک کہ جمہور اقتدار شاہی کے رہنے کے حاصل کر چکے قابل ہوں اسوقت تک یہ طبقہ امرا شاہی کی حفاظت کر سکیں گے اگر اُس کا خاندان کچھ مدت تک امن کے ساتھ قائم رہ جائے تو اُس نے جو بنیاد ڈالی تھی اُس پر ایک قومی اور آئینی بادشاہت قائم ہو جاتی مگر پبولین خود دوسری جماعتوں کے سیاسی حقوق کو اس وجہ سے ناپسند کرتا تھا کہ اُن سے اُسکے اختیار مطلق میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی، اسلئے اُسکے زوال کے ساتھ ہی اسکی تنظیمات بھی برباد ہو گئیں۔

لوئس فیڈریم کا منشور (مورخہ ۳ جون ۱۸۱۴ء) فی الاصل ایک طرح کی معاہدت تھی۔ قدیم شاہی خاندان جلاوطنی سے واپس آگیا تھا۔ رعایا انقلاب اور پبولین کی حکومت کا مشاہدہ کر چکی تھی پس یہ گویا قدیم شاہی اور جدید اصولِ حکمرانی کے دعووں یعنی حقِ موروثی اور انقلاب کے درمیان ایک مصالحت تھی۔ ظاہری حیثیت سے یہ بادشاہ کی ایک نوازش تھی اور کلیتہً اُسی کے اختیار پر مبنی تھی۔ اسکے سوا اس میں اور بھی متضاد باتیں جمع تھیں تاہم فرانس میں اس سے پہلے آئینی بادشاہت کے قیام کے لئے جو کوششیں ہوئی تھیں اُن سب سے یہ منشور بہتر تھا۔

اگرچہ ظاہراً انگریزی نظامِ سلطنت کی نقل کی گئی تھی مگر باطناً دونوں میں بڑا فرق تھا۔ انگلستان کے بادشاہ کے نسبت فرانس کے بادشاہ کو زیادہ اختیارات دئے گئے تھے۔

۱۸۱۴ء کا
منشور

۱۔ مقابلہ کردہ مقالہ ۲۔ باب ۱۰۔ پبولین کی نموذجی سلطنت کا بہترین بیان "خیالات پبولینی" میں پایا جاتا ہے مگر تفصیل عملی صورت میں کسی نہ آیا۔

یایوں کہتے کہ چونکہ یہ منشور خاص بادشاہ کی طرف سے شائع ہوا تھا اس لئے اس میں بادشاہ کے اختیارات نسبتاً کم محدود تھے لیکن انگلستان کی بادشاہت کے یہ نسبت فرانس کی بادشاہت محفوظ بھی کم تھی۔ صرف اس وجہ سے نہیں کہ فرانس کی رعایا کے مزاج میں تغیر و تحول زیادہ تھا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ انقلاب نے طبقہ امرا کو بالکل تباہ کر دیا تھا اور تمام قوم کو عمومی خیال ور لئے کا عادی بنا دیا تھا۔ امرا جو بادشاہ کے ساتھ قانون سازی کے حق میں شریک کئے گئے تھے اور سیاسی جرائم کے لئے وہ عدالت اعلیٰ قرار پائے تھے وہ صحیح معنی میں قومی جماعت سمجھے گئے تھے بہن سے گزشتہ کی یادگار اور آئندہ کے توقعات وابستہ تھے گویا وہ قدیم و جدید دور کے جامع تھے، مگر فی الحقیقت پتولین کے وقت کے نئے امرا زیادہ تر نسل انداز کر دیئے گئے تھے اور قدیم امرا کے پریشان حال خاندانوں کے ساتھ بہت ہی نیا مانہ برتاؤ کیا گیا تھا۔ موروثی امرا انگلستان کے دارالامرا کے مقابلے میں بہت پست تھے اور وہ ہرگز مستقل اور صحیح معنوں میں قومی جماعت نہیں خیال کئے جاسکتے تھے۔ ایوانِ معوثین کا منشا یہ تھا کہ وہ قدم زمانے کی سیدان اس پر منعقد ہونیوالی مجلسوں نیز اسٹیشن جنرل کے طبقہ سوم کا قائم مقام ہو لیکن فی الحقیقت یہ دولتمندوں کی ایک خالص حکومت تھی اور سرکاری اعمال کے حسب منشا اس سے کام لینا مقصود تھا۔ عام رعایا جن میں بکثرت متول اور تعلیم یافتہ اشخاص موجود تھے اور جس نے دور انقلاب میں کارہائے نمایاں انجام دئے تھے اسے نہ رائے دی کا حق تھا اور نہ اس کے افراد منتخب ہو سکتے تھے، انقلاب میں کسانوں کو آزادی ملکیت اور سیاسی حقوق تک حاصل ہو گئے تھے مگر وہ بھی حق انتخاب سے خارج رکھے گئے اور نیچے طبقے والوں کا تو بالکل خیال ہی نہیں کیا گیا۔ پس جمہور سے (جواب فرانس میں ایک زبردست سیاسی طاقت بن گئے تھے) یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ ایک ایسے نظام سلطنت کی تائید کریں گے جس میں انھیں نیابت کا مطلق حق نہ دیا گیا ہو۔

انقلاب سے دو متضاد میلانوں کو تعزیت ہو گئی تھی۔ ایک طرف مرکزیت کی

خوش تھی اور دوسری طرف عمومیت کی توسیع۔ اگر یہ دونوں میلان انتہا تک پہنچائے جاتے تو ایک کا انجام مطلق العنان بادشاہی پر ہوتا اور دوسرے کا انقلابی ابتری پر۔ منشور کا منشا یہ تھا کہ اول الذکر میلان کو تقویت دے اور اُسے قابو میں لائے اور اس طرح ثانی الذکر میلان کو روک دے۔

پارلس دہم کی مطلق العنانی اور انقلابی اخباروں کے باعث پہلی مرتبہ جو طوفان برپا ہوا انہیں یہ منشور پہنچ گیا۔ لوئس فلپ کے فریق اور جولائی کے انقلاب (۱۸۳۰ء) والوں نے یہ شور مچایا کہ منشور پر حقیقتاً عمل درآمد ہونا چاہئے مگر فرق صرف اتنا ہوا کہ امر کا منصب موروثی ہو نیکی بجائے مین حیات کے لئے کر دیا گیا اور دارالمبعوثین میں اگرچہ دو تہندوں کا غلبہ رہا مگر اُسکے انتخاب کنندوں میں وسعت کر دی گئی۔ (الف)

۱۸۳۰ء کا
انقلاب

اس کے بعد ایک دوسرا انقلاب پیش آیا اور کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ یہ انقلاب اس زور کا ہو گا۔

۱۸۳۰ء کا
انقلاب

فروری ۱۸۳۰ء میں تمام نظام سلطنت ایک دن میں الٹ دیا گیا۔ قلیل التمداد جماعت نے ایسی جانبازی دکھائی کہ کثیر التمداد جماعت مبہوت و حیران ہو کر رہ گئی اور

۱۔ دو ٹوک دل "عمومیت امریکہ میں" انگریزی ترجمہ از ریو، جلد ۱، صفحہ ۳۹۰ : انقلاب فرانس دو مخالف جذبات ایک دوسرے کے خلاف روش پر چل رہے تھے، اور انہیں ہرگز خط ملا نہ کرنا چاہئے۔ ان میں سے ایک تو حریت کا مہرہ تھا اور دوسرا مطلق العنانی کا۔ انقلاب نے خود کو شاہی اور اس کے ساتھ ہی صوبائی تعلیمات کا دشمن ظاہر کیا۔ اس نے اپنی بلا امتیاز نفرت سے ان تمام چیزوں کو ایک ہی میں غلط ٹھہرا دیا جو اس سے قبل موجود تھیں۔ اس میں مطلق العنانی اختیار اور اس کی خرابیوں کی روک سب داخل تھے اور اس انقلاب کا میلان یہ تھا کہ وہ ایک ساتھ چیزوں کو تہ و بالا بھی کرنا چاہتا تھا اور مرکزیت بھی قائم کیا چاہتا تھا۔ فرانسیسی انقلاب کی دُہری نوعیت ایک واقعہ ہے جس سے مہبان مطلق العنانی نے خوب ہی کام نکالا ہے۔

(الف) رائے دہی کی شرط کیلئے تین سو فرانک کے بجائے دو سو فرانک کی براہ راست معمول کی ادائیگی کر دی گئی، اُسکے بعد بھی انتخاب کنندوں کی تعداد پانچ لاکھ سے کم رہی اور خاندان آئرلینڈ کی ٹا کا می کے اسباب میں سے ایک نمایاں سبب مجدد حق رائے دہی بھی تھا۔

اس سے کچھ بن نہ پڑا۔ جو نظام سلطنت اس طرح اُٹا گیا وہ اس سے بہتر تھا جو اُسکے بعد قائم ہوا اور اس میں ہر اعتبار سے ترقی کی گنجائش تھی یہ دو سرا موقع تھا کہ عوام نے فرانس میں حکومت کریشی کو شش کی۔

انقلاب اول کی نیابتی عمومیت پھر قائم کی گئی اور ایک شخص اس جمہوری سلطنت کا صدر (پریسیڈنٹ) مقرر کیا گیا لیکن رئیس کے اختیارات مجلس قومی کے ذریعے سے محصور و محدود کر دیے گئے تھے مگر خود مجلس قومی میں سخت تفرقہ پڑا ہوا تھا اور وہ اپنی قوت کو بیکار مباحثات میں ضائع کر رہی تھی۔ عوام کا میلان طبی پھر بادشاہت کی طرف ہو گیا اور ایک دوسرا پولین اس سلطنت عمومی کا فاتح اور اسکا جانشین بن گیا۔ لوئس پولین نے تمام نظم و نسق پر قبضہ کر لیا اور اہل فرانس کے حصہ کثیر نے اسکی اس کارروائی سے موافقت کر لی اور اس طرح یہ کارروائی جائز قرار پا گئی۔

دوسری
شہنشاہی

نئی شہنشاہی کے، نظام سلطنت (۱۸۵۲ء) نے انگریزی سلطنت کے بجائے رومی سلطنت کی یاد تازہ کر دی۔ حقیقت پولین کے خیالات بالکل رومی طرز کے تھے اور اس وجہ سے فرانس کے رومی انیال لوگوں نے اُسے پسند کیا۔ تمام سیاسی طاقت کا منبع رعایا قرار دیدی گئی تھی اور اسی کی عظمت و جلال کی اطاعت کی جاتی تھی۔ نظام سلطنت اسکی رضامندی کے تابع تھا۔ جماعت و اضیع قانون کا انحصار اُسی کی منظوری پر تھا۔ یہاں تک کہ شہنشاہی اختیار بھی اُسی کی مرضی سے مستخرج تھا اور شہنشاہ رائے عامہ کا جواب دہ تھا۔ عوامی مسادات جسے عوام اس درجہ عزیز رکھتے تھے، وہ بلا استثنا ہر شخص کو رائے دی کا اختیار دیکر بلے بحث و تکرار تسلیم کر لی گئی تھی۔ اسی وسیع بنیاد پر شہنشاہی قوت و جلالت کی عمارت بلند کی گئی تھی۔ قانون کا پیش کرنا، سیاسیات، امور خارجہ، فوج اور عدالت سب کی نگرانی شہنشاہ کے ہاتھ میں دیدی گئی تھی۔ یہاں تک کہ مجلس سلطنت کے ارکان کو بھی وہ اپنی مرضی سے علیحدہ کر سکتا تھا۔ نظام سلطنت میں صرف دو اہم طاقتیں تسلیم کی گئی تھیں۔ ایک رعایا کی کثرت رائے، دوسرے شہنشاہ۔

۱۸۵۲ء کا نظام سلطنت سالِ ہفتم (۱۸۵۲ء) کے پولینی نظام سلطنت سے ظاہری مشابہت رکھتا تھا، مگر دونوں کے اختلافات واقعا قابلِ لحاظ تھے۔

۱۸۵۲ء پولین سوم کا لقب ”بنایت خدا و رضا“ قوم شہنشاہ فرانیسیاں“ تھا۔

ان دونوں کے درمیان جو کچھ تھا وہ آزادی کا محض ایک سایہ تھا۔ وزیر صرف شہنشاہ کے جوابدہ تھے مگر ان میں سے بعض محض فصیح البیان مقرر تھے اور ان کے تقرب سے غرض یہ تھی کہ وہ ایوان معوشین میں حکومت کی حمایت کریں۔ ان لوگوں کا اثر بعض وقت نہ صرف نمایندگان قوم کے لئے بلکہ خود شہنشاہ کیلئے خطرناک بن جاتا تھا۔ جماعت واضح قانون کی طاقت مثبت ہو نیکی بجائے زیادہ تر منفی تھی۔ وہ کسی مضرباً واجب قانون کو درست نہیں کر سکتی تھی، البتہ اُسے نامنظور کر سکتی تھی۔ اُسے خود کسی قانون کے پیش کر نیکا اختیار نہیں تھا اور وہ اپنے مجوزہ تغیرات کی نسبت کمیشن کے ذریعے سے مجلس سلطنت سے مشاورت اختیار کر سکتی تھی۔ سیاست کی بڑی غرض یہ قرار دی گئی تھی کہ وہ عام آزادی کی حمایت کر لگی، نظام سلطنت کو قائم رکھے گی اور مستثنیٰ حالتوں میں اپنی جانب سے اصلاحات تجویز کر لگی، لیکن حقیقتاً یہ ایسے امر کی ایک جماعت تھی اور اسکے ارکان پوجود مجبور تھے کہ شہنشاہ سے وابستہ رہیں۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ شہنشاہ ہی سے انہیں یہ اعزاز حاصل ہوا تھا اور کچھ فرانس کے معاشرتی اور فریقانہ تعلق کی وجہ سے۔ حکومت کا خاص مقصد یہ تھا کہ شہنشاہ اور عوام میں یکجہتی قائم رہے اور اس لئے مخالفین کو درالبعوشین و پیرس دونوں جگہ بہت ہی خفیف آزادی دی گئی تھی۔

اس خود مختارانہ نظام سلطنت سے عام آزادی کی نئی خواہش کو تسلی نہیں ہوئی۔ پوپین سوم کو مجبوراً ایسی مراعات کرنا پڑی جس سے آئینی بادشاہت کی طرف قدم بڑھے۔ سینات کے ایک فیصلے (ستمبر ۱۸۷۹ء) کے موجب جس کم دیا گیا کہ ہر دو اوائی ہائے مجلس کو اپنی طرف سے قانون پیش کر نیکا حق ہے۔ وزیران مجلسوں کے رکن ہو سکتے ہیں اور انھیں سینات کے سامنے جوابدہ ہونا پڑیگا۔ یہ تغیرات رعایا کے سامنے پیش کئے گئے اور ۲۰ اپریل ۱۸۷۹ء کے فیصلہ عام میں (۱۵۲۸۸۲۵) رایوں کے مقابلے میں (۳۵۰۱۴۲) رایوں سے منظور ہو گئے۔

۱۸۷۹ء لوئس نپولین نے "تفکرات سیاسیات" میں اپنے کچھ خیالات ۱۸۷۹ء سے قریب زمانہ میں قلب بند کئے تھے اس میں اس نے فرانسسی نظام سلطنت کا ایک خاکہ بھی کھینچا تھا۔ اس خاکہ کو ۱۸۷۹ء کے نظام سلطنت سے وہی نسبت ہے جو نوجوانی کے خیالات کو سن و شد کے پختہ خیالات کے ساتھ ہوتا ہے۔

۱۸۷۹ء ان رعایتوں کا آغاز ۱۹ جنوری ۵ فروری اور ۱۴ مارچ ۱۸۷۹ء کے احکام سے ہوا۔

لیکن جرمانیا کی جنگ سے پولین کی حکمت عملی اور فرانسیسی فوج کو جو شکست نصیب ہوئی انہی وجہ سے یہ مراعات اس نازک موقع پر نظام سلطنت کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

پیرس (۲۸ ستمبر ۱۹۱۹ء) کے ایک نئے انقلاب نے شہنشاہی کو منسوخ کر کے پھر جمہوریت کا تجربہ کر چکی کوشش کی۔

فرانس میں انقلاب کے دوران میں اور اس کے بعد جن تغیرات کا تجربہ ہوا انکا نہایت اہم اثر دوسرے ممالک اور خاص مکران ممالک پر پڑا جو روم کے اثر میں رہ چکے تھے۔ اطالیہ میں فرانسیسی فوجوں کی تلوار نے اپنے ملک کے نمونے پر جمہوری سلطنتیں قائم کیں اور بعد میں پولین اول نے اطالیہ اور سپانیہ دونوں ملکوں میں آئینت سلطنتیں قائم کیں جو فرانسیسی شہنشاہی کی نقل تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا جدید یورپ کے نظام سلطنت کیلئے احکام پیرس سے صادر ہوئے مگر پولین کے زوال کے ساتھ ہی ان کی قلیل الحیات سلطنتوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

آئینی شاہی کے نشوونما کے اعتبار سے سسلی اور سپانیہ کے وہ نظام سلطنت زیادہ اہم تھے جو ۱۸۱۵ء میں شائع کئے گئے تھے مگر یہ نظام سلطنت بہت ہی مختصر زمانے تک رہے۔ جزیرہ سسلی کا نظام سلطنت زیادہ تر لارڈ ولیم بنٹنک کا تیار کیا ہوا تھا اور اس لئے وہ بالطبع انگلستان کے نمونے پر بنا تھا مگر اس کے ساتھ ہی بورانی زمانے کی آئینی روایات کا بھی خیال رکھا گیا تھا اور تقسیم اقتدار کے جدید اصول انگلستان کے بہ نسبت زیادہ واضح طور پر تسلیم کئے گئے تھے۔ قانون سازی کا اختیار پارلیمنٹ کو دیا گیا تھا لیکن پارلیمنٹ کے صرف دو ایوان تھے۔ بادشاہ پارلیمنٹ میں شامل نہیں تھا۔ وہ پارلیمنٹ سے ایک جدا گانہ اور خارجی طاقت کے طور پر قوانین کو منظور کرتا تھا۔ دارالامرا سسلی کے بیرونوں اور مقتدایان دین پر مشتمل تھا۔ دنیاوی امرا موروثی تھے مگر بادشاہ ایسے لوگوں میں سے نئے امیر بنا سکتا تھا جن کی خالص آمدنی چھ ہزار فرانک ہو۔ دارالعوام میں رعایا کے قائم مقام بھی تھے اور رائے دہی یا انتخاب کے لئے بہت قلیل آمدنی کافی سمجھی گئی تھی۔ انتظامی اختیارات بادشاہ کو حاصل تھے مگر اس کے وزرا اور مشیران خاص ان اختیارات کو عمل میں لانے کے لئے پارلیمنٹ کو مجبور تھے۔ تمام اہم معاملات میں بادشاہ اپنی مجلس خاص سے

۱۹۱۹ء کا
انقلاب

۲۰-۲۱ مئی ۱۹۱۹ء

۱۹۱۹ء

مشورہ لینے کیلئے مجبور تھا اور بعض معاملات میں اُسے پارلیمنٹ کی منظوری بھی لینا پڑتی تھی، مثلاً سسلی کے اندر فوجوں کا لانا غیر ملکی عمال کا تقرر، احکام کے لئے عہدوں کا قیام، سیاسی خدمات کے وظائف کا عطا کرنا۔

عدالتی اختیارات، بادشاہ کے نام سے عمل میں آتے تھے مگر اُنکے عمل میں لایاؤلے وہ حکام ہوتے تھے جو از روئے قانون مقرر کئے جاتے تھے ہر باشندہ سسلی کو یہ اختیار تھا کہ وہ خلاف قانون روک ٹوک کی متاومت کر سکے۔ مذہبی تصانیف کے سوا اور تصانیف سے اعتساب اٹھا دیا گیا تھا، جاگیر داری حقوق دبا دیئے گئے تھے۔

فنا ہر ہے کہ یہ نظام سلطنت انگریزی طریقوں کی نقل تھا۔ اسی میں ۱۷۹۱ء کے فرانسیسی نظام سلطنت کے نظریات کے کچھ اجزاء بھی شامل کر دئے گئے تھے۔ ان دونوں نظامہائے سلطنت میں جمہوریت کی شان غالب تھی مگر سسلی میں شاہی روایات کے مقابلے میں یہ شان زیادہ نمایاں اس وجہ سے نظر آتی تھی کہ بوربوتی بادشاہوں کا مطلق العنان دربار ہر نظام سلطنت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسکے ساتھ ہی پادریوں اور چیکوین طریق والوں میں جنگ وجدل جنوبی طبائع کی پوری سرگرمی سے جاری تھی۔ یلینز جب بادشاہ کو واپس لگیا تو اُسے اتنی طاقت حاصل ہو گئی کہ جس نظام سلطنت کے برقرار رکھنے کا اس نے حلف اٹھایا تھا اُسے منسوخ کر کے اُسکے بجائے مطلق العنان حکومت قائم کر دیے لیکن انگلستان کی سیاسی ہیئتوں کو فرانسیسی انقلاب کے اصول سے ملا کر جو ایک نیا نظام سلطنت قائم کیا گیا تھا وہ زمانہ آئندہ کی بہت سی اسی قسم کی کوششوں کے لئے نمونے کا کام دیتا رہا۔

اسیٹنی سلطنت اور تین قوتوں کی تقسیم کے متعلق اس قسم کے نظریات کے اثر سے وہ نہایت مکمل نظام حکومت تیار ہوا جسے ہسپانیہ کے متولیکوں نے ۱۲ مارچ ۱۸۰۳ء کو شایع کیا تھا، جب کہ بادشاہ قید میں تھا اور ملک کے بہت بڑے حصے فرانسیسی متصرف تھے۔ اس نظام سلطنت میں ۱۷۹۱ء کا فرانسیسی نظام سلطنت پیش نظر رکھا گیا تھا اور یہ اعلان کیا گیا تھا کہ اقتدار اعلیٰ رعایا کو حاصل ہے (دفعہ ۳) مگر اس کے ساتھ ہی بادشاہ کو بہت وسیع اختیارات دئے گئے تھے۔ وضع قوانین کے اختیارات، پارلیمنٹ اور بادشاہ کو اشتراکاً تقوین تھے (دفعہ ۱۵) اور بادشاہ انصاف کی نگرانی کا بھی ذمہ دار تھا (دفعہ ۱۷) لیکن یہ بھی شرط تھی کہ اگر کوئی قانون دوسرے پارلیمنٹ میں

(۲) ہسپانیہ

منظور ہو جائے تو بادشاہ پر اسکی منظوری لازم ہو جائیگی۔ ہسپانیہ کا نظام سلطنت حقیقتاً انگریزی نظام سلطنت سے بہت مختلف تھا کیونکہ اس میں دارالامرا کا وجود نہیں تھا اور براہ راست قومی قائم مقاموں کی مجلس سے واسطہ تھا جسے کورٹس کہتے تھے۔ اس نظام سلطنت میں بہت سے نقائص تھے اور رعایا نے اسے خوشی کے ساتھ قبول بھی نہیں کیا تھا مگر جب واپس شدہ بادشاہ فرڈیننڈ ہفتم نے اسے محض اپنی رائے سے (۱۸۰۷ء میں) رد کر دیا تو پھر وہ عام طور پر پسند کیا جانے لگا اور (۱۸۱۲ء میں) کئی مرتبہ اسے بزور قاعلم کرینکی کوششیں کی گئیں۔

۱۸۳۲ء کا ایسٹاٹوٹورے آل (شاہی نظام سلطنت) جس نے ہسپانیہ میں نیا تہی حکومت قائم کی رعایا کو مطمئن کرینکے لئے ناکافی ثابت ہوا۔ ۱۸۳۷ء میں منولیہ ملکہ کرستینا مجبور کی گئی کہ وہ ۱۸۱۲ء کے نظام سلطنت کو تسلیم کرے اور دوسرے سال ترقی پسند فریق کے دباؤ سے ایک نئے نظام سلطنت کی باقاعدہ منظوری حاصل کی گئی جسکی بنیاد ۱۸۱۲ء کے نظام سلطنت پر رکھی گئی تھی اور ایسٹاٹوٹورے آل کے مطابق اس میں کسی قدر ترمیم کر دی گئی تھی۔ اس میں تسلیم کیا گیا تھا کہ بادشاہ قانون کے منظور کرنیکے متعلق بلا حصر اختیار حاصل ہے۔ دو ایوان قائم کئے گئے ایک ایوان امرا اور دوسرا ایوان سفوتین۔ اعتماد پسند فریق نے ۱۸۴۵ء میں اس پر نظر ثانی کی اور اسے ۱۸۴۷ء کے فرانسیسی منشور سے زیادہ قریب کر دیا۔

لیکن اس سے بھی آئینی کشمکش کا خاتمہ نہیں ہوا اور ملک میں سیاسی و جزر جاری رہا۔ کبھی مذہبی فریق کو غلبہ ہو جاتا، کبھی انتہا پسند، طوائف الملوک کی برپا کر دیتے، کبھی درباری، سازشوں میں سرگرم ہوتے اور کبھی فوج کو تسلط کامل حاصل ہو جاتا۔ متعصب ملکہ ایزابیلا کی بد نظمی کے باعث ۱۸۶۵ء میں ایک نیا انقلاب پیش آیا جس میں بوربون خاندان اور یسوعی فرقے والے دونوں نکال دیے گئے۔ ایک مدت تک شاہی پسند فریق لا حاصل طور پر کسی بادشاہ کی جستجو میں سرگرواں رہا۔ یہاں تک کہ ۱۸۷۵ء میں اطالوی بادشاہ وکٹرمانوئل کے دوسرے بیٹے فریوک اورٹانے ماویچو اداں کے لقب سے تاج قبول کر لیا۔ ایک زمانے تک حالات آئینی حکومت کے موافق معلوم ہوتے تھے مگر زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ مسلسل سازشوں کے باعث بادشاہ کی طبعیت مکرہ ہو گئی۔ اور وہ

خود ہی (۱۸ فروری ۱۸۶۳ء) تخت سے دست بردار ہو گیا۔ اب ضرورت سے مجبور ہو کر لوگوں نے جمہوریہ کا اعلان کر دیا مگر اسکے بعد ہی فوجی فریق نے حکومت پر قبضہ کر لیا اور آئینی بادشاہت کو دوبارہ قائم کر نیکے لئے راستہ صاف کر دیا اور یکم جنوری ۱۸۶۳ء کو نومیسر الفانسو دوازدہم بادشاہ مشہر کیا گیا۔ اس دوران میں خاندان بوربون کا دعویدار دون کارلوس پادریوں اور حق موروثی کے طرف داروں کی مدد سے شمالی ہسپانیہ اور خاص کر باسک کے پہاڑی خطے میں اپنے خاندانی حقوق کے ثابت کر نیکے لئے کوشش کرتا رہا مگر نتیجہ اسکے سوا کچھ نہ ہوا کہ رعایا کی مصیبت اور پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ ۱۸۶۸ء میں ایک نئے نظام سلطنت کے تیار کر نیکے لئے ایک کونریس طلب کی گئی اور شاہ الفانسو نے اس نظام سلطنت کے متعلق ۳۰ جون کو اپنی منظوری صادر کر دی۔ اس نظام سلطنت کی رو سے قوم کی نیابت کے لئے (قانون انتخاب مصدرہ ۸ فروری ۱۸۶۹ء کے موافق) ایک دار الامر کی اور (قانون انتخاب مصدرہ ۸ فروری ۱۸۶۹ء کے موافق) ایک دار المبعوثین کی بنیادی۔ دار الامر کے کچھ ارکان تو استحقاقاً مقرر ہوئے تھے، کچھ بادشاہ کے نامزد کئے ہوئے تھے اور کچھ منتخب شدہ۔

۳۰ اپریل ۱۸۶۸ء

اپریل کے ۱۸۶۸ء کے نظام سلطنت کی نقل پر نکال کے ۱۸۶۸ء کے نظام سلطنت میں کی گئی، مگر یہ نظام سلطنت کبھی پوری طرح مسلم نہیں ہوا۔ ۱۸۶۸ء میں دون پیدرو نے اپنی بیٹی ڈونا ماریا ڈی گوریا کے حق کو مستحکم کر نیکے لئے ایک نیا نظام سلطنت تیار کیا۔ اس میں شاہی اصول کی زیادہ خوبی کے ساتھ حفاظت کی گئی تھی۔ نیز انگلستان اور مشور فرانس کی تقلید میں دار المبعوثین کے ساتھ موروثی اور باوام الحیات امر کا بھی ایک ایوان قائم کر دیا گیا تھا۔ اس نظام سلطنت میں چار قوتیں تسلیم کی گئی تھیں۔ (۱) قانون سازی۔ اسکا متعلق منظور بادشاہ پارلیمنٹ سے تھا (۲) قیام توازن۔ قوم کے سرپرست اعلیٰ ہونیکے لحاظ سے یہ قوت بادشاہ کو حاصل تھی کہ وہ تمام سیاسی طاقتوں میں توازن اور یکجہتی قائم رکھے (۳) اختیارات علانہ۔ اسکا متعلق بادشاہ و وزرا سے تھا (۴) اختیار عدالتی۔ یہ اختیار آزاد عدالتوں کو تفویض کیا گیا تھا۔

دون میگل اور مطلق العنانوں کی فتح کے بعد بھی (جو کسی نظام سلطنت سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتے تھے) دو فریق مختلف کامیابیوں کے ساتھ اپنی جدوجہد میں سرگرم رہے۔

ایک عمومی پسندوں کا فریق تھا جو ۱۸۲۲ء کے نظام سلطنت کا خواہاں تھا اور دوسرا "منشوری" تھا جو ۱۸۲۶ء کے منشور کا طالب تھا۔ ۱۸۳۸ء میں اس پر آخر خدا کر نظام سلطنت پر نظر ثانی کی گئی اور موروثی امارت اور مجلس سلطنت منسوخ کر دی گئیں۔ عام عیالیا نے ان تغیرات میں بہت کم حصہ لیا۔ تاہم موجودہ خاندان کو برک کے تخت میں ہسپانیہ کے بنسبت پرنگال میں سیاسی حالت نے زیادہ کامیابی اور امن و امان کے ساتھ ترقی حاصل کی ہے۔

آئینی شاہی پرنگال سے برازیل پہنچی ۱۸۲۲ء میں اپنے وطن مادری (یعنی امریکہ) سے آزاد ہو گیا تھا اور وہاں پہنچ کر اُسے اس قسم کی جدوجہد اور ایسے ہی نشیب و فراز کا سامنا ہوا مگر یورپ ہی کے مانند اُسے ترقی بھی ہوتی گئی (۱۸۲۵ء میں شاہی کا خاتمہ ہو گیا) اطالیہ کو مطلق العنان حکومت کی ذلت سے نکالنے کے لئے لگاؤ اور جدوجہد کی ضرورت ہوئی۔ اگرچہ نیپولین کی قائم کردہ اٹلی اور نیپلز کی بادشاہتیں میرو و شمعہ سلطنتوں سے زاید نہیں تھیں مگر بوربون اور ہابس برگ کی شہزادے جب دوبار تخت نشین ہوئے تو انکی مطلق العنانی رعایا کی طاقت برداشت سے باہر ہو گئی۔ اس بازگشت ظلم کے خلاف خفیہ سازشیں اور علانیہ بغاوتیں ہونے لگیں اور انکا السداد صرف غیر ملکی فوجوں کے ذریعے سے ہوا۔ جب ۱۸۲۱ء میں شاہ نیپلز اس امر پر راضی ہوا کہ وہ ہسپانیہ کا شاہ والا نظام سلطنت اپنے ملک میں نافذ کر دے تو فوراً ہی آسٹریوی فوجوں نے دخل دیکر پرانی مطلق العنانی کو پھر قائم کر دیا۔ ۱۸۲۱ء اور ۱۸۲۲ء کے درمیانی زمانے کی تحریکیں بھی بیکار ثابت ہوئیں کیونکہ آئینی حکومت قائم کرینی جب کوئی کوشش کیجاتی تھی تو آسٹریا کی زبردست قوت اسکے دبانے کو تیار رہتی تھی اور آسٹریا ہی کی قوت چرسکہ ان خاندان استمداد کے لئے نظر ڈالتے تھے۔

۱۸۳۰ء کے بعد یہ ہوا کہ اصلاح کے جوش کے ساتھ فیکری حکومت سے آزاد ہوجانکی خواہش بھی شامل ہو گئی اور اس طرح اس تحریک کو بہت تقویت حاصل ہو گئی۔ ۱۸۳۰ء میں تمام اٹلی میں جوش برپا ہو گیا اور بغاوتیں معلوم ہوتا تھا کہ اس تحریک کو نئے پوپ پائس ہیم کی تائید بھی حاصل ہو گئی ہے۔ پیرس میں انقلاب کے شیعہ کے قبل ہی نیپلز میں فریمنڈ دوم اور پیدمونٹ میں چارلس ابراٹ آئینی سلطنت قائم کرنے پر مجبور کے گئے

لیکن فرڈیننڈ نے مناسب موقع حاصل ہوتے ہی اس کام کو پلٹ دیا۔ حالانکہ اُس کے برقرار رکھنے کے لئے وہ ٹیکسٹ مقدس کے نام سے حلف اٹھا چکا تھا۔ اس متواتر وعدہ شکنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اسکے بیٹے فرانسس ثانی کو ۱۵۶۶ء میں ضرورت نے مجبور کیا کہ وہ اپنی سلطنت دوبارہ قائم کرے تو رعایا نے اُس پر اعتماد کرنے سے انکار کر دیا اور اس خاندان ہی کو ملک سے نکال باہر کیا۔

پیڈمونٹ میں صورت معاملات اس سے مختلف رہی۔ خاندان سوائس فیرومولی استقلال کے ساتھ ۳۴ مارچ ۱۵۳۸ء کے نظام سلطنت پر قائم رہا جسے چارلس البرٹ نے ۱۵۳۰ء کے فرانسیسی منشور کے موافق منظر کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ چارلس البرٹ کو اس مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی کہ کل اٹلی کو اپنے زیر نگین ایک سلطنت بنا لیتا کیونکہ رادسکی کی فتوحات نے اسکی اس حوصلہ مندی کو روک دیا اور غالباً اس جزیرہ نما کو قبل از وقت عیسویت کے طوفان سے بھی بچایا۔ لیکن اس بازگشت کے زمانے میں بھی دو کڑا ناول اپنے باپ کے وعدے پر ثابت قدم رہا۔ اسکی ۱۵۵۹ء اور ۱۵۶۶ء کی حیرت انگیز کامیابیوں کی بڑی وجہ یہی تھی کہ رعایا کو اس پر یہ پھر سنا تھا کہ وہ صدق دل سے نظام سلطنت اور قوم کا ہی خواہ ہے، دوسری وجہ یہ تھی کہ اس نے ایک بہت بڑے دبر کا فور کو اپنے کاموں کا انصرام سپرد کر دیا تھا۔ فرانسیسیوں کی مدد سے ایل آسٹریا لمبارڈی سے خارج کر دئے گئے اور اس نئی قومی بادشاہت نے وسط اٹالیہ کی امارت کو اپنے اندر لے لیا اور گابالڈی کی دلیرانہ جہم نے اس میں فیلز اور سسلی کا بھی اضافہ کر دیا۔ پروشیا کی مدد سے ۱۵۶۶ء میں وینس کا الحاق کر لیا گیا اور ۱۵۶۶ء کی جنگ فرانس و جرمانیا نے فرانسیسی فوجوں کو روما کے نالی کر دینے پر مجبور کیا تو ایل اٹالیہ کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے قدیم دار السلطنت پر قابض ہو جائیں۔ جرانیائی فتوحات نے یورپ کی آخری مذہبی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ نئی اطالوی شاہی برابرائینی اصول پر قائم رہی اور جمہوری فریق تک نے گابالڈی کی تقلید میں تسلیم کر لیا کہ حالات موجودہ کے اعتبار سے حکومت کی یہی سب سے بہتر صورت ہے۔

لجیم کی سلطنت نے روانی طرز کو چھوڑ کر جرمانی طرز اختیار کر لیا۔ ۱۵۳۱ء کا لجمی نظام حکومت ۱۵۳۳ء کے فرانسیسی منشور سے اخذ کیا گیا ہے مگر اس میں عیسویت پسند رعایا کے ساتھ مراعات زیادہ کی گئی ہے۔ چنانچہ دفعہ (۲۵) میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ

اکل اختیارات کا منع و ماخذ رعایا ہے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بحیم میں کوئی ملکی حکمران خاندان نہیں تھا۔ اور اُسے یہ جمہوری دوسرے ملک سے بادشاہ کا انتخاب کرنا پڑا تھا (نقصہ ۶) کی رو سے تمام طبقاتی اختیارات خارج کئے گئے ہیں اور حق انتخاب وسیع طور پر قائم کیا گیا ہے اور انتخاب کنندے وہی ہوتے ہیں جو دار البعوشین کے ہیں صرف فرق یہ ہے کہ ارکان دلاہرا کے لئے عمر اور جائیداد کی حد بڑھی ہوئی ہے (ابتدائی تجویز یہ تھی کہ ارکان دارالامرا کی نامزدگی کا اختیار بادشاہ کو دیدیا جائے)۔ لیو ہاؤ (کو برگ) کی عاقبانہ اور بدبرانہ حکومت میں بحیم پر ۱۸۳۸ء کے ہارک زمانے کا اثر بہت ہی کم پڑا اور پوپ کے اختیارات طبق کے ماننے والوں اور آزاد (لبرل) فریق کے پرجوش مقابلوں کے باوجود ملک کی خوشحالی برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ اسکاٹلنڈ اور یامین نظام سلطنت کے رواج کی ایک عجیب تاریخ ہے۔ سوئڈن میں سوٹھویں صدی سے ڈاٹ کے چار طبقے تھے اور ہر ایک کا انتخاب جدا جدا ہوتا تھا یہ چار طبقے امرا اور نائٹ، پادری، اہل شہر اور کاشتکار تھے۔ بادشاہ کو اکثر امرا کی بڑھی ہوئی طاقت کے مقابلے میں نیچے کے دو طبقوں سے تائید حاصل کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ امرا کا اثر بالعموم پارلیمنٹ سے باہر مجلس شاہی میں نمایاں ہوتا تھا جس میں وزیر اعلیٰ شامل ہوتے تھے اور یہ سب کے سب امرا کے گروہ میں سے ہوتے تھے۔ سب سے پہلے کتاوس سوم نے امرا کے اُس غلبے کو جس سے بادشاہ کی ہستی اور ملک کی حفاظت دونوں خطرے میں آگئی تھی، اس طرح توڑا کہ ۱۸۰۹ء میں سلطنت اور دربار کے اعلیٰ ترین عہدوں کے سوا تمام سیاسی عہدوں کے دروازے غیر امر اکیلے بھی کھول دیئے۔

سوئڈن کا، جون ۱۸۰۹ء کا نظام سلطنت جس سے قبل کے ۱۷۷۲ء والے

نظام سلطنت کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس نظام سلطنت میں مجلس سلطنت اور چاروں وزیروں کے خزانے جس اعتبار اور صحت کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں انکی نظیر نہ ملے موجودہ کے دوسرے نظام ہائے سلطنت میں نہیں ملتی۔ امریکا یہ مخصوص ادبی بھی روکا گیا تھا کہ وہی تمام عہدوں کے اہل ہیں۔ حال کے زمانے تک مذکورہ بالا چاروں طبقے قائم رہے اور فنی منظوری کے بغیر بادشاہ نہ تو نظام سلطنت میں کوئی تغیر کر سکتا تھا نہ کوئی قانون نافذ کر سکتا تھا اور نہ نئے محصل لگا سکتا تھا بالعموم تین طبقات ایک رائے متفق ہو جاتے تھے اور چوتھے کو مجبور ہونا پڑتا تھا کہ انسانی قوانین کے معاملے میں بادشاہ اور چاروں طبقوں کا مشفق ہونا لازمی تھا۔

۳۔ جو ان کے گروہ
دوسرے کو ملکی مالک
۱۰۔ سوئڈن

بہت سے اعتبارات سے یہ نظام سلطنت جرمانیا کے ازمنہ وسطیٰ کے نظم و ترتیب کے مثل تھا۔ یہ نظام سلطنت اگرچہ بہت سے فوائد پر حاوی تھا مگر سویڈن سے باہر اس پر بہت کم توجہ لگائی اور کسی نے اسکی نقل نہیں کی۔ جسکا خاص باعث یہ تھا کہ طبقات کی تقسیم کی وجہ سے قومی مرضی کی قطعی حقیقت کا پتہ چلانا مشکل ہو گیا تھا۔ ۱۸۶۶ء میں دو ایوانوں کے معمولی طریقے نے ان چار طبقوں کے طریقے کو مٹا دیا۔

ناروے کا سہر ذہب ۱۸۱۴ء کا نظام سلطنت اس سے بدرجہا زیادہ عمومیت کو لیے ہوئے ہے۔ سویڈن کا بادشاہ (چارلس سینرڈم) صلح کے ذریعے سے ناروے کا بھی بادشاہ ہو گیا، اُسے حالات نے مجبور کر دیا کہ وہ اُس نظام سلطنت کو قبول کر لے جسے ۱۸۱۴ء کے موسم بہار میں خود اہل ناروے نے اپنی شخصی حریت اور ملکی آزادی کے تحفظ کے خیال کے تیار کیا تھا۔ وضع قانون رعایا کا کام قرار دیا گیا تھا اور اسکی انجام دہی اسٹورٹھنگ (پارلیمنٹ) سے متعلق ہوئی۔ بادشاہ کو منظوری کا اختیار تھا لیکن جس قانون کو مجلس تین مرتبہ منظور کر دے، اُسے بادشاہ مسترد نہیں کر سکتا تھا۔ اسٹورٹھنگ کا انتخاب رعایا اور زیادہ تر زیندار کرتے تھے اور پھر وہ خود اپنے کو دو ایوانوں میں تقسیم کر دیتی تھی۔ علانہ اختیارات بادشاہ سے متعلق تھے اور اسکے وزیر دارموتے تھے۔ بعد میں شاہی طاقت کے بڑھانے اور امر اکا ایک سیاسی طبقہ یا کونیکے کے کوششیں ہوئیں۔ مگر سب ناکام رہیں۔ ناروے نے جس غلو کے ساتھ خود کو سویڈن سے آزاد رکھا ہے وہی اسکا باعث تھا کہ ان دونوں تغیرات کی کاشتکاروں اور شہریوں نے زیادہ زور کے ساتھ مخالفت کی۔

ڈینمارک میں ۱۸۱۴ء کے انقلاب کی زوامرا پر تھی اور عام باشندوں کی مدد سے بادشاہت نے مطلق العنانی حاصل کر لی اور موجودہ صدی تک یہی حکومت کا جہز نہیں ہو سکا۔ اولاً اُسکا ظہور ۲۸ مئی ۱۸۴۸ء کے قانون کی رو سے نامکمل طور پر صوبوں کی مجلسوں میں ہوا۔ اُسکے بعد ۵ جون ۱۸۴۸ء کے قانون اساسی نے سلطنت کو زیادہ عمومی بنا دیا۔ ڈینوں اور جرمانوں کی مخالفت نظام سلطنت کے اختلاف کے باعث نہیں بلکہ قومیت کے اختلاف کے باعث ہوئی۔ ۱۸۶۶ء میں اس نظام حکومت پر بھی نظر ثانی کی نوبت آئی اور جو ترمیم ہوئی وہ بادشاہ اور کس واک دونوں کی رضامندی سے عمل میں آئی۔

(۲) ناروے

(۳) ڈینمارک

رگس واک یعنی پارلیمنٹ میں دو ایوان تھے ایک ایوانِ اعلیٰ دوسرا ایوانِ عام۔
(نظامِ سلطنت مورخہ ۲۸ جولائی ۱۷۹۶ء)۔

ہندو لیٹنس کی زمانہ حال کی سلطنت میں (جو صوبہ جات متحدہ کی قدیم جمہوریت اور بعد کی ٹیوٹوئی بادشاہت ہالینڈ کے بجائے قائم ہوئی تھی) آئینی شاہی فوراً جاری ہو گئی۔ اسکا اجراء ۲۸ مارچ ۱۸۱۶ء کو ہوا اور انجیم کے متحد ہو جانے کے بعد ۱۸۱۵ء کے ایک نئے قانون کی رو سے اسکی تجدید ہوئی (۱۴ اکتوبر ۱۸۳۸ء کا نیا نظامِ سلطنت اسی کی ترقی مزید تھی اور حال میں آئینی خیال ہالینڈ میں بہت بڑھ گیا ہے۔

اپنی برائے نام مستی کی آخری صدی میں جرمانی قوم کی قدیم رومی شہنشاہی ایک خالی اعزاز رہ گئی تھی۔ تمام حقیقی اختیار حکمرانوں کے ہاتھ میں تھا۔ انھیں حکمرانوں میں شہنشاہ بھی تھا اسکی با اثر حیثیت صرف اسی بنا پر تھی کہ وہ آسٹریا کا آچ ڈوک اور ہنگری اور بوہیمیا کا بادشاہ تھا۔

لیکن خود اپنی اپنی ملکوں کے اندر بیشتر حکمرانوں نے پارلیمنٹوں کی عائد کردہ قبو بند کو توڑ کر مطلق العنان حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ انھیں اولاً شاہی عہدہ داروں کی حیثیت سے اختیارات حاصل ہوئے تھے، مگر پھر وہی اختیارات موروثی بن گئے۔ اور ازمنہ وسطیٰ کے عام رنگ کے موافق ان اختیارات نے کچھ مذہبی اور کچھ پدر سری کیفیت پیدا کر لی تھی۔ اقتدار شاہی کے رومانی خیال کے موافق ان اختیارات کو وسعت دیکر دی گئی تھی اور اس کے سوا کوئی اور بندش نہیں تھی کہ شہنشاہی کی اطاعت کی ایک ہلکی سی ذمہ داری عائد ہوتی تھی اور شہنشاہ کے دربار اور اسکے دیوان خاص میں حاضر ہونا پڑتا تھا۔

سب سے اول جس سلطنت نے یہ آزادانہ مطلق العنانی قائم کی وہ پروشیا تھی (۱۲ اپریل ۱۷۹۶ء)۔ ایک طرف آسٹریا ترقی کر کے یورپ میں ایک بڑی سلطنت اور فرانس کی مقابل بن گئی تھی اور کم و بیش شہنشاہی کے دائرہ اثر سے باہر ہو گئی تھی۔ دوسری طرف شمال میں ایک نئی سلطنت پیدا ہو گئی تھی جس نے ازمنہ وسطیٰ کی شہنشاہی سے جنگ و جدل کر کے بہت جلد ترقی کر لی تھی اور اس جنگ پر جرمانیا کا قومی رنگ چڑھایا تھا۔ ہابس برگ اور لورین کے آسٹریائی اور کتھولک خاندان کی تائید کا انحصار انکی شہنشاہی عظمت، روایتی حقوق، امراء، طبقہ مذہبی اور ایک مختلف النسل فوج کے اوپر تھا۔ برعکس اس کے

ہو مقرران کا پروٹسٹ خاندان جرمانیا کی قومی آزادی اور قومی روح کا ناسا پسند اور حامی بن گیا تھا۔

فریڈرک اعظم (۱۷۷۰ء - ۱۷۹۷ء) براعظم کی آئینی بادشاہت کے بانی ہونگی عزت و منزلت کا سزاوار ہے۔ اگر رعایا نے اس کے متعلقہ کو زیادہ بہتر طور سے سمجھا ہوتا اور حکمرانوں نے اس کی تقلید میں زیادہ کوشش کی ہوتی تو سلطنت کے مطلق العنان حالت سے نکل کر آئینی صورت اختیار کرنے میں زیادہ آسانی ہو گئی ہوتی۔ کسی شخص نے اس سے زیادہ زور کے ساتھ اس اصول کی مخالفت نہیں کی ہے کہ بادشاہ سلطنت کا آقا و مالک ہے۔ اس سے زیادہ کسی نے اس امر کو قطعی طور پر ثابت نہیں کیا ہے کہ شاہی ایک عہدہ ہے اور بادشاہ سلطنت کا خاص الخاص خادم ہے اسنے ازمنہ وسطی کے رابانی حقوق اور مالکانہ حکمرانی کے تمام اصول کو بلا تذبذب باطل کر دیا مگر اس نے نہ طبقات (پارلیمنٹ) کے قدیم نظام سلطنت کو از سر نو رائج کیا اور نہ جدید نیابتی انتظام قائم کیا۔ اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ اسکے خیالات اپنے زمانے سے بہت آگے بڑھے ہوئے تھے اور رعایا میں بھی یہ قابلیت نہیں پیدا ہوئی تھی کہ وہ حکومت میں حصہ لے سکے۔ لیکن یہ طریق ذیل اس نے آئینی بادشاہت کے لئے راستہ صاف کر دیا: (۱) اس نے یہ اصول قائم کیا کہ شاہی حقوق، حقیقت سلطنت کے فرائض ہیں (۲) قوانین اسی قسم کے نافذ کئے اور (۳) تمام عہدہ داروں کو مجبور کیا کہ اپنے سیاسی فرائض کو ذوق شوق اور دیانت کے ساتھ انجام دیں۔

فریسیسی انقلاب نے جرمانیا کو فریڈرک کی تیار کردہ شاہراہ سے ہٹا دیا کیونکہ اس انقلاب سے حکمران خوفزدہ اور رعایا انتہا پسند ہو گئی۔

نپولین کے اثر سے رائن کی متفقہ سلطنتوں میں جو نظماہائے سلطنت قائم ہوئے وہ ایک حد تک آئینی بادشاہت کی طرف قدم بڑھانے کا باعث ہوئے۔ ان نظماہائے سلطنت نے قدیم طبقات کی نیابت کی آخری یادگار کو بھی مٹا دیا۔ اساسی قوانین کو جمع کر کے یکجا مرتب کیا اور اصحاب جائداد اہل حرفہ و صاحبان علم کو ایک حد تک نیابت کا حق عطا کیا، گو کہ یہ نیابت نہایت حقیر اور بے اثر تھی۔

”جنگ آزادی“ کی جانبازانہ کوشش نے جرمانیا کو غیر ملکی تسلط سے آزاد کر دیا اور زمانہ جدید کے نظم و ترتیب کے قیام کے لئے آزادانہ قومی انداز پر ایک عمدہ موقع مہیا کر دیا۔

(۳) رائن کی
متفقیت

(۴) ۱۸۱۵ء
متفقیت

ملک میں اُس وقت جو معدودے چند اعلیٰ درجے کے مدبر تھے مثلاً آئٹنٹن - ہمبولٹ اور ٹن سے قبل پارلیمنٹ، سب اس تغیر کے خواہاں تھے اور فریڈرک ولہلم ثالث علانیہ طور پر اپنا خیال اسکی تائید میں ظاہر کر چکا تھا مگر جسے مائینا کے حکمران خاندانوں، امیروں اور عہدہ داروں کے خیالات مطلق العنانی کی جانب شدت سے مائل تھے۔ انقلاب نے تمام جدید خیالات کی طرف سے سخت بد اطمینانی پیدا کر دی تھی اور رعایا کی سیاسی قابلیت ابھی بہت پست درجے پر تھی۔ جرمانیا کی سلطنت متفقہ اور اسکی منفرد سلطنتوں نے مطلق العنان طرز حکومت کو برقرار رکھا۔ صرف صوبوں کی مجلس شوریٰ کے باعث ایک خفیف سی پابندی عائد کر دی تھی جس قانون کے موافق متفقیت قائم ہوئی تھی اسکی تیسرے دفعہ میں یہ فہر کیا گیا تھا کہ اس متفقیت کی تمام سلطنتوں میں مقامی مجلس شوریٰ قائم کیا جائیگی۔ لیکن آئین شوریٰ مدبروں نے صاف طور پر یہ شرط لگا دی تھی کہ اُس سے کسی طرح پریناتی یا آئینی بادشاہت مراد نہیں لی جائے گی۔

۱۸۱۵ء کے بعد
نظام سلطنت

چند سلطنتوں نے مستقل طور پر انیسویں بادشاہت کی نقل میں اپنے وہاں آئینی بادشاہت قائم کی مگر صوبہ جات کی قدیم مجلس شوریٰ کے اثرات باقیات نے اُن میں بھی فرق پیدا کر دیا۔ امارت نساؤ نے اس میں سب سے سبقت کی (۲ ستمبر ۱۸۱۵ء) مگر یہ نظام سلطنت بہت ہی تھوڑے دنوں قائم رہا۔ اُسکے بعد لکسمبرگ کا درجہ ہے (۲۴ اگست ۱۸۱۵ء) اور سلکسن، وائمار، آئرلینڈ کی امارت عظمیٰ (۱۵ مئی ۱۸۱۶ء) کو خاص امتیاز یہ حاصل ہے کہ وہاں کا حکمران کارل اوگسٹ بذات خاص آزادانہ انتظامات کی جانب راغب تھا۔

جنوبی جرمانی سلطنتوں کی کارروائی، بحسن میں بوریہ کی شاہی (۲۶ مئی ۱۸۱۶ء) بادن (بیڈن) کی امارت عظمیٰ (۲۲ اگست ۱۸۱۶ء) اور ویورٹیم برگ (۲۵ ستمبر ۱۸۱۶ء) داخل ہیں، زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ویورٹیم برگ کی پیش میں حکومت ہی اور ناپرانے طبقات کی مخالفتوں کو فٹا کرنے میں کامیاب ہو سکتی تھی۔ ان سلطنتوں نے مفاد عامہ کے خیال سے آئینی حکومت رائج کی تاکہ اُن بڑی سلطنتوں کے مقابلے میں انھیں قوت حاصل ہو جائے جن میں مطلق العنان حکومتیں قائم تھیں۔

ہنووہر کی شاہی (۲۱ ستمبر ۱۸۱۶ء) کی امارت عظمیٰ (۲۱ ستمبر ۱۸۱۶ء) اور سلکسن مانٹکن (۲۳ اگست ۱۸۱۶ء) نے بھی مذکورہ بالا سلطنتوں کی تقلید کی۔

ان تمام نظامہائے سلطنت میں بادشاہ کو بہت وسیع اختیارات اور حقوق دیئے گئے تھے۔ حقیقت فرانس کی نسبت قدامت پسند جبرانیوں میں بادشاہی کی حالت زیادہ محفوظ تھی اور شاہی جب تک آزادانہ خیالات کو سمجھتی اور اسکی پیشروی کرتی رہی معاملات عامہ کے نظم و نسق میں اس پر اس قدر اعتماد کیا جاتا رہا کہ کسی دوسری جگہ یہ بات نہیں ہوئی۔

یوانہائے شوری کی ترتیب میں انگریزی اور فرانسیسی نوئے پیش نظر رکھے گئے تھے لیکن دارالامرا بیشتر اصحاب جاہ و ثروت پر مشتمل تھا جن کے دعوے اور خیالات زمانہ ماضیہ پر مبنی تھے۔ ان میں کچھ درباری عہدہ دار بھی شامل کر لئے گئے تھے، اس وجہ سے اس یوان کو کبھی کافی وقعت اور اقتدار نہیں حاصل ہوا۔ دارالعوام میں اہل دولت کا اثر فرانس کی نسبت کم تھا اگرچہ وہ طبقات کے قدیم طرز پر قائم ہوا تھا اس وجہ سے اس تنظیم کو اکثر نیابتی کے بجائے "طبقاتی" کہتے تھے۔ لیکن واقع میں یہ بجا نہیں تھا۔ ازمنہ وسطی کے طبقاتی انتظام اور زمانہ حال کی نیابتی حکومت میں یہ فرق نہیں ہے کہ سو خال ذکر رعایا میں اختلاف طبقات کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ فرق یہ ہے کہ وہ نیابتی حکومت ہے اور وہ قوم کے مشمولہ مزاج کے مفاد خاص پر اس قدر زور نہیں دیتی جس قدر قوم اور سلطنت کی وحدت (اتحاد) پر زور دیتی ہے۔ مثلاً بویریا کے جدید نظام سلطنت کو دیکھئے تو جدید اصول کی حقیقت عیاں ہو جاتی ہے۔ اس نظام سلطنت میں تمام سبھوٹین سے یہ قسم لی جاتی ہے کہ وہ ملک کی عام سبھوٹ پر نظر رکھیں گے اور جداگانہ طبقات و مذاہب کا کچھ خیال نہ کریں گے۔

جرمانیا کی دو بڑی سلطنتوں کی بے اعتمادی اور عناد کے باعث آئینی شاہی کا نشو و نما میسول برس رکا رہا۔ پروشیا میں اصلاح کی تمام کوششیں ناکام رہیں اور قوم کی موجودہ نیابت کے بجائے صرف صوبجات کی مجالس شوری منظور کی گئیں۔ آسٹریائی حکومت کو یقین تھا کہ اسکے مختلف صوبجات میں اتحاد قائم رہنے کا صرف یہی ذریعہ تھا کہ مطلق العنان حکومت قائم رہے۔ جرمانی متفقی نے اپنی تمام کوششیں اس امر پر صرف کر دیں کہ شاہی اصول بحال خود برقرار رہے اور رعایا پر احتسابی نگرانی قائم کر دی جائے۔

مسئلہ کے فرانسیسی انقلاب نے جرمانیا میں نئی تحریکات پیدا کر دیں اور

بہت سی سلطنتوں کو آئینی طریق قائم کرنے پر رغب کر دیا۔ ولایت جسے میں ۱۸۳۱ء کو آئینی حکومت قائم ہو گئی، جس کا منشا یہ تھا کہ حکمران کی خود مختاری کے مقابلے میں عوام کی آزادی محفوظ رکھی جائے۔ سکسویا کی شاہی کا نظام سلطنت بویریا کے طرز پر ڈھالا گیا (۲۸ ستمبر ۱۸۳۱ء)۔ ہنووہ کی شاہی میں ایک جدید اساسی قانون جاری ہوا (۶ ستمبر ۱۸۳۳ء)۔ مگر دوسرے بادشاہ ارسٹ آؤگسٹ نے اسے خارج کر دیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۴۸ء میں وہ قانون پھر کسی قدر ترمیم شدہ صورت میں بحال کیا گیا۔

پس اس طرح مذکورہ بالا دو بڑی سلطنتوں کی مخالفت کے باوجود آئینی حکومت جرمینیا میں برابر ترقی کرتی گئی۔ یہ ضرور ہے کہ اس میں اکثر ظاہری زیادہ اور اصلیت کم تھی۔ مہذبہ داروں کی انشا پر دازیوں سے اور مختلف فریقوں کے تضادم باہمی سے مجالس قومی کے اندر اور باہر دونوں جگہ اسے نقصان پہنچتا رہا۔

۱۸۴۸ء پر ویشیا

آخر الامر ۳۰ فروری ۱۸۴۸ء کو فریڈرک ولہلم چہارم نے ایک فرمان شاہی جاری کیا اور صوبہ بجات کی قدیم مجالس کی بنیاد پر تمام ملک پر ویشیا کیلئے ایک مشترک لندتاغ (پارلیمنٹ) قائم کیا۔ اس مجلس کو قانون سازی کے متعلق صلاح دینے، نئے محاصل کی منظوری دینے اور اندرونی معاملات کے متعلق درخواست دینے کا حق دیا گیا۔ اس طرح پر ویشیا مطلق العنان حکومت کی حد سے نکل کر محدود شاہی کے زمرے میں آگئی اور جرمینیا کی نیا بقی سلطنتوں سے قریب ہو چکی۔ طریق جدید کے اجر کو حرکت دی گئی تھی اور وہاں کا نظام سلطنت فی نفسہ اس قدر قوی تھا کہ وہ محض آئینی حکومت کی سرسری نقل کر نیکے بجائے موجودہ تعلقات و حالات کو برقرار رکھ سکے، اگرچہ پارلیمنٹ کے اختیارات بہت ہی ناکافی تھے مگر ترقی کی ایک صورت نکل آئی تھی اور اس امر کا امکان پیدا ہو گیا تھا کہ رعایا کی سیاسی تربیت کے ساتھ ساتھ نظام سلطنت کے نقائص دور ہوتے جائیں گے۔ بد قسمتی یہ ہوئی کہ حکومت پارلیمنٹ کی جائز خواہشوں تک سے اس قدر مخالف تھی کہ اس نے اعتدال پسند فریق کا اعتماد بھی کھو دیا۔ جب ۱۸۴۹ء کے سیاسی زلزلے نے یورپ کی ساری سرزمین کو ہلا دیا تو یہ نئی عمارت بھی منہدم ہو گئی۔ ۵ دسمبر ۱۸۴۹ء کو ایک نیا نظام سلطنت مرتب کیا گیا جسے زیادہ تر جمہوری اور انقلابی فریق نے مرتب کیا تھا۔ چھ مہینے بعد (۳۰ مئی ۱۸۴۹ء) کو بادشاہ نے ایک انتخابی قانون شائع کیا اور اس کے بموجب

۳۱ جنوری ۱۹۵۷ء کا نظر ثانی کیا ہوا نظام سلطنت تیار کیا گیا، اسکے بعد بعض اہم تغیرات ہوتے رہے ہیں۔ خاصکر مرکزی اقتدار کی تقویت کے لئے قدم آگے بڑھتا رہا ہے۔ اگرچہ اس نظام سلطنت میں بہت سے شدید نقائص تھے مگر اس سے پرورشیا میں سیاسی زندگی کی ایک قانونی بنیاد قائم ہو گئی۔

آئندہ چند برس کے تجربات نے ثابت کر دیا کہ آئینی حکومت کی ظاہری شکل تو قبول کر لی گئی، مگر اس کے منشا کی کما حقہ تعمیل نہیں ہوئی۔ ایوانِ علی جو مطلق العنانی اور ازمنہ و طلیٰ کی سپہمکری کا نمائندہ متنازعہ بددلی کا اظہار کر رہا تھا۔ بادشاہ اپنے اختیارات میں روک ٹوک کے عادی نہیں تھے اور اس نئی حالت کا قبول کرنا انھیں شاق معلوم ہوا۔ عوام کے نمائندوں کو آہستہ آہستہ یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے اختیارات کس قدر محدود ہیں اور پر وسی حکومت اور انگلستان کے پارلیمنٹی طریق میں کس قدر فرق ہے مگر اصلاح و جہت کی اس شدید مصعب کشاکش میں آئینی حکومت کی بنیاد برابر مضبوط ہوتی گئی اور رفتہ رفتہ مخالفت کے بجائے سلطنت کے لئے اولئے فرض کا خیال پیدا ہو گیا۔

۱۹۶۶ء میں آسٹریا کے شعلہ جنگ میں مخالفت کے تمام اجزا اکٹھا ہو گئے اور سب متحد ہو گئے۔ آسٹریا بھی بے خبری کے عالم میں ۱۹۶۸ء کے انقلاب میں پھنس گئی وہ مختلف قومیں جو ایک خاندانِ ہابس برگ کے تحت میں مربوط تھیں اب علیحدہ ہونے کی کوشش کرنے لگیں۔ اور کچھ دن تک وائینا تا تجربہ کار اور پر جوش نوجوانوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ فوج کے سوا اور کہیں بھی اتفاق باقی نہیں رہا۔ فوج ہی پر بادشاہ کا آخری بھروسہ تھا۔ فوج کی فتوحات نے آسٹری مدبرین کو اس قابل بنادیا کہ وہ پورے ملک میں اپنے اہل میں لے لیں۔ اندرونی اور بیرونی خطرات سے مرعوب ہو کر انھوں نے یہ کوشش کی کہ سلطنت کو از سر نو زیادہ متحدہ بنایا دیا جائے۔ ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء کو جو نظام سلطنت عطا کیا گیا وہ آسٹری شہنشاہی کو آئینی بادشاہت کے اصول پر ترتیب دینے کی ایسے کوشش تھی مگر اس کا عملی تجربہ کر کے نہیں دیکھا گیا۔ ایک مجلس میں ان تمام قوموں کو جمع کرنا غیر ممکن معلوم ہوا جو ایک دوسرے سے مختلف تھیں اور تہذیب کے اعتبار سے بھی مختلف مابج پر تھیں۔ ہنگری کی بغاوت کی وجہ سے یہ اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا کہ ایک مطلق الاختیار اور متحدہ حکومت قائم رکھی جائے کیونکہ حکمران خاندان ہمیشہ

(د) آسٹریا

آسٹریا کے مختلف صوبوں کے درمیان ذریعہ اتحاد و رابطہ تھا اس لئے ہر طور پر یہی مناسب معلوم ہوا کہ سلطنت کے تمام اختیارات شہنشاہ کے ہاتھ میں جمع ہوں۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے شاہی فرمان نے یہ اعلان کر دیا کہ وزرا صرف بادشاہ کو جوابدہ ہیں۔ انہی تاریخ کی مجلس وزرا کے فیصلے کے بموجب مکی مجلس شوریٰ شاہی مجلس شوریٰ میں بدل دی گئی اور ۱۳ دسمبر ۱۸۶۱ء کے ایک حکم شہنشاہی کے ذریعے سے ۱۸۶۱ء کا نظام سلطنت اٹھا دیا گیا۔ اسی تاریخ کو مجلس وزرا نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ صرغخاص کے علاقوں میں رائے دہی کی مجلسیں قائم کی جائیں گی جن میں امراتھوٹے زمیندار، تجارتی طبقات سب شامل کئے جائیں گے مگر اصلیت یہ تھی کہ مطلق العنان بادشاہی قائم کر دی گئی تھی اسکی مرضی کو عمل میں لانیکے لئے عہدہ داروں کی ایک جماعت کل کی طرح کام کر رہی تھی۔ کیتھولک پارٹیوں سے اسے اخلاقی تائید حاصل تھی اور ایک زبردست فوج اسکی مادی حمایت کے لئے موجود تھی۔

۱۸۵۸ء کے بعد پروسیا، بایرن، ویٹمبرگ دلیات ہے وغیرہ میں مطلق العنانی کو پیہم شکستیں نصیب ہوئیں اور ۱۸۵۹ء کی اطالوی جنگ میں آسٹریا کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس کے قینوں ستوں (عمال، فوج، وپادری) اس قدر کمزور ہیں۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ شہنشاہی حکومت کو مالی اور سیاسی مشکلات سے کوئی مقرر اسکی سوانظر نہ آیا کہ نیا ہی نظام سلطنت پھر عطا کیا جائے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے شاہی فرمان میں اس ارادے کے پورے کرینکا غرض ظاہر کیا گیا اور ۲۶ فروری ۱۸۶۱ء کے قانون اساسی کی رو سے اس کے پورے کرینکی کو شمش کی گئی۔

اس فرمان میں یہ قرار دیا گیا تھا کہ مختلف سلطنتوں اور صوبوں میں تاریخی حقوق کا جو احساس پیدا ہو گیا ہے اسکی بموجب شاہی اختیارات قائم کئے جائیں گے۔ ہر قوم کے لئے ایک لندناغ (مجلس مکی) ہوگی جسے ایک حد تک بجائے خود آزادی حاصل ہوگی اور اسکی ساتھ ہی عام رائٹس تناغ کی وضع قوانین اور شہنشاہی حکومت کی نگرانی میں یہ سب قومیں برابر کی شریک ہوں گی۔ رائٹس تناغ بھی دو قرار پائیں ایک سلطنت کے لئے اور دوسری مغربی صوبہ جات کیلئے، لیکن اس نظام سلطنت کو استقلال نہیں ہوا کیونکہ اہل ہنگری نے رائٹس تناغ میں اپنے سبھوں کے بھیجنے سے انکار کر دیا۔

۲۰ ستمبر ۱۸۶۵ء کے شہنشاہی اعلان نے راتشس تناغ کو معطل کر دیا اور حکومت کو
پھر اسکی نگرانی سے آزاد کر دیا لیکن ۱۸۶۶ء کی تباہ کن شکست نے ایک نیا تغیر پیدا کر دیا۔
سید واکلی شکست اور پروشیا سے براک کا عہد نامہ ہو جانیکے بعد ہنگری کے ساتھ
صدق دل سے گفت و شنود شروع ہوئی۔ ہنگری اس امر پر مصر تھی کہ وہ اپنے قدیمی حقوق
ترک کرنا چاہتی اور نہ وہ انھیں ایک ایسے نظام سلطنت سے بدلنا چاہتی ہے، جو محض
شہنشاہ کا علیحدہ ہو۔ آخر اہل ہنگری اس شرط سے مصالحت پر راضی ہوئے کہ یہ تسلیم
کیا جائے کہ ہنگری کا نظام سلطنت از روئے قانون بحال ہے اور ۱۸۴۳ء کے قوانین اور
ملک کی آزادی قائم رہے گی، اور اس میں جس قدر مداخلت کی گئی ہے سب کا اعتراف یہ کیا جائے۔
حقیقت میں یہ یہوگانہ حکومت کا بحال کرنا تھا۔ اس زمانے سے ایک راتشس تناغ اور
وزارت ہنگری کے لئے ہے اور دوسری راتشس تناغ اور وزارت دریائے لائٹا کی
دوسری جانب کے صوبجات کیلئے ہے۔ ۱۸۶۶ء کے بعد مسلسل قوانین ایسے جاری
ہوئے جن سے وزیر کی ذمہ داری، نیابت کا طریقہ، عدالتی اور ملکی انتظامات، مرتب و معین
ہوئے۔ معین شدہ نظام سلطنت جہاں تک قابل عمل درآمد تھا از روئے جاری کیا گیا۔ دونوں
ڈائٹ (پارلیمنٹ) نے ایک متفقہ مجلس قائم کی جسکا منشا یہ تھا کہ وہ تمام شہنشاہی کیلئے
ایک عام طرز عمل ترتیب دینے کے لئے تین مشترک وزرا، یعنی وزیر خزانہ، وزیر جنگ،
اور وزیر خارجہ کے ساتھ ملکر کام کرے۔ یہ امر مشکوک ہے کہ آیا یہ مسالمت مستقلاً قائم
رہے گی یا نہیں مگر یہ یقینی ہے کہ آسٹریا، ہنگری اور بوہیمیا تینوں میں سے کوئی بھی اسکی
روادار نہ ہوگی کہ مطلق العنانی پھر قائم ہو جائے اور اگرچہ اس کی ظاہری صورت کے متعلق
ان میں باہم اختلاف ہو گا اس خواہش میں سب متفق ہیں کہ آئینی بادشاہی برقرار رہے
جس پر قومی نمایندوں کا اثر اور انکی نگرانی غالب ہو۔

منفرد سلطنتوں سے گزر کر جرمانی متفقیت کو مجموعۂ آئینی حکومت کی شکل میں لائینکی
کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۸ مارچ ۱۸۷۱ء کو ایک نظام سلطنت تیار کیا گیا جو آسٹریا کے
سوا تمام جرمانی ریاستوں پر ممتدی تھا۔ شاہان پروشیا سورونی شہنشاہ قرار پائے۔
ایک متفقہ سینات میں ہر سلطنت کی نیابت کا انتظام کیا گیا تھا، اور جرمانی رعایا کے معنوں کی
ایک قومی مجلس قرار پائی مگر اس تجویز نے عملی شکل نہیں اختیار کی۔ جرمانیا کے مسائل کو

(۱۸) ۱۸۷۱ء کا
مجوزہ جرمانی
نظام سلطنت

اس طرح حل ہوتے دیکھنے کے بجائے اسٹریٹجک کے لئے تیار ہو گئی۔ شاہ پروشیا اس پر رضا مند نہیں ہوا کہ وہ قومی مجلس کے ہاتھ سے شہنشاہی تاج قبول کرے۔ بویریانے اُس میں شامل ہونے سے انکار کر دیا اور خود قوم بھی کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکی۔ خاندان اور تفرہ پسندی کے اثرات قومی اتحاد کے اثرات سے زیادہ قوی تھے اسکے بعد بھی جو کشمیں خصوصاً پروشیا کی طرف سے، جرمانیا کو ایک آئینی شاہی کے تحت میں متحد کر نیکی ہوئیں وہ سب کی سب انھیں اثرات کے مقابلے میں ناکام رہیں برائے نام کہ آسٹریا اور جرمان خاندانوں کی طرف سے جو قفقز ڈالی جا رہی تھیں اُن کا خاتمہ ۱۸۶۶ء کی جرمانی جنگ نے کیا۔

۱۶ اپریل ۱۸۶۶ء کو شمالی جرمانیا کی جو متفقیت قائم ہوئی، اُسے آئینی بادشاہت کہنے میں بہت سے شرائط و قیود لازم آتے ہیں۔ شاہ پروشیا اس متفقیت کا سرورٹی صدر روسیہ سالار قرار دیا گیا تھا اور عام کارروائی کی نگرانی اُسے تفویض ہوئی تھی۔ اسکی معاونت کے لئے تمام سلطنتوں کا ایک متفق چانسلر (صاحب الیوان) تھا، شاہ پروشیا چانسلر کو نامزد کرتا تھا مگر وہ پارلیمنٹ کا ذمہ دار ہوتا تھا اور نظام ملک کے انصرام کے لئے وہی سر دیوان سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے عالمانہ اختیار آئینی بادشاہت کے اختیار عالمانہ کے مشابہ تھا۔ اسکے ساتھ ہی صدر کی کارروائیوں کی روک تھام نہ صرف رائٹس تلخ سے ہوتی تھی، جس میں جرمانی قوم کے نمائندے شامل تھے بلکہ مجلس متفقہ بھی اسکی نگران تھی۔ جس میں تمام متفقہ سلطنتوں کی شرکت اور رائے شامل تھی۔ یہی دونوں جماعتیں قانون وضع کرنے میں متفقہ انتظامات کی نگرانی کرتی تھیں۔

۱۶ اپریل ۱۸۶۶ء کے جرمانی شہنشاہی کے نظام سلطنت نے بادشاہ کو شہنشاہی کا خطاب دیکر اُس کی قوت کو بڑھا دیا لیکن آج بھی بعض فوجی اور مالی معاملات میں شہنشاہ کو منظور کی کاہت ہی محدود حق حاصل ہے۔ وضع قانون میں اُسے کوئی آزادانہ دہرہ رست اختیار حاصل نہیں ہے اور مجلس متفقہ صرف وضع قانون کی مجلس نہیں ہے بلکہ شہنشاہی کی حکومت میں شریک ہے۔ پس ایک حد تک مختلف شہریاروں اور مقامی حکمرانوں کی ایک مجموعی حکومت قائم ہے جو شاہی کے بجائے ایمانی حکومت سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ شہنشاہی میں جن اصولوں کی آمیزش کو پینڈورف نے دو صدی قبل

شمالی جرمانیا کی متفقیت ۱۸۶۶ء

نہایت ہولناک بتایا ہے وہ ابھی پوری طرح صاف نہیں ہوئے ہیں لیکن اپنے خصوصیات اور اجتماعی ضدات کے باوجود جرمانی نظام سلطنت نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ وہ ایک زوردار اور جاندار شے ہے، اور اگر آئینی بادشاہت کا جزو و اعظم تسلیم کیا جائے کہ شاہی قوت اور وحدت عمل کے ساتھ رعایا کے حقوق اور آزادی کا اجتماع ہو جائے تو جرمانیا کی شہنشاہی بالیقین اس صنف میں داخل ہے۔

اس تمام بحث پر نظر ثانی کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نیا تہی یا آئینی بادشاہی کے طریقے کو مغربی یورپ میں نہایت قطعی غلبہ حاصل ہو گیا ہے۔ یورپ کی تقریباً ہر ایک مہذب سلطنت نے رعایا اور اسکے مشمولہ طبقات کے نہ صرف شخصی بلکہ سیاسی حقوق کو بھی تسلیم کر لیا ہے۔ اب شاہی، مطلق العنان اور غیر محدود نہیں رہی ہے بلکہ وہ ایک اعلیٰ قانونی طاقت بن گئی ہے اور رعایا کے حقوق نے اسے محدود کر دیا ہے۔

لیکن دوسرے اعتبارات سے مختلف ممالک کی آئینی شکلوں میں بہت فرق ہے۔ انگلستان میں شاہی، امرا کے ایک زبردست طبقے سے گھری ہوئی ہے اور ملکی کاموں کا انحصار بادشاہ کی شخصی مرضی کے بجائے پارلیمنٹ کے فریق غالب اور وزرا کے اوپر ہے جو پارلیمنٹ کو جوابدہ ہیں۔ برطیسم پر کہیں بھی طبقہ امرا کو یہ اقتدار و اعزاز حاصل نہیں ہے۔ وہاں شاہی کے بعد عمومی حصہ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ طبقہ امرا کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ وہ اعتدال قائم رکھتا اور اول الذکر دونوں حصوں کے درمیان ایک واسطے کا کام دیتا ہے۔ برطیسم میں آئینی جدوجہد شاہی اور جمہوریت کے درمیان ہے، اور ان میں سے ہر ایک اس کو شخص میں سرگرم ہے کہ وہ دوسرے کے مقابلے میں اور نیز تمام سلطنت کے اندر اپنے محل مناسب پر قائم رہے۔ ہر ایک اپنی تنہا حکومت اور اپنے حریف کو دبانگی فکر میں ہے مگر دونوں سے کسی ایک کو جب عارضی طور پر شکست ہو جاتی ہے، تو اس کے بعد پھر ایک ایک قوت بحال ہو جاتی ہے برطیسم میں آئینی بادشاہت کی علانیہ کو شخص یہ ہے کہ اسے ایک زندگیثیت حاصل ہو جائے جس سے اس جسم سیاسی کے ہر حصے کو اسکا موزوں حق مجائے بادشاہ کو کامل اقتدار و عظمت طبقہ امرا کو وقت و اثر، عوام کو امن و آزادی نصیب ہو۔ برطیسم میں بالعموم اور فرانس میں اور جرمانیا میں بالخصوص بادشاہ سلطنت کا

صدر کارکن ہوتا ہے، صرف لفظاً نہیں بلکہ عملاً بھی۔ جب قومی حیات اور رفتار زمانہ سے اُسکا تقادم ہو جاتا ہے صرف اُسوقت نامحدود رائے عامہ کی قوت سے اُسکی روک ہوتی ہے مگر یہ رائے عامہ بالعموم انفصالی اور جامد ہوتی ہے۔ اس حالت کے سوا بادشاہ کی قوت طبقہ امرا کی نسبت بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ جرمانیا میں یہ طبقہ اپنے ذاتی مفاد کے خیال سے بادشاہ کا خدمت گزار بنا رہتا ہے اور فرانس میں وہ اپنی بے بسی کی شکوہ سنجی کیا کرتا ہے۔ فرانس میں بوربوں خاندان کے بادشاہ، زیادہ دولت مند اہل شہر پر بھروسہ کرتے تھے اور پتولین سوم اور لٹو طبقات کو اپنا پشت بنا سمجھتا تھا۔ جرمانیا کی منفرد سلطنتوں میں بادشاہ اپنی تائید کے لئے کچھ تو فوج پر بھروسہ رکھتے ہیں اور کچھ حکام پر۔ حکام اپنی جگہ پر بادشاہ کے لئے خاص روک تھام کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ شہنشاہی میں شہنشاہ کا اعتماد عوام پر اور مختلف سلطنتوں کی حکومتوں پر ہوتا ہے۔ بے اتہا کوششوں کے باوجود کہیں بھی کوئی ایسا انتظام نہیں ہوا ہے جس سے عوام کے دعوے کو تسکین ہوگئی ہو، جب یہ مقصد پوری طرح حاصل ہو جائے گا، حکمران خاندان اپنے ازمنہ وسطی کے تعصبات کو برطرف کر دیں گے، اور زمانہ حال کے خیالات سے متفق ہو جائیں گے تو یہ مدت دراز کی کشمکش ختم ہو جائے گی اور محدود شاہی کی بقا کا پورا اطمینان ہو جائے گا جس سے یہ توقع وابستہ ہے کہ وہ اتحاد عام کے ساتھ اجزا کی آزادی کو جمع کر دے گی اور رومی سیاسی مذاق کو جرمانی احساس آزادی کا ہم آہنگ بنا دے گی۔

تعلیق گستاخِ مرن نے اس بحث پر ایک رسالہ لکھا ہے اور جب (۱۹۱۵ء میں ہنور سے) یہ رسالہ شائع ہوا تو سوائس کے اعلیٰ طبقوں میں بہت پسند کیا گیا مگر تعلیم یافتہ متوسط طبقے نے اسے عوام پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اس رسالہ کا نام یہ ہے: انگلستان کے لئے آئینی شاہی کا مناسب ہونا اور براعظمِ یورپ کیلئے آئینی شاہی کا بے کارغرض ہونا، اور اُسکے مصنف نے اُسوقت سے ہنور میں ایک ایسا دائرہ عمل اختیار کیا ہے جو حکمران اور قوم دونوں کیلئے عمل شکایت ہے۔ اس مضمون پر آزاد خیالوں نے جو پُر سوز تصانیف شائع کیں ہیں، یہ رسالہ مطلقاً انسانی کے طرف سے اُنکا جواب ہے، اپنے اکثر مخالفوں کی طرح قسمرن نے بھی آئینی بادشاہت کا خیال تمامہ انگلستان کے نظام سلطنت کے ظاہری اشکال و پھول سے اخذ کیا ہے اُسکا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ انگلستان کا طریقہ براعظم میں قابلِ غور نہیں ہے کیونکہ انگلستان میں

نقائص و اخذات کی اصلاح و درستی روایات قدیمہ اور حکمران طبقہ اعیان کے اغراض سے ہو جاتی ہے لیکن اس نظام سلطنت پر اگر بالکل عمومی انداز سے غور کیا جائے تو نہایت اہم نتائج یہ ہونگے مگر انگلستان کا دستور اور آئینی بادشاہت دونوں ایک ہی شے نہیں ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کوشش کی عملی صورت کے لحاظ سے اس دستور کو باوجود انکی اصولی غلطیوں کے سب سے اہم بالشان اور سب سے بڑی کامیابی قرار دیجئے، مگر یہ کہنا بجا نہیں ہے کہ اصول کی یہ ایک اتم و اکمل عملی صورت ہے۔ یہ کہنا کہ براعظم کے حالات انگریزی طریقے کے ناموافق ہیں، یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ حالات آئینی بادشاہت کے بھی مخالف ہیں۔ آئینی بادشاہت سے مراد ایسی بادشاہت ہے جو تسلیم کرتی ہو کہ طبقات رعایا کے حقوق کی طرح اُسکے حقوق بھی نظام سلطنت کی رو سے مشخص و معین ہیں اور یہ کہ ہر شخص قانون سازی کے لئے جسم سیاسی کے جملہ اعضا کو متفقہ کام کرنا چاہئے۔ ایک زندہ بادشاہت لازماً آئینی بادشاہت ہوگی کیونکہ زندگی خود نظام ہی کا نام ہے۔ شہر من کا ہر جگہ یکسانیت و اقتدار خاص، حکمران کی ملک، ہے، صاف یہ ظاہر کرتا ہے کہ جزئیات پر اس قدر غافل نظر رکھنے کے باوجود اُس نے سلطنت کے متعلق زمانہ حال کے خیال کو پوری طرح نہیں سمجھا ہے۔ ازمنہ وسطی کے اس استدلال کو اختیار کر لینے سے وہ زمانہ حال کے خیالات سے کلیتہً متصادم ہو گیا ہے لیکن ہے کہ ایک وقت تک وہ پشتہ بندی سے اس سیلاب کو روکے مگر جب موجیں بلند ہوئی تو اس کو فرار و گریز کی بجائے بہا لیا جیٹنگی۔ (یہ جس طرح ششہ میں لکھا گیا تھا میں اُسکو اُسی طرح چھوڑے دیتا ہوں۔) ۱۸۷۷ء میں اس کی صداقت ثابت ہو گئی۔ زمانہ موجودہ نے اگر کسی ایک اصول کو صاف طور پر مضبوط کر لیا ہے تو وہ یہ ہے کہ سیاسی اقتدار جس طرح ایک عام حق ہے اُسی طرح ایک عام فرض بھی ہے۔ اسکا تعلق تمام قوم کی سیاسی ہستی و زندگی سے ہے اور وہ کسی شخص و احد کی ملک یا حق شخصی ہرگز نہیں قرار دیا جاسکتا۔

پندرھواں باب

۲۔ آئینی نشانی کے غلامی تصورات

یورپ کی تقریباً تمام مہذب سلطنتوں نے آئینی بادشاہت کا طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ انہیں توقع یہ ہے کہ اس ذریعے سے نہ صرف اُس باہمی مخالف میں جو مطلق العنان حکمرانی اور کمزور منقسم سلطنت کے درمیان زمانہ وسطیٰ کی وراثت کے طور پر چلا آ رہا ہے آشتی و صلح پیدا ہو جائے گی بلکہ زمانہ حال کے مختلف سیاسی خیالات اور خاکسار شاہی اور جمہوریت کے متضاد خصیالوں میں بھی مسالمت کی صورت نکل آئیگی۔ اس لئے اس طریق کے اساس پر بحث کرنا خاص عملی اہمیت رکھتا ہے لیکن بحث سے پہلے بعض اٹالیا و آسٹریا کے خلاف کر لینا ضروری ہے۔

فرانسیسی انقلاب نے اپنے ابتدائی برسوں میں روسو کے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی کہ سلطنت دو قوتوں پر مشتمل ہے۔ ایک قوت ارادی یعنی قوت قانونی دوسری قوت عملی یعنی اختیار عامانہ۔ فرانس میں آئینی بادشاہت کا اصل اصول سمجھا جاتا تھا کہ رعایا رائے قائم کرتی ہے، بادشاہ اُسے عمل میں لاتا ہے۔

یہ خیال کرنا رعایا کو بادشاہ کا حریف مقابل بنادینا، بلکہ حقیقت خود شاہی کا خاتمہ کر دینا ہے کیونکہ اس سے بادشاہ عوام کی مرضی کا خادم محض ہو جاتا ہے اور ”عوام کی مرضی“ بادشاہ سے ایک خارج شے ہو جاتی ہے جسے قیام میں اُسے کچھ دخل نہیں ہوتا۔ لوگوں کی شانزدہم کا زوال اور انتہا پسندوں کا اعلان جمہوریت بے شک و شبہ تاریخی واقعات کے نتائج تھے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ نظام سلطنت کے اس اصول کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا تھا۔

ایکے برعکس اگر بادشاہ کو قانونی طاقت کے تابع سمجھ کر اس سے خارج کر نیئے بجائے اسکا ہم پائے سمجھ لیجے تو سلطنت کے لئے جس کو حد عمل کی ضرورت ہے وہ ضائع ہو جاتا ہے اور ایک ناممکن العمل دو عملی قائم ہو جاتی ہے۔ لے گویا ایک دوسروں والا جوت پیدا ہو جاتا ہے

لے اس دو عملی سے جو ابتری پیدا ہوتی ہے اُسے فرانس کا عمومی جمہوری خرق بھی طرح سمجھتا تھا اور

۱۔ یہ غلط ہے کہ
۲۔ بادشاہ کو صرف
۳۔ عامانہ اختیار
۴۔ حاصل ہے

اُس سے یا تو سلطنت کے ٹکڑے ہو جائیں گے یا یہ ہو گا کہ شاہی اور جمہوریت میں سے کوئی ایک اصول جلد تر و دوسرے سے مغلوب ہو جائیگا۔

۱۲) بادشاہ بالکل
بے اختیار ہے

اس معاملہ کو رخ کر نیکے لئے سینے نے خیال غاہر کیا ہے کہ سرتاج سلطنت بالکل بے اختیار ہونا چاہئے اور اسی کو اُس نے آئینی طریقے کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اگر کسی شخص کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ماں کے پیٹ سے بادشاہ پیدا ہوا تھا تو وہ شخص یونین ہے۔ اُس نے اس تجویز کا ایسا حقارت آمیز جواب دیا ہے کہ وہ کبھی بھلا یا نہیں جاسکتا۔ اس نے کہا کہ "تم کسی شخص سے جو تھوڑی سی بھی سمجھ رکھتا ہے اور جسے کچھ بھی عزت کا خیال ہے یہ توقع کیونکر کر سکتے ہو کہ وہ سُور کی طرح پڑا رہیگا اور میں لاکھ سالانہ کھا کر موتا ہو کر رہیگا"

۱۳) شاہی اختیار
کو زیادہ عمل میں
لانے ہیں

ایک زیادہ عام خیال یہ ہے کہ "بادشاہ کو حکمرانی کا حق حاصل ہے مگر اُس حق کا عمل میں لانا اُس سے نہیں بلکہ اُسکے وزراء سے متعلق ہے" یہ طریقہ مختلف دقتوں میں متعدد ممالک میں عمل رائج رہا ہے اور ممکن ہے کہ اب بھی رائج ہو لیکن اگر اسے ایک مستقل سیاسی ہول کے طور پر تسلیم کر لے لے تو اُس سے یہ لازم آئیگا کہ بادشاہی بالکل ترک کر دی جائے اور جمہوریت کا رواج ہو جائے کیونکہ اگر کسی شخص کو کوئی حق حاصل ہو اور وہ دائمی طور پر اسکے استعمال سے محروم کر دیا جائے تو اُس حق کی نوعیت اصلی اس سے زائل ہو جاتی ہے اور تھوڑا ہی زمانہ گزرنے پر بالیقین یہ بے معنی خطاب بھی اُس سے نکال کر اُس شخص کو دیدیا جاتا ہے جو واقعتاً اس حق کو کام میں لاتا ہو۔ ازمنہ وسطیٰ میں ماتحت زمیندار اور مستاجر اولاد زمین پر مالکیت حقوق استعمال کرنے لگے، پھر انھیں زمین کا قبضہ و دخل بھی مل گیا اور انھوں نے سابق مالکوں سے باضابطہ اور مکمل ملکیت بھی بزور حاصل کر لی۔ کار و لنگی خاندان کے حاجیان عمل نے جب میر و نگی خاندان کے شاہی اختیارات غصب کر لئے تو پھر زیادہ زمانہ نہیں گزرنے پایا کہ انھوں نے شاہی خطاب پر بھی قبضہ کر لیا۔ جب ایک بار حکومت کا اصلی اختیار بادشاہ سے نکل کر وزراء کو حاصل ہو گیا تو پھر وزراء کے اختیار جمہوریت کے رنگ میں آ جاتے ہیں اور شاہی ایک خیالی شے رہ جاتی ہے۔ سلطنت کا سرتاج ہونیکے لئے ایک بکا کن شخص کے بجائے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ انھوں نے اس سے یہ کام نکالا کہ بادشاہی سے پورے طور پر کوئی غاصبی ہو جائے۔

۱۴) مشعل کی فرانک فرٹ کی پارلیمنٹ کے انتہا پسند جمہوری ذوق کا یہ کہنا بالکل سچا نہیں تھا کہ آئینی بادشاہت

ایک نمائشی علامت مقرر کر لینا تکمیل پرتی ہے بادشاہت نہیں ہے۔

۴۔ بادشاہ کا
شخصی اخلاق
کوئی اہمیت
نہیں رکھتا

ان وجود سے یہ دعوے بھی ناممکن ہے کہ آئینی بادشاہت میں بادشاہ کے شخصی عادات و اطوار سے کوئی بحث نہیں ہے۔ یعنی اسکا کوئی اثر نہیں پڑتا کہ وہ ایک ممتاز شخص ہے یا ایک وجود مطلق۔ زمین ہے یا بلعید اس کے اخلاق خردیانہ ہیں یا اوادشاہ آئینی بادشاہت کا نشانیہ ہے کہ بادشاہ ایسا ہونا چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو اُسے آزاد پرہنجائیگی قوت نہ ہو مگر اسکے ساتھ ساتھ احکام ان اُس میں نفع رسانی کی قابلیت ہو۔ اُسکے اختیار کا محدود ہونا صرف اسی مفہوم میں ہو سکتا ہے وہ اپنے وزرا کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی نہیں ہوتا۔ یہ طریقہ تو نہایت ہی لغو و مہمل ہو گا کہ سلطنت میں سب سے بڑی منزلت کا شخص مردانہ فارغیت و صفات سے محروم سمجھا جائے اور جس شخص کو سب سے زیادہ سیاسی حقوق حاصل ہوں ہی کو سب سے کم سیاسی آزادی حاصل ہو۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ لوگ بادشاہ سے وفاداری اور محبت کا اظہار کریں حالانکہ وہ یہ سمجھتے ہوں کہ اُسکا ان امور کا اہل ہونا اور نہ ہونا برابر ہے بلکہ یہ بھی نہ معلوم ہو کہ وہ ان خیالات کو سمجھنے اور اُنکا بدل کر سکیں قابلیت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ اس اصول کا منطقی نتیجہ تو یہی نظریہ ہے کہ آئینی بادشاہت کے لئے سب سے موزوں وہ حکمران ہے جو سب سے زیادہ کمزور ہو اور جس میں دور بینی اور اصابت رائے کا مادہ بالکل نہ ہو لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ اس قسم کی سلطنت سے قوم کی یہ تمنا پوری ہو سکے کہ سلطنت کے ہر جزو میں ایک توازن اور اس کے انتظام میں جان ہونا چاہئے۔

اس خیال کی تائید بالعموم انگلستان کے نظام سلطنت سے کی جاتی ہے مگر انگلستان

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ ایک منصب ہے بلا اختیار کے اور ایک ٹوپی ہے بغیر سر کے۔ اسکے سوا اُسکا کوئی کام نہیں ہے کہ ایک وزیر اعظم مقرر کر دے (جو بالعموم اُس کے مخالف ہوتا ہے) اور اپنے ایک بائشیں کی پرورش کرے۔ لے بیگل نے اپنی کتاب ”فلسفہ حقوق“ (ف ۲۰) میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ بادشاہ کا کام اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ ”ہاں“ کہہ دے اور دیکھ کر دے لیکن یہ خیال حد سے متجاوز ہے اُسے بطرح ”ہاں“ کہنا پڑتا ہے اُسی طرح نہیں ہی کہنا پڑتا ہے اور اسے صرف منابط کا حکم ہی نہیں دینا پڑتا بلکہ اسکے الفاظی الواقع حقیقی حکم میں نیصا کے سوا بوقت ضرورت اُسے خود اپنی طرف سے بھی زور مآبد کرنی چاہئے اسی حالت میں ہی وہ فتنے کا یہ قول صحیح ہو گا کہ ”سب سے زیادہ بے منزلت ولی اس کام کیلئے سب سے بہتر شخص ثابت ہو گا“

میں بادشاہ کی شخصیت کی طرف سے لاپرواہی نہیں برتی جاتی بلکہ صورتِ معاملات بالکل اس کے برعکس ہے۔

اسی طرح تیسرے کا یہ اصول موضوعہ بہت مشہور ہے کہ "بادشاہ صاحب تخت و تاج ہے مگر کار فرما نہیں ہے"، مگر اسے بھی ہم آئینی شاہی کے اصول کی صحیح تشریح نہیں سمجھ سکتے۔ یہ صاحبِ دانش وزیر خود ہی اس اصول کو عمل میں لانے سے قاصر رہا۔ قطعی ہے کہ لوٹس فلیپ کے زوال کا باعث یہ نہیں تھا کہ وہ صاحبِ تاج ہونیکے ساتھ کار فرما بھی ہونا چاہتا تھا۔ اور اسکے جانشین پولین سوم کی عوام میں ہر دلعزیزی کی اصل وجہ یہی تھی کہ اُس نے کار فرمائی کو اپنے قبضہ قدرت میں رکھا۔

صاحبِ تاج و تخت ہونیکے معنی یہ ہیں کہ شاہی حالات و عظمت کے حقوق باضابطہ حاصل ہیں اور کار فرمائی کا مفہوم یہ ہے کہ سلطنت کی روش کا عملاً انصرام کیا جائے۔ یہ دونوں حقوق یکساں طور پر سلطنت کے سر تاج سے تعلق رکھتے ہیں اور اُسکے لئے جو خسران ذکر کا انکار کرنا یعنی بالفاظِ دیگر اُسے ظاہریت کا عطا کرنا اور اصلیت کا اُس سے سلب کر لینا شاہی اقتدار کو فتنہ کر دینا ہے۔

کار فرمائی (حکومت) اور نظم و نسق (Administration) میں خلط نہ کرنا چاہئے بادشاہ کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ ہمہ تن نظم و نسق کے معمولی جزئیات میں بزدل ہو جائے اور اُسکا ایسا کرنا سلطنت کے لئے مفید بھی نہیں ہے۔

جن لوگوں نے رعایا کے اقتدار اعلیٰ کے اصول کو پیش نظر رکھا ہے انکا دعوے یہ ہے کہ "آئینی بادشاہت میں" بادشاہ پر لازم ہے کہ رعایا کی کثرت رائے اور اسکی مرضی کے موافق حکومت کرے" یہ اصول بادشاہت کو عموماً پٹار کر دیتا ہے کثرت رائے کی حکومت بھی

۵۔ بادشاہ صاحبِ تخت و تاج ہے مگر کار فرما نہیں ہے۔

۶۔ یہ کہ بادشاہ کو کثرت رائے کا علم ہونا چاہئے۔

۱۔ برہمچریہ کی تعریف "دبران عہدِ جاہِ سوم" کے پڑھنے سے ہر شخص کو یقین ہو جائیگا کہ بادشاہ کی شخصیت کا کس قدر بڑبڑت اثر و زرا پر پڑتا ہے۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ بادشاہ کی مرضی کی کوئی اہمیت نہیں ہے (بشمول) اس امر کو فراموش کر دیا ہے کہ جاہِ سوم کا دور حکومت انگلستان کی تاریخ میں ایک متشنی زمانہ ہے جس میں بادشاہ نے یہ کوشش کی اور ایک مدت تک اُسے کامیابی بھی ہوئی کہ وہ اپنے پیغمبروں کی نسبت مکرانی میں زیادہ ذلیل ہو جائے۔ (انگریزی سیرجم)

عمومیت ہے لیکن حقیقت بادشاہت کی اعلیٰ خوبیوں میں سے ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ قلیل التعداد فریق کو کثیر التعداد فریق کی دراز دستی سے محفوظ رکھے۔ اگر بادشاہ محض کثرت رائے کا نمایندہ و خادم ہو جائے اور فی الحقیقت سلطنت کثرت رائے کے زیر فرمان آ جائے تو بادشاہی کا خاتمہ ہے۔ اس طرح پر جو عمومیت پیدا ہو جائیگی، ممکن ہے کہ وہ بادشاہ کو نمائش کے طور پر اُسکے منصب اعلیٰ پر قائم رکھے مگر اُسکا اس منصب پر قائم رہنا اُسی وقت تک ہو گا جب تک اُسکے آقاؤں کو اپنی اصلی طاقت کے پوشیدہ رکھنے کی حاجت ہوگی۔

۱۷۸۹ء میں فرانس کی قومی مجلس نے ٹھیک یہی کرنا چاہا تھا۔ تیرس نے اس مجلس کے متعلق اپنی تصنیف "فرانسیسی انقلاب" (Revolution française) جلد ۲ صفحہ ۱۹۰ میں بہت صحیح کہا تھا کہ "اُنکے خیالات جمہوری ہیں اور اس کے عموماً شاہی ہیں" "تاریخ نے یہ ثابت کر دیا کہ اس حالت کا قائم رہنا ناممکن ہے۔ فرانس میں بے اختیار بادشاہت کو مفتار مطلق جمہوریت نے تباہ کر دیا (۱۷۹۲ء)۔"

سولہواں باب

۳۔ شاہی کا اصول اور آئینی شاہی کا انصاف

آئینی شاہی کا تصور بہتر ہے کہ وہ ایک سچی شاہی ہو نہ کہ محض ایک دہی شاہی ہو۔ شاہی کا اصل اصول یہ ہے کہ سلطنت کا اقتدار اعلیٰ اور سبکدست ایک تنفس میں، مجسم ہو کر ظاہر ہو۔ اُس میں اور مذہبی شاہی میں فرق یہ ہے کہ شاہی طریق میں حکمرانی کا حق خود بادشاہ کو حاصل ہوتا ہے اور مذہبی حکومت میں اصلی حکمران خدا ہوتا ہے اور بادشاہ صرف اُس کا منظر ہوتا ہے۔ جمہوریت میں اور اُس میں فرق یہ ہے کہ جمہوریت میں ایک صدیاریس ہوتا ہے جو خود کو تسلیم التعداد طبقہ اعیان یا کثیر التعداد عوام کا خادم یا نائب سمجھتا ہے۔ برعکس اسکے بادشاہ کسی کا تابع نہیں ہوتا بلکہ وہ حکومت پر آزادانہ قبضہ رکھتا ہے۔ جمہوریت میں سیاسی اقتدار کا اظہار مجموعی حیثیت سے ہوتا ہے اور شاہی میں انفرادی حیثیت سے بلند نظر سے دیکھا جائے تو بادشاہ کو یا سلطنت کا مجسمہ ہوتا ہے۔

اس خیال کے دو پہلو ہیں اور اگر بادشاہی کا نام قائم رکھنا ہے تو دونوں کا وجود برقرار رہنا چاہئے۔

۱۔ سلطنت کے سر تاج کو اقتدار اعلیٰ کے اکیلے قائم مقام اور نمایندہ ہونے کی حیثیت سے شخصی علوی مرتبت حاصل ہونا چاہئے۔

۲۔ بادشاہ کی ذات میں سلطنت کی اعلیٰ ترین عظمت و قوت حقیقتاً مجتمع ہونا چاہئے۔ بادشاہ کے دائرہ عمل کے دوسرے ہیں: ایک بادشاہ کا خود مبدائے عمل ہونا دوسرے اوروں کے کام کو منظوری بخشنا۔

۱۔ پہلے اصول میں امور ذیل داخل ہو سکتے ہیں:—

(۱) قوم کے دیگر اجزاء کے قائم مقاموں کے ذریعے سے وضع قانون میں بادشاہ کے افعال کی روک تھام

(۲) بادشاہ کی یہ ذمہ داری کہ وہ اپنے حقوق و فرائض کے علمبردار میں وزیر کو شریک

رکھیں گا، اس لئے کہ جماعت عامہ کے دوسرے ارکان کی حیثیت کمتری ہی اعلیٰ دارنہ کیوں نہ ہو

شاہی کی حقیقی
خصوصیات

بہر وضع قانون
کی نگرانی اور رد و ثبات
شرکت مانگتا ہے

بادشاہ کی حیثیت ہر حال میں اس سے بالاتر ہوگی اور اس طریق کے اجرا سے کہ بادشاہ کی مرضی اسکی ذاتی مرضی نہیں ہوگی بلکہ سلطنت کی مرضی ہوگی، نظام سلطنت و حقیقت بادشاہ کے بوجہ کو ہٹا کر دیتا ہے اور اس کے اقتدار کو غلط فہمی اور بربادی سے محفوظ رکھتا ہے مگر یہ اصول اس خیال سے موافقت نہیں رکھتا کہ

(۱) بادشاہ کوئی ذاتی روح شخص نہیں ہے بلکہ وہ محض ایک صورت ہے

(۲) بادشاہ قوم کے قائم مقاموں یا اپنے وزیروں کے تابع ہے اور وہ اسے مجبور

کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی کے مخالف خیال ظاہر کرے یا اپنی مرضی کے خلاف عمل کرے۔

چونکہ اعلیٰ اقتدار کا تعلق بادشاہ کی ذات سے ہے، اسلئے لازم ہے کہ اسکی ذات کی آزادی اور اس کے حقوق قائم رہیں لیکن اسکی ذات ہر اعتبار سے اور کلیتہً سلطنت سے متعلق

نہیں ہوتی بلکہ یہ تعلق ایک خاص حد تک ہوتا ہے، البتہ دوسرے لوگوں کی بہ نسبت یہ

تعلق زیادہ ہوتا ہے۔ وہ شوہر بھی ہے، باپ بھی اور کسی کلیسا کا رکن بھی یا یہ بھی ممکن ہے کہ

عالم یا شاعر ہو، لیکن تمام معاملات عامہ میں سلطنت کی رائے کا اظہار اسی کی ذاتی رائے

سے ہونا چاہئے۔ شاہی سلطنت میں یہ بات نہایت اہم اور ضروری سمجھی جاتی ہے کہ بادشاہ

سلطنت کے امور میں اپنی ذاتی فکر مندی اور ذاتی مستعدی کو کام میں لائے۔ اُسے

سب سے بڑے حقوق دینا اور پھر اسی بنا پر اسے دوسروں کی نگرانی میں رکھنا سراسر لغو و فصل

معلوم ہوتا ہے۔ ایوانہائے مبعوثین سے قانون نہیں پیدا ہوتا بلکہ قانون کی وقت اسی وقت

ہوتی ہے جب اُسے بادشاہ کی آزادانہ مرضی حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہ کے احکام کا اقتدار

وزرا سے نہیں ہوتا بلکہ وزراء خود اپنے اقتدار کے لئے بادشاہ کے دست مگر ہوتے ہیں اور

اگرچہ وہ اسکی مرضی کے اظہار کے لئے لابی آلہ ہوتے ہیں مگر پھر بھی آلہ ہی ہوتے ہیں نظام سلطنت کی

لئے گیزتھائیف (Memoires) جلد ۲ صفحہ ۲۳۳: "صرف خدا ہی حکمران ہے اور اس عالم خاکی کا کوئی

شخص خدا نہیں ہے خواہ وہ عوام میں ہو یا بادشاہوں میں سے۔ عوام کا ارادہ کسی کو بادشاہ بنا دینے کیلئے

کافی نہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ جو شخص بادشاہ بنے وہ اپنے میں بعض فطری اور ذاتی شانمانہ

خصوصیتیں رکھتا ہو اور یہ خصوصیتیں اُس نے اُس ملک کو گویا جہیز میں دیدی ہوں جسکے ساتھ اُس نے

اپنی ذات کو وابستہ کیا ہے"

لیکن بادشاہ کو
باضابطہ اس کا
پابند اور تابع
بنانا ممکن نہیں۔
بادشاہ کے لئے
مستقل آزادی
لازم ہے۔

رو سے بادشاہ جس حد تک دوسرے اعضاء سلطنت کی منظوری و امداد کا پابند نہیں ہوتا اُسی حد تک اُسے کامل آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنی شخصی مرضی کا اظہار کرے یا اُس کے موافق عمل پیرا ہو۔

شاہی کے دوسرے اقسام کے مقابلے میں آئینی بادشاہت کی خصوصیت یہ ہے کہ بادشاہ نہ تو بطور خود قانون نافذ کر سکتا ہے اور نہ بالعموم وہ تنہا حکومت کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ وضع قوانین کے لئے ایوانہائے مسوئین کی منظوری ضروری ہے اور حکومت کے کاموں کے لئے وزیر کی شرکت لازمی، لیکن آئینی بادشاہت کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ بحکومت ایوانہائے مسوئین یا وزیر کی طرف منتقل ہو جائے۔

مجلس وضع قوانین
اور وزراء
کا تعلق

جس طریق حکومت میں ایوانہائے پارلیمنٹ اور وزیر کی کثرت رائے باحاطہ اور لازمی طور پر بادشاہ کے افعال کو معین کر دے وہ حکومت بلاشبہ شاہی اصول کے مخالف ہے۔ اُسے حقیقت پارلیمنٹ اور وزیر کی حکومت کہنا چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ عملاً ایک آئینی بادشاہ اکثر ایوانہائے مسوئین کے فیصلے اور وزراء کے مشورے کو منظور کرے گا کیونکہ وہ انھیں سلطنت کی مرضی عام کا اظہار سمجھتا ہے لیکن اگر وہ حیثیت بادشاہ کے اپنے فرائض کے ادا کر نیک خواہاں ہو تو اُسے لازم ہے کہ وہ اپنے اس آزادانہ حق کو محفوظ رکھے کہ وہ بطور خود ان معاملات کی جانچ قومی سپردی کے نقطہ نظر سے کرے گا۔ ان حدود کے اندر ایک آئینی بادشاہ پوری آزادی کے ساتھ کارروائی کر سکتا ہے۔

یہ خیال بالکل پچھ ہے کہ بادشاہ کو خاص اپنی رائے کے اظہار سے روکنا چاہئے۔ ہر ایک ذی فہم شخص کو اپنے اہلی خیالات کا اظہار کرنا ضروریات زندگی میں سے ہے۔ اور اگرچہ سیاسی ضروریات اکثر بادشاہ کو اُسکے خیالات کے اظہار سے روکتی ہیں، مگر کسی شخص کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اُسکی آزادی تقریر سے انکار کرے یا اُسے دروغ بیانی پر مجبور کرے۔ بادشاہ پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ ملک کی حالت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اپنے کان سے سنے۔ اُسے چاہئے کہ رعایا کی ضروریات سے باخبر رہے۔ معاملات عامہ کی تمام کیفیات پر نگاہ رکھے اور جب عام اغراض اور بہبود عام کا اقتضا ہو تو وہ اپنی جانب سے

۱۔ اس قسم کی حکومت کا ذکر تفصیل کے ساتھ آگے ساتویں مقالے میں آتا ہے۔

۲۔ دیکھو مثال کی تصنف "شاہی کا اصول" (صفحہ ۹) جس میں اس بحث پر قابل توجہ خیالات کا

ضروری قوانین اور کارروائیوں کے اجرا و امضا میں تاخیر نہ کرے۔ یہی روش ہے جس پر چکر سلطنت کے بڑے بڑے بادشاہوں نے ناموری حاصل کی ہے۔ آئینی بادشاہی اس قسم کے معاملات میں قابل بادشاہوں کے لئے میدان ترقی مہیا کر دیتی ہے۔ اسے چاہئے کہ اس میدان کی راہوں کو بند نہ کرے۔

آئینی بادشاہ کے حقوق اور اختیارات

۲۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ سلطنت میں بادشاہ کو سب سے بلند رتبہ اور کامل اختیار حاصل ہونا چاہئے۔ انگریزی نظام سلطنت نے بھی اس اصول کو قبول کر لیا ہے حالانکہ اس نظام سلطنت میں شاہی حقوق پر اس قدر قیود عائد ہیں کہ برائے قسم کے اکثر بادشاہ اسے ناقابل برداشت سمجھیں گے۔ اس اصول سے نتائج ذیل پیدا ہوتے ہیں :-

۱۔ آئینی بادشاہی مفرد شاہی اقتدارات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ جدا اقتدارات شاہی پر تمام و کمال حاوی ہے۔ مطلق العنان بادشاہی اس اعتبار سے اس سے متجاوز ہے کہ وہ دوسری سیاسی جماعات کو نہ تو آزادانہ حقوق دیتی ہے نہ شاہی حقوق کے عملدرآمد میں انھیں لازمی طور پر شریک کرتی ہے، وہ خود تمام حقوق کی دعویدار ہوتی ہے اور دوسروں کو صرف اپنی حرمت کا امیدوار رکھتی ہے۔ برخلاف اسکے آئینی بادشاہی اسکی پابند ہے کہ وہ دوسری جماعات کے حقوق اور رعایا کی آزادی کو تسلیم کرتی ہے۔

۲۔ وضع قوانین میں بادشاہ کا حصہ ہوتا ہے اور نفس قانون کے اعتبار سے یہ حصہ علی العموم قطعی ہوتا ہے اور شکل قانون کے اعتبار سے ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ اسے تمام قوانین کے متعلق برائت اور منفوری کا حق ہوتا ہے اور یہ قوانین اسی کے نام سے شایع ہوتے ہیں۔ اگر اس اساسی قاعدے سے انکار کیا جائے تو شاہی اصول میں جمہوری اثرات خلیل ہو جاتے ہیں۔ اعلیٰ اقتدار ایوانوں کو ملتا ہے اور جہانک تو وضع قوانین کا اتفاق ہے بادشاہ ان ایوانوں کے تابع ہو جاتا ہے۔ شاہی ایوانوں کے حقوق متوازی ہو سکتے ہیں، کلی نہیں ہو سکتے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ اظہار کیا گیا ہے۔ لو تھر انی (Fischreden Table Talk) میں

کہتا ہے کہ "کسی بادشاہ میں اس سے زیادہ تعلق آئینہ اور قابل وصف کوئی فعل نہیں ہو سکتا کہ وہ آزادی سے اپنی رائے کا اظہار کرے اور جو کچھ اسکے دل میں ہو اسے قولاً و فعلاً کر دکھائے" "وہ دوسروں کی آزادی تقریر کی کیونکر وقت کر لیا جب کہ خود اسکی آزادی پر قیود عاید ہوں؟"

۳۔ تمام حکومت بادشاہ کی ذات میں مجتمع ہوتی ہے یعنی حکمرانی اسکا آزادانہ حق ہوتا ہے اور حکومت کی تمام کارروائیاں اُسی کے نام سے عمل میں آتی ہیں۔

آئینی بادشاہت میں وزیر یا اعمال اپنے نام سے حکومت نہیں کر سکتے لیکن اسکے ساتھ ہی بادشاہ بھی اُنکے اتفاق و امداد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ اُنکے تمام حقوق و فرائض شاہی اختیار سے ماخوذ ہوتے ہیں اور ازمنہ وسطیٰ کی جاگیر یا بادشاہت کی طرح وہ اپنے مقصد کے لئے اُن حقوق کو کام میں نہیں لاسکتے بلکہ صرف سلطنت کے لئے انھیں استعمال کر سکتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ سلطنت کا علی اتحاد قائم رہے جس طرح قانون سازی کے معاملے میں اسی طرح وزراء کے متعلق بھی بادشاہ کو ہدایت عمل اور منظوری کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ ہدایت کے حقوق کو وزیر بھی کام میں لاسکتے ہیں مگر منظوری کا حق بادشاہ کی ذات واحد سے مخصوص ہے اور وزیر کو صرف یہ حق حاصل ہے کہ وہ شاہی احکام سے اتفاق کرنے کے لئے میں آزاد ہیں۔

آئینی بادشاہت ازمنہ وسطیٰ کے اس اصول کو تسلیم کرتی ہے کہ تمام اقتدار اعلیٰ سے شروع ہو کر افضل کی طرف آتا ہے اور حکومت مرکز سے دائرے کی جانب پھیلتی ہے، نہ اسکے برعکس، لیکن اب اس سے بچنے کی کوشش کیجاتی ہے کہ ازمنہ وسطیٰ کی طرح حکومت مختلف حقوق میں متفرق کر دی جائے۔

۴۔ سلطنت کے تمام اعضاء فرداً فرداً بادشاہ کے تابع ہوتے ہیں۔ اُس میں صرف وہی اعضاء داخل نہیں ہیں جن کے افعال کلیتہً اسکی مرضی کے تحت میں ہوں بلکہ وہ وزیر بھی اس میں شامل ہیں جن کا اتفاق رائے بادشاہ کے لئے سلطنت کی مرضی کے اظہار کے قبل ضروری ہے۔ ورنہ بھی اُس میں داخل ہیں جن کے کام اُسکے حیثیت اثر سے باہر آزاد ہیں، یہاں تک کہ وہ ایوانہائے مبعوثین بھی اسکی ماتحتی سے خارج نہیں ہیں جن کی قانون سازی کے

۵۔ لوئیس فون ہسٹائن (۱۵ اصول نظریہٴ نسق) جلد ۱، صفحہ ۸۶ اور آگے کے صفحوں میں کارروائیوں کے جاری کرکے شخصی حق کو حکومت کے اختیار سے میسر کرتا ہے اور یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اول الذکر کو قومی نمائندوں اور دیزبروں دونوں کے اثر سے آزاد ہونا چاہئے۔ یہ نظریہ بادشاہوں کی مطلق العنانی کیلئے بہت عمدہ چور و دروازہ بناوتا ہے مگر آئینی نظم کیلئے ہلکا ہے (دوسری شامت میں فون ہسٹائن نے اس مسئلہ پر اپنے خیالات کو بالکل بدل دیا ہے)

اختیارات سلطنت میں خود آزادانہ قوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پس جس طرح جسم کے تمام اعضاء پر فوقیت رکھتا ہے اسی طرح بادشاہ جسم سیاسی میں سب سے بلند حیثیت پر فائز ہوتا ہے۔

آئینی بادشاہی ایک اضافی شے ہے، کوئی مجرد شے نہیں ہے۔ وہ مختلف تعلقات و ضروریات کے موافق رنگ اختیار کرتی اور قومی خصوصیت اور تاریخ کے مطابق ہیئت بدلتی رہتی ہے، اس لئے صرف انگریزی سلطنت سے اسکا تصور ذہنی قائم کرنا درست نہیں۔

خصوصیات ذیل آئینی بادشاہی کی ہر صورت میں مشترک ہیں :-

(۱) بادشاہ کے رتبہ اقتدار کی تجدید نظام سلطنت کی رو سے ہوتی ہے۔ آئینی فرمان نظام سلطنت سے خارج یا اس سے بالاتر نہیں ہے بلکہ اسی کے اندر داخل ہے۔ اس طرح حکومت کو آئینی اس دور سے کہتے ہیں کہ اس میں نظام ساخت کے معین کردہ قانون انتظام کی توقیر و نظر رہتی ہے اور بادشاہ اسکا پابند ہوتا ہے۔ نظام سلطنت کا تحریری ہونا یا نہ ہونا نظر انداز کر دینی شے نہیں ہے مگر اسکا تحریری ہونا لازمی نہیں ہے۔

انگلستان جو تمام آئینی بادشاہوں کا مورث اعلیٰ سمجھا جاتا ہے، وہاں خود آئینی قوانین اور قومی آزادی کے تحریری اعلان موجود ہیں مگر تمام سیاسی انتظام کا کوئی مکمل اور با ترتیب مضابطہ اس قسم کا نہیں ہے جسے موجودہ زمانے میں پسند کیا جاتا اور بالعموم نظام سلطنت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ انگریزی قوانین، سیاسی جدوجہد کے نتائج اور قومی تاریخ کے مختلف دوروں کی مخصوص ضروریات سے بتدریج پیدا ہوئے ہیں، برعکس اسکے زمانہ حال کے نظامائے سلطنت بیشتر ایسے میں جو ایک ہی مرتبہ مکمل و متعظم قانونی نوعیت کے ساتھ کسی عام اصول سلطنت کے زیر اثر مرتب ہوئے ہیں۔

آئینی بادشاہی، دونوں صورتوں میں ممکن ہے، لیکن غیر تحریری قانون کی اہمیت پر اعتراض کے بغیر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تحریری منشور اور حقوق سیاسی کے تحریری اقرار ہمیشہ بہت ہی بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے تھے۔ یہ امر زمانہ موجودہ کے حالات کے بالکل موافق ہے یعنی زمانہ مابعد میں حق کا احساس محض رسم و رواج کے تعلق سے نہیں پیدا ہوا ہے اور اس کے لئے جس حفاظت و موضوع کی ضرورت ہے وہ صرف تحریری دستاویز ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔

لے البتہ بعض نظامائے سلطنت محض کاغذ کے پرزے تھے چنانچہ فریڈرک واپلر جہاں نے اپنی ایک شاہی تقریر میں بعض تحریری نظامائے سلطنت کو "کاغذی نظام سلطنت" کہا تھا۔ اس لئے کہ یہ نظامائے سلطنت کی نظریہ

آئینی بادشاہی کی
مشیکل خصوصیات

(۲) آئینی بادشاہ اس امر کا پابند ہے کہ وہ نہ صرف نظام سلطنت کے ایک ایک حرف کی وقت کرے بلکہ سلطنت کے قوانین کو بھی موثر سمجھے۔ وہ صرف اُسی قدر اطاعت کی توقع اور خواہش کر سکتا ہے جو از روئے قوانین و نظام سلطنت عین ہو۔

(۳) قانون سازی کا اختیار بادشاہ کو صرف بشمول مجلسِ نائبین حاصل ہوتا ہے۔ قانون کی اشاعت کے لئے اسے مجلس کے مشورے کی طرح اُسکی منظوری بھی لینا ہوتی ہے۔

(۴) مالی انتظامات اور محال کی منظوری کا انحصار مجلسِ نائبین کے اتحادِ اعلیٰ اور اتفاقِ رائے پر ہوتا ہے۔

(۵) حکومت اور انتظام میں وزیر کی شرکت لازمی ہوتی ہے، بادشاہ کے فرامین، فیصلے اور احکام کسی تیسرے شخص پر اُس وقت تک واجبِ تعمیل نہیں ہوتے جب تک کہ بادشاہ کے دستخط کے ساتھ ایک وزیر کے دستخط بھی اُس پر نہ ہو جائیں۔

(۶) وزراء اور تمام دیگر عہدہ داروں کی ذمہ داری لازمہ و لازمی ہوتی ہے۔

(۷) عدالتی انتقارات کی آزادی اور وزیر کی عدالتی فرائض کی انجام دہی سے ملحدگی حکومت پر ایک مناسب روک اور برعایا کے حقوق کی ایک اہم حفاظت کا کام دیتی ہیں۔

(۸) طبقات اور افراد کے شخصی اور ذاتی حقوق کے علاوہ عام حقوق بھی تسلیم کئے جاتے ہیں اور یہ حقوق بدعتِ بیجا سے اُسی قدر محفوظ ہیں جس قدر خود بادشاہ کے حقوق۔

آئینی بادشاہی کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ایک آزاد قوم کی قومی بادشاہی ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ یا ہول کی بنا پر بنائے جاتے ہیں اور قوم میں اُنکی بنیادِ متحکم نہیں ہوتی اسی وجہ سے اُن میں سے اکثر بہت آسانی سے تباہ ہو جاتے ہیں مگر کسی نظامِ سلطنت کو محض اُنکے تعمیری ہونے کی وجہ سے "کاغذی نظامِ سلطنت" نہیں کہنا چاہئے بلکہ عکسِ اس سے اُنکے قواعد کو مزید تقویت و طابقت حاصل ہو جاتی ہے۔

شرواحِ باب

ایمانی حکومت

(الف) یونانی شکلِ سلطنت - سپارٹا

جس طرح ایتھنز سے قدیم عیسویت کی اعلیٰ ترین سیئت کا اظہار ہوا تھا، اُسی طرح یونانیوں میں سپارٹا ایمانی حکومت کا سب سے زیادہ نمایاں نمونہ تھا۔ یونانیوں کے مباح عام طور پر ایمانی سلطنت کے بجائے عمومی سلطنت کی طرف مائل تھے اور صرف غیر ملکی وحشیوں کے مقابلے میں وہ اپنے کو ایک خلقِ حبشہ ایمان کہنا پسند کرتے تھے لیکن دُورس کی نسل کے لوگ جن میں اہل سپارٹا بھی داخل تھے اپنے اندرونی انتظامات میں بھی ایمانی سیئت و خیالات کو مرجع سمجھتے تھے۔

ایمانی حکومت کا برترین اصول یہ ہے کہ قوم کے زیادہ معزز عناصر کتر درجے کے عوام پر حکمران ہوں ان معزز عناصر کی قدرو منزلت کے طریقے مختلف سلطنتوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ لگونیہ میں اہل سپارٹا حکمران قوم سے تھے جنہوں نے اس ملک کو بزر و شمشیر فتح کیا تھا اور قدیم باشندوں یعنی پیریونکی اور لکے دیونی قوموں کو اپنا مطیع بنا لیا تھا۔ راعی و رعیت نسبتاً ایک دوسرے سے الگ تھے۔ فائیمین اولین نے حکومت کا نظم و نسق ایسا رکھا تھا کہ وہ اُنکے اخلاف میں نسبتاً بعدِ نسل منتقل ہوتا چلا جائے۔ پس اس طرح حاصل شدہ طاقت کے برقرار رکھنے کی کوشش میں تمام قدیم ایمانی حکومتوں کی مختص خصوصیت یعنی موروثی حقوق سیاسی، از خود پیدا ہوئے اور یہی تمام سلطنت کا بنیادی اصول قرار دیا گیا۔

اہل سپارٹا کی اس موروثی حکومت میں نسلوں کی آمیزش نے کسی قسم کا متغیب نہیں پیدا کیا تھا۔ اہل سپارٹا اور غیر ملکیوں کے درمیان امتیاز ایسے سخت اور قطعی طور پر قائم رکھا گیا جیسے ذاتوں کا فرق قائم رکھا جاتا ہے، اور اُن میں باہمی مناکحت کی ممانعت کر دی گئی۔ بہت شاذ و نادر ایسا ہوتا تھا کہ غیر ملکی کو پورے ملکی حقوق دینے جاتے ہوں۔ حکمران نسل کو

اہل سپارٹا کے
حبشہ ایمانی کی
ابتدا۔

انکی تعریف

نئے خاندان کی شمولیت سے کبھی تقویت نہیں دیا جاتی تھی نہ رعایا کو اس امید سے تسلی حاصل ہوتی تھی کہ اس کے بہترین اخلاف کبھی اپنی ذاتی قابلیت سے سلطنت میں بلند مرتبہ حاصل کر سکیں گے یہ تفرق پسندی اس وجہ سے اور بھی زیادہ عجیب اور تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے کہ اہل اسپارٹا دیگر اعتبارات سے اپنی نسل کے خاص رکھنے کی چنداں پروا نہیں کرتے تھے۔ اسپارٹا کی وہ عورتیں جن کے شوہر جنگ میں کام آجاتے تھے نیم غلاموں سے ہمستر ہوتی تھیں تاکہ ان سے جو بچے ہوں وہ اسپارٹا کی قوم میں شامل کر لئے جائیں۔ لیکن تسلیم کا انتظام زیادہ غور و فکر کے ساتھ کیا گیا تھا اور اس سے نسل کی فوقیت کی تشکیل کی گئی تھی۔ منشا یہ تھا کہ وہ نوزائیدہ بچے اسپارٹا کے امتیاز کو محفوظ رکھیں۔ سلطنت کو اپنے نوجوانوں کو سیاسی اور فوجی تسلیم دینے کا اس قدر خیال تھا کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے خاندان کے اتحاد و آزادی کو قربان کر دینے میں بھی دریغ نہیں کرتی تھی۔ اسپارٹا سے زیادہ کسی جگہ انفرادی زندگی اس درجہ سلطنتی زندگی کے تابع نہیں تھی۔ دیگر سلطنت کا اختیار مطلق اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ اس انسان کا وجود صرف سلطنت کے لئے سمجھا جاتا تھا۔

تعلیم

داخلی مساوات

خود اپنے حلقے میں تمام اہل اسپارٹا کے حقوق یکساں تھے اور اس ایمانی حکومت میں جمہوری مساوات کو اس درجہ وسعت دی گئی تھی کہ دیگر کسی حصہ سے اپنے نظام سلطنت کی بنیاد قرار دینا ایک تمام خاندانوں کی جائیدادیں برابر ہو جائیں۔ زمین کی تقسیم کے وقت ہر خاندان کو برابر حصہ دیا گیا تھا اور اس سے علاوہ ہونے والی ممانعت ہو گئی تھی۔ اس خیال سے کہ لوگ شخصی ملکیت جمع کر کے ایسے غریب کا فرق پیدا کریں سوئے اور چاندی کا استعمال ممنوع قرار پا گیا تھا، وہ نیم غلام جو اہل اسپارٹا کی زمینوں کی کاشت کرتے تھے ان اشخاص کی ملک نہیں ہوتے تھے بلکہ خود زمین کی طرح سلطنت کی ملک ہوتے تھے اور ان میں جس کی قسم سے جو معاوضہ ملتا تھا وہ ان کے لئے قانون سب میں برابر تقسیم ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ عام کھانا جس میں اہل ملک مختلف دستہ خاندانوں پر تقسیم ہو جاتے، وہ سب کے لئے عام اور یکساں ہوتا تھا پس اس طرح اسپارٹا کی ایمانی حکومت والوں میں اہل اعظم کی جمہوری حکومت کے مقابلے میں مساوات زیادہ مکمل اور مستحکم تھی۔

لیکن حکومت اسپارٹا کا عملہ رآمد کسی نوع کے جمہوری نہیں تھا کیونکہ سلطنت

تفہات ملکی

اور قوم دونوں کی انفرادیت حقیقتاً اسکے خلاف تھی۔ اسپارٹا میں اگلیسیا (مجلس عام) ضرور موجود تھی مگر اصلی اختیارات سینات کے ہاتھ میں تھے اور بالعموم یہی مجلس تمام امور نامہ کا فیصلہ کرتی تھی۔ اہم معاملات میں اسکے فیصلے مجلس عام میں پیش ہوتے تھے مگر انہی نسبت صرف منظوری یا انمنظوری کا اظہار ہو سکتا تھا۔ اس آخر الذکر مجلس میں بادشاہ محکم اور سیناتیوں کے سوا اور کوئی تفسیر نہیں کر سکتا تھا اور تیس برس سے کم عمر کا کوئی شخص رائے نہیں دے سکتا تھا۔

سلطنت کی ترتیب و ترکیب اعلیٰ خیال کے موافق منضبط تھی۔ اسپارٹا کے سینات خاندانوں کے نو ہزار سرگروہ میں تقسیم تھے جن میں رومی کوریوں سے تشبیہ دے سکتے ہیں، وودشاہی حلقے و بادشاہوں کو اور باقی اٹھائیس حلقے ایک ایک رکن سینات کو نامزد کرتے تھے۔ یہ سیناتی ایک حد تک بادشاہ کے ہمسرہ ہوتے تھے۔ پس اس طرح سینات تیس ارکان پر مشتمل تھی اور اس انتظام سے کسی ایک خاندان کی خاص فوقیت نہیں پیدا ہو سکتی تھی، لیکن اسکے ساتھ ہی تمام خاندان کے مجموعی حقوق اور ان کی وقعت قائم رہتی تھی۔ اہل اسپارٹا عقل و دانش کی بنا پر اعلیٰ پیرانہ سری کو سمجھتے تھے اور اس کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ بادشاہ کے سوا تمام سیناتیوں کے لئے لازمی تھا کہ ان کی عمر ساٹھ برس سے کم نہ ہو۔ عمر کے متعلق حد سے بڑھا ہوا لحاظ نظام سلطنت پر ایک وجہاً معلوم ہوتا ہے۔ سالخورہی سے عقل کے ساتھ کمزوری بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ سلطنت کے کام چلانے کے لئے صرف بڑھوں کے تجربے ہی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ جوانوں کی قوت کار و جوش کی بھی حاجت ہوتی ہے۔ انتخاب مجلس عام کی رائے سے ہوتا تھا مگر امید وار اس مجلس کو پہلے سے اپنا ہم رائے بنا لیتے تھے۔ اس بلند رتبے کے حصول رائے کیلئے بڑے انجمن اپنا یہ اعتماد ظاہر کرتے تھے کہ ان میں اب تک اتنی قوت ہے کہ وہ سلطنت کی خدمت عمل کی سے انجام دے سکیں۔ اور وہ اپنی بقیہ زندگی سلطنت کی خدمت کے لئے وقف کرنے پر آمادہ ہیں۔ مجلس کی منظوری

اہل اسپارٹا کی اگلیسیا وہی اختیار اور میت کہتی تھی جو ہونے کے زمانے میں تھیبون کی قومی کمیٹیوں کو حاصل تھے۔

سہ (لاٹینی کوریا) (Kuriae) جن کو کورے (Kuriae) اور تہرم

گویا قوم کے عام اعتماد کا اظہار تھی۔ یہ عہدہ عمر بھر کے لئے ہوتا تھا اور اس سے یہ اطمینان ہو جاتا تھا کہ عام لوگ خود غرضانہ جوش میں تغیر و تبدل نہ کر سکیں گے مگر اسکے ساتھ ہی اس میں یہ نقصان بھی تھا کہ باوجود کمزور اور کام سے ناقابل ہو جانیکے لوگ عہدے سے دستکش نہیں ہوتے تھے۔

بادشاہ اور حکام

اسپارٹا کی اعیانہ کی حکومت دو طریقوں پر محدود تھی، ایک طرف سے بادشاہی نے جس سے سلطنت کی وحدت و عظمت کا اظہار زیادہ شاندار طور پر ہوتا تھا، اُسے محدود کر رکھا تھا دوسری طرف سے تقرر حکام کے جمہوری انتظام نے اُسے محصور کر دیا تھا۔ حکام کا تغیر و تبدل خود رعایا کی طرف سے عمل میں آتا تھا اور بادشاہ اور سینات دونوں کے فرائض کی انجام دہی انھیں کے اختیار میں ہوتی تھی اور معاملات سلطنت میں انھیں وسیع عدالتی اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے۔

نظام سلطنت کی حقیقت مصنوعی تھی

اسپارٹا کے اس نظام سلطنت کا اثر دل پر ایک مصنوعی شے کا سا ہوتا ہے۔ افلاطون کی "ڈریبلک" کی طرح اسکی ظاہری خوبی اور ہر گئی سے حسن و جمال کے احساس کو فرحت حاصل ہوتی ہے لیکن باطناً اسکی حالت اس قدر غیر طبعی ہے کہ حیثیت مجموعی اس سے عنبت کے بجائے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اس عمارت کے نقش و نگار سے طبیعت خوش ہو سکتی ہے مگر اُس میں رہنے کی خواہش نہیں پیدا ہو سکتی۔ اگر اہل ایتھنز اس الزام کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک منظم سلطنت کے بجائے ہنگامہ آرا حکومت کو ترجیح دی تو اہل اسپارٹا پر بھی یہ الزام عاید ہو سکتا ہے کہ انھوں سیاسی تنظیم پر انسانی آزادی کو قربان کر دیا۔

اہل ایتھنز کے مقابلے میں ان کا طریق زیادہ ممتاز ہے گروہ اُس قدر سرت انگیز اور آرام دہ نہیں ہے۔ ایک میں قابلیت سیاسی کا یکساں توازن قائم کیا گیا ہے دوسرے میں روشنی اور تاریکی دونوں اپنی اپنی جگہ پر بڑھی ہوئی ہیں۔ ایک ضرورت سے زیادہ ساکن ہے اور دوسرا ضرورت سے زیادہ متحرک۔

اس کا قیام و بقا

قیام کی بقا کے اعتبار سے اسپارٹا کے نظام سلطنت کو بہت فوائد حاصل تھے۔ سولن نے نسل اور دولت کے اعیانی عناصر کے امتزاج سے جو عمومیت قائم کی تھی اس پر اس مطلق العنانی کو غالب آتے ہوئے دیکھتا رہا اور اُس کی روک نہ کر سکا۔

ان مطلق العنانوں کے زوال کے بعد آئندہ میں خالص عمومیت قائم کی گئی مگر سو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ اُسکی حالت ایسی ابتر ہو گئی کہ کوئی امید باقی نہیں رہی۔ اس کے برخلاف مگر گرس کے نظام سلطنت نے پانچ سو برس تک اسپارٹا کی عظمت کو قائم رکھا اور جب اسپارٹا کو زوال ہوا تو اس وجہ سے ہوا کہ نظام سلطنت کے حلف کیا گیا۔ لوگوں نے دولت جمع کر لی اور دولت سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ اُن میں پیدا ہوئیں اور حکام نے عوام سے ملکر فریقانہ سازشیں شروع کر دیں۔ اس نظام سلطنت کا اتنے دنوں تک قائم رہنا اس وجہ سے اور بھی تعجب خیز معلوم ہوتا ہے کہ جب ہم اسکے ضوابط کو دیکھتے ہیں تو وہ فطرت انسانی اور واقعات حاضرہ دونوں کے خلاف معلوم ہوتے ہیں لیکن ایک حد تک اس دیر پائی کی وجہ یہ بھی تھی کہ اُس کے بانی کی نسبت قوم کا یہ خیال تھا کہ وہ زے اُس کا مورد عنایت اور خود ایک دیوتا ہے اور اس وجہ سے وہ اس نظام سلطنت کو ربانی قانون کہتے تھے۔

کریٹ کا نظام سلطنت بھی ایسا ہی تھا اور کارٹیج میں اسی طرح اعمیانی نظام سلطنت رائج تھا، اور یہ دونوں اپنی مدت قیام کے متعلق فخر کر سکتے ہیں اور حقیقت تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اعمیانی حکومتیں چونکہ اپنے انتظام میں بقائے سلطنت کو اصل اصول قرار دیتی ہیں، اس وجہ سے وہ اپنے کو اور اپنی سلطنت کو اُس سے زیادہ مدت تک قائم رکھ سکتی ہیں جتنے زمانے تک کہ عمومیات اپنی حکومت کو برقرار رکھ سکتی ہیں۔

سلا لورنٹ اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ اس نظام سلطنت کی یہ عدم تفریق ہی اسپارٹا کی دیرانی کا ایک باعث ہوئی۔
(ب) ارسطو نے سیاسیات میں اسپارٹا، کریٹ اور کارٹیج تینوں کے نظامہائے سلطنت پر تنقید کی ہے۔

اسٹھارموال باب

(ب) روم کی اعیانی حکومت

حقیقی اعتبار سے روم کی جمہوری سلطنت بالکل ایسی ہی اعیانی حکومت تھی جیسی اسپارٹا کی حکومت تھی۔ فرق تھا تو یہ کہ روم کی حکومت کا درجہ بلند تھا۔ اہل روم نے سلطنت کے حقوق عام اور افراد و قبائل کی آزادی میں قطعی اور بدیہی امتیاز قائم کر دیا تھا۔ سلطنت کے اقتدار و عظمت کا ایک نمایاں خیال اُن کے دلوں میں مرکوز تھا اور وہ اُسے ترقی دینے کے نہایت درجہ شائق تھے، مگر انھوں نے انفرادی زندگی کو سلطنت کے سانچے میں ڈھالنے کے حق کا دعوے کبھی نہیں کیا۔ چنانچہ انھوں نے اس مصنوعی تنگ خیالی کو ترک کر دیا تھا کہ کسی قسم کا غیر ملکی جُذائے میں داخل نہ ہونے دیں۔ اس تنگ خیالی سے اسپارٹا کی قومی خوبی کا اپنی اصلی حالت پر قائم رہ جانا تو ممکن ہوا مگر اُس نے اُن کو بیرونی دنیا میں اس اہم حیثیت کے قائم رکھنے کے ناقابل بنادیا جو قسمت سے انھیں حاصل ہو گئی تھی۔ اہل روم ابتدا ہی سے اسپارٹا کے ایسے طبقاتی امتیاز کی قید سے آزاد تھے۔ روم میں مختلف طبقات اس طرح سے بے حس و حرکت ایک دوسرے کے آٹے سانے جیسے کھڑے نہیں تھے کہ وہ ایک دوسرے کے کام کو مٹھل کر دیتے بلکہ وہ اپنی آپس کی کشمکش اور اپنے نوع بہ نوع اثرات سے سیاسی زندگی کے اعلیٰ نشو و نما کا باعث ہوئے۔ اسپارٹا کے مانند روم کا نظام سلطنت بھی انسان ہی کے دست صفت کا نتیجہ ہے مگر ایک طرف تو وہ انسانی فطرت اور دنیا کی عام حالت سے زیادہ موافقت رکھتا ہے اور دوسری طرف وہ اپنے اشکال ظاہری کی زیبائش اور اپنے تعلقات باہمی کی عظمت کے لحاظ سے زیادہ ممتاز ہے رومی سلطنت سے پر زور طور پر دل پانچڑتا ہے کہ وہ ایک زندہ شے ہے۔

اگر ہم رومی جمہوریہ کی اہم خصوصیتوں پر غور کریں تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اُس میں شاہی اور عمومی تنظیمات سے کوئی اعتدال پیدا ہو گیا ہے مگر اُس میں اعیانی خصوصیات ہر قدم پر غالب ہیں۔ یہ خصوصیت امور ذیل سے واضح ہوتی ہے: (۱) طبقات کے

اسپارٹا اور روم کے
نظام ہائے سلطنت
کا مقابلہ

رومی سلطنت کی
اعیانی خصوصیت
امور ذیل سے
ظاہر ہوتی ہے

باہمی تعلقات (۲) مجالس قومی (۳) سینات (۴) احکام کے عہدے ۔
 روما کے پٹریشی (اشرف) اہل اسپارٹا کی طرح ایک ہی نسل سے نہیں تھے بلکہ وہ لاطینی، بیسنی اور کسی قدر ایٹرکسکی نسلوں سے تھے۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے انگریزی امرا میں سکسونی اور نورمانی خون ملا ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل تھا جس نے اول ہی سے طبقہ امرا کی سختی اور مطلق العنانی کو روک دیا ہو گا۔ بعد کو اگرچہ سیاسی طاقت مدت تک انھیں کے ہاتھوں میں رہی مگر عوام کی تنظیم سے اس میں اعتدال پیدا ہو گیا تھا کیونکہ عوام خود ہی اپنے حکام مقرر کرتے تھے۔ ماسوا اسکے اسکا بھی اثر پڑا ہو گا کہ عوام میں سے جن لوگوں نے نیا نیا امارت کا درجہ حاصل کر لیا تھا حکومت میں ان کی شرکت بڑھتی جاتی تھی۔ انجام کار نئے اور پرانے امرا کے اتحاد سے ایک طبقہ ممتاز اشخاص Optimates کا پیدا ہو گیا، یہ طبقہ کبھی محدود نہیں تھا مگر رومی سلطنت میں اسے سب سے بڑی اہمیت حاصل تھی۔

جب تک جمہوریت قائم رہی، طبقہ امرا نے حکومت کی روایات اور معاملات عامرے اپنا گہرا تعلق قائم رکھا۔ شرافت، نسب، تعلیم، دولت، حکومت، مذہبی اور سیاسی سطوات تمام باتوں میں اس طبقہ کو امتیاز حاصل تھا۔ اسکے ساتھ ہی وہ عوام میں سے چیدہ شخص کو اپنے میں شامل کر کے نئی طاقت حاصل کرنے سے بھی کبھی نہیں رکا۔ اگرچہ اس طبقے کو اعلیٰ ترین اقتدار حاصل ہو گیا اور وہ اولاً بادشاہوں کا ہمسر اور بعد کو ان سے فائق ہو گیا مگر جس قوم سے وہ پیدا ہوا تھا اسکے ساتھ اس نے ہمیشہ پوری موافقت قائم رکھی۔

سیاسی تعلیم کے متعلق رومیوں کو بھی ویسا ہی خیال تھا جیسا اہل اسپارٹا کو تھا مگر وہ اسے خاندان کا کام سمجھتے تھے، سلطنت کا کام نہیں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ روما کے سیاسی خیالات میں خاندانی خصوصیات اور مختلف رجحانات پائے جاتے تھے۔ برخلاف اسکے اسپارٹا کی ایمانی حکومت کے اندر ہر شے یکساں تھی۔ روما کے بیشتر خاندان قدامت پرست (یا مستحفظ) تھے وہ اسی روش پر قائم رہے مگر ان میں سے بعضے خاندان آزادانہ اصول کی طرف بھی مائل تھے۔ اس صنف میں امرا کے اندر ولیری خاندان اور عوام میں پبلیلی اور پوسینی خاندانوں کے نام لئے جاسکتے ہیں (شاذ مستثنیات کو چھوڑ کر) خاندان کلاوڈی کو انگلستان کے فرقہ ٹوری کے مثل سمجھنا چاہئے۔

۱۱۱۔ طبقات کے
 باہمی تعلقات

(۲) قومی مجلس
مجلس قبائلی

روا کی تینوں مجلسوں میں سے سب سے کم عمر مجلس یعنی مجلس قبائلی کا انتظام جمہوری تھا، ابتداً ان کا منشاء یہ نہیں تھا کہ وہ حکومت میں کسی قسم کا حصہ لیں بلکہ انکی غرض صرف یہ تھی کہ عوام کی خواہشوں اور خیالوں کو ظاہر کر دیں اور امرائے زائد از ضرورت اقتدار پر ایک طرح کی روک کا کام دیں، لیکن بعد کو وہ نہ صرف قانون سازی میں شریک ہو گئے بلکہ قانون سازی کے تمام اختیارات کو انھوں نے غصب کر لیا، مگر جمہوریت کے آخری زمانے تک میں جب کہ اعیانی حکومت بہت تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہو رہی تھی اور بادشاہی کے قائم ہونے کا زمانہ قریب آتا جاتا تھا اسوقت بھی بہت مستثنیٰ صورتوں میں اور کسی بلند درجہ ٹریبون (Tribune) کے اثر سے یہ ہوتا کہ مجلس قبائلی فی الواقع قطعی اختیارات کو عمل میں لاتی ہو۔ عام طور پر عوامیت کی دخل دہی کے رُکے رہنے کا باعث کچھ تو یہ تھا کہ سینات کے وسیع اختیارات کا بہت لحاظ کیا جاتا تھا اور کچھ یہ کہ خود ٹریبون اُس میں روک پیدا کرتے تھے کیونکہ تجاویز کا پیش کرنا ٹریبون ہی کا کام تھا۔ اور دونوں ٹریبونوں میں سے ہر ایک دوسرے کے کام کو روک سکتا اور اُس میں دقت ڈال سکتا تھا۔ مجلس قبائلی کا معمولی کام یہ تھا کہ وہ بٹلایان کی خود سری اور انکے ضرورت سے بڑھے ہوئے اختیارات کو روکے۔

مجلس خاندانی
(عشائری)

مجلس خاندانی تمام اعیانی حیثیت رکھتی تھی مگر جمہوریت کے آخری زمانے میں اسکی اصلی اہمیت بالکل زائل ہو گئی تھی اور وہ محض برائے نام قائم تھی۔ وہ درحقیقت قدیم خاندانی امرائے مجلس تھی اور اسکی ترتیب خاندان پر مبنی تھی اور سینات اب اسکی انھیں خاندانوں کے سرگروہوں کی ایک کمیٹی (مجلس) تھی۔ عوام میں سے اگر کبھی کوئی شخص اس مجلس خاندانی میں شامل کیا جاتا تھا تو وہ پست تر حیثیت سے داخل ہوا تھا۔

مجلس صده
(سنٹوریہ)

ان مجلسوں میں سب سے زیادہ اہم مجلس عام صده (سنٹوریہ) تھی جس میں تمام قوم یکجا ہوتی تھی لیکن اسکی ترتیب ایسی رکھی گئی تھی کہ اعلیٰ طبقوں کو اس میں قطعی فوقیت حاصل رہتی تھی۔

(ب) ٹریبون جو ابتداً محض انجن عوام کا رکن ہوتا تھا وہ اس طرح پرغلا سیناتی حکومت کا آئندہ کار ہو گیا تھا کہ اگرچہ انھوں نے اسے اور دوسرے کاموں میں لگا دیا۔ انگریزی ترجمہ)

(الف) ملکیت کو بہت اہمیت دی جاتی تھی، صرف طبقہ اول کے درمیں سب سے زیادہ محصول دینے والے شامل تھے، انہی طبقے ہوتے تھے اور اگر ٹائٹوں کے اٹھارہ طبقے بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتے، تو انہیں کامل کثرت رائے حاصل ہو جاتی تھی۔ ملکیت کے اعتبار سے رائے دہی کی بھی نسبت باقی چار طبقوں میں بھی تھی، دوسرے طبقے کے چار آدمی تیسرے طبقے کے چھ، چوتھے طبقے کے بارہ اور پانچویں طبقے کے چوبیس آدمیوں کے برابر ہوتے تھے۔ وہ بے شمار اشخاص جو صاحب الماک نہیں تھے اور ان سے بھی زیادہ تعداد کے (Capitecensi) ایک سو ترانوے حلقوں میں سے ایک ہی طبقے کے اندر سب شامل کر دیے گئے اور اس طرح انہیں اس مجلس میں بہت کم اثر حاصل تھا جس میں صاحب دولت امرا کا اس قدر غلبہ تھا۔

(ب) شرافت نسب، اور پیشے کے اعزاز کا بھی لحاظ کیا جاتا تھا، چنانچہ ٹائٹوں کے اٹھارہ طبقے انہیں اصولوں پر قائم ہوئے تھے اور وہ سب سے اعلیٰ و اشرف قرار پا کر مجلس میں سب سے اول رکھے گئے تھے۔

(ج) جوانوں کے نسبت بوڑھوں کو رائے دہی کا حق زیادہ حاصل تھا کیونکہ ”بزرگوں“ کے طبقے میں موت کے طبعی قانون کے باعث ”اخروں“ کے طبقے کے بہ نسبت نصف تعداد رہ جاتی تھی حالانکہ رائے دینے میں دونوں طبقے برابر تھے۔

(د) اگر ہم طبقات کو نظر انداز کر دیں تو صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس کی تمام فی ہری حالت عمومیت کے مخالف تھی۔ شگون کا لیا جانا، تمام جماعت کی معینہ فوجی ترتیب، عالی مرتبت حکام کی صدارت، از روئے قاعدہ صرف حکام کو عوام کے مخاطب کرنے اور ان سے معاملت کرنا اختیار، یہ سب ایسے امور تھے جن سے اس مجلس میں ایک شکوہ اور اعتدال پیدا ہو جاتا تھا۔ یہ کوئی غیر طبعی امر نہیں تھا کہ روم کے باشندے یونان کی مجلس عامہ کی بے ترتیبی اور شور و غضب کو گونہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

قوم کی اس ایمانی تنظیم کو حقیقی قوانین کے بنانے اور اعلیٰ حکام کے انتخاب کا کام

عہ ”کاپیٹینی“ کا فعلی ترجمہ ہوگا ”سر رائے شمار کردہ“ اصطلاح میں روم کے ایسے شہریوں کو کہتے تھے جن میں کوئی خصوصیت نہ تھی اور جب کاغذ سر داری شمار کر لیا جاتا تھا ہم ان کو ”نفر“ کہہ سکتے ہیں۔ (اردو مترجم)

۳۔ سینات

تفویض تھا، سینات اپنی نوعیت اور فرائض کے اعتبار سے روما کی سلطنت میں ایک بہت ہی اہم تنظیم تھی۔ ابتداً اُس میں امیروں کے خاندان کے سرگروہ یعنی رؤسائے ملک شامل تھے اور سینات زیادہ تر خاندانی امرا کی نمائندگی کرتا تھا لیکن بعد میں یہ اُن مدبرین کی مجلس بن گیا جنہوں نے اعلیٰ عہدوں پر اپنی قابلیت کا ثبوت دیا تھا۔ سینات کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ شکون یعنی مقبوس روایات کے محفوظ رکھنے کے کام خاندانی امرا ہی کے ہاتھ میں رہے اور اس اعتبار سے اُنکی وقعت بھی قائم رہی مگر زمانہء بعد میں اُنکے بجائے عہدہ داروں کا ایک امیرانہ طبقہ قائم ہو گیا۔ روما کے بڑے بڑے حکام کو بادشاہ کا ہر تہہ بھجنا بیجا نہ ہو گا اور قیام زمانے کے لوگ خود اس سینات کو جس میں وہ لوگ شامل ہوتے تھے جنہوں نے اس عہدے کے کام انجام دیے تھے، بادشاہوں کی مجلس کہتے تھے۔ اس سے واضح ہے کہ اس سیاسی طبقہ اعیان کی وقت کس درجے پر تھی۔ سابق حکام میں سے ارکان سینات کی فہرست مرتب کرنے اور نا اہل لوگوں کے نام اس فہرست سے خارج کرنا مقررہ کام اختلاف کے نگراں ہوئی جنسیت سے محاسبوں کے سپرد ہوتا تھا۔ سینات کے ارکان جن عہدوں پر فائز رہ چکے ہوتے تھے انہیں عہدوں کے اعتبار سے اُنکی نشست ہوتی تھی اور اسی اعتبار سے وہ رائے دیتے تھے، چنانچہ مفصل، محاسب، امیر جیش (Praetor) میر تعصیب (aedile) خزانہ دار (Quaestor) اپنے اپنے سابق عہدوں کی ترتیب سے مجلس میں بیٹھتے تھے۔ اُنکی کارروائی اُن سخت قیود و ضوابط کے ساتھ عمل میں آتی تھی جو رومی حکومت کی مخصوص صفت تھی۔ مجلس کا افتتاح دعا اور قربانی سے ہوتا تھا، حکام وقت اُنکی کارروائی کے نگراں ہوتے تھے اور وہی تجاویز پیش کرتے اور رائے لیتے تھے اور بحث میں ٹریبون (Tribune) یا حکام در اندازی یا مداخلت نہیں کر سکتے تھے۔

سلطنت کے تمام اہم کام سینات میں یا تو ترتیب دئے جاتے یا فیصل ہوئے تھے دیوتاؤں کی پرستش اور اُنکے لئے قربانیوں اور تہواروں کے منائیکے قواعد بھی مجلس مرتب کرتی تھی۔ دوسری سلطنتوں اور غیر ملک کے سفیروں سے گفت و شنود کا کام بھی اسی مجلس انجام دیتی اور روما کے تمام اہم سیاسی معاملات کا انتظام کرتی تھی تو انین کے متعلق

اسکا حاکم اور اسکی منظوری بالعموم قطعی ہوتی تھی۔ انتظامی حد کے اندر خود اس کے فیصلے قانون کے بجائے سمجھے جاتے تھے۔ وہی تمام بالیات کا انتظام کرتی، حاصل کی منظوری دیتی، اور اخراجات کی نوعیت اور مقدار کا تعین کرتی تھی۔ فوجوں کا اجتماع اور انکی ترتیب اسی کے ہاتھ میں تھی۔ اسی طرح نائب قنصل اور نائب امیر پیش کو (جو صوبوں پر متعین کئے جاتے تھے اور جنہیں صوبے کے کل نظم و نسق کا اختیار دیا جاتا تھا) اختیارات اور ہدایات کا عطا کرنا بھی اسی مجلس کا کام تھا۔ سخت نازک موقعوں پر جمہوریت کو خطرے سے بچانے کے لئے جس قسم کے غیر محدود اختیارات کی ضرورت ہو، سینات وہ اختیارات قنصلوں کو دے سکتا تھا۔

اس امر میں بحث کی گنجائش ہو سکتی ہے کہ روما کے حکام کے عہدے شاہی حیثیت رکھتے تھے یا انسانی، مگر اس قدر یقینی ہے کہ انکی حیثیت عمومی نہیں تھی وہ جن خارجی رسوم و آداب میں گھرے ہوئے تھے، انہیں سے انکی حقیقت بیان تھی۔ انکے چنے کا سرخ کنارہ، انکی بائیں دانت چڑی ہوئی کرتی، انکے ایسٹروں اور دوستوں کا رہنا کارانہ دستہ، انکے حلوں میں مصاہرہ داروں کا چلنا، دیوتاؤں کے ساتھ انکا تعلق (جن سے انکے متعلق تقرر کے وقت شگون بھی لیا جاتا اور بعد میں برابر صلاح ہوتی رہتی تھی) یہ سب باتیں ان کی شاہی اور انسانی حیثیت کو ظاہر کرتی تھیں۔ حکام کا وسیع اور بجائے خود مطلق العنانی اقتدار قطعی طور پر شاہی حیثیت رکھتا تھا۔ جمہوری حیثیت صرف انکے عہدے کی مختصر میعاد اور انکے اختیار کے دو یا زیادہ مرتبہ حکام میں تقسیم ہونے سے ظاہر ہوتی تھی۔ ایک انسانی اصول جو روما کے نظام سلطنت میں خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہے وہ یہ ہے کہ ہر حاکم کو یہ جستار ہوتا تھا کہ اپنی منظوری کے ذریعے سے اپنے سے برابر یا اپنے سے کمتر درجے کے کسی حاکم کے فعل کو روک دے۔ اس اصول نے انکے غیر محدود اختیار کو معتدل کر دیا تھا مگر جب سلطنت کے نفع و فساد کے لئے کسی اختیار پر عمل کرنے کی حاجت ہوتی تو اس قاعدے سے اس عمل میں کوئی کمزوری نہیں واقع ہوتی تھی۔

حکام کا انتخاب تمام قوم کی طرف سے ہوتا تھا، مگر زیادہ اعلیٰ عہدوں کے انتخاب مجلس مدہ (سنٹوریہ) کے لئے محفوظ تھے اور اس مجلس میں صاحب دولت امر کا غلبہ تھا۔ اسکا انتظام حکام کے ہاتھ میں تھا اور شاہانوں نے اسے محدود کر دیا تھا۔

علاوہ اسکے اُس انتخاب میں صرف وہی لوگ لئے جاتے تھے جنکا تعلق قومی طبقہ اعمیانی سے ہوتا تھا اور اسکی وجہ یا تو یہ تھی کہ وہ کسی ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس سے انھیں شہرت عام طرفداروں کا وسیع گروہ اور عام مرجعہ حاصل ہو جاتا تھا! یہ وجہ تھی کہ انکی دولت بہت زیادہ تھی جس سے یہ لوگ اپنے صرف سے عام کھیل تماشے قائم کر کے عوام میں اثر پیدا کر لیتے تھے یا اسکی وجہ یہ ہوتی تھی کہ کامیاب سپہ سالار یا فصیح البیان مقرر ہونکی حیثیت سے انکو شہرت و عزت حاصل ہو جاتی تھی۔ جب اعلیٰ حکام کے عہدوں کے دروازے عوام کے لئے بھی کھل گئے تو پھر اس میں اعلیٰ خاندان امرا کی کوئی قید نہیں رہی لیکن شاذ و نادر مستثنیات کے سوا عملاً یہ عہدے اس وسیع سیاسی و معاشری طبقہ اعمیان ہی میں محدود رہتے تھے جس نے اب خاندانی طبقہ اعمیان کی جگہ لیلی تھی۔ ماسوا اسکے سنیات بھی انھیں لوگوں سے مرتب ہوتی تھی جو اس عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔

اس لئے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اپنے شاہی اور عمومی اجزاء کے باوجود روم کی جمہوریت حقیقتاً اعمیانی حکومت تھی اور ازمنہ وسطیٰ کی طرح سے یہ کسی خاص خاندان یا کسی خاص طبقے کی حکومت نہیں تھی بلکہ ایک قومی اعمیانی حکومت تھی جسکی عظمت و قوت کا مثل دنیا میں نہیں ہوا ہے۔

انیسواں باب

(ج) اعیانی حکومت پر بعض خیالات

(الف) مونٹسکیو نے خیال ظاہر کیا ہے کہ اعیانی حکومت کا اصول اعتدال ہے اور یہ صحیح ہے کہ اسکی باڈاری کے لئے اعتدال کی ضرورت ہے کیونکہ غور کرنے سے عیاں ہو جاتا ہے کہ رعایا کا گروہ کثیر اپنی تعداد اور جسمانی قوت میں حکمران جماعت سے بہت بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ عمومی حکومت میں خیال ہوتا ہے کہ اسے اختیار پر کوئی خارجی روک نہیں ہے اور اس وجہ سے اُس میں اپنے اختیار کے غیر معتدل استعمال کی تحریک پیدا ہو جاتی ہے لیکن اعیانی حکومت کے لئے یہ آسان نہیں ہے کہ وہ مخالفت اور انحراف کے خطرے سے آزاد ہو جائے اور اس لئے بالعموم اُسے یہ تسلیم رہتا ہے کہ اعتدال کے بغیر اسکی حالت غیر محفوظ رہیگی لہذا اسکی حکمت عملی علی العموم مستحفظانہ ہوتی ہے۔

لیکن اس سے اعیانی حکومت کا اصل اصول نہیں ظاہر ہوتا، حقیقت اعتدال کے بجائے اسکا اصل اصول حکمران طبقہ کی اخلاقی اور ذہنی قوت کی فوقیت ہے۔ صحیح معنی میں وہ حکومت اعیانی حکومت نہیں ہے جس میں وقتی بہترین افراد حکمران نہ ہوں بلکہ جب حکمران جماعت کے وہ اوصاف جن کے باعث انھیں یہ اقتدار حاصل ہوا تھا، تبدیل ہو جاتے ہیں ان کے اخلاق پست ہو جاتے ہیں اور ان میں کمزوری اور رکاکت آ جاتی ہے تو اعیانی حکومت کی اصلی طاقت زایل ہو جاتی ہے۔ اُس صورت میں بھی اُسے زوال ہو جاتا ہے جب ان حکمرانوں کے اعلیٰ طبقات تو اعلیٰ جاہل باقی رہیں مگر نیچے کے طبقات بھی ویسا ہی امتیاز حاصل کر لیں اور قدیم

(الف) ”روح القوانين“ (De L'Esprit des Lois) جلد سوم باب چہارم۔

۱۔ مونٹسکیو کا یہ دعویٰ کہ نیکوکاری عیونیت کا اصول ہے (تصنیف مذکورہ بالا جلد ۳ باب ۳) اُتنا قریں صحت نہیں ہے جتنا کہ ارسطو کا یہ قول کہ ”عیونیت کا اصول نیکوکاری ہے اور عیونیت کا اصول آزادی“ (”سیاسیات“ ۴، ۸، ۶)؛ مگر یہ بھی حقائق اور فیروں کے تجلیات میں دوسرا مشترک بہت کم ہو ا کرتی ہے۔

طبقہ اعیان اپنی غفلت یا نخواست کے باعث نیچے طبقے کے لوگوں کو اپنے میں شامل کر کے اپنی قوت کو مکمل و مضبوط نہ کرے۔ روم کے طبقہ اعیان کے حصول غفلت اور انگلستان کے طبقہ اعیان کے اثر و رفعت کی بقا کا باعث یہی ہے کہ یہ دونوں طبقے قومی زندگی کے دوش بدوش چلتے رہے اور نیچے طبقے کے لوگوں کو اپنے میں شامل کر کے نئی قوت حاصل کرتے رہے۔

ہر ایک اعیانی حکومت کی سخت ترین غلطی اسکی تغرد پسندی ہے، حکمران طبقے کے امتیازات کی بنا اسکے اوصاف پر ہوتی ہے مگر حصول حکومت کیلئے سو روٹی جانشینی کی حمایت میں وہ اکثر ذاتی اوصاف کو بالکل نظر انداز کر جاتا ہے، اس قسم کی محدود اعیانی حکومت ایک چھوٹے سے طبقے کے اندر قائم رہ سکتی ہے مگر جب اس کے تعلقات میں وسعت ہوتی ہے تو وہ اپنے کام کی انجام دہی کے ناقابل ہو جاتی ہے۔ اسپارٹا اور وٹس نے جب اپنی فتوحات کو پھیلا دیا تو وہ کمزور ہو گئے۔ اسپارٹا کے خاص باشندوں اور وٹس کے امرا دونوں میں سے کسی کی تعداد اور قوت اس درجے پر نہیں تھی کہ وہ وسیع ممالک پر حکومت کر سکیں اور باقی لوگ چونکہ سیاسی زندگی سے خارج تھے اور انکا کوئی اثر نہیں تھا اس لئے انکی جانب سے امداد و بہت کمزور ہوتی تھی بسطیح برن کی اعیانی حکومت بھی تباہ ہوئی۔ اسکے امرا کی حالت میں فی نفسہ کوئی ایسا امتزاج نہیں پیدا ہوا تھا بلکہ اس کی بربادی کی وجہ یہ ہوئی کہ اس نے شہر اور ملک کے متنازع افراد کو اپنے میں شامل نہیں کیا۔

اسکی تغرد پسندی
اکثر ہلک ثابت
ہوتی ہے

ہر ایک اعیانی حکومت کی بنا امتیازی صفات پر ہوتی ہے مگر کسی مخصوص صفت کا انتخاب قوم کی محض طبیعت اور حالت سے تعلق رکھتا ہے، اگر اسکا انحصار نسب پر ہے تو اس سے ایک خاندانی طبقہ اعیان پیدا ہو جاتا ہے اور اس میں نظام سلطنت پر خاندانوں یا طبقوں کے حقوق کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے۔ ازمنہ و سلی میں ایسا بہت ہوتا تھا۔ تربیت و تعلیم کو رنج رکھنے سے قیسوں یا عاملوں کی حکومت اعیانی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر حکمران کینے عمر کی شرط ہوتی ہے تو اس سے سمرین یا شیوخ کی حکومت قائم ہو جاتی ہے، اگر فوجی امتیاز کا لحاظ ہوتا ہے تو پہلوگروں کی حکومت برپا ہو جاتی ہے، اگر جائیداد و منقولہ یا غیر منقولہ کا خیال کیا جاتا ہے تو زمینداروں یا سرمایہ داروں کی حکومت ہو یا ہو جاتی ہے جسے اہل ثروت

اعیانی حکومت کی
مختلف صورتیں

کی حکومت کہنا چاہئے اور جسے سیر و حکومت کی تمام صورتوں میں سب سے زیادہ قابل نفرت قرار دیتا ہے۔ ممتاز اشخاص (Optimate) کی حکومت، فرقہ وندی کی رکھتی ہے، کیونکہ اس میں متعدد وظائف اور اشخاص شامل ہوتے ہیں سیاسی نظام کی بنیاد پر عہدہ داروں کی حکومت اعیانی ہی قائم ہو سکتی ہے مگر جیسا کہ ازسری میں ہوا اس حالت کو زیادہ بقاء نہیں ہوتی۔ یہ رفتہ رفتہ صورتوں کی بنیاد پر ہے اور وسیع خانہ دانی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ایسا بھی اکثر ہوتا ہے کہ اس حکومت اعیانی کے لئے مختلف صفت کی ضرورت سمجھی جاتی ہے اور یہ اس حکومت کے مقابلے میں زیادہ قوی ہوتی ہے جس میں صرف ایک صفت کی حاجت ہوتی ہے کیونکہ آخر الذکر کو ان تمام طبقات و اشخاص کی مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے جن میں اعیانی حیثیت کے لئے کوئی کوئی نظریہ استحقاق موجود ہوتا ہے۔

عام خصوصیات
۱۔ خیالی
شان و شوکت

اعیانی حکومت کو یہ شوق ہوتا ہے کہ وہ اپنے فائدہ کو نمایاں کرے۔ اس لئے وہ سلطنت کی فخری شان و شوکت اور علوئے مرتبت کے انہار کی خواہش رکھتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ وہ رعایا کی طرف سے دلی محبت کا خیال ترک کر دے مگر وہ اپنی وقعت کے ترک کئے جانے کی روادار نہیں ہو سکتی، پس وہ فخری شان و شوکت کے انہار سے یہ اثر پسند کرنا چاہتی ہے کہ اُسکے سیاسی اشکال کو امتیاز حاصل ہو جائے اور اُسکا اقتدار قوی ہو جائے۔ عمومیت کے مقابلے میں اعیانی حکومت کی یہ ایک نمایاں فوریات ہے، کیونکہ عمومیت میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ حکام اور سلطنت دونوں پست ہو کر عام سطح پر جاتے ہیں۔ لیکن اس فائدے کے ساتھ ہی یہ خطرہ بھی لگا ہوا ہے کہ مبادا اس کے اس طبقات اپنی منزلت کا اندازہ کرنے میں حد اعتدال سے بڑھ جائیں اور رعایا کے مورد و مورد کی طرف بہ قدر ضرورت توجہ نہ کریں۔ اعیانی حکومت نے اکثر نیچے چلنے والوں کے ساتھ درشت اور ظالمانہ برتاؤ کیا ہے اور یہ برتاؤ اس وجہ سے ابھی ناقابل برداشت ہو جاتا ہے کہ اس میں مسلم و ستم کے ساتھ تحقیق بھی شامل ہوتی ہے۔ اہل اسپارٹا نے اپنے نیم غلاموں کے ساتھ جو برتاؤ کیا اور روم کے امراء نے جتنے عوام کے ذمہ داروں پر جو مظالم کئے۔ انگریز زمینداروں نے آئر لینڈ کے کاشتکاروں پر جو ستم توڑے اور انگریزی حکام نے ہندوستان کے باشندوں اور جینوں کے جیساں جباری

انہار کی سختی

و قہاری سے مسکرائی کی وہ سب اس بیان کے شاہد عادل ہیں۔

جس طرح عمومیت بالعموم زاید از ضرورت متلون اور تغیر پذیر ہوتی ہے، اُسی طرح اعیانی حکومت احمد سے زیادہ اٹل اور لکیر کی فقیر ہوتی ہے۔ عمومیت یہ سمجھ کر کہ اسکی طاقت کی کوئی حد نہیں ہے اکثر اپنے قیام و دوام کے ضروری شرائط کو فراموش کر دیتی ہے، اعیانی حکومت جو کہ اپنے قیام کی فکر سے غافل نہیں ہوتی اس لئے وہ اکثر اس غلط خیال میں پڑ جاتی ہے کہ افسانہ کا بہترین وسیلہ قیام طریقوں پر مضبوطی سے جمار ہنا اور ہر قسم کے تغیر کو سختی کے ساتھ خارج کرتے رہتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عمومیت کی نسبت اعیانی حکومت نے طریق استحفاظ کی قابلیت کا زیادہ اظہار کیا ہے اور اسکی مدت قیام نسبتاً زیادہ رہی ہے۔ وہ بیباکانہ سیاسی تجربوں سے بچی رہتی، پھونک پھونک کر احتیاط سے قدم رکھتی اور جب اسکو کوئی واقعی خطرہ پیش آتا ہے اُسی وقت یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی قطعی قوت کا اظہار کرتی اور کچھ دیر کیلئے شاہی کی خصوصیات اختیار کر لیتی ہے۔ اگر حکم کے اندر رہے تو یہ ایک عمدہ صفت ہے اور نتیجہ ہے حفاظت ذاتی کے طبعی احساس کا لیکن یہی صفت جب تجاوز کر جائے تو وہ ایک غلطی بن جاتی ہے۔ اس استحفاظی خیال کا اظہار اس طرح بھی ہوتا ہے کہ حکومت کی تمام تنظیمات میں موروثیت کو اصل الاصول بنا دینے کا طبعی میلان پیدا ہو جاتا ہے، از سر نو طبعی میں، جب کہ تمام یورپ پر اعیانی رنگ چڑھا ہوا تھا، یہ میلان خصوصیت کے ساتھ نمایاں نظر آتا ہے۔ خاندان ہون اشٹادوفن کے زوال کے بعد جرمانی شہنشاہی تک حقیقتاً اس اعیانی رنگ میں آگئی حالانکہ ابست رائے اسکی بنیاد شاہی کے خیال پر ہوئی تھی۔ یہ خود منصب شہنشاہی تو

(۳) احمد سے زیادہ سختی

۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۲ء میں
چہ اٹھارہ ہستی

لے یہ امر فرانسیسی مصنف ہودین کو اچھی طرح معلوم تھا اور اُس نے اسکی تشبیح بھی کی ہے گراؤ کے بعد سے جرمانی مورخین نے یہی بہتر سمجھا کہ اُسے فراموش کر دیں۔ (دیکھو مصنف مذکور کی تصنیف "جمہوریہ"، جلد ۲ باب ۶) فلپ کیمنٹس نے اپنے تجاویز اصلاح کی بنیاد خیال پر رکھی ہے کہ جرمانیا ایک اعیانی سلطنت ہے۔ ہفندورف نے شہنشاہی کو بادشاہی اور اعیانی طریقوں سے مخلوط قرار دیا ہے مگر اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ اعیانی حکومت کا میلان غالب ہے (اب کہ فی شخص اس امر سے انکار نہیں کرنا کہ خاندان ہون اشٹادوفن کے زوال کے بعد سے شہنشاہی نے اعیانی حیثیت اختیار کر لی تھی اور بادشاہ محض نمائش کے لئے تھا۔ انھیں دلائل سے پہلی کو یہ بھی یقین کر لینا چاہئے تھا) انھیں تان کی بادشاہت بھی محض نمائشی ہے۔ انگریزی مسترجم۔

موروثی نہیں ہوا۔ مگر اسکا انتخاب موروثی انتخاب کنندوں کے ذریعے سے ہونے لگا۔ شہنشاہ کا رتبہ اگرچہ نہایت بلند تھا مگر اسے اختیار برائے نام ہی تھا۔ کسی اہم امر کا فیصلہ کرنے قبل اسے ڈائٹ سے مشورہ لینا ضروری تھا۔ انتخابی حلقے تمام قوانین تیار کرتے تھے اور سب سے اول ڈائٹ میں ہی رائے دیتے تھے۔ دوسرے درجے میں رائے دی کا حق ان حکمرانوں کو حاصل تھا جو ابتدائے سلطنت کے عہدہ دار تھے مگر کسی یکسی طرح سے انھوں نے اپنے کو موروثی رئیس بنالیا تھا۔ حکمرانوں کے بعد شہنشاہی شہروں کا درجہ تھا مگر ان شہروں کی حکومت بالعموم چند قابو یافتہ امیروں کے ہاتھ میں ہوتی تھی اور اس طرح ان شہروں کی نیابت حقیقت اعیانی نوعیت کی تھی۔ حکومت کا کام شہنشاہ اور ڈائٹ مکر انجام دیتے تھے۔ صاحب جامداد امر کی جاگیر کی خود مختاری سے مرکزی حکومت کو وقت اور پریشانی کا سامنا رہتا تھا۔ ازمنہ وسطی کے ترم سیاسی اور مذہبی تعلقات میں موروثی جانشینی کی جانب اعیانی میلان ظاہر و باہر ہے۔ ہر شے اسی کے اثر میں تھی۔ جاگیر شہنشاہی ہمدے اور اعزاز، تمام عدالتی اختیارات (جس میں کاؤنٹ، بیلٹ، تحصیل شاہی، صاحب جامداد امر اور مقامی اسپیکر داخل تھے)۔ سپہگری اور درباری خدمات شہروں اور دباؤں کے ادنیٰ و اعلیٰ ملازمین اور کاشتکاروں کے جاگیردارانہ قبضے سب کے سب اسی موروثیت کے زیر اثر تھے۔

برخلاف اسکے زمانہ جدید میں موروثیت سے بحیثیت سیاسی اصول کے قطعی نفرت پائی جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں کچھ نہ کچھ صداقت موجود ہے مگر ان کا اتہا تک پہنچانا بھی غلطی ہے ہمارے اس زمانے میں جدید ترقی اور نئی ضروریات کی تکمیل میں موروثیت کے سخت اصول سے جو رکاوٹیں پیش آئی ہیں، ان کے خلاف کوشش کرنا بالکل سوجا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ شخصی قابلیت کے بے روک ٹوک تسلیم کیے جانیکا وعدہ کیا جائے اور اس امر پر زور دیا جائے کہ جن سیاسی عہدوں کیلئے شخصی قابلیت اور اطاعت تمام درکار ہے وہ موروثی قواعد کے تابع نہ کیئے جائیں۔ نہ انھیں خاص خاص خاندانوں کی ملک سمجھنا چاہئے لیکن یہ ایک غلطی ہے کہ موروثی جانشینی سے اضنی و حال میں جو تعلق قائم ہے وہ توڑ دیا جائے۔ یہ سچی غلطی ہے کہ جہاں مستحکم روایات کے برقرار رکھنے کی ضرورت ہو، وہاں لامحالہ اور بکثرت تغیر و تبدل کیا جائے یا بے ضرورت وہ حالات بدل دئے جائیں جو سلطنت کے لئے مضبوط ستونوں کا کام دیتے ہیں اور جو زبردست اخلاقی مقاصد اور طاقتوں کو مستقبل کی طرف

منتقل کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنا حقیقت ریت پر عمارت بنانا ہے۔ یہ قوم و سلطنت دونوں کی زندگی کو تباہ کرنا ہے کیونکہ انکی زندگی ہرنسل کے ساتھ بدلتی نہیں رہتی بلکہ صدیوں تک مسلسل چلی جاتی ہے۔

۱۔ ایمینت پسند انگلستان میں اب تک سیاسی موروثیت کی اہمیت پوری طرح مسلم ہے۔ برک کے خیالات دربارہ انقلاب فرانس "Reflection on the Reus lutim in france" میں انکی رائے دیکھنا چاہئے۔ وہ لکھتا ہے کہ آپ دیکھیں گے کہ "منشورِ غلم" کے وقت سے "اعلانِ حقوق" کے وقت تک ہمارے نظامِ سلطنت کی یکساں روش یہ رہی ہے کہ ہماری آزادی کے حق اور دعوئے کو اس اصول پر نہیں کرے کہ وہ ہمارے آبا و اجداد سے ہمیں حاصل ہوئے ہیں اور ہم اپنے اخلاف کے لئے انھیں چھوڑ جائیں گے گویا یہ آزادی اس سلطنت کے باشندوں کا خاص حق ہے اور اسے دوسرے زیادہ عام یا سابقہ حق سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ ہمارے دہاں بادشاہت موروثی ہے، امارت موروثی ہے، دارالعوام اور قوم کے امتیازات حقوق رائے دہی سب مدت رائے دراز سے بزرگوں سے وراثتاً چلے آ رہے ہیں۔ اس میں جدت وہی لوگ نکلتے ہیں جن کی کوئی ذاتی غرض ہوتی ہے یا وہ تنگ خیال ہوسکتے ہیں۔ جو لوگ پیچھے ہٹ کر اسلاف پر نظر نہیں کرتے وہ اپنے اخلاف کا بھی خیال نہ کریں گے۔ علاوہ اسکے انگلستان کے لوگ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ موروثیت کے خیال میں استغناء و انتقال دونوں مضمر ہیں اور اسکے ساتھ ہی ارتقاء کا اصول اس سے مناج نہیں ہے۔ اس میں نئی چیزوں کے حاصل کرنیکی کامل آزادی ہے جو کچھ حاصل ہو جائے اسے وہ محفوظ کر لیتا ہے۔ ہمارا سیاسی نظام دنیا کی ترتیب اور بقائے عالم کے طریق سے بالکل متحد و متفق ہے اور وہ ایک دائمی شے ہے جسکا جزائے تغیر بدلتے رہتے ہیں مگر اسکی ہیئت مجموعی بحال رہتی ہے۔ اس میں نہایت دائمی کے ساتھ نسل انسانی کے پراسرار اصول قائم کر دیئے گئے ہیں جس سے وہ بحیثیت مجموعی کسی ایک وقت میں نہ بدلتا ہوتا ہے نہ اذیت نہ جوان، مگر اس میں غلطاء، زوال، تجدید اور ترقی کا ایک دائمی سلسلہ جاری رہتا ہے پس اس طرح سلطنت میں فطرت کے اصول کو قائم رکھنے سے ہم جس امر کو ترقی دیتے ہیں وہ بالکل نیا نہیں ہوتا اور جس چیز کو قائم رکھتے ہیں وہ بالکل ازکار رفتہ نہیں ہوسکتی۔ موروثی طریق کے پسند کر نیکے باعث ہم نے اپنے نظامِ سلطنت میں ختم کلا متعلق پیدا کر دیا اور اپنے ملک کے نظامِ سلطنت کو اپنے عزیز ترین غائی روابط سے وابستہ کر دیا ہے۔ اپنے سیاسی قوانین سے ہم اپنے اہل خاندان کی کسی محبت ہو گئی ہے ہم اپنی سلطنت اپنے گھر اپنے قبر کا اور اپنی عبادت گاہ کو ایک دوسرے سے جدا نہیں سمجھتے کیساں جنسِ دل کے ساتھ یہ نظر کرتے ہیں اور ایک کی خوبیوں کا عکس دوسرے پر پڑتا ہے۔"

(۵) قانون کا
اجتماع
ایمانی حکومت کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے قیام کی حفاظت کے خیال سے خارجی نظم و ترتیب کو برقرار رکھے۔ اس خیال سے وہ قانون کی محافظت اور قانونی صورتوں کو ٹھیک ٹھیک قائم رکھنے کی بھی کوشش کرتی ہے۔ جب تک کہ اپنی ہستی کے معرض خطر میں ہونے سے اُسے کوئی اشتعال نہ ہو جائے، اُس وقت تک ایمانی حکومت بجا طور پر یہ فکر کر سکتی ہے کہ اُس نے دایا اور خود اپنے ارکان دونوں کے معاملے میں عمومی حکومت کی بہ نسبت زیادہ مداخلت گستری سے کام لیا ہے۔ اسے محض اتفاقی امر نہیں کہہ سکتے کہ علم قانون کا شوق و مناسب سے زیادہ ایک ایسی قوم کے ہاتھ سے ہوا جو ایمانی حکومت کی اس قدر دلدادہ تھی، یعنی رومیوں کے ہاتھ سے۔ قانون کی ترقی کے لئے اہل دین نے جو سخت مگر غیر جانبدارانہ طریقہ اختیار کیا وہ بھی تعریف کے قابل ہے۔ یہی حال برن کے قانون کا تھا اور انگریزوں میں پاس قانون کا جیسا زبردست احساس موجود ہے وہ ظاہر ہے اور یہ قوم بھی ایمانی حکومت کی پسند کرنوالی ہے، ازمنہ وسطیٰ میں خود سلطنت کی حکمت عملی تک کو قانونی فیصلے اور اسکی تعمیل کی ظاہری حیثیت دیکھائی تھی۔

زمانہ محال کے خیالات، سلطنت کے ایمانی حیثیت کے اس قدر خلاف ہیں کہ انیسویں صدی کے وسط سے پہلے ہی ایمانی سلطنت کی کوئی مثال باقی نہیں رہ سکی۔ قدیم روم کی ایمانی حکومت اولاً عمومییت کے عروج سے شکست ہوئی اور اُس کے بعد جا کر شہنشاہی نے اُسے پامال کیا۔ ازمنہ وسطیٰ میں ایتالیا اور جرمانیا کی ایمانی حکومتیں دلیان ملک کی ترقی پذیر طاقتوں کے سامنے پست ہوئیں اور آخر الامر اہل شہر کی مخالفت نے انہیں غارت کر دیا۔ اُسکے اب اس زمانے میں ایمانی طبقات کو قوم کے ایک میز فرد کی حیثیت سے درمیانی درجہ حاصل ہے، شاہی اقتدار نہیں حاصل ہے۔ ہر جگہ یہ طبقات شاہی یا عمومییت کے تابع ہیں اور اگر یہ طبقات شاہی میں اعتدال اور عمومییت میں رخصت و خود داری پیدا کر سکتے ہیں مگر وہ سلطنت میں خود حکومت کا دعوے نہیں کر سکتے۔

ایمانی حکومت
کو زوال

سوال باب

سلطنت کی عمومی صورتیں

(الف) عمومیت بلا واسطہ (قدیمی عمومیت)

عمومیت کی نسبت زمانہ قدیم اور زمانہ حال کے خیالات میں بہت بڑا فرق ہے۔ زمانہ قدیم میں اسکے معنی عوام یا آزاد اور مساوی الحقوق باشندگان شہر کی حکمرانی کے تھے۔ قدما میں لوگ دنیاوی امور کی ابتداء سلطنت سے کرتے تھے اور سیاسی حکمرانی کو سب میں برابر تقسیم کر کے آزادی کو محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ اب اس زمانے کے لوگ شخصی آزادی سے ابتداء کر کے کوشش یہ کرتے تھے کہ حتی الوسع اپنی ذاتی آزادی سلطنت کے حوالے نہ کریں۔ اتحاد اسکاں سلطنت کی اطاعت کم کریں۔ قدیم عمومیت خواہ قطعی ہو یا اسکی حالت میں کچھ اعتدال پیدا کر دیا گیا ہو مگر ہر حال میں وہ بلا واسطہ ہوتی تھی۔ موجودہ زمانے کی عمومیت بالعموم نیابتی ہوتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اول الذکر کا قیام صرف ایک چھوٹی سی سلطنت میں ممکن ہے، برخلاف اسکے ثانی الذکر ایک بڑی قوم اور اسکے وسیع ممالک میں بھی رائج ہو سکتی ہے۔

اہل یونان چونکہ متعدد چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں منقسم تھے، اس لئے انھوں نے اپنے سیاسی ذوق کا اطمینان اسی میں دیکھا کہ اپنے وہاں عمومیت قائم کریں۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یونان کی قدیم بادشاہتوں اور نام نہاد اعیانی حکومتوں میں بھی کچھ نہ کچھ عمومیت کا اثر پایا جاتا ہے اور موجودہ زمانے کی شاہی اور رومانی اعیانی حکومت کے مقابلے میں انکا مابہ الامتیاز یہی تھا۔ اور یہ بھی خیال رکھنے کی بات ہے کہ یونان کے بڑے بڑے فلسفی ایجنز کی قطعی عمومیت کو ناپسند کرتے تھے مگر وہ سلطنت کی بہترین صورت معتدل عمومیت ہی کو سمجھتے تھے اور اسے آئینی حکومت کہتے تھے۔

تقدیر جدید
عمومیت کا فرق

یونان کی عمومیت

لے اس رائے میں زنونون، اطلالون، اور اسلوب متفق ہیں۔

ایکلیسیا
نظامِ سلطنت

عمومیت کے انتہائی رنگ کا جلوہ ایتھنز میں نظر آیا اور ایتھنز کے نظامِ سلطنت سے بہتر کسی حقیقت کا پتہ کہیں اور نہیں چل سکتا۔ کسی اور سلطنت میں قوم کی حکومت کو یہ وسعت نہیں حاصل تھی۔ قریب قریب تمام اہم معاملات ایتھنز میں (مجلس عام) کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ اس کے اجلاس بہت کثرت سے ہوتے تھے۔ اکثر ہفتے میں ایک مرتبہ اس کا انعقاد ہوا کرتا تھا اگر ہم یہ خیال نہ رکھیں کہ معمولی کاروبار اور پیشے کے کام آزاد اہل شہر نہیں انجام دیتے تھے بلکہ بشمار غلاموں سے کام لے جاتے تھے تو باوی النظر میں یہ ناممکن معلوم ہوگا کہ مجلس عام کے اجلاس اس کثرت سے ہوتے ہوں۔

ایکلیسیا
(مجلس عام)

مختلف النوع عوام کی ظاہری نمایندگی ایتھنز میں (مجلس عام) میں ہوتی تھی اس میں بیس برس سے زائد عمر کے تمام شہری شریک ہوتے تھے۔ صرف وہ لوگ اس سے خارج تھے جو کسی وجہ سے اپنے ملکی حقوق کھو بیٹھتے تھے۔ اس مجلس میں اہل ایتھنز اپنے کو سلطنت کا مالک سمجھتے تھے۔ ہر فرد مجموعی اقتدار اعلیٰ کا ایک جزو ہوتا تھا۔ عمومیت کی اس مخصوص علامت نے کہ کثرت رائے فرمانروائی کرے اور ہر شہری کا حصہ اقتدار اعلیٰ میں ہو یہاں پوری ترقی حاصل کر لی تھی۔ ہر شخص کو تقریر کرینا آزادانہ حق حاصل تھا اور رسولوں کے وقت میں کسری کے جو امتیازات قائم کئے گئے تھے وہ بھی دوسرے قیود کے مانند باہر بھکر خارج کر دئے گئے تھے۔ مقرروں کو اپنا زور فصاحت دکھانے کے لئے پورا موقع حاصل تھا اور اکثر اس سے سحر کا سا اثر پیدا ہو جاتا تھا۔ یہ بڑی ہی خوش قسمتی تھی کہ پیری کلیس کے سبب طویل القدر بدر اہل رائے ہونیکے ساتھ زبان آور بھی تھے۔ زیادہ تر ایسا ہوتا تھا کہ چالاک اور جریں لقاؤ عوام کے جذبات کو بھڑکا کر ان پر قابو حاصل کر لیتے تھے۔ زمانہ موجودہ کی سلطنتوں میں فصاحت کا وہ اثر نہیں ہے جو اس زمانے میں تھا۔ اس وقت سامعین سب ایک جگہ جمع ہوتے تھے اور ان پر جس زور کا اثر پڑ سکتا تھا وہ اخباروں کے ذریعہ سے منتشر پڑھنے والوں پر نہیں پڑتا۔ مفہوم کی آواز اور اس کے انداز بیان سے بھی اس کے لفظوں میں خاص مفہوم اور زور آ جاتا تھا اور سامعین کی تحسین و آفرین سے مباحثے میں ایک زبردست حرکت پیدا ہو جاتی تھی۔ ہمارے زمانے میں پارلیمنٹ کی تقریروں کا یہ اثر نہیں ہوتا جسکی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ مجلس نسبتاً چھوٹی اور منتخب ہوتی ہیں اور کچھ یہ کہ ان کے اختیار زیادہ محدود ہیں۔

اس کے اختیارات

”ایتھنز“ کے اختیارات سلطنت پر از سر تا پای محیط تھے۔ رسولوں نے ان اختیارات کو

حکام کے انتخاب حکومت کی نگرانی اور قوانین کے متعلق مشورہ دینے تک محدود رکھا تھا مگر مقننوں کے اثر میں اگر عوام بہت جلد ان حدود سے تجاوز کر گئے۔ عام قوم کے فیصلے ایکسٹریما انڈان بارشاہ کے فیصلے کی طرح قطعی ہوتے تھے۔ خود مختار بادشاہ کی طرح عوام بھی جو اپنے حقے حکم دیدیتے تھے، چاہے وہ قانون کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ قانون کا زوال، حقیقت مجلس مقننین سے تعلق رکھتا تھا مگر عملاً قوانین کا آخری تصدیق انگلیسیا ہی کے مباحثوں اور رایوں سے ہوتا تھا۔ حقیقت میں مجلس مقننین ان بے شمار مجلسوں میں سے ایک مجلس کی جو ہر خاص و عام سے الگ تھی۔ یہ مجلس عام خود ہی حکومت کے تمام امور و معاملات کا فیصلہ کرتی تھی۔ وہی سفر کا اقدار کرتی اور انھیں ہدایات دیتی تھی۔ وہی غیر ملک کے اعلیٰوں کے بیانات سننے اور جنگ و صلح کا تصفیہ کرتی۔ وہی سپہ سالاروں کا انتخاب کرتی اور سپاہیوں کی تنخواہوں کا تعین کرتی حتیٰ کہ یہ بھی پہلے سے قرار دیدیا کرتی تھی کہ جنگ کا کیا اسلوب اختیار کیا جاوے۔ مفتوح شہروں اور ملکوں کی قسمت کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ نئے دیوتاؤں کا قبول کرنا مذہبی تہواروں اور نئے کامنوں کا انتظام کرنا شہریت کے حقوق و امتیازات کا تعین کرنا سب اُسی کے ہاتھ میں تھا، ہر پینتیسویں اچھیسویں روز سلطنت کے داخل و خارج کی کیفیت اُسکے سامنے پیش ہوتی تھی، وہ محصول لگاتی، غیر ملکوں کے لئے محصول کی رسم کا تعین کرتی، دارالضرب کا انتظام کرتی اور لوگوں سے آزادانہ امداد کا مطالبہ کرتی تھی، مندرجہ اور عام عمارتوں، سڑکوں، دیواروں اور جہازوں کے بنانے کے لئے منجھ مشہوری لازمی تھی۔ وہ یہاں تک کر سکتی تھی کہ سرکاری آمدنی سے بیج کے طور پر لوگوں کو ٹیکس میں جا بیٹھے لئے رقوم دیدے۔ اُسکے اختیارات معمولی عدالتی کارروائیوں پر حاوی نہیں تھے مگر مستثنیٰ حالات میں جب جرم قانون کے تحت میں نہیں آتا تھا یا جب اہم حالات کے اعتبار سے غیر معمولی کارروائیوں کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ مجرمانہ الزامات پر بحث کرتی، تاوان کا تعین کرتی اور ملزم کے جرم کا بھی تصفیہ کرتی تھی۔ جو خرابیاں اُس میں عمومیت کے درجہ عروج کے بعد بہت ہی جلد پیدا ہو گئیں اُن سے ناجائز عدالتی کارروائیوں کو اور بھی بڑھتی ہو گئی۔

ایک خصوصیت

مجلس کے اندر جو اہل شہر موجود ہوتے تھے انہیں کی کثرت رائے قطعی ہوتی تھی۔ قوم کے ادنیٰ لمبقتوں تک کی ذہنی قوت میں ایسی ترقی ہو گئی تھی کہ قدیم یا جدید کسی سلطنت میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ وہ ایسے کلوس اور سوفوکلیس کے افسانہ نائے غم کو بخوبی سمجھ سکتے تھے۔ دس ہوسٹینس کی تقریروں کو سنتے تھے، تجارت اور شہنشاہی اور ہر قسم کے کاروبار کے منافع کثیر نے انہیں دولت مند بنا دیا تھا لیکن اس قابلیت کے لوگوں میں بھی زیادہ حصہ ایسا تھا کہ وہ زبان آوروں کی پرفتن ترغیبات کو روک نہیں سکتا تھا اور اپنے اختیار کو وائائی اور انصاف سے عمل میں لانے سے گریز کر جاتا تھا۔ زیادہ معزز اور دولت مند شہری جو تعداد میں قلیل تھے ان کے ساتھ زیادتی اور بدسلوکی ہوتی تھی چنانچہ زینوفون اپنے وطن کے متعلق لکھتا ہے کہ عموماً یہ لازمی نتیجہ ہے کہ بدکردار اچھے رہیں اور نیکو کار پریشان ہوں۔

سیات

سولون کے نظام حکومت کا منشا یہ تھا کہ اگلیسیا کے اختیارات ایک حد تک "بوسے" (یعنی مجلس شیوخ) کے تابع ہوں۔ سولون نے اس آخر الذکر مجلس کی بنا قوم کے چار قبائل کے اعیانی انتظام کے موافق رکھی تھی۔ قبائل کے ارکان چار طبقوں میں تقسیم کئے گئے تھے۔ اور ان میں سے اعلیٰ اور دولت مند طبقے کے حقوق و فرائض زیادہ قرار دئے گئے تھے تاکہ سیات میں دولت اور تعلیم کو غلبہ حاصل رہے لیکن کلائیسٹینس کے وقت (۶۰۰ ق م) سے مجلس روز بروز عوام کے اثر میں زیادہ آتی گئی۔ پانچ سو ارکان کی سیات عوام الناس کی ایک چھوٹی سی مجلس بن گئی جس کے ارکان کے تقرریں دولت و تعلیم کا مطلق لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔

لے زینوفون نے اپنی کتاب "جمہوریت" میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ اہل آیتھنز اچھے اور بڑے لوگوں پر تیز نگری پوری صلاحیت رکھتے ہیں مگر وہ بدوں کو ترجیح دیتے اور اچھوں سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ یقین یہ کیا جاتا ہے کہ دشمن واحد کی خوبی عوام کے لئے مفید نہیں بلکہ ضرر ہوتی ہے اور یہاں مقصود سلطنت کا عمدہ انتظام نہیں ہے بلکہ عوام کی آزادی اور اقتدار سے غرض ہے (لیکن یاد رہے کہ اب یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ یہ کتاب زینوفون کی طرف منسوب کر دی گئی ہے جو حقیقت میں اس کی تصنیف نہیں ہے اور عموماً یہ کیفرانہ ہے کہ اس سے ایک موافق استدلال کی طور پر نقل کرنا مناسب نہیں یہ کتاب ۳۵۰ ق م کے کچھ قبل از یسوع مسیح لکھی گئی تھی یعنی زینوفون کے مرنے سے ۶۹ برس پہلے)

ارکان کا انتخاب تک نہیں ہوتا تھا بلکہ قرعہ اندازی سے لوگ لیلیٹے جاتے اور اُسکے بعد پھر پچاس پچاس کے دس حصوں میں تقسیم کئے جاتے تھے اور ہر ایک حصہ باری باری چھتیسویں روز کاموں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیتا تھا۔ اس قسم کی جماعت عوام پر کوئی آزادانہ اختیار عمل میں نہیں لاسکتی تھی کیونکہ عوام ہی اُسے کبھی آسمان پر چڑھا جاتے تھے اور کبھی زمین پر گرادیتے تھے۔ اُسکا کام صرف اتنا تھا کہ مجلس عام میں پیش کر نیکے لئے کام تجویز کرے اور عوام الناس کو حکومت خود اختیاری کے کام میں مدد دے۔

”آرخون“ اولاً اُن اعلیٰ حکام کو کہتے تھے جو ایو پریدوں میں سے ہوتے تھے اور سولون کے نظام سلطنت کے موافق اُنکا انتخاب سب سے دولت مند طبقے سے ہوتا تھا اگرچہ عمومیت کو ترقی ہوئی تو نسب و دولت کی جگہ گروہ بندی نے لیلی اور آرخون عوام کے خادم اور بے شمار عدالتوں کے بے اختیار صدر رہ گئے۔

عدالتوں کا انتظام بھی عمومی طریق پر ہوتا تھا اور وہ بھی ایک طرح کی عام مجلس ہو گئی تھیں۔ جن میں چھ ہزار سے کم اہل رائے شریک نہیں ہوتے تھے۔ ہر معاملے کا فیصلہ اُسکی اہمیت کے اعتبار سے ہوتا تھا۔ کسی میں سوال رائے ہوتے تھے اور کسی میں ہزار عدالت کے منافع اور اثر سے فائدہ اٹھانے کا خیال ایک مرض مزمن کی طرح تمام اہل ایتھنز میں سرایت کر گیا تھا۔ اُس سے ایک نہایت مذموم پیشہ مفت خوری کا نکل آیا تھا۔ ارسو فائیس نے دیسپس میں اسکی جو خوب لکھی ہے۔ عوام کے منتخب کردہ حکام اپنے کو عوام کی حکومت کا حامی اور ترقی دینے والا خیال کرتے تھے اور بے غرضانہ انصاف کر نیکے بجائے وہ فریقانہ مناقشات و اغراض میں پھنس جاتے تھے، اور عدالتیں خانگی اور سرکاری سحر کے آرائی کا ڈنگل بن جاتی تھیں۔ ان مفت خوروں اور جھوٹ کی رشوت ستانی اور تباہ کاری بہت جلد ترقی کر گئی اور عوام کو آزادانہ خود داری نے انصاف کو بالکل غارت کر دیا۔

اکیسواں باب

(ب) بلا واسطہ عمومیت پر تنقید

بلا واسطہ عمومیت کی کیفیت مع اُسکے عیب و صواب کے ذہین و فطین اہل ایتھنز کی تاریخ میں روشن حرفوں میں لکھی ہوئی ہمیشہ کے لئے موجود ہے۔

عمومیت اقتدار کے مقابلے میں آزادی کو ترجیح دیتی ہے۔ اہل ایتھنز کی جرئت پسندی اُنکے فنون لطیفہ کے کمال کا باعث تھی جسکی داد آج تک دی جا رہی ہے لیکن عمومیت جس طرح سب کو آزادی دیتی ہے، اُسی طرح حکومت میں بھی سب کو شامل کرتی ہے۔ اہل ملک کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ بذات خاص حکومت کریں، یعنی حکومت کیلئے بہت وسیع قومی مجلس قائم کریں لیکن یہ صرف چھوٹی سلطنتوں اور ایسی قوموں میں ممکن ہے جنہیں سلطنت کے باقاعدہ کاروبار میں وقت صرف کر نیکے لئے کافی فرصت ہو اور پھر اس سے یہ لازم آتا ہے کہ یا تو طرز معاشرت اور کاروبار میں نہایت سادگی ہو جیسا کہ کھستان کی چھوٹی قوموں میں ہوتا ہے یا ایک ایسا مزدوری پیشہ گروہ موجود ہو جسے شہریت کے حقوق میں دخل نہ ہو بہت کم قوم میں بلا واسطہ عمومیت ہمیشہ بے اصل ہوتی ہے، کیونکہ جب تک آبادی میں غلاموں کا ایک طبقہ نہ ہو اس قسم کی عمومیت قائم نہیں رہ سکتی۔

ان وسیع مجالس عامہ میں بہت آسانی سے اپنے غیر محدود اختیار کا خیال پیدا ہو جاتا ہے جس سے ہر طرح کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں اور اکثر مطلق العنانہ حرص و طمع کو قساوت و حق کی جگہ لجاتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہر شخص فرداً فرداً اپنی جگہ پر ایسا نڈر اور دور اندیش ہو مگر مجلس میں جا کر عام جوش میں سب بہہ جاتے ہیں اور جس تجویز کو ذرا دیر پہلے وہ بلا پس پیش مسترد کر دیتے اس کو فوراً جوش میں وہ اُسی کو منظور کر لیتے ہیں۔ مقررین صرف عوام کے جوش کو ابھار کر اپنا اثر پیدا کرتے ہیں اور جب ایک مرتبہ یہ طوفان برپا ہو جاتا ہے تو پھر اُسکی زیادتی کو روکنے کے لئے کسی قسم کی شرم و حیا بھی کام نہیں دیتی بلکہ

لے برگ نے اس خیال کو نہایت خوبی سے اپنے "خیالات در بارہ انقلاب فرانس" میں ظاہر کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ

قوی اخلاق
کی اہمیت

پس اگر عمومیت کا ایک عمدہ نظام سلطنت بنا نامہ تو اسکے لئے ضروری ہے کہ ملک کے حصہ غالب میں سیاسی اہمیت و قابلیت موجود ہو۔ انھیں اخلاق اور تعلیم دونوں میں اعلیٰ مرتبہ حاصل کرنا چاہئے۔ لیکن ایٹھنز کی تاریخ اس تجربے کے خلاف متنبہ کر رہی ہے۔ ایک ایسی قوم میں جس نے اس قدر نمایاں ذہنی ترقی حاصل کر لی تھی جس نے رعیت اور خطرے کے وقتوں میں اپنے اخلاقی کام کو جاری رکھا، اُس میں بھی خالص جمہوریت بہت تھوڑی ہی مدت تک ابتدائے اور تباہی سے محفوظ رہ سکی۔ جب ایٹھنز کی قوت و ثروت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچا ہوا تھا اُس وقت بھی اُسکی اس عظمت کا باعث قوم کی حکومت نہیں تھی بلکہ عملاً اُس حکومت کا ترک کر دینا اور اسے ایک شخص واحد کو تفویض کر دینا اسکا سبب تھا۔ پیری کلیس کے زمانے کے متعلق تھیوکیدس دیکھتا ہے کہ ایٹھنز میں عمومیت محض نام کو تھی ورنہ واصل وہاں ایک شخص کی حکومت تھی جو شہریوں میں سب سے برتر تھا۔

عوام جب ایک مرتبہ اُسے اقتدار سے سرت ہو گئے تو پھر وہ اپنی خوبیوں کو برقرار رکھ سکتے۔ جب تک لوگوں کو خدا کی گرفت کا خوف، رسم و رواج کے قیود کا لحاظ اور بہترین انخاص کے اقتدار کی وقعت کا خیال رہتا ہے اُسی وقت تک سلطنت کی عمومی صورتیں قائم رہ سکتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ عمومی سلطنت میں معاملات ملکی میں دخل رکھنے سے عوام کی سطح بلند ہو جاتی ہے اور دوسری سلطنتوں کے باشندوں کے مقابلے میں انھیں اپنے قوت کے نشوونما کا زیادہ احساس ہوتا ہے اور اس اعتبار سے

(تھیوکیدس) حاشیہ صفحہ گزشتہ جہاں عوام کو مطلق اور بے قید اختیار حاصل ہوتا ہے وہاں لوگوں کو اپنی قوت پر بہت زیادہ اعتماد ہوتا ہے کیونکہ اُنکے اعتماد کی بنا قوی ہوتی ہے۔ زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ وہ خود ہی اپنے اذکار ہوتے ہیں وہ اپنے مقصود اصلی سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے وہ دنیا کی سب سے بڑی قوت یعنی عزت و وقت کے احساس کی ذمہ داری کو کم محسوس کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے عام کاموں میں ہر شخص پر فرداً فرداً نامی کا جواب پڑے گا وہ بہت کم ہو گا۔ اختیار کے غلط استعمال کو زیادہ کی تعداد سے زیادہ ہوگی اُسی قدر اُسے عام کا اثر کم ہو گا۔ انفرادی فتنے کو پسند کرنا ان کی فطرت پسندی کی عام حکم رکھتا ہے۔ اسلئے ایک کمال عمومیت دنیا میں سب سے زیادہ بد شرم فتنے، اور بد شرم سب سے زیادہ مذہبی ہے۔

وہ دوسروں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ اُن میں ہر فرد مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیشے کی زندگی تک محدود نہ رہے بلکہ کچھ زیادہ وسیع النظری اختیار کرے اور تاریخ کے اہم قوانین اور قوم کی مجموعی زندگی سے آشنا ہو جائے، لیکن جب غیر محدود طاقت کا خیال غالب آجاتا ہے تو ہیبت و وحشت کا احساس بہت جلد غائب ہو جاتا ہے اور چونکہ سلطنتوں کی دوسری قسموں کے مانند عوبیت میں حاکم و محکوم کا امتیاز نہیں ہوتا اس لئے اختیارات بہت آسانی سے خراب کر دیئے جاتے ہیں۔ عوام بُری خواہشات کے تابع ہو جاتے ہیں، اپنے سے مسز و برتر قلیل التعداد جماعت سے انھیں حسد ہو جاتا ہے اور وہ اُسے پریشان کرنے لگتے ہیں کیونکہ اُس جماعت کا وجود بجائے خود عامۃ الناس کے لئے ایک دائمی مصلحت و لعنت کا باعث ہوتا ہے۔ عوام الناس کی بدترین صفات اپنا اثر دکھانے لگتی ہیں۔ غرور، حرص و ہوا کے آزادانہ اظہار، کثیر التعداد و بیکار تفریبات کی خواہش و مساوت قلبی کا زور ہو جاتا ہے۔ جمہور جس قدر خود اپنے اوپر حکمرانی کو سہل کرتے جاتے ہیں اُسی قدر دوسروں پر اُنکی حکمرانی زیادہ تکلیف دہ ہوتی جاتی ہے۔ فرقہ بندیوں قائم ہو جاتی ہیں اور آپس کی منافرت جب الوطنی سے زیادہ ہو جاتی ہے اور اُنکی مہلک جنگ و جدل میں ملک تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ مسلسل تفریبات سے سلطنت خطرے میں پڑ جاتی ہے اور کسی ایک حالت پر استقلال نہ ہونیکے باعث تباہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سلطنت ایٹھنزی کی عظمت اگرچہ بہت ہی تابناک تھی مگر غیبت و شوکت بہت ہی تھوڑے دنوں تک قائم رہی اور اسکے بعد ایک ایسے طویل الخطا کا زمانہ آیا جس سے ایٹھنز پھر بحصل نہ سکا۔

ہر عمومی سلطنت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُس میں سادات کی محبت پائی جاتی ہے۔ ایٹھنزی میں یہ اصول جس انتہائی حد تک بلا خیال کسی اور امر کے ترقی کر گیا تھا اسکی مثال زمانہ مابعد کی کسی عمومی سلطنت میں نہیں ملتی۔ جہاں تک ممکن تھا اہل شہر خود ہی براہ راست سلطنت کے کام انجام دیتے تھے کیونکہ نیابت کے طریقے میں منتخب شدہ نمائندوں

۱۔ ایٹھنزی کی تاریخ کا غلیبہ انسان و درکلاس یھنیس (سلسلہ ق۔ م) کے وقت سے شروع ہوا۔ جس نے خاص عمومی قسائم کی تھی اور پیری کلیس (سلسلہ ق۔ م) کے انتقال پر ختم ہوا پس اس طرح یہ دور صرف ۸۲ برس رہا۔

کچھ نہ کچھ سبقت و فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔ جب کسی عہدے پر یا سنیات میں چند اشخاص کے مقصد رکنیکی ضرورت ہوتی تھی تو اہل ایتھنز انتخاب کے بجائے قرعہ اندازی کے مجہول طریقے کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ انتخاب کی حالت میں ذہنی اور اخلاقی خوبیوں کا خیال کرنا پڑتا تھا۔ حکام میں جلد جلد تغیر و تبدل ہوتا رہتا تھا تاکہ مدت اختیار کی طوالت کے باعث انھیں عوام پر برتری نہ حاصل ہو جائے۔ یہ حکام کے وجود سے اطاعت لازم آتی تھی اور یہ امر فی نفسہ عمومی اصول مساوات کے خلاف تھا۔ پس اگر اس عدم مساوات سے چارہ نہیں تھا تو یہ ضروری تھا کہ جہاں تک ہو سکے قرعہ اندازی اور کثرت تغیرات کے ذریعے سے وہ اثر گھٹا دیا جائے۔ عمومیت جس مساوات کو پسند کرتی ہے وہ تعداد کی مساوات ہے، اس کا اصول موضوعہ یہ نہیں ہے کہ ہر شخص کی حیثیت اس کے حسب لیاقت ہو بلکہ ایسا ایک ویسا دوسرا ہے۔

نفی بد

عمومی مساوات کا دوسرا نتیجہ نفی بد ہے۔ یونانیوں میں اس کی کارروائی عملانیہ ہوتی تھی اور اسے لوگ قریب قریب عزت کے مرادف سمجھتے تھے مگر موجودہ سلطنتوں میں اگرچہ عملاتی طریقہ رائج ہے مگر باضابطہ تسلیم نہیں کیا جاتا اور علی العموم ذات کی نظر سے دیکھا جاتا ہے جس نظام سلطنت کو اپنی بقا کی خواہش ہو اس کے لئے لازمی ہے کہ اسے یہ اختیار حاصل ہو کہ جن اشخاص کو وہ اپنے وجود کے منافی سمجھے انھیں خارج کر دے۔ عمومیت پر یہ الزام نہ لگانا چاہئے کہ وہ اپنے ایسے شہریوں کو جلا وطن کر دیتی ہے جن کی شخصی فوقیت عام مساوات کیلئے خطرناک ہوتی ہے جیسا کہ ایتھنز میں ہوا کرتا تھا مگر عمومیت کے فوائد میں یہ امر ضرور بحث طلب ہے کہ وہ عوام الناس کی ذلت پسندیوں کو تو برداشت کر لیتی ہے مگر مخصوص افراد کی بلندی و برتری کی تاب نہیں لاسکتی۔

خلاصہ یہ کہ جس قسم کی بلا واسطہ جمہوریت یونان میں قائم تھی وہ صرف چھوٹی سلطنتوں خاص کر زراعت پیشہ اور گلہ بان قوم کے لئے موزوں ہے کیونکہ ان کے طرز زندگی میں

بلا واسطہ جمہوریت
صرف چھوٹی اور
غیر ترقی یافتہ سلطنت
میں قائم رہ سکتی ہے

۱۔ ارسطو "سیاسیات" جلد ۶: ۸۷۱ -

۲۔ " " جلد ۵: ۱۰۷ اور جلد ۶: ۷۱۱ -

۳۔ ارسطو نے اس رائے کو شرح و بسط سے بیان کیا ہے ("سیاسیات" جلد ۶: ۲، اور آگے)

قدیم رسم و رواج کی سادگی باقی رہتی ہے۔ ایک اعلیٰ تمدن اور وسیع تعلقات کی قوم میں اُس سے ایک فوری جوش پیدا ہو جاتا ہے مگر وہ بہت جلد ناکافی اور خضر ثابت ہو جاتا ہے۔ ایک صورت میں عمومیت فطرت کے موافق اور با استدال معلوم ہوتی ہے، دوسری صورت میں وہ اوباشی و زیاں کاری کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں وہ جب آزادی کی توقع دلاتی ہے وہ تمام اعلیٰ صفات پر ایک ناروا زیادتی اور عوام الناس کی بے قید و حشیانہ حرص و ہوس کا آلہ بن جاتی ہے۔ ترقی پذیر تمدن جب ایک مرتبہ اپنے اختلافات اور متباہن حالات کو قائم کر دیتا ہے تو پھر مساوات کے تمام دعوے محض دروغ بانی اور فساد معلوم ہوتے ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یونان کے تجربے سے اس کی تصدیق ہو چکی تھی، اور زمانہ مابعد میں سوئٹزرلینڈ میں بھی اس خیال کی ہمت ثابت ہو گئی۔

پانچواں باب

(ج) نیابتی عمویت اور موجودہ زمانہ کی جمہوریت

اس زمانے میں جو واسطہ عمویت صرف نہایت ہی مستثنیٰ اور بہت ہی مفید صورت حالات میں قائم رہ سکی ہے اور اس پر بھی اتنے قدر کی نسبت اسکی حالت میں بہت زیادہ اعتدال رہا ہے۔ سوئزرلینڈ کے بعض کومستانی صوبوں میں اب تک اسکا وجود پایا جاتا ہے۔ مجلس عامہ میاں میں ایک مرتبہ جمع ہوتی ہے اور اس چھوٹی سی جمہوریہ کے عہدوں اور اعزازوں کی تقسیم ہاتھوں کے شمار سے ہوتی ہے، بالعموم یہ اعزاز سب سے زیادہ مسز خانہ دلاؤں کو دیے جاتے ہیں۔ یہ مجلس عام ان قوانین کو بھی منظور کرتی ہے جنہیں کونسلیں (مجلس خاص) تیار کرتی ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی عمویات جن پر یورپی زندگی کی عام رفتار کا اثر بہت ہی کم پڑا ہے وہ اس اعتبار سے عزت و توقیر کی مستحق ہیں کہ انکی پانچ سو برس کی تاریخ بہت ہی مردانہ واقعات سے بھری ہوئی ہے اور نظم و زیادتی کا دھبہ ان پر کم لگا ہے۔ نیز ان کے رسم و رواج کی سادگی اور باشعوروں کا امن اور فراخیابی سب کی سب سے زیادہ وقعت ہے، لیکن ادھر قریب زمانے میں ان میں یہ میلان پیدا ہو گیا ہے کہ جس قسم کی نیابتی صورت حکومت، سوئزرلینڈ کے دوسرے صوبوں اور مالک متحدہ امریکہ میں رائج ہے ویسی ہی حکومت اپنے یہاں بھی رائج کرں۔ چنانچہ ۱۸۹۳ء اور ۱۸۹۴ء کی فرانسیسی تحریکات نے نیابتی نظام سلطنت کے قائم کرینکی کوشش کی تھی اور موجودہ زمانے میں عمویت کی حامی جماعتوں میں ہر جگہ یہ خیال غالب ہے۔ پس موجودہ زمانے کی عمویت کو نیابتی عمویت کہنا بالکل بجا ہے۔

جس طرح آئینی بادشاہی کی ابتدا انگلستان سے ہوئی، اسی طرح نیابتی عمویت یا انشاؤ اہل امریکہ جمہوریت کی موجودہ صورت کانشو ونا شمالی امریکہ میں ہوا۔ یہ امر خیال کرنا چاہیے کہ موجودہ زمانے کی سلطنت کی یہ دونوں خاص باتیں انگریزوں کی ہیں

یہ واسطہ حکومت عام
کہ بدلتے نیابتی حکومت
کا قائم ہونا

۱۔ نیابتی عمویت کی
ابتدا امریکہ سے ہوئی

قوم ہی کی سیاسی طبائی کا نتیجہ ہیں۔

اسکی پر اسونکے
اسباب

ایک جدید عمومی نظام سلطنت کی ابتدا اور اسکے نشو و نما کیلئے متعدد اسباب جمع ہو گئے تھے۔ ایک حد تک اس ملک کی وسعت بھی اسکا سبب تھی، جہاں زمین کو قابل کاشت بنانے کے قبل سخت محنت کی ضرورت تھی۔ ابتدائی تاریخ سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وسیع ممالک عمومیت کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ بالعموم بڑے بڑے بادشاہوں کی جانب سے اُن ملکوں میں نئی آبادیاں قائم کی گئی تھیں اور آباد کار سختی کے ساتھ باورداشت کے تابع رکھے گئے تھے۔ جنوبی امریکہ میں بھی نئی آباد کاریاں قائم ہوئی تھیں اور زمین کے وسیع قطعات پر کم تعداد آبادی کو پھیلا کر انھیں قابل پیداوار بنا دیا تھا مگر باوجود اس کے وہاں ایک مدت دراز تک کوئی عمومی قسائم نہیں ہوئی۔ انکی راہ میں زمین کی صنعتیت نہیں بلکہ باشندوں کی خصلت حاصل تھی، مگر پھر بھی وہ ملک کی وسیع زمین پر لوری آزادی کے ساتھ آسانی سے اپنے میں بھلائے اور انھیں جو سخت مقابلہ فطرت کے ساتھ کرنا پڑا اُس نے انکی قوت عمل اور نئے ارادے کی نشنگی کو راغب کرتے کر دیا۔

نیدرلینڈ
(دیکھئے صفحہ ۴۸۰)

انگریز آباد کار اپنے قدیم وطن سے خود اختیاری حکومت کی قدر شناسی، آزادی کا احساس اور قانون کی الفت اپنے ساتھ لائے تھے۔ نئی دنیا میں انھیں جاگیر داروں اور امیروں کے انتظامات کے ظلم و جور سے بھی نجات حاصل ہو گئی۔ ان آباد کاروں میں اول روز سے کامل مساوات کا علم رآمد جاری ہو گیا تھا۔ چور زمین جو نیدرلینڈ میں اگر آباد ہوئے تھے وہ انگلستان کے طبقہ متوسط سے تعلق رکھتے تھے۔ انکا مذہبی عقیدہ ہر قسم کی کلیسائی حکومت کے خلاف تھا۔ انکی خواہش یہ تھی کہ وہ عیسائیوں کی ایک عالمگیر قسیمیست میں شریک ہوں، وہ ایک دوسرے کو آپس میں بھائی بھائی سمجھتے تھے۔ وہ بحر اطلس کے دوسری طرف اس غرض سے گئے تھے کہ وہ ہتھی کلیسا اور اُس کی حمایتی سلطنت کے ظلم و ستم سے نجات پائیں اور اپنی مذہبی اور اپنی سیاسی آزادی کو برقرار رکھیں۔ انکے خیالات عمومیت کے ساتھ ہی مذہبی حکومت کی طرف بھی مائل تھے۔ وہ انگلستان کی شاہی اور پارلیمانی حکومت سے منحرف نہیں تھے مگر وہ یہ چاہتے تھے کہ وہ حکومت کی براہ راست قادی سے آزاد ہو جائیں۔ ”آبائے زائیں“ نے پلائی تھ میں انکر جس پہلے معاہدہ باہمی مورخہ ۱۶۲۰ء پر دستخط کئے تھے اُس سے شمالی امریکہ کی

عمومیت کے بدو آغاز پر روشنی پڑتی ہے۔ اُنکے الفاظ یہ تھے: بسم اللہ آمین۔ ہم جنگے نام نیچے لکھے ہوئے ہیں اور جو بادشاہ جلال تاج شاہ جیمس کی وفادار رعایا ہیں، ہم خدا کی عظمت عیسوی مذہب کی ترقی اور اپنے بادشاہ اور ملک کی عزت کے خیال سے یہ سفر اختیار کر کے وجینیا کے شمالی حصوں میں یہ پہلی نوآبادی قائم کرنے آئے ہیں۔ ہم اپنی اس تحریر کے ذریعے سے خدا کے عروج اور ایک دوسرے کے روبرو باہر مستحکم عہد کرتے اور خود کو ایک ملکی جماعت قرار دیتے ہیں تاکہ ہم اپنا نظم و نسق اپنی بقا کا انتظام بہتر طریق سے کر سکیں۔ اور اپنے مذکورہ بالا مقاصد کو پورا کر سکیں اور اسی عہد کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً اس قسم کے منصفانہ اور مساویانہ قوانین و ضوابط وضع کریں نظام سلطنت بنائیں اور عہدے قائم کریں جو اس نوآبادی کی عام جماعت کی بہبود کیلئے سب سے زیادہ موزوں و مناسب معلوم ہوں۔ اور ہم ان قوانین و ضوابط وغیرہ کی ہر طرح کی مناسب فرمانبرداری و اطاعت کا وعدہ کرتے ہیں، روڈ ٹیکنیٹ، نیو ہیوس، کوئٹیکٹ اور پراؤٹس میں جو لوگ اول اول ترک وطن کر کے آئے انھوں نے بھی اسی قسم کی کارروائی اختیار کی۔ پس اس طرح اُن جماعتوں نے جو نیو انگلینڈ کے حلقہ نوآبادی پر مشتمل ہیں اور جن میں سب کا سرگروہ میساچوسٹ تھا، انھوں نے حکومت کی ایک ایسی صورت اختیار کی جو آزاد اشخاص کا مشترکہ کام معلوم ہوتی تھی۔

جنوبی حلقے کے حالات اس سے بالکل مختلف تھے۔ اسی حلقے کو اولاً ورجینیا کہتے تھے مگر بعد کو ورجینیا کا لفظ اس حلقے کی سب سے زیادہ اہم نوآبادی کے لئے مختص ہو گیا تھا۔ وہاں اسقفی کلیسا اور اسکا اعلیٰ نظام معاش تسلیم کر لیا گیا۔ اگرچہ آباد کار زیادہ تر متوسط۔ حلقے سے تعلق رکھتے تھے مگر اس آباد کاری کے انتظام میں مذہبی اغراض کے بجائے اقتصادی اغراض زیادہ غالب تھے۔ علاوہ اسکے جماعت اعیان کے بہت سے ارکان ایسے تھے جو وہاں بڑی بڑی جائیدادوں کے مالک تھے۔ بعد کو طلب معاش میں بہت سے سفیروں نے یہاں آکر آبادی کو بڑھا دیا اور لندن کی پولس نے بحریوں اور اوباشوں کو بھی وہاں منتقل کرنا شروع کر دیا۔

تاہم ورجینیا تک میں بھی یہ نہوسکا کہ انگلستان کے مانند اعلیٰ نظام سلطنت قائم ہو جاتا اور شیفسبری کی خواہش پر لاک نے ۱۶۶۹ء میں کیرولینا کے لئے

ورجینیا

کیرولینا

اس قسم کا نظام سلطنت تیار کر نیکی جو یادگار کوشش کی وہ بالکل ہی اکام رہی آباد کار اسے گوارا نہیں کرتے تھے کہ جس صورت میں وہ کہیں نہ کہیں خود آزادانہ زمین کے مالک ہو سکتے تھے اُس حالت میں وہ رئیسوں اور زمینداروں کی مستاجری قبول کریں چنانچہ ۱۷۹۳ء میں لاک کا نظام سلطنت منسوخ کر دیا گیا۔ شمالی اور جنوبی دونوں نوآبادیوں میں چونکہ آباد کار بوجہ بُعد مسافت کے بذات خاص جمع نہیں ہو سکتے تھے اس لئے انھوں نے نیابتی مجلسیں قائم کر دیں، جیسے قائم مقاموں کا انتخاب آزادانہ ہوتا تھا اور یہی مجلسیں نوآبادی کی خود مختاری کو قائم رکھتیں اور اسکے نظم و نسق کی نگرانی کرتی تھیں۔ اس انتظام کی ابتدا کا سراغ گزشتہ زمانے میں ۱۷۱۹ء تک ملتا ہے اور بہت جلد یہی طریقہ تمام نوآبادیوں میں رائج ہو گیا۔

نیو یارک
اور پنسلوانیا

وسطی حلقے میں غیر ملکی عناصر بہت کثرت کے ساتھ مل گئے تھے لہٰذا نیو یارک (جو اولاً نیو ایسٹر دم کہلاتا تھا) اور پنسلوانیا میں اسکا زیادہ غلبہ تھا اگر وہاں بھی انگریزی قوم کے اثر سے اصولاً وہی نظام سلطنت اختیار کیا گیا جو اور جگہ اختیار کیا گیا تھا جن امور میں سب نوآبادیاں یکساں تھیں وہ حسب ذیل ہیں :-

نوآبادیوں کے
نظامات سلطنت
کے مشترک عناصر

(الف) انگریزی قانون جس میں زمیندارانہ اور جاگیر دارانہ مستاجری کا دخل نہ ہوا اقتصادی اصول کی بنیاد زمین کی آزاد ملکیت پر ہو۔

(ب) مرتبے اور حقوق میں کامل مساوات ہو اور انگلستان میں جس قسم کی اعیانی حکومت اسوقت تک قائم تھی اسکا کوئی اثر نہ ہو، لیکن نسل کے نمایاں فرق سے اس مساوات میں خلل آگیا تھا "رڈ انڈین" یعنی ملک کے اصلی باشندے سفید رنگ لوگوں کے ہم پایہ نہیں قرار دیئے گئے تھے نہ انھیں حکومت میں کچھ حصہ دیا گیا۔ جیشیوں کی حالت اس سے بہت گری ہوئی تھی۔ یہ جیشی افریقہ سے لائے ہوئے غلاموں کی اولاد تھے۔ بالعموم وہ سفید رنگ آباد کاروں کی ملک تھے اور اگر شاؤنادر وہ آزاد ہی بھی حاصل کر لیتے تھے تو بھی شہریت کے سیاسی حقوق انھیں ہرگز نہ گزرتے تھے۔

(ج) سلطنت کی مدد کے بجائے خود اپنے بزور بازو پر اعتماد کرنیکی مستقل عادت۔ اس کی کیفیت ابتدائی آباد کاری میں خوب واضح نظر آتی ہے جب کہ ہمسائے ٹکڑیوں کے مکان بنانے میں ایک دوسری کی مدد کرتے تھے۔

(۵) قومی مدرسوں کے ذریعے قوم کی عام تعلیم۔ اس قسم کے مدرسے بہت ہی ابتدائی زمانے میں دیہاتیوں نے اپنے بچوں کے لئے قائم کر لیے تھے اور بہت سی نوآبادیوں میں انکی حاضری لازمی قرار پائی تھی۔

(۶) دیہات کا آزادانہ انتظام اور صوبوں کا خود مختارانہ نظم و نسق۔

(۷) عہدہ داروں کی مختصر تعداد۔ اُن میں سب سے زیادہ اہم عہدہ کل نوآبادیوں کے گورنر (والی) کا ہوتا تھا۔ یہ والی اجازت یافتہ (chartered) نوآبادیوں میں آباد کاروں کی طرف سے منتخب ہوتے تھے اور زمیندارانہ نوآبادیوں میں زمینداروں کی طرف سے نامزد ہوتے تھے اور شاہی نوآبادیوں میں انگریزی حکومت کی طرف سے اُنکا تقرر ہوتا تھا۔ اسکے بعد دوسرا درجہ ججوں کے صدر کا ہوتا تھا۔ ان دونوں عہدہ داروں کو اہل ملک کے نمائندوں کے ساتھ ملکر کام کرنا ہوتا تھا۔ والی کے ساتھ اہل کاؤنسل ہوتے تھے اور ججوں کے ساتھ بیج (juror) : ناٹھان امن کو انگلستان میں بادشاہ معززین میں سے نامزد کرتا تھا مگر امریکہ میں ہمیشہ زمین کے آزاد کاشتکاری ناظم امن ہوتے تھے۔

(۸) مستقل فوج شاید ہی کہیں ہوتی ہو۔ اسکے بجائے عیشیا (محافظ ملک فوج) ہو کر تھی۔

(۹) ایک دار البعثین کا وجود جسے ہر نوآبادی میں آزاد اشخاص منتخب کرتے تھے۔ یہ دار البعثین قوانین کے بنانے میں سنیات کے ساتھ ملکر کام کرتا تھا مگر محاصل کی منظوری اور نظم و نسق کی نگرانی میں وہ تنہا کارروائی کرتا تھا۔

(۱۰) عہدوں کے لئے مختصر مدت کا رواج تاکہ کثرت کے ساتھ تغیر کا موقع مل سکے۔

(۱۱) سب سے آخر میں اخباروں کی آزادی کا تدریجی نشوونما اور تمام اہل کی آزادی تھی۔

انہیں بنیادوں پر ہر ایک نوآبادی میں انگلستان سے تقریبی ہونے سے بہت قبل ایک خود مختارانہ نیابتی نظام حکومت قائم ہو گیا تھا اور اولا خود تاج برطانیہ کی طرف سے اُنکی بہت افزائی ہوئی تھی۔ پس جب مسئلہ میں اعلان آزادی نے انگلستان کے بادشاہ اور پارلیمنٹ سے تعلقات منقطع کر دیئے تو نئی جمہوریتیں فوراً مکمل حالت میں قائم ہو گئیں۔ مسئلہ میں اتحاد کا متحدہ نظام سلطنت صرف اتنا ہی تھا کہ یہی صوبہ وار حکومتوں کا طریقہ وسیع پیمانے پر اُس جمہوری سلطنت پر عائد کر دیا جائے جو اسوقت قائم ہو گئی تھی۔

فرانسیسیوں نے ۱۷۹۳ء اور ۱۷۹۵ء میں اور پھر ۱۸۰۱ء میں سلطنت کی

اتحاد

۲۔ فرانس

اس نئی صورت کی نقل کی مگر انھیں مستقل کامیابی نہیں حاصل ہوئی۔ فرانسیسیوں نے دیوانہ وار جوش کے ساتھ آزادی، مساوات و اخوت کے سیاسی خیالات کو قبول کیا مگر ان کے روایات شاہانہ تھے اور ان کے رسم و رواج میں جمہوریت کا اثر بہت ہی خفیف تھا۔ انکا میلان ہمیشہ سے یہ رہا کہ خود اپنی مدد کر نیکیے بجائے سلطنت سے مدد کے خواہاں ہوں۔ سلطنت کی شان و شوکت اور اس کے اقتدار کو آئینی زندگی کی پابندی قانون اور بنیادیں محنت پر ترجیح دیں۔ فرانسیسیوں کا مرکزیت کا رجحان جمہوریت کے بجائے ہمیشہ شاہی طرف زیادہ رہا ہے (الف)

فرانس کے برخلاف امریکہ کی نیابتی حکومت سوئزرلینڈ کو راس آگئی، حالانکہ فرانسیسیوں ہی کے توسط سے یہ طریق حکومت و مال پہنچا تھا۔

سوئزرلینڈ میں بڑے بڑے صوبوں میں اعیانی طریق چسکرانی ہوتی تھی۔ برن، فرامبرگ، سولیر اور لیونزرن وغیرہ میں امریکا کا ایک، موروثی طبقہ تھا اور زیورچ، بازل، شاف ہاوزن وغیرہ میں اہل شہر کی مجلسیں تھیں جو اپنے میں کسی اور کو دخل نہیں کرتی تھیں لیکن عوام کی آزادی قائم تھی اور اسی پر صوبائی انتظام کی بنیاد رکھی گئی تھی اور جمہوریت ہی قوم کا سیاسی منتہائے خیال تھی اور اسکا اثر عوام کے عادات و اخلاق میں راسخ ہو گیا تھا۔ نہ کوئی مستقل فوج تھی اور نہ دائمی عہدہ دار تھے۔ سوئزرلینڈ کی خود مختاری حکمرانوں اور امیروں سے کشمکش کے بعد حاصل ہوئی تھی پس جدید خیالات کے موافق ملکی آزادی کو تمام طبقات اور کل ملک پر رعیت دیدی گئی اور امر اور ذی اثر اہل شہر کے امتیازات منسوخ کر دیے گئے تو اس سے غیر متوقع امر ظہور میں نہیں آیا۔ اس تغیر سے صرف یہ ہو کہ اعیانی جمہوریت کے بجائے نیابتی جمہوریت مکمل ہو گئی۔

(الف) ۱۸۴۸ء سے فرانس میں جمہوریت قائم ہو گئی ہے اور اب شاہی کی بازگشت کی کچھ امید باقی نہیں رہی ہے۔ (انگریزی مسترجع)

۱۸۴۸ء دیکھو ۱۸۴۸ء کا "ایکٹ آف میڈیشن" ۴۴، ۴۵ اور پہلی "سوئزرلینڈ کی تحقیق کا قانون" جلد ۱ صفحہ ۴۴

۱۸۴۸ء دیکھو ۱۸۴۸ء کے اتحادی نظام سلطنت کی دفعہ (۴۴) حسب ذیل ہے۔ سوئزرلینڈ میں نہ کوئی رعایا ہے اور نہ عہدے، نہ نسب نہ خاندان یا شخصیت کا کوئی امتیازی حق ہے۔

تمام سوئزرلینڈ کو ایک نیابتی عمومیت میں متحد کر ٹیکلی کوشش میں جو نظام سلطنت ۱۹۸۱ء میں نافذ کیا گیا اُسے بھی استقلال نہیں حاصل ہوا۔ قدیم صوبوں کی آزادی کی روایات اور اندرونی مخالفت کے عناصر اس قدر قوی تھے کہ انکا بلویشیا کی جمہوریت کے تابع ہونا ممکن نہ تھا اور یہ جمہوریت بہت جلد منسوخ کر دی گئی، لیکن اکثر صوبوں اور خاص کر شہروں اور نئے صوبوں میں ۱۹۸۱ء کے بعد اعیانی حقوق کی گونہ رجعت کے باوجود نیابتی طریقہ قائم رہے۔ ۱۹۸۳ء کے بعد کی اصلاحی تحریکات نے نیابتی صورت کو زیادہ آزادانہ طور پر ظاہر ہونیکا موقع دیا اور ۱۹۸۴ء میں تنفیذ پر بھی اُسکا عملدرآمد ہو گیا۔

زمانہ اعمال کی عمومیت قدیم یونانی صورت سے اصلاً مختلف ہے۔ فارس کے رہنے والے ہٹانہ نے (سیر و دو توس، مقالہ ۳، فصل ۸۲) قدیم عمومیت کی یہ پانچ خصوصیتیں گنائی ہیں (۱) تمام حقوق کی مساوات (۲) مشرقی مطلق العنانوں سے خود مختارانہ اختیار کا اخراج (۳) قرعہ اندازی سے عہدہ داروں کا تقرر۔ (۴) عہدہ داروں کی ذمہ داری (۵) مجلس عامہ میں عام مباحثہ اور فیصلہ۔ ان میں سے تین خصوصیتیں موجودہ سلطنت میں بھی مسلم ہیں خواہ وہ سلطنت آئینی بادشاہی ہو یا جمہوریت۔ مگر دوسری دو خصوصیتیں یعنی قرعہ اندازی سے عہدہ داروں کا تقرر اور مجلس عامہ اب مسترد ہو گئی ہیں۔

قدیم عمومیت تمام اہل ملک کو یکساں طور پر حکومت میں شریک کرتی تھی۔ زمانہ اعمال کی عمومیت بہترین اشخاص کو قائم مقام منتخب کرنے میں گویا اعیانی امتیاز پر کاربند ہوتی ہے اور اس اعتبار سے وہ عمومیت کی زیادہ اعلیٰ و اشرف صورت ہے۔ اقتدار اعلیٰ کا حق مجموعہ تمام اہل ملک یعنی قوم کو دیا گیا ہے مگر اس حق کا عملدرآمد سب سے قابل لوگوں کو تفویض ہوتا ہے جو تمام قوم کے نمائندے ہوتے ہیں۔

اہل ملک ملکی معاملات میں بطریق ذیل اب بھی براہ راست دخل رکھتے ہیں:-
(الف) آئینی قوانین پر رائے دینے میں۔ سوئزرلینڈ میں ۱۹۸۳ء سے عام طور پر یہ اصول مسلم ہو گیا ہے کہ آئینی قوانین کے لئے تمام اہل ملک کی کثرت رائے ضروری ہے۔

۳۔ قدیم و جدید
عمومیت کے فرق

۳۔ (قدیم فارسی میں اس نام کا تلفظ ہتھان تھا) گو کہ کتببت «آئنان» ہوتی تھی۔ یونانیوں نے اُسے آتانیس (otanes) بنالیا تھا۔ یہ فرناپ کا بیٹا تھا۔ (اردو مترجم)

اس میں ان لوگوں کا شمار نہیں ہے، جو رائے دینے سے گریز کریں۔ برخلاف اسکے ممالک متحدہ امریکہ میں رائے دہی کا کام تمام قوم کو تفویض نہیں کیا گیا ہے بلکہ قائم مقاموں کی اُن متحدہ مجلسوں کو دیا گیا ہے جو خاص اسی غرض سے منتخب ہوں (اسکو کانفرنس یا مجلس عارضی کہتے ہیں)

(ب) بعض اوقات دوسرے قوانین پر بھی رائے دینے میں اس صورت میں عام فیصلے کی دو حالتیں ہوتی ہیں۔ ایک اثباتی یعنی اہل ملک کا کسی فیصلے کو منظور کر لینا جس سے قانون کو جواز حاصل ہو جائے (یہ مراجعہ کہلاتا ہے)۔ دوسری صورت منفی یعنی ایوانہائے مبعوثین کے منظور کر لینے کے بعد قوم کو اُس قانون کے نامعلوم کر دینے کا موقع دیا جائے۔ ثانی الذکر صورت میں جو لوگ قانون کے خلاف رائے دیں انکی تعداد تمام اہل ملک کی تعداد کے نصف سے زائد ہونا چاہئے برخلاف اس کے اول الذکر صورت میں رائے دینے والوں کی معمولی کثرت رائے ہی سے فیصلہ ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں طریقے خالص عمومیت سے ماخوذ ہیں اور چونکہ ان سے عوام الناس میں بہت آسانی سے اشتعال پیدا ہو جانے کا احتمال رہتا ہے اس لئے وہ علم و تہذیب کے لئے خطرے سے خالی نہیں ہیں۔ اولاً ان قواعد کو سوئٹزرلینڈ کے چند منفرد صوبوں نے جاری کیا اُس کے بعد ۱۸۷۷ء میں کل اتحاد کے لئے وہ منظور کر لئے گئے۔

۱۸۳۱ء نظام سلطنت زیورج بابت ۱۸۳۱ء دفعہ ۹۳۔ "آئینی تغیر کی کوئی تجویز جس پر مجلس عظمیٰ میں دوبار بحث ہو چکی ہو اگر منظور ہو جائے تو تمام اہل ملک کے سامنے منظوری یا منظوری کیلئے پیش کیجائے" سوئٹزرلینڈ کا ۱۸۴۸ء اور ۱۸۷۱ء کا اتحادی نظام سلطنت دفعہ (۷) "اتحاد صوبائی نظامہائے سلطنت کی حفاظت کی ذمہ داری کرتا ہے" بشرطیکہ اُسے قوم نے قبول کر لیا ہو اہل ملک کی اہلی اکثریت رائے ہی جو تکی اکثریتی کی خواہش کرے اُس پر نظر ثانی کیجائے" ۱۸۷۱ء کے اتحادی نظام سلطنت کی دفعہ ۹۹ حسب ذیل ہے:

"وہ اتحادی قوانین یا فیصلے جو تمام شہریت پر عاید ہوتے ہیں اور زیادہ فوری اہمیت کے نہیں ہوتے وہ قوم کی منظوری یا منظوری کے لئے پیش کئے جاسکتے ہیں بشرطیکہ تیس ہزار ترقی رائے دی رکھنے والے باشندگان سوئٹزرلینڈ یا آٹھ صوبہ جات اُس کا مطالبہ کریں"

(ج) مجلس واضع قوانین کے ارکان کے انتخاب میں۔ یہ انتخابات بالعموم برابر کے انتخابی حلقے اور سرشماری کے حسابی طریق پر مبنی ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی انکی بنیاد تنظیمی تقسیم یعنی کمیون پر بھی ہوتی ہے۔ پس عام طور پر نیابت نامکمل رہتی ہے اور اکثر اسکا فیصد نصف یا قیاد خیالات سے ہوتا ہے۔ یہ خرابی بنیادی حکومت کا لازمی خاصہ یا اسی تک محدود نہیں ہے بلکہ آئینی بادشاہت میں بھی اسی طرح عیاں ہے۔

۵۔ بنیادی عیوض
میں اقتدار اعلیٰ

اعلیٰ اقتدار کا باقاعدہ عہدہ عہد رآمد علی العموم بہت وسیع مجلسوں کو سپرد ہوتا ہے جو با اقتدار قوم کی بنیاد ہی اتم و اکمل نیابت کی حیثیت سے منتخب ہوتی ہیں۔ ازمنہ وسطیٰ میں سوئٹزرلینڈ میں شہروں کی مجالس عظمیٰ اور زرعی صوبوں کی "مجالس مکی" درحقیقت اصلی مجالس کی وسعت دادہ صورتیں تھیں جنہوں نے اختیارات کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا اور انھیں مجلسوں میں اہم معاملات کے لئے (اور شہروں میں قانون سازی کی ضرورت سے بھی) صوبے کے دوسرے ارکان کی کمیٹیوں کا اضافہ کر لیا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے میں مجالس عظمیٰ حکومت سے علیحدہ ہیں اور انھیں باضابطہ اقتدار اعلیٰ حاصل ہونیکے باعث انکا مرتبہ بھی بلند ہو گیا ہے۔ مثلاً متفقہ مجلس کو جس میں دو ایوان ہوتے ہیں، متفقہ حکومت کے مقابلے میں پی در پی درجہ حاصل ہوتا ہے۔

شمالی امریکہ میں قومی موثر اور ہر ریاست کی جماعتہائے واضع قانون دو دو ایوانوں پر مشتمل ہیں اور حکومت سے جدائیت رکھنے میں سوئٹزرلینڈ سے بھی بڑھی ہوئی ہیں۔

۱۸۳۱ء کے زیورچ کے نظام سلطنت کی دفعہ ۳۸ حسب ذیل ہے :-

"نظام سلطنت کے بموجب اعلیٰ اختیار کا عہد رآمد مجلس عظمیٰ کو سپرد کیا گیا ہے۔ قانون کا بنانا اور مقامی نظم و نسق کی نگرانی کرنا، اسی مجلس سے متعلق ہے اور صوبے کے خارجی تعلقات بھی مجلس اُنکی نمائندگی کرتی ہے۔"

۱۸۴۸ء کے اتحادی نظام سلطنت کی دفعہ (۶۰) حسب ذیل ہے :-

۱۔ مشترکیت کے اختیارات اعلیٰ کا عہد رآمد اتحادی مجلس کے سپرد ہے۔ جبکہ دو حصے میں ایک نیشنل کابینل (مجلس قومی) اور دوسری کابینل آف ایٹس (مجلس طبقات) ۱۸۴۸ء کے

اتحادی نظام سلطنت کی دفعہ (۱۱) حسب ذیل ہے :- قوم اور صوبہ جات کے حقوق کو محفوظ رکھنے ہوئے مشترکیت کے اعلیٰ اختیارات کا نفاذ اتحادی مجلس کے ذریعے سے ہو گا۔"

اب حکومت میں رعایا کا براہ راست کوئی دخل نہیں رہا ہے جن سلطنتوں نے اغراض قانون سازی میں خالص عوامیت کو قائم رکھا ہے، وہاں بھی یہی حال ہے ہر جگہ حکومت کا کام رعایا کے باختیار ناموں کو سپرد ہے جو رعایا کے نام سے اسے عمل میں لاتے ہیں۔ بعض سلطنتوں میں حاکم اعلیٰ کا انتخاب رعایا براہ راست کرتی ہے مثلاً اکثر ریاستہائے امریکہ کے گورنر (والی) اور جینوا کے حکام شہر کا انتخاب تمام اہل ملک کرتے ہیں۔ ممالک متحدہ امریکہ کے رئیس جمہوریہ کا انتخاب وہ رائے دہندگان کرتے ہیں جو خود استوائی انتخاب کنندوں کی طرف سے منتخب ہوتے ہیں۔ برعکس اسکے بعض دوسری سلطنتوں میں اس انتخاب کا اختیار مجلس وضع قانون کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اس طرح خاص مہموں کے تقرر میں وہ گویا رعایا کی نمایندگی کرتی ہے۔ یہ آخر الذکر طریقہ سوئٹزر لینڈ کی مشترکہ جمہوریتوں میں رائج ہے۔ جہاں مجلس عظمیٰ ارباب حکومت اور اعلیٰ جموں کا تقرر کرتی ہے۔ یہی کیفیت فرانس اور امریکہ کی بعض ریاستوں کی ہے۔ ظاہر ہے کہ مقدم الذکر صورت میں حکومت کو زیادہ آزادی اور قوت حاصل ہوتی ہے خاص کر ایوانہائے معوثین کے مقابلے میں کیونکہ اسے یہ دعوے ہوتا ہے کہ ان ایوانوں کی طرح وہ بھی رعایا کی نمایندہ ہے اور نسبتاً اسے عوام کا زیادہ اعتماد حاصل ہونے کا دعوے ہوتا ہے۔ موخر الذکر صورت میں حکومت کا مدار مجلس قانون سازی پر زیادہ ہوتا ہے کیونکہ وہی اسے وجود میں لاتی ہے اور اس لئے اسکا امکان کم ہوتا ہے کہ ایک قوت دوسری کو اس کی حد کے اندر محدود کر دے گی اور اس پر روک قائم رکھے گی (ج)

۱۔ فرانسیسی نظام سلطنت ۱۸۳۸ء کی دفعہ ۳۴ کی رو سے بھی ایسا ہی تھا: "فرانسیسی قوم" علامہ اختیار ایک شہری کو عطا کرتی ہے جو صدر جمہوریہ کا لقب پاتا ہے" دیکھو نوک دل کی کتاب "جمہوریت امریکہ" جلد ۱۔ (معلوم ہوتا ہے کہ پہلی اس مقام پر دفعہ ۴۴ کا حوالہ دینا چاہتا تھا جو حسب ذیل ہے: "صدر کا انتخاب خفیہ رائے دہی کے ذریعے سے رایوں کے قطعی غلبے پر ہوتا ہے اور اس انتخاب میں فرانس اور انگریز کے تمام اضلاع کے انتخاب کنندے شامل ہوتے ہیں" دیکھو لائبریری اور بات بی کی کتاب کا مقدمہ معینہ ۱۳۸۸ء انگریزی ترجمہ) (ج) علامہ حکومت کے سرگروہ کے انتخاب کے ان دونوں طریقوں کا اہم فرق فرانس کے ۱۸۳۸ء کے

۱۔ رائی اختیار

عدالتی اختیارات بھی قوم کے نام سے نافذ ہوتے ہیں لیکن جج جنہیں خاص قابلیت یا تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے بالعموم یا تو حکومت کی طرف سے نامزد کیے جاتے ہیں جیسا کہ ممالک متحدہ امریکہ اور جمہوریہ فرانس میں ہوتا ہے، یا مجلس قانون سازی کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں جیسا کہ سوئٹزرلینڈ میں ہوتا ہے۔ مگر جوری (پنچایت) کے ذریعے سے رعایا کو براہ راست حصہ بھی ملتا ہے کیونکہ جو (پنچ) بذریعہ قلمہ اندازی تمام جماعت رعایا میں سے منتخب ہوتے ہیں۔ ہر ایک نیابتی عمومیت میں کمیٹیوں کا نظام حکومت خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ نظم و ترتیب کی بنیاد مستحکم وہی ہوتا ہے کمیٹیوں میں اہل شہر کو معاملات عامہ اور حکومت خود اختیاری میں حصہ لینے کی اور مدنی آزادی کی تعلیم حاصل ہوتی ہے۔ انہیں مقامی انتظامات، بالخصوص انکے چھوٹے اور دیہاتی حلقوں میں اب تک یہ ممکن ہے کہ کل باشندے مقامی مجلس میں یکجا ہو سکیں۔ البتہ شہروں میں نیابت کی ضرورت ہوتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ اور شمالی امریکہ کی جمہوریتیں تاریخی طور پر جب انہی بنا کا سراغ لگائیں گی تو یہی معلوم ہوگا کہ انکی ابتدا آزادانہ مقامی نظام حکومت سے ہوئی ہے۔ فرانس کے بارے میں اگر یہ کلیہ صادق نہیں آتا تو اس سے صرف اس امر کا مزید ثبوت ملتا ہے کہ فرانسیسیوں کا طبعی میلان جمہوری حکومت کی طرف نہیں ہے۔

قوم کو خود اپنے اقتدار اعلیٰ کے براہ راست استعمال میں جو نہایت خفیف حصہ حاصل ہے اس سے قطع نظر کہ جب ہم دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نیابتی عمومیت میں قاعدہ یہ ہے کہ قوم اپنے حکام کے ذریعے سے حکمرانی کرتی ہے اور اپنے نائبوں کے ذریعے سے قانون بناتی اور نظم و نسق کی نگرانی کرتی ہے۔ اس امر میں موجودہ نظام سلطنت کو ان سلطنتوں سے خاص مشابہت حاصل ہے جو حاکم و محکوم کے درمیان فرق کرتی ہیں۔

بندۂ حاشیہ: غور گزشتہ۔ نظام سلطنت سے بہت صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ روسیو گریوی نے تجویز کی تھی کہ رئیس جمہوریہ کو مجلس قومی منتخب کرے؛ مگر فیصلہ یہ ہوا کہ عام رائے سے اسکا انتخاب ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دو برابر کی طاقتیں قائم ہو گئیں۔ ایک رئیس جمہوریہ، دوسری مجلس قومی اور ان دونوں کے درمیان اختلافات کے طے کرینکا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اسی صورتِ معاملات سے پنولین سوم کو موقع مل گیا کہ اس نے دوبارہ شہنشاہی قائم کر دی۔ (انگریزی مستحجم)۔

۲۔ مقامی انتظامات

ٹیسوال باب

(د) نیابتی حکومت عوام پر بحث

مونتسکیو نے عمویت کا اصول نیک کرداری کو قرار دیا ہے۔ گزٹیک کرداری کا سب سے پہلا سیاسی اصول یہ ہے کہ حکمرانوں کی اخلاقی خوبیوں کی قدر و وقعت کی جائے ذہنیہ کہ سب لوگوں کے درمیان مساوات قائم ہو۔ اور خالص عمویت میں حکمرانوں کی اخلاقی خوبیوں کی قدر شناسی کا وجود کسی طرح پایا نہیں جاتا۔ ہاں صرف اتنا سچ ہے کہ ایک اچھی حکومت کی عملی ضروریات کے لئے ایک حد تک نیکو کرداری لازمی ہے اور اسکے فقدان سے بہت جلد سلطنت کا تباہ ہو جانا لازم ہے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ نیکو کرداری نیابتی عمویت کا سیاسی اصول بن گئی ہے۔ یہ نیابتی حکومت صرف یہی نہیں کہ نسبتاً معتدل ہے بلکہ معتدل تر بھی ہے کیونکہ انتخاب کے طریقے سے اسے ایمانی حکومت کے فوائد کا کچھ حصہ حاصل ہو جاتا ہے۔

بہترین قائم مقاموں کے حاصل کرینگی دشواری

اسکا اصول یہ ہے کہ قوم کے بہترین افراد قوم کے نام اور اسکے حکم سے حکومت کرتے ہیں مگر بڑی مشکل یہ ہے کہ انتخاب کا انتظام کیونکر کیا جائے کہ بہترین قابلیت اور بہترین اخلاق کے لوگ منتخب ہو سکیں۔

موجودہ زمانے میں عمویت کا میلان یہ ہے کہ صرف انتخاب کنندوں کی تعداد پر انتخاب کا انتظام رکھا جائے، چونکہ عمویت مساوات پر زیادہ زور دیتی ہے اس لئے وہ بہت آسانی سے اپنی تنظیمات کے لئے حسابی قواعد مقرر کر لیتی ہے۔ وہ اہل ملک کا شمار کر لیتی اور برابر تعداد کو برابر حق دیدیتی ہے۔

اوپر کے مقابلے میں
تعداد پر زیادہ لحاظ
کر دینا خطرہ

لیکن یہ طریقہ بلا واسطہ عمویت کے لئے زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہ تمام اہل ملک کو اختیارات کے استعمال کا یکساں حق دیتی ہے۔ نیابتی عمویت کے لئے یہ اس قدر موزوں نہیں ہے کیونکہ اس میں اہل ملک کی قابلیت اور اہلیت کے اعتبار سے فرق کیا جاتا اور معاملات عامہ کا نظم و نسق صرف بہتر لوگوں کو سپرد ہوتا ہے۔ پس آخر الذکر صورت میں منتخب شدہ لوگوں کے اوصاف کا خیال کیا جاتا ہے اور اس حالت میں یہ بالکل خلاف قیاس

معلوم ہوتا ہے کہ اسکی انتخابی تقسیم صرف تعداد کی بنا پر ہو۔ علاوہ اسکے اس طریقے کے تفصیلات نیابتی سلطنت میں زیادہ نقصان رساں ہیں۔ بلا واسطہ عمومیت کی جمعیت عامہ، محض مساوی الحقوق عوام کا مجمع نہیں ہوتی بلکہ اس پر حکام اعلیٰ مقررین اور سفیرین کا اثر پڑتا ہے اور اس لئے بالغ و جرحہ کثرت رائے کا فیصلہ تمام باشندوں کے تصبیحات کا ترجمان ہوتا ہے مگر نیابتی عمومیت میں قوم اس طرح مجمع نہیں ہوتی بلکہ مختلف حلقوں میں منقسم ہوتی ہے جن کا تعداد کے اعتبار سے مساوی ہونا تو ممکن ہے مگر اوصاف کے اعتبار سے مجموعی قوم سے انکا تناسب ایک دوسرے سے بہت مغایر ہوتا ہے اور اس لئے یہ حلقے قوم کے نہایت غیر مساوی ٹکڑے ہوتے ہیں۔

کیا یہ دعوے کرنا ممکن ہے کہ برٹنی کے زرعی اضلاع یا لیون سے صنعتی اضلاع پیرس کے انتخابی حلقوں سے تمام مشابہ ہیں، جہاں ہر شخص کو یہ نظر آسکتا ہے کہ حقیقی اتحاد کے بغیر قوم کے نہایت ہی متمول اور نہایت ہی تعلیم یافتہ ارکان، بیشمار مختلف درجوں کے معمولی شہری اور صنایع اور اوسنے درجے کے انبوہ (جسکا مثل فرانس میں کہیں اونہیں مل سکتا) سب ایک ہی میں خلط ملط ہیں۔ انتخابی حلقوں کے اس فرق کا عقلی اقتضایہ ہے کہ انکی رایوں کی مختلف قیمت مقرر ہونا چاہئے، صحیح نیابت اس طور پر حاصل ہو سکتی ہے کہ انتخابات کا انتظام یوں کیا جائے کہ قوم کے ہر ایک عنصر اور ہر ایک مقصد کی نیابت اس فلق کے تناسب کے ساتھ ہو جو مجموعے کے ساتھ اُسے حاصل ہے۔ تعداد کی ایک قدر قیمت ضرور ہے مگر وہ فی نفسہ کافی نہیں ہے۔ جائداد، تعلیم، پیشے اور طرز زندگی وغیرہ کے مانند دوسرے اوصاف پر بھی خیال کرنا ضروری ہے اور اناسب یہ ہے کہ اُسے قوم کی محض فرضی تقسیموں پر انداز کر نیئے بجائے، قوم کے ذی حیات اجزاء پر اسکا نفاذ کیا جائے۔

عملی قواعد

پس نیابتی جمہوریت کے لئے دو بنیادی اصول قرار دیے جاسکتے ہیں:۔

- (۱) جب تمام اہل ملک مجموعاً یکجا کارروائی کریں یا جب کل قوم کی رائے لیجائے تو اُس وقت صرف رایوں کی تعداد کا شمار کر لینا کافی ہے جیسا کہ بلا واسطہ عمومیت میں ہوتا ہے۔
- (۲) برخلاف اسکے جب قوم کے مختلف اجزاء کل قوم کے لئے نائب منتخب کرتے ہوں اس وقت صرف رایوں کا شمار کرنا کافی نہیں ہے۔ اجزاء کی ترتیب انکے اوصاف کے اعتبار سے

ہونا چاہئے تاکہ بہترین آدمیوں کے انتخاب کا یقین ہو سکے اور قوم کے علمی، اخلاقی اور مادی (مالی) عناصر سب کو مناسب حصہ مل سکے۔

نیابتی عوامیت کے
مضار و مفاد

نیابتی عوامیت کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ اقتدار اعلیٰ کا حق کثیر کو عطا کرتی ہے مگر اس اقتدار کا غلہ رآمد ایک قلیل جماعت کو تفویض کرتی ہے۔ اس اطمینان کی غرض سے کہ یہ قلیل جماعت حصہ کثیر کی مرضی کے موافق عمل کرے گی حصہ کثیر اُن لوگوں کے انتخاب کو اپنے اختیار میں رکھتا ہے جو اُس کے نام سے حکومت کرتے ہیں اور خود بے مقورے وقفے کے بعد نئے انتخابات ہوتے رہتے ہیں۔

یہ نظام سلطنت اسے تسلیم کرتا ہے کہ حصہ کثیر جس حکومت خود اختیاری کا اپنے فطری حق کے طور پر دعوے کرتا ہے اُسے واقعی علی طور پر انجام دینے کی ذمہ داری ہے نہ فرحت، نہ غم، نہ غصہ کثیر کو اس قابل سمجھتا ہے کہ اُسے سلطنت کے معاملات کی اتنی سمجھ اور اُن سے اتنی دلچسپی ہے کہ وہ انتخابات میں حصہ لے سکے اور اپنی نیابت کے لئے بہترین آدمیوں کو منتخب کر سکے۔

بلا واسطہ عوامیت کے مقابلے میں یہ نیابتی حکومت عام اہل ملک سے کثیر اظہار قابلیت کی خواہاں ہوتی ہے مگر نمائندوں سے نسبتاً زیادہ اظہار قابلیت چاہتی ہے۔ وہ آزاد و مساوی الدرجہ اہل ملک کی خود اعتمادی پر بھروسہ کرتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی توقع رکھتی ہے کہ وہ اپنے بہترین آدمیوں کے انتخاب میں امتدال سے کام لیں گے اور جب تک اُن کے نمائندوں کو حصہ کثیر کا اعتماد حاصل رہے اسوقت تک وہ بطیب خاطر اُنکی حکومت کے مطیع رہیں گے۔

اقتدار کی کمزوری

متواتر انتخابات حکمرانوں کو محکموں کی مرضی کے تابع بنا دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی درمیانی وقفے میں اُن محکموں کو بھی اطاعت کرنا پڑتی ہے۔ رعایا کی آزادی حکومت کے اقتدار کی نسبت زیادہ مستحکم بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ حکام اعلیٰ جمہوریت کے سرگروہ ہو چکے ہیں بجائے اُن کے خادم خیال کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ بقول گینز حکومت صرف اوپر سے ہو سکتی ہے نیچے سے نہیں ہو سکتی مگر نیابتی عوامیت یہ کوشش کرتی ہے کہ جہاں تک ہو سکے نیچے سے حکومت کر سکی صورت قائم رہے۔ پس اس طرح حکومت محض ایک انتظام کے مشابہ ہو جاتی ہے اور سلطنت وسیع پیمانے پر ایک کیون یا ایک بڑی اتحادی

تقسیم بن جاتی ہے۔

دافع قوانین جماعتوں میں اقتدار کی کمزوری بہت ہی کم ظاہر ہوتی ہے بلکہ وہاں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ نائبین اپنے کو قوم کے مرادف سمجھ کر اقتدار علی الاطلاق کے معاملے میں پڑ جائیں گے، برخلاف اسکے، حکومت کو اپنے اختیار کے حقیقتاً مضبوط اور زور دار کر نیچے لئے بڑی مشکلیں پیش آتی ہیں۔ انتخابات کے کثرت سے ہونے سے حکومت کی حالت غیر مطمئن ہو جاتی ہے اور اسے قوم کی تغیر پذیر رائے کے تابع بنادیتی ہے۔ جب تک حصہ کثیر اسکی تائید کرتا رہتا ہے اسی وقت تک اسے تقویت رہتی ہے اور وہ وسیع اور دور رس تجاویز کو اسی وقت عمل میں لاسکتی ہے جب یہ تجاویز قوم کے مزاج اور روایات کے موافق ہوں اور اس طرح انکی بقا کی طرف سے اطمینان ہو جائے۔

حکومت کے ارکان میں نمائش نہیں ہوتی۔ انکی حیثیت معمولی افراد قوم کی سی ہوتی ہے۔ شاہی اور اعیانی حکومتیں جس قسم کی شان و شوکت میں گھری ہوتی ہیں ان کا یہاں کہیں نام و نشان نہیں ہوتا۔ فطری حالت اس قدر مد نظر ہوتی ہے کہ درباری سفارتوں کے مصنوعی طہراق کی گنجائش یہاں نہیں ہوتی، عمومیت اسے زیادہ پسند کرتی ہے کہ اس کی نمائندگی محض وکیل یا قنصل کے ذریعے سے ہو۔ بہت بڑی مستقل فوج اس کی طمانینت اور آزادی کے لئے ایک مستقل خطرہ ہوگی اور اسے بڑے پیمانے پر محافظ قوم اور محافظ ملک فوج قائم رکھنا پڑتی ہے۔ ہر خرد کی خود مختارانہ کارروائی اور آزادانہ عمل کے مقابلے میں تمام طاقتوں کی اجتماعی حالت کو کم نشو و نما حاصل ہوتا ہے۔

شان و شوکت اور
جہمی قوت کی کمی

عام تعلیمات کی فوجی

خدمت عامہ کے انتظامات بالعموم اچھے اور بعض اوقات نہایت ہی افضل ہوتے ہیں۔ عمومیت میں ہر شخص اس امر کا متوقع ہوتا ہے کہ وہاں مفید عام اور کار خیر کے میثرائنظامات ہوں گے۔ عمدہ سڑکیں ہوں گی، آمد و رفت اور رسل و رسائل کے ذرائع اچھے ہوں گے، بہکثرت قومی مدرسے ہوں گے، دلچسپ تہوار اور دعوتیں وغیرہ ہوتی ہوں گی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ دفتر دار حکام اور انکی جہہ آزما کارروائیوں سے نجات ہوگی۔

دوسری طرف نظام سلطنت میں علوم و فنون کے اسطلاحاً افضل مقاصد کی طرف سلطنت کو متوجہ کرنے میں دوسرے نظام ہائے سلطنت کی بہ نسبت زیادہ دشواری پیش آتی ہے جس قوم میں عمومیت کا رواج ہو وہ جب ایسی صورتوں کو پورا کرنا چاہے جتنے مفاد قومی کی

ترقی قوم کی طرف
غفلت

قدر و منزلت کا اندازہ کرنا عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہو تو اس قوم کیلئے ضروری ہے کہ وہ تہذیب و تمدن کے بہت اعلیٰ درجے پر پہنچ گئی ہو۔

عوام کے اخلاق
بلند ہونا

اس نظام سلطنت سے آزادی کے جس مردانہ احساس کا اظہار ہوتا ہے اور جس پر انکی بنیاد قائم ہوتی ہے وہ احساس متوسط طبقے کے لوگوں کے خیالات کو بلند کر دیتا ہے، اور یہی متوسط طبقہ سلطنت کا خاص پشت پناہ ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے معاملات عامہ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق کے باعث تمام اہل ملک کی ذہنی قابلیت کو نشو و نما حاصل ہوتی ہے اور انکے اخلاق میں مضبوطی آجاتی ہے، جب وطن سے کام لینے کے لئے پوری وسعت اور آزادی حاصل ہوتی ہے اور نازک موقعوں پر اہل ملک وطن کے لئے بہت بڑی بڑی قربانیاں کر نیکے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس نظام سلطنت میں اعلیٰ خیالات کی ترقی کے مواقع بہت کم ہوتے ہیں اور قوم اس قسم کے خیالات کو بدگمانی اور مخالفت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ لیکن اس خیال کے لوگ اگر اپنے پر نخوت و عیووں سے مساوات کے احساس کو صدمہ نہ پہنچائیں اور بہبود عامہ کے لئے وہی جوش و انہماک ظاہر کریں جو بہترین عمویت پسندوں سے ظاہر ہوتے ہیں تو اس خیال کے لوگوں کی بھی وقعت ہو سکتی ہے۔

تعلیق۔ روبرٹ فون مول نے (انسائیکلو پیڈیا صفحہ ۴۶۳ میں) مذکورہ بالا دعویٰ کی مخالفت کی ہے کہ کیا یہ عمویت میں تعداد کے اصول کو قطعی فیصلہ کن قرار دینا چاہئے وہ کہتا ہے کہ ”یہ کہنا کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو کہ انتخاب میں حصہ لینے کو افراد کا شخصی حق نہ سمجھنا چاہئے بلکہ اسے ایک مفوض فرض یا عہدہ تصور کرنا چاہئے تاہم اس امر پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا کہ قوم ہی اپنے اقتدار اعلیٰ کو نیابت کے ذریعے سے مل میں لاتی ہے۔ قوم کے اقتدار اعلیٰ کی بنیاد اس پر ہے کہ ہر شخص کو طرانی میں حصہ لینے کا قطعی حق حاصل ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ حکومت کے موجودہ نظریے میں یہ خیال پیش نظر ہے خاص کر روسو نے اپنے نظریے کی بنیاد پر رکھی ہے کہ نتیجہ یہ ہے کہ خیال شعنی اور جمہوری حقوق کی پیروی میں الجھ کر دیکھا اس سے صاف ہو کہ یہ نہیں نکلا۔ اس نظریے میں جسے معاشرتی سلطنت کہتے ہیں اسکی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ اسوعلی سلطنت کو الٹ دیا ہے جس شخص نے قوم کی وحدت اور اہل ملک کی مجموعی ہئیت کا فرق سمجھ لیا ہے اس پر غلطی صاف عیاں ہے۔ انتخاب کنندہ رائے دہی کا حق نہ صرف اس شخص کے نہیں بلکہ سلطنت سے حاصل کرتا ہے۔ انتخاب کا کوئی ساطریقہ جو بہبود عامہ کیلئے سلطنت کا ایک نظام ہے اس باب کے بہت کیلئے اس کی کتاب ”نیابتی حکومت“ Representative Government دیکھنا چاہئے۔“

انگریزی ترجمہ

چوبیسواں باب

سلطنت کی مرکب صورتیں

اس وقت تک ہم صرف منفرد سلطنت کے متعلق بحث کرتے رہے ہیں لیکن بعض سلطنتیں مرکب بھی ہوتی ہیں جس سلطنت کے اجزاء بجائے خود سلطنت ہوں یا ان اجزاء کی تنظیم و ترتیب سلطنتوں کے مثل ہو اسے مرکب سلطنت کہتے ہیں۔ ان مخلوط سلطنتوں کے تمام داخلی اجزاء ایک نہ ایک منفرد سلطنت کی حیثیت رکھتے ہیں اور محض اس لحاظ سے مخلوط سلطنتوں میں کوئی خاص بات بیان کے قابل نہیں ہے۔ مثلاً ممکن ہے کہ اجتماعی سلطنت اور اس کے منفرد اجزاء کی یا سلطنت اعلیٰ اور اس کے توابع کی تنظیم شاہی طریق پر یا نیابتی عمومیت کے اصول کے مطابق ہو۔

مرکب سلطنتوں کی
مختلف صورتیں

لیکن ہمیشہ یہ نہیں ہوتا کہ اجتماعی سلطنت اور اس کی منفرد سلطنتوں کے نظام سلطنت ایک ہی سے ہوں۔ مثلاً ۱۸۱۵ء کی جرمانی مشترکیت با اقتدار حکمرانوں کی ایک عدیت تھی اور عوام کو اس میں نیابت کا کوئی حق نہیں تھا۔ درآئحالیکہ اس کی منفرد سلطنتوں میں رفتہ رفتہ آئینی بادشاہی رواج پاتی جا رہی تھی۔ انگلستان میں آئینی بادشاہت ہے مگر اس کے ایشیائی تقبوضات میں خود مختار حکومت ہوتی ہے اور اس کی بعض بعض نوآبادیوں میں برطانوی سیادت و صیانت کے زیر اثر نیم آزاد جمہوریت قائم ہے۔

جہاں قومیت، تمدن اور تاریخی حالات میں بہت زیادہ فرق ہو، وہاں نظام سلطنت کا اختلاف فطرت کے موافق اور نظر بحالات جایز ہے لیکن جہاں حالات یکساں ہوں (جیسا کہ جرمانیا کی مشترکیت میں ہے) وہاں اس قسم کا فرق فطرت اور ہم آہنگی دونوں کے خلاف ہے۔

تمام مرکب سلطنتوں میں ہیں ایک نئے فرق مراتب سے سابقہ پڑتا ہے یعنی مجتمعہ یا اعلیٰ سلطنت کے اقتدار اور جداگانہ سلطنتوں یا توابع کا تعلق فیما بین کیا ہو۔ اس فرق مراتب کو پیش نظر رکھ کر حسب ذیل تقسیم قرار دیا جاسکتی ہیں:-

۱) بقدریکر سلطنتوں کی
ایک سلطنت کی
مختلف اقسام کی

۱۔ اعلیٰ سلطنت اپنے ماتحت توابع پر خود مختار حکومت کرتی ہو۔ اس صنف میں یورپی طاقتوں کے متعدد، خاصکر ایشیائی اور افریقی مقبوضات داخل ہیں صرف اعلیٰ سلطنت میں آزادانہ نظام عمل ہوتا ہے، توابع غیر آزاد اور غیر ملکی حکومت کے ماتحت ہیں۔ اعلیٰ سلطنت اور ماتحت سلطنتوں کے درمیان تخالف بہت ہی نمایاں ہوتا ہے اور تصادم سے بچنے کیلئے حکمران سلطنت کو اپنی پوری قوت صرف کر دینا پڑتی ہے۔

بقیہ دیگر سلطنتوں پر
سیادت یا ممانت۔

۲۔ ماتحت سلطنتوں پر ایک اعلیٰ طاقت کی سیادت قائم ہو، یا ایک زبردست سلطنت اپنے سے کمزور سلطنتوں کی حیانت کرتی ہو۔ اس صورت میں ماتحت یا محروسہ سلطنتوں کے لئے ایک حد تک آزادی ممکن ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں مقدس رومی شہنشاہی اور اس زمانے میں ترکی شہنشاہی اس امر کی مثالیں ہیں کہ ماتحت سلطنتوں سے فکر ایک مجموعی سلطنت بن گئی۔ موجودہ زمانے میں سیادت کے مقابلے میں محبت کو ترجیح دیتا ہے اور حقیقت میں جب تک دونوں سلطنتوں کی طاقت میں بہت بڑا فرق نہ ہو اسوقت تک سیادت محض بے معنی ہے، اور ایک آزاد قوم کو بھی اُسے پسند نہیں کر سکتی۔ پولین نے راتن کی سلطنت پر ایک متفقہ پیرا انگریزوں نے جب ڈیرویان پر یورپی طاقتوں نے مولڈویہ اور ولاخیا پر جس قسم کی سیادتیں قائم کیں وہ اسکی مثالیں ہیں۔

سہ۔ نوآبادیوں پر
ملکداری کی حکمت

۳۔ ملک آبادی اور اسکی وہ نوآبادیاں جو ابھی تک آزاد نہیں ہوئی ہیں مگر انھوں نے کم و بیش ایک مکمل سلطنت کی حیثیت پیدا کر لی ہے ان میں اسی قسم کے تعلقات ہوتے ہیں۔ البتہ فرزندانہ اطاعت سے اُس میں گونہ ترمیم ہو جاتی ہے اور وہ زیادہ اعلیٰ و ارفع نظر آتے ہیں۔ نوآبادی کے اندرونی انتظام میں جب معقول حد تک آزادی حاصل ہو جاتی ہے

(الف)۔ ڈینیڈک کے شہزادے جارج کو یونان کے تخت پر بلباق جارج اول منتخب کر کے بعد انگریزوں نے انھیں اس محبت کو ترک کر دیا۔ انگریزی مستبرجم (ب)۔ (یہ محبت ۱۸۵۷ء کے معاہدہ پیرس کی رو سے قائم ہوئی تھی۔ ۱۸۵۸ء میں چھ طاقتوں نے باجالی سے ان دونوں صوبوں کی حکومت کے انتظام کیلئے ایک قرارداد کی۔ دوسرے سال یہ دونوں صوبے ایک ہی خیرادے کو اپنا والی منتخب کر کے متحد ہو گئے اور اسوقت سے سلطنت رومانیہ کے نام سے مشہور ہیں۔ انگریزی مستبرجم)

اُس وقت بھی اُسے اپنے بیرونی تعلقات کے معاملے میں ملک آباہی کی صیانت کی ضرورت باقی رہتی ہے اور اس لئے نوآبادی اپنے ملک آباہی کے تفوق کے تسلیم کرنے پر رضا مند رہتی ہے۔ اسکی پہلی مثال کناڈا اور انگلستان کے تعلقات سے ظاہر ہوئی۔

۴۔ مشترکیت یا ذاتی اتحاد میں متعلقہ سلطنتوں کو بالعموم اپنی پوری وقت اور آزادی حاصل رہتی ہے، گوکہ مخصوص حالات میں عام اغراض کی ضرورت سے قیود بھی عاید ہو سکتے ہیں۔ ہر ایک سلطنت کا انتظام بجائے خود مکمل ہوتا ہے مگر مجموعی سلطنت کو ترقی نہیں ہوتی اور خاص حالات اور زیادہ بیرونی تعلقات کے علاوہ اسکی کوئی شخصیت نہیں ہوتی جو کہ سلطنت کے اجراء ضروری یعنی قانون سازی، حکومت اور اختیار عدالتی اس میں نہیں ہوتے، اس لئے واقعی سلطنت ہو سیکے بجائے وہ سلطنت کا ایک ہیولی ہوتا ہے۔ اسکی حالت ایک دہائی میں الا قوام بنائے اور ایک باقاعدہ سلطنت کے مین مین ہوتی ہے اور اسلئے مکمل اور تغیر پذیر رہتی ہے۔

سلطنت کی اس صورت میں کل آبادی ایک نسل کی ہو سکتی ہے گرائن میں حقیقی متحدہ قومیت نہیں ہوتی اور متفقہ معاشرت و طاقت کی ترقی بڑی مشکل سے ہوتی ہے جس اتحاد ذاتی میں کم از کم ایک بادشاہ سب کا سر تاج ہوتا ہے اس میں یقیناً اس مشترکیت کی بہ نسبت کم نظر آتا ہے جس میں کوئی متحدہ کارکن مطلقاً نہیں ہوتا مگر یہ دونوں صورتیں عملی ضروریات کیلئے بالکل ناموزوں ہیں۔ موجودہ زمانے میں ۱۸۱۵ء کی جرمانی مشترکیت اس کی بہترین مثال اور اسکے نقائص کی واضح ترین شہادت ہے۔

۵۔ متفیت، شہنشاہی متفقہ یا اتحاد حقیقی ان سب کی قدر مشترک یہ ہے کہ متفقہ اور منفردہ دونوں سلطنتوں کا انتظام بجائے خود مکمل ہوتا ہے۔ متفیت میں منفردہ سلطنتوں کو نسبتاً زیادہ آزادی حاصل ہوتی ہے کیونکہ ہر ایک کی حکومت کلیتاً اُسی سے متعلق ہوتی ہے۔ برخلاف اسکے اتحاد حقیقی میں متفقہ سلطنت کا سرگروہ اپنی خاص مملکت کا حکمران بھی ہوتا ہے اور اس لئے اقتدار اعلیٰ نسبتاً کم حاصل ہوتا ہے۔ (ج)

متفیت اور متفقہ شہنشاہی میں ایک منظم قوم ہوتی ہے، اس کے ساتھ ہی

۴۔ مشترکیت یا اتحاد ذاتی۔

۵۔ متفیت، شہنشاہی متفقہ اور اتحاد حقیقی۔

(ج)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر پہلی خط بحث میں پر گیا۔ اس نے مجموعی سلطنت کے سرگروہ کی آزادی کو خود مجموعی سلطنت کی آزادی سے خط ملا کر دیا ہے۔ انگریزی مسترحم)

انکی منفرد سلطنت کی قوم الگ منظم ہوتی ہے۔ چنانچہ ہم اہل امریکہ کا نام لیتے ہیں اور اہل پسنوینیا اور اہل ورجینیا بھی کہتے ہیں۔ سوئس قوم کا لفظ بھی بولتے ہیں اور اہل برن اور اہل جینیوا بھی کہتے ہیں۔ لفظ جرمانی کا بھی استعمال کرتے ہیں اور اُس کے ساتھ پروٹسٹی، سکسونی اور بوری کے الفاظ بھی بولتے ہیں۔ لیکن جداگانہ سلطنتیں کسی نوع سے توابع نہیں ہیں۔ اپنے حدود کے اندر وہ ایک منفرد سلطنت کے مانند آزاد ہیں۔

نظریہ سلطنت کے
شرائط لازمی۔

ان دونوں قسم کی سلطنتوں کا ایک ہی نطفہ پر ایک ساتھ قائم رہنا صرف اس طرح ممکن ہے کہ (۱) ہر ایک کے اختیارات کا فرق قطعی طور پر معین کر دیا جائے اور اختلافات کو صلح و شہنتی کے ساتھ طے کر لینے کے قواعد مقرر ہو جائیں اور (۲) حکمران اور رعایا جانتیں جہاں تک ممکن ہو ایک دوسرے سے آزاد اور علاحدہ رکھی جائیں، شخصی فساد نفسی یا عکسہ کی سلطنتیں متحدہ امریکہ میں سب سے زیادہ مکمل ہے۔ اختیارات کا امتیاز سوئٹزرلینڈ کے نظام سلطنت میں بہت وضوح کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ جسے ریڈی کی شہنشاہی میں

ٹھہر گ۔ وائٹس نے لکھا ہے کہ "مشترکیت اور سلطنتیں منفردہ دونوں کی قوت کو اپنی حد کے اندر خود مختار ہونا چاہئے۔ ان میں سے کسی ایک کو دوسرے کی جانب سے اختیار تفویض نہیں ہونا چاہئے" "سیاسیات کی اصولی خصوصیات" صفحہ ۴۴۔ (پنچلی کی کتاب کی چوتھی شاعت کا مدیر کتابا ہے؛ ۱۸۸۷ء سے اب تک متفقیات کی عام حالت اور خاصکر جرمانی شہنشاہی کے قانونی نظام کے متعلق متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں مگر ابھی تک اس شکل سے کاکوئی تفسیری بخش حل نہیں ہوا ہے۔

اصل کتاب میں جو خیال ظاہر کیا گیا ہے اُسے اولاً توک ول نے پسید کیا اور وائٹس نے اُسے مدون کیا۔ مگر خیال اس اقتدار اسطے کی اصلیت کے منافی ہے جو سلطنت میں سب سے بڑی طاقت ہوتا ہے اور اس لئے اپنے حدود اور اپنے اغراض دونوں کے اعتبار سے وہ ناقابل تقسیم ہے۔

ٹھہ اس بحث پر کہ سوئس متفقیات کو قوانین متفقیات کے نافذ کرنے کی ذرائع حاصل ہیں دیکھو بروٹی من کی کتاب "شمال امریکی قانون متفقیات کا مقابلہ سوئس تنظیمات سیاسی کے ساتھ" دو حصے۔ مطبوعہ زیورچ۔

اگرچہ شاہ پروشیا جینیت شہنشاہ کے تمام متفقیت کا واحد سرگروہ سمجھا جاتا ہے اور منفرد سلطنتوں کے ایوانوں سے ڈاٹ پوری طرح پریمیز اور ملحدہ ہے تاہم متفقہ حکومت اور منفرد سلطنتوں کے کارکنوں میں بہت قریبی تعلقات ہوتے ہیں متفقیت اور اسکے ارکان کے جداگانہ اختیارات مطلقاً واضح نہیں کئے گئے ہیں بلکہ درحقیقت قصداً غیر معین چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ لیکن ان قواعد کی وجہ سے کہ شہنشاہی قانون ہمیشہ معوج جاتی قانون پر فائق ہوتا ہے اور ہر ایک شہنشاہی قانون کے لئے مجلس متفقہ کی منظوری ضروری ہے۔ متفقہ سلطنتوں کی حفاظت اور خود مختاری کا کافی سامان کر دیا گیا ہے اور انھیں قواعد سے اولاً تو اختلافات کی روک ہو جاتی ہے اور اگر احياناً اختلافات پیدا بھی ہوں تو بہت جلد طے ہو جاتے ہیں۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مجتمہ سلطنت معمولاً غیر ملکی معاملات سے تعلق رکھتی ہے اور مستثنیٰ طور پر ایسے اندرونی معاملات میں دخل دیتی ہے جنکی اہمیت عام ہوتی ہے سوہذا منفرد سلطنتوں کی خود مختاری سے اندرونی نظم و نسق کا کام لیا جاتا ہے اور شاؤ و نادہری بیرونی معاملات میں ان کا دخل ہوتا ہے۔

ساتواں مقالہ

اقتدار اعلیٰ اور اُسکے کارکن اعضا

سلطنت کے عمال اور عہدے

پہلا باب

اقتدار اعلیٰ کا تصور

اقتدار اعلیٰ کی اصطلاح

سلطنت طاقت قومی کا مجسمہ اور اُسکی شخصیت ہے۔ اسی طاقت کو اعلیٰ ترین منزلت اور وسیع ترین قوت کی حالت میں ”اقتدار اعلیٰ“ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اقتدار اعلیٰ کی اصطلاح پہلے پہل فرانس میں پیدا ہوئی اور فرانسیسی ہی علوم میں ابتداء اسے نشوونما حاصل ہوئی۔ بوڈین نے اُسے قانون عامہ کا بنیادی تصور بنا دیا۔ اُسوقت سے اس لفظ اور اس خیال نے جدید نظام ہائے سلطنت کے نشوونما اور زماں جدید کی تمام سیاسیات پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے۔

ازمنہ وسطیٰ میں اقتدار شاہانہ یا اقتدار اعلیٰ کا لفظ اور بھی زیادہ وسیع معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ ہر ذی اختیار جس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا تھا اور جس کا ہر کسی بلا است کے روبرو نہیں ہو سکتا تھا اسے ”صاحب اقتدار اعلیٰ“ کہتے تھے۔ اعلیٰ ترین عدالتوں کو عدالت ذمی اقتدار کہتے تھے پس اس طرح سلطنت کے اندر بہت سے ذمی اقتدار عہدے اور جماعتیں ہو کر رہی تھیں لیکن تدریج یہ لفظ خالص انتظامی شاخوں کیلئے متروک ہوتا گیا اور سلطنت کی سب سے اعلیٰ حکمران طاقت کے لئے محدود ہو گیا اور اس لفظ کے تصور کا اطلاق صرف سلطنت کی مجموعی طاقت پر ہونے لگا۔

فرانس میں اقتدار اعلیٰ تصور اقتدار اعلیٰ بحیثیت اختیار مطلق

سولہویں صدی کے بعد سے فرانسیسی سیاسیات کے مرکزی میلانات اور فرانسیسی بادشاہوں کی

اختیار مطلق حاصل کر نیکی کوششیں اس خیال پر کلیتہً عادی ہوئیں تھیں۔ بودین نے یہ خیال غائب کر دیا کہ اقتدار اعلیٰ سلطنت کی دائمی اور علی الاطلاق طاقت کا نام ہے اور اس لفظ کا ہی مفہوم رائج ہو گیا۔ لوئس چارلیم اور ۱۷۹۳ء کی مجلس ملی کے انقلابی، دونوں یکساں طور پر خود کو مقتدر علی الاطلاق سمجھتے تھے مگر دونوں غلطی میں مبتلا تھے۔ جدید نیابتی حکومت میں اقتدار مطلق کا کہیں پتہ بھی نہیں ہے، اور نہ دنیا میں آزادی مطلق کا کہیں وجود ہے۔ اس لامحدود وقت اور اعلیٰ سے نہ تو سیاسی آزادی کو سواقت ہو سکی اور نہ سلطنت کے دوسرے اجزاء عناصر کا حق اس سے مطابقت رکھ سکتا ہے اور جہاں کہیں لوگوں نے اس کے عمل میں بالائی کوشش کی ہے، تاریخ نے اُنکے ادعا کا بطلان ثابت کر دیا ہے۔ خود مختاری سلطنت تک کو اقتدار مطلق نہیں حاصل ہے کیونکہ خارجی طور پر وہ دوسری سلطنتوں کے حقوق سے محدود ہے اور داخلی طور پر خود اپنی نوعیت اور اپنے منفرد ارکان کے حقوق کی پابند ہے۔

جرمانی زبان میں اس خیال کے کامل طور پر ظاہر کر نیکی لئے کوئی مناسب لفظ نہیں ہے لفظ "اوبر گروہالت" Obergewalt یعنی طاقت اعلیٰ یا سوورینٹڈ والوں کا قدیم فقرہ جس کے معنی ہیں: "بزرگترین اور وسیع ترین اقتدار" اس سے صرف اندرونی اقتدار کا خیال پیدا ہوتا ہے، یہ صرف آزادی کا تصور نہیں قائم ہوتا۔ لفظ "سٹاٹس ہواشت" Staatsheist سے سلطنت کے اختیار کے بجائے زیادہ تر اس کی عظمت و جلال کا اظہار ہوتا ہے اور "سٹاٹس گروہالت" Staatsgewalt میں عظمت سے زیادہ طاقت کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے اہل جرمانا

اقتدار اعلیٰ کے لئے
جرمانی زبان کی
اصطلاحات

سے تیرس اپنی "تاریخ انقلاب فرانس" میں لکھتا ہے کہ انقلابیوں کی رائے میں قوم اپنے اس اختیار کو بھی اپنے سے جدا نہیں کر سکتی کہ وہ اپنے حسب خواہش جس وقت جو چاہے کرے اور جو چاہے حکم دے۔ یہی اقتدار اعلیٰ کے اقتدار مطلق کی بناء ہے اور یہ اقتدار اُس سے ملحدہ نہیں کیا جاسکتا پس قوم نہیں کر سکتی کہ وہ خود کو لوئس چارلیم کی فرمانبرداری کا پابند کر دے۔ سینے نے اس نظریے کی غلطی کو تسلیم کیا ہے۔

سے ہنور کے اعلان مشہورہ مسئلہ میں مرقوم ہے کہ "اقتدار شاہانہ کے حقوق میں مطلق انسانی کا کوئی خیال شامل نہیں ہے۔ برطانیہ غلطی کا بادشاہ اپنے اقتدار شاہانہ کے اعتبار سے یورپ کے کسی حکمران سے کم نہیں ہے اور اسکی رعایا کی آزادی اُسکے تخت کے لٹ دینے کے بجائے اسے استحکام کا باعث ہے۔"

مجسور میں کہ اقتدار اعلیٰ کے مفہوم کے ادا کر نیے لئے دھڑوں لفظ استعمال کریں یعنی Statshoheit und Statagewalt لیکن اسکے ساتھ ہی ان جبرانی الفاظ میں ایک خاص فائدہ بھی ہے کہ فرانسیسی اصطلاح کی بہ نسبت ان سے مغالطہ ہونیکا اندیشہ کم ہے۔ ان میں اختیار مطلق کے مفہوم کے پیدا ہونیکا احتمال نہیں رہتا۔

اقتدار اعلیٰ
کی خصوصیات

اقتدار اعلیٰ کے مفہوم میں اسور ذیل داخل ہیں :-

۱۔ اقتدار سلطنت کا کسی دوسری سلطنت کی ماتحتی سے آزاد ہونا۔ تاہم اس آزادی کو بھی مطلق آزادی نہیں بلکہ ایک نسبتی آزادی سمجھنا چاہئے۔ قانون اقوام جو تمام سلطنتوں کو ایک باہمی تنظیم قانونی میں منضبط کرتا ہے وہ سلطنتوں کے اقتدار اعلیٰ کے لئے اس آئینی قانون سے زیادہ منافی نہیں ہے جو سلطنت کے حدود کے اندر ان کے اختیار عامہ کے عملدرآمد کو محدود کرتا ہے۔ ایک رقبہ سلطنت کے اندر منفرد سلطنتیں بھی اقتدار شاہانہ رکھ سکتی ہیں۔ گو کہ غیر ملکی حکمت عملی اور فوج کی نگرانی وغیرہ کے سے اہم معاملات میں وہ سلطنت اعلیٰ کے تابع ہوتی ہیں۔

۲۔ اعلیٰ منزلت عامہ جسے اہل روم Majestas (جلالت) کہتے تھے۔

۳۔ اختیارات عامہ کا مخصوص نہ ہونا بلکہ مکمل اور وافر ہونا۔ اقتدار اعلیٰ چند منفرد اور مخصوص حقوق کے مجموعے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک عام اور وسیع حق ہے۔ یہ مرکزی تصور کی حیثیت رکھتا ہے اور قانون عامہ میں اسکی اہمیت ویسی ہی ہے جیسے قانون ذاتی میں ملک کی اہمیت ہے۔

۴۔ علاوہ اسکے یہ اقتدار اعلیٰ سلطنت میں سب سے بلند شے ہے۔ پس کوئی سیاسی طاقت اس سے بالاتر نہیں ہو سکتی۔ ازمنہ وسطیٰ کے فرانسیسی امرا جب اہم معاملات میں حیثیت آقا شے اعلیٰ کے بادشاہ کی اطاعت پر مجبور ہوئے تو پھر وہ خود با اقتدار نہیں رہے۔ جرمانیا کے الیکٹر (حکمرانان ولایات) جو دسویں صدی سے اپنی اپنی ملکیت کے اندر اپنے اقتدار اعلیٰ کو قائم کئے ہوئے تھے۔ لافنگ ہاؤس کو یہ اقتدار اعلیٰ کو

دلف، جرمانیا کے دوسرے حکمرانوں کے مقابلے میں الیکٹر (حکمرانان انتخاب کنندہ) کے اقتدار اعلیٰ کی بناؤں میں فران پر ہے جو شہنشاہ میں چارلس چہارم نے شائع کیا تھا۔ (انگریزی سترجم)

اپنے حق خاص کے طور پر ان ملکوں میں کام میں لاتے رہے تھے۔
 ۵۔ چونکہ سلطنت ایک عضوی جسم ہے اس لئے اسکی خوشحالی کے لئے وحدت اقتدار کا ہونا ایک لازمی شرط ہے۔ لہذا اقتدار اعلیٰ کے منقسم ہو جانے سے سلطنت سفل اور زوال پذیر ہو جاتی ہے اور اس لئے سلطنت کے تو مندرہ بنے کیلئے وحدت عمل لایا جاتا ہے۔

۱۔ ایسا نوٹیل ہیرمن فشتے کا یہ کہنا کہ سلطنت کا "وحدت عمل" ہی اقتدار اعلیٰ ہے۔ حد سے بڑھ جاتا ہے۔ کامل اختیار و جلال اقتدار اعلیٰ کے اصل ہیں۔

تعلیقاً

(۱) روسو، جسکے نظریات کو فرانسیسی انقلاب نے واقعہ کی صورت میں بدل دیا تھا۔ وہ اقتدار اعلیٰ کو "مرضی عامہ" پر مبنی کرتا ہے۔ اور اس طرح اس نے غلطی کی ہے کہ "مرضی اعلیٰ" کو "اقتدار اعلیٰ" کے بجائے رکھ دیا اسکے بعد وہ یہ دلیل لایا ہے کہ چونکہ اختیار منتقل ہو سکتا ہے مگر مرضی منتقل نہیں ہو سکتی (معاہدہ معاشرتی ۲، ۱) اس لئے اقتدار اعلیٰ ناقابل انکار ہے۔ وہ قانون کو یہ سمجھا ہے کہ قانون بنفسہ مرضی کی پیداوار ہے، اسکی تحدید نہیں ہے۔ "مرضی" میں وہ "چاہئے" کو قبول جاتا ہے، اور ابتدائی غلطی متعدد دوسری غلطیوں کا منبع ہے۔ مرضی انسانی جذبہ کا ظہور و بیان ہے مگر اقتدار اعلیٰ کسی طرح کی سلطنت کا قانونی ادارہ نہیں ہے۔ مرضی قانون کے عمل میں آنے کی محرک اور اس کے تیز رفتاری کی موجب ہو سکتی ہے، مگر موزنی نفسہ قانون نہیں ہے۔ فرمانروا کی مرضی کے لئے اقتدار اعلیٰ شرط مقدم ہے مگر اسکا عکس نہیں ہے۔

(۲) یہ امر سیرق استدلال کے خلاف ہے کہ اقتدار اعلیٰ، سلطنت و قانون کا منبع سمجھا جائے اور صاحب اقتدار سلطنت سے بالاتر قرار دیا جائے۔ سلطنت کا اقتدار اور جاہ و جلال سلطنتوں کے وجود کو پہلے ہی تسلیم کر لیتا ہے۔ پس اقتدار اعلیٰ قانون عامہ کے اندر داخل ہے۔ اُس سے بالاتر نہیں ہے۔

(۳) کنٹامنس فرانس کا دعویٰ یہ ہے کہ اختیار کے بعد سلطنت کا "حس ارادی" اقتدار اعلیٰ کی خاص صفت ہے۔ مگر جس اگرچہ حق کے عمل میں لانے اور قانون کے نافذ کر نیے کے لئے ضروری ہے مگر خود حق یا قانون کی لازمی شرط نہیں ہے۔

دوسرا باب

قوم یا سلطنت کا اقتدار اعلیٰ اور حکمران کا اقتدار اعلیٰ

اقتدار اعلیٰ کا تعلق کس سے ہے؟ سیاسی جماعتیں اس سوال کے جواب میں مختلف رائے ہیں بلکہ جو شخص علیٰ حیثیت سے اسکا مطالعہ کر رہا ہو اُسے بھی بہت سی مشکلات اور تعصبات پر غالب آنا پڑتا ہے۔

۱۔ قوم کا اقتدار اعلیٰ
اس طرح کہ قوم افراد کا
مجموعہ سمجھی جائے۔ یہ
موافق الحکومت ہے

ایک رائے یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ قوم کو حاصل ہوتا ہے۔ روسو کے زمانے اور انقلاب فرانس کے وقت سے اس رائے کی اشاعت بہت وسعت سے ہوئی ہے۔ یہ رائے اگر صحیح ہے تو سوال یہ ہے کہ قوم کیا ہے؟ بعضوں کے نزدیک، قوم، افراد کے اُس مجموعے کا نام ہے جو سلطنت کے اندر متحد ہو گئے ہوں یعنی سلطنت کو ریزہ ریزہ کر کے، اعلیٰ اقتدار اس بے نظم و ترتیب مجموعے کو یا ان افراد کے حصہ کثیر کو عطا کر دیا گیا ہے۔ یہ انتہائی بخشن رائے خود سلطنت کے وجود کے منافی ہے۔ حالانکہ سلطنت ہی اقتدار اعلیٰ کی بنیاد ہے۔ یہ رائے کسی نظام سلطنت سے مطابقت نہیں پیدا کر سکتی کیونکہ وہاں ہی سلطنت کے اختیارات کا عملدرآمد ایک با ترتیب قومی مجلس کے ہاتھ میں ہوتا ہے، بے ترتیب جمعوں کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔

۲۔ قوم کا اقتدار اعلیٰ
اس طرح کہ اُس سے
مستعد و اہل ملک کی
جماعتیں ہوں یہ
صورتِ خارجہ اسطے
مقبول نہیں ہو سکتی

بعض دوسرے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ سب اہل ملک برابر حیثیت سے ایک یا زیادہ مجلسوں میں مجموعی طور پر رائے دیں، یعنی یہ لوگ حکومت عوام میں عوام کے اقتدار اعلیٰ کو زیرِ نظر رکھیں۔ قوم کے اقتدار اعلیٰ کے اصول سے اگر یہی مفہوم ہو اور حکومت اسی صورت تک محدود رہے تو اُسکے بھی ایک معنی ہو سکتے ہیں اور اُسے ہم صحیح سمجھ سکتے ہیں مگر نیاتِ عمومی میں اس اصول کا پوری طرح استعمال نہیں ہو سکتا کیونکہ اس طرز حکومت میں بالعموم اقتدار اعلیٰ کا استعمال اہل ملک براہِ راست نہیں بلکہ بالواسطہ اپنے نائبوں کے ذریعے سے کرتے ہیں۔ اسکے سوا اور کسی قسم کی حکومت سے یہ اصول مطابقت نہیں پیدا کر سکتا کیونکہ اس میں یہ لازم آتا ہے کہ سلطنت کا سر تاج کترین باشندہ ملک کے برابر ہو

اور حکمران چونکہ تعداد میں قلیل ہوتے ہیں واسلئے وہ اپنی رعایا کے حصہ کثیر کے تابع ہو جائینگے۔ پس اسکے معنی یہ ہیں کہ جسم سلطنت میں پانوں کو وہ مرتبہ ملے جو سر کا ہے اور سر پاؤں کی جگہ لے لے۔

بعض وقت مذکورہ بالا دونوں رائیں ایک دوسرے میں خلط ملط کر دیتی ہیں۔ پہلی رائے طوائف الملوکی کی طرف لیتی ہے اور دوسری خالص عمومت کی طرف اور بائیں ہمدانکے موید عام طور پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ تمام و کمال صحیح ہیں لیکن یہی وہ امر ہے جو نظریات میں خطرناک ہے۔ انکا مفہوم اور انکا اقتضا یہ ہے کہ بلا واسطہ عمومت کے علاوہ اور تمام نظام ہائے سلطنت برباد کر دیے جائیں۔

ان رایوں کی تائید ایسے فریقوں نے کی ہے جو ایک دوسرے کے بالکل مخالف تھے مگر یہ تمام فریق ہمیشہ وہی رہے ہیں جو موجودہ نظام سلطنت یا حکومت سے شاکلی تھے اور اُسے

۱۔ بائیں ہمدانک
۲۔ سطح تشریح کی گئی ہے
۳۔ گواہ تمام دنیا کی
۴۔ مسئلہ رائیں ہیں۔

۱۔ یہاں ہمارا اشارہ فرقہ یسوعیوں Jesuits کے قایدائیسٹس کے اور مئی فرقے کے دو اور شخصوں بیلدرن اور ماریانا کے نظریوں کی طرف ہے۔ جنہوں نے قوم کے اقتدار اعلیٰ کو اس غرض سے اپنی حمایت میں لے لیا تھا کہ وہ سلطنت کے اور پر کلیسا کے اور بادشاہوں کے اوپر پوپ کے حقوق کو قائم کریں۔ بادشاہوں کو اختیار قوم سے حاصل ہوتا ہے اور صرف پوپ کو خدا کی طرف سے اختیار حاصل ہوتا ہے (سولہویں اور سترہویں صدی میں قوم کے اقتدار اعلیٰ کا اصول جس طرح پیدا ہوا اور ایک طرف فرقہ یسوعی اور دوسری طرف فلسفی متقدموں نے اُسے سطح ترقی دینی اسکے لئے گیر کر لی تصانیف لکھنا چاہیں) لیکن اس مہول کی اشاعت میں روسو کا اثر سب سے بڑھا ہوا تھا۔ اُسکے خیال کے موافق افراد کا مجموعہ اپنے معاشرتی معاہدے کی رو سے متحد ہو۔ وہی صاحب اقتدار اعلیٰ ہے، یعنی ہر شخص ایک ہی وقت میں صاحب اقتدار بھی ہے اور ماتحت بھی ہے۔ اقتدار اعلیٰ عام مرضی کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ مادہ اقتدار اعلیٰ ناقابل افکاک ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ حصہ کثیر اگر چاہے تو حکام کی اطاعت سے انکار کرے اور نظام سلطنت کو بدل دے۔ ایسا کرنے میں وہ صرف اپنے اقتدار اعلیٰ پر عمل کرتا ہے اور اسکی مرضی کے مقابلے میں خود نیابتی جماعت کا حاصل کردہ اختیار کو کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ آخر الکلام یہ کہ روسو کی رائے کے موافق قوم کی جماعت کے لئے کوئی بنیادی قانون نہیں ہو سکتا۔ تمام قوانین صرف قوم کی مرضی کا فہرہ ہیں اور جب اُنکی رائے بدل جائے تو قوانین کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

اٹ دینا چاہتے تھے۔ فرانسیسی انقلاب کے وقت قوم کا اقتدار اعلیٰ تباہی و بربادی کا ایک جھلک آکر نظر آیا تھا۔ مجلس قومی نے اپنے ۲۰ اپریل ۱۷۹۲ء کے اعلان جنگ میں روسو کے نظریے کو باضابطہ شائع کیا اور لکھا کہ اس میں مطلق شک نہیں کہ فرانسیسی قوم نے صفات طویر یہ اعلان کر دیا ہے کہ اقتدار اعلیٰ کا تعلق صرف قوم سے ہے اور وہ اس ناقابل انتقال اختیار کو کسی دوسرے کو تفویض نہیں کر سکتی، اعلیٰ اعلیٰ مرضی کے عکس آکر کوئی قید یا پیموکتی ہے تو وہ آئندہ نسلیوں کے حقوق ہیں۔ قوم نے اس امر کو تسلیم کر لیا ہے کہ کوئی رواج کوئی معاہدہ انسان کی سوسائٹی (نظم معاشرت) کو کسی ایسے اقتدار کے تابع نہیں کر سکتا جس کے واپس لینے کا انھیں حق نہ ہو۔ یہ قوم کو خود ہی اپنے لئے قوانین بنانے کا اختیار ہے اور ان کے بدلنے کا ناقابل انتقال اختیار بھی اسی کو حاصل ہے۔ یہ کسی ایک شخص کا حق نہیں ہے بلکہ سب کا حق ہے۔ بادشاہی کے برباد ہو جانے کے بعد جو مجلس عام برپا ہوئی اس نے اس اصول کے مزید پتہ چاہ رکھے۔ لیکن ہم نے اپنے زمانہ میں بھی اس اصول کا پیرس کے اوپیل ڈول (ڈاؤن ہال) میں دوبارہ اعلان ہوتے سنا ہے۔ اس قسم کے اقتدار اعلیٰ کے عمل سے سرکش اہل پیرس نے فروری ۱۷۹۰ء میں آئینی بادشاہی کو منسوخ کر دیا، جمہوریت کا اعلان کیا اور امارت مطلق کو ایک عارضی حکومت کے سپرد کر دیا۔ لامارٹین کے ایک سرکاری اعلان میں لفظ مذکور ہے کہ ہر فرانسیسی جو سن بلوغ کو پہنچ گیا ہو اس کا شمار ملک کے شہریوں میں ہے اور ملک کے شہری رائے دہندہ ہے اور ہر رائے دہندہ ذی اقتدار ہے یہ حق سب کو یکساں اور کامل طور پر حاصل ہے۔ کوئی باشندہ ملک دوسرے سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرا اقتدار اعلیٰ تجھ سے زیادہ ہے، اپنی طاقت پر غور کرو۔ اسکو کام میں لائیکے لئے تیار ہو جاؤ اور خود کو اپنے اقتدار اعلیٰ پر قابض ہونیکا اہل ثابت کرو۔“

ہم عقل یا انصاف کا
اقتدار مانے۔

بعض فرانسیسی مدبروں نے یہ کوشش کی ہے کہ اس قومی اقتدار اعلیٰ کے تباہ کن خیال کے مقابلے میں عقل یا انصاف کے اقتدار اعلیٰ کا ایک دوسرا خیال قائم کریں۔ انکی یہ کوششیں

۱۷۹۲ء میں فرانسیسی کی تقریر میں کہتا تھا کہ سوسائٹی کے دو عنصر ہیں ایک مادی یعنی افراد اور انکی قوت و مرضی، دوسرا اخلاقی یعنی قانون، جو اغراض جائز کا نتیجہ ہے۔ کیا تم سوسائٹی کو مادی عنصر سے پیدا کرنا پسند کرتے ہو؟ اس صورت میں افراد یا انکی ریالوں کے لئے خیر و اقتدار اعلیٰ حاصل ہو گا۔

نیک ارادے سے ہوئیں مگر ان میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ ان لوگوں نے اس طریقے سے قوم کے اقتدار اعلیٰ کے بڑے مصروفوں کے روکنے کی کوشش کی مگر وہ اس امر کو بھول گئے کہ کسی حق کا تعلق ”شخص“ اسی سے ہو سکتا ہے اور سیاسی حقوق کسی سیاسی شخصیت ہی کی طرف منسوب ہو سکتا ہے۔ ایک غلطی تو یہ ہے کہ سلطنت کی اصولی ہیئت صرف کامل عیسویت ہی تسلیم کیا جاتی ہے۔ اب دوسری غلطی یہ ہوئی کہ اسکے مقابلے میں تحیل پرستی (حکومت مذہبی) قائم کی گئی۔ مقصود یہ ہے کہ قوم کا حصہ کثیر خیالات کے تابع ہو کر کام کرے مگر شخصیت ہمیشہ خیال کی بنسبت زیادہ قوی رہتی ہے۔

ایک دوسری رائے یہ ہے کہ قوم کو ایک شخص واحد سمجھ جو اگرچہ کافی طور پر نظم نہ ہوگی تو تاہم اس میں انتظام کے قبول کرشمی قابلیت موجود ہو اور اس واحد حیثیت سے اس کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کیا جائے جبکہ مفہوم یہ ہے کہ قوم اپنی زبان، اپنے عیسیات، اور اپنے معاشی، اقلیات کے ساتھ اپنے سب مرضی سلطنت میں بھی تغیر کر نیک حق رکھتی ہے۔

۵۔ قوم کا اقتدار اعلیٰ اس جملے سے کہ قوم ایک شخص نہ ہے۔

ہم اس سے پہلے (مقالہ ۲، باب ۲ میں) یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ ملت People

میں قوم nation بننے کا مادہ موجود ہوتا ہے، اور اس لئے ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اقتدار اعلیٰ کی بنا پڑنے کیلئے یہ ایک فطری شرط ہے مگر یہ صرف امکان ہے اس کا حصول نہیں ہے۔ اس مفہوم میں قوم کا اقتدار اعلیٰ ایک غیر ترقی یافتہ اور خام شے ہے جسے سلطنت کا پیشرو کہنا چاہئے۔ یہ ممکن ہے اور یہی ہونا چاہئے کہ ہم nation یا People کو یہی مفہوم میں

۶۔ قوم و سلطنت کا اقتدار اعلیٰ

بعینہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ اسی کو قوم کا اقتدار اعلیٰ کہتے ہیں۔ اگر یہ کو رائے دہانما اقتدار اعلیٰ طوعاً یا کرہاً اپنی حالت کو بدلے بغیر ایک یا چند افراد کے ہاتھ میں منتقل ہو جائے تو یہ نسبتاً ایک زیادہ عاقلانہ اور معتدلانہ قوت بن جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ قوت ہی رہتا ہے۔ یہی طلق العنان قوت اور امتیاز خاص کا بدلہ بن جاتا ہے کیا اسکے برخلاف تم سوسائٹی کو اخلاقی عنصر یعنی ”حق“ سے پیدا کرنا پسند کرتے ہو؟ ایسی صورت میں انصاف کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ حق کا اصول انصاف ہے۔ آزادانہ اس سلطنت کا مقصد یہ ہے کہ قوت کو معزول کر کے انصاف کو مرکز بنادے (اس پر پہنچی کا اعتراض یہ ہے کہ قوم مادی عنصر نہیں ہے) اور اس خیال میں بھی قانون عامہ کو افراد کی مرضی سے اخذ کرشمی پرانی غلطی ہے۔ اردو ترجمہ ”سیاسیات“ مقالہ ۳، فصل ۱۱ ف ۱۹۔ انگریزی سترجمہ

ایک زندہ مجسمہ سمجھیں جسے سر اور اعضاء ہوتے ہیں گو یا وہ سلطنت کی ذی حیات (یا عضوی) شخصیت ہے۔ جب تک سلطنت ایک شخص کی حیثیت رکھتی ہے اس وقت تک اسکے لئے خود مختاری، عزت، طاقت، اعلیٰ اختیار اور وحدت عمل کا ہونا لازمی ہے۔ اسے ایک لفظ میں یوں کہئے کہ اسکے لئے "اقتدار اعلیٰ" ضروری ہے۔ سلطنت بحیثیت ایک شخص کے صاحب اقتدار اعلیٰ ہے اور اسی لئے ہم سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ سلطنت سے مقدم، سلطنت سے خارج یا سلطنت سے بالاتر کوئی شے نہیں ہے۔ یہ خود سلطنت ہی کی قوت اور اسی کی غلت و شوکت ہے۔ یہ تمام مجموعے کا حق ہے اور جس طرح کل اپنے کسی جز سے بالیقین قوی ہوتا ہے اسی طرح کل سلطنت کا اقتدار اعلیٰ بھی سلطنت کے کسی جز کے اقتدار اعلیٰ سے یقیناً بالاتر ہے۔

اگر فرقانہ مناقشات نے ابتری زیر یا کر دی ہوتی، تو سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کو قوم کا اقتدار اعلیٰ کہنا بالکل درست ہوتا بشرطیکہ قوم سے ہم صرف منفرد اشخاص کا بنو نہ سمجھیں بلکہ اسے ایک منظم سیاسی مجموعہ سمجھیں، جس میں سر کو سب سے بلند درجہ حاصل ہو اور ہر عضو اپنی مناسب جگہ پر ہو۔ اس مفہوم میں فرانسیسی معنی میں نے فرانسیسی محاورے کے موافق nation کے اقتدار اعلیٰ سے بحث کی ہے مگر جو جرمانی زبان کے خلاف ہے جیسا کہ مقالہ ۲ باب ۲ میں مفصلاً بیان ہو چکا ہے۔ غلط فہمیوں سے بچنے کیلئے ہم نے بہم فقرہ سلطنت کا اقتدار اعلیٰ استعمال کیا ہے۔

سلطنت کے اس اقتدار اعلیٰ پر داخلی اور خارجی دونوں طریق پر نظر کیا جاسکتی ہے۔

۳۔ اسٹو نے اپنے رسالے ابست ۱۸۷۸ میں کہتا ہے: کوئی شخص قوم nation کے اقتدار اعلیٰ سے انکار نہیں کر سکتا بشرطیکہ قوم سے یہی حیثیت سے تمام قوم مراد ہو جس میں باجواہ اور رعایا دونوں داخل ہوں اگر قوم کا کوئی جز نہ ف اپنے لئے اقتدار اعلیٰ کا دعوے کرے اور کہے کہ "میں سلطنت ہوں" تو اس سے کچھ بحث نہیں کہ وہ جز بادشاہ ہے، پارلیمنٹ ہے یا گرد عوام ہے۔ یہ اصول غلطے اور غلط اصول کے نتیجے میں ہمیشہ خطرناک ہوتے ہیں "سمونڈی نے بھی People کے اقتدار اعلیٰ اور nation کے اقتدار اعلیٰ میں ایسا ہی سخت فرق کیا ہے اور اہل الذکر کو ستر اور ثانی الذکر کو قبول کیا ہے (دیکھو سمونڈی کی تصنیفات جلد ۱ صفحہ ۸۸)

خارجی حیثیت سے یہ کہ کوئی خاص سلطنت دوسری سلطنتوں کے تعلقات کے اعتبار سے کس حد تک خود مختار ہے۔ کلیسا کے تعلق کو اسی ضمن میں سمجھنا چاہئے۔ داخلی حیثیت سے یہ کہ جماعتِ عامہ کو قانون سازی کا حق کس حد تک حاصل ہے۔

انگلستان میں اس مفہوم میں اقتدارِ اعلیٰ پارلیمنٹ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جوکل قوم کی نیابت کرتی ہے اور جس کا سرگروہ بادشاہ ہوتا ہے۔ یہ امر صرف انگلستان کے

لے انگلستان کے بادشاہ ہنری ہشتم نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں پارلیمنٹ میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ جموں نے ہیں اس امر سے مطلع کیا ہے کہ ہماری شاہی حیثیت کسی وقت بھی اس سے بلند نہیں ہوتی جیسی کہ پارلیمنٹ کے دورانِ اجتماع میں ہوتی ہے، جب کہ ہم اور تم (علی الترتیب) بحیثیت سر اور دیگر اعضاء کے ایک جسمِ سیاسی میں متحد ہو جاتے ہیں۔ پس اس ایوان کے ادنیٰ ترین رکن کے خلاف بھی جو کچھ کیا جائے وہ گویا ہماری ذات خاص اور تمام دربار پارلیمنٹ کے خلاف کیا گیا ہے۔“

(ب) [بادشاہ کو پارلیمنٹ کا ایک جز قرار دیتے ہیں بلجی کی انگلستان کے آئینی مقننوں کی تائید حاصل ہے، چنانچہ میک ہسٹون اپنی تشریحات Commentaries کی کتاب دوم باب دوم میں لکھتا ہے کہ پارلیمنٹ کے اجراء کے ترکیبی میں ذی نفیست بادشاہ (جو اپنی شانہ سیاسی حیثیت سے شریک ہوتا ہے) اور ملک کے تینوں طبقات داخل ہیں۔ مقتدا یا ان دین اور امرائے دنیاوی سے بادشاہ کے ایک دیوان میں بیٹھے ہیں اور عوام اپنے طور پر دوسرے ایوان میں نشست کرتے ہیں۔“ وہ ایسی نے اپنی کتاب ”قانون نظام سلطنت“ میں لکھا ہے کہ ”پارلیمنٹ کا لفظ اگرچہ عام بول چال میں اکثر کچھ اور ہی معنی میں استعمال ہوتا ہے مگر ایک مقنن کی زبان سے جب یہ لفظ نطقا ہے تو اس سے مراد بادشاہ، دارالامرا، اور دارالعوام سے ہوتی ہے۔“ مگر عام بول چال کی طرح تاریخی حیثیت سے بھی پارلیمنٹ بادشاہ سے ایک نمینر شئے ہے اور اس سے مراد طبقات رعایا کی وہ مجلس ہے جس کے مشورے اور مرضی کے بغیر بادشاہ کوئی قانون نہیں بنا سکتا۔ یہ ایک پرانی غلطی ہے اور بار بار اسکی تصحیح کی گئی ہے کہ ملک کے تین طبقات سے مقصود بادشاہ، امرا اور عوام نہیں ہیں بلکہ ملک کے تین طبقات پادری، امرا اور عوام ہیں اور جہاں تک ان تینوں طبقات کا تعلق پارلیمنٹ سے ہے وہ بقول میک ہسٹون مقتدا یا ان دین امرائے دنیاوی اور ارکان دارالعوام ہیں۔ تیرہویں صدی میں تیسویں سے بحیثیت مجموعی یہ خواہش کی گئی تھی کہ وہ پارلیمنٹ کا ایک طبقہ بن جائیں، مگر انھوں نے اس سے انکار کر دیا (ایٹنسن نے اپنی کتاب ”نظام سلطنت کے قانون درواج“ میں پارلیمنٹ کی تعریف کی ہے کہ وہ ملک کے تین طبقوں کا اجتماع ہے جن میں سے ایک طبقہ اس میں شامل ہونے سے برابر انکار کرتا رہا ہے) بغیر بادشاہ کی طلبی کے

نظامِ سلطنت کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ زائدہ حال کی نیابتی تنظیمات کا اساسی مہول ہی ہے۔ حکمران جسمِ قوم کا سر سمجھا جاتا ہے مگر اسی وجہ سے وہ قوم کا ایک عضو بھی شمار ہوتا ہے لیکن سب سے اعلیٰ اقتدار یعنی قانون سازی کا اختیار سرگروہ کو تفویض نہیں ہوتا بلکہ اسکے ساتھ ایک نیابتی جماعت بھی ہوتی ہے گویا یوں کہنا چاہئے کہ کل مجموعہٴ سلطنت کو یہ کام سپرد ہوتا ہے۔ موروثیت کا خیال جو سلطنت کو حکمران کی ملک قرار دیتا ہے اور اس لئے اقتدار اعلیٰ کو صرف حکمران تک محدود رکھتا ہے اور مطلق العنانی کا کلیہ جو سلطنت اور حکمران کو ایک ہی شے قرار دیتا ہے، یہ دونوں اس امر کو نہیں سمجھتے کہ حکمران کی تمام طاقت فی نفسہ قوم ہی کی مجموعی طاقت کا نام ہے اور اگرچہ حکمرانوں اور خاندانوں کا زوال ہوتا رہتا ہے مگر قوم اور سلطنت کا قانونی وجود بدستور باقی رہتا ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ حقیقت کی مجلس پارلیمنٹ نہیں ہو سکتی اور اگر وہ بادشاہ کی مجلس سے نہ منعقد ہوئی تو اسکی شخصیت محض ایک "مجلس عارضی" کی ہے۔ اگر نری مسترحم) لے تسبیل قل سلطنت کے اس اقتدار اعلیٰ کو باطل قرار دیتا ہے۔ اسکا دعویٰ یہ ہے کہ شاہیوں میں صرف بادشاہ کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کیا جاتا ہے اور جمہوریوں میں رعایا کا اور اس خیال کو وہ صرف جرائیا ہی کی سلطنتوں تک محدود بھی نہیں رکھتا، لیکن اس صورت میں ہم روما کے قانون عامر کی کیا تعبیر کریں گے جو شہنشاہی اور جمہوریت دونوں کے تحت میں رومی قوم کو اقتدار اعلیٰ عطا کرتا تھا اور قانون کو ہمیشہ ہی قوم کی مرضی قرار دیتا تھا۔ سہذا جمہوریت کے زمانہ میں تفصلوں کو شاہانہ اختیارات عطا ہوتے اور اعلیٰ انتظامی اختیار اور محصول لگانہ کا حق سفیات کے ہاتھ میں رہتا تھا (جو یقین محکومتی اقتدار اعلیٰ کی ایک صفت ہے) علاوہ اسکے انگلستان کے قانون عامر کی کیونکر تعبیر کی جائیگی جو پارلیمنٹ اور قوم کے اقتدار اعلیٰ کو بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ سے ہم آہنگ بنا دیتا ہے۔ قانون قوم کی رو سے جرائیا کی سلطنتیں بھی اپنے حکمرانوں سے ملحدہ صاحب اقتدار اعلیٰ سمجھی جاتی ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ جب دوسری سلطنتوں کے مقابلے میں انکی شخصیت تسلیم کی جاتی ہے تو انھیں کے افراد ملک اور انھیں کے حکمرانوں کے مقابلے میں انکی شخصیت کیوں نہ تسلیم کی جائے۔ جرائیا میں قوانین سلطنت کے قوانین ہوتے ہیں اور قومی یا سرکاری قسرنے حکمرانوں کے قسرنے سے ایک جداگانہ شے سمجھے جاتے ہیں۔ منشا یہ ہے کہ حکمرانوں کے سرکاری مطلق معنائی اختیار کی رعایات باقیات کے باوجود جرائیا کا قانون عامر تمام دوسری تمدن سلطنتوں کی طرح

۷۔ حکمرانوں کا اقتدار اعلیٰ

تمام قوم کے اقتدار اعلیٰ کے علاوہ سلطنت کے اندر ایک اور اقتدار اعلیٰ ہوتا ہے یہ اقتدار سلطنت کے سب سے اعلیٰ رکن، سردار یا حکمرانوں کا اقتدار ہے اور چونکہ یہ اقتدار شاہی میں بہت صاف نظر آتا ہے اس لئے اُسے بادشاہ کا اقتدار شاہانہ کہنا چاہئے۔ تنظیم سیاسی کے تمام دیگر ارکان اور منفرد اہل ملک کے مقابلے میں قوم کے بادشاہ کو ایک مفہوم میں صاحب اقتدار اعلیٰ کہتے ہیں اور ہر ایک شاہی سلطنت میں اقتدار اعلیٰ بادشاہ ہی کے طرف منسوب ہوتا ہے۔

سلطنت کا اقتدار اعلیٰ اور بادشاہ کا اقتدار اعلیٰ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔ اس سے اقتدار اعلیٰ کی اس طرح تقسیم نہیں ہو جاتی کہ اسکا نصف حصہ قوم سے متعلق ہو جائے اور نصف حصہ بادشاہ سے۔ اختیارات کے لئے کوشش کرنوالی دو قیبتیں نہیں ہوتیں اختیارات کی وحدت و عمومیت دونوں میں شامل ہے مگر یہ عیاں ہے کہ کل جس میں سر بھی داخل ہے تنہا سر سے برتر ہے۔ تمام قوم یا سلطنت قانون بناتی ہے مگر سرگروہ کو جو اعلیٰ اختیارات حاصل ہوتے ہیں، قانونی حدود کے اندر وہ انھیں عمل میں لانے کے لئے بالکل آزاد ہوتا ہے۔ سلطنت کا اقتدار اعلیٰ بالخصوص قانون سے تعلق رکھتا ہے اور بادشاہ کا اقتدار اعلیٰ حکومت یا نظم و نسق سے متعلق ہوتا ہے۔ جہاں اول الذکر بیکار ہوتا ہے وہاں موخر الذکر کام دیتا ہے۔ واقعاً ان دونوں میں تضاد بہت کم ہوتا ہے اور اصولاً بالکل ناممکن ہے کیونکہ اس کے معنی یہ ہونے کہ تنہا سرگروہ تمام سلطنت سے جس میں خود وہ سرگروہ بھی داخل ہے مقابلہ کرے اور یہ بمنزلہ اس کے ہے کہ کوئی شخص خود اپنے سے مقابلہ کرے۔

قوم کے عمومی اقتدار اعلیٰ اور بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ میں کبھی اعلیٰ اتفاق نہیں ہو سکتا، مگر

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ یہ تسلیم کرتا ہے کہ قوم محض رعایا کے مجموعے سے ایک جداگانہ اور بالاتر شے ہے اور سلطنت کی ایک ہستی اور اسکی ایک عظمت و قوت ہے جسکا خاتمہ صرف بادشاہوں کی عظمت و قوت پر ہو جاتا ہے۔ میں تسلیم کی اس لئے کوانتا ہوں کہ اقتدار اعلیٰ کو تمام و کمال بادشاہ کے لئے تسلیم کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسکا اقتدار غیر محدود ہو گیا ہے لیکن زمانہ جدید کی تاریخ نے بلا بحث و تکرار یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ اخراجی اصول جرمایا اور نیز لاتینی حاکم میں مطلق انسانی اور قومی حقوق کی تحقیر کے لئے ایک زبردست موعید بن گیا ہے۔

سلطنت کے اقتدار اعلیٰ اور بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ میں ویسی ہی موافقت ہے جیسی موافقت کل جسم انسان اور اسکے سر کے درمیان ہوتی ہے۔

تعلیق۔ قوم کے اقتدار اعلیٰ کا فقرہ بعض وقت حصہ کثیر کا غلبہ ظاہر کرنے کے لئے نہیں بلکہ سلطنت کی اس شکل یا حکومت کے اس طرز کے اظہار کے لئے استعمال ہوتا ہے جو قوم کے حصہ کثیر کی ہستی و ہیبت کے منافی ہونے کے باعث بقا کی قابلیت نہیں رکھتی یا یہ کہ سلطنت یا حکومت کی صورت موجودہ قوم کے صوبہ خواہ ہے۔ یہ خیال فی نفسہ صحیح ہے مگر اس کے اظہار کا انداز بڑا اختیار کیا گیا ہے۔

علاوہ اس کے اگر قوم کے اقتدار اعلیٰ کا یہ مفہوم ہو کہ سلطنت کا اختیار اولاً قوم کے حصہ کثیر کی مرضی سے اخذ کیا گیا ہے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ بہت سی عمومیات اور (دو) شہنشاہی یا فرانسیسی شہنشاہی کے مثل بعض بعض شاہیوں کے نظام سلطنت کی بنیاد بھی (مگر ان کے نظری یا اصولی اعتبار سے) قوم کے حصہ کثیر کے رضامندانہ فعل پر مبنی ہے۔ علیٰ ہذا سوئٹزرلینڈ کے متعدد صوبوں کے نظام سلطنت میں قوم کو صاحب اقتدار اعلیٰ نہیں قرار دیا ہے بلکہ یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اقتدار اعلیٰ بحقیقت جمہوری قوم کو حاصل ہے اور مجلس عظمیٰ اسے عمل میں لاتی ہے، لیکن اس اصول کا اطلاق بھی تمام سلطنتوں پر نہیں ہو سکتا اور اقتدار اعلیٰ کا لفظ جس سے ایک دائمی حق کا اظہار ہوتا ہے جب کسی مخصوص اور عارضی کارروائی پر عائد کیا جاتا ہے تو ناموزوں ہو جاتا ہے۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ جیسا کہ اکثر علماء وقوع پذیر ہوتا رہا ہے، قوم کے اقتدار اعلیٰ کے معنی اگر یہ سمجھے جائیں کہ قوم حکومت سے علیحدہ نہیں ہے اور اس قسم کی قوم کو یا کسی خاقانہ اور پرجوش مجمع کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے حکومت کو الٹ پلٹ کر دے یا نظام سلطنت کو تباہ کر دے تو یہ ایسا خیال ہے جسے قطعاً مردود قرار دینا چاہئے اور جو عمومی اصولوں سے بھی کسی طرح موافق نہیں ہو سکتا۔

(انگلستان میں حال کے زمانے میں اقتدار اعلیٰ کے مسئلے پر زیادہ تر آسٹن کی مشہور تعریف کے موافق بحث ہوئی ہے۔ آسٹن نے اپنی جو سپروائٹس (اصول قانون) کے چھٹے جلد میں اقتدار اعلیٰ کی تعریف یہ کی ہے کہ اگر کوئی معین شخص بالاتر انسانی تہی عادت کسی نبی ہی کی بالاتر تہی کی فرماں پذیر ہو اور ایک مخصوص سوسائٹی کا سواہر اہم عاقل

اگر کافر یا پزیر ہو تو یہ یوں نہیں دشمن بالاترستی اس سوسائٹی میں صاحب اقتدار اعلیٰ ہے اور یہ سوسائٹی اس میں وہ بالاترستی ہی شامل ہے ایک سیاسی اور خود مختار سوسائٹی ہے اقتدار اعلیٰ کے تصور کا یہ بخود بخود تاریخ کے بالکل مخالف اور علیٰ حیثیت سے عیر الحصول ہے۔ سین نے اپنی تصنیف "قیدی تیار" میں "تفہیمات" کے خطبہ ۱۲ و ۱۳ میں اس پر لکھتے ہیں

کی ہے ۔ انگریزی مستحکم ۔

تیسرا باب

(الف) سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کا تجزیہ

۱۔ جلالیات ہر ایک منضبط شدہ قوم کا یہ حق ہے کہ اُس کا رتبہ اور عظمت تسلیم کی جائے اور اُسکی وقعت کیجائے۔ رومی اسے، جلالیت سلطنت، کے نام سے موسوم کرتے تھے اور رومی سلطنت کی عزت، اختیار، بلکہ اُسکی ترتیب و تنظیم تک کے خلاف جو کام ہوتا وہ، جلالیت سلطنت کے خلاف ایک جرم سمجھا جاتا تھا۔

۲۔ خود مختاری سلطنت کا دوسری سلطنتوں سے آزاد اور خود مختار ہونا۔ اگر کوئی سلطنت کسی دوسری سلطنت کے سیاسی تفوق کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو۔ تو اُس کا اقتدار اعلیٰ ذائل ہو جاتا ہے۔ اور وہ اُس دوسری سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کے تابع ہو جاتی ہے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ طرح کی تبعیت سے سلطنت کا اقتدار اعلیٰ کلیۃً منافی ہو جائے اس لئے کہ یہ ممکن ہے کہ تبعیت کامل نہ ہو۔ مرکب سلطنتوں، ششکئیوں، شفقتیوں اور شفقی شہنشاہیوں میں مختص سلطنتیں اگرچہ بعض اعتبارات سے مجموعے کے تابع ہوتی ہیں تاہم ان میں اضافی طور پر اقتدار اعلیٰ باقی رہتا ہے۔ یہ اختیار اگرچہ خارجی حیثیت سے محدود ہوتا ہے مگر داخلی حیثیت سے محدود نہیں ہوتا، چنانچہ سوئزر لینڈ میں صوبوں کا اقتدار اعلیٰ مجموعی اقتدار اعلیٰ سے بالکل علیحدہ سمجھا جاتا ہے۔ علی ہذا شمالی امریکہ اور جرمانی شہنشاہی میں اتحاد یا شہنشاہی کے اقتدار اعلیٰ اور متحدہ سلطنتوں کے اقتدار اعلیٰ میں فرق ہے۔

کسی منفرد سلطنت کا اضافی اقتدار اعلیٰ اسی حالت میں ممکن ہوتا ہے جب کہ خود اُس کا ایک سیاسی نظام موجود ہو، یعنی قانون سازی اور نظم و نسق وغیرہ کے سے ضروری اعضا خود اسی میں موجود ہوں، اور وہ کسی بڑی سلطنت کا محض ایک ممبر نہ بن گئی ہو۔ اس غیر حالت کے لئے ایک قطعی حد فاصل قائم کرنا بعض وقت مشکل ہو جاتا ہے۔

خارجی امور میں آج کل سلطنت کا اقتدار اعلیٰ بالعموم مجلس وضع قوانین کے بجائے سلطنت کے صدر یا سرتاج کی ذات سے ظاہر کیا جاتا ہے مگر یہ امر اصول کی بنیاد پر نہیں ہے۔

محض آسانی کے خیال سے ایسا کیا جاتا ہے۔

اندرونی تعلقات کے اعتبار سے اقتدار اعلیٰ کا اظہار سب سے پہلے رعایا کے اس حق سے ہوتا ہے کہ وہ اپنی سیاسی ہستی کے لئے جو شکل چاہے پسند کرے اور اگر ضرورت سمجھے تو اسے بدل بھی دے۔ اسے قوم کا اختیار کیسی کہتے ہیں۔ یہ اختیار قوم کے ایک بڑے یعنی محض اسکے حصہ کثیر کو تفویض نہیں ہو سکتا بلکہ بلا شک و شبہ اس حق کا تعلق ایک منظم قوم کی مجموعی حیثیت سے ہے۔ رعایا فرداً فرداً قوم کے حکم کی مخالفت نہیں کر سکتی خواہ اس میں اسکے سیاسی حقوق کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچتا ہو کیونکہ جب تک کہ ہر شخص فرداً فرداً قانون عامہ کے معاملات میں اطاعت نہیں کریگا اسوقت تک سلطنت اپنی صورت، اپنا ربط اور اپنا نظریہ قائم نہیں رکھ سکتی۔

ہر حکومت کی پسند
کرنے، درست کرنے بل
وہیہ کا اختیار

اصلاح

تاہم اخلاقی یا آئینی، کسی اعتبار سے بھی یہ امر نظر انداز کر نیکے قابل نہیں ہے کہ آیا تغیر، اصلاح کی صورت میں واقع ہوتا ہے یا انقلاب کی صورت میں۔ اصلاح کے لئے اسور ذیل لازمی ہیں :-

(۱) تغیر نظام سلطنت کی موافقت کے ساتھ واقع ہو یعنی ایک نیا تہی جہانت کے توسط سے عمل میں آئے اور بحالات ظاہر آئینی حد کے اندر ہو۔

لے ڈسٹنگشٹن نے اپنے ۱۹۶۷ء کے الوداعی خطبے میں کہا تھا کہ ”ہمارے سیاسی انتظامات کی بنیاد قوم کے اس حق پر ہے کہ وہ اپنے نظامہائے سلطنت کو خود بنا سکتی اور ان میں ترمیم کر سکتی ہے لیکن جو نظام سلطنت کسی وقت میں جاری ہو جب تک کہ وہ تمام قوم کی بین اور قطعی رائے سے نہ بدلا جائے اسوقت تک اسکی اطاعت کرنا ہر شخص کا مقدس فرض ہے۔ اس خیال ہی سے کہ قوم کو حکومت کے قائم کرنے کا اختیار دیا تھا حق ہے یہ لازم آ جاتا ہے کہ قوم کے ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ قائم شدہ حکومت کی اطاعت کرے۔ قوانین کے عملدرآمد میں کسی قسم کی مزاحمت، اور کوئی اجتماع، کوئی انجمن کیسی ہی دلفریب نام سے کیوں نہ ہو لیکن اگر اسکی اصلی غرض یہ ہے کہ قائم شدہ قوتوں کے کھٹ بے باک ختم یا انکی کارروائی کو اپنی مرضی کے موافق چلائے یا ان پر حاوی ہو جائے یا ان کے مخالف کارروائی کرے یا انھیں معزوب کر دے۔ تو یہ تمام امور اس بنیادی اصول کے تباہ کرنے اور قوم کو ہلاکت کی طرف لیجا بیٹھا ہے۔“

(۲) یہ تیز نظام سلطنت کے منشاء اُسی کے موافق ہو یعنی قدیم تنظیمات اگر طرف کی جائیں تو یہ ضروری ہے کہ وہ فی الواقع فرسودہ اور بے جوڑ ہو گئی ہوں اور نئی تنظیمات کے لئے نئے حالات نے راستہ صاف کر دیا ہو۔

اگر نظام سلطنت کے شرائط ظاہری یا اُسکے منشاء باطنی سے انحراف کیا گیا تو پھر یہ تیسرا اصلاح نہیں رہتا بلکہ انقلاب ہو جاتا ہے۔

اصلاح کا حق سلطنت کی قوت و طاقت کا ایک لازمی اظہار ہے۔ اس حق میں روک پیدا کرنا قوم کے نشو و نما سے انکار کرنا اور انقلاب کی بنا قائم کرنا ہے۔

استعمالی نظریہ سلطنت کا دعوئے ہے کہ انقلاب بھی قوم کا ایک حق ہے لیکن یہ بات قانون عامہ کے تصور ہی کے خلاف ہے۔ انقلاب کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو قائم شدہ نظام سلطنت بزرور توڑ دیا جائے یا اُسکے اصولوں سے روگردانی کی جائے پس اصولاً انقلابات کا کوئی حق نہیں ہو سکتا مگر اُسکے ساتھ ہی اس میں بھی شک نہیں کہ وہ پرزور نوامیس قدرت سے ہیں جو قانون عامہ کو میل دیتے ہیں۔ جو طاقتیں شور انگیز طور پر قوم میں تحریک پیدا کر دیتی ہیں ان پر جہاں کوئی روک نہیں ہوتی وہاں آئینی قانون کے باقاعدہ ملکہ رآمد میں خلل پڑ جاتا ہے۔ انقلاب کی موجودگی میں قانون بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ درحقیقت عملی سیاسیات کا یہ بہت بڑا کام ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو انقلابی تحریکات کو آئینی اصلاح کی شاہراہ پر چلا دے۔

مستثنیٰ حالت کے سوا انقلاب کا کوئی حق نہیں ہو سکتا۔ صرف یہی ضرورت اسے روا رکھ سکتی ہے کہ کوئی قوم اپنی ہستی کے بچانے یا اصلاح کے تمام راستوں کے بند ہو جانیکے باعث ترقی حاصل کر نیکے لئے مجبور ہو جائے۔ نظام سلطنت، قوم کا صرف ظاہری نظام ہے اور اگر اُسکی وجہ سے خود سلطنت تباہی کے گرداب میں پڑ جائے یا یہود عامہ کے اہم مفاد کو خطرہ پیش آجائے تو پھر ضرورت کسی قانون کو تسلیم نہیں کرتی۔

۱۸۳۰ء کی بورجواسیا سخت قدامت پرست تھا کہ جولائی ۱۸۳۰ء کے فرانسیسی انقلاب سے اُسکا دل ٹوٹ گیا تھا، وہ اپنا یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ ”اس اصول سے انکار کرنا کہ ضرورت کسی قانون کو تسلیم نہیں کرتی“ بدترین ظلم و ستم کی اجازت دیتا ہے۔ جب کوئی قوم پیروں کے نیچے روندی جا رہی ہو اور اُسکے ساتھ ایسا

اقتدار اعلیٰ کا ایک دوسرا منصب ہے ضروری قوانین کا وضع کرنا۔ نظام سلطنت بنانے کے اقتدار کی طرح تو ضیع قوانین کا اختیار بھی سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کا نتیجہ اور ساتھ ہی ساتھ اس کا صحیح منظر ہے۔

۳۔ وضع قوانین

اصولاً تمام اختیارات عامہ اسی اقتدار اعلیٰ کے تابع ہوتے ہیں بچانہ نظام سلطنت اور وضع قوانین کے ذریعے سے اقتدار اعلیٰ کی تمام دوسری نوعیتیں محدود و مرتب کی جاتی ہیں۔ نظام سلطنت کے ترتیب دینے اور قانون کے وضع کرنے میں سلطنت کا اقتدار اعلیٰ عملی حیثیت سے ظاہر ہوتا ہے ورنہ عام طور پر وہ ساکت و صامت رہتا ہے۔ شاہی میں یہ خاص بات ہے کہ دوسری قوتوں کے روز روز کے تغیر پذیر افعال بادشاہ کے اقتدار اعلیٰ میں مجتمع ہو جاتے ہیں۔ قوم بحیثیت مجموعی ساکت رہتی ہے اور اس کا سرگروہ بالواسطہ یا بلاواسطہ حکام و عمال کے ذریعے سے کام کرتا رہتا ہے۔

۵۔ سلطنت کی تمام دوسری طاقتوں کا اس اقتدار اعلیٰ کے تابع ہونا۔

لیکن اگر وہ رکن جسے باقاعدہ کام کی فکر کرنا پڑتی ہے کام کر نیے قابل نہ رہے مثلاً یہ کہ تخت سلطنت خالی ہو جائے اور نظام سلطنت کے موافق کوئی جانشین نامزد نہ ہوا ہو تو اس کی کو پورا کر نیے لے سلطنت کا اقتدار اعلیٰ خود عمل کرنے لگتا ہے۔

اعلیٰ نقطہ خیال سے انسان کبھی غیر ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ خود قویں نہ صرف خدا کے ابدی حکم ہی کی جو ابدہ ہیں بلکہ تاریخ کے واقعات کے سامنے بھی وہ جوابدہ ہیں۔ تاہم یہ غیر ممکن ہے کہ سلطنت کے اندر کوئی ایسا محکمہ قائم کیا جائے جسکے روبرو خود قوم بحیثیت مجموعی یا اس کا وہ قائم مقام جسے اعلیٰ اختیار تفویض ہو جاوے گی کے لئے طلب کیا جاسکے، کیونکہ اس صورت میں خود سلطنت اپنے ایک محکمے کے تابع ہو جائیگی اور اس طرح کل جزم کے اور جسم ایک عضو کے تابع ہو جائیگا۔ اگر سلطنت اپنے اقتدار اعلیٰ کے کل کر نیے لئے

۶۔ عدم فرداری

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ ظالمانہ برتاؤ ہو رہا ہو جسکی اصلاح کی کوئی توقع نہ ہو جسکی ستم شکاری مذمروں کے حقوق کا خیال کرے اور نہ عورتوں کی عزت کا پاس، تو یہ ایک انتہائی ضرورت کا موقع ہے اور ایسی صورت میں کوئی فعل اس سے زیادہ حق بجانب نہیں ہو سکتا کہ ایسے ظالموں کے خلاف خروج کیا جائے۔ جو شخص اس سے انکار کرے وہ ایک بد بخت ملعون ہے۔

کسی دوسری سلطنت کو جوابدہ ہو تو اس طرح اس کا اقتدار اعلیٰ محدود ہو جائیگا۔
 بین الاقوامی قانون کی ترقی یا ایک عالمگیر سلطنت کے قائم ہو جانے سے
 یہ ممکن ہے کہ قوموں کی قانونی ذمہ داری کا کوئی انتظام ہو جائے، اس وقت تو یہ
 محض ایک خیال ہے ممکن ہے کہ آئندہ زمانے میں حقیقت ہو جائے۔
 تمام مخصوص طاقتیں سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کے ارکان کے روبرو جوابدہ ہیں۔
 وزراء اور بڑے سے بڑے عمال پر ان کے نظم و نسق کی جوابدہی لازم ہے۔

یہ سلطنت کی تمام
 دوسری طاقتیں
 اسی اقتدار اعلیٰ کو
 جوابدہ ہیں۔

تعلیق۔ اس زمانے کی بحال سیرکیسی بالعموم ۱۸۹۷ء کی فرانسیسی قومی مجلس کو نظیر قرار دیکر
 یہ خیال کرتی رہی ہیں کہ ان کی کارروائی سلطنت کے اقتدار اعلیٰ پر نہیں بلکہ (روسو کے خیال کے موافق)
 قوم کے اقتدار اعلیٰ پر مبنی ہے لیکن روسو خود اس سے بہت آگے بڑھا ہوا ہے۔ وہ تمام نیابتی
 مجلسوں کے کامل اقتدار اعلیٰ سے منکر ہے اور اس کا یہ خیال ہے کہ قوم کا سواد اعظم جس وقت چاہے
 بغیر کوئی وجہ ظاہر کئے ہوئے، براہ راست اپنی مرضی کو مجلس پر عائد کر سکتا ہے اور ایسا کرنا بالکل
 بجائے ہے۔ اس اصول کے نتائج اکثر خوفناک و مایوسہ سازوں کی طرح سیاسی افق پر نمودار
 ہوتے رہے ہیں اور ان با اقتدار جماعتوں کو ہیبت زدہ کر دیا ہے جنہوں نے خود ہی
 عوام کا لانعام کو بھڑکایا تھا۔

چوتھا باب

(ب) حکمران کا اقتدار اعلیٰ

موجودہ زمانے میں سلطنت کے سرگروہ کا اقتدار اعلیٰ صرف شاہی میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اقتدار اعلیٰ کا فی نفسہ مستحق بادشاہ ہی ہو سکتا ہے، رئیس جمہوریہ اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا گو کہ شاہانہ اختیارات کو عمل میں لاتا ہے۔

قدیم رومی جمہوریہ میں "جلالت" قضاوں کی طرف منسوب تھی جنہوں نے شاہی اختیار کو باخود با تسیم کر لیا تھا۔ بعد کو یہ ر جلالت، سیدنا سے بھی منسوب ہو گئی۔ جدید جمہوریتیں اقتدار اعلیٰ پر زیادہ رقیبانہ نظر رکھتی ہیں اور حکومت کے سرگروہ اہلی کو محض قوم کا حکم بردار سمجھتی ہیں اور قوم کے اقتدار اعلیٰ کے حقوق ان کی طرف منتقل نہیں ہو سکتے۔

اکثر یہ دعوے کیا جاتا ہے کہ حکمران کے اقتدار اعلیٰ کا وجود صرف موروثی شاہیوں میں پایا جاتا ہے، لیکن ایسا خیال کرنا، حقیقت فراموشی کے نفس اختیار کو مبدا اختیار میں خد کر دیتا ہے۔ ایک منتخب شدہ فرمانروا کو اپنی ذاتی حیثیت سے اقتدار اعلیٰ کا حق کسی موروثی فرمانروا سے کم نہیں ہوتا۔ انگلستان کے بادشاہ جارج اول کا اقتدار شاہانہ کسی طرح اسکے جانشینوں سے کم نہیں تھا حالانکہ اسی کے ذات سے یہ نیا خاندان شروع ہوا تھا۔ تاہم علمی حیثیت سے ہم حکمران کے ذاتی (original) اور تفریقی (derived)

موجودہ زمانہ کی جمہوریتوں میں سلطنت کے سرگروہ کا اقتدار اعلیٰ تسلیم نہیں کیا جاتا

لیکن شاہیوں میں خواہ وہ احتمالی ہیں یا موروثی۔ حق تسلیم کیا جاتا ہے۔

اس اقتدار کی دو صورتیں ہوتی ہیں (۱) ذاتی

۱۔ روسو حکمران کے اقتدار اعلیٰ کو اس بنا پر مسترد کرتا ہے کہ مرضی عامہ کل قوم ہی سے متعلق ہو سکتی ہے۔ قوم کے کسی جز کی مرضی ایک محدود مرضی ہے اور اس لئے زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ فیصلے صادر کرے، قوانین کا بنانا صرف کل قوم ہی کے وسیلے سے ہو سکتا ہے لیکن اقتدار اعلیٰ کو صرف قانون سازی تک محدود رکھنا اور حکومت کے لئے اسے وسیع زمرہ نا ملنی ہے۔

(الف) (پہلی نے یہاں "ولیم (آرچ)" کا نام لیا ہے۔ منتخب شدہ بادشاہ کی مثال زیادہ سوزوں ہے مگر ولیم نے کوئی خاندان نہیں قائم کیا۔ انگریزی مستبہم)

اقتدار اعلیٰ میں فرق قائم کر سکتے ہیں لیکن اس فرق کا اطلاق سلطنت کے اقتدار اعلیٰ پر نہیں ہو سکتا کیونکہ سلطنت کا اقتدار اعلیٰ ہمیشہ اس کا جزو ذاتی ہوتا ہے اول الذکر اقتدار وہ ہے جو آبائی یا قابضانہ حقوق کے طور پر اصلاً حکمران کی ذات سے وابستہ ہے۔ اس صفت میں موروثی حکمران اور فاتح، اور وہ حکمران داخل ہیں جو خود تاج شاہی اپنے سر پر رکھ لیں جیسا کہ چارلس عظمیٰ اور فریڈرک اول شاہ پروسیا نے کیا تھا اور یہی حال جرمانیا کے اُن منتخب شدہ شہنشاہوں کا تھا جو اپنے اقتدار اعلیٰ کا ماخذ انتخاب کنندوں کو نہیں بلکہ خدا کو سمجھتے تھے۔

ثانی الذکر اقتدار کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ قوم یا انتخاب کنندوں نے اُسے اقتدار تفویض کیا ہے، چنانچہ روما میں شہنشاہی اختیار قوم کا عطا کردہ تھا۔ موجودہ زمانے کی انتخابی شاہیاں بھی اسی قسم کی ہیں۔

سلطنت کے مختلف فرائض پر بحث کر نیکی بعد ہم حکمران کے اقتدار اعلیٰ کا تجزیہ کریں گے۔

پانچواں باب تقسیم اختیارات

(۱) زمانہ قدیم کی استوائی مجلسیں

مجلس وضع قوانین کے نشو و نما کے لحاظ سے زمانہ حال کی سلطنتیں قدیم سلطنتوں کے مقابلے میں بہت ہی اعلیٰ درجہ تکمیل کو پہنچ گئی ہیں۔ قدیم زمانے میں بھی یہ صولی خیال پیدا ہو گیا تھا کہ قوم وضع قوانین میں حصہ لیتی ہے اور مجلس وضع قوانین میں قوم کی نیابت ہوتی ہے۔ گرائس زمانہ میں اہل شہر یکجا جمع ہو جاتے تھے اور اس طرح وہ اس فرض کو براہ راست انجام دیتے تھے۔

لا واسطہ مجلس
قانون سازی

یونان کی مجلس عامہ مقابلہ بہت ابتدائی حالت میں تھیں۔ ایٹھنصر کے مکس (جائے اجتماع) یا ٹیٹھسٹر میں اہل شہر کا ایک بے ترتیب مجمع ہو جاتا تھا آدمی گن لئے جاتے تھے اور ہر شخص کو بونے کا حق حاصل ہوتا تھا۔ اس کے برخلاف روم کی کومینیا (مجلس عام) طبقات میں منقسم تھی اور صرف اعلیٰ حکام کے حسب ہدایت کارروائی کرتی تھی۔ اس طریقے میں بہت سی حقیقی خرابیاں ہیں جنکا تذکرہ زمانہ موجودہ کے نیا ترقی طریق سے کیا گیا ہے۔

نیابتی مجلس سے
تقدیر پر ہیں

(۱) جس سلطنت کا رقبہ ایک معمولی قبضے سے زائد ہو اس میں تمام شہریوں کا براہ راست اجتماع ناممکن ہے۔ وسیع سلطنتوں میں کل قوم کی مجلس کھلنے کی بات رہ جاتی ہے چنانچہ روم میں جمہوریت کی آخری صدیوں میں یہی حال تھا۔ اس حالت میں دارالصدر کے عوام کو ایک غیر متناسب غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔

اس وجہ سے اس روم Comitia Centuriata (سنٹوریہ) کو Comitia Tributa (ترباں قبائلی) سے بالاتر سمجھتے تھے۔

(۲) ایسی وسیع اور مختلف النوع مجلس بہت ہی بے قابو ہو جاتی ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہے کہ عام رائے کا اظہار کر دے یا کسی ایسی تجویز کی جو پہلے سے مشہور ہو چکی ہو منظوری یا امانتداری دیدے لیکن کسی مجوزہ قانون پر سنجیدگی سے بحث کرنا یا سیاسیات کے پیچیدہ مسائل کو سلجھانا اسکے حیطہ اسکان سے بالکل خارج ہے۔

صرف بہت ہی چھوٹی سلطنتوں میں جہاں ہر کام میں بالکل سادگی ہو قانون سازی اکادم عام مجلس کو سپرد کیا جاسکتا ہے۔

پہلے باب

(ب) سلطنت کے سیاسی فرائض کی قدیم تفسیر

اگرچہ انتہا دراعلیٰ میں ایک بڑی حد تک وحدت اور مرکزیت ہوتی ہے لیکن پھر بھی سلطنت کو مختلف فرائض انجام دینا پڑتے ہیں۔ اور اسی سبب سے سلطنت کے مختلف مناصب اپنی اپنی عملی ضرورتوں کے لحاظ سے مختلف شکلیں بھی اختیار کرتے ہیں۔

ارسطو کی رائے میں یہ فرائض تین ہیں۔

(۱) غور و بحث (شوری)

(۲) نظامت

(۳) عدالت

وہ اول الذکر کے ضمن میں سلطنت کے اہم معاملات عامہ یعنی جنگ و صلح کے فیصلے، معاہدے قائم کرنے یا انکو مسترد کرنے، وضع قوانین، موت، جلا وطنی، اور ضبطی کی سزاؤں اور مالیات کی نگرانی کو داخل سمجھتا ہے۔ پس اس طرح بہت ہی مختلف الجھنیت امور یکجا ہو گئے ہیں۔ یہ دنیوی سیاسیات اور وضع قوانین اور پھر اسی کے ساتھ فوجداری کا اعلیٰ اختیار اور حکومت کے نظم و نسق کی نگرانی سب اس میں آگئی ہیں مگر تمام سلطنت اور اہل ملک کی حفاظت کے لحاظ سے یہ سارے امور اپنی سیاسی اہمیت کی بنا پر ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ارسطو ان سب کو قانون سازی نہیں بلکہ شوریٰ سمجھتا ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ واقعی قانون سازی کا کام زمانہ ابعد تک مجالس عامہ کے تحت میں نہیں تھا اور صرف بالواسطہ اُس پر اُنکا اثر پڑتا تھا لیکن اور دوسرے نہایت اہم معاملات میں ان کے غور و بحث کا بہت بڑا اثر تھا۔

ثانی الذکر اختیارات کسی حد تک نفاذ ہائے جدیدہ کے عاملانہ اختیارات کے مداخلت میں لیکن یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اُنکا تعلق حکمرانی کے منفرد محکموں سے ہے۔ تیسری قسم ہمارے عدالتی اختیار کے مرادف ہے۔

یونان اور دیاس
اکثر مختلف فرائض
ایک ہی شخص انجام
دیا کرتا تھا۔

اگرچہ مختلف فرائض اپنی خصوصیات کی وجہ سے خارجی طور پر ایک دوسرے سے
متمیز رکھے گئے ہیں مگر کارکن افراد کے اعتبار سے داخلی طور پر وہ متحد ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے
یہ ذکر ہو چکا ہے کہ ایستغفر کی مجلس عام قوانین پر غور و بحث کرتی، حکومت کی اہم کارروائیوں
کو عمل میں لاتی، اور عدالتی فرائض کو بھی انجام دیتی تھی۔ وہاں کے آرخون انتظامی عہدہ دار
ہوتے تھے مگر اسکے ساتھ ہی انھیں عدالتی اختیارات بھی حاصل ہوتے تھے۔ روم کی سلطنت
نے اس سے زیادہ ترقی کی تھی اور وہاں فرائض کی تفریق بڑھی ہوئی تھی۔ یونان کی
بہ نسبت کوینیٹیا (مجلس عام) کے قانونی فرائض، سینات اور حکام کے فرائض سے
پوری طرح واضح اور متمیز تھے تاہم "کوینیٹیا" میں غیر ملکی معاملات کے اہم مسائل پر
بحث ہوتی تھی اور ابتدائی زمانے میں حکم موت کے مراعات کا فیصلہ بھی وہیں ہوتا تھا۔
اسی طرح سینات صرف انتظامی ہی امور کو سرانجام نہیں دیتی تھی بلکہ اسکی منظر شدہ
تجویزوں کو قانونی حیثیت حاصل ہو جاتی تھی اور سب سے آخر امر یہ ہے کہ حکام بالعموم
انتظامی اور عدالتی دونوں فرائض کے جامع ہوتے تھے جس شخص کو جس حد تک اقتدار
(Imperium) حاصل ہوتا تھا اسکو اسی حد تک عدالتی اختیار (Jurisdictionis)
بھی حاصل ہوتا تھا۔ علاوہ اسکے اُسے مذہبی فرائض بھی انجام دینا پڑتے تھے اور اپنے احکام
اعلامی کے وسیلے سے اُسے ایک طرح کا قانونی اختیار بھی حاصل ہوتا تھا۔ اب اس
جمہوریہ روم کی تمام نظمیات میں صاف یہ نظر آتا ہے کہ ارادۂ ایک شخص کی جاتی تھی کہ حکومت
کے مختلف فرائض ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔

بڑھتی روٹی شہنشاہی
میں علی اور فوجی
عہدوں کا امتیاز

مشرقی رومی شہنشاہی میں ایک نیا امتیاز اور قائم ہوا۔ تمام شہنشاہی کے
جملہ سرکاری اختیارات بدستور شہنشاہ کے ہاتھ میں رہے مگر صوبوں کی ماتحت حکومت
میں علی اور فوجی عہدے پوری طرح ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیے گئے تھے۔ حکام
کے بے انتہا اختیارات کے باعث رعایا پر جب ظلم و ستم مورہے تھے اسوقت رعایا کے
مفسد کے خیال سے یہ کارروائی عمل میں نہیں آئی مگر اب تخت کو محفوظ رکھنے کی ضرورت سے
اسکے نفاذ پر مجبور ہونا پڑا۔ بہر حال اس سے سیاسی ترقی کا ایک قدم آگے بڑھا جسے
زمانہ حال کی سلطنت نے بھی قبول کر لیا ہے۔

ازمنہ وسطیٰ میں
بیت ہی کم تھا۔

ازمنہ وسطیٰ میں سلطنت کی طاقت میں ہر طرف سے روک پیدا ہو کر وہ محدود ہو گئی تھی

لیکن فی نفسہ نہایت ہی مختلف النوع فرائض باہم مجتمع ہو گئے تھے۔ نہ صرف بادشاہ کو بلکہ ہر ایک کاؤنٹ کو ملکی اور فوجی، انتظامی اور عدالتی جملہ اختیارات حاصل ہوتے تھے اور مجالس ملکی وضع قوانین کے ساتھ ہی ساتھ عدالتی فرائض بھی انجام دیتی تھیں۔

بودین پہلا شخص تھا جس نے اس امر پر توجہ دلائی کہ کم از کم بادشاہ کو یہ چاہئے کہ وہ بذات خاص عدالتی کارروائی نہ کرے بلکہ اس کام کو آزاد رجوں کے ہاتھ میں چھوڑ دے۔ اُس نے قدیم دستور کی حمایت میں بہت سے دلائل بھی بیان کئے ہیں مثلاً یہ کہ بادشاہ کا بذات خاص تمام قوم کے سامنے عدل و داد کرنا بہت اچھا فریضہ ہے مگر اسکے ساتھ ہی اُس نے یہ دکھایا ہے کہ اس سے قوی تر وجوہ اس امر کے موجود ہیں کہ بادشاہ بذات خاص جج کا کام کرنے سے کنارہ کش رہے۔ ایک ہی وقت میں قانون ساز اور جج دونوں ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ انصاف اور حق عفو باہم ملائے جائیں قانون کی پابندی بھی کی جائے اور حسب مرضی وہ ترک بھی کر دیا جائے۔ اگر انصاف پوری طرح نہ ہوا تو متخاصم فریقوں کو کافی آزادی نہیں رہتی اور وہ بادشاہ کے اقتدار کے نیچے دب جاتے ہیں۔ سزا کی دہشت، خوفناک طور پر بڑھ جاتی ہے اور اگر بادشاہ کی طبیعت ظلم کی طرف مائل ہوئی تو مقام عدالت پر رعایا کے خون کی نہریں بہنے لگتی ہیں اور قوم کو اپنے سر تاج سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب بادشاہ خود اپنے معاملات میں یا اپنے خلاف جرموں میں فیصلہ کرتا ہے تو صورت معاملات نہایت بدتر ہو جاتی ہے۔ پس بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے لئے صرف جرم و عفو کے اختیارات خاص کو محفوظ رکھے۔

درحقیقت بودین کو یہ موقع تھا کہ وہ فرائض کی تاریخ سے نظارہ پیش کرتا۔ مقدمات کے وقت بادشاہ کی موجودگی کے خلاف امر کی متعدد پارلیمنٹیں اپنا خیال ظاہر کر چکی تھیں۔ بیشتر سلطنتوں نے بتدریج اس نئے اصول کو اختیار کر لیا، بادشاہوں نے یہ کار شروع کیا کہ معمولاً عدالتی کارروائیاں حکام کے سپرد کر دیں اور اپنے لئے صرف فیصلوں کی تصدیق اور بالخصوص حکم موت کی منظوری کو محفوظ رکھا۔

بودین نے ملکی فرائض کی سہولت پر زور دیا

ساتواں باب

(ج) تقسیم اختیارات کا جدید اصول

سیاسیات جدیدہ کی رفتار نے یہ خیال پیدا کر دیا ہے کہ سیاسی فرائض کی خارجی تفریق کے لئے یہ ضروری ہے کہ انھیں فرائض کے موافق شخصی طور پر کارکنوں کی بھی تفریق ہو جائے۔

سوشلسٹیکو پہلا شخص تھا جس نے شد و مد کے ساتھ اس جدید اصول کا اعلان کیا۔ اُس نے مدنی آزادی اور حق کے نام سے یہ مطالبہ کیا کہ مختلف فرائض عامہ کو مختلف شخصوں کے ہاتھوں سے انجام پانا چاہئے اگر قانون سازی کے اختیارات، عدلانہ اختیارات کے ساتھ ایک ہی شخص بلکہ ایک ہی جماعت حکام کے ہاتھ میں مجتمع ہو جائیں تو پھر آزادی کوئی چیز نہیں رہتی کیونکہ قوم کو یہ خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ بادشاہ یا سیناٹ اپنی جابرانہ کارروائیوں کے لئے من مانتے قانون بنائے گا اور انکو جابرانہ طور پر عمل میں بھی لائے گا۔ علیٰ ہذا اگر عدالتی اختیار، تشیعی اور عدلانہ اختیار سے جدا نہیں ہے تو بھی آزادی نہیں باقی رہتی۔ اگر عدالتی اختیار قانون سازی کے اختیار کے ساتھ ملا دیا جائے گا تو اصل ملک کی زیست و حیات معرض خطر میں پڑ جائے گی کیونکہ منہ و معج ہی واضع قانون بھی ہو گا۔ اور اگر عدالتی اختیار، عدلانہ اختیار کے ساتھ ملایا جائے گا تو جج کو ایک شد و مد کا شخص کی قوت حاصل ہو جائے گی۔

کسی ایک شخص کے ہاتھ میں ضرورت سے زیادہ اختیارات کے جمع ہو جانے سے شخصی آزادی کے لئے بالیقین خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اختیار کی مختلف شاخیں متحدہ کر دی جائیں تو ایک دوسرے کے اثر سے ان میں روک پیدا ہو جاتی ہے لیکن اس تفریق کے قائم کرنے کی دلیل قاطعہ یہ سیاسی غرض نہیں ہے کہ اُس سے عملاً ملکی آزادی کی ضمانت ہو جاتی ہے

۱۔ سوشلسٹیکو کی "روح قانون" Esprit des lois (میں انگریزی نظم سلطنت کا بیان) چھٹا اسفحہ ۶ اور پہلی کی "عام نظم سلطنت کی تاریخ" صفحہ ۶۷۔

ملکی ضرورت کی ضرورت کے
وفاقہ فیہ فیہ فیہ فیہ
زیادہ ہوتی ہے۔

بلکہ اسکی بڑی وجہ نظام عضوی میں پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر کام اُسی وقت ختم ہوتا ہے جب کہ اسکا کارکن عضو خاص کر اسی کے لئے بنایا گیا ہو نہ کہ جب باطل مختلف فرائض ایک ہی عضو کے حوالے کر دیئے جائیں۔ اس امر میں ملکی تدبیر فطرت ہی کی مثال کی پیروی کرتا ہے۔ آنکھ دیکھنے کے لئے موزوں ہے، کان سننے کیلئے، منہ بولنے کے لئے اور ہاتھ گرفت و عمل کے لئے، اسی طرح جسم سیاسی کے لئے بھی ضروری ہے کہ ہر کام کے لئے ایک جدا گانہ کارکن ہو۔

”تفریق اختیارات“ کے مقبول عام فقرے سے ایک صحیح اصول کا غلط عملہ آد پیدا ہو جاتا ہے۔ اختیارات میں اگر کلیتہً ”تفریق“ ہو جائے اور وہ ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیئے جائیں تو سلطنت کا تو وحدہ عمل باطل ہو جاتا ہے جس طرح طبعی جسم میں مختلف اعضا ایک دوسرے سے مربوط ہیں اسی طرح سیاسی جسم کے کارکن اعضا کا باہمی ربط انکی تفریق سے کم ضروری نہیں ہے، پس سلطنت کے لئے اتحاد قوت ایک لازمی چیز ہے اس لئے اختیارات میں باعتبار فرائض کے امتیاز ہو سکتا ہے مگر انھیں کلیتہً جدا نہیں ہونا چاہئے۔ مونٹسکیو نے تین اختیارات قائم کئے ہیں (۱) اختیار قانون سازی (۲) اختیار عدالت (۳) اختیار عدالتی۔

(الف) انگریزوں نے بھی اس تقسیم کو اپنا نظریہ سلطنت بنا لیا ہے۔ شمالی امریکہ کے ملک متحدہ میں اس سہ گانہ تقسیم پر بہت سختی بلکہ مبالغے کے ساتھ عملدرآمد ہوا ہے اور جدید یورپ کے بہت سے نظماہلئے سلطنت نے بھی اسی کو مان لیا ہے۔

بعضوں نے مقدر سلطنت کے وحدت عمل کے خیال سے ان تین اختیارات پر اضافے بھی کئے ہیں۔ از انجملہ سلطنت میں (۴) ایک قوت معدلہ کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ بیخبر کلوشٹ کا خیال ہے اور دون پیدرو کے پرنگالی نظام سلطنت میں بھی اُسے اختیار کیا ہے۔ دوسروں نے عدالت قوت کے متعلق حسب ذیل اضافے کئے ہیں :-

(الف) (مملکت متحدہ امریکہ کے وقتی نظام سلطنت نے اُس زمانے کے انگریزی نظام سلطنت کے مروجہ نظریے کی جس درجہ جمیع کی اُسکے لئے حیثیت کی تصنیف انگریزی نظام سلطنت (باشاعت ۱۷۸۷ء) صفحہ ۲۷ اور ۲۲ دیکھنا چاہئے۔

انتیاز ہونا چاہئے نہ کہ
تفریق۔

اختیارات کی سہ گانہ
تقسیم۔

اضافے

(۵) اختیار انتظامی -

(۶) اختیار نظارت -

(۷) اختیار نیابت -

تخلیف اختیار
سادگی کی نیابت

ایک غلط خیال یہ پھیلا ہوا ہے کہ یہ سب اختیارات ایک دوسرے کے مساوی ہیں۔ یہ خیال سلطنت کی عضوی نوعیت کے خلاف ہے۔ عضوی جسم میں ہر ایک عضو اپنی خاص قوت رکھتا ہے مگر ان عضویوں میں سے کسی ایک کی قوت کسی دوسرے عضو کی قوت کے مساوی نہیں ہوتی بلکہ ایک کی قوت دوسرے کی قوت کے یا تو ماتحت ہوتی ہے یا اُس کی بالادست، اور یا پھر اُسکے دوش بدوش کام کرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو گا تو مجموعے کا ربط و اتحاد قائم نہ رہے گا۔ یہی حال سلطنت کا ہے اگر تمام اعلیٰ اختیارات واقعی مساوی ہوں اور ممالک متحدہ امریکہ کی طرح یہ حالت صرف ظاہری نہ ہو تو سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ "سیر کو جسم سے جدا کر کے اُسے جسم کے مساوی کرنا انسان کی جان لئے فیکر نہیں" (دیکھو بھٹی کے "مطالعات" صفحہ ۱۳۶) دوسری غلطی جو بالکل ہی جوں کی سی بات معلوم ہوتی ہے یہ ہو ا کرتی ہے کہ لوگ سلطنت کے اعضائے عملیہ کو بالکل ایک منطقی قیاس سمجھتے ہیں۔ قانونی قوت، قواعد مرتب کرتی ہے گویا وہ مقدمہ کبریٰ ہے اور عدالتی قوت اُسکے تحت میں کسی خاص واقعے کو جانچتی ہے یعنی وہ مقدمہ صغریٰ ہے اور عاملانہ قوت نتیجہ برآمد کرتی ہے۔ پس اس طرح یہ عدالتی فیصلے میں مختلف قوتوں کے تمام فرائض جمع ہو جائیں گے اور حکومت اُن فیصلوں کو عمل میں لانے کے لئے صرف پولس کا کام انجام دینے کے لئے رہ جائیگی۔

الف قانون سازی
کی قوت

سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ قانون سازی کی قوت کو دوسری تمام قوتوں سے

۱۔ گروٹسکیو نے اسکا تصور اپنے ذہن میں دوسری ہی طرح چرایا ہے (۱۱، ص ۶)۔ وہ عدالتی اختیار کو بھی یوں بیان کرتا ہے۔ "اُن امور میں عاملانہ اختیار جو حقوق عامہ سے متعلق ہیں" اور اس طرح اسے حقیقی "عاملانہ اختیار سے جو حقوق شخصی کے مابین ہوتا ہے" جدا کیا ہے۔ اس غیب خیال کو اُس کے تتبع میں کانٹ نے "نظریہ قانون" (۱۵) اور اسٹارٹ نے "خطبات سیاسیات" (۱۵) بھی اختیار کیا ہے۔ بخلاف انکے دیکھو اسٹال "سلطنت کا نظریہ" جلد ۲ ف ۲۵۷۔

میز کر کے دیکھئے دوسرے تمام فرائض، خاص خاص کارکنوں سے متعلق ہیں مگر قانون سازی کا معاملہ تمام سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ قانون سازی کی قوت خود قوانین و تنظیمات سلطنت کا تعین کرتی ہے۔ برخلاف اسکے تمام دوسری طاقتیں نافذ الوقت قوانین و تنظیمات کے موافق مختص بدیہی اور تغیر پذیر حالات کے اندر کام کرتی ہیں۔ قوت وضع قوانین کل مجموعے کے مستقل تعلقات کی ترتیب کرتی ہے اور دوسری قوتیں بالعموم ایک خاص مقصد کے لئے کام میں لائی جاتی ہیں اور کل قوم پر اثر نہیں ڈالتیں۔ لیکن جب تک وضع قوانین جماعت کے حقوق کا تعین نہ ہو جائے اس وقت تک ان دوسری قوتوں کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔

قانون سازی کی قوت صرف حقوق کے عام قواعد یعنی مخصوص الاثر قوانین ہی کا تعین نہیں کرتی بلکہ سلطنت کے تنظیمات کا قائم کرنا اور انکا بدلنا بھی اُس سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر وہ موازنہ مابعد کے عام اقتصادی انتظامات پر نظر ڈالتی ہے، اگر وہ اصول نہیں بلکہ مطالبات کی منظوری دیتی ہے، اگر وہ ملک کے داخلی حالات سے بحث کرتی ہے تو یہ سب اس لئے ہے کہ ان کا تعلق تمام سلطنت سے ہے گو کہ وہ صحیح معنی میں قوانین نہیں ہیں۔

روسو قانون سازی اور انتظام کے تعلقات کی توضیح اس طرح کرتا ہے کہ ان میں وہی فرق ہے جو فرق علم النفس کی رو سے آزادی و قوت میں ہے۔ وضع قانون ارادہ عام کا اظہار ہے اور انتظام حکومت کے مخصوص افعال پر شامل ہے۔ قانون قوم کا ہے، عمل بادشاہ کا ہے، لویشنس فون ہسٹائن بھی اسی امتیاز کو تسلیم کرتا ہے، لیکن قوت قانون سازی کے لئے قوانین و تنظیمات کی ضرورت پر عمیق نظر ڈالنا بھی انکے اجرا کی قوت آزادی سے کم ضروری نہیں ہے اور دوسری طرف حکومت جو اپنی حکمت عملی کی غایت و ذرائع کا انتخاب کرتی ہے، اسکے افعال بھی قوت آزادی کے لحاظ سے کم درجے پر نہیں ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ یہ فرق عام و خاص آزادی یا ایک قائم شدہ نظم اور وقتی کام کے الفاظ سے ظاہر کیا جائے۔

چونکہ کل اپنے ہر ایک جزو یا منصوبہ سے زیادہ ہے، اس لئے قوت قانون سازی تمام دوسری مختص قوتوں سے بالاتر ہے۔

جدید سلطنتوں میں یہ قوتیں چار مجموعوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں جن کے خصوصیات قطعاً

روسو اور ہسٹائن
کی رائے پر تنقید

اب، سلطنت کی
دوسری طاقتیں

ایک دوسرے سے الگ ہیں ان میں سے دوسب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ بلند تر (۱) حکومت یا انتظام اور (۲) قوت عدالتی ہیں۔

اور حکومت یا انتظام
اصطلاح قوت عالمانہ
کی تنقید۔

(۱) حکومت یا انتظام۔ اسکے لئے بالعموم قوت عالمانہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے مگر یہ لفظ نہایت ہی ناموزوں ہے اور اس سے بہت سی لغزشیں پیش آتی، جدول میں غلط فہمیاں اور عمل میں خطائیں واقع ہوتی ہیں۔ اس سے نہ تو حکومت کی اصلی حقیقت ظاہر ہوتی ہے اور نہ وضع قانون اور عدالتی اختیار سے اسکے تعلقات کا اظہار ہوتا ہے۔

ایک شخص خود اپنے فیصلے کو یا دوسرے کے حکم و فرمان کو عمل میں لاسکتا ہے مگر ہر حال میں تعمیل دوسرے درجے پر ہے، فیصلہ یا حکم مقدم شے ہے لیکن حکومت کے فرائض فی نفسہ مقدم (یا اولین) حیثیت رکھتے ہیں۔ حکومت تجویز اور فیصلہ کرتی ہے، رائے قائم کرتی ہے، اپنی مرضی کا اظہار کرتی ہے۔ کسی کام کا حکم دیتی یا کسی کام سے منع کرتی ہے اور بیشتر حالات میں اسکے احکام کی تعمیل بغیر کسی عالمانہ جبر کے ہوتی ہے۔ عموماً حکومت کی طرف سے محض ایک اعلان کافی ہوتا ہے اور اسکے احکام کی تعمیل ہو جاتی ہے لیکن جب جبر کی ضرورت لاحق ہو تو یہ بھی بے شبہ حکومت ہی کا کام ہے مگر چونکہ یہ دوسرے درجے پر ہے اس لئے یہ بالعموم ماتحت عمال، مثلاً پولیس وغیرہ کے ذریعے سے عمل میں لایا جاتا ہے۔ اگر دوسروں کے ارادے سے بحث ہو تو بھی لفظ عالمانہ درست نہیں ہے۔

یہ صحیح نہیں ہے کہ قانون جن امور کو عمومی حیثیت سے قرار دیتا ہے، حکومت محض امور کو انفرادی حیثیت سے عمل میں لاتی ہے۔ عموماً قانون عمل میں نہیں لایا جاتا بلکہ اسکا اطلاق اور اسکی پابندی ہوتی ہے۔ کسی قانون کا اعلان اور اسکا عمل میں لانا ایک ہی شے نہیں ہیں۔ واضح قوانین، جن قواعد کو منظور کرتا ہے، جن اصولوں کو وہ ظاہر کرتا ہے، حکومت اپنی کارروائیوں کے قانونی اور آئینی حدود کے طور پر انکا استحرام کرتی ہے مگر ان حدود کے اندر وہ خود آزادانہ فیصلے کرتی، دوسری سلطنتوں سے معاملات طے کرتی، تحقیقات کیلئے کمیشن مقرر کرتی، قیام امن کیلئے جن کارروائیوں کی ضرورت سمجھتی ہے انھیں اختیار کرتی، کارکنوں کا تقرر اور فوج کی نگرانی کرتی ہے، یہ اصطلاح انتظام کرینوالی حکومت اور عدالتوں کے باہمی تعلقات کے لحاظ سے اور بھی کم قابل اطلاق ہے، کسی فیصلے کا عمل میں لانا خود عدالتی قوت کا فعل ہے، کیونکہ انصاف کا انتظام کرنا، زائل شدہ حقوق کا بحال کرنا،

اُسی کا کام ہے، اور جب تک خود اُسکی قوت ناکافی نہ ہو جائے اُسوقت تک اُسے حکومت کی قوی تر قوت سے امداد لینے کی ضرورت نہیں ہے، ان دونوں قوتوں کے تعلقات ایسے نہیں ہیں جیسے ایک آقا اور غلام کے ہوتے ہیں۔

حکومت کا اصل اصول

پس حکومت کا اصل الاصول یہ ہے کہ اُسے یہ اختیار ہو کہ مخصوص حالات میں جو کچھ قرین انصاف یا مفید ہو اُسکا حکم دے سکے۔ اس میں یہ قوت ہو کہ ملک اور قوم کو خاص حملوں اور خطروں سے محفوظ رکھ سکے، ملک اور قوم کی نیابت کر سکے اور انھیں عام خرابیوں سے بچا سکے، حکومت وہی چیز ہے جسے یونانی "ارخے" اور رومی "ام پے ریم" کہتے تھے اور جسے جرمانی زماڈ وسطی میں "ولایت" اور "فوکٹائی" Vogtei کا نام دیا گیا تھا۔ سلطنت کی تمام دوسری جزوی طاقتوں کے مقابلے میں حکومت کا فرما اور بلاشبہ سب سے بلند طاقت ہے کیونکہ دوسروں سے اُسکا تعلق ایسا ہے جیسا کہ سر کا تعلق جسم کے دوسرے اعضا سے ہے جس شے کو نیابتی قوت کہتے ہیں وہ بھی اُسی کے اندر داخل ہے۔

سلطنت کی عام کارروائی کی مناسبت سے اُسے "حکومت سیاسی" اور جبرئیات کے لحاظ سے "انتظام" کہتے ہیں۔

(۲) قوت عدالتی

عدالتی قوت اکثر فیصلہ کر نیوالی قوت سمجھی جاتی ہے اور یہ غلط بحث فرانسیسی (اور انگریزی) اصطلاح یعنی "قوت انصاف" کے لفظ سے پیدا ہوئی ہے لیکن قوت عدالتی کا اصل الاصول فیصلہ کرنا نہیں بلکہ قانون کے حکم کا معین کرنا ہے (اہل روم اُسے انصاف In judicio نہیں بلکہ معدلت گستری In jure کہتے تھے) فیصلے کا مفہوم اگر یہ ہو کہ خاص حالات میں انصاف کا تعین کر کے اُسکا اعلان کیا جائے تو یہ لازمی طور پر حکومت کا کام نہیں ہے نہ اسے اختیار عامہ کا علمد آد کہہ سکتے ہیں۔ روم میں عام طور پر یہ کام ججوں کے بجائے غیر سرکاری اشخاص کو اور ازمنہ وسطی میں جرمنیا میں ایسروں کو

عہد یونانی میں اس لفظ کے معنی ہیں (۱) آغاز، اصل، ابتدا، عنصر (۲) پیشروی، حکومت، اقتدار اعلیٰ؛ (۳) ملک، قلم جس پر حکومت کی جائے۔ ع۔ ص۔

معدلت کی خدمت یا وہ قبضہ جو اُسکی قوت ہو سلیف کو جرمانی زبان میں "فوکٹ" Vogt کہتے ہیں۔ ع۔ ص۔

سپرد ہوتا تھا۔ موجودہ زمانے میں یہ کام اکثر عام جوریوں کے سپرد ہوتا ہے۔ برخلاف اسکے قانون کا قائم رکھنا، افراد اور قوم کے حقوق کی حفاظت کرنا، ہمیشہ حاکمانہ یا ناظرانہ فرض سمجھا گیا ہے۔

قوت عدالتی اور حکومت میں ایک حقیقی فرق یہ ہے کہ ثانی الذکر کی طرح اول الذکر کا فرمائی سے واسطہ نہیں رکھتی بلکہ وہ صرف انھیں قوانین کی حفاظت کرتی اور انھیں کو نافذ کرتی ہے جو پہلے سے تسلیم کئے جا چکے ہیں۔ حکومت کے فرائض انسان کے ذہنی قوی کے مانند قرار دئے جاسکتے ہیں اور قوائے عدالتی کے فرائض کو ضمیر کہہ سکتے ہیں۔

جدید زمانے کی سلطنتوں میں حکومت اور عدالت کے اختیارات کی علیحدگی ایک بہت ہی اہم سیاسی ترقی ہے۔ قدیم زمانے اور ازمنہ وسطیٰ میں ایک ہی حاکم دونوں فرائض کو انجام دیتا تھا۔ اس تغیر سے انصاف کی بے لوثی اور اہل ملک کی آزادی کو فائدہ پہنچا ہے اور حکومت کے وقار میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ تجربے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ

۱۔ اس موقع پر ڈانگلٹن کی ۱۶۹۶ء کی حیرت انگیز الوداعی تقریر کے ان الفاظ کو دیکھنا چاہئے۔ ”یہ بھی ایک اہم امر ہے کہ ایک آزاد ملک میں جن لوگوں کو سلطنت کا نظم و نسق سپرد ہو وہ اپنی قوت تخیل سے کام لینے میں احتیاط برتیں اور اپنے آپ کو اپنی حدود کے اندر رہیں اور اس سے بچتے رہیں کہ ایک محکمہ دوسرے محکمے کے اختیارات میں دخل دے، اس قسم کی دخل دہی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام محکموں کی قوت ایک محکمے میں جمع ہو جاتی ہے۔ اور حکومت کی شکل جو کچھ بھی ہو گر حقیقتاً مطلق انسانی پیدا ہو جاتی ہے، انسان کے دل میں حصول قوت کا جو شوق اور پھر اسے خراب کر نیکا جو میلان طبعاً موجود ہے، بس اسکا صحیح اندازہ ہی کر لینا اس رائے کی صداقت کے تسلیم کرینے کے لئے کافی ہے۔ سیاسی قوت کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے اور اسے مختلف لوگوں کے سپرد کر کے ہر ایک کو دوسروں کی دراندازی کے خلاف بہبود عام کا محافظ بنادینے سے جس طرح ایک دوسرے پر روک پیدا ہو جاتی ہے اُسی ضرورت کو شدت اور موجودہ تجربوں سے ثابت ہو چکی ہے، ان میں سے بعض تجربے ہمارے ہی ملک میں خود ہمارے ہی آنکھوں کے سامنے ہوئے ہیں، پس ان تغایرین کا قائم کرنا جس قدر ضروری ہے اُسی قدر اُنکا محفوظ رکھنا بھی ضروری ہے“

بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کوئی ممتاز مدبر، یا حکومت کا کوئی فرد (عامل) اچھا نچ بھی رہا ہو اور یہی حال اسکے عکس کا ہے۔ عدالتی قوت اگرچہ حکومت سے آزاد ہوتی ہے مگر جس طرح دل سر کے تابع ہے اسی طرح عدالتی قوت بھی حکومت کے ماتحت ہوتی ہے۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ کے فرائض انھیں تین تقسیموں پر ختم ہو گئے ہیں اور آسانی سے یہ سمجھ میں آ جاتا ہے کہ کس طرح پر حال کے نظا ہائے سلطنت نے انھیں تین پر حصہ کیا ہے لیکن زیادہ وقتِ نظر سے کام لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اعضائے فرائض کے دو اور مجموعے بھی ہیں اور وہ دونوں اگرچہ حکومت کے تابع ہیں مگر کچھ بھی وہ اُس سے تمیز نہیں کیونکہ وہ تحکم و فرمان کے (جو حکومت کی شرط لازمی ہے) بہت کم تحمل ہو سکتے ہیں یہ دونوں مجموعے حسب ذیل ہیں :-

(۳) تمدن کے ذہنی عناصر اور سلطنتی تہذیب کی نگرانی اور خبر گیری۔

(۴) سلطنت کے مادی اغراض (یعنی اقتصادیات) کا انتظام اور انکی خبر گیری۔

(۳-۴) ذہنی اور مادی مفاد کی نگرانی۔

ان دونوں اصناف میں حکمرانی کا کوئی سوال نہیں ہے، انسانی تہذیب کے بڑے اجزاء یعنی مذہب اور علوم و فنون کہیں بھی سلطنت کی قوت عمل سے متعلق نہیں ہیں اور نہ سلطنت انکو متعین اور پورا کر سکتی ہے چنانچہ مذہب اور علوم و فنون کے خارجی تنظیمات یعنی گرجے اور مدرسے سے بھی اصولاً سلطنت کو وہ واسطہ نہیں ہے جو خود اسکے حدودِ خاص میں حاکم و محکوم کے درمیان ہے۔ اس قسم کے معاملات میں بھی سلطنت کا کام اتنا ہی ہے کہ وہ نفع عام کی معاون ہو اور حیات عامہ کو مضرتوں سے محفوظ رکھے مگر وہ جانتی ہے اور متواتر اسکو توجہ دلائی جاتی رہتی ہے کہ ان چیزوں کی اصل اسکی قلمرو سے باہر ہے اس لئے ان امور میں سلطنت کے فرائض صرف نگرانی اور مرتبہ نہ خبر گیری تک محدود ہیں۔ سلطنت کے امر و نہی کو یہاں کچھ دخل نہیں۔

ایسا ہی حال چوتھی صنف یعنی اقتصادیات عامہ کا ہے۔ سلطنت کے مدخل و مخارج کا نظم و نسق، اہل ملک کے کاروبار اور انکی اقتصادی بہبود کو تقویت دینا منافع عامہ کے کاموں کا اہتمام کرنا، مقامی حکومتوں کی نگرانی کرنا، ان سب چیزوں کی مخصوص علت مخرج پوچھ تو یہ نہیں ہے کہ اقتدار کا نفاذ ہو بلکہ جس طرح تمدنی معاملات کے لئے ذہنی ترقی کی خبر گیری لازم ہے اسی طرح اقتصادی معاملات کے لئے مادی مقاصد کی پیروی۔ اقتصادی

انتظامات میں سلطنت کی شکمہ نہ خصوصیت کو گویا دخل ہی نہیں ہے، بلکہ اُس کے کہیں زیادہ ان انتظامات کی بنیاد اہل فن کے علم اور تجربے پر ہوتی ہے۔ پس سلطنت کی کارروائی جس حد تک اس معاملے میں ایک سچ کے شخص کے مشابہ ہو جاتی ہے اُس قدر کسی اور معاملے میں نہیں ہوتی۔ سلطنت کے املاک کی خرید و فروخت، اسی طرح ہو سکتی ہے جیسے سچ کے اشخاص کے املاک کی ہوتی ہے۔ قوم کی مادی بہبود، وہ وسیع بنیاد ہے جس پر سلطنت کا مدار کار ہے اور اگرچہ سیاسی ہستی کے لئے یہ ایک لازمی شرط ہے مگر بنیاد ہونیکے اعتبار سے وہ سب سے نیچے اور حکومت سب سے بلند جگہ پر ہوتی ہے۔ سلطنت کے فرائض کا یہ امتیاز صرف حال کے زمانے میں بتدیج تسلیم کیا جانے لگا ہے مگر ہنوز محکم اور مربیانہ سرپرستی میں ایسا خلط ملط ہے کہ اُس سے بہت سی خرابیاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ بعض وقت ایسے کاموں کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیا جاتا ہے جنکے لئے صرف رہبری یا نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض وقت مستعدانہ و شکمہ نہ عمل کے موقع پر ڈرتے ڈرتے مدد یا نگرانی کیجاتی ہے لیکن بائیں ہمہ سو بلکہ پچاس برس پیشتر جو حالت تھی اُس سے اب بہت بہتر حالت ہے اور بہت سے تنظیمات حکومت کے براہ راست انتظام سے عملدہ کئے جانچکے ہیں اور اُنکے انتظام میں جبر و زور کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ وہ علمی اور فنی حیثیت سے قوم کی بہبود اور آزادی دونوں کو مد نظر رکھتے ہوئے عمل میں آتے ہیں۔

اٹھواں باب

خدمات عامہ اور فرائض عامہ

۱۔ سلطنت جو کچھ خدمت لے، یا برضا و رغبت سلطنت کی جو کچھ بھی خدمت کیجائے وسیع معنی میں یہ سب "خدمات عامہ" میں داخل ہے، اس میں سپاہی، بحوری (پہنچ) و کلائے قوم اور ابتدائی اور ثانوی انتخاب کنندہ سب داخل ہیں۔ لیکن صحیح مفہوم میں یہ سب کے سب خدمات عام میں شامل نہیں ہیں۔ خدمات عامہ کے مفہوم میں یہ ضم ہے کہ خاص طور پر وہ کام کسی کے تفویض کیا جائے یا بالخصوص کوئی اس پر مامور کیا جائے۔ مذہبی حلقوں، کینیاؤں اور دوسری جماعتوں کے کارکن سلطنت کے ملازم نہیں ہیں۔ انکی خدمت عام ضرور ہے مگر سلطنت نے اُس خدمت کو اُن پر عائد نہیں کیا ہے اور نہ اُن کا تعلق براہ راست سلطنت سے ہے بلکہ

خدمات عامہ کا
وسیع اور محدود مفہوم

سلطنت کا سرتاج اسی اعتبار سے کہ وہ خود ہی صاحب اقتدار اعلیٰ اور وہی تمام خدمات عامہ کا منبع ہے، ملازمان عامہ (سرکاری) میں داخل نہیں ہے، پھر بھی فریڈرک اعظم کا یہ کہنا صحیح تھا کہ بادشاہ سلطنت کا خادم اول ہے، کیونکہ اسکا منصب ہی نظام سلطنت پر مبنی ہے اور اسکا وجود تمام سلطنت ہی کی خدمت کے لئے ہے۔

۲۔ محدود معنی میں تمام سرکاری خدمات، فرائض عامہ میں داخل نہیں ہیں اور نہ تمام سرکاری ملازم نظام سلطنت کے عہدہ دار ہیں۔ جسم سیاسی (جماعت عامہ) میں سلطنت کا عہدہ ایک خاص عضو کی حیثیت رکھتا ہے اور اسکے اپنے مخصوص فرائض ہیں۔

(۳) تمام سرکاری ملازم
سلطنت کے عہدہ دار
نہیں ہیں۔

ہر ایک فرض عامہ مخصوص افراد کے لئے محدود ہے اور عہدہ دار کی ذات اس فرض کی انجام دینے والی ہے، وسیع مفہوم میں سلطنت کے عمال یا کارکن وہ سرکاری ملازم ہیں جو اپنے لئے سرتاج سلطنت کی اتھنی اور وقت کو تسلیم ضرور کرتے ہیں مگر وہ

لے خاص خاص فرائض عامہ ان لوگوں کو سپروکے جاسکتے ہیں گلاس سے انکی معنی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اپنے عہدوں کے کاموں کو خود اپنی رائے سے انجام دیتے ہیں۔ محدود مفہوم میں یوں کہنا چاہئے کہ یہ وہ افراد ہیں جنہیں خود حکم دینے کا اختیار ہوتا ہے اور یہ ان لوگوں سے ملحدہ ہیں جنہیں اس قسم کا اقتدار اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کو پرانے رواج کے مطابق منظم عامہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ پروفیسر، سرکاری مدرسوں کے معلم، عام شفا خانوں کے نگران، اور طبیب، سرکاری انجینئر اور خزانچی، ناظم ممالک شاہی وغیرہ کے ایسے اکثرد عہدہ دار اس صنف میں داخل ہیں۔

استقامی اور عدالتی
عہدہ داروں کا فرق

صحیح معنی میں کارکنانِ سلطنت وہ لوگ ہیں جو استقامی یا عدالتی کاموں پر متعین ہوں اول الذکر اقتدار اختیار سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے حدود اختیار کے اندر جس کام کو رعایا کے لئے مفید سمجھتے ہیں اس کا حکم دیتے ہیں مگر ان کا انحصار بالاتر عہدہ داروں پر ہوتا ہے اور وہ اُنکے ہدایات کے تابع ہوتے ہیں۔ برخلاف اسکے، عدالتی عہدہ دار نہیں کر سکتے کہ خود انکی رائے میں مفاد عامہ کے لئے جو کام مناسب معلوم ہو اُس پر عمل کریں، وہ مجبور ہیں کہ قانون کو عملی حالہ تسلیم کر کے اُس پر کاربند ہوں اور مقررہ قواعد کے بموجب اُسے نافذ کریں۔ مگر اس کام میں وہ خود اپنے فہم و ادراک کے تابع ہیں، حکومت کے خاص احکام کے پابند نہیں ہیں۔ معمولی حالات میں اول الذکر کارکنوں کا میلان، آزادی کی طرف اور ثانی الذکر کا رجحان، استغفاظ کی طرف ہوتا ہے۔

۳۔ سلطنت کے ملازموں اور عہدہ داروں کے مددگاروں کو سلطنت کے ان دونوں قسم کے کارکنوں سے تمیز رکھنا چاہئے۔ ان لوگوں کے ملازم سرکاری ہونے میں کوئی شک نہیں مگر ان کا کوئی خاص منصب نہیں ہوتا، انہیں کسی قسم کا اقتدار یا آزادانہ اختیار حاصل ہوتا ہے۔ وہ محض ان عہدہ داروں کے مددگار ہیں جنکی ماتحتی میں وہ کام کرتے ہیں۔ اس زمرے میں، محرر، منقش، محصل وغیرہ داخل ہیں۔ چونکہ یہ لوگ سلطنت کے ایک عضو کے طور پر کام کرتے ہیں اس لئے ان کا شمار سرکاری ملازموں میں ہے، خاص کر ایسی صورت میں کہ وہ دماغی کام انجام دیتے ہوں گو کہ یہ دماغی کام نہایت بلند درجہ کا نہ ہو، لیکن اگر یہ وصف بھی نہ ہو اور محض دستی خدمت مد نظر ہو تو ایسے لوگ سلطنت کے کام میں ہونے پر بھی سرکاری ملازم نہیں کہے جاسکتے۔ اُنکے لئے زیادہ موزوں یہ ہے کہ انہیں سلطنت کا شخصی یا خاگی ملازم کہئے۔ ہر کارے، دیوان، عصابدار، اہل پولس، نقیب، وغیرہ

اسی زمرے میں داخل ہیں۔ انکی حالت، خدمات عامہ کے اعلیٰ شرائط کے بجائے شخصی قانون کے تابع ہوتی ہے۔

۴۔ ملکی اور فوجی فرائض میں سب سے اول شہنشاہ قسطنطین اعظم نے صاف طور پر فرق قائم کیا اور نئے زمانے کی سلطنت میں اس فرق کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ فوج میں صرف عہدہ دار ہی خدام عامہ سمجھے جاسکتے ہیں کیونکہ احکام کا تعلق صرف انھیں سے ہوتا ہے۔ باقی تمام سپاہی ایک عام ملکی فرض انجام دیتے ہیں یا ایک شخص معاہدہ کے طور پر اپنی خوشی سے فوج میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ملکی اور فوجی عہدہ داروں میں خاص امتیاز یہ ہوتا ہے کہ آخر الذکر میں انضباط زیادہ سخت ہوتا ہے اور فوجی اطاعت ان پر لازم ہوتی ہے لیکن ایک حد تک اس امتیاز کی وجہ یہ بھی ہے کہ فوجی عہدہ داروں کو اختیارات، بالواسطہ حاصل ہوتے ہیں، کیونکہ ان کا کام عامانہ ہے اور یہ کام بالطبع دوسرے درجے پر ہے۔

ملکی اور فوجی عہدوں میں فرق۔

۵۔ اجتماعی اور انفرادی عہدوں میں بھی ایک طرح کا فرق قائم کیا گیا ہے۔ اول الذکر جس میں بہت سے اشخاص داخل ہوتے ہیں اور جو غور و بحث کے بعد شرکت رائے سے فیصلہ کرتے ہیں۔ صلاح اور مشورے کیلئے زیادہ مناسب ہیں اور ثانی الذکر عمل کیلئے موزوں ہیں۔ بعض وقت اجتماعی غور و بحث اور انفرادی فیصلہ ایک ساتھ ملا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر ایک وزیر دوسرے وزیر کی رائے لیکر خود فیصلہ کرتا ہے۔

اجتماعی اور انفرادی عہدوں کا فرق

علاوہ اسکے اعلیٰ اور ادنیٰ ہونیکے لحاظ سے اور جائے عمل کے اعتبار سے بھی عہدوں میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ عہدے مرکزی ہوتے ہیں، درمیانی بھی ہوتے ہیں، جن کا تعلق صوبوں، محکموں اور ضلعوں سے ہوتا ہے اور سب سے کتر درجے میں مقامی یا موضعی عہدے ہوتے ہیں۔ بعض وقت یہ عہدے متوازی العمل بھی ہوتے ہیں۔ یعنی متعدد عہدہ دار ایک ہی حد کے اندر ایک ہی اختیار العمل میں لاتے ہیں مگر ہر عہدہ دار بطور خود اس پر عمل کرتا ہے۔ انکی مثال قدیم روم کے حکام اور انگلستان کے ناظران امن ہیں۔

جائے عمل کے اعتبار سے عہدوں میں امتیاز

۶۔ عہدے میں بالعموم سب ذیل چیزیں شامل ہوتی ہیں :-
(الف) اختیارات عامہ اور فرائض عامہ کی ایک مخصوص نوعیت اور اسکا ایک معین دائرہ عمل جسے "حدود اختیار" کہتے ہیں۔

عہدے میں کیا چیزیں شامل ہیں۔

(ب) ایک مرکز یا معین مقام جسے ”عہدے کا مستقر“ کہتے ہیں اور جہاں بیٹھ کر عہدے کا کاروبار عمل میں آتا ہے۔ جو عہدہ دار گشت کرتے رہتے ہیں اُنکے لئے بھی ایک مستقر ضرور ہوتا ہے۔

(ج) عہدے کی دعوت علیٰ کیلئے ایک حدِ فرضی (یعنی قطع یا ”گزر“) کا ہونا۔

سلطنت اور اس کے
ملازمین کے باہمی
تعلقات۔

۷۔ سلطنت اور اس کے ملازمین کے باہمی تعلقات کا معاملہ شخصی قانون سے متعلق نہیں ہے جیسا کہ پہلے لوگوں نے خیال کیا تھا بلکہ یہ ایک خالص سیاسی نوعیت کا معاملہ ہے۔ سلطنت کی خدمت محض ماموری یا حکم برداری نہیں ہے اور اسے اجرِ قتی خدمت کہنا تو اور بھی سچا ہے۔ شخصی قواعد کے معاہدے سے سرکاری ملازمین کے تقرر، اختیارات اور برطرفی کی تشریح نہیں ہوتی۔

سرکاری ملازمین کے تقرر کی بنیاد ایک باضابطہ حکمنامے پر ہوتی ہے جسے سلطنت اپنے ارادے سے عوام کے نفع کیلئے جاری کرتی ہے۔ لوگوں نے اس کا ردِ رائی کو ”قانونِ خاص“ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے مگر اس لفظ کا ترک بہتر ہے کیونکہ بالعموم تقرر کی کارروائی جماعتِ واضع قانون

۱۷ دیکھو گوئٹر کی تصنیف: ”سلطنت کی ملازمت، قانونی نقطہ نظر سے“ لنڈس ہوٹ شمس اور سنخارے کی کتاب جلد ۲ صفحہ ۲۵ اور آگے۔ شمس ہینر اپنی کتاب ”قانونِ سلطنت“ (صفحہ ۵۰۹) میں اُس زمانے کے مقننین کی حیثیت قانون کے خیال کو تو مسترد کرتا ہے مگر عجیب بات ہے کہ وہ خود اس موقع پر روما کے شخصی قانون کے اصول کو عائد کرنا چاہتا ہے حالانکہ خود اہل روما کو خواب میں بھی خیال نہیں آیا ہو گا کہ اس قانون سے یہ کام لیا جائے گا۔ تاہم اسکی یہ رائے ہے کہ خدماتِ عامہ کی بنا معاہدے پر ہے اگرچہ اُس معاہدے کی باندی لازمی نہیں ہے۔ اس معاہدے کو وہ عہدے پر نصب ہونیکے لئے شرطِ مقدم قرار دیتا ہے جیسے جاگیر پر قبضہ پانے سے پہلے جاگیر کی معاہدہ ہو اگر آتا تھا گریہ غلغلی ہے اس قسم کے قبل از نصب معاہدات مستثنیات میں سے ہیں۔ کسی شخص سے یہ استفسار کرنا کہ آیا وہ عہدے کو قبول کرے گا یا نہیں اور اسکا جواب، معاہدہ نہیں قرار دیا جاسکتا یہ ایک مبہوم معاہدہ ہو سکتا ہے اور اسکی بھی کوئی دلیل نہیں ہے اگر کسی مستثنیٰ صورت میں کوئی معاہدہ ہو بھی تو اس سے صرف فوہقین کے شخصی حقوق پر اثر پڑتا ہے حقوقِ عامہ پر اثر نہیں پڑتا اور اسلئے یہاں اس بحث کرنیکی کوئی ضرورت نہیں ہے اس میں شک نہیں کہ مزدگی کے قبول کرنے یا اُس سے انکار کا کیا حق حاصل ہے مگر اس سے اُس حکم کی تطبیق اور موثر حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

کی طرف سے عمل میں نہیں آتی بلکہ بادشاہیوں میں بادشاہ کی جانب سے عمل میں آتی ہے اور جمہوریتوں میں کبھی حکومت کی طرف سے اور کبھی عام انتخاب کے ذریعے سے عمل میں لائی جاتی ہے۔ حکم سلطنت کے اقتدار اعلیٰ کے ارادے کا یکطرفہ فعل ہے بلکہ جن مستثنیٰ حالتوں میں دائمی معاہدہ بھی ہو، جیسے غیر ملکیوں کے خدمات کے حصول میں ہوتا ہے، وہاں بھی یہ کارروائی یکطرفہ ہی سمجھی جاتی ہے۔ اگر نامزدگی کے بعد سلطنت کی طرف سے تقرر عمل میں نہ آئے تو اس قسم کا معاہدہ کسی کو بحیرہ قدر کرانیکے لئے عدالتی کارروائی کی بنا نہیں قرار پاسکتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ نقصانات کا مطالبہ کیا جائے جیسا کہ شخصی معاہدہ میں ہوتا ہے۔

خدمات عامہ کے فرائض کا تعین سلطنت کی طرف سے ہوتا ہے اور یہ فرائض عام اور منظم نوعیت کے ہوتے ہیں۔ عہدے کا قیام سلطنت کی ضروریات کیلئے ہوتا ہے، اس شخص کے لئے نہیں ہوتا جو اس پر فائز ہو اس لئے عہدہ نہ کسی خاص شخص کی ملک ہو سکتا ہے اور نہ لوگوں کے لئے حصول زر کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ جہاں کہیں یہ حالت ہوتی ہے (جیسی کہ ازمنہ وسطیٰ میں عام طور پر اور فرائض میں بعد کو بھی ہوتی رہی)۔ وہاں اس حالت میں سلطنت کیلئے شخصی قانون کے حدود سے نکلنا دشوار ہو جاتا ہے اور اور یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ سلطنت کو ابھی اپنی سیاسی ہستی کا پوری طرح احساس نہیں ہوا ہے۔

۸۔ عہدے کیلئے جو موجدہ معین ہوتا ہے وہ البتہ ایک ایسا عنصر ہے جس کا واسطہ شخصی قانون سے ہے کیونکہ حقیقتاً اس موجدہ کی غرض یہ ہے کہ عہدہ دار اور اسکے خاندان کے معاشی ضروریات پورے ہوں اور چونکہ عہدہ دار سلطنت کی خدمت بجالاتا ہے اس لئے وہ حق رکھتا ہے کہ سلطنت سے اپنی زندگی کے اخراجات طلب کرے۔ اس قسم کے مطالبوں کی حیثیت سیاسی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ماسکانہ حق کی سی نوعیت رکھتے ہیں۔ پس موجدہ کے دعووں کا فیصلہ ایک ملکی جج (یا حاکم دیوانی) بخوبی کر سکتا ہے۔

مگر اس عنصر سے عہدے کی نوعیت عامہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہر زمانے میں ایسے غیر تنخواہ دار یعنی اعزازی عہدہ دار بھی ہوتے رہے ہیں جنکی اہمیت جماعت سیاسیہ میں باقاعدہ تنخواہ دار عہدہ داروں کے منسل رہی ہے۔ انگلستان کے ناظران اس بلاشبہ سلطنت کے ویسے ہی عہدہ دار میں جیسے پروسیا کے تنخواہ دار دصوبہ دار، جو کو تو الی کے خدمات بھی انجام دیتے ہیں۔

نواں باب

عہدہ داروں کا تقدر

موروثی عہدے

۱۔ ازمنہ وسطیٰ میں یورپ کے ہر ملک میں جس طرح موروثی عہدے قائم ہو گئے تھے اب جدید سیاسیات میں ویسے ہی ہمہ گیر طور پر وہ مردود قرار پا رہے ہیں۔ ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ موروثی عہدے اپنی اپنی جگہ پر باقتدار ہو گئے تھے اور اس طرح ان عہدوں نے سلطنت کی وحدت اور ان کے نظم عمل کو بر باد کر دیا تھا۔ علاوہ اسکے ارثیت شخصی قابلیت کی ضامن نہیں ہو سکتی۔

زمانہ حال کی سلطنتوں میں بھی مستثنیٰ طور پر موروثی عہدے ہوتے ہیں، مگر یہ عہدے بالعموم اعزاز کے طور پر ہوتے ہیں ان کے ساتھ کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ مثلاً دربار سے متعلق وہ عہدے جو ازمنہ وسطیٰ سے چلے آ رہے ہیں۔

توفیقی اور اعزازی عہدوں کا فرق

۲۔ توفیقی اور اعزازی عہدوں کا فرق اس سے زیادہ اہم ہے۔ توفیقی عہدے میں انسان اپنی تمام قوت صرف کر دیتا ہے اور وہی اس کا ذریعہ معاش ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے مختص معلومات کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس اس کے حاصل کر نیکے لئے اس کے حسب ضرورت تعلیم، امیدواری اور امتحانات کام کر نیکی حاجت ہے۔ پس اس قسم کے عہدوں کے لئے مواجہے کا ہونا ضروری ہے۔

برخلاف اس کے اعزازی عہدے کے فرائض صرف وقتاً فوقتاً انجام دینا ہوتے ہیں اور اس لئے ایسے خدمات کو وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو اپنا ذاتی کاروبار بجائے خود کرتے ہوں، جیسے زمیندار تاجر وغیرہ اور ان کا ذریعہ معاش ان کا پیشہ یا ذاتی دولت ہوتی ہے۔ جو ری (پنچ) کی خدمت انجام دینا یا نیابتی مجلسوں میں شریک ہونا اسی قسم کے فرائض ہیں جو اس طریقے پر انجام پا سکتے ہیں۔ بظاہر سوسائٹی کا فنی ثروت بطور ہی اس قسم کے عہدوں کا کام انجام دے سکتا ہے۔ عوام الناس یا تو تعلیم یافتہ نہیں ہوتے یا ان کے پاس وقت نہیں ہوتا یا دونوں کی کمی ہوتی ہے۔

جدید سلطنتوں میں تو فیضی عہدے زیادہ اہم ہیں مگر اکثر حالات میں دونوں قسموں کے فوائد متحد کئے جاسکتے ہیں۔ نیابتی اور خود اختیاری حکومتوں میں یہ مواقع ہیں کہ تو فیضی عہدہ داروں کی ہدایت کے ساتھ نیابتی اعزازی عہدہ داروں کی مدد بھی شامل کر لی جائے۔

چنانچہ پروشیا میں صوبہ دار کو صوبے کے ارکان کے ساتھ ملا دیا ہے۔ بیڈن (بادن) میں ضلع کا پرنسٹ ضلع کے اعزازی ارکان کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ تو فیضی جج، جوری اور ایسیر کے ساتھ شریک کردئے گئے ہیں۔

۳۔ جرمانیا کی سلطنتیں اگرچہ اکثر اعتبار سے سیاسی ترقی میں انگلستان اور فرانس سے پیچھے ہیں مگر وہ اپنے قابل تعریف تو فیضی عہدوں کے انتظام میں سب سے آگے ہیں۔ جرمانی طریق کے موافق عہدہ داروں کے ایک لائق اور قابل اطمینان گروہ کی موجودگی یقینی ہے اس طریقے کے اصول یہ ہیں :-

(الف) عہدے اُن تمام لوگوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں جن میں اُن عہدوں کے کام کو سر انجام دینے کی قابلیت موجود ہو۔ غریب طلبہ کی امداد کے لئے بہ کثرت وظائف اور اوقاف موجود ہیں مگر فی الاصل زیادہ حصہ ایسے خاندان کے لوگوں کا ہوتا ہے جن میں خود تعلیم کا معیار بلند ہوتا ہے اور وہ خاندانی اخلاق و تربیت کا اثر گھر سے اپنے ساتھ لاتے ہیں اور پھر اسکا اثر ملازمت کی عام سطح کے بن کر پھیل جاتا ہے۔

(ب) بالعموم سرکاری ملازمت کے امیدواروں کے لئے یہ لازم ہے کہ انھوں نے کسی فوقانی مدرسے اور یونیورسٹی میں قدیم ادبیات (یعنی لاطینی اور یونانی) کی تعلیم پائی ہو، جہندسی اور فن تعمیر وغیرہ کے ایسے فنی (ٹکنیکل) عہدوں کے لئے مذکورہ بالا تعلیم کے بجائے عام فنی مدرسوں یا جہندسی مدرسوں کی تعلیم درکار ہوتی ہے۔ نصاب تعلیم کے ختم کر نیکے بعد ایک سرکاری امتحان ہوتا ہے جرمانی یونیورسٹیوں میں علمی روح جاری و ساری ہے وہ اس امر کی مانع ہے کہ تعلیم کی ہمت کسی خاص پیشے کی علمی تیاری تک محدود کر دی جائے اور اُنکی کوشش اسی میں صرف ہو کہ قوانین اور اصول کی گہری معرفت حاصل کی جائے۔ اس طرح پرچینی حکام کے طرز تربیت کے تقاضا ترقی پذیر علمی کاموں کے ذریعے سے رفع ہو جاتے ہیں اور سلطنت اور سوسائٹی کو اس بات کی نہایت لمبائی ہے کہ اُسکے عہدہ داروں کی ابتدائی تربیت نہایت اچھی ہوگی۔ امتحان کی شرط فریقانہ طرز فطاری

جرمانیا کے عہدہ دار

یا منافرت کا اور درباری سازشوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتی ہے، امتیازی قابلیت رکھنے والے نوجوانوں کے لئے میدان عمل کی راہ کو کھول دیتی ہے اور سخت پیروی کر نیوالے گونا گاہ امیدواروں کو، چاہے وہ کیسی ہی بڑی بڑی سفارشیں یا اثرات رکھتے ہوں پیچھے ہٹا دیتی ہے۔

البتہ اس طریقے پر محض علمی خیال سے آنکھ بند کر کے عمل نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ سلطنت کو لازم ہے کہ چند مناسب مستثنیات کو بھی جگہ دے اور یہ استثنا صرف اُن غیر ملکیتوں ہی کے حق میں نہ ہو جنکی قابلیت بغیر کسی سرکاری امتحان میں شریک ہوئے فاہر ہو چکی ہو بلکہ اُن ملکیتوں کے حق میں بھی ہو جو اپنی قابلیت کے باعث ممتاز ہوں۔ خصوصاً وہی لوگ جن کو تمام ازل نے نہایت اعلیٰ قابلیتوں سے مالا مال کیا ہے، شائع عام کو چھوڑ کر اپنے لئے ایک نیا راستہ نکال لیتے ہیں اس لئے یہ سخت دیوانگی ہوگی کہ سلطنت اُن کی قابلیتوں سے شتم ہونے سے ہاتھ دھو بیٹھے، صرف اس بنا پر کہ وہ اُس عام راستے پر نہیں چلے جو پہلے سے بنادیا گیا تھا گو کہ اُنھوں نے کہیں زیادہ مشکل حالات میں رہ کر اپنی قابلیتوں کو چمکایا ہے۔ اسی کے مصداق وہ عہدے ہیں جنکے لئے اعلیٰ تہذیب اور اعلیٰ مسلمی قابلیت درکار ہے جیسے وزرا اور مشیران سلطنت یا یونیورسٹیوں کے اساتذہ۔ ایسے مستثنیات کا قائم کرنا آسان ہے اور اس میں یہ خوف ہرگز نہیں کہ عام قاعدہ جو مقرر کیا گیا ہے وہ ٹوٹ جائے گا۔

(ج) نظری (یا علمی) امتحان کے بعد عملی امتحان ہوتا ہے یعنی امیدوار کو کسی عہدہ دار یا قانون پیشہ کے تحت میں کام کرنا ہوتا ہے۔ اس امیدواری کے زمانے کے ختم ہونیکے بعد اور امیدوار کو کوئی عہدہ ملنے سے پہلے بالعموم اُسے ایک اور امتحان دینا ہوتا ہے تاکہ یطمینان ہو جائے کہ اب وہ پختہ کار ہو چکا ہے اور اُسے سلطنت کا کوئی عہدہ دیا جاسکتا ہے۔

(د) جو لوگ ان شرائط کو پورا کرتے ہیں سلطنت اُن میں سے خود اپنی ضرورت کے موافق ارتقا قدر کرتی ہے۔

اسکے بعد سے ملازموں کو اُنکے زماں ملازمت اور ثبوت قابلیت کے موافق تدریجاً ترقی دی جاتی ہے۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک معین ترتیب کے ساتھ اعزاز، منصب اور معاوضے میں ترقی دی جائے۔ یہ اصول اکثر و بیشتر تو درست ثابت ہوتا ہے مگر اُس پر نہایت

سمجھ بوجھ کر اور چند قیود کے ساتھ عمل کرنا چاہئے۔ بلند تر اور بلند ترین عہدے کچھ اس لئے تو میں نہیں کہ تنکے ہوئے مضاعف بڑھوں کا آخری نصب العین بنیں۔ پس سرکاری ملازموں کی ترقی کو بندھے تنکے حسابی کر کی طرح انکی مدت ملازمت ہی پر لحاظ کر کے عمل میں نہ لانا چاہئے اصل چیز ہے انکے کام کی خوبی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بہت اچھے دماغ والے لوگ جب ایک طویل مدت تک ملازمت کے ادنے درجوں میں رہ کے معمولی کام کی چکی میں پڑ جاتے ہیں تو اعلیٰ درجے پر پہنچنے کے زمانے تک انکی کار آمد قوتیں مغفول اور مردہ ہو جاتی ہیں حالانکہ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب کہ ان سے بہترین دماغی قابلیتوں کی توقع کی جاتی ہے۔ اس غلط طرز عمل کا ذمہ دار وہ نظام نہیں ہے جس نے ملازموں کی ترقی کے ضابطے کو مقرر کیا ہے بلکہ باب و دفاتر کے کورانہ طرز عمل سے یہ نوبت آ جاتی ہے۔ جو سیاسی عہدے سب سے بلند ہوتے ہیں انھیں کے لئے سب سے زیادہ ضرورت اسکی ہے کہ ان پر ایسے لوگ مامور ہوں جنکی قوتوں میں کسی طرح کی کمی یا خرابی نہ آئی ہو۔ چہ جائے کہ ایسے اہم عہدے فروت بڑھوں کے لئے وقف ہو جائیں۔ پس اعلیٰ عہدوں کے لئے قدامت ملازمت بہت کم صورتوں میں دلیل راہ بنا دی جاسکتی ہے۔

(ھ) سلطنت جو مواجیہ عطا کرتی ہے اس سے عہدہ دار کو اپنی حالت کے موافق اپنی اور اپنے اہل و عیال کی گزراوقات کی طرف سے اطمینان ہو جاتا ہے۔ اگر تجارت کی آمدنی سے مقابلہ کیا جائے تو اس میں شک نہیں کہ اکثر جرمانی عہدہ داروں کو بہت کم معاوضہ دیا جاتا ہے مگر اسکے ساتھ یہ بھی ہے کہ وہ تجارتی نفع نقصان کی غیر متیقن کیفیتوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ اور اگر اپنے مواجب کو کفایت شعاری کے ساتھ اور کوئی اور ذاتی املاک ہو تو اسکے ساتھ ملا کر کام میں لائیں تو معقول طور سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اگر بے شمار تو فیضی عہدوں کے بدلے کچھ عہدے اعزازی کر دئے جائیں تو تو فیضی عہدوں کے معاوضے میں ترقی ہو سکتی ہے۔

(و) جرمانی عہدہ دار کو کچھ حقوق عامہ (Pragmatic rights) ایسی حاصل ہوتے ہیں یعنی ایک سترہ تنخواہ پانیکا اور جب سلطنت کو اسکی خدمت کی ضرورت باقی نہ رہے یا جب وہ خود سرب یا بیماری کی وجہ سے کام کے قابل نہ رہے تو وظیفہ پانے کا اسے قانونی حق ہوتا ہے۔

اس طریق میں جرمانی عہدہ داریہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ ایک قابل اطمینان اور قابل عزت حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ اپنی قوت اجتماعی کے احساس کے ساتھ ایک حقیقی پیشہ درجماعت کی ہیئت اختیار کر لیتے ہیں اور انھیں سیاسی قوت کی بھی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ سلطنت کے سرتاج اور رعایا کے نمایندوں کو بھی انھیں میں شامل کرنا پڑتا ہے اور ان لوگوں کو ان کے اتحاد عمل کے بغیر نہیں۔

انگلستان کے
عہدہ دار

۴۔ انگریزی طریقہ اس سے بالکل مختلف ہے، صوبوں میں پولس کا انتظام اور اختیار غیر تنخواہ دار کارکنوں کو سپرد ہوتا ہے جو طبقہ امرا سے لئے جاتے ہیں۔ دراز مستقل عہدہ داروں کے طبقے سے نہیں لئے جاتے بلکہ پارلیمنٹ کے فریقوں میں سے منتخب کئے جاتے ہیں۔ ملکی عہدوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا تقرر فریقانہ اثر سے ہوتا ہے اور ان میں سابقہ اہمیت کا کچھ لحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ صرف پارلیمنٹ کے ذی اثر ارکان کی سرپرستی اور سفارش سے یہ تقررات عمل میں آتے ہیں۔

لیکن اب انگلستان تک میں اسیدواروں کے امتحان لینے کی ضرورت بہ نسبت سابق کے زیادہ محسوس ہوتی جاتی ہے۔ اعلیٰ عدالتی عہدوں کے لئے ایک طویل زمانہ کی قانونی تعلیم کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ تعلیم یونیورسٹیوں میں نہیں ہوتی بلکہ "انز آف کورٹ" میں اور پیشے کے عملی تجربے سے حاصل ہوتی ہے۔ اکثر خصوصی اور فنی عہدوں کیلئے بھی اب امتحان کی ضرورت ہوتی ہے۔ نا اہل لوگ خارج کر دئے جاتے ہیں اور مریانہ اور فریقانہ اثر کم ہوتا جاتا ہے۔ وزارت کے تغیر سے صرف ساٹھ جگہوں پر اثر پڑتا ہے جن میں کچھ تو اعلیٰ سیاسی عہدے ہیں اور کچھ دربار سے متعلق عہدے ہیں۔

مالک متحدہ امریکہ
کے عہدہ دار

۵۔ مالک متحدہ کا طریقہ ابتداء انگریزی طریقے پر مبنی تھا مگر اسکا عملہ رآد جمہوری اور جمہوی انداز پر ہوتا تھا۔ اینڈر و جیکسن کے عہد صدارت میں تغیر کامل کا خطرناک طریقہ جاری ہوا جسے "طریق غنائیم" کہنا چاہئے۔ کسی نئے منصب جمہوریہ کے انتخاب پر کوئی ہر چوتھے یا کم سے کم ہر آٹھویں برس، اگر کوئی دوسرا فریق برابر اقتدار ہو جائے تو عہدوں کی ایک کثیر تعداد خالی ہو جاتی ہے اور نئے لوگوں سے معور کیا جاتی ہے۔ اس لئے عہدوں کے حصول کا ایک عام خطبہ پیدا ہو جاتا ہے اور فریقانہ خواہشوں کے مقابلے میں سلطنت اور سوسائٹی کے اغراض کا بہت کم خیال کیا جاتا ہے۔ پس اس طرح عہدہ داروں کا تمام طبقہ غیر یقین حالت

اور شدید تغیرات کے خدشے میں رہا کرتا ہے اور اس حالت میں شہرت خواری اور خبریوں کا روکنا مشکل ہوتا ہے۔ صرف جموں کی حالت بہتر ہے اور چونکہ عاداتاً تجربہ کار وکلاء میں سے ان کے انتخاب ہوتا ہے اسلئے انکی قانونی مہارت اور قابلیت کی طرف سے اطمینان ہوتا ہے۔

۶۔ فرانس میں عہدہ داروں کا ایک طبقہ تو ہے مگر انکو جمیٹ جمعی جبرائیا کے عہدہ داروں کی سی آزادی ہے اس لئے کہ سلطنت کے سر تاج یعنی موجود الوقت وزارت کو عہدہ داروں کے تقرر اور برطرفی کا اختیار نسبتاً زیادہ حاصل ہوتا ہے اور انکی علمی قابلیت ویسی اطمینانی ہوتی ہے۔ البتہ اکثر فنی اور خصوصی عہدوں کیلئے خاص مدرسوں (یعنی مدارس فنون۔ فوجی تعلیمی مدارس) کی خاص تعلیم کی شرط ہے عدالتی فرائض کیلئے یونیورسٹی کی تعلیم درکار ہے مگر اس قاعدے پر اس وسعت اور کثرت کے ساتھ عمل نہیں ہوتا جیسا کہ جرمانیا میں ہوتا ہے۔ عہدہ دار کا انحصار حکومت پر زیادہ ہوتا ہے عہدے اور سلطنت کی وفا شعاری کے بجائے فریقانہ وفا شعاری کا زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔

فرانس کے عہدہ دار

۷۔ قدیم زمانے کی جمہوری سلطنتوں میں اور کسی قدر اس زمانے کی جمہوری سلطنتوں میں بھی یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ عہدہ داروں کا تقرر ایک معین مدت اور عموماً چند برسوں کے لئے ہوتا ہے کہیں دوبارہ مقرر ہونیکا امکان رہتا ہے اور کہیں یہ امکان بھی نہیں ہوتا۔ سوئٹزرلینڈ اور امریکہ وغیرہ میں یہی طریقہ جاری ہے۔ مقامی عہدوں کے لئے یہ طریقہ بخوبی کام دے سکتا ہے کیونکہ ان عہدوں کے لئے بالعموم زیادہ تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی اور بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اس میں کسی شخص کو اپنی پوری قوت صرف کر دینی ضرورت ہو مگر جب سلطنت کے عہدوں کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے جہاں اس زمانہ کے اعلیٰ ترقی یافتہ ضروریات کے لحاظ سے ایک مدت دراز کی فنی تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے تو اس سے سخت نقصانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس طریقے میں بخیرت تغیر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذاتی حرص و طمع اور فریقانہ سازشوں کے پورا کرینکا موقع ملتا ہے۔ کارکنوں کو طمانیت نہیں رہتی اور سیاسی کاموں کی پائیداری اور استقامت کم ہو جاتی ہے۔ ان نقصانات کے مقابلے میں یہ نفع کوئی چیز نہیں ہے کہ اس طریقے سے نالائش عہدہ دار اور وہ لوگ جنہوں نے عوام کا اعتماد کھو دیا ہے آسانی کے ساتھ خارج کئے جاسکتے ہیں۔ یہ طریقہ اعیانی حکومت میں اس قدر خطرناک نہیں ہے کیونکہ فطرتاً اسکا میلان استقامت

جمہوری سلطنتوں میں
قریباً عموماً ایک معین
زمانے کیلئے ہوتا ہے

اور اعتدال کی طرف ہوتا ہے لیکن عمومی حکومت میں یہ زیادہ خطرناک ہو جاتا ہے کیونکہ اس طریق حکومت میں تغیرات کا شوق زیادہ ہوتا ہے اور محض اسی وجہ سے اس کا رجحان کم مدت کے طریقے کی طرف ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے یہ بھی اندیشہ رہتا ہے کہ نہایت اعلیٰ قابلیت کے لوگوں کے خدمات سے سلطنت محروم ہو جائے اور اسکی وجہ یا تو عوام کی خود رانی اور کج فہمی ہوتی ہے یا یہ کہ خود یہ لوگ اس سے زیادہ قابل اطمینان طریق زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔

۸۔ جو شخص کسی عہدے پر مقرر کیا جائے اس کے قبول کرنے یا اس سے انکار کرنے کے متعلق اسے آزادی حاصل ہونا چاہئے۔ اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ سلطنت کی خدمت کی بنیاد معاہدہ ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ دماغی کام کے لئے قطعی مجبوری کا عاید کرنا دشوار ہے اور ضمنی مجبوری حصول مقصد کے لئے نا کافی ہوتی ہے۔ تمام مفید کاموں کی انجام دہی کے لئے شخصی آزادی پہلی شرط ہے۔ کوئی باشندہ ملک اس امر پر مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ دوسرے کی بر نسبت زیادہ ایثار کرے۔ اس زمانے کی تمام سلطنتوں میں خواہ جمہوری ہوں یا شاہی یہ اصول مسلم ہے۔ مقامی عہدے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کی تعداد کی کثرت اور کام کی قلت کی وجہ سے ہر باشندہ پر انکی انجام دہی کا ایک عام فرض عاید ہو جاتا ہے۔

یہ سوال معرض بحث میں رہا ہے کہ تقرر کی ابتدا کس وقت سے ہوتی ہے اگر اہم اس امر کا خیال رکھیں کہ تقرر صرف سلطنت کی یک طرفہ کارروائی ہے تو ہم بلا تردد اسکا جواب یہ دے سکتے ہیں کہ جس وقت سے یہ کارروائی عام کر دی جائے یعنی مروج ہو جائے اور اس پر دستخط ہو جائیں اسی وقت سے تقرر مروج ہوتا ہے۔ نامزد شدہ شخص کو اس کی اطلاع دینا اور بعد میں اسکو عہدے پر رخصت کرنا یہ سب کامل نامزدگی کے نتائج مابعد ہیں۔

۱۱۔ اسکی مثال وہ شہر ہیں جو سلطنت بن گئے ہیں۔ جیسے کہ "اشہنشاہی" کے آزاد شہر تھے یا جہاں نظام سلطنت اس قدر سادہ ہوتا ہے کہ اسکی حالت ایک ضلع یا قبضے کی حکومت کی سی ہوتی ہے جیسے ہنٹ سٹل کے کنٹون کی حالت ہے۔

۱۲۔ اس بحث پر صدر جمہوریہ جفرسن اور ممالک متحدہ کی عدالت عالیہ کے درمیان تنازعہ ہو چکا ہے

عہدے کے قبول کرنے یا اس سے انکار کرنے کی آزادی

تقرر کی ابتدا کس وقت سے ہوتی ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۲۸ - (اسٹوری جلد سوم صفحہ ۱۲۴) جفرسن کا دعوئے یہ تھا کہ نامزدگی سے عہدہ دار کو کوئی حق نہیں پیدا ہوتا جب تک کہ حکم نامزدگی اُسے نہ مل جائے۔ عدالت عالیہ کی رائے یہ تھی کہ محض نامزدگی ہی اس اعتبار سے اثر پذیر ہے کہ جس حکومت نے نامزدگی کی ہے وہ اُسے ساقط کر دینا حق نہیں رکھتی۔

تسوارے کا خیال یہ ہے کہ نامزدگی کا اثر قانونی نتائج تک محدود ہے (دیکھو تسوارے کی کتاب فقرہ ۱۳۶) مگر یہ تحدید نہ تو ضروری ہے اور نہ صحیح ہے۔ نامزدگی کا اثر محض شخص معارف کے طور پر نہیں بلکہ سلطنت کے فعل عامہ کے طور پر ہے اور اگرچہ عہدے پر نصب ہونے کے وقت تک اختیارات عمل میں نہیں لائے جاسکتے مگر ان اختیارات کے عمل میں لایا جاسکتا ہے پہلے ہی سے قائم ہو جاتا ہے۔

دسواں باب

سرکاری عہدہ داروں کے حقوق اور فرائض

فرائض منصبی کی
انجام دہی

۱۔ سب سے مقدم یہ ہے کہ عہدہ دار کو اپنے فرائض منصبی کے انجام دینے کا حق ہوتا ہے۔ اسے عہدہ دار کا حق قانونی یا اس کا قانونی حیثیت دار کہتے ہیں، اور اس کا تعلق تمام تر مفاد عامہ سے ہے۔ اسکے ساتھ یہ فرض بھی مستقلاً وابستہ ہے کہ عہدہ دار اپنے عہدے کے کار بارائے منصبی کو اسی طرح انجام دے جس طرح ہونا چاہئے۔ پس اس حق قانونی کا عمل میں لانا نہ لانا عہدہ دار کی شخصی مرضی پر منحصر نہیں ہے۔ سلطنت یہ حق اس کو اس لئے نہیں دیتی کہ جو اس کا جی چاہے کرے بلکہ اس لئے کہ وہ خدمت عامہ کا انہرام کرے۔ اسی سبب سے عہدہ دار کو سلطنت سے یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ دوا گاہ اور ذاتی حیثیت سے اپنے عہدے کے دائرہ عمل کی وسعت یا اپنی سرکاری کارگزاری کی نوعیت کو معین کرے۔ بلکہ ان دونوں باتوں میں وہ قانون کے ان احکام کا (جن کی رو سے اسکے عمل کی وسعت اور طرز کارگزاری میں رد و بدل لازم آتی ہے) اور حکام بالادست کی ہدایتوں کا تابع ہے، چاہے یہ چیزیں اس کی ذاتی مرضی کے خلاف ہی ہوں۔ پس اسکے ذمے نئے کام بھی غائب کئے جاسکتے ہیں اور اُسے ان سے انکار کر لینا قدرت نہیں۔ البتہ یہ نئے کام بھی وہی ہونگے جو اسکے عہدے سے متعلق ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ عہدوں کی ہستی اور ان کی نوعیت کلیۃً سلطنت سے متعلق ہے اور اس وجہ سے عہدے کا حق اور عہدے کے فرائض بھی سلطنت ہی کے تابع ہیں۔

نصب اور درجہ

۲۔ عہدہ دار کو اسکے عہدے کے لقب اور درجے کا شخصی حق حاصل تو ہوتا ہے مگر اس حق کی بنا بھی سیاسی اغراض پر ہوتی ہے اور بذریعہ قانون اس میں ترمیم کی جاسکتی ہے۔ اسکے ساتھ ہی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی سابق عہدہ دار کا لقب اور درجہ اسکے شخصی حق کے بغیر قائم رہے۔

۳۔ اغراض سلطنت کے لئے جو اخراجات پیش آئیں یا جو نقصانات برداشت کئے جائیں ان کے معاوضے کا حق خالصاً شخصی قانون سے تعلق رکھتا ہے اور اس معاملے میں تنخواہ دار

اخراجات کیلئے
معاوضہ

تخواہ (مواجبہ)

اور غیر تخواہ دار دونوں عہدہ دار یکساں ہیں۔

۴۔ لیکن خود خدمات کے معاوضے کا حق اسی کے مثل نہیں ہے۔ اسکا انحصار سلطنت کی رائے پر ہے کہ کسی خاص عہدے کیلئے تخواہ ہونا چاہئے یا نہیں۔ جس عہدہ دار کو تخواہ ملتی ہو وہ اپنی تخواہ کے متعلق شخصی قانون کے حقوق کا تابع ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ اکثر جرمانی سلطنتوں کی طرح عہدہ داروں کے معاوضے میں امتیاز قائم کر دیا جائے۔ یعنی (۱) ایک معاوضہ درجے کا ہو اور (۲) ایک معاوضہ خدمت کا۔ سلطنت کا یہ فرض ہے اور اس کے اغراض کیلئے یہ ضروری ہے کہ جن عہدہ داروں کے پورے وقت اور قابلیت سے وہ کام لیتی ہو ان کے سبب حال اُمّی گزراوقات کا سامان کرے لیکن اسکے علاوہ کچھ اصلاحات ایسے بھی ہیں جو عہدے کے فرائض ادا کرنے میں لازمی طور پر پیش آتے ہیں یا ان فرائض سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ امتیاز ان عہدہ داروں کے معاملے میں خاص اہمیت رکھتا ہے جو عملی خدمات سے کنارہ کشی اختیار کر نیوالے ہوں۔ سابق الذکر قسم کے معاوضے کے متعلق اُن کا حق قائم رہتا ہے لیکن موخر الذکر قسم کے معاوضے کے متعلق اُن کا کوئی حق نہیں رہتا۔ اول الذکر ایک بڑی حد تک شخصی قانون کا معاملہ ہے اور موخر الذکر فرائض عامہ کے عملدرآمد سے تعلق رکھتا ہے جن خاص عہدوں کے ساتھ خاص معاوضے یا رسوم وغیرہ شامل ہوتے ہیں وہ آخر الذکر قسم میں سمجھے جاتے ہیں۔ خواہ اسکا تعلق عہدہ داروں کی مستقل آمدنی ہی سے کیوں نہ ہو۔ سلطنت کو اختیار ہے کہ اس قسم کے رسوم میں تغیر کرے۔ رسوم کی کمی کی تلافی کے لئے اگر معینہ تخواہ میں اضافہ کر دیا جائے تو یہ ایک رعایت ہے ورنہ اس قسم کی تلافی کیلئے کوئی قانونی حق نہیں ہے۔

لیفٹہ تعاعد

وکیلۃ تعاعد کا حق اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ عہدہ دار اگر بغیر اپنے کسی قصور کے عہدے سے ہٹنے پر مجبور ہو تو اسے اپنی تخواہ کے متعلق شخصی قانون کے موافق حق حاصل ہوتا ہے۔ وکیلۃ کا تناسب تخواہ گزراوقات کے موافق ہونا چاہئے اور اگر اس قسم کا کوئی امتیاز باضابطہ تسلیم کیا گیا ہو تو وکیلۃ کے معین کرتے وقت عہدے کے اہل اصلاحات کو وضع کر لینا چاہئے۔ مناسب یہ ہے کہ وظائف کی مقدار اور شرطیں از روئے قانون قطعی طور پر معین کر دی جائیں تاکہ کسی قسم کی آزادی رائے سے کام لینے کی ضرورت نہ پڑے۔ وظائف کے عام دستور سے خزانے پر بہت بڑا بار پڑ جاتا ہے لیکن سلطنت کو پورا وقت

دینے والے عہدہ داروں کی ضرورت ہو تو پھر اس بار کے نہ برداشت کر نیکے لئے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ تجارت و حرفت کی آمدنی کے مقابلے میں سرکاری عہدہ داروں کی تنخواہیں اکثر حالتوں میں بہت کم ہوتی ہیں اور ذہنی قابلیت و تعلیم کی انھیں زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس لئے سلطنت کا یہ فرض ہے کہ جو لوگ اپنی زندگی اسکے لئے وقف کر دیتے ہیں انھیں یا محتاج کی طرف سے مستغنی کر دے۔ اس خرچ کا معاوضہ عوام کو اس طرح ملتا ہے کہ بہتر لوگ ملازمت میں داخل ہو جاتے ہیں اور رشوت لینے کی طبع باقی نہیں رہتی۔

سلطنت کے ملازموں کی بیواؤں اور انکے یتیم بچوں کو وظیفے کا کوئی قانونی حق نہیں ہوتا۔ تنخواہ موروثی نہیں ہوتی۔ بہت سی سلطنتوں میں یہ عہدہ انتظام جاری ہے کہ وظیفہ کا ایک عام سرمایہ ہوتا ہے اور اس کا قیام زیادہ تر عہدہ داروں کی تنخواہوں کی وضعات پر ہوتا ہے۔

۶۔ عہدہ داروں کے فرائض زیادہ تر انکے حقوق کے تابع ہوتے ہیں علاوہ اسکے ان پر اپنے سے اعلیٰ عہدہ داروں کی اطاعت بھی لازم ہوتی ہے۔ سلطنت کے سرتاج اور قوم کے ساتھ انھیں وفا شعاری برتنا پڑتی اور ضرورت ہو تو رازداری کی پابندی بھی کرنا پڑتی ہے۔ عام طور پر عہدے کے لئے جو حلف لیا جاتا ہے اس سے یہ ذمہ داری پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس سے یہ ذمہ داری مضبوط ہو جاتی ہے۔ یہ عہدہ دار کے فرائض کی کوئی شرط نہیں ہے نہ اس سے فرائض پر کسی قسم کا اثر پڑتا ہے۔

مختلف کاموں کی نوعیت کے اعتبار سے اطاعت کی حالت بھی بدلتی رہتی ہے انتظامی اور عدالتی کارکنوں کے لئے اسکی حیثیت مختلف ہوتی ہے۔ بظاہر خود الزام کو فی الجملہ آزادی حیثیت حاصل ہونا چاہئے مگر اول الذکر بھی اطاعت مطلق یا اعتدال اطاعت پر مجبور نہیں ہیں۔ قانون و اخلاق دونوں طریقوں سے ایک حد معین ہو جاتی ہے۔ خاص خاص صورتوں میں اطاعت کی حد معین کرنا بڑا مشکل مسئلہ ہو جاتا ہے۔

(الف) عہدہ دار یہ کر سکتا ہے کہ اسے جو حکم دیا جائے اسکی نسبت وہ یہ دیکھے کہ وہ حسب ضابطہ ہے یا نہیں، یعنی بالادست عہدہ دار کو اپنے عہدے کے اعتبار سے اس حکم کے دینے کا حق ہے یا اس نے محض اپنی ذاتی رائے سے حکم دیدیا ہے۔

نیز یہ کہ اس حکم کی تعمیل خود اس کے اختیار کے اندر ہے یا نہیں۔ علاوہ اسکے جس حکم کے لئے دستخط کی ضرورت ہوتی ہے اگر اُس پر دستخط نہ ہوں تو وہ اس کی تعمیل سے انکار کر سکتا ہے۔ وہ سرکاری کارکن ہے کوئی خانگی ملازم نہیں ہے اور اس لئے اُسے یہ حق ہے کہ وہ احکام کے حسب قانون ہونیکے لئے اس کی نوعیت پر غور کرے۔

اگر اس قسم کی تحقیق کا سوال مشتبہ ہو اور عہدہ دار بالادست یہ تصدیق کرے کہ اُسے حکم دینے کا حق ہے تو عہدہ دار ماتحت کے لئے اطاعت لازم ہے۔ اس کا حق بلکہ اس کا فرض جو کچھ ہے وہ یہی ہے کہ وہ اپنے شکوک کو اپنے بالادست کے سامنے بیان کر دے اور دوبارہ حکم دئے جائیگا انتظار کرے۔

(ب) کسی حالت میں کوئی عہدہ دار اس قسم کی اطاعت پر مجبور نہیں ہے جس سے مذہب و اخلاق کے اعلیٰ اصول شکست ہوتے ہوں، یا جس سے وہ خود کسی جرم میں شریک ہو جاتا ہو۔ اس قسم کے کام ہرگز اُس کے عہدے کے فرائض میں داخل نہیں ہو سکتے۔ کسی عہدہ دار سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ایسے کام انجام دے گا جسے دوسرا شخص انسانیت کے خیال سے یا صاحب مذہب، مذہب کے خیال سے یا ایک معمولی شہری ملک کے تعزیری قانون کے لحاظ سے اس کی انجام دہی سے انکار کر دینگا۔

(ج) ایک ماتحت عہدہ دار کسی ایسے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کر سکتا جسے وہ اپنی

(الف) اس موقع پر یقیناً ایک فرد واحد کے اخلاق اور اس کے عہدے کے قانونی فرض میں خلط بھڑکت ہو گیا ہے۔ حافی کمالات، ہونے کی حیثیت سے حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اخلاق کا احترام کرے مگر کسی عہدہ دار کا یہ حق نہیں ہو سکتا کہ وہ قانونی اور آئینی وجود کے سوا کسی اور وجہ سے مقاومت کر سکے۔ یہ یقینی ہے کہ اُس سے یہ خواہش نہیں کی جاسکتی کہ وہ ملک کے فوجداری یا دیوانی قانون کی خلاف ورزی کرے لیکن اگر کوئی ایسا حکم دیا جائے جو اسکے مذہب یا اسکے اخلاق کے مغائر ہو تو وہ یہ نہیں کر سکتا کہ صرف اس بنا پر اس حکم کی تعمیل بھی نہ کرے اور اپنے عہدے پر بھی قائم رہے۔ آگے کے فقرات (ج) و (د) میں اس امر کو صحیح طور پر بیان کیا ہے مگر غلطی نے جو کچھ یہاں بیان کیا ہے اس میں اور مذکورہ بالا فقرات میں تناقض معلوم ہوتا ہے۔ (انگریزی مستحکم)

رائے میں خلاف قانون یا نامناسب سمجھتا ہو، وہ اس معاملے میں صرف اپنے بالادست کے سامنے عذر پیش کر سکتا ہے، اُسے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اُسکے بالادست کی غرض یہ نہیں ہو سکتی کہ وہ قانون کی خلاف ورزی کرے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ اُس نے کسی خاص معاملے میں کافی غور نہ کیا ہو اور ممکن ہے کہ ماتحت کی ادب اور صاف دلی کے ساتھ ظاہر کی ہوئی رائے کو سنکر وہ اپنے فیصلے میں ترمیم کر دے۔ کسی عہدہ دار کو اپنے بالادست اور اپنی سلطنت کو لغزٹوں سے بچانے میں کو تاہی نہ کرنا چاہئے کیونکہ اگر افسر بالادست اپنے احکام پر مصر ہو تو ماتحت پر اطاعت لازم ہے اور ذمہ داری بالادست پر عائد ہوتی ہے۔ یہ خلاف اسکے اگر ماتحتوں کو مقادست کا اختیار دیدیا جائے تو سلطنت کی وحدت عمل برباد ہو جائے گی، اسکی قوت سلطنت ہو جائیگی اور قانون کی ایک منفرد خلاف ورزی کی بہ نسبت جسکا ذمہ دار بالادست افسر ہے کہیں زیادہ مذہم نتائج پیدا ہونگے۔

۱۱۔ اکثر نظامہائے سلطنت میں یہ اصول واضح طور پر ظاہر کر دیا گیا ہے، مثلاً ۱۸۸۵ء کے ہندوؤں کے نظام سلطنت کی دفعہ (۱۶۱) میں یہ کہا گیا ہے کہ جو حکم صحیح صورت میں بالادست عہدہ دار کی طرف سے جاری ہوتا ہے اُس سے اس ماتحت عہدہ دار پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جسے وہ حکم دیا جاتا ہے بلکہ اسکی ذمہ داری اُس بالادست پر عائد ہوتی ہے جو حکم دیتا ہے۔ اسی طرح آئینی نکلن کے نظام سلطنت کی دفعہ ۴۰-۱۱ میں اس کے قیاس پر نظام سلطنت کی دفعہ (۳۰) میں یہ دیکھ سکتے ہیں کہ بالادست عہدہ دار کی ذمہ داری اُس شخص پر ہے جو اسکا حکم دے۔ بالادست عہدہ دار کے احکام کا عذر صرف اس صورت میں پیش کیا جاسکتا ہے جب وہ احکام صحیح صورت میں نافذ ہوں اور انکا نافذ کرنا اُنکا اختیار رکھتا ہو اس صورت میں ہی اُن احکام کا ذمہ دار ہو جاتا ہے جس نے انکو جاری کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ گوئیر (اپنی کتاب محولہ بالا کے فقرہ ۴۹ میں) "شرف اطاعت" کے معنی یہی سمجھا ہے گوکہ اس میں شک نہیں کہ اُس نے عہدہ دار کو ایک "کل" فرض کر کے اپنے استدلال کی بنا کو کمزور کر دیا ہے؛ اسلئے کہ وہ غیر واجبی احکام کے خلاف عذر دینے کے فرض کو تسلیم کرتا اور اطاعت کے فرض کو صورت اور معنی دونوں کے لحاظ سے محدود کرتا ہے (دیکھو اُس کی کتاب صفحہ ۲۰۸) اسکے علاوہ اس سلسلے میں جو "کل" کا لفظ استعمال ہوا ہے اُس سے رہبانیت کی سی ہوتی ہے۔ (اس نہایت معرکہ آرا سلسلے پر دیکھو شکستہ کا جرمانی قانون سلطنت، جلد ۱، صفحہ ۳۲۵ اور آگے، لائبنڈ کی تصنیف، جلد ۱، صفحہ ۴۲۷ اور آگے کوئےنگ کا لا قانون نظم و نسق، صفحہ ۱۲۲ اور آگے۔)

یہی حال بالادستوں کے خلاف آئین احکام کا ہے۔ اُنکی مقاومت کر کے ماتحت کو خود آئینی اطاعت کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہئے۔

دفاشعاری

۷۔ دفاشعاری کا خیال فرض اطاعت سے آگے بڑھا ہوا ہے۔ عہدہ دار کو جو حکم دیا جائے جب وہ لفظاً و معنیاً اُنکی تعمیل کر دیتا ہے تو وہ اپنے فرض اطاعت سے سبکدوش ہو جاتا ہے لیکن دفاشعاری کا اثر اُسکے تمام اعمال و افعال پر عادی ہوتا ہے۔ البتہ اب جاگیر داری طریق کی طرح وفاداری نظم معاشرت کی بنیاد خاص نہیں رہی ہے کیونکہ عہدہ داروں کے فرض قانو نامعین ہو گئے ہیں۔ اُنکے کاموں پر بادشاہ کی ذات کی دفاشعاری سے زیادہ سلطنت کی ضروریات کا اثر پڑتا ہے۔ با اس ہمہ ملازمت سرکاری کی کجہتی اور اُسکے اضافی ارتباط کی بنیاد ابھی تک دفاشعاری پر ہے۔

اگر کوئی عہدہ دار ایسے منفرد امور میں جو اہم ہوں اپنے بالادستوں کی رائے کے خلاف رائے رکھتا ہو اور وقت ضرورت اُسکا اظہار بھی کرتا رہتا ہو تو اس سے دفاشعاری کے فرض میں کوئی نقص نہیں عائد ہو گا۔ لیکن اگر وہ مستقل اور اساسی اصولوں میں حکومت سے مختلف الراء اور اُسکے مخالف ہو مثلاً شاہی حکومت میں وہ اپنی جمہوریت پسندی کا اظہار کرے اور جمہوری سلطنت کے قیام کے لئے کوشش کرتا ہو یا اسکے برعکس جمہوریت میں شاہی کے لئے کوشاں ہو تو اس سے وفاداری کا رشتہ ٹوٹ جائیگا اور وہ جسم حکومت کا ہم آہنگ عضو نہ رہیگا۔ یہی حال اس عہدہ دار کا ہے جو اُس مخالفت میں باقاعدہ اور مسلسل جھگڑتا ہو جسکا مقصد حکومت کو ہٹ دینا یا اسکے راستے میں دقت حاصل کرنا ہو۔ یہ دفاشعاری کے اس درجہ خلاف ہے کہ کوئی حکومت طوائف الملوکی کی حالت میں پڑے بغیر اسے گوارا نہیں کر سکتی۔ لے کسی خاص کام میں ترک اطاعت نہ بھی کی جائے تو بھی وزارت سے

لے گیر دئے ڈسٹنگن کی سوانح عمری کے دیباچے میں اُسکا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب تک کہ مہام ملی کی باگ میرے ہاتھ میں ہے، میں دیدہ و دانستہ کسی اہم جگہ پر ہرگز کسی ایسے شخص کو نہیں مقرر کروں گا۔ جسکے سیاسی خیالات حکومت کی عام روش کے خلاف ہوں۔ میری رائے میں ایسا کرنا ایک طرح کی سیاسی خودکشی ہے۔ اشتراکین کے مندرجہ ذیل پر زور ملحوظات سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ جرمانی بدلتوں نے اُن خرابیوں کو کس قدر قوی طور پر محسوس کر لیا ہے جو غیر وفادار عہدہ داروں کی باعث

باقاعدہ مخالفت کرنا، وفا شعاری کے خلاف ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی عہدہ دار باطل مختلف بلکہ مخالف رائے رکھتا ہو اور اس سے اُسکے عہدے کے فرائض کی بجا آوری میں خلل نہ پڑے مگر اُس پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنے عہدے کی حیثیت سے اس قسم کے خیالات کا اظہار نہ کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اُسے تو لاؤ فعلاً اپنی مخالفت کا اظہار کرنا لازم ہے تو اُسے چاہئے کہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ججوں کی حالت زیادہ آزادی کی ہے۔ اُن کا عہدہ سیاسی نوعیت کا نہیں ہوتا اور نہ اُس کا انحصار حکومت کی مرضی پر ہوتا ہے۔

عہدے کی وفا شعاری کا ایک لازمہ یہ بھی ہے کہ اپنی حکومت کی اجازت کے بغیر کوئی عہدہ دار کسی غیر سلطنت کی نہ تو کوئی خدمت اختیار کرے نہ اس کی طرف سے کوئی اعزاز، وظیفہ یا اس قسم کا کوئی اور امتیاز قبول کرے۔

۸۔ سرکاری رازداری جو حسب قاعدہ عہدہ داروں پر فرض ہے اُسے کئی اور مطلق رازداری نہیں سمجھنا چاہئے بلکہ اُس کا تعلق انھیں امور سے ہے جن کا مسلم عہدہ دار کو اپنے عہدے کی بدولت حاصل ہوا ہو اور جن کے افشاء سے سلطنت یا افراد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو یا کسی اعلیٰ تر فریضے کی بنا پر رازداری ضروری ہو دونوں انتہائی حدود سے بچنا چاہئے۔ نہ تو خلاف آئین اور خلاف قانون افعال کو چھپانے کے لئے بدعتی یا نقشب سے پر اسرار خاموشی اختیار کرنا چاہئے اور نہ بے سمجھے بوجھے فنون کوئی دیکھا جائے۔

۹۔ سلطنت کو یہ اختیار ہے کہ جو کارکن اپنے فرائض میں نفلت برتیں یا اُسے عداوت عمل کریں، انکی تادیب کرے یا انھیں سزا دے۔ جن جرائم کی تحقیقات اور سزا معمولی عدالتوں میں ہو سکتی ہے انھیں ادا اُسے فرائض کی اُس غفلت کے سبب سزا دینا چاہئے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ سلطنت میں پیدا ہو جاتی ہیں وہ کہتا ہے کہ اکثر سرکاری عہدہ داروں کے انداز سے جس قسم کی گستاخی اور وقت کا سامنا ہوتا ہے اس کا اندازہ اس کے سوا اور کسی طور پر نہیں ہو سکتا کہ جو لوگ اس طرح پر خطرناک رایوں کی اشاعت کریں یا حکومت کے اقتدار کی بیخ کنی کریں اُن کے خلاف سخت کارروائیاں اختیار کی جائیں اور انھیں فوری برطرفی قید یا جلا وطنی کی سزا دی جائے۔“

جس میں عہدہ دار کی طرف سے تادیب کی جاتی ہے۔ اول الذکر کا فیصلہ ملک کے معمولی قانون سے ہوتا ہے اور موخر الذکر کا تصفیہ خصوصیت کے ساتھ مفاد عامہ کے نقطہ نظر سے کیا جاتا ہے۔ یہ فرق ویسا ہی ہے جیسے عدل و احتساب میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابھی ذکر ہو چکا ہے اول الذکر کے متعلق قانون فوجداری کے موافق کارروائی کی جاتی ہے مگر سلطنت نے خود اپنے مفاد کے خیال سے اس میں کچھ ترمیمیں کر دی ہیں (۱)۔ فرانسیسی عملہ آمد کے موافق کسی سرکاری جرم کے لئے کسی عہدہ دار پر فوجداری کا مقدمہ اس وقت چل سکتا ہے جب حکومت یا کوئی اور صاحب اقتدار جسے خاص طور پر اس کا حق دیا گیا ہو اس کی اجازت دے (۲) عہدہ داروں کے مقدمات کی سماعت کیلئے خاص عدالتیں ہوتی ہیں۔ سنگھت آن کے عملہ آمد میں یہ دونوں مستثنیات خارج کر دئے گئے ہیں مگر وہاں کے اعمیانی عہدہ دار بجا حلوں سے دیگر فرائض سے محفوظ کر دئے گئے ہیں۔ سرکاری تادیب اس سے ایک قدم آگے بڑھی ہوئی ہے اور اس کا نفاذ ان صورتوں میں بھی ہوتا ہے جن میں عام قانون کے

سہ جرمانی شہنشاہی قانون نظام عدالت (دفعہ ۱۱) کی رو سے جرمانیا کی مختلف سلطنتوں میں وہ قوانین باقی رہ گئے جو اسے لازم قرار دیتے ہیں کہ کسی عہدہ دار پر اس کے بالواسطہ یا بلا واسطہ دوسرے فرائض کے متعلق اگر کوئی دیوانی یا فوجداری کا مقدمہ قائم کیا جائے تو اس کے لئے سابقہ فیصلے کی ضرورت ہے، لیکن یہ سابقہ فیصلہ صرف اسی قدر تعین کرتا ہے کہ آیا عہدہ دار نے اپنے عہدے کے امتیازات سے تجاوز کیا ہے یا کوئی فرض جو براہ راست اس پر عائد تھا اسے ترک کر دیا ہے۔ جن جرمانی سلطنتوں میں اعلیٰ انتظامی عدالت موجود ہے وہاں یہی عدالت اس کا فیصلہ کرتی ہے اور جہاں اس قسم کی عدالت نہیں موجود ہے وہاں شہنشاہی عدالت میں اس کا تصفیہ ہوتا ہے۔ پروسیا، بوریٹن، ہسین وغیرہ میں اس قسم کے قانون جاری ہیں۔ فرانس میں سابقہ فیصلے کی ضرورت ۱۵ ستمبر ۱۸۷۰ء کے حکم کی رو سے منسوخ کر دی گئی ہے۔ سزا دی سے علیحدہ ہو کر، عہدہ داروں کی تادیب کے متعلق ان دونوں ملکوں میں بہت ہی مختلف و متغیر خیالات پائے جاتے ہیں۔ دیکھو کوئی سنگ کی محو بالاکتاب صفحہ ۱۲۷۔

۱۷ جیریکا میں جیشیوں کی بغاوت سے یہ ثابت ہو گیا کہ اختیارات کے اس قدر خوفناک طور پر ناجائز استعمال کر نیے باوجود انگلستان تک میں عہدہ داروں پر کامیابی سے مقدمہ چلانے کا سخت دشوار ہے۔

بموجب الزام عائد کر چکی کافی بنا نہیں ہوتی بلکہ ایسی صورتوں میں بھی اسکا فائدہ ہوتا ہے جب کہ عام قانون کی رد سے لازم رہا ہو جاتا۔ یہ تادیب کارکن کی ہر قسم کی غلطی اور غفلت پر حاوی ہوتی ہے بلکہ اسکی خانگی زندگی پر بھی اس حد تک اثر ہوتا ہے جس حد تک اس سے عہدے کی عزت و اہتمام کو نقصان پہنچتا ہو۔

تادیبی سزائیں یا تو ہلکی ہوتی ہیں جیسے تنبیہ، ملامت، یا خفیف جواز، یا سخت قسم کی ہوتی ہیں جیسے نفل، تبادلہ، جبری سبکدوشی، یا برطرفی۔ خفیف قسم کی سزائوں کا دینا عہدہ دار بالادست کے معمولی اختیارات میں داخل ہے اور اسے لئے کسی خاص قانونی کارروائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ برخلاف اسکے سخت قسم کی سزائوں کے لئے قانونی کارروائی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ عہدہ دار کے حقوق بالادست کے اختیار کے مطلق الغنا نہ استعمال سے محفوظ رہیں۔ بہت سی سلطنتوں میں برطرفی کی سزا صرف عام قانونی عدالت کے فیصلے سے ہو سکتی ہے، لیکن عام عدالت میں ایسا ہوتا ہے کہ تصور پر شخصی حیثیت سے نظر کیجاتی ہے یعنی عہدہ دار کی شخصی حیثیت کا لحاظ زیادہ کیا جاتا ہے اور اسکی عہدہ دارانہ حیثیت کا لحاظ کم۔ اس طریق میں عہدہ دار کے مقاصد کو بروقت سلطنت اور عہدے کے مستقل مقررہ فوہیت حاصل ہو جاتی ہے یعنی افراد کے حقوق کو قوم کے حقوق پر ترجیح دی جاتی ہے۔ جو عدالت اس قسم کی عام اہمیت کے معاملے کا فیصلہ کر نیکی لئے مقرر ہوا اسکی ترکیب اس طور پر ہونا چاہئے کہ وہ مشتملہ مقاصد کو کا حقہ سمجھنے کی قابلیت رکھتی ہو۔ اگر ایسی عدالت نہ موجود ہو تو نااہل اور ناکارہ عہدہ داروں کی برطرفی کا اختیار حکومت ہی کے اعلیٰ عہدہ داروں کے ہاتھ میں رہنا چاہئے۔

۱۔ جرمانی شہنشاہی عہدہ داروں کا قانون ۱۸۷۱ء دفعہ ۱۰۔

۲۔ ایضاً دفعہ ۷۶۔

گیارہواں باب

سرکاری ملازمت کا ختم ہونا

عہدے کا قیام عہدہ دار کی ضرورت کے لئے نہیں ہوتا بلکہ عہدہ دار عہدے کے لئے مقرر کیا جاتا ہے۔ پس اگر کوئی عہدہ اٹھادیا جائے تو جو شخص اس پر متعین تھا اُسکی عہدہ داری کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ عہدے کی نوعیت اور اسکے قائم رہنے کا فیصلہ صرف مفاد عامہ کے مصالح پر لحاظ کر کے کیا جاتا ہے لیکن عہدے کے اٹھا دینے سے عہدہ دار کی گزراوقات کا حق رائل نہیں ہو جاتا۔ اس حق کو اُس مدت تک کیلئے برقرار سمجھنا چاہئے جو عہدے کے زائل ہونے کے بعد اس کی ضرورت میں عہدہ دار کو ہوتا۔

اگر کسی عہدے کا اٹھا دیا جائے

جس طرح سے کہ کسی عہدے کے قبول کرنے یا اُس سے انکار کر نیکے معاملے میں آزادی ہوتی ہے اسی طرح اب استعفا دینے کے حق کو بھی رائل حال کے قانون سلطنت نے تسلیم کر لیا ہے کہ یہ ضروری ہے کہ آزادی کی ان دونوں صورتوں کی حالت ایک نہیں ہوتی۔ اگر کسی عہدہ دار کی کے قبول کر نیکے آزادی کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ اُسے ترک کر دیے لی بھی ویسی ہی آزادی حاصل ہو۔ اگر جہاں شخص کا کرکن کی دائمی ثابت اور خوشحالی کی اس قدر شدید ضرورت ہے جیسی کہ خدمات عامہ میں ہوتی ہے، وہاں کسی کارکن کو تنہا جبر سے اسکی خدمت پر گزار کر رکھنا سلطنت کے لئے مفید طلب بھی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ برعکس جہاں عہدے کا قبول کرنا ایک لازمی ملکی فرض ہے وہاں کم از کم ایک معین مدت تک اُس پر قائم رہنا بھی لازمی ہے۔

لے پروسیا کا قانون یہ ہے کہ "کسی عہدے دار کا استعفا صرف اُس حالت میں نامنظور ہو گا جب کہ اُسکے قبول کر لینے سے مفاد عامہ کو سخت نقصان ہوتا ہو" بویریا کا قانون یہ ہے کہ ہر شخص اپنی خوشی سے بغیر کسی وجہ کے بیان کئے ہوئے استعفا دے سکتا ہے مگر اس صورت میں وہ اپنی تمام تنخواہ و نیر اپنے لقب اور عہدے کے جملہ امتیازوں سے محروم ہو جائیگا۔

استغنے کا محض دیدن عہدے کے فرائض کو ختم نہیں کر دیتا۔ عہدہ دار اگر اپنی ہی رائے اور ارادے سے عہدے کو چھوڑ دے تو اُسکا ایسا کرنا خدمت سے فرار ہونا کہا جائیگا۔ استغناء صرف ایک وسیلہ ہے اس تحریک کا کہ سلطنت اُس عہدے کو جو اس نے عہدہ دار کو عطا کیا تھا اس سے واپس لے لے۔ عہدے کے فرائض اُس وقت تک ختم نہیں ہوتے۔ جب تک کہ سلطنت استغنے کو قبول نہ کر لے اور پھر بھی یہ اختیار حکام بالادست کو ہوتی رہتا ہے کہ وہ ضروریات عامہ پر نظر کر کے سبکدوشی کا ایک وقت معین کریں۔ جب کوئی عہدہ دار معمولی استغنے کی بنا پر سبکدوش کر دیا جائے تو اسکی ملازمت کے ختم ہوتے ہی وہ تمام شخصی اور سیاسی حقوق بھی ختم ہو جاتے ہیں جو اُسے اُسکے عہدے کی بنا پر حاصل تھے۔

بہ خلاف اسکے اگر کسی سرکاری ملازم کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ کنارہ کش ملازموں کے زمرے میں شامل کر دے یا انکا مطالبہ کر سکے تو اُسکا معاملہ دوسری نوعیت رکھتا ہے جیسی صورت میں عہدہ دار کے شخصی اختیارات عامہ ختم ہو جاتے ہیں مگر اُسکے ذاتی اعزاز جیسے خطاب اور مرتبہ زائل نہیں ہوتے اور اُسے بعض (قوم کے اپنا حق بھی باقی رہتا ہے ولفیہ تقاعد کی مقدار بالعموم عمر یا مدت ملازمت کے اعتبار سے مقرر ہوتی ہے۔ ولفیہ تقاعد کا حق کچھ تو سن کی حیرا دتی پر مبنی ہے جس میں طول ملازمت کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے جسکی مدت تیس سے چالیس برس تک ہوتی ہے اور کچھ صحت کی قبل از وقت خرابی وغیرہ کے باعث کام سے ناقابل ہو جانے پر منحصر ہے (یورپا میں سیرانہ سال کی حد ستر برس قدر کی گئی ہے اور پروسیا، وٹمبرگ، سکسونیا، ہاننوریم میں پینسٹھ برس) آخر الذکر حالت میں ولفیہ تقاعد قانونی حق صرف اُس صورت میں خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ جب کہ خود خدمت کی وجہ سے یہ نقص پیش آیا ہو، کیونکہ ایسی ہی صورت میں سلطنت کا یہ فرض ہے کہ مفوضہ خدمات عامہ کے عہدہ دار میں جو نقصانات لازم کو برداشت کرنا پڑے، ہوں انکی تطانی کرے۔

ملازم کی خواہش کے خلاف اسکی خدمت سے علیحدگی یعنی برطرفی کے قواعد و ضوابط موجودہ زمانے میں مختلف سلطنتوں میں مختلف ہیں قدیم جرمانی شہنشاہی (مقدس رومی شہنشاہی) میں مقننوں کے اثر کی وجہ سے عہدہ داروں کے شخصی حقوق کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ عہدے کی نسبت یہ خیال تھا کہ وہ ایک حق ہے، جو بالعموم مدت العمر کے لئے

عطا کیا جاتا ہے اور اُسکا واپس لینا صرف حکام سلطنت کی مرضی سے ممکن نہ تھا۔ ایسی علیحدگی کا امکان اُسی حالت میں ہوتا تھا جب ملازم سے اداۓ فرض میں خطا ہوئی ہو اور عدالتی فیصلہ اُسے خطا تسلیم کرے۔ یہ اعتراض ضرور قائم تھا کہ مفاد عامہ کی بنا پر مغرب برطانیہ بھی جائز و درست ہے مگر آخری صدی کے اختتام کے قریب پہلی ہی رائے کو زیادہ وسعت حاصل ہوتی جاتی تھی، اور بہت سے جدید نظامہائے سلطنت میں اس اصول کے نسبت بالاعلان یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ یہ آزادی کی ترقی اور خود مختار حکومت کے خلاف ایک ضمانت ہے۔ یہ حالت نہ صرف جرمانیا میں تھی بلکہ زیادہ قریب زمانہ تک سینیٹر زلمینڈ میں بھی یہی حالت تھی جہاں عہدے صرف ایک مدت معینہ کیلئے دئے جایا کرتے تھے۔ اسکے برخلاف انگلستان میں فرقہ نہ مناقشات نے اس سیاسی احساس کو مدت تک زندہ رکھا کہ عہدے کی خاص غرض سلطنت کا فائدہ ہے افراد کا فائدہ نہ نظر نہیں ہے، یہ اصول یہاں تک مسلم ہو گیا ہے کہ سرکردہ سلطنت کو کامل اختیار ہے کہ جس طرح وہ عہدے عطا کر سکتا ہے اسی طرح اُسے واپس بھی لے سکتا ہے جبوں کی آزادی کے تعین کے خیال سے اُنکی نسبت استثناء قائم کیا گیا تھا۔ ولیم سوم کے عہد میں یہ طے پایا تھا کہ قانون عامہ کے منج حکام اعلیٰ کی مرضی تک کے لئے نہیں بلکہ اطمینان بخش رویے کی بنا پر رخصت رکئے جائیں اور پھر بھی اگر اُن سے کوئی ایسی بات سرزد ہو جو اُنکی خوش روئگی کے خلاف سمجھی جائے تو اُنکے برخاست کرنے نہ کرنا فیصلہ صرف بادشاہ اور پارلیمنٹ کے حیطہ اختیار میں ہو۔ شمالی امریکہ کے ممالک متحدہ کا قانون سلطنت بھی

لے چنانچہ انگلستان میں جو شریف ایک برس اس عہدے کا کام کر چکا ہے وہ آئندہ تین برس تک اس عہدے کے قبول کرنے سے آزاد ہے۔

۳۔ شہنشاہی کی شاہی مجلس کے ارکان کے انتخابی حق بریت کے متعلق باضابطہ یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ کوئی رکن مجلس شاہی بغیر عدالتی تحقیق کے اور ایسے حکم کے جو اس تحقیق پر مبنی ہو، برطرف نہیں کیا جاسکتا۔

(الف) جرمانیا میں یورپا ہی ایک ملک ہے جس میں صرف معمولی عدالت فعداری ہی انتظامی عہدہ داروں کو موقوف کر سکتی ہے۔ دوسری سطحت میں برطانیہ ایک تادیبی سرکشی جاتی ہے۔ یہی قاعدہ شہنشاہی میں بھی ہے۔ ۴۔ خارج سوم کے وقت تک جج کا عہدہ بادشاہ کے انتقال کے ساتھ ختم ہو جاتا تھا۔

اسی قسم کے اصول پر مبنی ہے۔ فرانس میں بھی قدیم زمانے سے انتظامی عہدہ دار حسب مرنفی برطرف کئے جاسکتے اور کہیں پندرہویں صدی میں آکر رجحان قابل برطرفی قرار پائے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ فرانس تک میں انقلابی وقتوں کے سوا عہدہ داروں کو ایک مناسب حد تک اپنی جگہ کی طرف سے اطمینان حاصل ہے۔
جرمانی طریق میں شخصی حقوق کی اہمیت میں مبالغہ ضرور کیا گیا ہے لیکن اگر اس مبالغہ سے قطع نظر کر کے اور قانون سلطنت کے نقطہ خیال کا پورا لحاظ کر کے دیکھئے تو دوسری آئینی سلطنتوں کے خود رایانہ طریق عمل پر جرمانی طریق کی برتری ثابت ہوتی ہے، نہ صرف اسلئے کہ اس سے سلطنت کے لازم کی شخصی ہستی محفوظ ہو جاتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس سے سلطنت کا نظام عضوی فریقانہ ہنگامہ آرائیوں اور اضطرابی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے تہلکوں سے بچا رہتا ہے۔

بہر نوع ہر حالت میں یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ عہدے کا قیام سلطنت کی ضرورت سے جوتا ہے اور اس لئے سلطنت مفاد عامہ کے لحاظ سے کسی عہدہ دار کو برطرف یا تبدیل کر سکتی ہے۔ یہ دونوں حقوق لازمی طور پر ایک ہی شخص سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی شک کی حالت میں ان کا تعلق سر تاج سلطنت سے ہوتا ہے۔ عہدے سے علحدگی کے نتائج جہاں تک شخصی حالت کے بجائے سیاسی حالات سے تعلق رکھتے ہیں وہاں تک اس اصول کو ان سلطنتوں میں بھی تسلیم کرنا چاہئے جن میں برطرفی کا اختیار صرف عدالت قانونی کو ہوتا ہے۔
ان قواعد کی حد بندی کی دو شکیں ہو سکتی ہیں: (۱) ایک جموں کی آزادی کے متعلق

۱۹۰۷ء کے قانون کے بموجب شمالی امریکہ کے مالک متحدہ میں عہدہ داروں کے برطرف کرنا اختیار صرف رئیس جمہوریہ کو تھا حالانکہ اس کا تقرر مجلس اعلیٰ کی اتفاق رائے کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ایک بے جوڑ بات تھی مگر ۱۸۷۱ء تک اس میں ترمیم نہیں ہوئی۔

۱۸۷۱ء لیکن بعض سلطنتیں ایسی بھی ہیں جو اس اصول کو تسلیم نہیں کرتیں بلکہ وہ یہاں تک بڑھی ہوئی ہیں کہ ایک خاص مدت تک کیلئے سرکاری وجوہ سے عہدے کو ناقابل منسوخ قرار دیتی ہیں۔

اور (۲) دوسری خود کار کنوں کے مفاد کے متعلق۔ زمانہ حال میں یہ اصول عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ جج نہ تو موقوف کئے جاسکتے ہیں اور نہ ان کی مرضی کے خلاف انکا تبادلہ ہو سکتا ہے۔ اور بغیر پوری تنخواہ کی برقراری کے وہ کنارہ کشی پر مجبور نہیں کئے جاسکتے۔ انگلستان میں جج صرف پارلیمنٹ کے حکم سے علیحدہ کئے جاسکتے ہیں اور جرمانیا میں عدالتی فیصلے کی رو سے یہ

دوسری قسم کی حد بندی کے متعلق مختلف حالات میں فرق کرنا چاہئے کسی عہدہ دار کے علیحدہ کر نیکے اسباب حسب ذیل ہو سکتے ہیں۔

(الف) کوئی جرم ایسا سرزد ہو جس سے اخلاقاً وہ عہدے کے ناقابل ثابت ہو۔

(ب) کوئی حقیقی جرم نہ سرزد ہو مگر ایسی غفلت، بزدلی یا کوئی اور اخلاقی خطا ظاہر ہوئی ہو جو عہدہ دار کو عہدے کے ناقابل ثابت کرے۔

(ج) دماغی ناقابلیت مثلاً حافظے کا جانا رہنا، دیوانگی وغیرہ۔

(د) خارجی اسباب ایسے پیدا ہو جائیں جن کو عہدہ دار کی ذات سے واسطہ نہ ہو مگر جن سے اسکی کارگزاری کی قوت میں فتور پڑ جائے یا جن سے وہ عوام کے اعتماد سے محروم ہو جائے اضطرابی زمانے میں یا غیر ملکی پھپھکیوں کے باعث ایسے عہدہ داروں کے متعلق بھی یہ صورت پیش آسکتی ہے جنھوں نے نہ صرف اپنا فرض ادا کیا ہو بلکہ جن کو یہ دشواری صرف اسی وجہ سے پیش آئی ہو کہ انھوں نے اپنا فرض ادا کیا۔ چنانچہ وزیر ایشٹائن، پولینڈل کے خوش کر نیکے لئے برطرف کر دیا گیا تھا۔

ان تمام صورتوں میں سلطنت کے پاس ایسے ذرائع ہونا چاہئیں جن سے وہ عہدہ داروں کو علیحدہ کر کے خود کو نقصان سے بچا سکے۔ اس میں سے صرف پہلی صورت (الف) میں قانونی عدالتیں اپنے معمولی طریق کارروائی سے فیصلہ کر نیکے لئے موزوں ہو سکتی ہیں۔

بھویریا کے نظام سلطنت میں یہ قرار پایا ہے کہ جج بغیر عدالتی فیصلے کے اپنی تنخواہ سے محروم کر کے اپنے عہدے سے علیحدہ نہیں کئے جاسکتے۔ بحیم کے نظام سلطنت کی دفعہ ۱۰۰ حسب ذیل ہے۔ ججوں کا تقرر ادا م الحیات ہوتا ہے کوئی جج عدالتی فیصلے کے بغیر اپنی جگہ سے محروم کیا جاسکتا اور نہ معطل کیا جاسکتا ہے۔ کسی جج کا تبادلہ نئی نامزدگی اور اسکی مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔“

عدالتی طور پر برطرف کئے جانے سے لقب، عہدہ، تنخواہ، حق و وظیفہ سب زائل ہو جاتا ہے۔
 دوسری صورت (ب) میں معمولی عدالتوں میں معاملات کے پیش کرنے سے
 یہ بہتر ہے کہ خود محکمہ کی طرف سے تادیبی کارروائی کی جائے، مگر اس حالت میں عہدہ دار کو
 ہمیشہ اس امر کا موقع حاصل رہنا چاہئے کہ وہ اپنی محافظت کر سکے۔ اس کے قصور کے
 سخت یا خفیف ہونے کے اعتبار سے یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی موقوفی کے ساتھ اس کی تنخواہ کا
 تمام حق زائل ہو جائے مگر اس کے بقیہ سیاسی حقوق کو نقصان نہ پہنچے بلکہ وہ مناسب
 وظیفہ دیکر کنارہ کشی پر مجبور کیا جائے، یہ ظاہر ہے کہ آخر الذکر صورت میں حکومت
 زیادہ آزادی کے ساتھ کارروائی کر سکتی ہے کیونکہ اس سے عہدہ دار کے
 شخصی حقوق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

تیسری صورت (ج) میں بالعموم عہدہ دار کو کنارہ کشی پر مجبور کرنا درست ہے
 مگر اس کی برطرفی روا نہیں کیونکہ اس میں خود عہدہ دار کا کوئی قصور نہیں ہے۔
 چوتھی صورت (د) کی تدبیر یہ ہو سکتی ہے کہ یا تو عہدہ دار جبراً کنارہ کشی پر
 مجبور کیا جائے، یا اسی نوعیت، اعزاز اور آمدنی کی دوسری جگہ پر تبدیل کر دیا جائے۔
 یہ دونوں آخری صورتیں حکومت کے سب سے اعلیٰ صاحب اقتدار کے
 رو برو پیش ہونا چاہئیں اور جس صورت میں کہ تقرر، سرتاج سلطنت کی طرف سے
 ہوتا ہو اس صورت میں برطرفی کے لئے بھی اس کی منظوری اور حکم کی ضرورت ہو۔
 بعض بعض سلطنتوں میں اب بھی بغیر کسی وجہ کے بیان کئے ہوئے اور بغیر اسکے کہ
 عہدہ دار کو مداخلت کا موقع دیا جائے، خود رایانہ طور پر برطرفی عمل میں آتی ہے مگر یہ
 دستور ایک منظم حالت کے موافق نہیں ہے۔

۵۔ تظیل

عارضی تظیل سزا کے طور پر یا احتیاط کی نظر سے عمل میں آ سکتا ہے، اول الذکر
 صورت میں حکم یا تو قانونی عدالت سے ہونا چاہئے یا تادیبی طور پر کسی باختیار اعلیٰ عہدہ دار کی
 جانب سے ہونا چاہئے۔ اس صورت میں بالعموم زمانہ تظیل میں یا تو کل تنخواہ ضبط ہو جاتی ہے
 یا اس میں کمی کر دی جاتی ہے۔

بعض صورتوں کے لئے مثلاً جرمانہ الزام کی حالت میں از روئے قانون ایک
 عارضی کارروائی کے طور پر تظیل کے شرائط پہلے سے معین کئے جاسکتے ہیں لیکن کسی

غیر ہر دغیر عہدہ دار کو اسکی پیدا کردہ شورش سے بچانیکے لئے بھی حکام بالا دست اس طریق سے کام لے سکتے ہیں۔ معطلی جب تک سزا کے طور پر نہ ہو اس سے شخصی حقوق داخل نہیں ہوتے۔ عہدہ دار کو اسکی آمدنی کا وہ حصہ جو شخصی نوعیت رکھتا ہو، تیار ہینگا۔ بالخصوص اسکا گزارہ۔ اگر کسی مجرمانہ الزام پر وہ معطل کیا جائے تو بھی اس کے یہ شخصی حقوق قائم رہیں گے مگر عدالت یہ حکم دے سکتی ہے کہ بلو ضمانت کے اسکی تنخواہ روک دی جائے تاکہ اگر اس پر جرمانہ ہو یا اسپر کوئی تاوان عائد کیا جائے تو تنخواہ سے اسکی ادائیگی ہو سکے مگر جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے اسکا آئندہ کی تنخواہ کا حق ختم نہیں ہوتا۔

— — — — —

صحت نامہ نظریہ سلطنت

صفحہ	غلط	صفحہ	غلط	صفحہ	غلط	صفحہ	غلط
۲	۳	۲	۱	۲	۳	۲	۱
۲۰	۱۲	۳۰	۱۳۰	۱۴	۱۴	۱۳۰	۱۴
۲۰	۲۰	۲۰	۲۰	۲۰	۲۰	۲۰	۲۰
۳۵	۱۴	۳۵	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴	۱۴
۳۴	۱۳	۳۴	۱۳	۱۳	۱۳	۱۳	۱۳
۲۵	۷	۲۵	۷	۷	۷	۷	۷
۵۲	۲۲	۵۲	۲۲	۲۲	۲۲	۲۲	۲۲
۶۸	۱۸	۶۸	۱۸	۱۸	۱۸	۱۸	۱۸
۷۱	۲۵	۷۱	۲۵	۲۵	۲۵	۲۵	۲۵
۷۸	۲۱	۷۸	۲۱	۲۱	۲۱	۲۱	۲۱
۸۳	۱۱	۸۳	۱۱	۱۱	۱۱	۱۱	۱۱
۹۰	۱۲	۹۰	۱۲	۱۲	۱۲	۱۲	۱۲
۱۲۸	۲۳	۱۲۸	۲۳	۲۳	۲۳	۲۳	۲۳
۱۲۹	۷	۱۲۹	۷	۷	۷	۷	۷
۱۳۰	۳	۱۳۰	۳	۳	۳	۳	۳
۱۳۰	۱۳	۱۳۰	۱۳	۱۳	۱۳	۱۳	۱۳
۱۳۲	۸	۱۳۲	۸	۸	۸	۸	۸

صحت	غلط	نہا	نہا	صحت	غلط	نہا	نہا
۲	۳	۲	۱	۲	۳	۲	۱
رواساز	دواسار	۱۰	۱۹۹	۱۲۲۹ - ۹۸۷	۲۲ - ۹۸۷	۱۳۲	۱۳۲
کے لئے لازمی	کے لازمی	۱۷	۲۰۲	تسلیم کرنا پڑا	تسلیم کرنا پڑا	۲۱	۲۱
وجوہ	وجوہ	۱۱	۲۲۵	Guizot	Gnizot	۲۲	۲۲
جسم	جس	۱۹	۲۳۲	France	Frauce	۲۳	۲۳
روک	ودک	۲۲	۲۴۰	ہنری چہارم	ہنری چہارم	۱۳	۱۳۶
حد ادنیٰ	حد ادلی	۱۵	۲۴۸	اگرچہ	اگرچہ	۲۰	۱۵۱
متدعوہ	متدعوہ	۱۶	۲۷۲	جوانیا	جوانیا	۸	۱۵۳
زیتون	ریتوں	۱۰	۲۷۳	درشتا	درشتا	۱۸	۱۵۴
ممنوع	ممنوع	۲۳	۲۷۸	صور تہائے	صور تہائے	۱۵	۱۵۷
اعضائے کار	اعضا	۲	۲۸۰	یادریوں	یادریوں	۵	۱۶۱
سوئزر	سوئزر	۱۵	۲۸۰	اشوائتس	اشوائتس	۱۲	۱۶۱
مرضی	مرضی	۶	۲۸۸	اشوائتسی	اشوائتسی	۱۳	۱۶۱
چاہا	چاہا	۳	۳۰۳	آزادانہ	آزادانہ	۲۰	۱۶۲
موسیو فوٹو	موسیو فوٹو	۲	۳۱۶	آتا	آتا	۱۷	۱۶۳
ولہ سلیم	ولہ سلیم	۱۰	۳۳۳	حلفی شترکیات	مشتکیات	۷	۱۶۳
چھوٹی	جھوٹی	۳۳۹	۳۳۹	ہابس برگ کے	ہابس برگ	۱۹	۱۶۷
جانے	انے	۷	۷	اطالیا	اطالیا	۱۱	۱۶۸
خداشت	وضع	۱۶	۳۴۳	علاقوں	علاقوں	۲۳	۱۶۹
گردوبی	مداشت	۱۸	۳۵۹	ہی	نئی	۱۳	۱۸۲
تھیں	کرد بیان	۹	۳۶۹	شمالی	شمالی	۲۳	۱۸۵
	نہیں	۱۷	۲۷۶	زیادہ تر	زیادہ تر	۸	۱۹۵

صحیح	غلط	۱	۲	صحیح	غلط	۱	۲
۴	۳	۲	۱	۴	۳	۲	۱
گیر کے کی	گیر کی	۶	۵۰۶	شہنشاہوں	شہنشاہوں	۲۱	۲۸۸
قوم	ملت	۱۲	۵۰۸	اساقفہ	اساقفہ	۱۳	۲۹۵
comment aries	comment aries	۱۳	"	صوامع	صوامع	۵	"
داخل	داخل	۶	۵۱۰	میں	میں	۱۹	۴۰۸
ہونے کے	ہونے کے	۶	۵۱۲	مطلق	مطلق	۸	۴۲۵
دل خواہ	دل خواہ	۵۱۳	"	وائینا	وائینا	۱۶	۴۳۲
Imperium	Imperium	"	"	ہے	ہے	۱۲	۴۳۳
Esprit	Esprit	۱۳	۵۲۵	وہ	وہ	۲۱	۴۴۶
کہ اس کے	کہ اس کے	۵۲۴	"	انہوں نے سیاسی	انہوں نے سیاسی	۱۶	۴۵۴
وحدت	وحدت	۵	۵۲۸	رہنا ہے	رہنا ہے	۶	۴۶۶
نوشیکو	نوشیکو	۹	"	نہ رکھ سکے	نہ رکھ سکے	۱۲	۴۶۶
اصلاح	اصلاح	۵۲۹	"	سیکس قوم ہی	سیکس قوم ہی	۲۵	۴۸۰
بیشتر	بیشتر	۵۳۱	"	قومی مؤتمر	قومی مؤتمر	۱۵	۴۸۸
عہدہ واروں پر کار	عہدہ واروں پر کار	"	۵۳۱	مولڈ یویا	مولڈ یویا	۱۴	۴۹۶
اور	اور	۵۳۴	"	پروسی	پروسی	۴	۴۹۹
مواجبہ	مواجبہ	۱۳	"	پروسیا	پروسیا	۱	۵۰۰
پروسیا	پروسیا	"	"	مستثنیٰ	مستثنیٰ	"	"
کا	کا	۵۳۲	"	تیسرے	تیسرے	"	"
گرو	گرو	۱۳	۵۳۳	and	und	۱	۵۰۳
Pragmatic	Pragmatic	۳	۵۳۴	Statsgewalt	Statsgewalt	"	"
Pragmatis	Pragmatis	۲۲	"	لائٹس	لائٹس	"	"
						۵۰۶	"

صحیح	غلط	صحیح	غلط	صحیح	غلط	صحیح	غلط
۴	۳	۲	۱	۳	۳	۲	۱
کر دینے	کر دیے	۱۳	۵۵۸	مختلف الراء	مختلف الراء	۱۳	۵۵۴
.	.	.	.	خفیف	خفیف	۵	۵۵۷

